العطایا الاحمدیہ

فی

فتاوٰی نعیمیہ

صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خاں نعیمی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

مجموعہ

العطایا الاحمدیہ فی فتاوٰی نعیمیہ

سنہ ۱۳۹۶ھ سنہ ۱۹۷۶ء

جلد دوم

مصنفہ

مفتی دار العلوم غوثیہ نعیمیہ و شیخ الحدیث

صاحبزادہ اقتدار احمد خان نعیمی قادری بدایونی

ملنے کا پتہ نعیمی کتب خانہ گجرات

ناشر ضیاء القرآن پبلیکیشنز ۹ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

فون: ۷۲۲۵۰۸۵-۷۲۲۱۹۵۳

فہرست مضامین العطایا الاحمدیہ جلد دوم

ختم شد

نام کتاب: العطایا الاحمدیہ فی فتاویٰ نعیمیہ جلد دوم

مصنف: صاحبزادہ اقتدار احمد خان بدایونی نعیمی قادری

کاتب: راجہ محمد صدیق خوشنویس کیلانی

اشاعت: تیسری بار، تعداد ایک ہزار

ناشر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

کمپیوٹر کوڈ: 1Z101

قیمت: -/300 روپے

ملنے کا پتہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔ فون: 7221953

کتاب الحظر والاباحت

انگریزی وضع کے کپڑے پہننے کا حکم اور عورتوں کو لکھنا سکھانے کا بیان

سوال نمبر ۱:۔ حضرت والا محترم ایک استفتاء حاضر خدمت ہے۔ بعض لوگ عوام الناس آج کل نئی روشنی کے زیر اثر ہیں۔ ان کو سمجھانا ہم سب کے لئے اشد ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل ہر دو سوالات میں ان کو علماء اہلسنت سے اختلاف ہے۔ آپ کی تحریر بھی اُن کے سمجھانے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہو گی۔ دلائل اور مضمون کی طوالت کی چنداں ضرورت نہیں صرف آپ کے چند الفاظ ہی سند کے لئے کافی ہیں۔ اہلسنت کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ فقط والسلام

منتظر جواب:۔ ابوداؤد محمد صادق غفر لہٗ، گوجرانوالہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں ۱ بکر کہتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ انگریزی وضع کے کپڑے پہننا سخت حرام اشد حرام ہے، ان کو پہن کر نماز مکروہ تحریمی۔ مگر زید کہتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا یہ ایک وقتی فتوے تھا۔ ہمارے زمانے میں اس کی کیفیت بدل گئی ہے اور علت بھی بدل گئی ہے۔ اور ان کپڑوں کا عام رواج ہو گیا۔ اس لیئے عموم بلویٰ کی وجہ سے کوٹ پتلون، ٹائی، ہیٹ وغیرہ کا پہننا جائز و مباح ہے۔ اور نماز ان کے ساتھ ہرگز ہرگز مکروہ تحریمی نہیں ہے۔ فرمایا جائے کہ زید کا یہ قول درست ہے یا نہیں۔ اور انگریزی لباس کوٹ پتلون ٹائی ہیٹ وغیرہ پہننے کا شرعی کیا حکم ہے۔ ۲ بکر کہتا ہے اعلیٰ حضرت کا قول ہے کہ عورتوں کو لکھنا سکھانا شرعاً ممنوع ہے۔ و سنتِ نصاریٰ و فتح باب ہزاراں فتنہ و مستانِ سرشعار کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔ جس کے مفاسد شدیدہ پر تجارب عدیدہ شاہد ہیں۔ متعدد حدیثیں اس سے ممانعت میں وارد ہیں۔ مگر زید کہتا ہے کہ لڑکیوں کو لکھنا سکھانا جائز ہے۔ حدیث لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ۔ ضعیف موضوع ہے۔ اور تعلیم کتابت کی ممانعت پر مبنی اعلیٰ حضرت کا فتوے محض احتیاط پر مبنی ہے۔ فرمایا جائے کہ کیا شرعاً زید کا قول درست ہے؟ اور لڑکیوں کو لکھنا سکھانا ممنوع ہے۔ یا غیر ممنوع۔

بَيِّنُوْا تُوْجَرُوْا

(جناب محترم قبلہ مفتی ابو داؤد محمد صادق خطیب زینت المساجد گوجرانوالہ، ۲ ۱۱/۲)

الجواب بِعَونِ العَلَّامِ الوَهَّابِ

ع ۱ قانونِ شریعت کے مطابق ہر مسلمان عورت و مرد کو ہر وہ چیز استعمال کرنی منع ہے جس سے اسلام کی کسی عبادت یا فروع و اصول کے ادا کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہو، یا کفار کی عبادت یا مذہبی مشابہت کا اظہار ہوتا ہو۔ اسی طرح جو چیز کفار کی دینی نشانی بن چکی ہو اگرچہ وہ پہننے استعمال کرنے میں آتی ہو مسلمان کو اس کا استعمال سخت مکروہ تحریمی ہے کیونکہ یہ مشابہتِ کفار و نصاریٰ ہے۔ اور کفار سے دینی مشابہت مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ صاحب ردّ المحتار فرماتے ہیں۔ جلد اول ص ۵۹۸ فَكَرَاهَتُهُ لِلتَّشَبُّهِ بِاَهْلِ الْكِتَابِ فَهُوَ مَكْرُوْهٌ مُطْلَقًا۔ یعنی ہر حال میں یہود و نصاریٰ کی دینی مشابہت مکروہ تحریمی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو شخص دنیا میں جس قوم کے ساتھ مشابہت رکھے گا۔ کل قیامت میں انہی میں شمار ہوگا۔ چنانچہ درِّ منثرہ ص ۲۰۴ پر امام جلال الدین سیوطی ابو داؤد کی حدیث نقل فرماتے ہیں:۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ امام عبد الرؤف مناوی نے اس کو اپنی کتاب کنوز الحقائق میں حسن کہا ہے، بر ص ۱۰۲۔ اس لیے انگریزی لباس میں سے ہیٹ۔ پتلون۔ ٹائی پہننا مکروہ تحریمی ہے۔ اس لیے کہ ہیٹ پہن کر مسلمان نماز نہیں پڑھ سکتا۔ تو یہ نماز کی رکاوٹ بنتا ہے اس لیے ناجائز ہوا کیونکہ ہیٹ پہننے والا مسلمان جب نماز پڑھے گا تو ہیٹ یا خود گر جائے گا یا بوقتِ سجدہ اتارنا پڑے گا اور ننگے سر نماز بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ عالمگیری جلد اول ص ۱۰۶ پر ہے۔ وَتُكْرَهُ الصَّلٰوةُ حَاسِرًا رَأْسَهٗ۔ پس چونکہ ہیٹ سجدے کی رکاوٹ ہے اس لیے ہر حال میں منع ہے۔ کیونکہ فقہاءِ عظام فرماتے ہیں کہ مسلمان کو ہر وقت ایسا لباس پہننا چاہیے جس سے بآسانی نماز ادا ہو سکے۔ انگریز قوم ایسی خبیث اور متعصب اور دشمنِ اسلام ہے کہ اس نے ہر موقع پر اپنی اکثر بناوٹ اور ساخت میں اسلام دشمنی کا ظاہر و پوشیدہ ثبوت دیا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ اس کے وضع کردہ لباس میں کتنی اسلام دشمنی موجود ہے۔ اسلام کا واضح قانون ہے کہ نماز میں کپڑا لپیٹنا اور پائنچے یا آستین چڑھانا مکروہ ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ وغیرہ میں ص ۱۰۶ پر مرقوم ہے:۔ وَلَوْ صَلّٰى رَافِعًا كُمَّيْهِ اِلَى الْمِرْفَقَيْنِ كُرِهَ۔ علامہ شامی نے فرمایا وَكَفُّ الثَّوْبِ مَكْرُوْهٌ تَحْرِيْمًا۔ انگریز قوم نے مسلمانوں کی نماز خراب کرنے کے لیے پتلون ایجاد کی۔ جس کے پائنچے اٹھے ہوتے ہیں۔ اسلام کا دوسرا قانون ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب نہ کرو۔ چنانچہ روایت ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضہ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبَوْلِ قَائِمًا مسلمان کو اس طریقے سے ہٹانے کے لیے پتلون ایجاد کی جس کو پہن کر پیشاب کرنا سخت ترین مشکل ہے۔ پس چونکہ پتلون پہن کر خلافِ اسلام کام سرزد ہوتے ہیں لہٰذا مسلمان کو پہننا مکروہ

اسلام کا تیسرا قانون حیات یہ ہے۔ عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ کی سولی کی موت ہے۔ اس لیے صلیب کو انھوں نے اپنا دینی شعار بنالیا۔ ہر جگہ انگریزوں نے صلیب کا نشان برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ صلیب کو سجدہ کرتے ہیں سینے پر صلیب بنانا ان کی بہت بڑی عبادت ہے، ٹائی اسی مقصد کے لیے ایجاد کی۔ ٹائی صلیب کا نقشہ ہے ٹائی مثل بت کے ہے۔ جو مسلمان ٹائی باندھتا ہے وہ ظاہر ظہور اسلام کے اس قانون کی مخالفت، اور عیسائیت کی تائید کرتا ہے۔ اسی لیے ٹائی باندھنا اشد مکروہ تحریمی ہے مکروہ تحریمی حرام کے درجے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ شرح در مختار جلد اول میں ارشاد ہے بر صـ۱۲۲ مَكْرُوهٌ وَهُوَ ضِدُّ الْمَحْبُوبِ قَدْ يُطْلَقُ عَلَى الْحَرَامِ (الخ) وَعَلَى الْمَكْرُوهِ تَحْرِيمًا وَهُوَ مَا كَانَ إِلَى الْحَرَامِ أَقْرَبَ وَيُسَمِّيهِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّيًّا ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ بیلٹ ٹائی پتلون مسلمان کو پہننا مکروہ تحریمی ہے یعنی حرام ہے۔ اور مکروہ تحریمی کے ساتھ نماز پڑھنا واجب الاعادہ ہے۔ چنانچہ شامی شریف جلد اول صفحہ نمبر صـ۴۲۵ میں ہے۔ كُلُّ صَلٰوةٍ أُدِّيَتْ مَعَ كَرَاهَةِ التَّحْرِيمِ تَجِبُ إِعَادَتُهَا اگر چہ اس سے گناہ صغیرہ لازم آتا ہے۔ لیکن پھر بھی تمام مسلمانوں کو اس سے بچنا لازم اشد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے مندرجہ بالا فتوائے صادر فرمایا۔ زید کا قول قطعاً غلط ہے کہ اعلیٰ حضرت کا فتوائے وقتی ہے۔ زید کا یہ قول بھی نری غلطی ہے کہ ہمارے زمانے میں اس کی کیفیت بدل گئی ہے۔ زید کا کونسا زمانہ ہے سب اعلیٰ حضرت کا زمانہ ہے کیونکہ اعلیٰ حضرت مجدد وقت ہیں عند الزید بھی مسلم ہے۔ اور علامہ شاذلی اپنی کتاب سیر السلوک صـ۲۰۸ پر "دہر" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کا زمانہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس علاقے میں دوسرا نبی تشریف نہ لائے اگرچہ وصال ہو جائے اور مرسل کا زمانہ دوسرے مرسل کے آنے تک ہے اگرچہ مرسل کا انتقال ہو جائے۔ اسی لیے حضرت مسیح کا زمانہ نبی کریم کی ولادت تک وسیع ہے۔ اور نبی کریم کا زمانہ تا قیامت اور مجدد کا زمانہ دوسرے مجدد تک۔ پس ثابت ہوا کہ اب تک اعلیٰ حضرت ہی کا زمانہ ہے۔ ان حضرات کی وفات سے ان کا زمانہ نہیں بدلتا۔ چنانچہ علامہ شامی جلد سوم صـ۳۲۷ میں فرماتے ہیں۔ أَنَّ رِسَالَتَهُ بَاقِيَةٌ بَعْدَ مَوْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور بقاء کی وجہ یہ بھی ہے کہ لَا رَسُوْلَ بَعْدَهُ جس طرح ایک آن رسالت سے خالی نہیں۔ اسی طرح ایک آن مجدد سے خالی نہیں ہوتی۔ زید کس طرح کہہ سکتا ہے کہ پتلون وغیرہ کی کیفیت بدل گئی اب بھی وہی کیفیتِ گناہ بیلٹ ٹائی پتلون میں موجود ہے۔ لہٰذا اب بھی کراہت اسی طرح موجود ہے۔ عموم بلوی صرف ان چیزوں میں معتبر ہے جو ضروریاتِ زندگی میں شامل ہو جائیں اور اس سے ضروریاتِ دین پر بھی برا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ عقود رسم المفتی صـ۳۹ پر ہے۔ فَلَا تَغَيَّرَتْ أَحْكَامُهَا لِتَغَيُّرِ الزَّمَانِ إِمَّا لِلضَّرُوْرَةِ وَإِمَّا لِلْعُرْفِ وَإِمَّا لِقَرَائِنِ الْأَحْوَالِ۔ یعنی یہ ٹھیک ہے کہ مرور زمانہ سے بوجہ تغیر حالات فروعی احکام بدل جاتے ہیں۔ لیکن صرف ضروریاتِ زندگی نہ کہ وہ احکام جو دین سے مخالف ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

فَھٰذَا کُلُّہٗ صَرِیْحٌ فِیْمَا قُلْنَا مِنَ الْعَمَلِ بِالْعُرْفِ مَا لَمْ یُخَالِفِ الشَّرْعَ۔ فَلَا بُدَّ لِلْمُفْتِیْ وَالْقَاضِیْ بَلْ وَالْمُجْتَھِدِ مِنْ مَعْرِفَۃِ اَحْوَالِ النَّاسِ وَقَدْ قَالُوْا مَنْ جَھِلَ بِاَھْلِ زَمَانِہٖ فَھُوَ جَاھِلٌ۔ یعنی جس کام سے کوئی شرعی قانون بدلتا ہو۔ اس کو کرنا خلافِ شرع کام کہلائے گا جو گناہ ہے۔ لیکن جس کے کرنے سے شریعت کے اصول و فروع پر اثر نہیں پڑتا وہ حکم اگرچہ کسی صورت میں منع بھی ہو مگر زمانے کے تغیر سے بدل جائے گا جیسے ضرورۃً فوٹو کھنچوانا کہ اگرچہ منع تھا مگر اب ضرورۃً جائز ہے بلا ضرورت فوٹو بنوانا حرام ہیٹ پتلون کے استعمال میں سراسر شریعت کی مخالفت ہے۔ ان کی کراہت کی علت بھی یہی ہے۔ علت اب بھی موجود لہٰذا کراہت بھی موجود۔ کیا زید پسند کرتا ہے مسلمان پتلون کے لوازم کھڑے ہو کر پیشاب کریں اور ٹائی جیسی شرکیہ چیز کو مسلمانوں کے سینے پر لٹکایا جائے۔ اعلیٰ حضرت کا فتوےٰ یہی حکم دے رہا ہے اور اسی علت کی بناء پر ہے لہٰذا اب بھی قابلِ اجراء ہے اور بحمداللہ تعالیٰ علمائے اہل سنت کے نزدیک جاری و ساری ہے کہ شرعًا ٹائی ہیٹ، پتلون قطعًا مکروہ تحریمی ہیں۔ زید اس کی مخالفت میں سخت غلطی پر ہے۔ ہاں انگریز کے بنے ہوئے کوٹ چسٹر۔ گون۔ واسکٹ۔ جرسی وغیرہ یا جو اس قسم کی اشیاء انگریزی ملکوں سے آئیں اُن کا استعمال بلا کراہت ہر مسلمان کو جائز ہے۔ کیونکہ ان میں وجہ کراہت کوئی نہیں۔ اور شرعی مسئلہ ہے کہ فساق کے کپڑے پہننے جائز ہیں چنانچہ درمختار جلد اوّل صـ۲۲۴ پر ہے:۔ قَالَ بَعْضُ الْمَشَائِخِ تُکْرَہُ الصَّلٰوۃُ فِیْ ثِیَابِ الْفَسَقَۃِ۔ وَالْاَصَحُّ اَنَّہٗ لَا یُکْرَہُ لِاَنَّہٗ لَمْ یُکْرَہْ مِنْ ثِیَابِ اَھْلِ الذِّمَّۃِ اِلَّا السَّرَاوِیْلُ مَعَ اِسْتِحْلَالِھِمُ الْخَمْرَ۔ فَھٰذَا اَوْلٰی۔ پس ثابت ہوا کہ کوٹ وغیرہ جائز ہیں اگرچہ اس کو پہن کر نصاریٰ سے مشابہت ہو جاتی ہے مگر یہ مشابہت مضر نہیں۔ مشابہت دو قسم کی ہے ۱ مشابہت فی الدین ۲ مشابہت فی الدنیا یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کافروں سے مشابہت فی الدین جیسی کہ اوپر بیان کی گئی منع ہے۔ چنانچہ شامی میں ہے۔ اَلتَّشَبُّہُ بِاَھْلِ الْکِتَابِ فَھُوَ مَکْرُوْہٌ مُطْلَقًا۔ اسی تشبیہ کی برائی حدیث پاک میں ان الفاظ سے آئی ہے لَتَرْکَبُنَّ سُنَنَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ: مشکوٰۃ شریف صـ۴۶۵ کتاب الفتن۔ اسی مشابہت کو اعلیٰ حضرت نے حرام قرار دیتے ہوئے مذکورہ فی السوال فتوےٰ صادر فرمایا اسی لیے اعلیٰ حضرت نے انگریزی لباس میں انگریزی وضع کی قید لگا دی کیونکہ لفظ وضع سے مراد لباس ہے جس سے نصرانیت کا ظہور ہوتا ہے اور وہ ٹائی پتلون وغیرہ ہیں دوسری قسم مشابہت فی الدنیا یہ جائز ہے جس میں کفار کے دین کو کوئی دخل نہ ہو نہ ہی اسلامی مسائل کی خلاف ورزی ہو وہ مشابہت دنیاوی ہے۔ سب فقہائے کرام اس کو جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ ردالمحتار جلد اوّل صـ۵۸۳ پر ہے:۔ فَاِنَّ التَّشَبُّہَ بِھِمْ لَا یُکْرَہُ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ بَلْ فِی الْمَذْمُوْمِ اور صـ۶۰۶ پر ہے وَیُکْرَہُ التَّشَبُّہُ بِھِمْ فِی الْمَذْمُوْمِ وَاِنْ لَمْ یَقْصِدْ۔ یعنی صرف شرعًا بری چیزوں میں انگریزوں یہودیوں سے مشابہت منع ہے

اسی لیئے علمائے متاخرین ہندوؤں کی ٹوپی دھوتی کو جائز مانتے ہیں اور سکھوں کی پگڑی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان گاندھی مارکہ کپڑے کی ٹوپی پہنے تو جائز ہے اور سکھوں جیسی پگڑی باندھے تو گناہ ہے خود نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ راہبوں جیسی جوتی پہنی۔ چنانچہ حضرت ہشام ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِيْ لَهَا شَعْرٌ مِنْ لِبَاسِ الرُّهْبَانِ:۔ ثابت ہوا کہ عام حالات میں کفار سے دنیاوی مشابہت جائز ہے۔ ہاں ہنگامی حالات میں ہر قسم کی مخالفت حرام و نقصان دہ ہے۔ اسی طرح جہاں کافر و مسلم مخلوط رہتے ہوں۔ یہاں تک کہ روافض و دیگر فرقوں کی خصوصی مشابہت سے بچنا بھی مستحب ہے۔ چنانچہ شامی کا ارشاد ہے :۔ لَمَّا كَانُوْا مُخْتَلِطِيْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ فَلَا بُدَّ مِنْ تَمْيِيْزِهِمْ وَعَنَا وَيُمَيِّزُ فِيْ لِبَاسِهِمْ وَهَيْئَتِهِ جلد ثالث ص۲۷۷۔ جلد پنجم ص۲۱۶ پر اِلَّا اَنَّهٗ مِنْ شِعَارِ الرَّوَافِضِ فَيَجِبُ التَّحَرُّزُ عَنْهُ ۔ مرزائی، وہابی، شیعہ کسی کے شعار کی مشابہت جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہیٹ، ٹائی، پتلون کا استعمال مسلمان مرد و عورت کو سخت مکروہ تحریمی اور کوٹ وغیرہ بلاکراہت جائز ہیں۔ زید کو اپنی غلطی سے رجوع کرنا چاہیئے :۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

(ع۲) شریعتِ اسلامیہ کے قانونِ طیبہ طاہرہ ذی الحکمت کے مطابق علی العموم عورتوں کو کتابت سکھانا مکروہ تنزیہی ہے یعنی ہر زمانے کی ہر قسم کی عام عورتوں کو تعلیم کتابت مکروہ تنزیہی ہے چنانچہ بیہقی شریف جلد چہارم میں حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح منقول ہے :۔ عَنْ عَائِشَةَ رض اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُنْزِلُوْهُنَّ فِي الْغُرَفِ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ وَعَلِّمُوْهُنَّ الْغَزَلَ وَسُوْرَةَ النُّوْرِ ۔ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ ۔ اس حدیثِ پاک سے ثابت ہوا کہ عورتوں کا لکھنا سیکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ اس لیئے کہ لفظ لَا تُعَلِّمُوْا اور لفظ عَلِّمُوْا بحث فعل نہی اور بحث امر کے صیغے ہیں۔ اور دونوں قواعدِ اصول کے مطابق مشترک فی الاحکام ہیں۔ چنانچہ علمائے اصول فرماتے ہیں کہ امر سولہ معنے کے لیئے آتا ہے ع۱ وجوب ع۲ ندب۔ ع۳ تادیب ع۴ ارشاد ع۵ اباحت ع۶ تہدید ع۷ امتنان ع۸ اکرام ع۹ تعجیز ع۱۰ تسخیر ع۱۱ اہانتہ ع۱۲ تسویتہ ع۱۳ دعا ع۱۴ تمنا ع۱۵ اعتقاد ع۱۶ تکوین۔ جس طرح امر مطلق مندرجہ سولہ قسم کا ہے اسی طرح نہی بھی آٹھ معنیٰ میں مشترک ہے ع۱ حرمت ع۲ کراہت ع۳ تنزیہ ع۴ تحقیر ع۵ بیانِ عاقبتہ ع۶ ارشاد ع۷ سفقتہ ع۸ یاس۔ امر کے اصلی معنیٰ وجوب اور نہی کے اصلی معنیٰ حرمت کے ہیں لیکن کوئی قرینہ دلالت کرے تو دوسرے معنیٰ ہی مراد لیئے جاتے ہیں۔ هٰكَذَا فِي التَّوْضِيْحِ عَلَى صَحِيْفَةٍ

۴۲ بِھٰذَا الْعِبَادَۃِ۔ قَدْ یَکُوْنُ لِغَیْرِہٖ بِمَعُوْنَۃِ الْقَرَائِنِ:۔ اور یہ قانون مشہور ہے کہ جب ایک عبارت میں امر و نہی استعمال ہوں گے تو ایک ہی درجے کے ہوں گے ھٰکَذَا فِیْ کُتُبِ الْاُصُوْلِ امر کا ادنیٰ درجہ مستحب ہے اور نہی کا ادنیٰ درجہ کراہتِ تنزیہی ہے۔ لہٰذا مندرجہ حدیث شریف میں چونکہ فقہائے اسلام کے نزدیک عَلِّمُوْھُنَّ کا لفظ استحباب کے لیئے ہے اس لیئے لَا تُعَلِّمُوْھُنَّ بھی اپنے ادنیٰ درجے کراہت تنزیہی پر ہو گی۔ اس قاعدے سے ثابت ہوا کہ علی العموم ہر عورت کو کتابت سیکھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ فتاوٰی حدیثیہ صہ ۶۲ پر ہے:۔ اَنَّ النَّھْیَ عَنْہُ تَنْزِیْہًا لِمَا تَقَرَّرَ مِنَ الْمَفَاسِدِ الْمُتَرَتِّبَۃِ عَلَیْہِ۔ مکروہ تنزیہی اس لیئے ہے کہ پیش کردہ روایت کا قرینہ وجوب یا حرمت کو ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرینہ کراہت تنزیہی کو ثابت کر رہا ہے اس لیئے کہ حقوق تین قسم کے ہیں۔ ۱ حق العبد ۲ حق اللہ ۳ حق النفس۔ حق النفس میں امر اور نہی ادنیٰ درجے پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شکار کھیلنے کا امر۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان لَا تَمْشِ فِیْ نَعْلٍ وَّاحِدٍ:۔ پس حق النفس اور حق العبد کراہت تنزیہی کا قرینہ ہیں۔ چنانچہ کتاب التوضیح صہ ۲۸۴ پر ہے اَلنَّدْبُ وَالْاِبَاحَۃُ (الخ) اِنَّمَا شُرِعَ حَقًّا لِلْعَبْدِ کتابت سیکھنا حق النفس ہے کہ مردوں کے لیئے بالکل جائز ہے اور عورتوں کے لیئے مکروہ تنزیہی۔ چنانچہ فتاوٰی حدیثیہ صہ ۶۲ پر ہے:۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ حَقِّ الْوَلَدِ عَلٰی وَالِدِہٖ اَنْ یُّعَلِّمَہُ الْکِتَابَۃَ:۔ ضمیر مذکر سے پتہ لگا کہ کتابت سیکھنا صرف مردوں کا کام ہے اور عورتوں کو منع۔ کیوں کہ جس طرح مرد کو عورتوں جیسے کام منع ہیں اسی طرح عورتوں کو مردوں جیسے کام منع ہیں۔ چنانچہ شامی شریف نے ارشاد فرمایا۔ لَا یَجُوْزُ لِلنِّسَآءِ التَّشَبُّہُ بِالرِّجَالِ۔ اور چونکہ قاعدہ شرعی ہے کہ جس کام میں احتمالِ گناہ ہو وہ مکروہ تنزیہی اور جس میں گناہِ صغیر لازم ہو وہ مکروہ تحریمی۔ چنانچہ شامی علی در مختار صفحہ نمبر صہ ۲۵۴ پر ہے:۔ بِاَنَّ کُلَّ مَکْرُوْہٍ تَحْرِیْمًا مِنَ الصَّغَائِرِ:۔ اور جس کام سے گناہِ کبیرہ لازم آتا ہے وہ حرام ہے پس کتابتِ زنان چونکہ گناہِ صغیرہ و کبیرہ کا احتمال رکھتی ہے لہٰذا تنزیہًا ممنوع۔ اس لیئے اعلیٰ حضرت نے اس کو ممنوع فرمایا۔ یہ ممانعت اختیاطًا نہیں بلکہ تمام عورتوں کو ہر وقت ہر دور میں مکروہ تنزیہی ہے۔ اس لیئے کہ امر مطلق اور نہی مطلق زمانے کے تغیر سے تبدیل نہیں ہوتی۔ ہاں امر موقت اور نہی موقت تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اصول فقہ کی کتاب توضیح تلویح صہ ۲۳۶ پر ہے یا فَاِنْ کَانَ الْاَمْرُ مُطْلَقًا یَجِبُ فِیْہِ الْمُدَاوَمَۃُ:۔ یہ ممانعتِ کتابت کی حدیث نہی مطلق ہے۔ پس جب تک وجہ کراہت باقی نہی باقی۔ زید کا یہ قول بھی غلط ہے کہ یہ حدیث لَا تُعَلِّمُوْھُنَّ ضعیف ہے قطعًا غلط ... اس بارے میں بہت غیر محقق معلوم ہوتا ہے۔ یہ حدیث شریف بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ میں نے بیہقی کی روایت کے الفاظ نقل کیئے ہیں وہاں یہ الفاظ بھی موجود ہیں ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ۔ اور فتاوٰی حدیثیہ

صفحہ نمبر ص۶۲ پر ہے۔ رَوَاہُ الْحَاکِمُ وَصَحَّحَہُ الْبَیْہَقِیْ:۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ اپنی کتاب مراٰۃ۔ حصہ ششم، غیر مطبوعہ میں اس حدیث کو صحیح فرماتے ہیں۔ اور تمام محدثین ومفسرین ممانعتِ کتابتِ نسواں کی دلیل میں اسی حدیث پاک کو پیش کرتے ہیں۔ تفسیر صاوی جلد سوم ص۱۰۵ پر اور تفسیر روح البیان ص۱۱۳ پر، روح المعانی پ۱۸ ص۴۲ پر اسی حدیث کو سند بناتے ہیں۔ کسی شخص نے اس کو ضعیف نہ کہا۔ نہ کسی نے اس کو موضوع کہا۔ زید کے پاس موضوع ہونے کی کیا دلیل ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ جس حدیث سے فقہائے امت کراہت تنزیہی جیسا قانون مستنبط کریں وہ ضعیف ہو یا موضوع۔ صحیح روایت کا موضوع ہونا محال ہے لیکن اگر بالفرض امکان ضعیف ہو بھی تو کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک ہی حدیث پاک بیک وقت مختلف اسناد سے صحیح وضعیف ہو سکتی ہے اور صحت کی وجہ سے قابلِ قبول ہے۔ اسی طرح شارحین فرماتے ہیں:۔ ھٰکَذَا قَالَ حَکِیْمُ الْاُمَّۃِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ فِیْ مُصَنَّفِہٖ جَاءَ الْحَقُّ:۔

پس ثابت ہوا کہ علی العموم مطلقاً عورتوں کو لکھنا سکھانا منع ہے۔ اور ممانعت کراہت تنزیہی ہے یہی مراد اعلیٰ حضرت کے فتوے کی ہے۔ کیونکہ لفظ ممنوع مشترک ہے ہر دو کراہیت کو مگر ممانعت تنزیہی۔ تَرْکُہٗ اَوْلٰی کے معنیٰ میں مکروہ تنزیہی بھی صحیح مذہب میں ناجائز ہے۔ اسی لیے صاحب توضیح ان لوگوں کے مسلک کو غیر صحیح قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے مکروہ تنزیہی کو جائز کے زمرے میں داخل مانا ہے۔ چنانچہ توضیح صفحہ نمبر ص۲۷ پر ہے:۔ وَھٰذَا لَا یَصِحُّ عَلٰی رَأْیِھِمَا وَھُوَ اَنَّ مَا یَکُوْنُ تَرْکُہٗ اَوْلٰی مِنْ فِعْلِہٖ (الخ) لٰکِنْ یُثَابُ تَارِکُہٗ اَدْنٰی ثَوَابٍ:۔ یہ ناجائز ادنیٰ درجہ کا ہے۔ اسی ادنیٰ ہونے کی وجہ سے بعض نے مکروہ تنزیہی کو جائز مانا ہے۔ جیسا کہ شامی میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ علی العموم عورت کو لکھنا سیکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ مگر علی الخصوص کتابتِ نساء جائز ہے یعنی وہ متقیہ زاہدہ عابدہ عورتیں جن کے گناہِ متصورہ کا احتمال نہیں اور جن کی کتابت سے گناہ متصورہ محتملہ متوہمہ کا شائبہ بھی نہ ہو۔ ان کے لیے یہ علمِ کتابت بالکل جائز ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف ص۳۸۸ جلد دوم، ابوداؤد شریف صفحہ نمبر ص۵۴۲ جلد دوم مشکوٰۃ شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۳۹۰ پر اس طرح حدیث پاک مرقوم ہے:۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاھِیْمُ (الخ) عَنْ شِفَاءَ بِنْتِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا عِنْدَ حَفْصَۃَ۔

فَقَالَ لِی اَلَا تُعَلِّمِیْنَ هٰذِهٖ رُقْیَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِیْهَا الْكِتَابَةَ :۔ یعنی حضرت شفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ فرماتی ہیں کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو میں کتابت سکھا رہی تھی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو علم تعویذ اور گھریلو طریقے سکھاؤ :۔ علامہ خطابی نے فرمایا کہ عورت کو کتابت سیکھنا جائز ہے :۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شریف جلد چہارم صفحہ نمبر ص ۵۱۳ پر ہے :۔ قُلْتُ یُحْتَمَلُ اَنْ یَّكُوْنَ جَائِزًا لِلسَّلَفِ دُوْنَ الْخَلَفِ لِفَسَادِ النِّسْوَانِ فِیْ هٰذَا الزَّمَانِ :۔

اشعۃ اللمعات جلد سوم صفحہ نمبر ص ۶۵۶ :۔ پر ہے

وازین حدیث جواز آں مفہوم گردد

ونہی از کتابت محمول است برنساء عامہ است

کہ خوفِ فتنہ در آنجا متصور است وانیجا چنین نیست

فتاوٰی حدیثیہ ص ۶۲ پر اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔ وَاِنَّمَا فِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰی جَوَازِ تَعْلِیْمِهِنَّ الْكِتَابَةَ :۔ ان تمام دلائلِ قاہرہ وبراہینِ باہرہ سے ثابت ہوا کہ علی الخصوص عورتوں کو کتابت جائز علی العموم مکروہ تنزیہی۔ مگر مکروہ تنزیہی بھی اس وقت تک رہے گا۔ جب تک صرف فتنہ وگناہ کا اندیشہ ہو۔ لیکن جس عورت یا جس تعلیم گاہ اسکول وکالج یا جس دور میں ارتکاب گناہ کا یقین یا تجربہ ہو تو قانونِ شرعیہ معینہ کے تحت مکروہ تنزیہی کا حکم بدل کر مکروہ تحریمی یا حرام ہو جائے گا۔ جیسا کہ آج کل بہت سی لڑکیاں صرف کتابت کے ذریعے نامۂ وپیام وعشق بازی وارتکاب افعال حرام وخبیثہ میں مبتلا ہیں۔ :۔ هٰكَذَا قَالَ الْعَلَّامَةُ شَامِیْ فِیْ كِتَابِهٖ عُقُوْدُ رَسْمِ الْمُفْتِیْ :۔

خلاصہ یہ کہ کتابتِ نسواں کے تین حکم اگر اندیشۂ گناہِ مطلق ہو تو منع تنزیہی اگر یقین یا صدورِ گناہ صغیرہ ہو تو مکروہ تحریمی۔ اگر گناہ کبیرہ سرزد ہونے کا یقین ہو تو کتابت سکھانا حرام۔ لہٰذا عام عورت کو کتابت سکھانا مکروہ تنزیہی سکھانے والا گناہگار۔ متقیہ عابدہ عالمہ زاہدہ کو کتابت سکھانا جائز اور فاحشہ بدکارہ بدچلن کو حرام۔ جس عورت کا ماحول خراب ہو، اس کو کتابت سکھانا مکروہ تحریمی

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

پیتل تانبے کی کلائی چین باندھنے کا حکم اور احکام شریعت کتاب پر تحقیقی تبصرہ

سوال نمبر ۲ ۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ۱۔ گھڑی کا چین کلائی پر باندھنا لوہے، پیتل کی ہو یا تانبے کی جائز ہے یا حرام؟ زید کہتا ہے کہ رضوی مسلک میں چین باندھنا خواہ لوہے کی ہو یا پیتل کی یا تانبے کی حرام چنانچہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی اور صدر الشریعت مولانا امجد علی صاحب مصنف بہار شریعت، سید ابو البرکات صاحب، مفتی اعجاز ولی صاحب وغیرہ علمائے کرام کلائی والی چین لوہے، پیتل، تانبے کی حرام جانتے ہیں۔ اس لئے زید کے نزدیک بھی کلائی پر اس طرح کا چین باندھنا بالکل حرام ہے اور اس کے ساتھ نماز پڑھنا حرام۔ فرمایا جائے کہ زید کا قول درست ہے یا غلط؟ ۲۔ چند دن ہوئے ہم نے ایک رسالہ میں ایک مضمون پڑھا جس میں کوکب صاحب کی لکھی ہوئی کتاب حیاتِ سالک پر کچھ تنقیدیں تھیں۔ قابلِ فہم بات یہ ہے کہ کوکب صاحب حضرت حکیم الامت کی طرف ایک ایسی بات منسوب کرتے ہیں جس کا ذکر اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ فرمایا جائے کہ کوکب صاحب کا یہ قول درست ہے کہ احکامِ شریعت اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں۔ اور اس کے سب مسائل قابلِ غور ہیں، اور سب مسائل قابلِ عمل بغیر تحقیق نہیں، کیا واقعی یہ درست ہیں۔ جہاں تک حضرت حکیم الامت کے حکم کا تعلق ہے۔ کس شخص میں جرأت ہے جو دم مار سکے بڑے بڑے صاحبِ علم اور مخالفین آپ کے مقابلِ قلم اٹھاتے ہوئے تھراتے ہیں۔ کس میں جرأت ہے کہ آپ کے فرمودات کی تردید کر سکے۔ حضرت حکیم الامت کی وہ شخصیت ہے کہ ایک دفعہ ان کے بارے میں میرے پیر و مرشد امیرِ ملت محدث علی پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مجلس میں دورانِ گفتگو فرمایا تھا کہ مفتی احمد یار خاں کے علمی مقام کو کون پہچان سکتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان کے بعد ہماری جماعت میں ان کا کوئی مثل نہیں۔ اس لئے سوال صرف یہ ہے کہ کیا کوکب صاحب کی یہ بات درست ہے۔ کیا حضرت حکیم الامت نے احکامِ شریعت کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے اور کیا احکام شریعت میں یہ درج ہے کہ گھڑی کی چین لوہے وغیرہ دھات سے بنی ہوئی، کلائی پر باندھنا حرام ہے؟ اور کیا احکام شریعت کے بعض مسائل قابلِ عمل نہیں ہیں؟ اگر کچھ بعض ایسے مسائل ہیں تو ہمیں ان سے آگاہ کیا جائے اور یہ بھی فرمایا جائے کہ کوکب صاحب کی نسبت کرنا درست ہے یا نہیں۔ اگر حکیم الامت نے واقعی ارشاد فرمایا ہو تو اس کی وضاحت فرمائیں تاکہ پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ اور خاص طور پر امیرِ ملت کے عقیدت مندوں کا عقیدہ حضرت حکیم الامت کے متعلق ویسا ہے جو اعلیٰ حضرت کے متعلق ہے۔ حضرت حکیم الامت کی ذات بھی اہلِ سنت کا ایک عظیم سرمایہ تھا

میری طرف سے مؤدبانہ عاجزانہ سلامِ نیاز مندانہ مزارِ مقدس پر عرض کیا جائے اور استفتاء کا جواب جلد از جلد ارسال فرمایا جائے۔

مؤرخہ ۱۱/۲/۱ صوفی عبداللطیف جماعتی ملیریٹی نزد ٹینکی نمبر ۱۴

الجواب بعون العلام الوھاب

آپ کا استفتاءِ گرامی دو سوالوں پر مشتمل ہے جن کا علیحدہ علیحدہ جواب حاضر کیا جا رہا ہے۔

(۱) زید کا قول سراسر غلط ہے۔ ہرگز ہرگز رضوی مسلک یہ نہیں ہے بلکہ اعلیٰ حضرت نے بھی کسی جگہ گھڑی کی چین جو کلائی پر باندھی جاتی ہے کو حرام نہ فرمایا۔ نہ احکامِ شریعت میں اس کی حرمت ثابت ہے۔ حضرت قبلہ سید ابوالبرکات صاحب سے میری گفتگو اس مسئلہ پر ہوئی انھوں نے فرمایا کہ اب تک مجھ کو اس کی حرمت کی دلیل نہ ملی حضرت قبلہ مفتی اعجاز ولی خان صاحب سے بھی میری گفتگو ہوئی وہ اگرچہ اس کی حرمت کے قائل ہیں مگر اس مسئلہ میں مزید گفتگو یا مکالمہ کرنے کو تیار نہیں نہ انھوں نے میرے سامنے حرمت کی دلیل پیش کی۔ جس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ان کے پاس حرمت کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ ہاں بہارِ شریعت جلد ۱۶ ص ۵۱ پر گھڑی چین کی حرمت لکھی ہے مگر وہ قول بھی مفتیٰ بہ نہیں اور کوئی محقق مفتیِ اسلام اس پر فتویٰ شرعی جاری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ صاحبِ بہارِ شریعت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اس قول پر کوئی دلیل یا حوالہ پیش نہ فرمایا نہ نقلاً نہ عقلاً نہ قیاساً نہ اجماعاً۔ فقہائے کرام کے نزدیک ہر وہ قول غیر مفتیٰ بہ ہے جو بغیر دلیل نقل کر دیا جائے ایسے قول پر اس وقت تک فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک مفتیِ دین خود اپنی تحقیق اس کی تائید میں حاصل نہ کر لے۔ چنانچہ کتاب عقود رسم المفتی ص ۵ پر ہے۔ وَمِنَ الْكُتُبِ الْغَرِيبَةِ الخ۔ اَوْ لِنَقْلِ الْاَقْوَالِ الضَّعِيفَةِ (الخ) اَوْ لِلْاِخْتِصَارِ۔ قَالَ شَيْخُنَا صَالِحُ الْجِينِيُّ اَنَّهُ لَا يَجُوزُ الْاِفْتَاءُ مِنْ هٰذِهِ الْكُتُبِ اِلَّا اِذَا عُلِمَ الْمَنْقُولُ عَنْهُ وَالْاِطِّلَاعُ عَلٰى مَاٰخَذِهَا هٰكَذَا سَمِعْتُهُ مِنْهُ وَهُوَ عَلَّامَةٌ فِي الْفِقْهِ مَشْهُوْرٌ

پس چونکہ بہارِ شریعت میں بلا دلیل حرام کہا گیا ہے۔ اس لئے محققین علماء کے نزدیک ہرگز معتبر نہیں۔ بعض رضوی علماء اس بہارِ شریعت کے قول کی بنا پر ہی کلائی کی لوہے پیتل تانبے والی چین کو حرام کہہ دیتے ہیں ورنہ حرمت کی دلیل آج تک انھوں نے بھی پیش نہ فرمائی۔ زید کا رضوی مسلک کی طرف اسبات کو منسوب کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ لفظ مسلک کے معنی ہیں راستہ۔ چنانچہ لغاتِ کشوری ص ۴۵۹ پر ہے۔ مسالک جمع مسلک کی راستے راہیں اور ص ۴۶۴ پر ہے مسلک: راہ، راستہ۔ اور لغۃ المنجد ص ۳۵۸ پر ہے۔ السلک، الطریق۔ ج مسالک۔ لفظِ مسلک کا اصطلاحی و منقول شرعی معنی ہیں شریعت و طریقت کا راستہ۔ اور مسالکِ شریعت و طریقت ہر دو صرف چار چار ہیں۔ اور چہار میں سے رضویت کوئی مسلک نہیں۔ ہاں رضویت صرف ایک نسبت ہو سکتی ہے۔ شرعی نسبت۔ استادی شاگردی اور روحانی نسبت،

پیری مریدی۔ شرعی نسبت کے لحاظ سے تمام شاگرد بالواسطہ یا بلاواسطہ رضوی ہیں، اور رُوحانی نسبت سے تمام مریدین بلاواسطہ یا بالواسطہ رضوی ہیں۔ اعلیٰ حضرت سے ایک نسبت عقیدتاً ہے۔ اس اعتبار سے ہر اہلسنت بریلوی ہے۔ لہذا کسی قول کو رضوی کہنا سراسر نادانی ہے، اور نئے فساد کا دروازہ کھولنا ہے نسبت عقیدہ کے اعتبار سے تمام اہلسنت علماء بریلوی ہیں، باوجود اس کے پھر بھی بہت سے علماء اکابرین اور ہمعصر، گھڑی کی کلائی والی ہر قسم کی چین کو مطلق جائز سمجھتے ہیں خواہ لوہے کی ہو یا پیتل تانبے کی چنانچہ اکابرین علماء میں حضرت قبلہ مولٰینا نور اللہ صاحب نعیمی، حضرت قبلہ مفتی محمد حسین نعیمی، محقق اہلِ سُنت مولٰینا علی محمد صاحب بندیال، علاّمہ احمد حسن نورَی، سیّد صاحب قبلہ، علاّمہ محمود رضوی، محقق عالمِ دین حضرت مولٰینا حافظ سید علی صاحب گجراتی، شیخ المشائخ حضرت حکیم الامت۔ غرضیکہ جمہور علماء گھڑی کی چین کی حلت کے قائل ہیں۔ اس کی حرمت پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ ہاں اس کی حلت اور جواز پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ شریعت کے اصولی اور نقلی قواعد سے بھی اس کی حلت ہی ثابت ہے۔ **دلیل نمبر ۱** ؛ علمائے اصول فقہ فرماتے ہیں۔ اَلْاَصْلُ فِی الْاَشْیَاءِ الْاِبَاحَۃُ (از نور الانوار صـ ۱۱۲) یعنی ہر چیز اصل میں حلال ہے جائز ہے جبتک کہ اس پر حرمت کی دلیل نہ قائم ہو۔ اس قاعدہ کلیہ کی بناء پر حرمت کی دلیل پیش کرنی لازم ہے نہ کہ حلّت کی۔ لہذا جو لوگ کلائی کی چین کو حرام کہتے ہیں وہ یا نصِ قطعی یا قیاس کی دلیل پیش کریں۔ وہ حضرات شاید اپنے قیاس میں یہ دلیل پیش کر دیں کہ لوہے پیتل وغیرہ کی چین میں زینت ہے اور زینت مرد کو حرام ہے لہذا چین باندھنی حرام۔ یا شاید یہ کہہ دیں کہ پیتل لوہے تانبے کا زیور عورت و مرد کو حرام ہے۔ چونکہ چین بھی زیور میں داخل ہے۔ لہذا حرام۔ یا شاید یہ کہہ دیں کہ لوہے پیتل کی چین میں فضول خرچی ہے اور فضول خرچی حرام لہذا یہ چین بھی حرام۔ مگر یہ تینوں قیاس بالکل غلط ہیں۔ کیونکہ قیاس کرنا آسان نہیں۔ اور یہ تینوں قیاس مقیس علیہ سے کسی طرح بھی موافق نہیں۔ خیال رہے کہ اسلام میں دو چیزیں انتہائی مشکل ہیں نمبر ۱ کسی کو کافر ثابت کرنا نمبر ۲ حرام کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام و فقہائے عظام نے ان دونوں موقعوں پر بے شمار قیود و ضوابط و شرائط و پابندیاں مرتّب کیں چنانچہ شامی جلد سوم صـ ۲۹۳ پر ہے۔ اِذَا کَانَ فِی الْمَسْئَلَۃِ وُجُوْہٌ تُوْجِبُ الْکُفْرَ وَوَجْہٌ وَاحِدٌ یَمْنَعُہٗ فَعَلَی الْمُفْتِیْ اَنْ یَّمِیْلَ اِلَی الْوَجْہِ الَّذِیْ یَمْنَعُ التَّکْفِیْرَ ؕ ترجمہ ؛۔ اگر کسی کے قول میں بہت صورتیں کفر کی ہوں فقط ایک اسلام کی تو اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ مگر جسطرح کہ دیوبندیوں وہابیوں نے ہر مسلمان کو کافر کہنا بہت آسان سمجھ لیا ہے اسی طرح ہمارے بعض رضوی بھائیوں نے حرام کرنے کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے حالانکہ قیاساً کسی شئی کو حرام کرنے کیلیے مقیس اور مقیس علیہ میں گیارہ اشیاء کی مطابقت ضروری ہے جن میں چار شرطیں۔ چار رکن اور قیاس کی لغوی تفسیر اور شرعی تفسیر اور قیاس کا حکم۔ مگر مندرجہ بالا قیاسات میں ان میں سے کسی چیز کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ اور مزید تعجب یہ ہے کہ رضوی حضرات میں بھی بعض اسکو حرام کہتے ہیں۔ بعض مکروہ تحریمی بعض مکروہ تنزیہی۔ اور دلیل کسی کے پاس نہیں۔ پہلا قیاس اس لئے غلط ہے کہ مرد کو مطلقاً زینت

حرام نہیں بلکہ انسانی مستعملہ اشیاء کا استعمال چار طریقوں پر ہوتا ہے ۱ برائے زینتِ محضہ یہ چیزیں صرف عورت کیلئے جائز ہیں مرد کے لئے ناجائز۔ اس کو زیور اور سنگھار کہا جاتا ہے چنانچہ علامہ شامی اپنی کتاب ردالمحتار جلد سوم ص ۳۰۹ پر فرماتے ہیں اَقُوْلُ فِیْہِ نَظَرٌ لِاَنَّ الْحُلِیَّ کَمَا فِی الْقَامُوْسِ مَا یُتَزَیَّنُ بِہٖ ۔ یعنی ہر وہ چیز جس سے زینتِ محضہ حاصل ہو وہ زیور ہے۔ لہٰذا ریشم سونا چاندی سے چونکہ صرف زینت مقصود ہے اس لئے مرد کو حرام۔ اگر یہی چیزیں ضرورت کے لئے استعمال ہوں تو مرد کے لئے جائز جیسے بوقتِ جنگ ریشم اور سونے کی ناک و دانت ضرورتاً لگائی گئی تو جائز جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث وارد ہے اسی لئے عالمگیری میں ارشاد ہے کہ سیاہ سرمہ اور کاجل بلا ضرورت مرد کو لگانا ناجائز ہے۔ کہ زینتِ محضہ ہے چنانچہ ارشاد ہے ص ۳۵۹ وَیُکْرَہُ الْکُحْلُ الْاَسْوَدُ بِالْاِتِّفَاقِ اِذَا قَصَدَ بِہِ الزِّیْنَۃَ اسی طرح صاحبِ بہارِ شریعت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب جلد ۱۶ ص ۲۰۸ پر ارشاد فرمایا کاجل بقصدِ زینت مرد کو لگانا حرام ہے۔ زینت مقصود نہ ہو تو کراہت نہیں۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ زینتِ محضہ مرد کو حرام۔ زینتِ محضہ وہ ہے جہاں صرف زینت ہی مقصود ہو، ضرورت نہ ہو، استعمال کرنے کی دوسری قسم زینت مع ضرورت، یہ مرد عورت دونوں کو شرعاً جائز ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ استعمال کرنے والا یا تو بوقتِ استعمال صرف ضرورت کا ارادہ کرے زینت خود بخود ہو جائے۔ جیسے آنکھوں کی گرمی دور کرنے کیلئے کاجل لگانا یا بوقتِ جہاد ریشم پہننا یا دانتوں کی بیماری دور کرنے کیلئے سونے کا دانت لگانا وغیرہ وغیرہ۔ یا مرد بوقتِ استعمال زینت اور ضرورت دونوں کا ارادہ کرے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (الخ) پارہ ۸ ع ۔ سرمہ، تیل، خوشبو، اچھا قیمتی لباس، خوبصورت جوتا، سونے کے بٹن، چاندی کی انگوٹھی، بہتر بن عمامہ، ٹوپی سب مرد کو جائز ہیں، کیونکہ زینت مع ضرورت ہیں اگرچہ ان میں زینت ہے مگر یہ چیزیں زیور نہیں۔ اس لئے کہ زیور وہ ہوتا ہے جس میں ضرورت قطعاً نہ ہو محض زینت ہو۔ تیسری قسم استعمال کرنے کی ضرورتِ محضہ۔ یہ بھی مرد و زن ہر دو کو جائز ہیں۔ جیسے تمام ضروریاتِ زندگی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ رب العزت ہے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ استعمال کی چوتھی قسم نہ زینت نہ ضرورت، یہ تمام مرد و زن کو بالاتفاق حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ اور ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۔ جیسے تمام عیاشی کے سامان۔ پس ثابت ہوا کہ دنیاوی استعمال کے فقط چار طریقے ہی ہیں۔ ۱ زینتِ محضہ ۲ ضرورتِ محضہ ۳ زینت مع ضرورت ۴ نہ زینت نہ ضرورت۔ اسی طرح اعلیحضرت نے بھی عطایا قدیر ص ۳۳ پر استعمال کے چار درجے فرمائے۔ گھڑی کی چین مذکورہ ۳ میں شامل ہے۔ یعنی اس میں زینت بھی ہے اور یہ چین ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے کہ اس میں گھڑی کی حفاظت ہے۔ چمڑے اور کپڑے کی چین میں وہ بات نہیں۔ اُن کو گرہ کٹ کاٹ لیتا ہے۔

جیسا کہ متعدد مسافروں کو سابقہ پڑا۔ گھڑی باندھنے میں آسانی ہے۔ دوسری چین کئی دفعہ باندھتے وقت گر جاتی ہے جس سے گھڑی کو شدید نقصان پہنچ کر سینکڑوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ خود گھڑی لوہے پیتل تانبے کی بالاتفاق جائز ہے (یا للعجب) اور جائز کی حفاظت واجب ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ فقہاء کرام ہے۔ یَجِبُ حِفَاظَتُ اَمْوَالِ الْحَلَالِ تفسیر کبیر زیر آیت لَاتَاکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بِالْبَاطِلِ اسی طرح مرقوم ہے۔ سونے چاندی کی گھڑی بالاتفاق مرد و زن پر حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ گھڑی اور چین دونوں زیور نہیں ورنہ صرف گھڑی بھی مرد کو حرام ہوتی۔ جس طرح صرف ٹیکہ دھاگے سے پرو کر ماتھے پر باندھنا مرد کو مطلقاً دھات سے حرام اتفاقاً ہے۔ جب صرف لوہے کا ٹیکہ حرام ہے بوجہ زیور کے۔ تو صرف گھڑی بھی حرام ہونی چاہیئے۔ یہ کیا منطق ہے کہ چین حرام اور گھڑی جائز۔ اگر زیور ہے تو کُل زیور نہیں تو کُل۔ صرف ضد بازی سے کام نہیں چلے گا۔ دلیل سے منواؤ، ہم ماننے کیلئے تیار ہیں۔ ورنہ جانِ برادر شریعت تمہارے گھر کی چیز نہیں کہ جس طرح چاہو توڑ مروڑ لو۔ مرد کے لئے مطلق طور پر صرف سونا چاندی حرام ہے۔ وہ بھی خلافِ قیاس حرام۔ مطابق قیاس سونا و چاندی کا استعمال بھی حرام نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ اس آیت کے ماتحت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں۔ تفسیر کبیر جلد چہارم صـ۲۹۵ پر اِنَّہٗ یَتَنَاوَلُ جَمِیْعَ اَنْوَاعِ الزِّیْنَۃِ فَیَدْخُلُ تَحْتَ الزِّیْنَۃِ جَمِیْعُ اَنْوَاعِ التَّزْیِیْنِ صـ۲۹۶ پر ارشاد ہے۔ وَیَدْخُلُ تَحْتَھَا اَیْضًا اَنْوَاعُ الْحُلِیِّ لِاَنَّ کُلَّ ذٰلِکَ زِیْنَۃٌ وَلَوْلَا النَّصُّ الْوَارِدُ فِیْ تَحْرِیْمِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْاِبْرِیْسَمِ عَلَی الرِّجَالِ لَکَانَ ذٰلِکَ دَاخِلًا تَحْتَ ھٰذَا الْعُمُوْمِ حدیث پاک سنن دارمی میں مرقوم ہے کہ نبی کریم نے حضرت عثمانؓ کو تارکِ دنیا کے لباس میں دیکھ کر ایک دفعہ فرمایا اے عثمانؓ زینت ہماری سنت ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عُثْمَانُ لَا تَرْغَبْ عَنْ سُنَّتِیْ فَاِنَّ مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ وَمَاتَ قَبْلَ اَنْ یَّتُوْبَ صَرَفَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَجْھَہٗ عَنْ حَوْضِیْ۔ اس کی شرح میں علامہ رازی فرماتے ہیں۔ وَاعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْحَدِیْثَ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّ ھٰذِہِ الشَّرِیْعَۃَ الْکَامِلَۃَ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّ جَمِیْعَ اَنْوَاعِ الزِّیْنَۃِ مُبَاحٌ مَاْذُوْنٌ فِیْہِ اِلَّا مَا خَصَّہُ الدَّلِیْلُ مُقْتَضٰی ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ اَنَّ کُلَّ مَا تَزَیَّنَ الْاِنْسَانُ بِہٖ وَجَبَ اَنْ یَّکُوْنَ حَلَالًا۔ وَحَلَّ کُلُّ الْمَنَافِعِ۔ صـ۲۹۶

اِن دلائل سے ثابت ہوا کہ سونے چاندی کا زیور خلافِ قیاس حرام ہے۔ خلافِ قیاس کی تعریف یہ ہے کہ منصوص قطعی پر بتمام شرائط کسی غیر منصوص حکم کو ڈھالا جائے۔ اس غیر منصوص قیاسی حکم کے خلاف بھی کوئی اس کی حرمت یا جواز میں نص نہ آجائے۔ اسی طرح شامی جلد اوّل صـ۲۰۲ پر ہے اَلْاِسْتِحْسَانُ کَمَا قَالَ الْکَرْخِیُّ قَطْعُ الْمَسْئَلَۃِ عَنْ نَظَائِرِھَا بِمَا ھُوَ اَقْوٰی وَذٰلِکَ الْاَقْوٰی ھُوَ دَلِیْلٌ یُقَابِلُ الْقِیَاسَ الْجَلِیَّ الَّذِیْ تَسْبِقُ اِلَیْہِ اَفْھَامُ الْمُجْتَھِدِیْنَ۔ یعنی خلافِ قیاس مسئلہ قیاسی مسئلے سے قوی ہوتا ہے قیاس جلی علمائے مجتہدین کے مفہومات کو کہتے ہیں۔ اس

کے خلاف جو مسئلہ بھی قرآن یا حدیث میں آئے گا وہ خلافِ قیاس ہوگا۔ مثلاً نور الانوار صہ۲۴۷ پر مرقوم ہے جس طرح بیع سلم۔ قیاس چاہتا ہے کہ بیع سلم ناجائز ہونی چاہیئے۔ کیونکہ حدیثِ پاک میں ارشاد ہے کہ: عَنْ حَکِیْمِ ابْنِ حَزَامٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَبِیْعَ مَا لَیْسَ عِنْدِیْ۔ مشکوٰۃ شریف جلد اوّل صہ۲۴۸ یعنی معدوم کی بیع منع ہے۔ اس پر قیاس کیا بیع سلم کو تو وہ بھی ناجائز ہونی چاہیئے۔ لیکن صراحتاً دوسری حدیث پاک میں بیع سلم کو جائز فرمایا لہٰذا قیاس کے خلاف جائز ہوئی۔ اسی طرح سونے چاندی کا زیور بوجہ زینت قیاس چاہتا ہے کہ مرد کو حلال ہو۔ کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ اور ارشاد ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ مگر چونکہ صراحتاً حدیث پاک سے حرمت ثابت ہے۔ لہٰذا خلافِ قیاس سونے چاندی کا زیور مرد کو حرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حرمت کی وجہ سے پیتل تانبہ، لوہا وغیرہ کے زیور مرد کو حرام نہیں ہوئے بلکہ ان زیوروں کی حرمت دیگر احادیث سے ہے۔ اسی لیئے لوہے کی زرہ اور جنگی لباس پہننا جائز ہے۔ سونے چاندی کا منع کیونکہ خلافِ قیاس اپنے مورد پر ہی رہتا ہے۔ خلافِ قیاس شریعت میں چار قسم کا ہے۔ چنانچہ علماء اصول فرماتے ہیں وَالْاِسْتِحْسَانُ یَکُوْنُ بِالْاَثَرِ وَالْاِجْمَاعِ وَالضَّرُوْرَۃِ وَالْقِیَاسِ الْخَفِیِّ۔ نور انوار صہ۲۴۷۔ یہ سونے چاندی کی حرمت خلافِ قیاس اثری ہے۔ اس لیے اس پر گھڑی کی چین کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خلافِ قیاس پر کسی کو قیاس کرنا منع ہے۔ ھٰکَذَا قَالَ اَبِیْ حَکِیْمُ الْاُمَّتِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ فِیْ فَتَاوٰی نعیمیہ۔ اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا کہ پیتل تانبہ لوہے کی چین بالکل حرام نہیں۔ جو لوگ اس کو اندھا دھند حرام کہہ دیتے ہیں وہ بہت غلطی پر ہیں۔ عُقلآء کو چاہیئے کہ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ چین مذکورہ عورت و مرد دونوں کو بالکل جائز بلا کراہت ہے۔ ہاں سونے کی چین ہو۔ یا چاندی کی۔ عورت و مرد دونوں کو حرام ہے۔ اسی طرح سونے کی صرف گھڑی مرد و عورت دونوں کو حرام ہے۔ کیونکہ چین زیور نہیں بلکہ مستعملہ چیز ہے۔

جوازِ چین مذکورہ کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:۔

دلیل ۱:۔ جمہور علمائے کرام کا عمل مبارک بھی اجماعِ امت میں شامل ہے۔ گھڑی کی چین کے متعلق سیدی ابو البرکات قبلۂ عالم پیر طریقت کا ارشاد قول گزر گیا کہ آپ جواز کے قائل ہیں۔ ۹/۱۰ کو فخرِ اہلسنت غزالیٔ زمان حضرت قبلہ علامہ کاظمی صاحب سے میں نے سوال کیا جبکہ وہ گجرات تشریف لائے تھے تو آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ یہ لوگ خواہ مخواہ ضد باندھ لیتے ہیں۔ حقیقت دیکھی جائے تو پیتل لوہے کی چین کے حرام ہونے کی دلیل تو درکنار کراہت کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حضرت حکیم الامت کو اخیر زمانے میں میں نے خود چند دن لوہے کی چین باندھے دیکھا۔ محققین کے نزدیک عمل اور قول میں نسبت عام خاص مطلق ہے کہ ہر قول مثل عمل کے ہے مگر ہر عمل مثل قول کے نہیں۔ محدثین کا ارشاد ہے۔ اَلْقَوْلُ مِثْلُ الْعَمَلِ سند کے لیئے ان تین علمائے عظام کا قول و عمل کافی ہے۔ کیونکہ یہ حضرات رائس العلماء ہیں۔ اِنْکَا قَوْلُ قَوْلٍ

جمہور ہے۔ جس طرح کہ راس سے سارا جسم مراد ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمعصر علماءِ محققین کے اقوال وعمل ظاہر و باہر ہیں۔ میرے استادِ محترم اخی معظم قبلہ مفتی مختار احمد صاحب بھی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ ان حضرات کا قول و عمل اہلِ اصول کے نزدیک شریعتِ پاک کی دلیل ہے۔ چنانچہ نور الانوار صـ۹ پر ہے وَتَعَامُلُ النَّاسِ مُلْحِقٌ بِالْاِجْمَاعِ ۔ یعنی لوگوں کا کسی چیز پر عامل ہو جانا جواز کی دلیل ہے۔ اور اجماعِ امت میں شامل ہے۔ لوگوں سے کون سے لوگ مراد ہیں۔ اسکی وضاحت خود مصنّف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں صـ۱ اَنَّ الْمُسْتَحَبَّ مَا اَحَبَّهُ الْعُلَمَاءُ یعنی علمائے کرام کا کسی کو محبوب رکھنا شئی کو مستحب بنا دیتا ہے۔ پس گھڑی کی چین مذکورہ بالا جمہور علماء کے نزدیک محبوب ہے، لہٰذا باندھنا مستحب ہوا۔ دلیل نمبر ۲ ۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مصنّفہ اَلطَّیِّبُ الْوَجِیْز میں ارشاد فرماتے ہیں صـ۱۲ مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ "اگر پہننے کے مشابہ نہ ٹھہرے تو نہ اس میں حرج نہ نماز میں کراہت"۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اسی طرف ناظر کہ یہ پہننے کے مشابہ نہیں۔ مگر فقیر کو اس میں تامّل ہے۔ اور وہ خود بھی اس پر جزم نہیں رکھتے اور اُسے لکھ کر تامّل کا حکم فرماتے ہیں۔ تو بہتر اس سے احتراز ہی ہے واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔ اس عبارت سے بالوضاحت ثابت ہوا کہ چین باندھنا نہ حرام نہ مکروہ تحریمی۔ بلکہ اعلیٰحضرت کے نزدیک خلاف بہتر ہے۔ بہتر بمعنیٰ مندوب ہے۔ لفظ مندوب و مستحب مرادف ہیں پس مجدد صاحب علیہ الرحمۃ کا یہ ارشاد کہ بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ یعنی مستحب اس سے احتراز ہی ہے اور قانونِ شریعت میں ترکِ مندوب و مستحب مکروہ تنزیہی بھی نہیں چہ جائیکہ حرام ہو۔ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں فَاَمَّا الْمُسْتَحَبُّ وَالْمَنْدُوْبُ فَیَنْبَغِیْ اَنْ لَّا یُکْرَہَ تَرْکُہٗ اَصْلًا (الخ) فَلَمْ یَلْزَمْ مِنْ تَرْکِ الْمُسْتَحَبِّ ثُبُوْتُ الْکَرَاهَةِ۔ (ردّ المحتار جلد اول صـ۶۱۱) ثابت ہوا کہ گھڑی کی چین باندھنا بلا کراہت اعلیٰ حضرت کے نزدیک جائز ہے۔ ہاں بوجہ گمانِ تشبّہ احتراز بہتر ہے۔ بعض رضوی حضرات بہتر بمعنیٰ اولیٰ کرتے ہیں اور اولیٰ بمعنیٰ واجب لاتے ہیں۔ اور دلیل میں اعلیٰ حضرت مجددِ ملّت کا قول طیّبہ پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فتاویٰ رضویہ جلد اوّل صـ۸۴۸ حاشیہ ف۲ پر فرمایا۔ قَدْ یُطْلَقُ الْاَوْلٰی عَلَی الْوَاجِبِ بَلْ عَلَی الْفَرْضِ۔ یہ دلیل انتہائی کمزور ہے۔ بلکہ اپنے پیش کنندہ کے غیر محقق ہونے پر دال ہے۔ اس کی وجہ کمزوری دو طریق پر ہے ۱ـ وجہ الزامی۔ اسی صفحہ پر حاشیہ ف۳ وجوب کے معنیٰ بھی دو کئے گئے ہیں۔ تاکید اور مجرّد ثبوت۔ چنانچہ ارشاد ہے قَدْ یُطْلَقُ الْوُجُوْبُ بِمَعْنَی التَّاکُّدِ بَلْ مُجَرَّدِ الثُّبُوْتِ ۔ تو کیا کوئی رضوی کسی واجب کو سنّتِ مؤکّدہ کہہ سکتا ہے۔ اور کیا اعلیٰ حضرت کے اس قول کے مطابق وتر یا عیدین کو بجائے واجب سنّت مؤکّدہ کہہ سکتا ہے۔ جس طرح واجب سے مؤکّدہ مراد ہو سکتی ہے مگر کسی قرینے سے اسی طرح اولیٰ سے واجب مراد ہو سکتا ہے مگر کسی قرینے سے ۲ـ وجہ تحقیقی یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا قَدْ یُطْلَقُ اور حرف قَدْ عِنْدَ النُّحَاةِ لِلتَّقْلِیْلِ ۔ تو مطلب یہ ہوا کہ بہت کم ایسا ہوتا

ہے کہ لفظِ اولیٰ واجب یا فرض کے معنیٰ میں ہو۔ واضح رہے کہ لفظِ اولیٰ مشترک ہے اس کے چھ معنیٰ ہیں۔ ایک معنیٰ حقیقی باقی معنیٰ مجازی۔ حقیقی معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا ترک مکروہ تنزیہی ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے ارشاد فرمایا جلد اوّل ص۲۱۱ فَكُلُّ مَكْرُوْهٍ تَنْزِيْهًا خِلَافُ الْاَوْلٰى اَذَانُ صَبِيٍّ مُرَاهِقٍ مَكْرُوْهٌ تَنْزِيْهًا لِاَنَّ غَيْرَهُمْ اَوْلٰى مِنْهُمْ ۔۔

اشارۃً ثابت ہوا کہ خلافِ اولیٰ مکروہ تنزیہی ہے عقود رسم المفتی ص۲۹ پر ارشاد ہے وَظَاهِرُ كَلَامِ فَخْرِ الْاِسْلَامِ اَنَّهٗ الْاَوْلَوِيَّةُ حَتّٰى يَجُوْزَ الْعَمَلُ بِهٖ یعنی فخر الاسلام کے نزدیک قولِ راجح پر عمل کرنا اولیٰ مگر مرجوح پر عمل بھی جائز ہے یہاں اولیٰ بمعنی مستحب ثابت ہوئے اولیٰ کے تیسرے معنیٰ مندوب۔ چنانچہ شامی میں ہے وَلَا شَكَّ اَنَّ تَرْكَ الْمَنْدُوْبِ وَالْمُسْتَحَبِّ خِلَافُ الْاَوْلٰى ۔ اولیٰ کے چوتھے معنیٰ قریب چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ بخاری شریف جلد اوّل ص۴۹ اور مشکوٰۃ شریف ص۸۶ پر ہے عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلٰوةً (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)۔ اولیٰ کے پانچویں معنیٰ اور چھٹے معنیٰ وہ ہی ہیں جو اعلیٰ حضرت نے بلفظ قَدْ يُطْلَقُ سے ارشاد فرمائے۔ ثابت ہوا کہ اولیٰ لفظِ مشترک ہے۔ حقیقی معنیٰ ہوتے ہوئے بغیر قرینے مجازی معنیٰ مراد لینا اہلِ اصول کے نزدیک غلط ہے۔ پس کتنی جلد بازی ہے کہ بلا سوچے سمجھے اپنی بات رکھنے کیلئے اعلیٰحضرت کے کلام پاک کی تحریف کرتے ہوئے بہتر کے معنیٰ اولیٰ کیسے جائیں اور اولیٰ کو وجوب میں ڈھال دیا جائے۔ بہتر کا لفظ ہماری اصطلاح میں مستحب کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ رضوی بزرگ نے اپنی اصطلاح پر بھی غور نہ فرمایا اِمَّا تَجْهَلُ عَنْ لِسَانِ قَوْمِكَ اصطلاحاً کلامِ امام علیہ الرحمۃ کا مفہوم وہی ہے جیسے فقہاء فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ کی صبح صاحبِ قربانی قبل قربانی کوئی چیز کھا سکتا ہے مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ بعینہٖ یہی مقصود کلامِ امام سے ہے کہ گھڑی کی مذکورہ چین جائز ہے نہ حرام نہ مکروہ مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے فقط ایک شبہ کے گمان پر۔ واضح رہے کہ احتراز و ترک عند البعض مرادف ہیں۔ احتراز کی تین قسمیں ہیں ۱ احترازِ لازم ۲ احترازِ بہتر ۳ احترازِ جائز۔ حرام چیز سے احتراز لازم ہے چنانچہ خود اعلیٰ حضرت نے اپنے ملفوظ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کراچی جلد سوم ص۱۵ پر فرمایا۔ عرض، اگر وہابی سے نکاح پڑھا جائے تو ہو جائے گا یا نہیں۔ ارشاد، چونکہ وہابی سے پڑھوانے میں اس کی تعظیم ہوتی ہے جو حرام ہے لہٰذا احتراز لازم ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر گھڑی کی چین باندھنا حرام ہوتا تو اعلیٰحضرت بہتر اس سے احتراز نہ فرماتے بلکہ فرماتے کہ لازم اس سے احتراز ہی ہے۔ جس طرح صاحبِ قربانی بقرعید کا چاند دیکھ کر بال ناخن کٹا سکتا ہے مگر بہتر اس سے احتراز ہی ہے۔ فقط ایک مشابہت کے خیال کی بناء پر ۳ قانونِ شریعت کے مطابق ضرورتِ مطلقہ کے وقت وہ چیز بھی جائز ہو جاتی ہے جس کو قیاسِ مجتہدین و علمائے کرام نے حرام بل اشدّ حرام کیا ہو چنانچہ

نورالانوار صفحہ ۲۴۷ پر ہے وَتَطْهِيرُ الْأَوَانِي مِثَالٌ لِلِاسْتِحْسَانِ بِالضَّرُورَةِ فَإِنَّ الْقِيَاسَ يَقْتَضِي عَدَمَ تَطَهُّرِهَا إِذَا تَنَجَّسَتْ لِأَنَّهُ لَا يُمْكِنُ عَصْرُهَا حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْهَا النَّجَاسَةُ۔ لٰكِنِ اسْتَحْسَنَّا فِي تَطْهِيرِهَا لِضَرُورَةِ الْإِبْتِلَاءِ بِهَا۔ وَالْحَرَجِ فِي تَنْجِيسِهَا۔ یعنی ناپاک برتن کا پانی سے دھل کر پاک ہوجانا قیاس کے خلاف ہے۔ کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ناپاک شئے سے پاک لگا تو خود ناپاک ہوگیا (مثل اشیاء) اور برتن نچوڑا نہیں جاسکتا کہ اس سے پانی نکالا جائے تو برتن موصوف بجائے پاک ہونے کے بدرجۂ اتم ناپاک ہوگیا اور ناپاک شئے کا کھانے پینے وغیرہ کے لئے استعمال کرنا اشد حرام ہے۔ مگر دنیوی حاجت کیلئے اتنے بڑے قیاس کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ قیاس نہ آیتِ قرآنی کی وجہ سے چھوڑا نہ حدیثِ پاک کی وجہ سے۔ نہ قول مجتہد فی الاصول۔ نہ قیاسِ خفی کی وجہ سے بلکہ محض دنیوی ضروریات زندگی کی وجہ سے۔ ثابت ہوا کہ ضرورتِ دنیاوی کی وجہ سے قیاساً حرام چیز کا استعمال کرنا بھی جائز بلکہ لازم ہے اور قیاس یکسر چھوڑ دیا جائے گا۔ تو اعلیٰ حضرت کا قیاس فقط احتراز مستحب کا ہی ہے یہ بھی گھڑی کی حفاظت اور گرہ کٹوں کی زد سے بچانے کیلئے چھوڑا جائے گا بلکہ خود اعلیٰ حضرت بھی اگر اس کسمپرسی کے دور کو دیکھتے تو اپنے قیاسِ احتراز سے احتراز فرما لیتے۔ میں عالمِ اہلسنت ہونے کی حیثیت سے اعلیٰحضرت کا نائب ہوں۔ نائب کا کام اصل کا ہی کام ہے۔ پس میرا ان دلائل کے ماتحت گھڑی کی چین از قسم تانبہ پیتل لوہا سٹیل رولڈ گولڈ کو جائز قرار دینا اعلیٰحضرت ہی کا جائز فرمانا ہے۔ لہٰذا کسی رضوی بھائی کو حق نہیں پہنچتا کہ بغیر دلائل و تحقیق اس فتویٰ کی محض ضد سے تردید کرے۔ ہاں اس سے زیادہ مضبوط دلائل و تحقیق کی بناء پر تردید جائز ہے کہ بَحْثُ الْحَقِّ لِحِكْمَةٍ

دلیل ۴ :۔ علامہ سید محمد امین معروف ابن عابدین شامی جو اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے روحانی استادِ محترم ہیں۔ جیسا کہ خود اعلیٰحضرت مولینا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے ثابت ہے چنانچہ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ صفحہ ۱۶ نمبر اعلیٰحضرت صفر کا مہینہ ۱۳۹۳ھ پر خود اعلیٰحضرت کا ارشاد منقول ہے۔ فرمایا کہ میں نے فقہ علامہ شامی سے سیکھا۔ بحمدہٖ تعالیٰ علامہ شامی کا مقام اس وقت فقہ میں بہت بلند ہے۔ آپ کا درجہ مجتہدین فی التصحیح کی صف میں ہے۔ آپ کے نزدیک بھی گھڑی کی چین مذکورہ باندھنا حرام نہیں چنانچہ شامی جلد پنجم صفحہ ۱۳ پر ارشاد ہے۔ يَعْنِي الْكَلَامَ فِي بَنْدِ السَّاعَةِ الَّذِي تُرْبَطُ بِهِ وَيُعَلِّقُهُ الرَّجُلُ بِزِرِّ ثَوْبِهِ وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ كَبَنْدِ السُّبْحَةِ الَّذِي تُرْبَطُ بِهِ فَتَأَمَّلْ۔ یعنی وہ چین جس سے گھڑی باندھی جاتی ہے۔ اور معلق کی جاتی ہے۔ وہ چین مثل تسبیح کے ڈورے کے ہے۔ کہ جس طرح تسبیح کا ڈورا ریشمی ہو تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر چین کلائی والی ریشم کی ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ خیال رہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں ریشم صرف پہننا حرام ہے۔ باقی ہر طرح استعمال جائز ہے۔ ریشم کے رومال میں مٹھائی رکھ کر کھا سکتا ہے۔ اس کے مصلے پر نماز پڑھ سکتا ہے۔ تو اس کی چین بھی بدرجۂ اولیٰ باندھ سکتا ہے۔ اسی لئے اس کو علامہ شامی نے تسبیح کی چین سے مشابہ کیا اور تسبیح کی ڈوری چین تو جائز۔ چنانچہ

شامی جلد پنجم صفحہ ۳۱ پر مرقوم ہے قُلْتُ وَمِنْهُ يُعْلَمُ حُكْمُ مَا كَثُرَ السُّؤَالُ عَنْهُ مِنْ بُنْدِ السُّبْحَةِ فَلْيُحْفَظْ ثابت ہوا کہ اگر وہی ریشم کی چین والی تسبیح اگر کوئی گلے میں ڈالے یا کلائی پر لپیٹے تو جائز ہوگا۔ اسی طرح پیتل تانبے کی چین بھی کلائی پر جائز ہوگی نہ حرام نہ مکروہ تحریمی۔ بعض حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ شامی اور اعلیٰحضرت کا فرمان گھڑی کی جیبی زنجیر کے متعلق ہے نہ کہ کلائی چین کے متعلق تو اُن کے اقوال کو حلّتِ چینِ متنازعہ فیہ پر دلیل کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے دو طرح جواب ہو سکتے ہیں ۱۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ پھر تو آپ کا مدعا بھی حاصل نہ ہوا اور اعلیٰحضرت کے قولِ طیّبہ کو حرمت پر بھی دلیل نہیں بنا سکتے اور کوئی رضوی ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اعلیٰحضرت نے مذکورہ کلائی چین کو حرام کہا ہے۔ یا احتراز کا حکم دیا ہے۔ اور نہ ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت حصّہ سوم صفحہ ۱۹ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کی عبارت پیش کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی جیبی چین کے متعلق ہے۔ پس اس طریقے پر کہیں ثابت نہیں کہ اعلیٰ حضرت نے کلائی کی چین کو حرام کہا ہو نہ ہی احکامِ شریعت حصّہ دوم ملفوظ ۶۲ کو سند میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی گھڑی کی زنجیر کے متعلق ہے نہ کہ چین کے۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ علامہ شامی کے اقوالِ طیّبہ طاہرہ کا دار و مدار پہننے اور نہ پہننے پر ہے۔ لہٰذا جو چیز بھی پہننے میں آئے گی اس کی حرمت ظاہر ہوگی۔ اعلیٰحضرت کے اقوال بھی اسی پر دال ہیں اور آپ بھی چین کو پہننا نہیں مانتے بلکہ ایک شبہہ ہے تو چونکہ ہر دو بزرگ پہننے، نہ پہننے پر حرمت و حلّت کا مدار رکھتے ہیں اور یہ پہننا ظاہر ہے کہ جیبی گھڑی کی زنجیر میں قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس میں تامّل بیکار۔ پس ثابت ہوا کہ چین ہی مراد ہے۔ اور وہی پہننے کے قریب ہو سکتی ہے۔ اسی میں تامّل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الطیب الوجیز کے سوال میں گھڑی کی چین کے متعلق ہی گفتگو ہے۔ اور اعلیٰحضرت نے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ شامی کی عبارت پیش کی ہے۔ جب سوال میں زنجیر کا ذکر نہیں تو جواب میں زنجیر کا ذکر کیوں۔ ثابت ہوا کہ ہر دو حکم میں برابر ہیں۔ اور تامّل تحقیق کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس سے حرمت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پس اِن دلائلِ قاہرہ و براہینِ باہرہ سے ثابت ہوا کہ کلائی کی مذکورہ چین بالکل حلال و جائز ہے۔ علامہ شامی نے جائز قرار دیا اور اعلیٰحضرت نے کہیں حرام نہ فرمایا۔

سائلِ محترم کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے۔ آپ کے سوال کے بعد میں نے احکامِ شریعت مطبوعہ نعیمی کتب خانہ ہر حصص کا بغور مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقعتاً یہ کتاب اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں بلکہ از قسم ملفوظات ہیں جن کو ایک جگہ تحریر میں لایا گیا۔ لہٰذا اس کو ملفوظاتِ اعلیٰحضرت تو کہہ سکتے ہیں مگر اعلیٰ حضرت کی تصنیفات کی صف میں اس کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ عربی زبان میں کسی کلام کو لکھنے کیلئے سات الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ۱۔ تحریر ۲۔ تصنیف ۳۔ تالیف ۴۔ تشریح ۵۔ تفسیر ۶۔ کتابت ۷۔ ترقیم۔ یہ چھ سات الفاظ اگرچہ اردو میں ان سب کا ترجمہ لکھنا ہی کیا جائے گا مگر عربی لغت میں ان میں عظیم تفریق

ہیں۔ چنانچہ ۱۔ تحریر کے معنیٰ ہیں خوشخط لکھنا لکھنے والا خواہ عالم ہو یا غیر عالم سمجھ کر لکھے یا بغیر سمجھے اپنا کلام ہو یا غیر کا۔ چنانچہ لغات منجد ص ۱۱۹ پر ہے حَرَّرَ الْكِتَابَ حَسَّنَهُ وَأَصْلَحَهُ۔ هٰكَذَا فِيْ لُغَاتِ كشورى۔

۲۔ تصنیف وہ عبارت جو ذہنی خیالات کو ترتیب دے کر زیرِ قلم لائی جائے خواہ اپنے ہاتھ سے لکھے یا لفظ بہ لفظ اپنے سامنے لکھوائے۔ چنانچہ لغاتِ قلوس اور منجد ص ۴۵۲ پر ہے صَنَّفَ۔ اَلْكِتَابَ۔ اَلَّفَهُ وَرَتَّبَهُ۔

۳۔ تالیف مختلف مضامین کو ایک جگہ جمع کر دینا۔ اپنے خیال کا یا اپنے الفاظ کا اس میں دخل نہ ہو دوسروں کی عبارات ایک جگہ ترتیب وار جمع کرنا یا کسی کے لفظ سن کر اسی ترتیب سے لکھنا جس طرح اس نے بولے تھے۔ اپنی ذہنی یادداشت سے اس کو ایک جگہ جمع کر دینا۔ اپنی عبارت کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسروں کی عبارات ایک جگہ جمع کر کے لکھنا۔ چنانچہ لغات کشوری ص ۹۱ و پر المنجد ص ۱۳ پر اَلَّفَ الْكِتَابَ جَمَعَهُ وَصَلَ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ۔ لغات حمیری ص ۱۰۰ اَلْمُؤَلِّفُ رَجُلُ الَّذِيْ جَمَعَ مَسَائِلَ الْكُتُبِ الْمُخْتَلِفَةِ اَوِ الْفَاظَ الرِّجَالِ الْمُخْتَلِفَةِ عَلَى التَّرْتِيْبِ۔

۴۔ تشریح۔ کوئی عالم کسی دوسرے شخص کے کلام کی پوری وضاحت کرے اور پوشیدہ مسئلہ اس طرح کھول کر صاف صاف لکھے کہ پوشیدگی دور ہو جائے۔ اور علم کے زور سے اپنے ہی لفظوں کو لکھے۔ چنانچہ منجد عربی ص ۳۹۳ پر ہے۔ شَرَحَ۔ شَرْحًا۔ اَلْمَسْئَلَةَ كَشَفَ غَامِضَهَا وَبَيَّنَهَا۔ اَلْكَلَامَ فَهِمَهُ۔ د۔ لغاتِ کشوری ص ۱۰۱ پر ہے۔ تشریح عربی لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ شرح کرنا۔ کھولنا۔ کُل حال بیان کرنا۔

۵۔ تفسیر۔ ربّ تعالیٰ کے کلام کے مطالب بیان کرنا اور مختلف قواعدِ عقلیہ و فرموداتِ نقلیہ کے مطابق کوئی عالم اپنے لفظوں میں حروفِ قرآنِ کریم کی وضاحت کرے۔ چنانچہ لغات کشوری ص ۱۰۹ پر ہے۔ تفسیر۔ بیان کرنا۔ اور کلامِ خدا کی شرح کرنا۔ المنجد ص ۶۱۳ فَسَّرَ الْاَمْرَ اَوْضَحَهُ وَبَيَّنَهُ

۶۔ کتابت۔ کسی جگہ کوئی شخص اپنے ہاتھ یا قلم سے حروف ہجاء مفرد یا مرکب کے نقوش بنائے۔ چنانچہ المنجد ص ۱۷ اور تاج العروس ص ۱۰۰ پر ہے۔ كَتَبَ الْكِتَابَ صَوَّرَ فِيْهِ اللَّفْظَ بِحُرُوْفِ الْهِجَاءِ اس کے معنیٰ مضبوط نقش ڈالنا بھی جیسے پتھر پر یا پکی سیاہی سے کاغذ پر جو مٹ نہ سکے۔ اسی لئے فرض کو بھی مکتوب کہا گیا ہے کہ وہ حکم منسوخ نہیں ہو سکتا۔

۷۔ ترقیم کے معنیٰ لکھنا۔ چنانچہ لغاتِ کشوری ص ۹۸ پر ہے۔ ترقیم۔ ع۔ لکھنا۔ رقم کرنا۔ یعنی لکھنے میں زبان کی طرز کا خیال رکھنا۔ عربی لکھنی ہو تو مکمل زیر زبر۔ پیش۔ شد۔ مد لگا کر خوبصورت بنا کر لکھا جائے۔ خواہ کسی کا مضمون ہو یا اپنا۔ چنانچہ منجد ص ۲۷۸ پر رَقَمَ كَتَبَ الْكِتَابَ بَيَّنَهُ وَاَعْجَمَهُ بِوَضْعِ النُّقَطِ وَالْحَرَكَاتِ وَغَيْرِ ذَالِكَ

صاحبِ تحریر محرّر کہلاتا ہے۔ اور صاحبِ تصنیف مصنّف کہلاتا ہے اور صاحبِ تالیف مؤلِف کہلاتا ہے تشریح کرنے والا شارح کہلاتا ہے۔ تفسیر والے کو مفسّر کہا جاتا ہے۔ صاحب کتابت کو کاتب صاحبِ ترقیم کا نام راقم ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت اپنے تمام ملفوظات کے نہ محرّر ہیں نہ مصنّف نہ مؤلّف ہو سکتے

ہیں نہ شارح نہ مفسر کہلا سکتے ہیں نہ کاتب نہ راقم الحروف۔ کیونکہ ان الفاظِ مذکورہ کی نسبتیں جداگانہ ہیں، چنانچہ لفظ تحریر، ترقیم، کتابت و تصنیف میں نسبت تساوی ہے۔ اور تصنیف تالیف، تشریح میں نسبت تباین ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی کلام کتابت بھی ہو تحریر بھی ہو ترقیم۔ اور تصنیف بھی یا ایک ہی عبارت کا ایک شخص محرر ہو، دوسرا کاتب تیسرا راقم۔ چوتھا مصنف یا ایک ہی شخص محرر بھی ہو، کاتب بھی، راقم بھی، مصنف بھی۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی عبارت کا ایک ہی شخص مصنف مؤلف اور شارح بھی ہو۔ یا ایک شخص مصنف ہو، اور دوسرا مؤلف تیسرا شارح ہو۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب سمجھنا چاہیئے کہ اعلیٰحضرت کسی ملفوظات کے مصنف و مؤلف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ آپ محض لافظ ہیں خواہ وہ احکام شریعت ہو۔ یا مجموعۂ ملفوظات چار حصے بلکہ آپ تو محرر کاتب راقم بھی نہیں۔ جس طرح کہ تمام احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہ نبی کریم رؤف الرحیم کسی حدیث مبارک کے مصنف، مؤلف، شارح یا محرر، راقم وغیرہ نہیں اسی طرح احکام شریعت وغیرہ اعلیٰحضرت کی تالیف و تصنیف وغیرہ نہیں۔ بلکہ احکامِ شریعت، کا مؤلف سید شوکت علی ہے۔ اس کو مخالفوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ رسالہ فیض رضا ص۱۷ اکتوبر نومبر ۱۹۷۲ء پر اس طرح درج ہے۔ احکام شریعت ضرور امام اہلِ سنت اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ اس کے جامع سید شوکت علی صاحب ہیں (الخ) اور یہی رسالہ ماہِ اگست ۱۹۷۲ء سید شوکت علی کو مؤلفِ احکام شریعت کا لقب دیتا ہے۔ اسی طرح تمام مکتبوں کی فہرستیں بھی ان کو مؤلفِ احکام شریعت کہتے ہیں۔ اور دیگر ملفوظات کے مؤلف مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب (مفتیٔ اعظم ہند) ہیں۔ شاید کوئی لاڈلا بیوقوف یہ بھی کہہ دے کہ احکامِ شریعت اس لئے اعلیٰحضرت کی تصنیف ہے کہ وہ آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ فتویٰ بھی ملفوظ ہو سکتا ہے فتوٰے کیلئے تحریر یا تصنیف وغیرہ شرط نہیں۔ جس طرح کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ مندرجہ تمام دلائل سے بالوضاحت ثابت ہو گیا کہ احکامِ شریعت اور حضرت قبلۂ عالم مفتیٔ اعظم کی مذکورہ تالیف اعلیٰحضرت کے محض ملفوظات ہیں۔ اور ملفوظات کیلئے قاعدۂ کلیہ مسلّمہ ہے کہ جو ملفوظات اپنے کانوں سے نہ سنے ہوں بلکہ کسی واسطے سے مسموع ہوں۔ وہ تمام کلام محققین مجتہدین علماء فقہاء کے نزدیک قابلِ غور ہوتے ہیں اگرچہ وہ ملفوظ عالم کے ہوں۔ یا مجتہد کے یا ولی اللہ غوث قطب کے بلکہ صحابی بلکہ نبی۔ یا خود داتائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظ ہوں۔ چنانچہ دیکھئے علامہ ابن جوزی کی کتاب اصولِ حدیث ص۱۶۲۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کرام۔ احادیث رسول اللہ میں خوب غور و خوض کر کے ملفوظات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اڑتیس ۳۸ اقسام فرماتے ہیں۔ اور خبرِ واحد کو ہر مقام پر اس حد تک قابلِ غور بناتے ہیں کہ قیاسِ مجتہد کے مقابل ترک کر دیتے ہیں۔ فرمایئے اگر ملفوظات قابلِ غور نہ ہوتے تو حدیثِ پاک کی اتنی قسمیں کیوں ہو جاتیں جب نبی کریم

کے ملفوظاتِ مقدسہ کو محدثین قابلِ غور فرماتے ہیں تو اعلیٰحضرت کے ملفوظ کیوں قابلِ غور نہ ہوں گے اور ان کو قابلِ غور کہنے سے کون سی قیامت ڈھ جائے گی حالانکہ احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات بھی کئی واسطوں سے مسموع ہیں۔ صحابہ کرام اور محدثین بھی اُن ہی احادیث میں جرح کرتے ہیں جو خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ طیبہ سے نہ سنیں ہوں۔ ورنہ جو ملفوظِ پاک خود پیارے آقا کی زبان مبارک سے سنے ہوں وہ تو قرآنِ پاک کا درجہ رکھتے ہیں اسی کو حدیثِ متواتر کہتے ہیں۔ بلا تشبیہ یوں ہی سمجھ لو کہ جو باتیں مولانا احمد رضا خاں علیہ رحمۃ کے دہانِ مبارک سے سنیں وہ بدرجۂ اتم قابلِ غور ہوں گی اور کوئی محقق اُن کے مطابق بغیر تحقیق فتویٰ نہیں دے سکتا۔ بلکہ جب کسی دوسرے مصنفِ محقق کی کتاب یا علماء متبحر کے قیاس میں اُس کا خلاف ہو گا۔ تو ملفوظ کو ترک کر دیا جائے گا اور دیگر تصنیف یا قیاس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ یہ میرا ہی قول نہیں بلکہ خود ملفوظات اعلیٰحضرت کے مؤلف مولانا مصطفیٰ رضا خان کا بھی یہ عمل ہے۔ چنانچہ اپنے مؤلفہ میں بہت جگہ اصل ملفوظات کو غیر معتبر غیر مفتابہ قرار دیتے ہوئے ملفوظ کی اشارۃً تردید کرتے ہیں یہ وہی ملفوظ ہیں جو خود اپنے کانوں سے مجلس اعلیٰحضرت میں نہ سنے۔ بلکہ کسی کی روایت نقل کی اور کسی کی زبانی یہ سُنا کہ اعلیٰحضرت نے اس طرح فرمایا تو اس پر مفتیٔ اعظم مؤلف نے غور کیا جب اس کو خلاف نقل پایا تو تردید کر دی جیساکہ آگے بیان کروں گا واللہ اعلم بالصواب۔ مسئلہ یہیں پر واضح ہو جاتا ہے مگر سائل کے سوال کے مطابق اُن مسائل کی نشاندہی ضروری ہے۔ جو قابلِ غور ہیں اور سائل نے اگرچہ صرف احکامِ شریعت کے متعلق سوال کیا ہے۔ مگر میری نظر میں چونکہ احکامِ شریعت اور دیگر ملفوظات ایک ہی درجے کے ہیں اس لئے سب پر نشان دہی کی جاتی ہے دیگر ملفوظات چونکہ مفتیٔ اعظم کی ہی تالیف ہے اور انھوں نے خود تالیف کرتے ہوئے تحقیق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اسلئے اِن میں خود حضرت مؤلف کی ہی تنقیدات پیش کروں گا۔ اور احکامِ شریعت کا مؤلف سید شوکت علی ایک غیر عالم شخص تھا اس لئے اس پر ایں اپنی تنقید درج کروں گا۔ خیال رہے کہ ملفوظات ایک آدمی جمع نہیں کرتا بلکہ جب کسی کی باتیں تالیف کرنے کا ارادہ ہوتا ہے تو یہ مرید بہت سے احباب کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ جب کبھی فلاں بزرگ کسی جگہ کوئی بات از قسم مسائل وغیرہ بات کریں تو وہ بات مجھ کو بتا دو۔ پس یہ احباب تمام گفتگو لکھ کر یا زبانی مؤلف کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ مؤلف اگر خود عالم ہو تو چھان بین اور تحقیق کر کے اپنے پاس گفتگو جمع کرتا رہتا ہے اگر غیر عالم ہو تو بغیر تحقیق جمع کرتا رہتا ہے۔ اب مؤلف کے پاس اس بزرگ کی کچھ خود مسموعی اور کچھ بالواسطہ مسموعی باتیں جمع ہو جاتی ہیں جن کو شائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ تجربہ شدہ بات ہے۔ اسی طرح خود مَیں نے بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظ جمع کئے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ اور اسی طرح اعلیٰحضرت کے ملفوظات جمع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملفوظات کو جمع کرنے والے بہت احباب ہیں۔ ۱؎ مفتیٔ اعظم مصطفیٰ رضا خان۔

۲۔ سید شوکت علی ۳۔ سید ایوب شاہ صاحب، ان کی زیارت سے میں بھی مشرف ہوا ہوں اور میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا بھی تھا کہ مَیں اعلیٰحضرت کے پیچھے بیٹھ کر آپ کی باتیں لکھا کرتا تھا۔ ادب کی وجہ سے۔ اور مجلس کی تمام گفتگو زیرِ تحریر لایا کرتا تھا۔ اَور بھی بہت سے احباب جامع ملفوظ ہوں گے۔ یہ ملاقات لائلپور میں شیخ الحدیث کے اس آخری جلسے میں ہوئی تھی جس میں شیخ الحدیث علیہ الرحمتہ نے صاحبزادہ فضل رسول کے سر پر خلافت وکفالت ونیابت کی دستار باندھی تھی۔ مؤلف ملفوظ اگر عالم دین ہو اور عدل وانصاف سے محققانہ حیثیت سے تالیف کرے، تو اس کے مؤلفہ ملفوظات قابلِ غور نہیں رہتے کیونکہ یا تو مؤلف خود ہی بالواسطہ مسموع ناقابلِ عمل ملفوظ کاٹ دیتا ہے یا اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ جس طرح بہت جگہ مفتیٔ اعظم نے کیا۔ پس نتیجہ نکلا کہ قابلِ غور وہ مسائل ہوتے ہیں۔ جو غیر عالم نے اعلیٰحضرت وغیرہ سے سنے۔ کچھ بھولا کچھ یاد رکھا۔ کچھ کمی کچھ زیادتی سے درج کر دیا۔ اس چشم پوشی کی وجہ سے مسئلہ قابلِ غور اور بغیر تحقیق ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ تحقیق بھی علماءِ متبحّرین کا کام ہے۔ نہ کہ عوام کا۔ عوام کو حق نہیں پہنچتا کہ بلاوجہ کسی کی تالیف کو ہدفِ تنقید بنائیں یا کسی علماء کے قول کے مقابل اِس ہی ملفوظ پر اڑ جائیں بلکہ مَیں تو یہ کہتا ہوں، کہ احکامِ شریعت کی وہ عبارت جو قابلِ غور ہے اعلیٰحضرت کی ہے ہی نہیں۔ یا تو خود ساختہ ہے یا کچھ زیادتی کمی ہوئی ہے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر کچھ عباراتِ ملفوظات درج کی جاتی ہیں۔ ۱۔ احکامِ شریعت دوم سوال ۳ کا ورق پر لکھا ہے کہ نبی کریم کا عرشِ اعظم پر مع نعلین مبارک حاضری کے متعلق بلا دلائل انکار لکھا ہے۔ اگر یہ انکار اعلیٰحضرت کی تصنیف میں ہوتا تو یقیناً با دلائل ہوتا۔ پھر کسی کو غور کی حاجت نہ تھی۔ ملفوظی ہونے کی وجہ سے قابلِ غور ہے۔ بعد غور معلوم ہوا کہ تمام اکابرِ امت فرماتے ہیں۔ کہ حضرتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر گئے تو مع نعلین گئے چنانچہ حضرت امیر خسرو جو مجدد الف ثانی کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اپنے قصیدۂ معراج میں فرماتے ہیں ؎

نعلین پائے اد ابرعرش گو نگاہ کن
جاہل کہ در نیابد معنیٔ استوارا

۲۔ نادر المعراج صـ۲۸ پر شیخ العالم اکبرآبادی فرماتے ہیں۔ لطیفۂ ششم۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام را در وادیٔ مقدس امر فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ شد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم را بر فوقِ عرش نہی آورکہ لَاتَخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۳۔ تفسیر روح البیان صـ۲۷ جلد پنجم میں ہے وَقِیْلَ لِلْحَبِیْبِ تَقَدَّمْ عَلٰی بِسَاطِ الْعَرْشِ بِنَعْلَیْكَ یَتَشَرَّفُ الْعَرْشُ بِخَیَالِ نِعَالِ قَدَمَیْكَ (الخ)

۴۔ دُرَّۃُ التَّاج صـ۸۷ پر لکھا ہے کہ امام ابن ابی جمرہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرشِ اعظم پر مع نعلین پاک پہنے ہوئے پہنچے۔ ۵۔ جواہر البحار جلد سوم صـ۴۳ پر خود مصنف شیخ یوسف بن اسماعیل نبہانی اسی مسلک کی تائید فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔ ؎

علیٰ راس ہذا لکون نعل محمد علت فجمیع الخلق تحت ظلالہ
لدی الطور موسیٰ نودی اخلع واحمد علی العرش لم یوذن بخلع نعالہ

اگرچہ شیخ نبہانی اِن صفحات پر اس واقعے سے متعلق بعض علماء کی کچھ تنقیدات پیش کرتے ہیں مگر اپنا مسلک تائید پر ہی راغب ہے۔ علاّمہ قزوینی اس کی تردید فرماتے ہیں مگر میرے نزدیک اُن کی تردید دو وجہ سے معتبر نہیں ایک یہ کہ، علاّمہ قزوینی عرشِ اعظم تک پہنچنے کا ہی سرے سے انکار کرتے ہیں حالانکہ تمام علمائے محققین بدلائلِ قاہرہ ثابت کرتے ہیں کہ نبی کریم عرشِ اعظم پر تشریف فرما ہوئے اور اس سے بھی آگے لامکان پر حاضر ہوئے۔ خود اعلیٰحضرت کا مسلک بھی یہی ہے۔ چنانچہ اپنے مشہورِ زمانہ بے مثال نعتیہ سلام میں ارشاد فرماتے ہیں۔

عرش کی زیب و زینت پہ عرشی درود فرش کی طیب و نزہت پہ لاکھوں سلام

اور بھی بہت سے اشعار میں عرش اعظم تک پہنچنے کو ثابت فرماتے ہیں۔ علاّمہ قزوینی کی پہلی بات کو اگر صحیح کہا جائے تو دوسری کو بھی صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ نعلین پاک کا بدیں وجہ انکار کرتے ہیں کہ آپ نبی کریم کے عرش تک پہنچنے کے ہی قائل نہیں جیساکہ شیخ علی الجہوری اپنی کتاب نورالوہاج میں فرماتے ہیں۔ مگر علاّمہ قزوینی کی دوسری بات تو غلط لہٰذا پہلی بھی غلط۔ دوسری وجہ غیر معتبر ہونے کی یہ ہے۔ واقعہ معراج اسرارِ الہٰیہ میں ہے اور اسرار پر صوفیاء کو مطلع فرمایا جاتا ہے۔ تو جس طرح علم کی بات میں علماء کا اعتبار ہوگا۔ فقہ میں فقہاء، نحو میں نحوی، فلسفے میں فلاسفہ۔ حدیث کی صحت میں محدثین، منطق میں منطقی۔ سائنس میں سائنس دان کے اقوال قابلِ اعتبار و ترجیح ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسرارِ الہٰیہ میں صوفیاء کی بات معتبر ہوگی نہ کہ علاّمہ قزوینی و دیگر فلاسفہ کی۔ اسرارِ الہٰیہ میں علماؤ محدثین کی بات بھی صوفیاء کے مقابل غیر معتبر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ میں تمام علمائے متقدمین کلمات سے مراد رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (الخ) لیتے ہیں مگر صوفیاء وسیلۂ نامِ اقدس مراد لیتے ہیں لہٰذا فتویٰ اسی پر ہے کہ وسیلۂ نام اقدس سے توبہ قبول ہوئی۔ کیونکہ یہ وسیلہ بھی اسرارِ الہٰیہ میں سے ہے جس کا علم بجز صوفیاء کے کسی کو نہیں۔ علماء و محدثین اس دریا کی لہروں سے بے خبر ہیں۔ پتہ لگا کہ اسرار میں صوفی کی بات معتبر ہے حالانکہ محدثین فرماتے ہیں کہ صوفی کی روایت معتبر نہیں۔ وجہ وہی جو اوپر بیان کی گئی۔ اسی طرح مفسرین وَالنَّجْم کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ نبی کریم نے حضرت جبرئیل کو دیکھا مگر صوفیاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا اہلِ علم حضرات صوفیاء کی بات تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت جبریلؑ کو دیکھنا کیا کمال ہے۔ نبی کا امتی کو دیکھنا کمال نہیں بلکہ امتی کا نبی کی زیارت کمال ہے۔ حضرت جبریلؑ ہر وقت نبی کریم کے دیدار کے متمنی رہتے ہیں اور یہ ان کا کمال ہے۔ پس اگرچہ علاّمہ قزوینی جیسے فلسفی و منطقی عالم۔ نعلین پاک پہن کر عرش اعظم پر جانے کا انکار کریں مگر محققین کے نزدیک صوفیاء کی بات معتبر ہوگی۔ اکابر علماء بھی مذکورہ حدیث لَا تَخْلَعْ نَعْلَیْکَ۔ کا انکار

نہیں کرتے۔ بلکہ حدیث کو صحیح مانتے ہوئے نعلین میں تاویل کر لیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ نعلین سے مراد لباسِ بشری ہے۔ مگر یہ محض تاویل ہے۔ اصل یہی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اصطلاحی عرفی نعلین پاک کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ احکامِ شریعت کی عبارت عقلاً بھی درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جب سفرِ معراج کی ابتداء ہوئی تو کیا نبی کریم ننگے پیر براق پر سوار ہوئے۔ اس کا بھی ثبوت ہونا چاہیئے۔ اخلاقی طور پر ظاہر ہے کہ نعلین پاک پہن کر ہی روانگی ہوئی ہوگی۔ پس سارے سفر میں کہیں بھی نعلین اتارنے کا ذکر نہیں۔ لَا تَخْلَعْ نَعْلَيْكَ تو کئی کتب معتبرہ سے منقول ہے۔ مگر فَاخْلَعْ والی حدیث کہیں بھی مرقوم نہیں منکرین بھی صرف انکار کرتے ہیں وجہ انکار نہیں بتاتے۔ ع۶ ایک مرتبہ علامہ کاظمی صاحب اور حکیم الامت تشریف فرما تھے۔ میرے علاوہ اور بہت سے عوام حاضر تھے۔ علمِ دیابنہ و وہابیہ کی بات شروع تھی۔ دورانِ گفتگو حضرت قبلہ علامہ کاظمی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ فخر الشعراء محمد اعظم چشتی نے نعت پڑھی جلسہ مخلوط تھا بسلسلہ ختمِ نبوت پنجابی نعت کا پہلا شعر اس طرح تھا۔

محمد پیارا بڑی شان والا ـــــ سنے جوڑے عرشاں تے چڑھ جان والا

وہاں مولوی عنایت اللہ شاہ بخاری بھی جلسے میں موجود تھے۔ معترض ہوئے کہ یہ غلط ہے۔ محمد اعظم صاحب نے کہا کہ مع نعلین جانے کا تو میں نے ذکر کیا ہے اتارنے کا آپ ثبوت پیش کریں اس پر ایسے خاموش ہوئے کہ اپنا منہ ہی پھیر لیا۔ پھر علامہ صاحب نے کہا کہ بحمد اللہ ہمارے تو نعت خوان بھی اکابر وہابیہ کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ قُلْتُ۔ اس واقعے سے دو باتیں معلوم ہوئیں ۱۔ علامہ کاظمی اور حکیم الامت جیسے محققین عرفاء نے واقعے کو بیان کر کے سن کر بھی تردید نہ کی نہ اعظم چشتی صاحب کی بات کو غلط کیا۔ ۲۔ وہابی حضرات جیسے منکرین کے پاس بھی اس واقعے کے انکار پر دلیل نہیں شرح بردہ۔ شیخ زادہ علی خرپوتی ص۱۱۰ پر ہے۔ اَنَّهٗ عليه السلام اَرَادَ اَنْ يَّخْلَعَ نَعْلَيْكَ فَسَمِعَ مِنَ الْيَنِينِ الْعَرْشِ اَنْ لَّا تَخْلَعْ يَا حَبِيْبَ اللهِ ـ (الخ)۔ ترجمہ وہی جو اوپر گذرا۔

احکامِ شریعت کا دوسرا قابلِ غور مسئلہ ۔ احکامِ شریعت جلد سوم مسئلہ ۱۳ کا جواب اس طرح لکھا ہے (۱) وتر ہو جانے میں شبہ نہیں۔ ہاں مکروہ ہے بقولِ شامی۔ اَمَّا لَوْ صَلَّاهَا جَمَاعَةً مَعَ غَيْرِهٖ ثُمَّ صَلَّى الْوِتْرَ مَعَهٗ لَا كَرَاهَةَ۔ سوال یہ تھا۔ ۱۔ جس نے فرض عشاء باجماعت نہیں پڑھی اور وتر کی جماعت میں شریک ہو گیا اس کے یہ وتر سرے سے ہوئے ہی نہیں یا ہوئے مگر مکروہ (الخ) جواب درست ہے مگر دلیل بے محل ہے۔ یعنی سوال و جواب گندم اور دلیل جو۔ سائل تو پوچھ رہا ہے کہ وتر ہوئے یا مکروہ ہوئے۔ جواب کی دلیل کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ اگر اس نے عشاء کی نماز غیر کے ساتھ پڑھی باجماعت۔ پھر وتر اس کے ساتھ باجماعت پڑھے تو کراہت نہیں ہوگی۔ بھلا اتنی بڑی بھول اعلیٰحضرت کر سکتے تھے۔ غالباً یہ بھول مولف سے ہوئی۔ اسی طرح ملفوظات ص۶ جلد سوم مطبوعہ مدینہ پبلشنگ پر ہے۔ ارشاد توریت مقدس سے بہت بیشتر کا ہے (الخ) یعنی

خضر علیہ السلام کا واقعہ نزولِ توریت سے بہت پہلے کا ہے۔ حالانکہ یہ قول احادیثِ صحیحہ تاریخ اور تفاسیر کے قطعاً خلاف ہے۔ کیا اتنی سخت غلطی اعلیحضرت کر سکتے تھے۔ حاشا ہرگز نہیں۔ مؤلف مصطفےٰ رضا خان مدظلہ نے یہ قول کسی سے سنا تو فوراً اس پر زبردست تنقید کی۔ حاشیہ پر فرماتے ہیں ۱ٔ میرے خیال میں پیشتر کی جگہ بعد ہونا چاہیئے۔ جیساکہ بخاری شریف کی حدیث اِنَّکَ عَلٰی عِلْمٍ۔ تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قَامَ مُوسٰی خَطِیْبًا فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ الخ اور مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے تمام تبلیغ و خطابات بعد توریت فرمائے۔ حضرت مفتیٔ اعظم نے کس طرح بلا جھجک ملفوظِ اعلیحضرت کی بادلائل تردید کر دی۔ اسلیئے کہ انہوں نے یہ خود اعلیحضرت سے نہ سنا بلکہ کسی نے سنایا تو یقیناً کچھ زیادتی کمی کر کے مسئلہ کو قابلِ غور بنا دیا۔
اسی طرح ملفوظ حصہ چہارم ص۵ پر ہے۔ عرض: عورت سے اگر کلمۂ کفر نکل جائے تو نکاح ٹوٹے گا یا نہیں (الخ)
ارشاد: ہاں عملاً باصل المذہب یہی ہے کہ نکاح فی الحال فسخ ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ جمہور فقہا کے خلاف ہے۔ اس کے مطابق کوئی عالم فتویٰ نہیں دے سکتا۔ اگر اس قول کو کلیتاً ملفوظِ اعلیحضرت تسلیم کیا جائے تو اعلیحضرت کی توہین ہوگی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اعلیحضرت نے ایسے غیر مقبول مسئلے بتائے ہوں۔ یقیناً یہی کہنا پڑے گا کہ سنتے وقت سامع کو غلطی ہوئی جس سے یہ مسئلہ قابلِ غور ہو گیا۔ اور جب مفتیٔ اعظم نے اس پر غور فرمایا تو فوراً اس کی تردید کر دی چنانچہ حاشیہ ۱ٔ پر ارشاد فرمایا۔ اور فتویٰ اس پر ہے کہ ارتدادِ زن سے عورت نکاح سے نہیں نکلتی (الخ) یعنی اوپر متن والا مسئلہ غیر مفتا بہ ہے۔ ثابت ہوا کہ تمام ملفوظات صرف میرے نزدیک ہی قابلِ غور نہیں بلکہ مفتیٔ اعظم ہند کے نزدیک بھی قابلِ غور۔ بعد غور جو غلط نظر آتا ہے اس کی تردید کر دیتے ہیں جو صحیح ہوتا ہے اس کی عدم تنقید بھی تائید ہے۔ ملفوظ حصہ چہارم ص۲۵ پر بہت زبردست چشم پوشی ہو گئی۔ عرض: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَتَمَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ تو بعض انبیاء شہید کیوں ہوئے۔ ارشاد: رسولوں میں سے کون شہید کیا گیا۔ انبیاء البتہ شہید کیے گئے۔ رسول کوئی شہید نہ ہوا یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ۔ فرمایا گیا نہ کہ یَقْتُلُوْنَ الرَّسُوْلَ الخ۔ اس میں چند زبردست غلطیاں ہیں جو یقیناً اعلیحضرت کی جانب سے نہیں بلکہ اُن جامعین کی طرف سے ہے جو مابین مؤلف والافاظ رابطہ ہیں۔ غلطی ۱ٔ: سائل نے جو آیت پیش کی وہ ہے اصل میں کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ۔ مگر سائل نے خَتَمَ اللّٰہُ کہا۔ اعلیحضرت نے یقیناً پہلے غلطی نکالی ہوگی لیکن سامع نے کوئی توجہ نہ دی۔ حضرت مؤلف نے بھی کوئی توجہ نہ کی اور اسی طرح اب تک غلط چھپتا رہا۔ غلطی ۲ٔ: لَاَغْلِبَنَّ کا معنی وہ نہیں جو ملفوظ میں مرقوم کر دیئے گئے کہ یہ منشاءِ کلام کے خلاف ہے اور تمام تفاسیر کے بھی خلاف اور دیگر آیات کے بھی خلاف۔ کیونکہ بہت جگہ ایسی آیات موجود ہیں جن میں رسل کی شہادت کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَھْوٰی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ۔ اسی طرح غائب کی ضمیر سے ایک آیت سورۂ

مائدہ میں بھی ہے۔ اب یہی کہنا پڑے گا کہ ملفوظات خواہ احکام شریعت کی شکل میں ہوں یا دیگر سب قابلِ غور ہیں۔ چنانچہ اس ملفوظ کی تردید بڑی خود حضرت مؤلف کی تحریر سے ثابت ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲ حاشیہ پر ارشاد ہے ۵ اور شہید ہو جانا مغلوبی نہیں غلبہ سے مراد غلبۂ حجت ہے۔ یہ چند اقتباسات صرف اس لئے کئے تاکہ لوگوں کی غلطیوں سے اعلیٰحضرت کی ذاتِ والاصفات کو ملوث نہ کیا جائے۔ نہ کسی دیوبندی وہابی کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقعہ ملے۔ اگر معاذ اللہ احکامِ شریعت وغیرہ تمام ملفوظات کو اعلیٰحضرت کی تصنیف مانا جائے تو لازم آئے گا کہ اعلیٰحضرت نے غلطیاں کی ہیں اور کہنا پڑے گا کہ اعلیٰحضرت کو ان آیات کا مطلب نہ آتا تھا۔ مگر مفتیٔ اعظم جانتے تھے یہ سراسر گستاخی ہے۔ پس دلائلِ قاہرہ و براہینِ باہرہ سے ثابت ہوا کہ احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں۔ ملفوظات کے بعض مسائل اعلیٰ حضرت کے بہت سے مصنفہ مسائل کے بھی خلاف ہیں۔ مثلاً ملفوظات اوّل صفحہ ۴۳ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ۔ عرض: اس شخص پر جو قصاص میں قتل کیا گیا نماز پڑھی جائے؟

ارشاد۔ ہاں خودکشی کرنے والے اور اپنے ماں باپ کو قتل کرنے والے اور باغی ڈاکو کہ ڈاکے کے دوران لڑائی میں مارا گیا۔ ان کے جنازے کی نماز نہیں۔ یہ کتنا غلط مسئلہ ہے۔ اس کی تردید فتاویٰ افریقہ صفحہ ۵۲ سوال ۲۹ ایک شخص مرد یا عورت مسلمان ہے اور اس نے اپنے ہاتھ سے گلا کاٹ دیا یا پھانسی کھا کر حرام موت مر گیا۔ اب اس صورت میں اس کے جنازے کی نماز پڑھنا اور مسلمان مقابر میں دفن کرنا جائز ہے یا نہیں۔ زید کہتا ہے نہیں (الخ) الجواب زید کا قول صحیح نہیں۔ فتویٰ اس پر ہے کہ اس کے جنازے کی نماز پڑھی جائے گی اور زید کا کہنا کہ مقابر مسلمین میں دفن نہ کیا جائے محض باطل ہے اور اپنے جی سے حکم گھڑنا ہے۔ درمختار میں ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسَہٗ عَمَدًا یُغَسَّلُ وَیُصَلّٰی عَلَیْہِ وَبِہٖ الخ۔ یہ تھیں بطورِ نمونہ چند چشم پوشیاں جنکی بناء پر احکامِ شریعت وغیرہ ملفوظات کی عبارات قابلِ غور ہوئیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

اقتدار احمد خاں

قوالی کا بیان

سوال ۳

کیا فرماتے ہیں ۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اولیاء اللہ کے مزار پر کنجریوں اور بھانڈوں کا گانا بجانا اور ڈھول بجانا اور ناچنا کودنا ۔ ریڈیو کا گیت گانا، فلمی گانے پڑھنے، اور قوالوں کا مخش گیت گانا یا ڈھول وغیرہ پر نعت خوانی کرنا سازوں کے ساتھ، کسی بھی جگہ عام لوگوں کے جلسوں میں قوالی کرنا یا عورتوں سے گیت سننا جائز ہے یا شرعاً حرام ہے؟ چند دن پیشتر ہمارے علاقے ڈیرہ نواب صاحب میں ملتان کے کسی شخص کی طرف سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ مفت تقسیم کیا جارہا تھا جس کے پہلے صفحہ پر مصنف کے نام کی جگہ بہاولپور یونیورسٹی کے ہیڈ مولانا شیخ الحدیث علامہ کاظمی صاحب کا نام درج تھا۔ جس سے یہاں کے علمی حلقے میں بہت تشویش پائی جاتی ہے ۔ کیونکہ سوائے چند صوفیوں کے کوئی بھی موجودہ قوالی کو جائز نہیں کہتا۔ اس کتاب سے بہت فتنہ پڑ گیا ہے یہاں کے تمام احباب نے آپ ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔ تاکہ اس پمفلٹ کے جھوٹ یا سچائی کا پتہ چلے پمفلٹ بھی حاضر خدمت کیا جارہا ہے ۔ بالوضاحت جواب ارشاد فرمایا جائے ۔ کہ کیا قوالی سننا عبادت لازمہ ہے یا مستحب یا مکروہ و حرام وغیرہ ہے؟

السائل :- مولوی محبوب عالم خطیب ڈیرہ نواب صاحب و دستخط اہالیانِ شہر

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

اَلْجَوَاب

گرامی نامہ تشریف لایا اور پمفلٹ بھی دستیاب ہوا ۔ بغور مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو کسی دلدادہ لہو ولعب نے حضرت غزالی زماں کا نام استعمال کیا ہے اور یا ان کے مکتوب میں کچھ خیانتیں کر کے مطبوع کا جامہ پہنایا ہے ۔ میں نے اس پمفلٹ میں بہت سی علمی غلطیاں پائیں اور یہ غلطیاں نسیاً نہیں بلکہ عمداً صرف اپنے مسلک کو بچانے کے لیے کی گئیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ ہر شخص کو اپنے مسلک کے اظہار و ثبوت کا پورا اختیار ہے لیکن اس کتاب میں اس اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے، پیش کردہ روایات کے خود ساختہ مطلب بیان کئے گئے، نحوی قاعدے بلا وجہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیے گئے ۔ بہت جگہ بغیر دلیل مطلق کو مقید بنایا گیا ہے

اگرچہ اس کمزور کتاب کا جواب دینا کچھ ضروری نہ تھا، مگر آپ کے پیہم اصرار پر کچھ نشان دہی ضرور کروں گا۔ اولاً یہ خیال رہے کہ ہمارے عرف میں گانا بجانا اگر فحش اور عریاں الفاظ سے ہو تو اس کو ناچ گانا کہا جاتا ہے، اگر گانا بجانا مہذب ہو، تو اس کو قوالی کہا جاتا ہے، اصطلاحِ شریعت میں عورت کا غیر مردوں کے سامنے کچھ گانا اگرچہ مہذب کلام ہو، عریاں کہلاتا ہے، اور اس کو غنا بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ فخر الدین زرّادی اپنی کتاب اصول سماع، میں فرماتے ہیں :۔ وَالسَّمَاعُ دُوْنَ الْغِنَاءِ لِاَنَّہٗ اِسْتِمَاعُ الْاَشْعَارِ الَّتِیْ تَکُوْنُ فِیْ ذِکْرِ الْغَوَانِیْ مَعَ حُسْنِ الصَّوْتِ وَالْغَوَانِیْ ھِیَ النِّسَاءُ اسی طرح قوۃ قلوب میں ابو طالب مکی فرماتے ہیں :۔ ان الاغانی ما نشبہت بہ النساء (محوالہ اصول سماع اوّل ص۶) :۔ لیکن علامہ شامی غنا کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں :۔ وَالْوَجْہُ اَنَّ اِسْمَ مُغَنِّیَۃٍ وَمُغَنٍّ اِنَّمَا ھُوَ فِی الْعُرْفِ لِمَنْ کَانَ الْغِنَا حِرْفَتَہُ الَّتِیْ یَکْتَسِبُ بِھَا الْمَالَ وَھُوَ حَرَامٌ :۔ پس علامہ زرادی کی تعریف لغوی ہے اور یہ عرفی۔ یہ اسلام میں متفقاً حرام ہے۔ لیکن اس پمفلٹ کتاب مسمّٰی "رمزیلۃ النزاع اثبات السماع" میں اگرچہ مصنف صرف مروجہ قوالی کے ہی حلت کے درپے ہے مگر پیش کردہ مطلب ودلائل سے از خود کلام عریاں بھی جائز بلکہ عبادت ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جن روایات کے خود ساختہ مطلب بیان کر کے فاضل مصنف قوالی مروجہ کو جائز ثابت کرتا ہے۔ ان سے قوالی تو بعد میں ثابت ہوگی، مگر پہلے عریاں کلام، ناچ گانا۔ بھانڈ، مراثی کے فحش کلام ثابت ہوں گے۔ اور سب اوباش لوگ اسی کتاب کو دلیل اور ڈھال بنائیں گے غرضیکہ اس کتاب سے مزید فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اگر یہ کتاب اس طرح بر سرِ عام شائع نہ ہوتی اور ہر کس و ناکس کو تحفۃً نہ دی جاتی جیسا کہ آپ کے استفتاء سے ظاہر ہے، تو میں اس پر قلم اٹھانا ضیاعِ وقت ہی سمجھتا، اور شاید آپ کے اصرارِ پیہم کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ مگر مذکورہ حالات میں جب کہ اس کتاب کے ذریعہ صحابہ کرام کی توہین کی جا رہی ہے اور عیسائیت و یہودیت کے شعار طبلہ، سارنگی کو سنتِ صحابہؓ کہا جا رہا ہے :۔ (العیاذ باللہ) اور ہندوؤں مشرکوں کے مروجہ جھانجھ و مزامیر کو اسلامی تہذیب ثابت کیا جا رہا ہے اپنے نفسِ امّارہ کی خاطر اسلام کا تصور اغیار کے سامنے وہی پیش کیا جا رہا ہے، جو نصاریٰ اور سکھوں، ہندوؤں نے اپنے دینوں کا پیش کیا فاضل مصنف نے شائع کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ اغیار کی نئی نسل کے سامنے جب یہ کتاب جائے گی تو ان کے سامنے اسلام کا کیا نقشہ ابھرے گا۔ اور صحابہ کرام کے متعلق کیا تصور کریں گے۔ اگر حضرت مصنف اور لواحقین کا یہی عقیدہ تھا تو ہر شخص پڑھو سننے کی کیا ضرورت تھی، اور شائع کرنے کی کیا حاجت؟ آپ کے حکم کی بنا پر ان وجوہ سے مکتوب گرامی کا جواب بشکلِ فتوےٰ ارسال کر رہا ہوں، پہلی سطور میں حرمتِ قوالی کے دلائل، بعدہٗ اس پمفلٹ کے اغلاط کی نشان دہی۔

۳ ۵ ۳/۷

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

صوفیاء کی اصطلاح میں جس کو سماع کہا جاتا ہے۔ ہمارے عرف میں اس کی دو قسمیں ہیں:۔ پہلی قسم:۔ نعت خوانی ۲ قوالی۔ نعت خوانی کی تعریف یہ ہے کہ: بغیر طبلہ، سارنگی، مزامیر وغیرہ کسی محفل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم یا رب تعالیٰ یا اولیاء، علماء، فقہاء، یا صحابہ اہل بیت، اکابرین امت کا ذکر پاک بطریقۂ نظم اشعار کیا جائے، خواہ اکیلا آدمی یا چند مل کر۔ قوالی کی تعریف یہ ہے کہ یہی سب کچھ ڈھول طبلہ سارنگی سے کی جائے۔ نعت خوانی میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں، سب جائز مانتے ہیں، قوالی میں اختلاف ہے، میری گفتگو قوالی کے بارے میں ہوگی کہ وہی متنازعہ فیہ ہے۔ سماع یعنی قوالی کا رواج مسلمانوں میں دورِ تبع تابعین کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت بھی صحیح اور غلط قسم کی قوالیاں تھیں، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء صوفیاء نے اپنی مکتوبات میں جائز لکھا، اور بعض نے قطعاً ناجائز و حرام۔ جس نے حرام کہا وہ بھی صحیح، جس نے جائز کہا اس نے صحیح قوالی کو جائز کہا۔ اس زمانے کے اختلاف سے ہم کسی کو برا نہیں کہہ سکتے۔ مگر آج کل سب قوالیاں غلط ہیں صحیح قوالی وہ ہے جس میں علماء کی بیان کردہ سات شرطیں موجود ہوں۔ غلط وہ ہے، جس میں ان شرائط سے ایک بھی نہ ہو۔ آج کل قوالی میں ساری شرطیں تو درکنار ایک شرط بھی نہیں ہے تو ان متقدمین کے حوالے موجودہ قوالی کے حق میں پیش کرنا سراسر نادانی ہے، پیش نظر رسالہ مزمیرانِ امامِ رسالے میں قوالی کی تقسیم کیئے بغیر مطلقاً قوالی کو جائز کہا ہے، جس سے ان علماء فقہاء کی گستاخی ہے جنہوں نے قوالی کو ناجائز قرار دیا۔ اور صحیح قوالی کے جواز کے قائل متقدمین کے اقوال طیبہ کو آڑ بنانا بھی ان کی توہین ہے کہ غلط کے یہ بھی خلاف تھے، ہمارے زمانے میں شریعت کے رو سے مطلقاً قوالی، گانا۔ بجانا، ڈھول، ناچنا کودنا سب قطعاً حرام ہیں۔ قوالی خواہ نعت کی ہو یا فلمی گانوں کی، بلکہ طبلہ پر نعت پڑھنا زیادہ حرام ہے:۔ کیونکہ آقائے دو عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی ہے کہ آپ کا نام پاک ڈھول باجے کے ساتھ لیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ڈھول باجہ کھیل کود میں شمار ہے، اور اسلام میں بجز چند کھیلوں کے سب باطل و حرام ہیں، چنانچہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ كُلُّ لَهْوٍ بَاطِلٌ إِلَّا ثَلَاثٌ۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری لاہوری در کشف المحجوب صـ ۳۱۷ پر فرماتے ہیں کہ:۔ طبلہ۔ مزامیر وغیرہ سب سے پہلے ابلیس لعین نے حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابلے میں پیدا کیا اس سے پہلے کوئی ڈھول، طبلہ وغیرہ نہ تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ ررابلیس را اضطراب طبعی قوت گرفت (الخ)۔ ونائے و طنبور بساخت واندر برابر مجلس سماع داؤد علیہ السلام مجلسے فرو گسترانید (الخ) آن گروہ کہ از اہل شقاوت بودند بمزامیر ابلیس مائل شدند۔ آقائے علی ہجویری کی اس عبارتِ مقدسہ سے دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ ۱ ڈھول

باجے وغیرہ کی تاریخ۔ اور نمبر ۲ اس کا موجد ابلیس ہے۔ جس طرح سائل نے میرے پاس ایک عالم کا رسالہ جواز قوالی میں بھیجا ہے، اسی طرح ایک عالم نے داتا گنج بخش کی خدمت عالیہ میں بھی عرض کیا تھا کہ میں حلت قوالی پر ایک کتاب لکھنے والا ہوں تو گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کو فرمایا تھا کہ اے خواجہ امام آپ ایسی چیز کو حلال کریں گے۔ جو تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ "کشف المحجوب صـ۳۱۶ پر ارشاد ہے کہ خواجہ امام لہو سے راکہ اصل ہمہ فسقہا است حلال کرد ثابت ہوا کہ قوالی داتا صاحبؒ کی نظر میں سب سے بڑا گناہ بلکہ اصل گناہ ہے، آپ متعدد جگہ قوالی کو حرام فرماتے ہیں :۔

حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی قوالی کو حرام فرماتے ہیں، اور قوالی کو گناہ کبیرہ میں شمار فرماتے ہیں چنانچہ احیاء العلوم صـ۱۵۱ پر امام غزالی رح قاضی ابو الطیب طبری کا قول نقل فرماتے ہیں۔ وَاَمَّا اَبُوْحَنِیْفَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَاِنَّہٗ کَانَ یُکْرِہُ ذٰلِکَ وَیَجْعَلُ سِمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَکَذٰلِکَ سَائِرُ اَھْلِ الْکُوْفَۃِ سُفْیَانَ الثَّوْرِیِّ وَحَمَّادٍ وَاِبْرَاھِیْمَ رح وَالشَّعْبِیِّ رح وَغَیْرُھُمْ (الخ) ثابت ہوا کہ حنفی مسلک میں مروجہ قوالی حرام ہے۔ اگرچہ امام مالک وغیرہ مجتہدین کرام کے نزدیک بھی قوالی مذکورہ حرام ہے، مگر چونکہ سائل و مدعا علیہ و مفتی و مستفتی سب حنفی ہیں اس لئے قول امام رح ہی حجت ہے، خود امام غزالی رح جس قوالی کے حق میں ہیں آج کل وہ قوالی نہیں۔ امام غزالی رح نے حلتِ قوالی میں بہت اقوال ذکر فرمائے ہیں، مگر امام اعظم رح کے بارے میں وہ بھی کوئی دلیل حلت پیش نہ کر سکے۔ اور علامہ امام غزالی رح کا قول امام اعظم کے قول کے مقابل غیر معتبر ہے لہٰذا عند الاحناف حجت نہیں ہے۔ مسلک حنفی کی کتاب فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صـ۲۵۲ پر ہے :۔ قَالَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَلسَّمَاعُ وَالْقَوْلُ وَالرَّقْصُ الَّذِیْ یَفْعَلُہُ الْمُتَصَوِّفَۃُ فِیْ زَمَانِنَا حَرَامٌ لَا یَجُوْزُ الْقَصْدُ اِلَیْہِ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْہِ وَالْغِنَاءُ وَالْمَزَامِیْرُ سَوَاءٌ :۔ یعنی مروجہ قوالیاں حرام اور مزامیر وغیرہ بھی حرام ہیں، کچھ جاہل صوفی اس کو مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں :۔ فتاوٰے ہندیہ میں ہے۔ وَجَوَّزَہٗ اَھْلُ التَّصَوُّفِ" لیکن چونکہ حلت و حرمت قانونِ شرعی ہے، اربعۃ تفاسیر جلد سوم صفحہ نمبر صـ۵۹۹ پر ہے :۔ اِنَّ مَذْھَبَ اَھْلِ السُّنَّۃِ اِنَّہٗ لَا یُثْبَتُ بِالْعَقْلِ ثَوَابٌ وَلَا عِقَابٌ وَلَا اِیْجَابٌ وَلَا تَحْرِیْمٌ وَلَا غَیْرُ ذٰلِکَ مِنْ اَنْوَاعِ التَّکْلِیْفِ وَلَا یُثْبَتُ ھٰذِہِ الْاَشْیَاءُ کُلُّھَا وَلَا غَیْرُھَا اِلَّا بِالشَّرْعِ :۔ اس لئے یہاں علماء فقہاء کی بات معتبر ہوگی نہ کہ صوفیاء کی۔ امام اعظم رح کا فتوٰے، فتاوٰی قاضیخان جلد سوم صفحہ نمبر صـ۴۰۶ پر ہے۔ اَمَّا اِسْتِمَاعُ صَوْتِ الْمَلَاھِیْ کَالضَّرْبِ وَالْقَضِیْبِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ حَرَامٌ وَمَعْصِیَۃٌ لِقَوْلِہٖ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اِسْتِمَاعُ الْمَلَاھِیْ مَعْصِیَۃٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْھَا فُسُوْقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِھَا مِنَ الْکُفْرِ (الخ) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ڈھول باجے کی آواز سننا حرام ہے۔ اور کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ اس حدیث پاک میں لفظ ملاہی کا ترجمہ مطلق طور پر علامہ قاضیخان نے

قوالی مروجہ کیا ہے، اب کس کو بولنے کی جرأت ہے، اسی طرح فتاویٰ بزازیہ جلد سوم ص۳۵۹ پر ہے، علامہ ابن بزاز فرماتے ہیں، کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قوالی سے متعلق یہ فرمانا وَالتَّلَذُّذُ بِهَا كُفْرٌ اس کا مطلب ہے ناشکری نعمت، یعنی قوالی سننے والا اور سنانے والا دونوں اس لیئے فاسق ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے اعضاء کو مقصدِ خلقت کے خلاف استعمال کیا۔ چنانچہ ارشاد ہے :- فَصَرْفُ الْجَوَارِحِ إِلَى غَيْرِ مَا خُلِقَ لِأَجْلِهِ كُفْرٌ بِالنِّعْمَةِ ثابت ہوا کہ ڈھول باجے کے لیئے انسان پیدا نہ کیا گیا، لہٰذا گناہ ہے، کتنی زیادتی ہے کہ ایسے سخت ترین گناہ میں صحابہ و اہلبیت جیسی پاک ہستیوں کو ملوث کیا جائے۔ (نعوذ باللہ منہ) میرے یہ تمام پیش کردہ دلائل بالکل صاف ظاہر حرمت کو ثابت کرتے ہیں، کسی ایچ پیچ، یا منطقی فلسفی الجھنوں کی چنداں ضرورت نہیں۔ نہ ہید خارجی، ہید ذہنی کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہے، بخلاف ہمارے فاضل مصنف صاحب کے محررہ رسالے کے کہ اس میں حلت قوالی ثابت کرنے کے لیئے بہت منطقی فلسفی تانے بانے بنانے پڑے، اور کشتی استدلال کو نحوی صرفی پتوار پر چڑھانا پڑا، حالانکہ یہ سب کچھ تار عنکبوت سے زیادہ نہیں، جیسا کہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ علامہ شامی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب ردّ المحتار جلد پنجم صفحہ نمبر ص۲۵۴ پر ارشاد فرماتے ہیں۔ عَنِ الْقُرْطُبِيِّ إِجْمَاعُ الْأَئِمَّةِ عَلَى حُرْمَةِ هٰذَا الْغِنَاءِ وَضَرْبِ الْقَضِيْبِ وَالرَّقْصِ :-

یعنی تمام امام مجتہدین متفقہ طور پر مروجہ قوالی کو حرام کہتے ہیں، غور تو کیجیئے کہ علامہ شامی تو کہیں کہ قوالی متفقہ طور پر حرام مگر ہمارے یہ مصنف صاحب ائمہ کرام کو بھی اپنے ساتھ ملوث کرنے کی بیجا کوشش کر رہے ہیں۔ امام اعظم رحمہ کی تصنیف فقہ اکبر کے شارح ملا علی قاری ص۲۰۵ پر فرماتے ہیں :- وَفِي الْخُلَاصَةِ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ عَلَى ضَرْبِ الدَّفِّ وَالْقَضِيْبِ يَكْفُرُ وَيَقْرُبُ مِنْهُ ضَرْبُ الدَّفِّ وَالْقَضِيْبِ مَعَ ذِكْرِ اللهِ تَعَالَى وَنَعْتِ الْمُصْطَفَى صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذَا التَّصْفِيقُ عَلَى الذِّكْرِ (الخ)

اور درِ مختار ص۶۹۲ پر علامہ علاؤ الدین حصکفی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل فرماتے ہیں :-

قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَصَوْتُ اللَّهْوِ وَالْغِنَاءِ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ النَّبَاتَ۔

یعنی صحابی رسول کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک کتنا شدید ہے۔ منافقت دو قسم کی ہے ع۱ نفاقِ شرعی، جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے ع۲ نفاقِ حکمی، جس کا بہت جگہ ذکر حدیث پاک میں ہے۔ یہاں نفاقِ حکمی مراد ہے۔ یہ بات واقعی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو شخص خواہ پیر ہو یا مرید قوالی سن سن کر منافقانہ عادات اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ زبان سے مسلمان اور متبع سنت ہونے کا دعوےٰ دار ہوتا ہے۔ مگر دل میں کفار کے طور طریقوں سے شکل و صورت، ڈھول باجے سے محبت ہوتی ہے، اسی کا نام منافقت ہے۔ تاریخ انڈونیشیا ص۲۹۹ پر لکھا ہے کہ (۵) چونکہ ہندوؤں اور

بدھوؤں میں عام طور پر گانے بجانے کا رواج تھا بلکہ وہ اس کو اپنی ایک بڑی عبادت سمجھتے تھے، لہٰذا صوفیائے کرام نے بھی انہیں دعوتِ اسلامی دینے کے لئے جمع کرنے کا اسی کو ایک کامیاب طریقہ سمجھا۔ اور ہندوستان کے موجودہ چشتیہ طریقے کے انداز سے قوالی شروع کر دی، ثابت ہوا کہ ڈھول باجے پر عوام کے سامنے قوالی ہندوؤں اور دیگر کفار کا طریقہ اور ان کی ایک عبادت ہے۔ کتنی بدنصیبی کا دور ہے کہ مسلمانوں کے علماء بھی اس کو عبادت اور سنتِ سلفاء ثابت کرنے کی خاطر خطرناک کوشش کر رہے ہیں، چشتیہ اکابرین نے تو اس کو فقط بطور حیلہ استعمال کیا۔ جس طرح کہ دوائی بیمار کو کھلائی جاتی ہے کہ اس سے شفا حاصل ہو۔ یا جال پرندے کے لیئے لگایا جاتا ہے کہ قریب آئے۔ یا بھاگے ہوئے جانور کو گھاس دکھایا جاتا ہے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ قوالی حرام بلکہ فی زمانہ اشد حرام ہے۔ محققین کے نزدیک قوالی وہ حرام اور میٹھی دوائی ہے جو سخت مجبوری کے وقت مرشدِ برحق (جو دنیائے تصوف کا طبیب حاذق ہے) کے مشورے سے بیمارِ عشق کو دی جاتی ہے۔ اِس بیمار کی تین نشانیاں ہیں ۱ تین دن بھوکا پیاسا رکھا جائے، پھر ایک طرف کھانا پانی اور دوسری طرف قوالی، تو کھانے کی پرواہ نہ کرے، قوالی کی طرف دوڑے ۲ وجد حقیقی ہو، کہ اگر زنانِ مصر کی طرح انگلیاں بھی کاٹ دی جائیں، تو معشوق سے دھیان نہ ہٹے۔ ۳ شریعت کے کسی کام سے غافل نہ ہو۔ جب ایسا بیمارِ عشق ہو گا تب اُسکو سماع کی دوائی دی جائے گی، تاکہ اُس کو لذتِ ذکرِ یار سے وصالِ یار کا مزہ آئے چنانچہ عرب کہتا ہے۔ ''ذِکْرُ المَحبُوبِ کَوَصْلِہٖ''، اور عشق کی تڑپ میں کچھ سکون ہو۔ مگر چونکہ میٹھی دوائی تندرست نادان بچے بھی پینا چاہتے ہیں، اور پینے کی ضد کرتے ہیں، اِس لیئے عقلمند ڈاکٹر اور طبیب دوائی کو بڑے خفیہ طریقے پر رکھتے ہیں اور عزیزوں، نااہلوں سے بچاتے ہیں، کیونکہ تندرست یا اس دوائی والی بیماری میں نہ مبتلا شخص جب اس دوائی کو استعمال کرتا ہے تو دیگر طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، جیسا کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو شخص اپنی مرضی یا نیم حکیم کے مشورے سے دوائیاں کھاتا رہتا ہے۔ وہ ہزاروں بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بیمارِ عشقِ معرفت نہ ہو، اور قوالی سُنے تو منافقت، غفلت، فسق، گمراہی ہزاروں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہزاروں فسق اور بد معاشیاں انہی قوالیوں کے ذریعے ہو رہے ہیں تو جو شخص علی الاعلان ہر شخص کو قوالی سننے کی دعوت دے رہا ہے، وہ درحقیقت بحیثیت نیم حکیم کے خطرۂ جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے قوالی کی حرمت تو بالکل صاف اور واضح الفاظ میں با دلائل بیان کی۔ مگر اس کی حلّت بڑی قیود اور شرائط کے ساتھ صرف بیمارِ عشق جیسے حضرات کو بقدرِ ضرورت دی۔ جس طرح اسلام نے مردار شراب وغیرہ کی حرمت بڑے واضح اور بلند الفاظ میں بیان کی مگر بھوک سے مرتے ہوئے شخص کے لیئے بڑی قیود کے ساتھ استعمال کی اجازت دی۔ اسی لیئے علامہ شامی فرماتے ہیں۔ کہ قوّالی سُننے کے لیئے چھ ۶ شرطیں ہیں، وہ بھی اس لیئے کہ قوّالی بطور دوائی ہے، چنانچہ شامی شریف جلد پنجم ص ۲۵۶

پر ہے:- وَاِحْتَاجَ اِلٰی ذٰلِکَ اِحْتِیَاجَ الْمَرِیْضِ اِلَی الدَّوَاءِ وَلَہٗ شَرَائِطُ سِتَّۃٌ (ع۱) اَنْ لَّا یَکُوْنَ فِیْھِمْ اَمْرَدُ وَاَنْ تَکُوْنَ جَمَاعَتُھُمْ مِنْ جِنْسِھِمْ (ع۲) وَاَنْ تَکُوْنَ نِیَّۃُ الْقَوَّالِ الْاِخْلَاصَ لَا اَخْذَ الْاُجْرَۃِ وَالطَّعَامِ (ع۴) وَاَنْ لَّا یَجْتَمِعُوْا لِاَجْلِ الطَّعَامِ اَوْ فُتُوْحٍ (ع۵) وَاَنْ لَّا یَقُوْمُوْا اِلَّا مَغْلُوْبِیْنَ (ع۶) وَاَنْ لَّا یَظْھَرُوْا وَجْدًا اِلَّا صَادِقِیْنَ۔ وَالْحَاصِلُ اَنَّہٗ لَا رُخْصَۃَ فِی السَّمَاعِ فِیْ زَمَانِنَا لِاَنَّ الْجُنَیْدَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی تَابَ عَنِ السَّمَاعِ فِیْ زَمَانِہٖ:۔ یعنی حضرت جنید رح نے بھی سماع سے توبہ کر لی، اور اسی طرح شیخ سعدی رح گلستان میں اپنی توبہ کا ذکر فرماتے ہیں، ایک جگہ علامہ شامی جلد پنجم ص ۲۰۶ پر فرماتے ہیں۔ وَاِنْ کَانَ السَّمَاعُ غِنَاءً فَھُوَ حَرَامٌ بِاِجْمَاعِ الْعُلَمَاءِ وَمَنْ اَبَاحَہٗ مِنَ الصُّوْفِیَۃِ فَلِمَنْ تَخَلّٰی عَنِ اللَّھْوِ وَتَحَلّٰی بِالتَّقْوٰی۔ یہ تھے وہ دلائل جن سے قوالی کی حرمت مطلقاً ثابت ہوتی ہے، اب اس رسالے کی کمزوریاں ملاحظہ ہوں۔ اس کتاب کی غلطیاں بعض مقام پر قال۔ اَقُوْلُ سے بیان ہوں گی۔ آج تک میری نظر سے جتنے رسائل فی بیان حلتِ قوالی گزرے ہیں خواہ عربی خواہ اردو اس میں یہ کمزوری شدت سے موجود رہی ہے، (ع۱) دلائل میں بالکل من گھڑت خود ساختہ احادیث پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے حوالہ بھی نہیں دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ع۲ حلت میں کوئی صاف واضح روایت نہیں لاتے۔ ایچ پیچ کرتے ہیں۔ ع۳ اول صفحات میں جس چیز کو اپنے ہی قلم سے حرام کہتے ہیں بعد میں اسی کو حلال اور عبادت کے درجہ پر پہنچا کر تائید میں قواعد علوم کے سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ یہ کمزوریاں صرف اسی پمفلٹ میں نہیں ہیں بلکہ اس سے پہلے علامہ زرادی وغیرہ کے مصنفات میں بھی ہیں۔ جس سے اس مسلک کی لغویت بدرجۂ اتم ثابت ہے۔ میں نے صرف ان ہی دلائل کو پیش کر کے حرمت ثابت کی ہے، جس میں تاویل یا اصطلاح یا اشارے کی حاجت نہیں، ورنہ ایسے دلائل حرمت کے میرے پاس قرآن وحدیث کے بیشمار ہیں، جن کے ذریعہ کچی تاویلات سے حرمت ثابت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی غلطی ع۱ صفحہ نمبر ۱ اور صفحہ نمبر ۳ پر دو شعر لکھے ہیں:۔

شعر

واعظ بطعنِ بادہ پرستاں زباں کشاد
یارب تو ئی پناہِ مَن از شرِّ آں سفیہہ

ترجمہ:۔ عالم دین نے شراب کے پجاریوں کے طعنے میں زبان کھولی۔ اے رب اس ذلیل بے وقوف عالم سے مجھ کو پناہ میں رکھنا۔ اس شعر میں علمائے کرام کے لیئے وہی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قرآن کریم میں کافروں کے لیئے استعمال کیا گیا اور کافروں نے مومنوں کے لیئے بولا۔ دوسرا شعر:۔

منع سماع و نغمہ نے می کند فقیہہ
بیچارہ پے نہ برد بر سرِ نغمتُ فیہ

ترجمہ :- فقیہہِ اسلام سماع اور طبلے کی آواز سے منع کرتا ہے۔ بے وقوف نادان نغمتٗ فیہ کے راز تک نہ پہنچا۔ لفظِ بے چارہ اردو زبان میں، کم عقل، مجبور اور بے وقوف کو کہتے ہیں۔ دیکھئے لغات المنعم (ص۱۵۴) یہ شعر کسی عارف جامی نقشبندی کی طرف منسوب ہے۔ حالانکہ نقشبندی حضرات (آدام اللہ فیوضہم) تو قوالی کی لغویت سے سخت متنفر ہیں۔ اور اُن کے جدِّ اعلیٰ خواجہ صاحب ہی سماع و نغمہ سے منع فرماتے ہیں۔ اگر یہ شعر کسی نقشبندی کا ہی ہے تو گویا اُس نے اپنے خواجہ صاحب کو ہی بُرا بھلا کہا۔ (العیاذ باللہ) ان دونوں شعروں میں ایک شرعی مسئلہ بتانے پر علماء فقہاء کی توہین و گستاخی کی، گویا کہ فاضل مصنف کے نزدیک ڈوم، مراثی، طبلچی اور بازاری بھانڈ تو ذی علم اور صاحبِ عقل ہیں۔ اور نغمتٗ فیہ کے اسرار سے واقف ہیں، مگر علماءِ کرام جو شانِ اسلام ہیں، وہ اُن سے بھی گھٹیا درجہ کیا ایسا بیہودہ رسالہ "مزبلۃ النزاع" ہو سکتا ہے، بلکہ "مزیدۃ النزاع والفتن" علماء کی گستاخی کفر ہے۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص۲۱۳ پر ہے
مَنْ اَبْغَضَ عَالِمًا مِنْ غَیْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِیْفَ عَلَیْهِ الْكُفْرُ (اَیْ بِسَبَبٍ دُنْیَوِیٍّ) فَیَكُوْنُ بُغْضُهٗ لِعِلْمِ الشَّرِیْعَةِ لِاَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ۔ اور واعظ بھی علماء ہی ہیں۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص۲۱۴ پر ہے۔
لِاَنَّ الْمُذَكِّرَ وَاعِظٌ وَهُوَ مِنْ جُمْلَةِ الْعُلَمَاءِ وَخَلِیْفَةُ الْاَنْبِیَاءِ۔ اپنی کتاب "مقال العرفا" میں اعلیحضرت کے والدِ معظم قبلۂ عالم امیرِ ملت مولانا نقی علی خان اپنی کتاب فضل العلم میں، امام بغوی معالم التنزیل میں۔ امام جلال الدین سیوطی اپنی تالیف جامع الصغیر جلد دوم (ص۷) پر حدیث پاک فرماتے ہیں۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقِیْهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ (هٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ) :- رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَةَ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فقہائے کرام کی تعریف فرمائیں، اور یہ مصنف اُن کو بے وقوف و بے چارہ کہے، صَدَقَ الْعَرَبُ ذَمُّ الشَّیْءِ مَدْحُ ضِدِّهٖ۔ علم کی ضد جہالت ہے تو عالم کی ضد ابلیس ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے اسرارِ الٰہیہ ہیں جو بھانڈ مراثیوں کے طبلے سارنگیوں سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور بے علم، جاہل قوال کی طبلے کی تھاپ سے کون سے نغمتٗ فیہ کے بھید ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ان قوالیوں سے کتنے غوث و قطب بنتے ہیں، حالانکہ غوثِ اعظم پیرانِ پیر فرماتے ہیں "دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا" ولایت تو علم کے دروازے سے عطا ہوتی ہے۔ چشتیہ اکابرین بھی قوالی کو اتنی اہمیت کا درجہ نہیں دیتے جتنی فاضل مصنف نے دی۔ دیدہ دلیری تو دیکھئے۔ سیدنا ابن مسعودؓ امام اعظمؒ علامہ شامی جیسے تمام فقہاء اسلام کو سفیہہ کہہ دیا۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔ اسی ص۳ پر حضرت کاظمی صاحب قبلہ کا نام استعمال کرتے ہوئے بمدّ القاب لکھتے ہیں۔ مَظْهَرِ اعلیٰ حضرت :- یہ لقب علامہ صاحب قبلہ کے بیٹے میں کر

نزدیک مسلّم ہے، اور حقیقت بھی ہے مگر اعلیحضرت اپنے ملفوظات اور اپنی کتاب مسائل سماع میں قوالی مروجہ کو حرام فرماتے ہیں۔ چنانچہ ملفوظات مطبوعات اوّل ص۱۰ پر ہے، عرض کیا۔ یہ روایت صحیح ہے کہ حضرت محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبر شریف میں ننگے سر کھڑے ہوئے گانے والوں پر لعنت فرما رہے تھے۔ ارشاد۔ یہ واقعہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ (الخ) اب تو لوگوں نے بہت اختراع کر لیے ہیں۔ (الخ) حالانکہ اس وقت بارگاہوں میں مزامیر بھی نہ تھے (الخ) اور ملفوظات سوم ص۶ پر ہے، عرض۔ گراموفون کا کیا حکم ہے :۔ ارشاد۔ بعض باتوں میں اصل کا حکم ہے بعض میں نہیں، (الخ) اور گانے میں اصل کا حکم ہے، اگر اصل جائز یہ بھی جائز، اگر اصل حرام یہ بھی حرام، مثلاً عورت و امرد کی آواز نہ ہو مزامیر کی آواز نہ ہو، اشعار خلاف شرع نہ ہوں تو جائز ہے ورنہ (ان میں سے ایک چیز بھی ہوئی تو) نہیں۔ غور فرمائیے کہ اعلیٰ حضرت کے نزدیک تو مزامیر حرام ہیں، تو بھلا مظہر اعلیحضرت کے نزدیک کیسے جائز بلکہ عبادت ضروریہ ہو سکتی ہے، ورنہ مظہریت کیسے ہو سکتی ہے، کہ یہ اسم ظرف کا صیغہ ہے۔ مظہر میں ظاہر ہی کا تسلّط ہوتا ہے۔ مظہر کا اپنا نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے ص۹ پر لکھا ہے :۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ۔ اقول فاضل مصنف نے اس حدیث سے گانا باجا ثابت کیا ہے، یہ بہت بڑی چشم پوشی ہے، اس لیے کہ لفظ غنا مشترک اور مشترک کے لیے تعینِ معنیٰ بغیر قرینہ جائز نہیں یہی وجہ ہے کہ شارحین نے اس میں بہت تاویلیں کی ہیں بعض فرماتے ہیں، اس کا معنیٰ اچھی آواز، بعض کہتے ہیں اس کا معنیٰ تجوید، بعض فرماتے ہیں اس کا معنیٰ مخلوق سے بے نیازی۔ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد دوم ص۶۰۹ پر ہے مَعْنَاهُ الْاِسْتِغْنَاءُ عَنِ النَّاسِ۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی روایت کے معنیٰ میں بہت سے قول ہوں۔ تو ترجیح قرینے کو ہوتی ہے۔ یہاں قرینہ لیس منا والی سخت وعید ہے۔ ہمیشہ وعید اس چیز پر وارد ہوتی ہے، جس میں موعود لہ کو فعل یا ترک کا اختیار ہو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سریلی آواز انسانی اختیار سے باہر ہے۔ حالانکہ غناءِ صوفیانہ سریلی آواز سے ہوتا ہے۔ جب یہ کسی کے اختیار میں ہی نہیں تو اتنی سخت وعید کیسے ہو سکتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں استغناء مراد ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت بھی اسی کو ثابت کر رہی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ آخر میں اسی جواب کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ (قال) مفسرین کے نزدیک غناءِ صوفیہ مراد نہیں۔ (اقول) غلط ہے، مفسرین و فقہاء کے نزدیک صوفیانہ غنا جو مزامیر کے ساتھ ہو وہی حرام ہے، جس طرح کہ پہلے فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم ص۲۵۲ کا قول نقل کر دیا گیا۔ اور اشعۃ اللمعات جلد دوم ص۲۰ پر اس طرح فرماتے ہیں کہ جو شخص مذکورہ بالا حدیث سے موسیقی ثابت کرے یا اس کا جواز مانے، وہ مکروہ کا مرتکب ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔ اَمَّا التَّكَلُّفُ بِرِعَايَةِ الْمُوْسِيْقِيْ فَمَكْرُوْهٌ۔ پس واضح ثابت ہوا کہ اس حدیث پاک سے دلیل جواز پیدا کرنا

فعل مکروہ ہے، اور فقہائے کرام جب کبھی مطلق مکروہ فرماتے ہیں، تو مکروہ تحریمی مراد ہوتا ہے، جس طرح کہ فتاوٰی فتح القدیر اور شامی میں ہے، اور مکروہ تحریمی حرام کے درجہ میں ہے، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں (جلد اوّل صفحہ نمبر ص ۱۲۲)
وَعَلَی الْمَکْرُوْہِ تَحْرِیْمًا وَھُوَ مَاکَانَ اِلَی الْحَرَامِ اَقْرَبُ وَیُسَمِّیْہِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّیًا۔ جب تغنا کی تاویل موسیقی سے حرام ہے تو خود موسیقی کیوں نہ حرام ہوگی۔ فاضل مصنف اسی ص ۹ پر ایک حدیث پاک نقل فرماتے ہیں۔ یَا عَائِشَۃُ اَلَا تَغَنَّیْنَ فَاِنَّ ھٰذَا الْحَیَّ مِنَ الْاَنْصَارِ یُحِبُّوْنَ الْغِنَاءَ اَلْحَدِیْث تمام چشتی حضرات اور یہ مصنف ڈھول باجے قوّالی مروجہ کا جواز ثابت کرتے ہیں۔ **اقول**۔ اس حدیث پاک میں محدثین کرام بہت احتمال بیان فرماتے ہیں اور ان تمام احتمالات میں کسی جگہ بھی قوّالی اور ڈھول باجے کا ثبوت ظاہر نہیں ہوتا۔ صاحب مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد سوم صفحہ نمبر ص ۴۲۶ پر اسی کی شرح میں فرماتے ہیں۔
قَالَ التُّوْرِبِشْتِیُّ یَحْتَمِلُ اَنْ یَّکُوْنَ عَلٰی خِطَابِ الْغَیْبَۃِ بِجَمَاعَۃِ النِّسَاءِ وَالْمُرَادُ مِنْھُنَّ مَنْ تَبِعَھَا فِیْ ذٰلِکَ مِنَ الْاِمَاءِ وَالسَّفْلَۃِ فَاِنَّ الْحَرَائِرَ یَسْتَنْکِفْنَ مِنْ ذٰلِکَ یعنی یہ کام لونڈیوں اور کمینوں کا ہے
ع۲ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس میں صرف غنا کی نفیًا اجازت ہے، نہ ڈھول وغیرہ کا تیسرا احتمال یہ ہے، جو سب سے صحیح بھی ہے، کہ یہ لفظ اَلَا تَغَنَّیْنَ یا استفہام انکاری ہے، یعنی کہیں تم نے گانے والیوں کو برات کے ساتھ تو نہیں بھیج دیا۔ یا ترجمہ یہ ہے کہ اے عائشہ صدیقہ انصار کے رواج کے مطابق اس بارات میں عورتوں نے نغمہ بازی تو نہیں کی، اس سے ثابت ہوا کہ یہ نفرت کے لیے ہے نہ کہ اجازت یا اباحت کے لیے عقلاء کے نزدیک یہی احتمال زیادہ صحیح ہوگا، ورنہ اگر مصنف کا مطلب ہی صحیح تسلیم کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رنڈیوں کنجریوں غیر عورتوں مراثیوں خسروں کے ناچ گانے کی مکمل اجازت دے دی۔ (معاذ اللہ) بتائیے کیا اتنے احتمالات والی حدیث شریف سے حرام قوالی کا جواز ثابت ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دلیل ظنی سے حلت حرمت قطعی ثابت نہیں ہو سکتی، اصول حدیث کے نزدیک زیادہ احتمالات ظنی بنا دیتے ہیں۔ دیکھو خطبہ بخاری جلد اوّل۔ اس حدیث پاک کے توصیغے میں بھی احتمال ہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک اس کا فاعل تو عائشہ صدیقہ ہیں مگر یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ تمام شارحین اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نغمہ سازی نہیں جانتی تھیں۔ نہ ان کو کسی نے سکھایا۔ حالانکہ نغمہ، گانا بڑا محنت اور سیکھنے سکھانے اور مشق کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے کام کا حکم کیوں دیا۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ ہر شخص کا کام نغمہ گانا نہیں۔ اگر میری اس بات کا انکار ہے تو ثابت کرو کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی کسی محفل میں معاذ اللہ عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ نے گانا گایا ہو۔ آگے چل کر لکھا ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ مطلق غنا حرام نہیں ہے۔

اقول - جی ہاں مگر یہ بھی ثابت ہوا کہ مطلق جائز بھی نہیں اور وہی مرفتہ غنا - قوالی اس سے بالکل ثابت نہیں ہوتی - فاضل مصنف ص۵ پر فرماتے ہیں، لَھْوَ الْحَدِیْثِ کی لفظی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں - کہ لھو کھیل کو کہتے ہیں اور حدیث بات کو (الخ) **اقول** - یہ ایسی بیہودہ بات ہے کہ کوئی بھی عقل اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں - قواعد قرآنیہ کے مطابق لہو الحدیث بہر حال باطل محض ہے اور اس نسبت سے ہی باطل ہوئے انفرادی طور پر ہر حدیث باطل نہیں - مگر ہر لہو باطل ہے - یہی وجہ ہے کہ اگر نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم اِلَّا سے استثناء نہ فرماتے تو وہ تین بھی کُلّ کے تحت داخل تھے - استثناء سے صرف تین لہو خارج ہوئے - پس باقی تمام بطلان میں شامل - واضح رہے کہ یہ اِلَّا نسخ یا فسخ نہیں - جو کچھ اڑ جائے، بلکہ استثناء ہے - اب مدعی کے لیے کچھ گنجائش باقی نہ رہی، پس آیت میں لہو الحدیث مطلق ہے - لِیُضِلَّ اس کی قید یا صفت نہیں بلکہ علتِ اشترا ہے، اور خریدار کے خریدنے کی وجہ جیسے کوئی کہے، زید نے شراب خریدی. تاکہ بیچے تو بیچنا شراب کی قید یا صفت نہیں بلکہ علتِ غائی ہے، اسی طرح لِیُضِلَّ بھی لہو الحدیث کے خریدنے کی علت اور وجہ ہے، نہ کہ لہو الحدیث کی قید - جیسا کہ مصنف نے دھوکا دیا ہے:- نحوی قاعدے سے بھی لِیُضِلَّ قید نہیں ہو سکتا، کیونکہ قید دو قسم کی ہے، ع۱ اضافت، جیسے زید کا گھر - ع۲ صفت جیسے شریف آدمی - یہاں لِیُضِلَّ میں یہ دونوں باتیں نہیں لہٰذا ثابت ہوا - کہ لہو الحدیث مطلق حرام ہیں - اس لیے کہ حلال کی نسبت حرام کی طرف کُلّ کو حرام بنا دیتی ہے - لہو کُلّ حرام اور اور حدیث کُلّ حرام نہیں - لیکن جب اس حلال کی نسبت ہوئی لہو کی طرف تو وہ بھی کُلّ حرام، جہاں جہاں نسبت باقی - وہاں حرمت باقی - ص۱۱ پر جواب ع۶ میں لکھتے ہیں کہ جو شئی موجود مرئی اور مال شرعی نہ ہو اس کی خرید و فروخت کسی طرح معقول و مقصود نہیں ہو سکتی - **اقول** - یہ قاعدہ اصطلاحاتِ قرآنیہ کے خلاف ہے - باری تعالیٰ فرماتا ہے:- اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی (الخ) یعنی یہ لوگ ایسے ہیں - کہ انہوں نے گمراہی کو خرید لیا - تفسیر صاوی میں ہے:- اَلْمُرَادُ بِالضَّلَالَۃِ اَلْکُفْرُ:- گمراہی سے مراد کفر ہے، حالانکہ کفر نہ مرئی شئی ہے نہ مال شرعی - مگر پھر بھی اشترا کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوا - فقہاء کی اصطلاح میں اشترا کے لیے تین چیزیں ہونی ضروری ہیں، ص۱ دکھائی دینے والی چیز - ع۲، مال - ع۳، غیر کی ملکیت - لیکن رب تعالیٰ فرماتا ہے - اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ (الخ) - حالانکہ رب تعالیٰ خود ہی ہر چیز کا مالک ہے - قانون کے مطابق مالک مشتری نہیں ہو سکتا - پتہ لگا کہ قرآنِ کریم بہت موقعوں پر لغت کے معنیٰ پر حکم جاری فرماتا ہے - اسی طرح لہو الحدیث میں - اسی لیے مفسرین نے یہاں غناء لہو مراد لیا

اور موجودہ قوالیاں چونکہ غنا پر لہو ہیں، اس لیے حرام۔ مصنف کا جواب نمبر ۴ بالکل غلط ہے، حرمت کے لیے یہ قاعدہ
بھی کلیہ نہیں ہے، نہی کی یہ تعریف بھی اس جگہ درست نہیں، کیونکہ یہ نحوی تعریف اور یہ لفظی تعریف ہے۔ نہ یہ
منحصر ہے، نہ معنوی۔ دیکھئے لہو الحدیث کا خریدنا اس آیت سے حرام ثابت ہوا ہے مگر یہاں نہی کا لَا تَفْعَلْ کی شکل
کہیں نہیں آئی۔ مصنف کا یہ استدلال صرف نا سمجھی کی بنا پر ہے، ورنہ کل کو کوئی کہہ دے گا کہ زنا حرام نہیں، کیونکہ قرآن
کریم میں لَا تَزْنُوْا کا صیغہ نہیں آیا۔ کوئی دوسرا کہتا پھرے گا، خون، خنزیر، کتا، بلا حرام نہیں، کہ اس کے لیے بھی
لَا تَفْعَلْ کی نہی نہیں آئی۔ **جواب ۵:** بھی احمقانہ ہے، کیونکہ خود لہو حدیث کو حرام مانتے ہو یا نہیں، مراد
خواہ کچھ بھی ہو۔ اس کی حرمت سے انکار مجال نہیں، اگر تسلیم ہے تو ظنیت کہاں گئی۔ مفسرین کا اختلاف اگرچہ
الفاظ و اشیاء میں ہے مگر مقصود میں نہیں، مقصود سب کا ایک ہی ہے، اللہ سے غافل کرے، اور موجودہ
قوالیاں، ڈھول باجہ بدرجۂ اتم غافل کرتی ہیں۔ ورنہ شیطان کافر کو یہ نہ بتاتا، اور کفار یہ راستہ اختیار نہ
کرتے۔ ص۱۶ پر ارشاد ہے۔ **اعتراض:**۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اَلْغِنَاءُ۔ **اقول۔**
یہاں مصنف نے الفاظ روایت میں غلطی کی۔ صحیح روایت اس طرح ہے:۔ صَوْتُ اللَّهْوِ وَالْغِنَاءِ (الخ)
آگے لکھا ہے، **جواب۔** حدیث پاک میں ہے:۔ اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ وَّلَا يُنَجِّسُهٗ شَيْءٌ۔
ثابت ہوا کہ ہر پانی مراد نہیں۔ اسی طرح الغناء سے ہر غنا مراد نہیں، بلکہ وہ غنا جو لہو و لعب پر ہو، وہ
صوتِ شیطان ہے، ایسی غنا کو ہم بھی ناجائز اور حرام کہتے ہیں۔ پس مطلق غنا کی حرمت ثابت نہ ہوئی
اقول:۔ مصنف صاحب نے یہاں خوب دھوکا کھایا ہے، اور سخت ترین نحوی غلطی کی ہے
اس جواب میں آپ نے عجیب قیاس فرمایا ہے۔ آپ کا مقیس الغنا کا لفظ ہے۔ اور مقیس علیہ، الماء کا لفظ
حالانکہ یہ قیاس بالکل غلط ہے۔ مصنف کا قیاس الف لام کی وجہ سے ہے، وہ سمجھے شاید دونو جگہ الف لام
عہدی ہے۔ یہ ان کی کج فہمی ہے۔ کیونکہ الف لام کے تعین کے لیے بھی کوئی قرینہ یا دلیل چاہیئے میری تحقیق
کے نزدیک لفظ اَلْغِنَاءُ میں الف لام استغراقی ہے کیونکہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ غنا کو تشبیہ دے
رہے ہیں "الما" سے، یعنی جس طرح پانی گھاس اگاتا ہے اس طرح غنا کی نغمہ بازی نفاق اگاتی ہے۔ اور
یہ بات ظاہر ہے کہ ہر قسم کا پانی گھاس اگاتا ہے، اور یہاں لفظ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ میں الف لام
استغراقی ہے۔ اور نحوی قانون ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ لفظاً بھی ایک طرح کا ہونا چاہیئے۔ تو جس طرح
کا الف لام الماء میں اسی طرح الغنا میں بھی ہونا ضروری ہے۔ مصنف نے اس کو قیاس دوسری
حدیث پر کیا، وہاں واقعی الف لام عہدی ہے، کیونکہ وہاں پہلے بیر بضاعہ کا ذکر موجود ہے اسی پانی
کے متعلق سوال ہے۔ جیسا کہ ترمذی شریف کی پوری حدیث پاک سے ثابت ہے۔ حدیث

کے سوال نے پانی کو مخصوص کر دیا۔ یہاں لفظ الغناء میں کس چیز نے غنا کو مخصوص کیا۔ پس ثابت ہوا کہ قیاس غلط ہے اور عام غنا کی صفت ہے کہ نفاق پیدا کرتا ہے، لہٰذا عام غنا حرام، ہاں خاص غنا جس میں فقہاء کے قیود موجود ہوں، صرف وہی جائز ہیں۔ بغیر دلیل یہ کہہ دینا کہ یہاں الف لام فلاں ہے قابل قبول نہیں۔ الف لام کے تعین کے لیے قانونی دلیل دینی چاہیے۔ مصنف نے بہت جگہ آگے چل کر بھی اس طرح زیادتیاں کی ہیں ص۱۶ کے دوسرے اعتراض کا جواب بھی بہت غلط ہے، اعتراض کی حدیث پاک یہ ہے۔ عَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي طَرِيقٍ فَسَمِعَ مِزْمَارًا فَوَضَعَ اِصْبَعَيْهِ فِي اُذُنَيْهِ وَنَاءَ عَنِ الطَّرِيقِ اِلَى الْجَانِبِ الْاٰخَرِ ثُمَّ قَالَ لِي بَعْدَ يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا۔ قُلْتُ لَا فَرَفَعَ اِصْبَعَيْهِ مِنْ اُذُنَيْهِ۔ قَالَ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ صَوْتَ يَرَاعٍ فَصَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ قَالَ نَافِعٌ وَكُنْتُ اِذْ ذَاكَ صَغِيْرًا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤدَ (مشکوٰۃ شریف ص۴۱۱)

دیکھیے کتنی صاف اور واضح دلیل ہے، کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ حضرت نافع کسی راستے پر جا رہے تھے، ایک شخص (یقیناً کوئی یہودی ہوگا) ڈھول وغیرہ بجا رہا تھا، تو آپ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور وہ راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔ جب بہت دور چلے گئے تو نافع سے پوچھا، کہ کیا آواز آ رہی ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ تو آپ نے کانوں سے انگلیاں نکالیں اور فرمایا میں بھی اسی طرح ایک دفعہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، تو آپ نے بانسری بجنے کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اور راستے سے دور جا کر مجھ سے پوچھا، کہ کیا آواز آ رہی ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں، تو آپ نے انگلیاں مبارکہ نکال لیں۔ حضرت نافع فرماتے ہیں۔ کہ مجھ کو اس کام کا حکم نہ دیا۔ کیونکہ میں اس وقت بچہ تھا۔ (مکلف نہ تھا) یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کا ہر لفظ واضح اور ظاہر ہے، کسی تاویل، تحریف، ایچ پیچ کی ضرورت نہیں۔ مگر شیطان ابلیس کی خباثت کو کیا کہیں، کہ بے چارے مصنف کو کس راستے پر ڈال دیا۔ اور ایسی ایسی تحریفیں اور خود ساختہ باتیں کرائیں کہ (الامان الحفیظ)۔ مصنف نے اس کے جواب میں اولاً دو خیانتیں کی ہیں۔ نمبر۱ عربی عبارت درج نہ کی بلکہ میں نے لکھی ہے۔ نمبر۲ حدیث پاک کے آخری الفاظ کا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ ان ہی لفظوں میں مصنف کے تمام خود ساختہ بیہودہ احتمالات کا مکمل جواب ہے۔ پھر جواب دیتے ہوئے کیسی قلابازیاں کھاتے ہیں، اور قادیانی مارکہ تاویلیں کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ شاید اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے کان بند کر لیے تھے کہ آپ پر اس وقت وحی نازل ہو رہی تھی ۔ **قول** :۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ ، وحی کے نزول کا خاص طریقہ ہوتا تھا ۔ جس کا ذکر حدیث پاک میں موجود ہے ۔ کہ آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی ، اور آپ خلوت میں تشریف لے جاتے تھے ، اور بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے تھے ۔ چنانچہ دیکھیے مشکوٰۃ شریف باب بدء الوحی ص۵۲۲ ابن ہشام کی روایت ۔ اور پھر یہ آواز تو مخل تھی خود نبی کریم کا اپنا کلام سوال حضرت عبد اللہ سے اور حضرت عبد اللہ کا جواب ، اور راستہ چلتے دوسرے لوگوں کا شور و غل کیا مخل نہ ہوا ، حالانکہ جب کوئی شخص کسی چیز کے متعلق سوچ رہا ہو ، تو اپنا کلام اور بازاری شور بھی مخل ہو جاتا ہے ، اور وحی کے نزول کے ثبوت میں بھی مصنف کے پاس کوئی دلیل نہیں ۔ بہت ممکن ہے کے لفظ سے اپنا اختراع ٹھونسنا چاہتے ہیں ۔ مصنف دوسری دلیل پیش کرتے ہیں ۔ کہ اگر مزمار کی آواز حرام تھی ، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بجانے والے کو کیوں نہ روکا ، اور ابن عمر کو کان بند کرنے کا حکم کیوں نہ دیا ۔ ثابت ہوا کہ مزمار کی آواز سننا حلال ہے ؛۔ **قول** :۔ بلکہ بجانا اور ڈوم ، مراثی ، بھانڈ بننا بھی حلال و سنتِ اسلام ہوا ۔ مصنف کو چاہیے کہ خود بھی گلے میں ڈھول ڈال لے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عمداً ایسی کچی باتیں کر رہا ہے ؛۔ ورنہ ایسی صاف حدیث میں اس طرح کی غلطیاں کرنا کیا معنیٰ ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بجانے والے کو نہ روکنا یقیناً اس لیے ہے کہ وہ مراثی کافر تھا ، اور کافر اگر شراب بھی پیئے ، تو نہ روکا جائے گا ۔ لہٰذا نہ روکنے سے حلت ثابت نہ ہوئی ۔ اور حضرت ابن عمر کو حکم نہ دینا اس کی وجہ خود حضرت نافع نے بتا دی ، جس سے عمداً کترا کر مصنف صاحب گذر گئے ، کہ ابن عمر نے مجھ کو کان بند کرنے کا حکم میری نابالغی کی وجہ سے نہ دیا ۔ یہی وجہ اُس وقت تھی کہ ابن عمر بھی اس وقت چھوٹے تھے ۔ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ کا لفظ اشارۃً بتا رہا ہے کہ جس طرح نافع کو بوجہ بچپن حکم نہ دیا اسی طرح ابن عمر کو بھی نابالغی کی وجہ سے حکم نہ دیا ۔ یہی وجہ صاحب مرقات نے بیان فرمائی ، چنانچہ دیکھیے مرقاۃ جلد چہارم ص۴۲ پر ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے ۔ اس لیے کہ لڑکے کی مدت بلوغ پندرہ سال ہے ، جب کہ حضرتِ ابن عمر جنگِ احد کے وقت چودہ سال کے تھے ۔ چنانچہ اکمال لصاحب مشکوٰۃ شریف ص۲۱ پر ہے ۔ اَنَّہٗ اِسْتَصْغَرَ یَوْمَ بَدْرٍ ۔ وَرُوِیَ اَنَّہٗ رَدَّہٗ یَوْمَ اُحُدٍ لِاَنَّہٗ کَانَ لَہٗ اَرْبَعَ عَشْرَۃَ سَنَۃً ؛۔ اسی طرح تفسیر معالم التنزیل ص۱۲ علیٰ اربع تفاسیر جلد دوم ص۱۲ پر صحیحین کی روایت میں خود ابن عمر کا قول نقل فرما رہے ہیں (الخ) پس واضح ثابت ہوا کہ قوالی ، مزمار ، ڈھول ، باجہ سب حرام ہیں ۔ ورنہ کیا بات ہے کہ اس وقت ابن عمر کانوں میں انگلیاں نہیں ڈالتے ، مگر آج اپنے کان بند کر رہے ہیں ، کیا معاذ اللہ ان پر بھی وحی ہو رہی تھی ۔ ص۱۸ پر اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ وَتَلَذُّذُ بِہَا کُفْرٌ (الخ) ؛۔ والی حدیث کی صحت کا انکار کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ حدیث مرقاۃ جلد چہارم ص۴۲ پر ، اور فتاوٰی قاضیخان جلد سوم ص۴۰ پر ، اور فتاوٰی بزازیہ جلد سوم ص۳۵۹ پر بلا تنقید نقل فرما کر حرمتِ قوالی پر استدلال کرتے ہیں ۔ کیا یہ تمام شارحین و فقہاء غلط ہیں اور اکیلا مصنف صحیح ہے الفاظ حدیث میں تغایر ہو سکتا ہے ۔ مگر معنیٰ مضمون بالکل درست ہے ۔ یہاں تک

کہ ابو داؤد کے محشی اور ہدایہ شریف کے محشی علیہما الرحمۃ نے بھی اسی حدیث سے حرمت قوالی پر دلیل لی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ حدیث پاک دو وجہ سے غیر صحیح ہے۔ **ع۱** ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث :- قَالَ اَنْکَحَتْ عَائِشَۃُ ذَاتَ قَرَابَتِہٖ (الخ) **اقول** :- اس حدیث پاک سے بھی موجودہ قوالیاں حلال ثابت نہیں ہوتیں، نہ مطلقاً غناء کی حلت ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ حدیث مفصل نہیں بلکہ مجمل، کہ لفظ "لو" کا جواب پوشیدہ ہے۔ اور مجمل حدیث سے حلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ دوسری جرح یہ بھی اس حدیث پر ہو سکتی ہے، کہ "اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیَّانَا وَحَیَّاکُمْ" اس نغمے میں عورتوں کا اور کنواری لڑکیوں کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ اس گانے کا اگلا شعر ہے۔ لَوْلَا الْحِنْطَۃُ الْحَمْرَاءُ لَمْ تَسْمَنْ عَذَارَاکُمْ۔ (ترجمہ) :- کہ اگر سرخ گندم نہ ہوتی، تو تمہاری کنواری لڑکیاں موٹی تازی سرخ سفید نہ ہوتیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے نفسانی ہیجان کے شعر ہیں۔ یہ گانا زمانۂ جاہلیت کے گانوں میں سے ایک گانا ہے۔ آج کل کے فلمی گانوں اور اس میں کچھ فرق نہیں۔ کیا مصنف نے اس حدیث کو مرفوع کہہ دیا، حالانکہ شارحین اس کو موضوع کہتے ہیں، ورنہ کوئی فلمی گانا بھی حرام نہ رہے گا۔ **دوسری وجہ** مصنف کے نزدیک اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ والی روایت اس وجہ سے بھی غلط ہے، کہ اس میں پہلے یہ ہے :- وَالتَّلَذُّذُ بِھَا کُفْرٌ اور بعد میں ہے وَالْجُلُوْسُ عَلَیْھَا فِسْقٌ۔ مصنف کی عقل نے جوش مارا کہ کفر پہلے اور فسق بعد میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فسق پہلے ہوتا ہے کفر بعد میں، لہٰذا روایت غلط۔ **اقول** :- کیسی افسوسناک جرأت ہے جو عالم کی شان کے خلاف ہے، اسی گھمنڈ پر علامہ کاظمی جیسے محقق و مفکرِ اسلام کا نام استعمال کیا ہے۔ میں قبلہ کاظمی صاحب کی شخصیتِ علیہ سے باخبر ہوں، ایسی بچگانہ حرکتیں وہ نہیں کر سکتے۔ مصنف نے چکڑالویوں کی طرح حدیث پاک کی گستاخی کی، اور الفاظِ طیبہ طاہرہ کو بے ڈھنگی کہا۔ مصنف کو توبہ کرنی چاہیئے، مصنف نے کفر اور فسق کی جو بحث کی ہے، اس طریقے سے مصنف کی کم عقلی بے تحقیقی ثابت ہوتی ہے :- **ع۱** مصنف نے کہا چونکہ کُفْرٌ پہلے ہے اور فِسْقٌ بعد میں اس لیئے یہ حدیث غلط ہے۔ (معاذ اللہ) حالانکہ اصول فقہ کا اوّل طالب علم شاگرد بھی جانتا ہے کہ واؤ ترتیب کے لیئے نہیں آتی، بلکہ صرف جمع کے لیئے آتی ہے۔

اس لیئے حنفی فقہاء وضو میں ترتیب واجب نہیں مانتے، جب کہ شافعی حضرات روشِ کلام سے وجوبِ ترتیب کے قائل ہیں۔ ان کے جواب میں ہم اسی قانون کو پیش کرتے ہیں کہ واؤ ترتیب کے لیئے نہیں۔ اگر مصنف علام کے نزدیک تردیدِ حدیث کا یہی استدلال ہے۔ اور اسی کج فہمی کی بنا پر حدیث پاک کی عبارت کو بے ڈھنگا کہہ کر گستاخی کے مرتکب ہوئے تو، کل قرآن مجید کی عبارت کا بھی انکار کر دینا۔ اور آیتِ کریمہ کو بھی غیر صحیح قرار دیتے ہوئے، بے ڈھنگا کہہ دینا۔ (معاذ اللہ) دیکھو قرآن کریم پارہ سوم میں ارشاد ہوتا ہے :- یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ :- اللہ تعالیٰ

نے سجدہ کا ذکر پہلے فرمایا، رکوع کا بعد میں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ رکوع پہلے ہوتا ہے سجدہ بعد میں۔ دیکھئے ہمارے مصنف صاحب کیا فتوٰے لگاتے ہیں اس آیت پر تمام مفسرین اس آیت کے تحت یہی فرماتے ہیں کہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں اگرچہ بعض مفسرین نے صرف اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ شاید بنی اسرائیل میں سجدہ پہلے ہوگا، مگر میری تحقیق کے نزدیک یہ اندیشہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ تمام انبیاء کرام کی نمازیں بطریقہ ترتیب بالکل ایک جیسی تھیں، صرف الفاظ اور سجدہ کے اعضا کا فرق تھا۔ اسی لیے تفسیر روح البیان اور تفسیر نعیمی پارہ اول اور تفسیر صاوی شریف نے فرمایا کہ یہ پانچ نمازیں پانچ پیغمبروں کی یادگاریں ہیں۔ چنانچہ نمازِ مغرب حضرت ایوب علیہ السلام اور نمازِ فجر حضرت آدم علیہ السلام کی نماز ہے۔ اسی لیے نمازِ اسراء میں سب انبیاء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، مگر کسی کو ترتیبِ نماز سکھانی نہیں پڑی۔ معراج کی روانگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحالتِ قیام نماز پڑھتے دیکھا، ثابت ہوا کہ سابقہ انبیاء کی نمازوں کی ترتیب قیام وغیرہ بالکل اسلامی موجودہ نماز کی طرح تھا۔ اور رکوع پہلے ہی تھا، سجدہ بعد میں، مگر آیت میں سجدہ کا ذکر پہلے رکوع کا بعد میں۔ پس جب یہ آیت قابلِ اعتراض نہیں، تو مذکورہ حدیث پر کون اعتراض کر سکتا ہے۔ اور جو آیت کا جواب ہوگا، وہی یہاں بھی۔ ہاں ہمارے سجدے اور سابقہ دینوں کے سجدے کے اعضا اور طریقِ ادا میں قدرے فرق تھا۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ اَنْ اَسْجُدَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَعْظُمٍ۔ (الخ) (یعنی سات اعضا پر سجدے کا حکم صرف مجھ کو دیا گیا ہے، (نہ کہ پہلے دینوں میں۔)۔ اگر اس کے باوجود ہمارے مصنف اپنی ضد پر قائم رہتے ہوئے حدیث کا انکار ہی کیے جائیں، تو میں عرض کروں گا کہ کفر کا معنٰی وہ نہیں جو آپ نے سمجھا۔ بلکہ کفر بمعنٰے ناشکری ہے، جیسے کہ فتاوٰے بزازیہ جلد سوم ص۲۵۹ کی عبارت پہلے ذکر کی گئی، اور ناشکری بھی گناہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مصنف صاحب فتاوٰی بزازیہ کی بات نہ مانیں، تو ہم عرض کریں گے کہ فسق دو قسم کا ہے ۱۔ فسق عملی، ۲۔ فسق اعتقادی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ تمام مفسرین کے نزدیک اس آیت میں فاسق اعتقادی مراد ہے نہ کہ عملی۔ تو اسی طرح مذکورہ حدیث پاک کے آخری جملے وَالْجُلُوْسُ عَلَیْھَا فِسْقٌ میں بھی فسق اعتقادی مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ قوالی کو اچھا سمجھتے ہوئے اس میں بیٹھنا فسق اعتقادی یعنی کفر ہے۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ میں فسق اعتقادی مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اسی قسم کی دو آیتیں اسی رکوع میں ایک ہی موقعے پر نازل ہوئیں۔ وہاں بھی ایک ہی حکم سناتے ہوئے پہلے کفر کا ذکر کیا۔ پھر ظلم کا، پھر فسق کا۔ مصنف کو چاہیے کہ وہاں بھی کہہ دیں کہ معاذ اللہ یہ ترتیب بے ڈھنگی ہے کہ پہلے کفر کا ذکر بعد میں فسق کا۔ آیات اس طرح ہیں۔ ۱:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ

فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ ۲ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۳ ایک ہی بات ایک ہی حکم، مگر جزا میں تین لفظ، ۱ کفر، ۲ ظلم، ۳ فسق۔ اگر مصنف کی ناسمجھی کی طرح تینوں میں فرق کیا جائے، کتنا بڑا اعتراض پڑ جائے گا۔ مگر ذی عقل محقق ان کو ایک ہی درجہ کفر میں رکھتے ہیں، تاکہ کلام الٰہی پر اعتراض نہ پڑے، اسی طرح یہاں حدیث میں بھی فسق اور کفر ایک ہی درجے میں ہے یہ تمام گفتگو اس صورت میں تھی، جب حدیث پاک کی عبارت اس طرح ہو کہ:۔ اَلْغِنَاءُ حَرَامٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا کُفْرٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْهَا فِسْقٌ، جیسا کہ مصنف کتاب ہذا نے لکھا، مگر فتاویٰ قاضی خان جلد سوم صفحہ ۴۰۶ اور ابوداؤد کے حاشیہ صفحہ ۶۷۴ اور ہدایہ آخرین صفحہ ۴۵۳ پر حدیث پاک اس طرح ہے:۔ اِسْتِمَاعُ الْمَلَاهِیْ مَعْصِیَةٌ وَالْجُلُوْسُ عَلَیْهَا فِسْقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا مِنَ الْکُفْرِ۔ بروایت ابی ہریرۃؓ۔ اب کوئی اندیشہ ہی نہیں رہتا۔ اور مصنف کی عذر داری بھی ختم ہو جاتی ہے، ص ۲۰ پر ایک حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ یہ روایت:۔ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نُهِیْتُکُمْ عَنْ صَوْتَیْنِ اَحْمَقَیْنِ (الخ) غلط ہے بے چارے مصنف شاید کتب پر بھی نظر نہیں رکھتے، یہ حدیث صاحب تفسیر درِّ منثور نے اپنے استدلال میں نقل فرمائی ہے، مگر کچھ لفظوں کے تغیر سے۔ چنانچہ تفسیر درِّ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ص ۱۶۰ پر ہے:۔ وَاَخْرَجَ ابْنُ اَبِی الدُّنْیَا عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا نُهِیْتُ عَنْ صَوْتَیْنِ اَحْمَقَیْنِ فَاجِرَیْنِ صَوْتٌ عِنْدَ نَغْمَةِ لَهْوٍ وَلَعِبٍ وَمَزَامِیْرَ وَصَوْتٌ عِنْدَ مُصِیْبَةٍ:۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے مصنف صاحب سے صاحبِ درِ منثور زیادہ محقق ہے پھر حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس مذکورہ روایت کی تردید میں ایک ایسی لایعنی اور بے سروپا بات فرما رہے ہیں۔ جس کا کسی قانون کی کتاب میں ثبوت نہیں فرماتے ہیں کہ یہاں نُهِیْتُکُمْ کا لفظ ہے، جو ماضی کا صیغہ ہے۔ اور ماضی کے صیغہ سے کسی چیز کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیئے کہ ہو سکتا ہے، کہ ایک چیز سے زمانے میں منع فرمایا ہو، اور مستقبل میں اس کی اجازت دے دی ہو۔ **اقول**:۔ مصنف نے اپنی ضد پالنے کے لیئے کیسا عجیب قاعدہ گھر بیٹھے بنا لیا، اور سمجھا کہ شاید شریعت کے قاعدے ان کے گھر کے غلام ہیں کہ جس طرح چاہو، توڑ مروڑ لو (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ) مصنف کی اس بات پر چار طرح تنقید ہے ۔ ۱:۔ یہ قانون کہاں لکھا ہے کہ ماضی کے صیغہ سے حرمت ثابت نہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں حلت و حرمت کے حکم بیشتر ماضی کے صیغہ سے ہی ہیں، خواہ ماضی مجہول ہو، جیسے حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ (الخ):۔ خواہ ماضی استمراری ہو۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم ص ۱۱۴ پر ہے، طبرانی کی صحیح حدیث منقول ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ کَانَ یَنْهٰی عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْیًا شَدِیْدًا:۔ دیکھو تبتل ماضی کے صیغے سے

حرام ہوا۔ اور اب تک حرام ہے، کہ فرمایا:۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ:۔ خواہ ماضی معروف کے صیغے سے ہو، مثلاً اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو۔ اور تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۶۷ پر ہے:۔ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْتِ الْمُغَنِّيَةِ:۔ اور جامع صغیر لجلال الدین سیوطی جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۹۳ پر ہے:۔ نَهٰى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْفِطْرِ وَالنَّحْرِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ عَنْ عُمَرَ وَعَنْ اَبِي سَعِيْدٍ:۔ یہاں بھی ماضی کا صیغہ ہے اور عید کے دن کے روزے کو حرام کر رہا ہے۔ اور اس کا نسخ محال ہے۔ تفسیر روح المعانی گیارہویں جلد ص۷۹ پر ہے:۔ وَمَا تَرَكْتُ شَيْئًا يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ عَنِ الْجَنَّةِ اِلَّا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ۔ یعنی جنت سے دور کرنے والی اور جہنم کے قریب لانے والی تمام باتوں سے میں نے تم کو منع کر دیا۔ یہاں نھیتکم ماضی کا صیغہ ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جو چیز جہنم کے قریب کرے وہ حرام ہے۔ اور حرمت ثابت ہوئی:۔ نھیتکم کے صیغے سے مصنف کو کس نے اختیار دیا ہے کہ دل سے حرمت و حلّت کے قاعدے بناتے رہیں:۔

دوسری تنقید:۔ یہ قاعدہ تو پھر حلّت پر بھی جاری ہو جائے گا، کہ جس طرح بہت سی چیزیں پہلے حرام ہوئیں، پھر حلال ہو گئیں، اسی طرح بہت سی پہلے حلال ہوئیں، پھر حرام۔ تو چاہیئے کہ مصنف کے نزدیک ماضی صیغے سے نہ کوئی چیز حلال ہو، نہ فرض نہ واجب۔ اور جتنی چیزیں بصیغۂ ماضی قرآن و حدیث میں حلال اور فرض و واجب ہیں، سب کا انکار کر دو۔ اسی طرح قوالی کے علاوہ جتنی چیزیں ماضی کے صیغے سے حرام ہوئی ہیں۔ اُن کا بھی انکار کر دو۔ **تیسری تنقید**:۔ مصنف صاحب نے بصیغۂ ماضی حرمت کا انکار اس لیئے کیا ہے کہ ہو سکتا ہے، مستقبل میں یہ حکم یہ نہی منسوخ ہو گئی ہو۔ جیسا کہ ان کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہے:۔ **اقول**۔ ہو سکتا ہے، یہ احتمال تو فعل حال کے صیغے میں بھی ہے، اس لیئے کہ وہ حرمتیں جو فعل حال کے صیغے سے ہوئیں وہ بھی کئی مرتبہ منسوخ ہو گئیں۔ پس لازم آیا کہ مصنف کے نزدیک نہ ماضی کے صیغہ سے حرمت ثابت نہ حال کے، رہ گیا مستقبل تو وہ خبر ہے، حکم بن سکتا ہی نہیں۔ اور حلّت و حرمت حکم ہیں نہ کہ خبر۔ چلو چھٹی ملی نہ کوئی حلال، نہ کوئی حرام۔ واضح رہے کہ اسلام میں پانچ طرح حلّت و حرمت ماضی کے ہی صیغے سے ثابت ہوتی ہے، جیسے اوپر ثابت ہوا۔ ۲۔ جیسے کہ يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ ۳۔ امر جیسے:۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْتَنِبُوا الْكَبَائِرَ ۴۔ نہی جیسے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا ۵۔ اِيَّاكَ وَاِيَّاكُمْ وغیرہ جیسے اِيَّاكَ وَاَنْ تَظُنَّ:۔ اس رسالے کا یہ بیہودہ قاعدہ ناقابل قبول ہے، اسی ص۲۰ پر دوسرے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ **قال**:۔ اِس حدیث میں تین چیزیں بیان فرمائیں۔ حر۔ والحریر۔ معازف، جو لغت

عربی میں مطلق شرم گاہ یا عورت کی شرم گاہ کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو المنجد ص ۵۲۵ العزف، صَوْتُ الدَّفِّ۔ اقول بعض کے نزدیک پیش سے ہے۔ دُف۔ مگر صحیح یہ ہے، استعمال دونوں طرح ہے، اور بہتر ہے کہ دف بالفتح استعمال کیا جائے۔ کیونکہ بزرگانِ دین اور علماء ادب کے نزدیک کثرتِ استعمال بالفتح ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی گلستان شریف میں ص ۱۰۷ پر قوالی کی برائی میں ہی فرماتے ہوئے فرماتے ہیں۔ درمے در کفِ نبود ہ است وقراضہ در دَفْ لفظِ کَفْ متفقاً مفتوح الکاف، اسی مناسبت سے لفظِ دَفْ بھی یہاں مفتوح الدال ہے۔ **ثمّ اقول**:۔ ہمارے مصنف صاحب نے پہلی دفعہ اپنے دعوے پر حوالہ پیش کرنے کی جرأت فرمائی، مگر ایسا اندھا کہ اپنے ہی دعوے کو چکنا چور کر دیا۔ نہ معلوم آنکھیں بند کرکے تحریر کی ہے، یا شاید کسی قوالی سے حالتِ سکر پیدا ہو گئی ہوگی۔ دعوے تو ہے کہ معازف شرم گاہ کو کہتے ہیں، مگر دلیل لائے ہے کہ معازف دَف کی آواز کو کہتے ہیں۔ یہ تو اسی طرح ہے، کہ ہمارا ایک طالب علم جب پہلی دفعہ تقریر کرنے لگا، تو کہتا ہے، کہ مسلمانو! نماز پڑھو۔ کیونکہ رب فرماتا ہے:۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ؕ۔ کیسی عجیب دلیل ہے۔ شاید ہمارے مصنف بھی پہلی دفعہ تصنیف کر رہے ہیں۔ ص ۲۱ ص ۲۲ ص ۲۳ پر حلتِ غنا پر استدلال کرتے ہوئے پانچ روایتیں نقل فرماتے ہیں، اور غلط تشریح کرکے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ پہلی حدیث یہ ہے:۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَا بَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ فِي اَيَّامِ مِنًى تُدَفِّفَانِ وَتُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ وَالنَّبِيُّ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهِ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهِ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ یہ ہے ان کی مایۂ ناز دلیل جس پر فخر کرتے ہوئے ہر ڈھول ہر قوالی، ہر کنجر بازی، بھانڈ، مراثی، طبلے، سارنگی اور ہر بد معاشی کو جائز کہتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث پاک سے موجودہ قوالیوں پر دلیل لینا سخت گمراہی ہے:۔ اس کی شرح میں شارحین فرماتے ہیں کہ یہ کام چھوٹی بچیوں کا تھا، جو شرعی احکام کی مکلف نہیں ہوتیں کیونکہ شریعت اسلامیہ میں نابالغ یا نابالغہ پر کوئی حکم جاری نہیں ہوتا دیکھو بڑی عورتوں کو گڑیاں کھیلنا حرام ہے، مگر بچیوں کے لیے جائز ہے۔ بڑی عورتوں بڑوں کے لیے ترک نماز حرام مگر نابالغوں کے لیے جائز۔ اس حدیث پاک میں لفظِ جاریتان موجود ہے کہ یہ کام جاریتان کر رہی تھیں نہ کہ بڑی عورتیں۔ کیونکہ جاریہ عربی لغت میں نابالغہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ لغت کی مشہور کتاب مجمع البحار جلد اول ص ۱۹۱ پر طیبی شرح مشکوٰۃ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ اَلْجَارِيَةُ مِنَ النِّسَاءِ مَنْ لَمْ تَبْلُغْ۔ اور المنجد ص ۸۶ پر ہے:۔ اَلْجَارِيَةُ (مؤنث) اَلْجَارِيْ (اَلصَّبِيَّةُ) (الخ) لغات کشوری ص ۱۲۷، جاریۃ، چھوٹی بیٹی غرضیکہ ہر کتب لغت میں جاریہ نابالغہ کو کہتے ہیں۔ اور نابالغہ کو جاریہ کہتے بھی اس لیے ہیں، کہ اس پر کوئی شرعی پابندی نہیں ہوتی، بلکہ کسی کام سے گناہ گار نہیں ہوتی۔ یہی مسئلہ سمجھانے کے لیے حضرت صدیق اکبر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ اس حدیث پاک کو صحیح سمجھنے کے لیے تین باتیں

قابل غور ہیں۔ ع۱ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھ کر کیوں لیٹے ع۲ صدیق اکبر نے منع کیوں فرمایا وہ خود تو صاحبِ شرع تھے نہیں، نہ اپنے پاس سے کوئی شرعی قانون بنا سکتے تھے۔ ع۳ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیوں روکا۔ اور کیوں فرمایا :۔ دَعْهُمَا۔ اگر انسان کی عقل درست ہو اور صحیح عقل سے سوچا جائے، تو اس حدیث پاک سے حرمتِ قوالی ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ ع۱ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اس لیئے اوڑھی، تاکہ یہ مسئلہ ثابت ہو جائے کہ اس سے بے رغبتی ہی کرنی بہتر ہے، اگرچہ بصورتِ جائز بھی ہو اور کسی بالغ کو اس سے دلچسپی نہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ روح المعانی۔ ج ۲۱ ص۷ پر ہے :۔ وَمَعَ هٰذَا اَشَارَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْتِفَافِهِ بِثَوْبِهِ وَتَحْوِيْلِ وَجْهِهِ الشَّرِيْفِ اِلٰى اَنَّ الْاِعْرَاضَ عَنْ ذٰلِكَ اَوْلٰى۔ ان بچیوں کا ڈھول بجانا اور گانا لذت آمیز نہ تھا، بلکہ محض دل بہلاوا تھا۔ چنانچہ ام المومنین۔ حضرت عائشہ صدیقہ خود فرماتی ہیں :۔ قَالَتْ لَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ (ھکذا فی تفسیر روح المعانی جلد۲۱ صفحہ نمبر ۷) اور غنا اونچی آواز اور ترنم کو کہتے ہیں، جو بہت مشق اور شاگردی سے حاصل ہوتی ہے :۔ چنانچہ روح المعانی جلد۲۱ میں ہے :۔ لِاَنَّ الْغِنَاءَ يُطْلَقُ عَلٰى رَفْعِ الصَّوْتِ وَعَلَى التَّرَنُّمِ (الخ) بچیوں کی آواز میں ترنم نہیں۔ اور لذت ترنم سے پیدا ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ عرفی غنا نہیں، حضرت صدیقہ کا سننا توجہ سے نہ تھا، نہ لذت لینا تھا، بخلاف موجودہ قوالی کے کہ وہ صرف لذتِ نفسانی کے لیئے سنی جاتی ہے۔ اس لیئے حرام ہے۔ ع۲ :۔ حضرت صدیق اکبر کا منع کرنا اس لیئے تھا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ پاک سے بہت دفعہ سنا تھا، کہ، ڈھول، باجہ، طبلہ، سارنگی، مزمار، جلاجل دف وغیرہ مردوں عورتوں کے لیئے حرام ہے اور متعدد احادیث اُن کے کانوں نے اِس بارے میں سنی تھیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے سُنا، کہ :۔ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِيْ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ وَاَمَرَنِيْ بِمَحْوِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيْرِ (الخ) :۔ اور کبھی اس زبانِ الہیہ سے یہ کلام بھی سُنا :۔ بُعِثْتُ لِكَسْرِ الْمَزَامِيْرِ وَقَتْلِ الْخِنْزِيْرِ۔ (از تفسیر روح البیان جلد ھفتم ص۶۷) ان فرمودات کی وجہ سے آپ نے بچیوں کے گانے بجانے کو بھی حرام سمجھا۔ اسی لیئے اس کو مزمار شیطان بھی فرمایا۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے، (از روح المعانی جلد اوّل صفحہ نمبر ص۷ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی تھی۔ صدیق اکبر سمجھے کہ حضورِ اقدس نیند میں ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوتے تو ابوبکر صدیق کبھی نہ روکتے اور قیامت تک یہ مسئلہ ہم کو معلوم نہ ہوتا، کہ بچیوں کا اوندھا سیدھا گانا غنا اور قوالی نہیں، بلکہ دل بہلاوا ہے جس سے بڑوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ حرام نہیں۔ حضرت عائشہ رضی کا یہ فرمان :۔ جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ بمعنی عرفی غنا نہیں، بلکہ لغوی غنا یعنی اشعار پڑھنا ورنہ لَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ نہ فرماتیں۔

۳ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا، کہ اے ابوبکر! چھوڑ دو، کہ یہ عید کا دن ہے، اس نے واضح کر دیا، کہ عید کا دن بچوں کے دل بہلانے کا دن ہوتا ہے۔ ان کو اپنا دل بہلانے دو، ان پر شرعی احکام نہیں کہ یہ حرام ہو، تم اس سے بے رغبت ہو جاؤ، جس طرح میں بے رغبت ہوں۔ یہ تھی اس حدیث پاک کی سچی با حوالہ تشریح۔ مگر کتنی افسوسناک جہالت ہے کہ اس کو دلیل بنا کر ہر بھانڈ، مراثی، طبلچی قوال کو قوالی جیسے فعل حرام کے لیے کھلی چھٹی دی جائے۔

دوسری روایت:۔ عَنِ الرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ قَالَتْ جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ حِيْنَ بُنِيَ عَلَيَّ فَجَلَسَ عَلٰى فِرَاشِيْ كَمَجْلِسِكَ مِنِّيْ فَجَعَلَتْ جُوَيْرِيَاتٌ لَنَا يَضْرِبْنَ بِالدُّفِّ۔ (الخ)۔ اس پر بھی مصنف صاحب نے بہت بے پر کی ہانکی ہیں، اور قوالیِ زنان و مرداں پر دلیل لی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی لفظِ جویریات موجود ہے۔ جو بتا رہا ہے کہ یہ بھی بچیوں کا فعل ہے، جو شریعت کی مکلف نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سننا نغموں کی یا ترنم کی لذت کی وجہ سے نہیں، بلکہ بچوں کی زبان سے ہر چیز پیاری لگتی ہے۔ یہاں تک کہ بچہ گالی دے تو بھی اس کو مارا پیٹا نہیں جاتا۔ بلکہ بڑے بوڑھے سن کر ہنستے ہیں۔ حالانکہ یہی گالی بڑے کے لیے بولنا حرام ہے، گالی پر شرعی تعزیر واجب ہوتی ہے، دیکھو کتب فقہ۔ بچے مرفوع القلم ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کہ ایک دفعہ انوار العلوم کے جلسے میں، میں نے اپنے والدِ محترم کے ہمراہ شرکت کی، علامہ کاظمی صاحب قبلہ ہم کو اپنے گھر لے گئے۔ دورانِ مجلس علامہ صاحب کا پوتا، یا نواسہ مردانے میں تشریف لایا۔ غالباً کسی نے اس کو چھیڑ دیا۔ جس پر اس نے سخت ترین گالی دی، توتلی زبان سے گالی تھی۔ سب علماء ہنس پڑے، غالباً گالی کھانے کے لیے ہی چھیڑا ہوگا۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ گالی دینا سب کے لیے جائز ہے۔ کسی عالم نے اس بچے پر حرام کا فتویٰ نہ لگایا بچوں کی حرکتیں نہ حرام ہوتی ہیں نہ گناہ۔ بچگانہ فعل کو نہ روکنا دلیلِ قوالی نہیں بن سکتی۔ یہی ڈھول جب بچیاں بجاتی ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کہتے۔ لیکن اسی ڈھول کی آواز جب کسی بڑے آدمی سے سنتے ہیں، تو کان مبارک بند کر لیتے ہیں۔ یہ فرق کیوں؟ صرف اسی لیے کہ ڈھول مطلقاً حرام ہے۔ خواہ کافر بجائے یا مسلمان۔ عورت بجائے یا مرد، جب کہ ترنم سے بجائے مگر بچہ غیر مکلف، اس کا وہ فعل بھی حرام نہیں۔ جو دوسروں کے لیے ہر حالت میں حرام۔ مصنف صاحب افسوس ہے کہ بچوں کی حرکات پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہو۔ کسی بڑے کی سند پیش کرو۔ مصنف کی پیش کردہ تیسری

حدیث:۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلِنُوْا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوْا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۷۲)

اس حدیث پر بھی، مصنف نے دلیل لی ہے، کہ مطلقاً قوالی جائز ہے۔ **اقول** :۔ یہ محض مصنف علامہ مدظلہ کی نادانی کم تحقیق ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اس حدیث سے دف بجانے کا ثبوت، اور قوالی کی حلت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس روایت سے بھی پچھلی روایات کی طرح حرمتِ قوالی ہی ثابت ہوتی ہے، اس کی تین وجوہ ہیں، ع۱ اس حدیثِ پاک کا پہلا جملہ بالکل درست ہے، اور سنداً، گویا حدیث پاک کے الفاظ صرف اتنے ہیں، اَعْلِنُوا النِّكَاحَ۔ اور ایک روایت میں پوری حدیث اس طرح صحیح ہے:۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْلِنُوا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ:۔ لیکن اگلا جملہ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوْفِ یہ ضعیف ہے اس کو نبی کریم کا حکم کہنا ہرگز درست نہیں۔ چنانچہ بلوغ المرام صفحہ ۲۰۴ پر ہے:۔ وَعَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ اَبِيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَعْلِنُوا النِّكَاحَ رَوَاهُ اَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ:۔ اور اس کے حاشیہ پر ہے وَرَوَاهُ اِبْنُ مَاجَةَ عَنْ عَائِشَةَ وَفِيْهِ زِيَادَةٌ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالْغِرْبَالِ وَهُوَ عِنْدَ التِّرْمِذِيْ بِلَفْظِ بِالدَّفِّ۔ قَالَ الْحَافِظُ فِي الْفَتْحِ، سَنَدُهُ ضَعِيْفٌ:۔ ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے، اور اس کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے، کہ اس کی سند میں ایک راوی عیسٰے بن میمون ہیں، جو ضعیف ہے۔ اور بیہقی نے فرمایا کہ اس کا ایک راوی خالد بن ایاس منکر الحدیث نے فرمایا، وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ والی روایت بھی غریب ہے۔ احمد نے فرمایا اس قسم کی روایات بہت سی مرقوم ہیں جس سے دف کے بجانے کی اجازت ملتی ہے۔ مگر سب کی سب غیر صحیح ہیں، اور سب میں کچھ نہ کچھ گفتگو ہے، یہ سب عبارت شرح الحدیث کی مشہور کتاب سبل السلام جلد سوم صفحہ ۱۴۱ سے نقل ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَفِيْ رِوَايَةِ عِيْسَى ابْنُ مَيْمُوْنٍ ضَعِيْفٌ كَمَا قَالَ التِّرْمِذِيُّ وَاَخْرَجَهُ اِبْنُ مَاجَةَ وَالْبَيْهَقِيْ وَفِيْ اِسْنَادِهٖ خَالِدُ بْنُ اِيَاسٍ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ (الخ) ع۲ اس حدیث میں ارشاد ہے، وَاضْرِبُوا عَلَيْهِمْ بِالدُّفُوْفِ لفظ اِضْرِبُوْا مطرد کے باب دوم ضَرَبَ يَضْرِبُ کا امر نہیں، بلکہ باب افعال کا امر ہے اور ضَرْبٌ بمعنیٰ اِضْرَابٌ اور اس میں مذکر مردوں کو بجانے کا حکم نہیں، بلکہ چھوٹی بچیوں سے بجوانے کا اختیار ہے۔ اور یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اَعْلِنُوْا یعنی نکاح کا اعلان ہونے دو، خود اعلان نہ کرو، بلکہ کرواؤ۔ یعنی خوب شور و غل جو بچے ایسے موقعوں پر مچاتے ہیں، مچاتے دو۔ اور بچیاں اگر دف ڈیرہ یا پیپا پے کر بجانے بیٹھ جائیں، تو ان کو نہ روکو، بلکہ کہو خوب بجاؤ۔ تاکہ

نکاح میں کبھی کوئی جھگڑا پیدا ہو، تو بستی کے لوگ گواہی دے سکیں۔ چنانچہ بلوغ المرام صہ ۲۰۳ پر ہے:۔ وَهٰذَا اِنَّمَا هُوَ لَهْوُ الْفَتَيَاتِ وَغِنَاءُ مُوَيْجِبَاتِ الْعَرُوْسِ لَا مَا عَلَيْهِ عَامَّةُ الْيَوْمِ مِنْ اِحْضَارِ نِسَاءٍ فَاجِرَاتٍ مُحْتَرِفَاتِ اللَّهْوِ وَالْفُسُوْقِ:۔ یعنی حدیث پاک میں دلہن کی سہیلیوں اور چھوٹی بچیوں کا دف بجانا اور گیت گانا مراد ہے، نہ کہ قوالوں، بھانڈ، مراثیوں اور رنڈیوں کے گانے باجے۔ تاکہ کوئی شخص حرام کا مرتکب بھی نہ ہو، اور اعلان بھی ہو جائے مقصود اعلان ہے نہ کہ دف۔ لہٰذا اگر کسی اور طریقے سے اعلان اچھی طرح ہو سکے تو دف کی حاجت نہ رہے گی میرے نزدیک فی زمانہ سب سے اچھا اور مؤثر اعلان دولہا کا سہرا ہے کہ اس کو باندھ کر پوچھنے کی بھی حاجت نہیں ہوتی، کہ یہ کیا ہو رہا ہے، پھولوں کے ہار، ڈھول، دف وغیرہ ایسا اعلان نہیں ہوتا، جیسا کہ سہرے میں، کیونکہ ہار وغیرہ تو نکاح کے علاوہ اور دولہا کے علاوہ بھی پہن لیے جاتے ہیں اور ڈھول باجہ نکاح کے علاوہ بھی بجائے جاتے ہیں، مگر سہرا صرف نکاح اور دولہا کے لیے مخصوص ہے۔ ہر شخص گواہی دے سکتا ہے کہ ہم نے اس کو فلاں دن سہرا باندھے دیکھا ہے۔ اس لیے بجائے ڈھول باجہ بجانے کے سہرے کو رواج دیا جائے تو بہتر ہے، پھولوں کا سہرا حرام بھی نہیں، اور اعلان بھی بہترین ہے۔ وہابیوں کو اس سے منع نہ کرنا چاہیئے:۔ بہر حال اس حدیث میں قوالی کا ثبوت نہیں، بلکہ بچیوں کا گانا بجانا مراد ہے، اگر یہاں:۔ فَاضْرِبُوْا بمعنے ضرب بجانا ہے، اور اس میں مذکر مردوں کو خطاب ہے جیسا کہ مصنف نے اس رسالے کے صہ ۲۵ پر لکھا ہے، تو اولاً لازم آتا ہے کہ ہر نکاح کے موقعہ پر دولہا اور دولہا کا باپ، بھائی چچا تایا، خود ڈھول باجہ، طبلہ، وغیرہ لے کر بجائیں، اور مصنف صاحب کے صاحبزادے کی اگر شادی نکاح ہو، تو مصنف صاحب خود طبلہ ڈھول اپنے گلے میں ڈالیں، اور مسجد کے محراب ممبر میں کھڑے ہو کر (العیاذ باللہ)۔ خوب بجائیں:۔ دوم:۔ اس حدیث کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف قوالی ہی جائز نہ ہو بلکہ تمام رنڈیوں کا بلانا، مراثیوں کا آنا مروجہ برات بجانے والے جو سڑکوں پر بجاتے پھرتے ہیں، سب جائز بلکہ مصنف کے نزدیک واجب ہونے چاہئیں۔ کیسی عقل ماری گئی ہے۔ حالانکہ سب علمائے کرام آج تک اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہ روایت بالکل موضوع ہے، صرف اتنی روایت درست ہے:۔ اَعْلِنُوْا النِّكَاحَ باقی لفظ کسی نفس پرست نے اپنے پاس سے ملائے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہوا، اگر فرضاً تصور بھی کرو تو مطلب یہ ہی ہوگا کہ یہاں بچیوں کا گانا باجا مراد۔ کیونکہ لفظ فَاضْرِبُوْا باب افعال کا امر ہے اور باب افعال کی آٹھ خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت لازم کو متعدی کرنا۔ چنانچہ مجموعہ پنج گنج صہ ۲۷ پر ہے، وخاصیت باب افعال ہشت چیز است (۱) تعدیہ (الخ) اور متعدی میں کام کا کروانا پایا جاتا ہے۔ تو ترجمہ یہ ہوا کہ تم دف بجواؤ

جس کے بجانے سے حرمت لازم نہ آئے۔ وہ کون ہیں، بالغ مرد و عورت نہیں بلکہ بچیاں۔ ورنہ ان احادیث کا تعارض پیدا ہو گا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دف سے منع فرمایا۔ چنانچہ جامع صغیر جلد دوم ص۱۹۳ پر ہے:۔ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ضَرْبِ الدَّفِّ وَلَعْبِ الصَّنْجِ وَضَرْبِ الزَّمَارَۃِ۔ اور کتاب کنوز الحقائق جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۴۲ پر ہے:۔ نَھٰی عَنْ ضَرْبِ الدَّفِّ وَلَعْبِ الصَّنْجِ (الخ) رواہ الخطیب:۔ اور تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۶۷ پر ہے:۔
نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْتِ الْمُغَنِّیَۃِ:۔ جب احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہو، تو ذی عقل علماء کا کام ہے کہ اس طرح شرح کریں جس سے ہر دو پر عمل ہو سکے۔ چنانچہ یہاں اسی طرح کرنا لازم ہے، کہ پہلی روایت میں اگر درست ثابت ہو جائے، تو مطلب ہے بچیوں کا دف بجانا اور ان روایات میں ممانعت ہے بالغوں کو۔ مصنف کی پیش کردہ چوتھی روایت:۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَاطِبِ الْجُمَحِیِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْفَصْلُ مَا بَیْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الصَّوْتُ وَالدَّفُّ فِی النِّکَاحِ (مشکوٰۃ شریف) ظاہری نگاہ سے اس کا جواب یہی ہے، کہ یہ دف بھی وہی ہے، جو پہلے بیان کر دیا، یعنی بچیوں کا شور و غل اور دف اسی لیے یہاں لفظ صوت ارشاد ہوا۔ مگر مصنف کو ان تفکرات کی ضرورت کیا ہے۔ وہ تو بس بیہودہ قوالیوں کی حلت کے پیچھے لگے ہیں دلیل بنے نہ بنے اُن کو کیا۔ یہ تو اس روایت کے بارے میں سرسری گفتگو تھی۔ لیکن اگر ذرا تحقیق کی گہرائیوں میں جاکر دیکھو، تو واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث بھی مصنف کی دلیل نہیں بن سکتی نہ ہی حلت و حرمت کے درمیان تمیز ہے نہ ہی حلت کو ظاہر کرنے والی، بلکہ اگر یہ روایت اسناداً صحیح بھی ہو تب بھی فقط یہ ایک مشابہت رواجیہ ہے، یعنی اکثر غلط اور حرام نکاح خفیہ ہوتا ہے، جائز نکاح دھوم دھام سے تو یہ روایت بطور جملہ خبریہ ہے نہ کہ انشائیہ۔ اور علم اصول کے مطابق جملہ خبریہ سے اصلاً حکم یا قانون یا وجوب یا تمیز ثابت نہیں ہوتی:۔ اگرچہ بعض جملہ خبریہ سے بوقت قرینہ حکم بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ جسکی امثلہ متعددہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں، مگر اصلیت کے خلاف۔ یہ تھی اس روایت کی تشریح۔ اب ذرا محدثانہ جرح بھی ملاحظہ ہو:۔ چنانچہ شرح اربعہ ترمذی جلد دوم ص۲۵۲ پر ہے:۔ وَفِی الْبَابِ عَنْ عَائِشَۃَ اَخْرَجَہُ التِّرْمِذِیُّ وَفِیْہِ رَاوٍ ضَعِیْفٌ۔ یعنی یہ روایت ضعیف ہے کہ اس میں بھی ایک راوی ضعیف ہے۔ جامع صغیر جلد دوم ص۷۵ پر اس کو صحیح کہا ہے، احمد نے اس کو حسن کہا ہے، مگر ان تمام اقوال کے باوجود یہ قابل حکم نہیں کہ اس کے راوی محمد بن حاطب بن حارث بن معمر جمحی، نابالغ صحابی ہیں۔ ص۲۵۲ شرح اربعہ ترمذی جلد دوم میں ہے۔ محمد بن حاطب (الخ) اختلاف است در کنیت وے صحابی صغیر است

اور ص ۲۵۳ پر ہے۔ وَمُحَمَّدُ بْنُ حَاطِبٍ قَدْ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ غُلَامٌ صَغِيْرٌ۔ اسی طرح ترمذی شریف ص ۱۲۹ جلد اوّل میں ہے۔ اور اصولِ حدیث کے مطابق جس طرح کافر کی روایت عدم تقابل کے وقت معتبر ہے۔ اور جب صحابی کی روایت سے مقابلہ ہو جائے۔ تو مردود ہے اسی طرح نابالغ کی روایت جب کسی بالغ ثقہ کی روایت کے مقابل نہ ہو۔ تو معتبر جیسے امام حسن اور امام حسین ابن عباس وغیرہم کی روایات کیونکہ یہ بھی نابالغ صحابی تھے اور ان کی روایات معتبر۔ لیکن جب کسی نابالغ کی روایت بالغ کی روایت کے مقابل ہو جائے۔ تو غیر معتبر جیسے کہ تمام محققین کے نزدیک عدمِ رؤیت باری تعالیٰ اور معراج میں دیدارِ الٰہی نہ ہونے کی روایت صرف اس لیے ناقابلِ قبول ہے۔ کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت کرتی ہیں۔ جو معراج کے وقت نابالغہ تھیں اور تمام صحابہ بالغین کے مقابل ہے۔ هٰكَذَا قَالَ أُسْتَاذِي سَيِّدِي سَنَدِي حَكِيْمُ الْأُمَّتِ أَبِي مُفْتِي أَحْمَد يَار خَان فِي شَرْحِهِ مرآۃ چونکہ محمد بن حاطب بھی نابالغ راوی ہیں اور تمام اکابر صحابہ دف کی ممانعت کی روایت فرماتے ہیں جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ حیرت ہے کہ مصنف صاحب نے اپنے رسالے میں حضرت عائشہ صدیقہ کی، بچیوں والی روایت تو پیش کر دی، مگر انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وہ روایت پیش نہ کی جو درِّ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۵۹ پر درج ہے۔ عَنْ اِبْنِ مَرْدَوِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْقَيْنَةَ وَبَيْعَهَا وَثَمَنَهَا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے گانے والیوں کے گانے کو حرام کر دیا (الخ) اب واضح ہو گیا کہ ان احادیث سے حلتِ قوالی کی دلیل لینا سخت غلطی ہے چنانچہ مصنف کی اسی پیش کردہ روایت کے متعلق علامہ محدث بیہقی فرماتے ہیں، قَالَ بَيْهَقِي فِي سُنَنِهِ ذَهَبَ بَعْضُ النَّاسِ بِهِ اَنَّ التَّمَامَ وَهُوَ خَطَأٌ (شرح الربعہ ترمذی جلد دوم ص ۲۵۲) حیرت ہے کہ مصنف نے اس روایت سے دف اور طبلے، سارنگی کو حرام اور حلال کے لیے تمیز سمجھ لیا۔ کتنی خطرناک حماقت ہے، اگر اس کو حقیقت سمجھ لیا جائے، تو لازم آئے گا۔ کہ جس نکاح میں دف نہ ہو وہ حرام ہو، اگرچہ شریعت کی ساری باتیں ہوں۔ اور پھر آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام نکاح مبارکہ میں اور حضرت فاطمہ زہرا کے نکاح پاک میں قطعاً دف کا ثبوت نہیں ملتا مصنف ان پر کیا فتویٰ لگائے گا۔ کیا قوالی کی خاطر دین سے بھی ہاتھ دھونا ہے، مصنف کو میرا مشورہ ہے کہ ایسے غلط رسالے اور عقیدے سے جلد از جلد توبہ کریں۔ مصنف نے لفظ فصل پر بھی غور نہ کیا، اور آنکھیں بند کر کے دلیل بنا ڈالی۔ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ پانچویں پیش کردہ روایت :۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا فَقَالَ مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ قَالَ كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ اَبْدَلَکُمُ اللّٰہُ بِھِمَا خَیْرًا مِّنْھُمَا یَوْمَ الْاَضْحٰی وَیَوْمَ الْفِطْرِ۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۱۲۶) قوالی کے رسالے میں مصنف کا اس حدیث کو پیش کرنا مصنف کی نیت کا پتہ دیتا ہے کہ قوالی کی آڑ میں مصنف مذکور ہر فحاشی ہندوانہ رسومات سینما جوئے بازی ہولی، دیوالی، آتش بازی، بھنگڑا، ڈھول، رنڈی، تمام جہالت کی باتوں کو عوام میں جاری کرنے کے خواہشمند ہیں، کہ لکھتے ہیں۔ کہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ حضور نے اہل مدینہ کو لہو ولعب سے منع نہیں فرمایا، بلکہ اس کا وقت بدل دیا۔ **اقول**۔ حالانکہ روایت مذکورہ میں ہے، کہ ہم زمانہ جاہلیت میں کھیلا کرتے تھے، اور جاہلیت کے کھیل وہی تھے جو چند اوپر مذکور ہوئے۔ ھٰکَذَا قَالَ حَکِیْمُ الْاُمَّۃِ کَاشِفُ الْغُمَّۃِ اِمَامُ الْاُمَّۃِ فِیْ مُصَنَّفِہٖ مراۃ جلد اوّل فی شرح ھذا الحدیث۔ دورِ جاہلیت دورِ کفر تھا۔ اب بھی عیسائی اور ہندو اپنی خوشیوں اور عیدوں بڑے دنوں میں یہی کام کرتے ہیں۔ تو گویا مصنف کے نزدیک معاذ اللہ ان سب کاموں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی صرف وقت بدلا۔ استغفر اللہ کتنی کم نظری ہے مصنف کے مذہب میں سب ہندوانہ کافرانہ رسومات جائز ہیں، اور مصنف چاہتے ہیں، اسلام کی پاکیزہ عبادات چھوڑ کر اپنی خوشیوں کو ہندوؤں، عیسائیوں کی طرح مناؤ۔ یہ ہندو نوازی نہیں، تو اور کیا ہے؟ سچ فرمایا نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ آخر زمانے میں علم اٹھ جائے گا۔ جاہل مفتی ہوں گے، جہالت کے فتوے دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے، اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ حیرت اس بات کی ہے، کہ ص۲۱ پر خود یہ حضرت لہو ولعب کو مطلق طور پر حرام بھی لکھ رہے ہیں، مگر یہاں اس روایت کی تحریف کرتے ہوئے اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مصنف کا یہ مذکورہ احتمال اگرچہ کتاب سبیل السلام جلد دوم ص۷ پر بھی لکھا ہے مگر یہ سب بالکل غلط گمراہ کن حدیثِ رسول اللہ کی تحریف اور مقاصدِ فرمانِ نبوت کو فوت کرنا ہے۔ اس کی صحیح اور سچی عین مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق شرح ملاحظہ ہو:۔

اقول:۔ اسلام نے وہی چیزیں تبدیل کی ہیں، جو معاشرے یا عقائد کے لحاظ سے بری تھیں۔ اس صحیح روایت میں ایک لفظ ہے:۔ قَدْ اَبْدَلَکُمُ اللّٰہُ بِھِمَا خَیْرًا۔ جس کا ترجمہ ہے، اللہ تعالےٰ نے ان دونوں دنوں کو خیر سے تبدیل کر دیا۔ ہر ذی عقل جانتا ہے کہ وقت اور دن بنفسہٖ نہ اچھے ہیں۔ نہ برے۔ ان کو تبدیل کرنے کی وجہ کیا ہے۔ بنظرِ عمیق سے یہی ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ لہو ولعب جو کافر لوگ ان دنوں میں کیا کرتے تھے۔ وہ برے ہیں۔ کیونکہ لہو ولعب حرام بیّنہ ہیں، جیسا کہ مصنف مذکور کو خود بھی آگے چل کر تسلیم ہے، خود دنوں میں کوئی عیب نہیں۔ ان دنوں کی کسی کافر سے نسبت نہیں۔ اہل عقائد کے نزدیک دنوں کی اچھائی برائی دو وجہ سے ہے، ۱۔ اس میں کوئی اچھا یا برا کام مروج ہو جائے۔ ۲۔ اس کی

کسی اچھے یا بُرے شخص سے نسبت ہو جائے۔ جن دو دنوں کا اس حدیث پاک میں ذکر ہے، وہ تمام شارحین کے نزدیک نیروز و مہرجان ہیں۔ سال میں کافر لوگ عید مناتے ہیں، یہ دو موسموں کے ابتدائی دن ہیں۔ بذاتِ خود یہ دن بُرے نہیں، بلکہ کافروں کے لہو و لعب سے مروج ہیں، اس لیے ان کو منانا یعنی ان میں خوشی منانا، اور اچھے اچھے کھانے پکانا، اور بوجہ دن کے تحفے بھیجنے کفر کی حد تک بُرے ہیں۔ اور یہ کام اگرچہ ویسے جائز ہیں۔ مگر اس دن کی نیت سے حرام وغیرہ چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ ۲۵۲ پر ہے:۔ مَنْ اَهْدٰى فِي النَّيْرُوْزِ بَيْضَةً اِلٰى مُشْرِكٍ تَعْظِيْمًا لِلْيَوْمِ فَقَدْ كَفَرَ بِاللّٰهِ تَعَالٰى۔ (الخ) مقام غور ہے کہ یہ دن کافروں کی عید کیوں بنیں، نہ اس دن میں کوئی پیغمبر، پادری گرو پیدا ہوا، نہ کوئی دیوتا آیا، صرف یہی وجہ ہے کہ اس دن نیا سال کی ابتدا ہوئی، تو کافروں نے اس کو عید بنا لیا اور نام ہوا نیروز، موسم بہار شروع ہوا، تو کفار نے اس کو خوشی کا دن بنا لیا، نام ہو گیا مہرجان۔ اور کافروں کی عید بجز کھیل کود کے کچھ نہیں۔ اور کھیل کود تو شریعت مطہرہ میں حرام۔ لہٰذا یہ دن منانے حرام، پس ثابت ہوا کہ لہو و لعب حرام یعنی اور یہ دن منانے حرام وغیرہ۔ اسی لیے حدیث پاک مذکورہ میں ہے:۔ اَبْدَلَكُمُ اللّٰهُ بِهِمَا خَيْرًا:۔ لفظ خیر مشترک ہے، اس کے تیرہ معنے مجمع البحار جلد دوم صفحہ ۲۷ پر مذکور ہیں اصول کے مطابق ہر مشترک میں ایک حقیقی معنیٰ ہوتا ہے، باقی عارضی۔ خیر کے اصلی معنے ہیں نیکی۔ اور نیکی وہ ہوتی ہے۔ جو خدا تک پہنچائے اور شارحین و مفسرین کے نزدیک لہو و لعب وہ ہے، جو خدا تعالیٰ سے غفلت پیدا کرے۔ اللہ سے غافل کر دے۔ چنانچہ۔ اس ترتیب سے خیر کا ضد لہو و لعب ہوا، اور تبدیل کا معنٰے ہوا کہ اللہ نے لہو و لعب کو حرام کر کے خیر یعنی نیکی کو جائز اور محبوب رکھا۔ اور دن اس لیے تبدیل ہوئے کہ ذریعہ گناہ بنائے گئے۔ جس طرح شراب کو حرام کیا گیا اصلاً مگر اس کے مستعمل برتن بھی حرام کر دیئے گئے، کہ وہ ذریعہ تھے، اس لیے لفظ خیر کے بعد اس روایت صحیحہ میں مِنْهُمَا آیا۔ صاحب مرقاۃ نے یہاں مِنْ بمعنیٰ فی کیا ہے۔ صفحہ ۲۵۲ جلد دوم پر ارشاد ہے:۔ (منهما) اى فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ:۔ دنیا و آخرت میں صرف نیکی ہی فائدہ مند ہے۔ لہو و لعب میں آخرت کا بالکل فائدہ نہیں، چنانچہ اہل لغت کی کتاب مجمع البحار جلد دوم صفحہ ۱۲ پر ہے۔ اَللَّعِبُ مَا لَا نَفْعَ فِيْهِ۔ اور ان دو دنوں میں سوائے کھیل کود کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، اس لیے شارحین فرماتے ہیں کہ یہ خیر بمعنیٰ اسم تفضیل نہیں۔ اِذْ لَا خَيْرِيَّةَ فِىْ هٰذَيْنِ يَوْمَيْنِ:۔ تو منشاءِ حدیث یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تمہارا کام لہو و لعب نہیں، بلکہ نیکیاں کرنا کھیل کود تو دورِ جاہلیت اور کفار کا کام ہے تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کام تبدیل کر دیئے، اور ان کی وجہ سے دن تک تبدیل کر دیئے۔ کیونکہ جو چیز اشد حرام ہیں، تو ان کے مروجہ دن بھی حرام ہو گئے۔ تاکہ مثل شراب شدتِ حرمت ثابت ہو۔ مگر مرتکب لہو پر حدِ شرعی نہیں، ہاں تعزیر ہے "جس طرح آکلِ سود پر حدِ شرعی نہیں تعزیر ہے"۔ لہٰذا یہ روایت

تو لہو و لعب پر حرمت کی دلیل ہے، جیسا کہ اشعۃ اللمعات جلد اوّل ص۶۴۳ پر ہے اور حاشیہ ابو داؤد ص۱۶۱ پر ہے مگر ہمارے مصنف کی عقل نے الٹا ہی فیصلہ کیا۔ ورنہ بتاؤ کس صحابی نے کس عید پر کونسا کھیل کھیلا، اور کیا اسلام میں ہر عید پر نماز اور ذکر اللہ واجب نہیں، اور اگر معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دن تبدیل کیا۔ اور دورِ جاہلیت کے کافرانہ کھیلوں کو جائز رکھا، تو کافر اور مسلمان کی عید میں کیا فرق، اور خیر کے کیا معنی! پھر معاذ اللہ صحابہ کرام کی زندگی اور دورِ جاہلیت کی زندگی میں کیا فرق۔ اور کیا آریوں کا یہ اعتراض مصنف کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے نبی کو اپنی جماعت کے علاوہ دوسرے لوگوں سے صرف ضد تھی۔ اور دوسرے لوگوں کی چیزوں اور لوگوں سے صرف ذاتی نفرت تھی۔ (معاذ اللہ) اور کیا یہ سوال مصنف کی مکتوبہ تحریر سے وارد نہیں ہوتا۔ حاشا حاشا میرے آقا میرے مولا نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دورِ جاہلیت کی سیہ کاریوں سے بچا کر اللہ کی رضا پر چلانے والے تھے۔ اور لہو و لعب جیسے فتنے اور عارضی لغو خوشی اور دل مردہ کرنے والے افعال سے بچا کر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے سچی فرحت و خوشی و حیاتِ قلبی عطا فرمانے والے۔ خیال رہے کہ کتا گوشت کھا کر ہی پلتا ہے، اور بکری گھاس کھا کر ہی۔ اس کے عکس میں موت ہے۔ اسی طرح کافر لہو و لعب سے پرورش پاتا ہے، مومن ذکر اللہ سے۔ ریل گاڑی لائن پر دوڑ سکتی ہے، اور ٹرک وغیرہ سڑک پر ہی۔ اس کے عکس میں ہلاکت ہے اسی طرح مومن اللہ کے راستے پر چل سکتا ہے جو ذکر اللہ اور عباداتِ اسلامیہ ہیں اور کافر شیطان کے ہی راستے پر چل سکتا ہے، جو لہو و لعب، طبلہ، سارنگی وغیرہ ہے۔ مصنف چاہتے ہیں، کہ بکری کو کتے کی خوراک کھلائی جائے، ریل کو سڑک پر دوڑایا جائے، اور مومن کو لہو و لعب، طبلہ، سارنگی میں مشغول کر کے دین و ایمان برباد کیا جائے (خدا مصنف کو ہدایت دے)۔ اسی ص۲۲ پر لکھتے ہیں۔ کہ سیاہ رنگ کی حبشی لڑکی نے منت مانی تھی۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ سے واپسی ہوگی تو دف بجاؤں گی۔ نبی کریم نے منت پوری کرنے کی اجازت دے دی، تو اس نے نبی کریم کے سامنے دف بجایا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ قوالی اور دف جائز ہے۔

اقول: مصنف نے اس حدیث کے الفاظ تحریر نہ فرمائے، اس کے الفاظ اس طرح ہیں (مشکوٰۃ ص۵۵۹)،

وَعَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ بَعْضِ مَغَازِیْہِ فَلَمَّا انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِیَۃٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ کُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّکَ اللّٰہُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَیْنَ یَدَیْکَ بِالدَّفِّ وَاَتَغَنّٰی فَقَالَ لَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْ کُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِیْ وَاِلَّا فَلَا (الخ) بالکل اسی واقعہ کو صاحب مشکوٰۃ شریف باب النذر صفحہ نمبر ص۲۹۸ پر بھی نقل فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ اِمْرَاَۃً قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ نَذَرْتُ اَنْ اَضْرِبَ عَلٰی رَاْسِکَ بِالدُّفِّ قَالَ اَوْفِیْ بِنَذْرِکِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ۔ اس روایت کو ہمارے مصنف صاحب نے بھی مذکورہ رسالے کے صـ۲۲ پر بالفاظ اردو نقل کیا ہے اور لفظ امرأۃ سے بالغہ عورتوں کی قوالی کرنے پر استدلال کیا ہے۔ یہ مصنف مذکور کی عظیم نادانی ہے۔ گویا کہ مصنف ان دو روایت کو دو علیحدہ واقعے تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ باطل محض ہے۔ حق یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک حبشی بچی نے دف بجانے کی منت مانی تھی، مگر ایک راوی نے جاریۃ فرمادیا۔ اور ایک راوی نے اِمْرَأۃ میرے نزدیک یہ ہی متحقق اور درست ہے، اس کی چند وجہیں ہیں:۔ عـ۱ میری تحقیق کی کسی شارح نے تردید نہیں کی، بلکہ بایں الفاظ تائید فرماتے ہیں۔ کہ ہر دو روایات کی شرح میں یہی کہتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوے میں تشریف لے گئے تھے۔ تو سلامتی سے واپسی کے لیے منت مانی تھی۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ابوداؤد صـ۴۲۹۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ باب النذور در باب مناقبِ عمرؓ ان ہی روایتوں کی شرح، اور تمام شارحین ہر دو روایات میں فرماتے ہیں، کہ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ غزوہ کونسا تھا۔ دیکھو مرأۃ شرح، مشکوٰۃ باب النذر۔ دوسری روایت کی شرح۔ عـ۲:۔ مصنف کے پاس یہ ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ دونوں نذریں علیحدہ واقعے ہیں۔ اور کہ یہ دو عورتوں نے یکے بعد دیگرے علیحدہ علیحدہ منت مانی تھی۔ اگر کوئی دلیل ہوتی۔ تو ضرور رسالہ ہذا میں درج ہوتی۔:۔ عـ۳ اگر یہ دو واقعے ہوتے تو صاحب مشکوٰۃ مناقب عمرؓ والی مذکورہ روایت کو باب النذر میں بھی ذکر فرماتے، کیونکہ اس میں بھی منت کا ذکر ہے۔ چونکہ واقع ایک ہی ہے صرف راویوں کے اختلاف کے ساتھ دونوں بابوں میں ذکر کردیا عـ۴:۔ مشکوٰۃ شریف نے دوسری روایت کا حوالہ ابوداؤد سے دیا۔ حالانکہ مشکوٰۃ اور ابوداؤد کے الفاظ میں بہت تغیر ہے مشکوٰۃ شریف میں یہ عبارت نہیں ہے۔ اَنَّ اِمْرَأَۃً اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ مگر یہ عبارت ابوداؤد میں ہے۔ اسی طرح صاحبِ مشکوٰۃ نے اپنی روایت کو اَوْفِیْ بِنَذْرِکِ رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ:۔ پر ختم کردیا۔ اور زیادتی کو رزین کی طرف منسوب کیا۔ مگر ابوداؤد شریف نے آگے دراز روایت فرمائی۔ جب دو کتابوں میں اتنا تغیر ہوسکتا ہے۔ تو دو روایوں کی عبارت میں لفظ جَارِیَۃٌ اور اِمْرَأَۃٌ کا تبدل ہوگیا تو کیا مضائقہ۔ اور جب دو کتابوں کے تغیر کے باوجود روایت ایک ہی رہی، جیسا کہ رواۃ ابوداؤد کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے۔ تو اِمْرَأۃٌ اور جَارِیَۃٌ، کی تبدیلی کے باوجود بھی واقعہ اور منت ماننے والی ایک ہی روایت ہے۔ عـ۵:۔ یہی حدیث پاک کتاب جمع الفوائد جلد اوّل صـ۲۱۴ پر اس طرح نقل فرمائی

(عمرو بن شعیب) عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ نَذَرْتُ اِذَا انْصَرَفْتَ مِنْ
غَزْوَتِكَ هٰذِهٖ سَالِمًا غَانِمًا اَنْ اَضْرِبَ عَلٰی رَأْسِكَ بِالدُّفِّ فَقَالَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاَوْفِیْ
بِنَذْرِكِ وَاِلَّا فَلَا هِیَ لِاَبِیْ دَاوٗدَ۔ دیکھئے اس روایت کے راوی عمرو بن شعیب ہی ہیں، یہاں بھی امرأةٌ
ہے مگر اس کے الفاظ جاریۃٌ والی مناقب عمرؓ کی حدیث سے کتنے موافق ہیں۔ ان پانچوں دلائل سے
ثابت ہوا، کہ روائتیں اگرچہ مختلف ہیں۔ مگر واقعہ ایک ہی ہے۔ اور منت ماننے والی وہی نا بالغہ بچی ہے۔
نہ کہ جوان عورت۔ اب یہ سمجھنے کی بات ہے کہ حضرت بریدہ نے لفظِ جاریہ کیوں کہا۔ اور حضرت عمرو بن شعیب
نے امرأة کیوں کہا۔ اور ہم لوگ کیا مراد لیں۔ تو یاد رکھیئے، کہ اصل منت ماننے والی چھوٹی بچی ہی تھی، جو قریب
بلوغ تو ہو سکتی ہے لیکن بالغہ، جوان یا بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لفظِ جاریۃٌ صرف نا بالغہ کو ہی کہا جاتا ہے۔
جیسا کہ کتب لغت مجمع البحار وغیرہ کے حوالے سے پہلے ثابت کر دیا۔ مگر لفظ امرأةٌ ہر مونث انسان کے
لیئے عام ہے۔ مصنف کا یہ قول غلط ہے کہ امرأة صرف بالغہ کو کہتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے بلا دلائل
ص۲۲ پر لکھا ہے۔ اسی طرح لفظِ نِسْوَةٌ بھی ہر مونث کے لیئے عام ہے۔ اور شریعت کی اصطلاح میں امرأةٌ
اور نِسْوَةٌ ہر عورت پر بول سکتے ہیں، کیونکہ عربی زبان میں مونث انسانی کے لیئے کل سترہ الفاظ ہیں:
(۱) صَبِیَّةٌ (۲) صَغِیْرَةٌ (۳) جَارِیَةٌ (۴) مُرَاهِقَةٌ (۵) طِفْلَةٌ (۶) وَلِیْدَةٌ (۷) كَاعِبٌ
(۸) نَاهِدٌ (۹) مُعْصِرَةٌ (۱۰) شَابَّةٌ (۱۱) سَلْفَةٌ (۱۲) عَجُوْزَةٌ (۱۳) عَوَانٌ (۱۴) نَصَفَةٌ
(۱۵) امْرَأَةٌ (۱۶) نِسْوَةٌ (۱۷) كَبِیْرَةٌ۔ لفظِ اِمْرَأَةٌ اور نِسْوَةٌ عام ہے، ہر عورت کو کہا جا سکتا
ہے، چھوٹی ہو یا بڑی۔ بالغہ ہو یا نابالغہ، اور لفظِ کبیرہ ہر بالغہ عورت کو کہا جاتا ہے، باقی لفظ عمر کے لحاظ سے
علی الترتیب ہیں۔ امرأةٌ واحد ہے، اس کی جمع نسائٌ (دیکھو تفسیر نعیمی جلد چہارم ص۴۴۳ اور للعجبہ
اردو عربی مؤلفہ و مرتبہ خلیل الرحمٰن نعمانی بریلوی ص۴۸۲) تمام تفاسیر و کتب فقہ سے
ثابت ہے کہ لفظ اِمْرَأَةٌ وَنِسَاءٌ چھوٹی بچی کو کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد اول ص۱۶۸
پر ہے (قَوْلُهٗ بَیْنَ النِّسَاءِ) ای الیتامٰی۔ یہاں نساء سے یتیمہ بچیاں مراد لی ہیں۔ اور یتیمی بلوغت
سے پہلے ہوتی ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد چہارم صفحہ نمبر ص۱۷ پر ہے:۔ لٰكِنَّ الشَّارِعَ علیہ
وَكَذَا الْعُرْفَ خَصَّصَهٗ بِالصِّغَارِ:۔ اسی طرح المنجد ص۱۰۲۶ پر ہے اور اسی طرح اربعہ تفاسیر
جلد دوم ص۵ پر ہے۔ ثابت ہوا کہ لفظ نساء چھوٹی بچیوں کو کہہ سکتے ہیں۔ جب جمع عام ہے تو
اس کا واحد لفظ امرأةٌ بھی عام ہے۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد سوم ص۱۷ پر ہے:۔
وَاِنْ عَلِمْتَ بِاَنَّ الصَّغِیْرَةَ اِمْرَاَتُهٗ۔ یہاں بھی لفظِ امرأة چھوٹی بچی کو کہا گیا ہے شرح عنایہ

عالمگیری جلد دوم صہ ۱۷ پر ہے :۔ رَاجِعٌ اِلَی الْمَرْأَۃِ الْکَبِیْرَۃِ دُوْنَ مَرْأَۃِ الصَّغِیْرَۃِ :۔ یہاں بھی لفظِ امرأۃ چھوٹی نابالغہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ فقہاءِ کرام کے نزدیک نابالغہ بیوی کو امرأۃ صغیرۃ کہتے ہیں۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اول صہ ۳۴۵ پر ہے :۔ وَاِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ صَغِیْرَۃً وَکَبِیْرَۃً فَاَرْضَعَتِ الْکَبِیْرَۃُ اِمْرَأَۃً صَغِیْرَۃً حَرُمَتَا عَلَی الزَّوْجِ۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ چھوٹی نابالغہ بچی کو امرأۃ کہہ سکتے ہیں۔ امرأۃ نیمۃ کا لفظ تو عام مستعمل ہے بخلاف لفظ جاریۃ کہ وہ صرف نابالغہ کو ہی کہتے ہیں، جیسے کہ پہلے مجمع البحار کے حوالے سے ثابت کیا گیا۔ پس لازم آیا کہ امرأۃ کہہ کر جاریۃ مراد لے سکتے ہیں مگر جاریۃ کہہ کر امرأۃ مراد نہیں لے سکتے ان ہر دو روایات میں سے اول میں جاریۃ ہے دوم میں امرأۃ تو یہی کہا جائے گا کہ روایت ثانیہ کے راوی عمرو بن شعیب کی مراد چھوٹی بچی ہی ہے نہ کہ کبیرہ، مگر لفظ عمومی، استعمال فرمایا۔ اور نتیجہ نکلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹی بچی کو ہی دف بجانے کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ بوجہ نابالغی اس کے لیے جائز تھا۔ مصنف کی کتنی چشم پوشی ہے، کہ صرف اپنا غلط عقیدہ بچانے کے لیے مفسرین اہل لغت، فقہاء اسلام کے خلاف توڑ موڑ کر رہے ہیں :۔

صہ ۲۵ پر فرماتے ہیں کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ صرف حضرت عمرؓ کی شان میں ہے، کیسی عجیب لغزش ہے، کہ تمام مفسرین فرماتے ہیں۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ تمام صحابہؓ کی شان میں ہے جن میں صدیق اکبر علیؓ مرتضٰے وغیرہ سب شامل ہیں۔ مصنف نے لفظِ کفار نہ دیکھا، گیا وہ بچی معاذ اللہ کافرہ تھی۔ کیا مصنف نے لفظ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ نہ دیکھا۔ خیال رہے کہ اس روایت اور اس جیسی دوسری روایات میں جہاں بھی لفظ شیطان آیا ہے، وہاں گناہگار یا کافر مراد نہیں، بلکہ شریر اور شرارتی مراد ہیں۔ بچوں کو شیطان کہنا بھی اسی معنٰی میں ہوتا ہے، جن فقہاء نے کسی کو شیطان کہنے سے منع فرمایا ہے، وہاں بمعنٰی فسادی، فتنہ پرور اور ملعون ہوتا ہے۔ غصے والے لوگوں سے بچے گھبراتے ہیں، نہ کہ حلیم الطبع سے۔ صہ ۲۸ پر فرماتے ہیں، کہ ایک حبشی عورت ناچتی گاتی ہے۔ یہ ناچ گانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دیکھا، اور عائشہ صدیقہؓ کو بھی دکھایا۔ ثابت ہوا کہ قوال جائز ہے :۔

اقول :۔ سُبْحَانَ اللّٰہ! کیا اچھا استدلال ہے، واہ ری کوتاہ بینی و کم نظری اس روایت میں مصنف صاحب نے عورت کا لفظ اپنے پاس سے شامل کر لیا ہے، حالانکہ حدیث پاک میں عورت کا لفظ موجود نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث پاک صہ ۵۵۸ پر اس طرح مرقوم ہے :۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا وَصَوْتَ صِبْیَانٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا حَبْشِیَّۃٌ تَزْفِنُ وَالصِّبْیَانُ حَوْلَھَا (الخ) ترجمہ:۔ روایت ہے ام المومنین عائشہ صدیقہ سے کہ نبی کریم علیہ السلام گھر تشریف فرما تھے، کہ ہم نے گلی میں بچوں کی آوازیں اور شور و غل سنا :۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ایک حبشیہ اچھل کود کر رہی ہے، اور بچوں نے تماشا بنا یا ہوا ہے، (الخ) اس روایت میں تین لفظ قابلِ غور ہیں، ۱ لغطاً۔ ۲ صبیان۔ ۳ حبشیہ۔ یعنی یہ کوئی بڑوں کا کام نہ تھا۔ بلکہ بچے شور و غل اور اچھل کود کر رہے تھے، لفظ حبشیہ کی مراد مشکوٰۃ شریف میں اسی جگہ۔ بین السطور جاریہ لی گئی ہے، اور حوالہ مرقات شرح مشکوٰۃ کا ہے۔ پتہ لگا، کہ وہ ناچنے کودنے والی بھی بچی تھی، اور بچوں پر شرعی احکام نافذ نہیں ہوتے۔ مصنف چاہتے ہیں کہ بڑی بالغ عورتوں کا ناچنا بھی جائز ثابت ہو۔ اور اپنے اس گمراہ کن عقیدے کے لیئے صحابیات کو ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ (معاذ اللہ) مصنف نے آنکھیں بند کرکے لکھ دیا، اور ذرا غور نہ کیا کہ یہ کہاں تک گستاخی ہے۔ اگر مصنف بالغہ عورت ہی مراد لینا چاہتے ہیں، اور بطورِ جواز یہ روایت پیش کی ہے تو کیا مصنف اب خود اپنے گھر سے کسی شریف زادی بالغہ کو بازار میں اس کام کی اجازت دے دیں گے۔ مصنف صاحب کا حافظہ بھی کمزور معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے ص۳۰ پر لکھتے ہیں۔ کہ لہو و لعب ہر وقت جائز ہے۔ یہاں مطلقاً لہو و لعب (کھیل تماشہ) کو جائز مانا۔ ص۳۱ پر لکھتے ہیں کہ لہو و لعب ہی نفسِ امارہ کی حرکت کا باعث اور وہی حرام۔ صوفیائے کرام کے غنا۔ نہ وہ حقیقتاً لہو و لعب میں داخل نہ حرام۔ صَدَقَ الشَّیْخُ السَّعْدِی:۔

”دروغ گو را حافظہ نہ باشد“

ص۳۲ پر ایک اعتراض بایں الفاظ نقل فرماتے ہیں:۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَبِیْعُوا الْمُغَنِّیَاتِ (الخ):۔ یہ ترمذی شریف کی روایت ہے اس کا جواب دیتے ہیں:۔ اَلْمُغَنِّیَاتُ پر الف لام عہد کا ہے جس سے مراد خاص مُغَنِّیَاتُ ہیں

اقول:۔ معلوم ہوتا ہے مصنف صاحب کو نحوی قاعدے بھی بھول رہے ہیں:۔ نحوی قاعدہ ہے کہ الف لام عہد ذہنی ہو یا خارجی، قرینے سے ثابت ہوتے ہیں، اگر قرینہ ہو تو مراد ہوں گے اگر الف لام عہدی کے لیئے قرینہ نہ ہو تو الف لام استغراقی ہی مراد ہوتا ہے:۔ چنانچہ فتاوٰے فتح القدیر جلد ہشتم صفحہ نمبر ص۸۹ پر ہے:۔ اِذْ قَدْ تَقَرَّرَ فِیْ عِلْمِ الْاُصُوْلِ اَنَّ الْمُعَرَّفَ بِاللَّامِ اِذَا لَمْ تَکُنْ لِلْعَہْدِ الْخَارِجِیِّ فَھُوَ لِلْاِسْتِغْرَاقِ

یعنی اصولِ نحو کا قاعدہ ہے جب الف لام عہد خارجی نہ ہو تو استغراقی ہوتا ہے اور یہ قرینہ ہونا بھی قرینہ ظاہری نہ ہونے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں۔ وَلَمْ يَظْهَرْ هُنَاكَ مَعْهُوْدٌ خَارِجِيٌّ فَهِيَ لِلْاِسْتِغْرَاقِ :- یعنی چونکہ یہاں الف لام عہدی کا قرینہ ثابت نہ ہوا اس لیے استغراقی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ الف لام عہدی بغیر قرینے کے مراد نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر استغراقی کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ عہدی نہ ہو۔ مصنف صاحب کی اپنی اختراع ہے جو یہاں بلا قرینہ اپنی بات پالنے کے لیے الف لام عہدی بنا رہے ہیں اور مصنف صاحب کا اس حدیثِ پاک کو ضعیف کہنا بھی درست نہیں۔ دو وجہ سے:- (۱) اس روایت کو لفظاً تو بوجہ راوی مذکور کے ضعیف کہا جا سکتا ہے مگر معنیً یہ حدیث ضعیف نہیں کیونکہ الفاظ کے کچھ تغیر سے یہی روایت درِ منثور نے بھی نقل کی ہے۔ چنانچہ تفسیر درِ منثور جلد پنجم صفحہ نمبر ص ۱۵۹ پر ہے:- عَنِ ابْنِ مَرْدَوَيْهِ عَنْ عَائِشَةَ رض قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ حَرَّمَ الْقَيْنَةَ وَبَيْعَهَا وَثَمَنَهَا (الخ) ترمذی شریف میں بھی روایت اس طرح شروع کی ہے:- عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَبِيْعُوْا الْقَيْنَاتِ (الخ) مصنف نے بحوالہ ترمذی اس روایت میں بجائے اس لفظ کے، بلا وجہ لَا تَبِيْعُوا الْمُغَنِّيَاتِ کر دیا۔ یہ مصنف کی غلطی ہے۔ درِ منثور کی روایت میں علی بن یزید راوی نہیں۔ معنیً یہ دونوں روایات ایک ہیں۔ اور محدثین کے نزدیک لفظی ضعف حکم نہیں بدلتا۔ (۲) مصنف مذکور کے نزدیک اس روایت کے ضعف کی دلیل محض یہ ہے کہ علی بن یزید راوی ضعیف ہے۔ حالانکہ علامہ ترمذی بذاتِ خود اس کے ضعف پر جزم نہیں رکھتے بلکہ فرماتے ہیں کہ بعض اہلِ علم نے ایسا کہا ہے کہ علی راوی ضعیف ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد اول ص ۱۵۴ پر ہے:- وَقَدْ تَكَلَّمَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ فِیْ عَلِيِّ بْنِ يَزِيْدَ وَضَعَّفَهٗ :- قواعدِ حدیث و اصطلاحاتِ محدثین کے لحاظ سے لفظِ بعض اور قَالَ بَعْضٌ۔ قِيْلَ۔ يُقَالُ۔ بَعْضُهُمْ وَغَيْرُهُمْ سب الفاظ تمریض ہیں۔ اور لفظِ تمریض سے ضعف ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ نے اپنی کتاب تقریب التہذیب میں ص ۱۸۷ پر علی بن یزید راوی کو مستور لکھا ہے۔ پس ضعف حتماً ثابت نہیں ہوتا۔ ثابت ہوا کہ گانا بجانا ہر طرح کی قوالی حرام ہے۔ اگر فرضاً علی بن یزید کو ضعیف بھی مان لو تو فرق صرف اتنا پڑتا ہے کہ الفاظ میں کچھ تبدیلی ہو گئی۔ مگر مقصد نہیں بدلا۔ اس ضعف کا کچھ حرج نہیں۔ ص ۳۴ پر لکھا ہے کہ يَا عَائِشَةُ اَكَا مُغَنِّيْنَ اے عائشہ رض تم گاتی نہیں؟ سرکار نے حضرت عائشہ رض کو غنا کا حکم دیا۔ **اقول**:- بالکل غلط ہے۔ یہ صیغہ واحد مؤنث حاضر نہیں۔ نہ ہی اس کا فاعل حضرت عائشہ صدیقہ رض ہیں۔ جیسا کہ میں

نے پہلے تشریح کر دی ص ۳۵ پر بھی مصنف نے بحوالہ عوارف المعارف وہی حدیث نقل کی جو ایک بچی کے منت ماننے اور دف بجانے کی ہے۔ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ یہ بچوں کا کام ہے بوجہ غیر مکلفہ کے جائز ہے۔ ص ۳۶ پر اسی عوارف المعارف کے حوالے سے روایت نقل فرماتے ہیں عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ دَخَلَ عَلٰی اَخِیْہِ بَرَاءِ بْنِ مَالِکٍ ھُوَ کَانَ یَتَغَنّٰی۔ مصنف صاحب اس روایت کو بھی قوالی کی دلیل بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی دلیل نہیں بن سکتی دو وجہ سے :۔ (۱) یہ روایت مجہول ہے کہ کسی نے اس کی اسناد کا ذکر نہیں کیا۔ فقہائے کرام کے نزدیک روایت مجہول کسی دعوے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ (۲) اس سے نعت خوانی کا ثبوت تو ہو سکتا ہے مگر قوالی کا نہیں اس لیئے کہ کَانَ یَتَغَنّٰی واحد کا صیغہ ہے اور مزامیر کا ذکر نہیں بس وہ ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی نعت خوانی اور یہ بالکل متفق علیہ جائز ہے۔ آگے چل کر اسی صفحہ پر مصنف بیان الفقہ کے حوالے سے تفسیر کبیر کی ایک روایت پیش کرتے ہیں :۔ عَنْ عُثْمَانَ کَانَتَا عِنْدَہٗ جَارِیَتَانِ تَغَنِّیَانِ فَلَمَّا کَانَ وَقْتَ السَّحْرِ قَالَ دَعِیْنَ ھٰذَا وَقْتُ الْاِسْتِغْفَارِ خود ہی اسکا ترجمہ کرتے ہیں بے شک حضرت عثمان غنیؓ کے پاس دو لڑکیاں تھیں جو گاتی تھیں پس جب سحر کا وقت ہوتا تو آپ فرماتے اب گانا بند کرو، یہ وقت استغفار کا ہے۔ **اقول** :۔ مصنف اس سے بھی۔ قوالی کی حلت ثابت کر رہے ہیں کتنی زیادتی ہے۔ حالانکہ یہ روایت بھی پانچ وجہ سے نا قابلِ قبول ہے،

نمبر ۱ تفسیر کبیر میں یہ روایت نہیں ہے۔ (۲) اس روایت میں عَنْ عُثْمَانَ ہے۔ علم اسماء الرجال کے مطابق دیگر کتبِ احادیث کا تو ذکر ہی نہیں۔ صرف صحیحین میں تیرہ آدمی عثمان نامی ہیں۔ پتہ نہیں یہاں کون سا شخص مراد ہے جو گانے کا اتنا شوقین تھا کہ روز رات کو ساری رات عورتوں کے گانے سنتا رہتا تھا۔ بھلا حضرت عثمان ابن عفان ایسا کر سکتے تھے جن کی ساری رات تہجد اور استغفار میں گزرتی تھی۔ جو دن کے صائم رات کے عابد زاہد۔ چنانچہ تاریخ طبری ص ۲۰۲ پر ہے :۔ فَصْلٌ فِیْ زُھْدِہٖ۔ کَانَ یَبِیْتُ فِی الصَّلٰوۃِ وَمَرَّۃً کَانَ یَخْتِمُ قُرْاٰنًا فِیْ رَکْعَۃٍ وَّاحِدٍ وَّکَانَ یَصُوْمُ فِی الْاَیَّامِ۔ کسی تاریخ نے مصنف کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ (۳) یہ حضرت عثمان پر بہت بڑا بہتان اور جناب کی شانِ اقدس میں گستاخی ہے۔ کیونکہ خود حضرت عثمان غنی کا فرمان ہے کہ میں گانے سے نفرت کرتا ہوں۔ اور نہ کبھی تمنا کی اور نہ دایاں ہاتھ ذکر کو لگایا جب سے بیعت کی۔ چنانچہ تفسیرات احمدیہ جلد اول صفحہ نمبر ص ۲۲۴ پر ہے :۔ وَھٰھُنَا قَوْلُ الصَّحَابَۃِ دَالَّۃٌ عَلٰی حُرْمَۃٍ مُطْلَقًا قَالَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ

مَا تَغَنَّیْتُ وَلَا تَمَنَّیْتُ وَلَا مَسَسْتُ ذَکَرِیْ بِیَمِیْنِیْ مُنْذُ بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ یہاں بَایَعْتُ کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ یہ عثمان غنی ہیں۔ یہ حدیث مشہور ہے مگر مصنف کی روایت میں لفظِ عثمان سے عثمانِ غنی ثابت کرنا مصنف کی ذمہ داری ہے (۴) اس روایت میں لفظ کَانَ ہے جو ماضی استمراری بناتا ہے اور ماضی استمراری۔ دوام واستمرار کو چاہتا ہے اور مطلب یہ بنتا ہے کہ ہمیشہ ہی ایسا گانا رہتا تھا۔ یہ معاملہ عثمانِ غنی کے بارے میں جھوٹ اور گستاخی ہے (۵) اس روایت میں لفظ دَعِیْنَ جمع مؤنث غائب ہے۔ حالانکہ عورتیں دو تھیں۔ دو کے لیے جمع غائب کا استعمال خلافِ قانون ہے۔ اگر بحث فعل امر ہو تب بھی دعین جمع نہ چاہیے بلکہ تثنیہ حاضر مؤنث ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ روایت غلط ہے۔ یہاں تک مصنف نے احادیث سے استدلال کیا جس کا جواب دے دیا گیا۔ اگلے صفحات میں مصنف فقہاء کرام کو بھی اس برے کام میں ملوث کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ فقہائے اسلام جو زینتِ ایمان ہیں سب کے سب متفقہ طور پر قوالی کے منکر ہیں۔ چنانچہ مدارج النبوت جلد اول ص۴۲۳ پر ہے

در یخا سہ طریق است ؎ یکی مذہب فقہاء است وایشاں انکار میکنند

اور کیوں نہ انکار کریں جب کہ آئمہ اربعہ اجماعی طور پر قوالی کو حرام کہتے ہیں اور انہیں مجتہدین کا اتفاق اجماعِ امت ہے۔ چنانچہ توضیح تلویح علم اصول۔ عقودِ رسم المفتی۔ اور تفسیرات احمدیہ جلد اول ص۱۸۳ پر ہے:۔ وَاَہْلُ الْاِجْمَاعِ مَنْ کَانَ مُجْتَہِدًا (الخ) اور اجماعِ امت حُجَّۃٌ قَطْعِیَّۃٌ ہے۔ جس کا انکار کفر ہے۔ چنانچہ تفسیراتِ احمدیہ میں ارشاد ہے:۔ فَیَکُوْنُ الْاِجْمَاعُ حُجَّۃً قَطْعِیَّۃً یَکْفُرُ جَاحِدُہٗ (الخ) امام اعظم کا مسلک قاضی طبری نے ارشاد فرمایا کہ اَمَّا اَبُوْحَنِیْفَۃَ فَاِنَّہٗ کَانَ یَکْرَہُ ذَالِکَ وَیَجْعَلُ سَمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ یہ پہلے بیان کر دی گئی۔ ثابت ہوا کہ امام اعظم کے نزدیک قوالی حرام ہے۔ ۲ ہدایہ جلد چہارم صفحہ نمبر ۵۳ پر ارشاد ہے:۔ قَالَ اَبُوْحَنِیْفَۃَ اُبْتُلِیْتُ بِہٰذَا مَرَّۃً فَصَبَرْتُ:۔ یعنی امام اعظم فرماتے ہیں کہ اسی طرح ایک دفعہ میں ایک ایسے کھانے کی دعوت میں پھنس گیا جس میں قوالی اور گانے باجے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مصنف نے بھی اس عبارت کو بطورِ اعتراض ذکر کر کے عجیب نادانی سے ص۳۶ پر جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت امام ابو حنیفہ دعوتِ ولیمہ میں کو خرمیں بلائے ہوئے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے وہاں سرود یعنی گانا ہو رہا تھا (الخ) استغفر اللہ مصنف نے امام اعظم کی کتنی گستاخی کی ہے۔ صحیح واقعہ یہ ہے کہ امام اعظم سے کسی نے گانے کے متعلق سوال کیا کہ اگر کوئی دعوت میں مدعو ہو تو کیا کرے۔ جب کہ وہاں قوالی جیسے گناہ یا

ڈھول باجے کا بھی صاحبِ دعوت نے انتظام کیا ہو تو امام صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ایسی ہی دعوت میں ایک دفعہ میں بھی مدعو تھا۔ میں پھنس گیا تھا تو میں واپس نہ آیا بلکہ صبر کیا۔ تمام فقہاء فرماتے ہیں کہ وہاں گانا باجا ہو نہیں رہا تھا بلکہ صاحبِ خانہ نے باہر کہیں پر انتظام کیا تھا اس لیئے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے گناہ گار نہ ہوئے اسی لیئے امام اعظمؒ نے لفظ اُبْتُلِیْتُ فرمایا نہ کہ اُسْمِعْتُ اور قیامت تک کے لیئے مسئلہ بتا دیا کہ اگر کسی دعوت میں مدعو ہو اور وہاں گانا۔ باجا ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر گانا دسترخوان پر ہو اور وہ شخص منع کرنے پر قادر نہ ہو تو اٹھ کر چلا آئے اور دعوت چھوڑ دے ورنہ منع کرے اور اگر دسترخوان پر یہ گناہ نہ ہو تو صبر کرے اور دعوت کھالے۔ یہی صورت امام اعظمؒ کے ساتھ پیش آئی۔ چنانچہ ہدایہ شریف جلد چہارم ص۴۵۲ پر ہے:۔ وَالْمَحْکِیُّ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ فِی الْکِتَابِ کَانَ قَبْلَ اَنْ یَّصِیْرَ مُقْتَدٰی وَلَوْ کَانَ ذَالِکَ عَلَی الْمَآئِدَۃِ لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یَقْعُدَ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ مُقْتَدِی اگر ہدایہ کا یہ قول مصنف صاحب تسلیم نہ کریں تو اس کا کیا جواب ہے کہ سائل کے سوال میں لعب و غنا دونوں کا ذکر ہے اور دونوں کا جواب امام اعظم نے دیا ہے حالانکہ مصنف صاحب کے نزدیک بھی لعب حرام ہے۔ جیسے کہ اسی رسالے کے ص۳۱ پر درج ہے۔ یا تو مصنف نے ہدایہ شریف پڑھا ہی نہیں یا یاد نہ رکھا اور یا غفلت برتی بیچارے۔ مصنف تو کہتے ہیں کہ اس جوابِ امام سے تو غناء کا جواز ثابت ہوتا ہے مگر صاحبِ ہدایہ علامہ۔ اپنی تصنیف ہدایہ جلد چہارم ص۴۵۳ پر فرماتے ہیں:۔ وَدَلَّتِ الْمَسْأَلَۃُ عَلٰی اَنَّ الْمَلَاہِیَ کُلَّہَا حَرَامٌ حَتَّی التَّغَنِّیَ بِضَرْبِ الْقَضِیْبِ وَکَذَا قَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ ؒ اُبْتُلِیْتُ لِاَنَّ الْاِبْتِلَاءَ بِالْمُحَرَّمِ یَکُوْنُ۔ **ترجمہ**: امام اعظمؒ کے اس مسئلے نے ثابت کر دیا کہ ہر وہ غناء حرام ہے جو قوالی کی طرح طبلے سارنگی وغیرہ سے ہو"۔ اور اسی طرح امام صاحبؒ کا لفظ اُبْتُلِیْتُ بھی حرمتِ قوالی بتا رہا ہے کیونکہ ابتلاء حرام ہی میں ہوتا ہے نہ کہ حلال میں۔ دیکھا آپ نے صاحبِ ہدایہ نے مصنف کے عقیدۂ باطلہ کی کس طرح دھجیاں بکھیر دیں۔ اور صاحبِ ہدایہ وہ شخصیت ہیں کہ مصنف صاحب بیچارے کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ خود علامہ کاظمی جیسے بزرگ اکابرِ دین بھی اُن کے دروازے کے خوشہ چین ہیں۔ اور اُن کے ٹکڑوں کے گدا کی حیثیت میں مصنف صاحب ص۳۷ پر فرماتے ہیں۔ لفظِ ابتلاء سے حرمت پر استدلال منع ہے۔ کیونکہ امام اعظمؒ نے قاضی بننے کے لیئے بھی ابتلاء کا لفظ فرمایا تو کیا قاضی بننا حرام ہے:۔

اقول:۔ ہاں حرام ہے۔ جب کہ حکومت ظالم ہو۔ چنانچہ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ظالم بادشاہ کا قاضی بننا حرام ہے کہ اگر فیصلہ بادشاہ کے خلاف کرے تو جان کی

ہلاکت اور اگر اسلام کے خلاف کرے تو ایمان کی ہلاکت۔ اور جان کر بلا فائدہ اپنے کو ہلاکت میں دینا حرام ہے۔ اس لیئے حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ امارت کی تمنّا نہ کرو۔ وہاں یہ ہی قضاء مراد ہے جو حرام اور امام اعظم کا لفظِ ابتلاء قضا کے لیئے فرمانا۔ حرام قضاء کی طرف ہی اشارہ ہے لیکن عادل بادشاہ کا قاضی بننا بالکل جائز ہے بلکہ کئی موقعوں پر واجب ہو جاتا ہے۔ اسی لیئے حضرت یوسف علیہ السلام نے خود حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست پیش کی۔ حدیث پاک اور امام اعظم کے قول میں حرام قضاء کا ذکر ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے فرمودہ میں حلال کا۔ بعض موقعوں پر تو مرد کے لیئے نکاح بھی حرام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بلغۃ السالک ص ۲۷۳ جلد اوّل میں ہے :۔ وَقَدْ يَحْرُمُ إِنْ لَمْ يَخْشَ الزِّنَا وَأَدَّى إِلَىٰ حَرَامٍ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ إِضْرَارٍ أَوْ إِلَىٰ تَرْكِ وَاجِبٍ (الخ) (۱) پس ثابت ہوا کہ امام اعظم کے نزدیک قوالی حرام ہے اور ابتلاء کے الفاظ فعل حرام کے لیئے مستعمل ہیں۔ (۲) امام مالک کے نزدیک بھی قوالی حرام ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص ۶۷ پر ہے :۔ قَالَ الْإِمَامُ الْمَالِكُ إِذَا اشْتَرَىٰ جَارِيَةً فَوَجَدَهَا مُغَنِّيَةً فَلَهُ أَنْ يَرُدَّهَا بِهٰذَا الْعَيْبِ۔ قَالَ فِي فِقْهِهٖ۔ وَلَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ الرَّجُلِ الْمُغَنِّي۔ (الخ) اور فتاوٰے مالکیہ بلغۃ السالک جلد دوم ص ۵۲ باب خیار عیب (وخصاء) بِالْعَبْدِ فَهُوَ عَيْبٌ وَإِنْ زَادَ فِي ثَمَنِ الرَّقِيقِ لِأَنَّهُ مَنْفَعَةٌ غَيْرُ شَرْعِيَّةٍ۔ كَغِنَاءِ الْأَمَةِ۔ یعنی غلام کا خصی ہونا شریعت کے خلاف اس طرح عیب ہے جیسے لونڈی کا گانا بجانا شریعتِ پاک کے خلاف عیب ہے۔ کتنا واضح ثابت ہوا کہ امام مالک کے نزدیک قوالی حرام ہے۔ (۳) امام شافعی کے نزدیک بھی قوالی حرام ہے۔ چنانچہ فتاوٰے شافعی حاشیہ ابراہیم بیجوری جلد ص ۲۹۷ پر ہے :۔ فَيَخْرُجُ بِهٖ غَيْرُ الْمُبَاحَةِ كَمَنْفَعَةِ آلَةِ الْمَلَاهِي۔ فقہائے کرام کی اصطلاح میں ہمیشہ آلاتِ ملاہی اور آلاتِ لہو سے یہی ڈھول باجے مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامی ہدایہ کے حوالے جلد پنجم ص ۲۰۵ پر فرماتے ہیں :۔ آلَاتُ اللَّهْوِ كَالطَّنْبُوْرِ قَالَ فِي الْبَحْرِ هُوَ يَقْتَضِيْ أَنْ يُفْتٰى بِقَوْلِهِمَا لِأَنَّ الْفَتْوٰى عَلٰى قَوْلِهِمَا فِيْ عَدَمِ الضَّمَانِ بِكَسْرِ الْمَعَازِفِ باجہ مزامیر چونکہ حرام شے ہیں اس لیئے توڑنے پر شرعی ضمان نہیں۔ (ای المزامیر) یعنی مزامیر وغیرہ غیر مباح چیزیں ہیں۔ (۴) یہی مسلک امام احمد بن حنبلؒ کا ہے۔ (فانظر فی فتاواہ) ثابت ہوا کہ اجماعِ امّت سے حرمتِ قوالی ثابت ہے۔ اور مزامیر وغیرہ لغویات پر اجماعِ امّت ہو چکا ہے کہ حرام قطعی ہیں۔ یہ صرف میں ہی نہیں کہتا بلکہ علامہ شامی اپنے فتاوٰے ص ۴۲۵ اور ص ۲۰۶ جلد پنجم میں بھی فرماتے ہیں کہ اس کی حرمت پر اجماعِ امّت ہے۔ جیسا کہ پہلے ہم نے

شامی کی عبارت پیش کر دی۔ مسلم شریف جلد اوّل ص۲۹۱ پر ارشاد ہے:۔ وَحَرَّمَهُ اَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَهْلُ الْعِرَاقِ وَمَذْهَبُ الشَّافِعِيِّ كَرَاهَتُهُ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ مِنْ مَذْهَبِ مَالِكٍ۔ یعنی امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک قوالی مکروہ ہے۔ اور عند الفقہاء جب مکروہ مطلق ہو تو کراہت تحریمی ہی مراد ہوتی ہے چنانچہ فتاویٰ فتح القدیر اور کبیری شرح منیہ ص۵۷۵ پر ہے:۔ فَاِنَّ اِطْلَاقَ الْكَرَاهَةِ يُفِيْدُ كَرَاهَةَ التَّحْرِيْمِ اور مکروہ تحریمی بدرجۂ حرام ہے۔ مدارج النبوت میں بھی یہی اشارہ ہے اور قانون اسلامیہ کے مطابق۔ اجماعِ امت حجتِ قطعیہ ہے، جیسا کہ ابھی تفسیرات احمدیہ کی عبارت پیش کی۔ اور حجۃ قطعیہ سے حرمتِ قطعیہ ثابت ہو جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ قوالی حرام قطعی ہے۔ مصنف صاحب بھی احیاء العلوم کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں کہ امام شافعی کی روایت میں دف مع جلاجل بجانا جائز ہے۔ احیاء العلوم کی یہ عبارت میری نظر سے نہ گزری۔ مصنف ص۲۷ پر فرماتے ہیں۔ سُئِلَ اَبُوْحَنِيْفَةَ رَحْ وَسُفْيَانُ ثَوْرِيْ رَحْ عَنِ الْغِنَاءِ فَقَالَا لَيْسَ مِنْ كَبَائِرِ وَلَا مِنَ الصَّغَائِرِ (بحوالہ تذکرۂ احمد فیہ) ہم پہلے صفحات پر طبری کی عبارت پیش کر چکے ہیں کہ اَمَّا اَبُوْحَنِيْفَةَ رَضْ كَانَ يَكْرِهُ ذَالِكَ وَيَجْعَلُ سَمَاعَ الْغِنَاءِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَكَذَالِكَ سَائِرُ اَهْلِ الْكُوْفَةِ سُفْيَانُ ثَوْرِيْ وَحَمَّادٌ وَاِبْرَاهِيْمُ (الخ) دیکھئے! دونوں عبارات میں کتنا تعارض۔ تفسیرات احمدیہ ص۲۲۵ پر ارشاد ہے۔ کہ حلّت اور حرمت کی دو طرفہ دلیلیں ملتی ہوں تو حرمت کی دلیل معتبر ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔ وَاِذَا نَظَرْتَ اِلٰى مَا يَقْتَضِي الْاُصُوْلِ يُوْجِبُ حُرْمَتَهُ اَحَدُهُمَا اَنَّهُ اِذَا تَعَارَضَ الْمُبِيْحُ وَالْمُحَرِّمُ كَانَ الْعَمَلُ بِالْمُحَرِّمِ اَوْلٰى۔ آگے چل کر مصنف صاحب اقوالِ صوفیاء ذکر فرماتے ہیں جس میں مصنف بہت جگہ زیادتی بھی کر جاتے ہیں (اللہ ہدایت دے) چنانچہ ص۳۰ پر فرماتے ہیں کہ مدارج النبوت باب التغنی جلد اوّل میں ہے۔ "امام اعظم کے ہمسایہ میں ایک (مراثی) عمر نامی تھا۔ وہ ہر رات کو آلات کے ساتھ غنا کرتا تھا۔

اقول یہ مصنف کی زیادتی ہے۔ مدارج النبوت باب التغنی میں آلات کا ذکر نہیں صرف جلد اوّل ص۴۴۵ پر یہ ہے کہ وہ ہر رات غناء کرتا تھا۔ چنانچہ عبارت اس طرح ہے۔

"ونقل کردہ اند کہ امام ابوحنیفہ را ہمسایہ بود کہ ہر شب برمیخاست وتغنی میکرد (الخ)

یہاں کہیں بھی مزامیر کا نام تک نہیں۔ **ترجمہ**۔ یہ کہ امام صاحب کا ایک ہمسایہ تھا جو کہ ہر رات گانے گایا کرتا تھا۔ مصنف نے اپنے پاس سے آلات کا نام لے کر کتنی بڑی خیانت کی ہے واضح رہے کہ مدارج کے مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی نہ فقہاء میں شامل نہ صوفیاء میں

بلکہ آپ محدثین میں ہیں۔ شریعت کی دلیل نہ صوفی کا قول ہے نہ محدث کا۔ بلکہ اسرار میں صوفی کی بات معتبر احادیث میں محدث کی احکام میں فقہاء کی اس تقسیم کو قائم رکھو گے تو فتنہ ختم ہو گا اور پھر حضرت محدث دہلوی نے قوالی کے بارے اپنا کوئی حکم نافذ نہیں کیا بلکہ جس طرح دو بیٹے جھگڑا کریں تو باپ اپنی حکمتِ عملی سے کچھ ایک کی کچھ دوسرے کی تائید کر کے صلح کرا دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ نے فقہاء اور صوفیاء میں اس طرح صلح کرائی کہ فقہاء کو کچھ سختی سے منع فرمایا اور صوفیاء کو حکم دیا کہ تم اپنی قوالیاں درست کر لو۔ جو حکایت و دلائل و عبارات شیخ علیہ الرحمتہ نے نقل فرمائے وہ سب ایک کتاب غیر معتبر سے نقل فرما دیئے۔ خود تحقیق نہیں کی اس کتاب کا نام (متذکرہ) ہے اور شیخ نے مصنف کو صاحبِ تذکرہ کے لقب سے متعدد جگہ یاد کیا۔ اور یہ کتاب محققین کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں۔ خود حضرت شیخ بھی اس پر کامل جزم نہیں رکھتے۔ خود بعض جگہ فرماتے ہیں۔ کہ ایں روایت بے توثیق قبول نتواں کرد چہ از حدِ خود تجاوز نمودہ است۔ ثابت ہوا کہ جاہل صوفیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ اپنی بات منوانے کے لیئے خیانتیں بھی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ اس رسالے کے مصنف نے کیا اور جھوٹی من گھڑت حکایات بھی بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ مدارج نے ثابت کیا۔ اس لیئے محدثین کے نزدیک صوفی روایت معتبر نہیں۔ دیکھو اصولِ حدیث کی کتاب مصنف صاحب صلا پر لکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ ابو یوسف سے منقول ہے کہ وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد تھے۔ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حسن علیہ السلام کہنا یا تو کاتب کی غلطی ہے یا مصنف نے خود لکھا ہے اگر خود لکھا تو ثابت ہوا کہ مصنف اس بات سے بےخبر ہیں کہ یہ رافضیوں شیعوں کا ہی طریقہ ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک بجز انبیاء و ملائکہ کسی کو علیہ السلام کہنا جائز نہیں۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل صلا وَكَذٰلِكَ يُكْتَبُ عِنْدَ ذِكْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَذٰلِكَ يَتَرَضّٰى۔ قَالَ۔ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔ یعنی صحابہ کرام کو صرف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا جائے۔ درِ مختار جلد پنجم صلا پر فرماتے ہیں:۔ وَكَذَا لَا يُصَلِّىْ عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا عَلَى النَّبِيِّ۔ اَىْ اِسْتِقْلَالًا۔ یعنی انبیاءِ کرام کے سواء کسی اور پر درود بھیجنا منع ہے۔ لفظ عَلَيْهِ السَّلَامُ بھی درود شریف کے درجے میں ہے۔ اسی لیئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر صرف علیہ السلام کہہ دینا وجوب کو ادا کر دیتا ہے۔ بہت جگہ صرف فرشتوں کے لیئے اور انبیاءِ کرام کے لیئے علیہ السلام کہنا کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ علیہ السلام کا لفظ حقیقتاً درود شریف کے لیئے مختص ہے چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر صلا ۲۲۸ پر ہے:۔ وَاَمَّا السَّلَامُ فَهُوَ فِيْ

مَعْنَی الصَّلٰوۃِ۔ صحابہ کرام کو رحمۃ اللہ علیہ بھی نہ کہا جائے۔ چنانچہ نسیم الریاض جلد سوم صفحہ نمبر ۴۹۲ پر ہے:۔
لَا یُقَالُ لِلصَّحَابَۃِ رَحِمَہُ اللّٰہُ بَلْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ :۔ امام حسن بھی صحابی ہیں ان کو بھی علیہ السلام کہنا جائز نہیں۔ یہ رافضیوں کا طریقہ ہے کہ وہ انبیاء کے مخصوص لفظ بھی صحابہ واہل بیت کے لیئے استعمال کر دیتے ہیں اور شیعوں کی علامات سے بچنا لازم ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۲۲۸ پر ہے:۔ لَا یُقَالُ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ۔ لِتَادِیَتِہٖ اِلَی اِتِّھَامٍ بِالرَّفْضِ۔ یعنی غیر نبی کو اَللّٰھُمَّ صَلِّ وغیرہ نہ کہو۔ تاکہ تم کو شیعہ ہونے کی تہمت نہ دی جائے۔ آگے فرمایا وَقَدْ نُھِیْنَا عَنْ شِعَارِھِمْ یہی وجہ ہے:۔ کہ علیہ السلام بھی کسی غیر نبی غیر ملک کو کہنا منع ہے۔ چنانچہ شیخ اسماعیل حقی فرماتے ہیں صفحہ نمبر ص۲۲۸ پر:۔ وَاَمَّا السَّلَامُ فَھُوَ فِیْ مَعْنَی الصَّلٰوۃِ فَلَا یُسْتَعْمَلُ لِلْغَائِبِ وَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ فَلَا یُقَالُ۔ عَلِیٌّ علیہ السلام۔ کَمَا تَقُوْلُ الرَّوَافِضُ وَتَکْتُبُہٗ۔ اسی طرح فتاویٰ کبیری شرح منیر ص۳ پر ہے مدلل اور بالتحقیق ثابت ہو گیا کہ اہل سنت کے نزدیک حسن علیہ السلام کہنا سخت ناجائز ہے۔ مصنف یا تو در پردہ شیعہ ہے اور یا غیر عالم ہے اور یا کاتب کی غلطی ہے۔ مصنف نے اسی ص۱۴ پر جنید بغدادی کی توبہ از قوالی کا جواب دیتے ہوئے خواجہ ابو یوسف کا ایک قول نقل کیا ہے کہ جنید بغدادی نے اس لیئے توبہ کی کہ قوالی سے ان کو وجد آتا تھا اور سخت صدمات آتے تھے۔ اس لیئے توبہ تھی نہ کہ قوالی کی حرمت کی وجہ سے۔ اقول۔ مصنف صاحب یا خواجہ یوسف کا منسوب ابو بکر شبلی کا اپنا اختراعی احتمال ہے۔ اس طرح تو ہر شخص اپنا اپنا خیال ظاہر کر سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ نے ردالمحتار جلد پنجم ص۲۰۹ پر معصیت اور حرمت ہی احتمال ظاہر کیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہی حق ہے تین وجہ سے۔

نمبر ۱:۔ کیونکہ روایت ہے:۔ تَابَ جُنَیْدٌ عَنِ السَّمَاعِ۔ حضرت جنید نے قوالی سے توبہ کی۔ اور باعتبار منقول عرفی کے توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے:۔ **۲** ابو بکر شبلی کا احتمال غلط ہے اس لیئے کہ صدمات دو قسم کے ہو سکتے ہیں یا دینی کہ اس وجد سے فرائض میں کوتاہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے خود بھی شک ظاہر کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وجد حرام اور غیر شرعی ہے:۔ کیا معاذ اللہ جنید بغدادی توبہ سے پہلے اتنے عرصے حرام کام میں مبتلا رہے اور فرائض میں کوتاہی کرتے رہے جو اشد حرام ہے۔ صوفیاء عظام کے نزدیک سچا وجد وہ ہے جو نماز کو نہ روکے جیسا کہ اعلیحضرت نے ملفوظات میں اور خود مصنف نے ص۴۳ پر بیان کیا تو کیا مصنف کے نزدیک حضرت جنید کا وجد جھوٹا تھا جو دیگر عبادات میں فرق کرتا اور یا یہ صدمہ دنیوی تھا کہ وجد سے ہاتھ پیر میں چوٹ آجاتی تھی۔ زخم آتے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو معاذ اللہ مصنف نے

حضرت جنیدؒ کی گستاخی کی۔ کہ حضرت جنید جیسے ولی کامل کو بزدلوں کے زمرے میں شامل کر رہے ہیں
کہ جب عشقِ الٰہیہ میں منصورؒ نے پتھر برداشت کئے سولی قبول کی۔ عشق کی لذت سے دست بردار
نہ ہوئے۔ شمس تبریزی نے کھال کھنچوالی مگر پیچھے نہ ہٹے بڑے بڑے اولیاء تو درکنار مبتدی حضرات
کو بھی جب لذتِ عشق کا سرور آتا ہے تو ہاتھ پیر بھی اگر ٹوٹ جائیں پھر بھی اس لذت سے پیچھے
نہیں ہٹتے۔ اگر قوالیوں سے وجد اور عشقِ الٰہی حاصل ہوتا تو کیا جنید علیہ الرحمۃ نے عشقِ الٰہیہ کے راستے
سے توبہ کرلی۔ حضرت جنیدؒ کی بارگاہ میں ابوبکر شبلی یا مصنف کی کتنی بڑی زیادتی اور گستاخی ہے، بلکہ
توبہ کا مقصد یہ ہے۔ کہ شروع ہی سے حضرت جنیدؒ نے قوالی کو برا سمجھا جیساکہ روایت میں آتا ہے کہ
کہ نبی کریم نے فرمایا اَنَا اَوَّلُ التَّائِبِیْن۔ مقصد یہ ہے کہ شروع سے پرہیز۔ یا مراد ہے۔ کہ
حضرت جنیدؒ نے اسرارِ الٰہیہ کے جس مقصد کے لیئے ایک دو دفعہ قوالی سنی وہ تو حاصل نہ ہوا بخلاف
اس کے اغیار نے حضرت جنیدؒ کے قوالی سننے سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حرام قوالیوں میں مشغول
ہوگئے اور اپنے اِس فعل حرام کے لیئے دلیل حضرت جنید کو بنا لیتے تھے۔ جیساکہ مصنف مذکور اپنی
حرام قوالیوں کے لیئے، امام غزالی محدث دہلوی جیسے اکابرین کو دلیل بنا رہے ہیں۔ حالانکہ سچ تو یہ
ہے کہ اگر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی۔ موجودہ قوالیاں اور موجودہ قوالوں کو دیکھ لیتے تو جنید بغدادیؒ
کی طرح توبہ کر لیتے۔ مصنف مذکور ص۴۳ پر سفینۃ الاولیاء کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت نظام الدین
اولیاءؒ کا واقعہ لکھتے ہیں کہ آپ ہمیشہ وجد و سماع کا وعظ فرمایا کرتے۔

اقول: مصنف صاحب کی دلیری دیکھئے کہ سفینۃ الاولیاء ص۱۲۲ پر ہے۔ حضرت شیخ
کی مجالس میں وعظ و تلقین کے سلسلے ہوا کرتے تھے۔ صاحبِ سفینۃ الاولیاء پھر لکھتے ہیں کہ سماع کے جملہ آداب
کیا تھے۔ وہی جس کا ذکر اعلیحضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ ملفوظات حصہ اوّل ص۱۰۱ پر فرماتے ہیں
(عرض) کیا یہ روایت صحیح ہے۔ کہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قبر شریف میں ننگے
سر کھڑے گانے والوں پر لعنت فرما رہے تھے (ارشاد) یہ واقعہ خواجہ قطب الدین بختیار
کا کیؒ کا ہے۔ اب تو لوگوں نے بہت اختراع کر لیئے ہیں۔ اس وقت تو بارگاہوں پر مزامیر
بھی نہ تھے۔ سبحان اللہ یہ ہیں جملہ آداب۔ یعنی بغیر مزامیر سماع کو ہماری اصطلاح میں نعت خوانی
کہا جاتا ہے۔ مصنف ص۴۲ پر حضرت مودود چشتیؒ کا خود ساختہ واقعہ نقل کرتے ہوئے فرماتے
جب مودود صاحب بخارا تشریف لائے تو حاسدین علماءِ بخارا مسئلۂ سماع میں بحث
کے لیئے جمع ہوگئے۔

اقول :- مصنف کو ذرا خیال نہیں کہ علمائے اسلام۔ جو اسلام کے نیر تاباں بلکہ رونقِ اسلام ہیں۔ ان کو صرف ایک مسئلے کی تحقیق و بحث کرنے کی بنا پر۔ حسد جیسی حرام چیز کی تہمت لگا کر گستاخی کا ارتکاب کر رہے ہیں مصنف مذکور کو معلوم ہونا چاہیئے علمائے کرام کے دم سے ہی اسلام کی بہاریں ہیں بلکہ صوفیاء کا وجود بھی علمائے اہل سنت کے دم قدم سے ہے جہاں کے عالم گمراہ ہو گئے وہاں کی عورتوں نے صوفی بننے چھوڑ دیئے۔ دیکھو دیوبند وہاں کوئی صوفی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں کے عالم بگڑ گئے۔ اور شرعی مسئلے کے مقابل کرامت دکھانا یہ بڑی جہالت ہے خواجہ صاحب کو حلت کی دلیل دینی چاہیئے تھی۔ ثابت ہوا کہ یہ سب مصنف کی اپنی اختراع ہے ورنہ یاد رکھو اولیاء اللہ کو کرامات اس لیئے نہیں دی جاتی کہ وہ شعبدے دکھا کر اپنا قائل کرتا پھرے اور مسائل شرعیہ کا مقابلہ کرے بلکہ اس لیئے کہ جادو اور کفر کا مقابلہ کرے۔ اور پھر یہ حکایت خزینۃ الاولیاء میں ہے بھی نہیں۔ مصنف صاحب اپنے رسالہ مزیلۃ النزاع صـ۴۳ پر فرماتے ہیں کہ شیخ ابو احمد نامی کسی مَن گھڑت شخص کے ساتھ علماء حاسدین نے مسئلہ غناء پر مناظرہ شروع کیا۔ تو آپ نے اپنی کرامت سے اپنے جاہل خادم کو علماء کا علم سلب کر کے دے دیا اور جاہل خادم کو تمام علوم کا عالم بنا دیا۔

اقول :- مصنف نے اس کا کوئی حوالہ نہ دیا۔ کتنی لغو اور واہیات بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی عقل ماری گئی ہے۔ اگر کرامت سے علم آیا کرتا تو امام اعظم، غوث پاک اور شیخ سعدی، امام غزالیؒ وغیرہ اولیائے کاملین کو استادوں کے پاس جانے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ غوثِ پاک جیسی سردار اولیاء ہستی مدرسۂ نظامیہ میں علمائے کرام سے درس لیتی۔ اور پھر ابو احمد کو خود تو علم آیا نہیں خادم کو علم دیدیا۔ گویا کہ خود جاہل رہا۔ خادم عالم بن گیا۔ اور یہاں تو صرف ایک بحث کا معاملہ ہے۔ حضرتِ منصور کو تو علمائے حق نے سولی پر چڑھا دیا۔ انھوں نے اپنی کرامت سے کیوں نہ علم سلب کیا اور خود مصنف نے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ کہاں سے حاصل کیا ان کو کسی صوفی نے آن کی آن میں کیوں نہ عالم بنا دیا۔ دنیا بھر کے تمام علماء نے بھی اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی علم حاصل کیا۔ سب علمائے کرام اسی طرح عمریں صرف کر کے ماریں کھا کر ایڑیاں رگڑ کر ہی عالم بنتے ہیں۔ کسی کو ابو احمد جیسا صوفی نہیں ملتا بڑے بڑے اولیاء اللہ کے صاحبزادگان بھی علماءِ کرام کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی علم کی دولت حاصل کرتے ہیں۔ ان کو کرامت سے کیوں نہیں عالم بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ حکایات بالکل جھوٹ ہیں صـ۴۵ پر خواجہ نقشبند کے متعلق یہ منقولہ منسوب کیا ہے کہ "نہ انکار میکنم ونہ اقرار میکنم۔ حالانکہ یہ مجدد صاحب کا فرمودہ ہے۔ مصنف نے صـ۴۷ پر ایسی بات لکھی جو ایک جنتی مسلمان عالم کے لیئے قطعاً جائز نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے، حضرت خضر کو غیر نبی ولی تصور کرتے ہوئے۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا علم کم اور حضرت خضر علیہ السلام کا علم زیادہ مانتے ہیں۔ اور معاذ اللہ

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو شاگردوں کا درجہ دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "اہل اللہ کے رازوں کو سمجھنا انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ کے لیے مشکل ہے" (استغفر اللہ، نعوذ باللہ من ھذا القول المردود والملعون) ایسی ہی جہالت کی باتیں ہیں جن سے نئے نئے فرقے جنم لیتے ہیں۔ قاسم نانوتوی دیوبندی نے خاتم النبیین کا ترجمہ غلط کیا تو مرزائیت نے جنم لیا۔ اور جب جاہل صوفیوں نے ایسے فقرے لکھنے اور چھاپنے شروع کر دیئے تو نہ معلوم کون سا بے دین فرقہ سر ابھارے جو معاذ اللہ صاف طور پر اولیاء اللہ کو یا بے دین صوفیوں کو انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ درجہ دے دیں خدارا کچھ تو خیال کرو قوم پہلے ہی ایسے فقروں سے بہت گمراہ ہو چکی ہے۔ مزید لغو بیہودہ رسائل کو چھاپ کر ان کو جہنمی نہ بناؤ نہ خود جہنمی بنو۔ مسلمانوں حاشا حاشا کسی اہلسنت کا یہ عقیدہ نہیں نہ یہ قول اہلسنت کے علماء کا ہے۔ یہ کسی جاہل صوفی کا ہے۔ اہلسنت کا مسلک واضح ہے کوئی امتی خواہ کسی نبی کا ہو۔ غوث ہو یا قطب، عالم یا مجتہد کسی نبی مکرم سے کسی علم میں زیادہ نہیں ہو سکتا بلکہ گردِ راہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ اولیاء تو انبیاء کرام کے گردِ راہ کے ذرے ہیں۔ اللہ کریم کی بارگاہ میں جو شان انبیاء کرام کا ہے کسی کا نہیں۔ انبیاء کرام گویا آفتاب ہیں تو اولیائے عظام ان کے چمکتے دمکتے ذرے۔ ولیوں عالموں کو جو کچھ ملتا ہے انبیاء کے در کی گدا ہوتی ہے خواہ جنید بغدادی ہوں یا ان کے مرید اولیاء کے سردار حضور غوث پاک ہوں۔ اہل اللہ کون ہے؟ اہل اللہ تو یہ ہی انبیاء کرام ہیں۔ مصنف جن کو اہل اللہ سمجھ رہا ہے وہ انبیاء کرام جیسی اہل اللہ ہستیوں کے غلاموں کے غلام ہیں۔ اولیاء اللہ تو خدا تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک انبیائے عظام کے قدم سے وابستہ نہ ہوں۔ رب تعالیٰ اپنے سب راز انبیاء کرام کو درجہ بدرجہ بتاتا ہے۔ پھر انبیاء کی خوشہ چینی سے اولیاء اللہ کو اس بحرِ بیکنار کا قطرہ میسر ہوتا ہے۔ مصنف حضرت خضر علیہ السلام کے جس واقعے سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ انبیاء کرام کا آپس کا ایک مخصوص واقعہ ہے۔ یاد رکھو کہ حق یہ ہے کہ خضر علیہ السلام بھی نبی ہیں جن لوگوں نے آپ کو ولی کہا ہے وہ بالکل غلط اور لغو ہے۔ ان کے دلائل بیہودہ ہیں مصنف صاحب ایک باطل قول کا سہارا لے کر صرف جاہل صوفیوں کو حضرت خضر کی صف میں شامل کر کے نبوت سے ٹکرانا چاہتے ہیں اور پیروں کی دکانداری کے لیے ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں مصنف کی انہیں باتوں کا سہارا لے کر پیر پرست فقراء کا ٹولہ قرآن و حدیث شریعت و علماء کرام کے متعلق بڑی بڑی گستاخی آمیز باتیں کہہ دیتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا مقام تو بہت بلند ہے۔ حضرت خضر کا علم تو حضرتِ ہارون علیہ السلام کے برابر بھی نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی رسول اور مرسل ہیں حضرت ہارون نبی اور رسول ہیں اور حضرت خضر صرف نبی ہیں۔ قرآن مجید کا یہ واقعہ محض ایک مخصوص چیز کا اظہار کرنے کے لیئے ہے ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم حضرت خضر سے کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ علامہ شیخ احمد اپنی تفسیر صاوی جلد سوم صـ۱۸ پر فرماتے ہیں وَھٰذَا مِنَ بَابِ عِتَابِ الْاَحْبَابِ تَادِیْبًا لِمُوْسٰی وَ اِلَّا فَالْوَاقِعُ اَنَّ مُوْسٰی اَعْلَمُ مِنَ الْخِضْرِ یعنی

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو محبت کا عتاب فرمایا صرف اس چیز کا اب دینے کیلئے آپ نے علم کی زیادتی کو اپنا کہہ کر اپنی طرف کیوں منسوب کیا چاہیئے تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف منسوب فرماتے۔ ایک آزمائش تھی کہ حضرت خضر کے پاس بھیجا۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے بہت زیادہ عالم ہیں یہ ایک امتحان تھا اسکا لیئے حضرت موسیٰ باوجود نبی (غیب داں) ہونے کے مچھلی کا ڈوبنا بھی اپنے علمِ غیب سے اُس وقت نہ جان سکے اور پھر حضرت خضر کے چل کر تو بہت سی غیب کی خبریں دے رہے ہیں مگر یہاں حضرت موسیٰ کو پہچانا بھی نہیں۔ جیسا کہ روایتوں سے ثابت ہے حالانکہ حضرت موسیٰ نے بغیر پہلے دیکھے ہوئے باوجود اجنبیت کے اپنے علمِ غیب سے حضرت خضر کو پہچان لیا مگر آگے کے مکاشفات محو کردیئے گئے صرف امتحان کیلئے اور جو باتیں حضرت خضر نے بتائیں وہ کوئی اسرارِ طریقت یا معرفت کے راز نہ تھے جس کو اہل اللہ کے راز کہہ کر حضرت کلیم کی گستاخی کی جائے۔ بلکہ غیب اور کشف کی چند خبریں تھیں منشاء باری تعالیٰ یہ تھا کہ اے میرے پیارے کلیم اگرچہ آپ کو علمِ غیب و کشف دیئے گئے مگر اتنے علم کو انتہائے علم نہ سمجھنا بلکہ بہت کشف اور غیب ایسے بھی ہیں جو آپ کو نہیں دیئے گئے اسی طرح بہت سے وہ غیب جو موسیٰ علیہ السلام کو ملے۔ وہ حضرت خضر علیہ السلام کو نہ ملے۔ جب یہ بات ان کے ذہن نشین کرادی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واپس بلالیا۔ نہ کچھ مزید دیکھا نہ کچھ سیکھا نہ شاگردی کی نہ استادی مصنف مذکور اس واقعے سے اور ہی ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ص۴۲ پر لکھتے ہیں اس لیئے آخر تک سے خائف ہو کر اہلِ تصوف کی شان میں بے ادبی سے بچنا چاہیئے۔ اقول یعنی صحابہ کی گستاخی ہو تو کوئی بات نہیں۔ حضرت موسیٰ کی بے ادبی ہوتی ہے تو ہو قرآن و حدیث کی تحریف بیشک ہوتی ہے مگر اہل تصوف کی نگاہوں میں بے ادبی نہ ہونے پائے واہ ری پیر پرستی و باطل نوازی اور داہ ری قوالی کی چسک۔ آگے فرماتے ہیں یعنی جن حضرات کیلئے غنا کو جائز لکھا ہے وہ وہ ہی ہیں جو صحیح معنی میں اس کے اہل ہوں الخ (اقول) مصنف صاحب اب آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اہل اور نااہل کی قیدیں لگائیں۔ جبکہ پہلے اپنے استدلال میں قرآن و سنت کو توڑ مروڑ کر مطلقاً قوالی ہر شخص کے لیئے بر سرِ عام سڑکوں اور گلیوں پر جائز کردی۔ ص۴۸ پر مصنف صاحب، غالباً خود اپنے استدلالات کی کمزوری بھانپ گئے اسلیئے فرماتے ہیں کہ کہیں کوئی میری اس کمزوری کو تحریر میں لاکر شائع نہ کردے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ قال۔ اگر کسی صاحب کو میرے خیالات کے ساتھ اختلاف ہو تو وہ قبل اس کے کہ جواب میں نوکِ قلم کو جنبش دیں۔ اپنے تمام اعتراضات اور جملہ شکوک و شبہات سے مجھ کو مطلع فرمادیں:۔ اقول: کیوں صاحب جب آپ نے یہ رسالہ لکھا اور احادیث کو توڑ مروڑا اور غلط حوالے تحریر کرنے کے لیئے نوکِ قلم کو جنبش دینے کی نیت فرمائی تو کیا کسی ذی علم یا علماءِ اہلسنت ذی عقل حضرات سے اپنے شکوک و شبہات بیان کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ اگر آپ ایسا کرتے تو وہی آپ کی بھی تسلی کردیتے اور ایسی فتنہ انگیز تحریر کی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ بعد میں جو آپ خفیہ رجوع کرنے کا ارادہ فرمارہے ہیں "وہ پہلے ہی"، تو پہلے ہی سوچا۔ "چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"۔ حضرت مصنف اپنے رسالے مزیلۃ النزاع کے ص۲۸، ۲۹ پر لکھتے ہیں تکملہ بحر الرائق کا حوالہ دیتے ہوئے:۔ اَلْغِنَاءُ وَالرَّقْصُ وَسَمَاعُ الْقَصَبِ لِلشَّرِيْعَةِ لَا اللَّهْوِ فَلَيْسَ فِيْهِ اِخْتِلَافُ الْفُقَهَاءِ وَهٰكَذَا اُجْرَةُ الْمُغَنِّيْ بِلَا شَرْطٍ حَلَالٌ۔ (تکملہ بحر الرائق وفتاوٰے ابی اللیث) یہ عبارت تکملہ بحر الرائق میں قطعاً نہیں ہے۔ بلکہ ص۲۰ تکملہ بحر جلد ہشتم میں وَيُكْرَهُ اِسْتِمَاعُ صَوْتِ اللَّهْوِ وَالضَّرْبِ بِهٖ وَالْوَاجِبُ عَلَى الْاِنْسَانِ اَنْ يَّجْتَهِدَ مَا اَمْكَنَ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ۔ مصنف نے کتنی زیادتی سے کام لیا۔ اور بحر الرائق کا غلط نام استعمال کرکے کوئی ایمانی کام نہیں کیا

فتاوٰی ابی اللیث میں فرضِ محال اگر یہ عبارت ہے تو غلط ہے۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ناچ گانے کی حلت میں اختلاف نہیں۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ ابھی تحقیق سے ثابت کر چکا ہوں کہ اختلاف ہے، بلکہ اکثریت اس کی حرمت پر ہے جیساکہ مدارج اور شامی کے حوالے درج کر دیئے گئے۔ مصنف مذکور کی یہ زیادتیاں تھیں جس میں کسی قسم کی گنجائش نہیں ورنہ حقیقت دیکھی جائے تو سب کتاب مذکور ہی غلط ہے اور قابلِ توبہ ورجوع اگر اب بھی مصنف صاحب رجوع نہ کریں تو حَسْبُنَا اللّٰہُ الْمُشْتَکٰی

خلاصہ کلام:۔ قوالی نہ سنتِ نبی کریم ہے نہ سنتِ صحابہ نہ تابعین۔ نہ شعارِ اسلام نہ عبادتِ لعینہٖ نہ ریاضت عمومیہ نہ زہد نہ تقوٰی۔ بلکہ قوالی بدعت ہے جو اہل کے لیے حسنہ ہے اور نااہل کے لیے بدعتِ سیئہ۔ اہل وہی ہے جو فقہاء کی بیان کردہ چھ شرطیں اپنے میں پیدا کرے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ میں ابھی اسی رسالے کی تردید میں مشغول تھا کہ مجھ کو ایک صاحب نے حضرتِ قبلۂ عالم جناب علامہ مولانا عطا محمد صاحب بندیالوی کا رسالہ مسئلہ قوالی کی شرعی حیثیت پیش کیا اور مجھے جواب کے لیے کہا۔ میں نے سرسری طور پر مطالعہ کیا کہ شاید کوئی دلیل کارآمد نظر آئے مگر اس میں بھی وہی چشم پوشیاں ہیں جن کی وضاحت و تردید کر دی گئی۔ زبانی طور پر سمجھا دیا گیا۔ تحریری جواب کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ وقت کا ضیاع ہے۔ علامہ بندیالوی مدظلہٗ اگرچہ منطق کے بحرِ بیکراں کے عظیم تیراک ہیں۔ اور دریائے فلسفہ کے شناور ہیں۔ اگر آپ کو معقولات کا استادِ کامل یا فلسفے کا امام کہا جائے تو بے جا نہ کہا جائے گا۔ بلکہ یہ حقیقتِ مسلّم ہے۔ ہم جیسے اصاغر تو علامہ بندیالوی کے گلستانِ منطق کے خوشہ چین ہیں اور فلسفے میں بڑے بڑے استاد ان ہی کے کاسہ لیس ہیں۔ مگر فقہ اسلامیہ میں پیرِ طریقت سید قبلہ ابوالبرکات اور شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب کا ہی مقام ہے۔ امام فقہ کا لقب تو امام اہلسنت اعلیٰحضرت اور صدرالافاضل مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کو ہی زیبا ہے۔ علامہ بندیالوی کا قول منطق اور فلسفہ میں تو حجت ہو سکتا ہے مگر فقہ میں ان کا قول قابلِ حجت نہیں۔ حضرت قبلہ بندیالوی مدظلہٗ کے رسالے کی صرف دو باتوں کا ذکر کرتا ہوں کہ جس سے رسالے کی کمزوریوں کا بخوبی علم ہو جائے گا۔

نمبر ۱:۔ رسالہ ہذا کی ابتداء ص ۱۵ سے ہوتی ہے۔ اسی ص ۱۵ پر چار مقدمہ درج ہیں پہلا مقدمہ میں فرماتے ہیں۔ حرمت کے لیے دلیل قطعی ضروری ہے۔ دلیل ظنی سے ثابت نہیں ہوتی۔ اور خبرِ واحد مفیدِ ظن ہے۔ یہ ہے پہلا مقدمہ۔ جواب۔ کاش مصنف محترم لکھتے وقت فقہ اور اصولِ فقہ کی کتاب پڑھ لیتے۔ کم از کم اس مقدمے کو لکھنے سے پہلے علامہ شامی کی کتب اور تلویح توضیح کا ہی مطالعہ فرما لیتے تو ایسی خطاءِ مطلقہ کا صدور نہ ہوتا۔ قانونِ شریعت کے مطابق حرام دو قسم کا ہے ۱۔ حرام قطعی ۲۔ حرام ظنی۔ حرام قطعی جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ حرام ظنی جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اسی کو مکروہ تحریمی بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی ردّ المحتار جلد اول صفحہ نمبر ۱۲۲

پر فرماتے ہیں۔ وَعَلَى الْمَكْرُوْهِ تَحْرِيْمًا وَهُوَ مَا كَانَ إِلَى الْحَرَامِ أَقْرَبُ وَيُسَمِّيْهِ مُحَمَّدٌ حَرَامًا ظَنِّيًّا۔ تلویح توضیح ص۲۷ پر ہے۔ وَالتَّحْرِيْمُ عِنْدَهٗ قِسْمٌ مِّنَ الْحَرَامِ (الخ) (حاشیہ) اور حرام ظنی دلیل ظنی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تلویح شرح توضیح ص۲۷ پر ہے۔ وَبِدَلِيْلٍ ظَنِّيٍّ مَكْرُوْهٌ كَرَاهَةَ التَّحْرِيْمِ اور چونکہ خبرِ واحد ظن کو مفید جیسا کہ مصنف محترم کو تسلیم۔ لہٰذا خبرِ واحد دلیل ظنی ہوئی جس سے حرمت ثابت ہے۔ پس خبرِ واحد سے بھی حرمتِ قوالی ثابت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ قوالی کی حرمت میں تو دلائلِ قطعیہ بھی بیان کر دیئے گئے۔

دوسرا مقدمہ:۔ فرماتے ہیں ''کسی چیز کے شرائط مقرر کرنا شارع جَلَّ جَلَالُہٗ یا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حق ہے'' ہم اپنے طور پر حلال اور حرام شرائط مقرر کرنے کا ہرگز حق نہیں رکھتے۔ شرائط دو قسم کی ہے ۱۔ شرائط اولویت ۲۔ شرائطِ جواز۔ کتبِ فقہاء کی شرائط، شرائطِ اولویت ہیں:۔ نہ کہ شرائطِ جواز۔ **جواب:۔** علامہ صاحب کی یہ تینوں باتیں خود ساختہ اور لغو ہیں۔ پہلی بات کسی چیز کے شرائط مقرر کرنا (الخ) شارع جَلَّ جَلَالُہٗ۔ یہ اصطلاح فقہاء علماء کے خلاف ہے سب آئمہ۔ لفظ شارع حضور علیہ السلام کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شارع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے۔ آئمہ مجتہدین بھی حلت و حرمت کی شرطیں لگا سکتے ہیں اس لیے فقہائے کرام نے خاوند کے لیے نکاح میں بھی چند شرطیں لگائیں اور فرمایا کہ اگر وہ شرطیں۔ نہ پائی جائیں تو نکاح کرنا بھی حرام ہو جائے جیسا کہ پہلے سبل السلام شرح بلوغ المرام کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اور جس طرح شریعت کی دلیل قرآن و حدیث ہے اسی طرح اجماعِ امت اور قیاس بھی۔ مجتہد اپنے قیاس سے حلت و حرمت کے لیے شرطیں لگا سکتا ہے۔ ہاں ما و شما واقعی اس چیز کے مجاز نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ نکاح کے لیے تو کسی نہ کسی آیت سے اشارہ ملتا ہو گا اس اشارہ سے شرطیں لگیں۔ تو میں کہوں گا کہ فقہائے امت جو کچھ بھی فرماتے ہیں اپنی طرف سے بالکل کچھ نہیں ہوتا ہر جگہ کسی اشارۃ النص یا عبارت النص یا دلالۃ النص یا اقتضاء النص سے ہی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح حرمتِ قوالی عام ہے مگر حلت کے لیے شرائط کسی نص سے ہی ہے۔ یہ مذکورہ قاعدہ مصنف نے اپنے گھر سے بنا لیا۔ دوسری بات بھی غلط ہے کیونکہ درباب قوالی منقول شرائط میں سے کوئی شرطِ اولویت نہیں۔ تیسری بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ علامہ شامی حلتِ قوالی کی شرائط بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں۔ شامی جلد پنجم ص۳۰۶ وَالْحَاصِلُ أَنَّهٗ لَا رُخْصَةَ فِي السَّمَاعِ فِي زَمَانِنَا یعنی ان شرطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قوالی کرنے اور سننے کی اجازت ہی نہیں۔ ثابت ہوا کہ شرائط جواز ہیں نہ کہ اولویت۔ یہ تھیں علامہ بندیالوی کے رسالے کی کچھ چشم پوشیاں۔ مجھ کو حیرانگی اور افسوس ہے کہ میرے اکابر کو کیا ہو گیا جو ایسی کچی باتیں کرتے ہیں

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ

کتبہ

فال نکالنے کا بیان اور شرعی حکم

سوال نمبر ۳۰:- فال نکالنا اور نکلوانا کیسا ہے۔ جائز ہے یا نہیں اور علم جفر اور علم ابجد کی کیا حقیقت ہے اور ہر ایک کا کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں اور اُن کا ثبوت قرآن حدیث میں ہے یا نہیں قرآنی آیت کا متن نقل کیا جائے۔ ۲۔: خواب کی کیا حقیقت ہے کیا دن میں جو انسان خیالات اور تصوارت کرتا ہے خواب میں وہی آجاتے ہیں۔ اور کیا انسان کی روح نکل جاتی ہے۔ سیر کے لیئے۔ اور کیا قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ہے۔ وہ آیت یا حدیث کا متن نقل کیا جائے:۔ (فقط والسلام نور محمد منڈ والھریار حیدر آباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

۱:۔ شریعت میں فال نکالنا قطعاً حرام ہے۔ اس کو عربی میں کہانت کہتے ہیں اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہانت کرنے والا اور کروانے والا دونوں ملعون ہیں۔ اور کاہن کی اجرت حرام ہے چنانچہ ارشاد ہوا:۔ اَلْکَاهِنُ وَالْمَکْهُوْنُ وَالْوَاشِمَةُ وَالْمُتَوَشِّمَةُ مَلْعُوْنٌ ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا۔ کہ کاہنوں کے پاس مت جاؤ۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے:۔ صفحہ نمبر ۳۹۲ پر: عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُمُوْرًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ .:۔ فال نکالنے اور فال لینے میں فرق ہے۔ فال نکالنا مطلقاً حرام ہے اور ناجائز ہے۔ جیسے کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ فال لینا جس کو عربی میں فال ہی کہتے ہیں۔ یہ اچھی باتوں میں جائز ہے اور بُری باتوں میں ناجائز چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ارشاد ہوا۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَالُ قَالُوْا وَمَا الْفَالُ قَالَ اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا اَحَدُكُمْ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ۵ علم نجوم دو قسم کا ہے۔ ایک جائز اور دوسرا ناجائز۔ اگر حساب و کتاب کے لیئے علم نجوم سیکھا جائے جیسے تاریخ بتانا یا جنتری بنانا تو جائز ہے۔ اور اگر خفیہ باتیں یا پیشین گوئی والا نجوم سیکھا۔ تو ناجائز ہے۔ کیونکہ ایسے نجومیوں کی اکثر باتیں جھوٹی ہوتی

ہیں۔ اور جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ اسی نجوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو سے تشبیہ دیتے ہوئے گناہ فرمایا:۔
چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ارشاد ہوا ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ ؕ علم جفر سیکھنا بالکل جائز ہے۔ اس کے موجد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف اور مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۹۲ میں ہے۔ عَنْ مُعَاوِيَةَ ابْنِ الْحَكَمِ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّونَ قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ بِذَالِكَ رَوَاهُ مُسْلِمٌ ؕ
علم ابجد کوئی مستقل علم نہیں ہے۔ بلکہ آٹھ لفظ ہیں۔ کہ جن سے ہر حرف کے نمبر ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ اور ان کے عدد علم جفر۔ وظائف۔ تعویز۔ علم حساب اور تاریخ نکالنے کے علم میں کام آتے ہیں:۔ (۲) بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ
علمائے محققین کے نزدیک خواب چند قسم کے ہیں (۱) خواب الہامی (۲) خواب وحی (۳) خواب اضطرابی (۴) خواب تخیلی (۵) خواب وہمی (۶) خواب تحقیقی۔ پہلی خواب صرف اولیاء اللہ کو نظر آتی ہے:۔ دوسری خواب انبیاء کرام کو مشاہدہ ہوتا ہے۔ تیسری خواب ہر پریشانی والے شخص کو ہیبت ناک شکل میں نظر آتی ہے۔ چوتھی خواب دن کے پراگندہ خیالات نظر آتے ہیں۔ جن کا اثر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پانچویں خواب اکثر اُن لوگوں کو آتی ہے۔ جو غلط وظائف کرتے ہیں۔ یا جن کو مالیخولیا والی بیماری ہو یا بچہ ڈرنے والا ہو۔ یا حاملہ عورت کو چھٹی خواب ہر شخص کو آئندہ گذشتہ کے واقعات کے بتانے کے لیے آتی ہیں۔ علمائے تعبیر انہی خوابوں تعبیر بتاتے ہیں۔ انسان کے جسم میں اللہ رب العزت نے دو قسم کی روحیں پیدا فرمائی ہیں۔ (۱) رُوحِ سلطانی (۲) روحِ سیلانی:۔ پہلی رُوح جب نکلتی ہے۔ تو انسان مرجاتا ہے۔ دوسری روح جب نکلتی ہے۔ تو خواب میں نکلتی ہے۔ مگر جسم سے تعلق پورا پورا رکھتی ہے۔ اسی لیے جب جگایا جاتا ہے۔ تو فوراً جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ رُوح سریانی یا سیلانی نکل کر بارگاہِ ربّ العزت میں حاضر ہو جائے تو خواب وحی ہے۔ اگر بھٹکتی پھرے۔ تو خواب تخیلی نظر آتی ہے۔ اگر جنات کے پاس پہنچ جائے۔ تو وہمی ہے۔ اگر کسی چیز میں مبتلا ہو جائے۔ تو خواب تحقیقی نظر آتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بدن میں دو روحیں پیدا فرمائیں۔ ایک روح کو نکال کر موت دیتا ہے۔ اور دوسری کو خواب میں نکالتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (پارہ ۲۴ ع ۲ آیت ۴۲ رکوع پہلا):۔ واللہ ورسولہ اعلم

کتبہ

٭ ٭ ٭ ٭

اِمام مسجد کو نامردی کا علاج حکیم بن کر کرنے کا حکم

سوال نمبر ۵ :۔ نامردی وغیرہ مرضوں کا علاج کرنے والے کو امام بنانے کا کیا حکم ہے۔

کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اِس مسئلہ میں کہ ایک مسجد کے خطیب اور امام فنِ حکمت سے واقف ہیں۔ کبھی کبھی اپنی ڈیوٹی کے علاوہ حسبِ ضرورت حکمت کا کام کر لیا کرتے ہیں۔ اور اکثر ان کے پاس نامردی کے مریض آتے ہیں۔ یہ حکیم صاحب کمزوریِ عضوِ تناسل کے مریض کو اس کے علاج کے لیئے عضوِ تناسل کو برانگیختہ کر کے منی کا اخراج کر کے اُس کا مناسب علاج کیا کرتے ہیں۔ بروئے شہادتِ مخالفین یہ کام عادتاً یا علانیۃً کیا ہے۔ اب اُس نے شکایت ہونے پر اپنے مرشد کے سامنے اس فعل کی مکمل توبہ کر لی۔ کہ آئندہ ایسا ہرگز نہ کروں گا۔ فرمایا جائے اگر کیا ایسے شخص کو امام یا خطیب بنانا شرعاً جائز ہے یا ناجائز ہے۔ اس کے مرشد صاحب نے اُس کی توبہ کے بعد اس کی امامت جائز قرار دی ہے۔ مگر بستی والوں نے اس اجازت کو منظور نہ کیا۔ اور آپ کے فتوے پر ہی عمل کیا جائے گا۔ لہٰذا بہت جلد فتوٰے عطا فرمایا جائے۔ اگر حضرت حکیم الامت جواب فرمائیں۔ تو کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف آپ کی مہر اور دستخط ہی کافی ہیں:۔

سائل :۔ مولوی ملک قاسم مدرس کراڑی کوٹ۔ ضلع گجرات

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

ایسے شخص کو امامت سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ اس کے پیچھے اُس وقت تک نماز نہ پڑھی جائے جب تک یہ شخص صرف لِوَجْہِ اللہ سچی توبہ نہ کرے۔ ابھی اِس نے صرف اِس لیئے توبہ کی ہے۔ کہ امامت باقی رہے۔ جو شخص قانونِ شریعت کے مطابق امام بننا چاہتا ہے۔ اس کو شرعی پابندیوں کا پورا پورا خیال رکھنا لازم ہے۔ امام کی امامت و خطابت اسلام کا بہت اُونچا عہدہ ہے۔ کہ جس کے لیئے شریعت میں چند بہت ضروری شرطیں ہیں۔ جن کا موجود ہونا ہر امام میں ضروری ہیں:۔

احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور فقہاء کی تشریحات سے مندرجہ ذیل شرطوں کا ہر امام میں ہونا لازمی ہیں:۔

نمبر ۱:- وہ شخص جس کو قوم اپنا امام بنانا چاہتی ہے۔ سب سے زیادہ عالم ہو (۲) قاری ہو۔ (۳) خاندان میں سب سے اونچا ہو (۴) سب سے زیادہ بزرگ ہو (۵) متقی ہو۔ (۶) وجیہ ہو (۷) ہر ایسے کام سے بچے جس سے وہ قوم میں ذلیل تصور کیا جائے (۸) بداخلاق نہ ہو (۹) بازاری آدمی نہ ہو (۱۰) امام کے خیالات و توجہ الی اللہ زیادہ ہونی چاہیئے۔ نہ کہ الی الدنیا (۱۱) وہ شخص بدمعاش نہ ہو۔ (۱۲) حرامی نہ ہو۔ (۱۳) فاسق اور فاجر نہ ہو۔ (۱۴) کسی کا نوکر، خادم، ملازم، کمی نہ ہو۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے کہ اَلْاَوْلٰی بِالْاِمَامَةِ اَعْلَمُهُمْ بِاَحْکَامِ الصَّلٰوةِ وَیَجْتَنِبُ الْفَوَاحِشَ الظَّاهِرَةَ۔ فَاِنْ تَسَاوَوْا فَاَوْرَعُهُمْ۔ یہ تمام شرائط جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ وہ ظاہراً، کنایتاً عالمگیری میں اس جگہ موجود ہے ان میں سے بعض کام اگرچہ عوام کے لیئے جائز ہیں۔ لیکن علماء کے لیئے منع ہیں۔ شریعت میں بعض کھیل جائز ہیں مگر علماء اور داڑھی والے حضرات کو وہ بھی منع ہیں۔ کیونکہ اس سے خصوصیات اور رعب شریعت جاتا رہتا ہے چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب احکام القرآن صفحہ نمبر ۴۲۸ پر جلد اول میں لکھا کہ:- وَاِنَّهٗ یَنْبَغِیْ لِذِی الْعَقْلِ اَنْ تَنْهَاهُ اللِّحْیَةُ وَالشَّیْبُ عَنِ الْبَاطِلِ۔ وَقَدْ قَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ لِاَسْلَمَ فِیْ شَیْئٍ اَمَا تَنْهَاكَ لِحْیَتُكَ هٰذِهٖ قَالَ اَسْلَمُ فَکَفَفْتُ نَامَا نَاهُ (ترجمہ):- اور بے شک لائق ہے۔ علماء و عقلاء کے لیئے یہ کہ منع رکھے اُن کو داڑھی اور بڑھاپا باطل کاموں سے اور حضرت فاروق نے ایک شخص حضرت اسلم سے فرمایا۔ کسی باطل کھیل میں مشغول دیکھ کر کیا تم کو تمہاری داڑھی نے اس کام سے منع نہ کیا۔ اسلم فرماتے ہیں۔ کہ پھر میں اس سے بالکل رُک گیا۔ تمام عمر۔ ثابت ہوا۔ کہ بعض کام اگرچہ عوام الناس کے لیئے بھی جائز ہوں۔ مگر قوم کے پیر و مرشد اور امام کے لیئے ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ جیسے مردے نہلانا اگرچہ جائز بلکہ سنت صحابہ ہے۔ مگر پنجاب کے علاقے میں یہ کام علماء اور امام کے لیئے جائز نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص مردے نہلاتا ہوگا۔ تو اس کو امام مقرر کرنا منع ہے یہ سب کام کیوں ہیں۔ تاکہ قوم کے دل میں امام کا سب سے زیادہ اونچا اور باعزت مقام رہے۔ اور امام کا دل ہر چیز سے ہٹ کر فقط نماز اور مسائل نماز میں لگا رہے۔ اور اللہ کی ذات میں مشغول رہے۔ نامردی کا علاج کرنا اگرچہ بہت بڑی نیکی اور خدمت خلق ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک بیماری ہے اور بیماری کا علاج کار ثواب ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف کتاب الطب فصل ثانی میں ہے۔ کہ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِیْكٍ قَالَ قَالُوْا۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَنَتَدَاوٰی۔ قَالَ نَعَمْ یَا عِبَادَ اللّٰهِ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ یَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ دَوَاءً۔ نامردی بھی ایک سخت ترین بیماری ہے۔ اس کا علاج کرانا بھی واجب ہے۔ اسی طرح عالمگیری جلد اول

صفحہ نمبر ۲۰۵ پر ہے۔ اب اگر مسلمان حکیم یہ علاج نہ کرے۔ تو ہم غیروں کے محتاج ہوئے اور اس علاج کے لیے جو ہمدردی ایک مسلمان ڈاکٹر کو ہو سکتی ہے۔ وہ غیر مسلم کو قطعاً نہیں ہو سکتی۔ بلکہ غیر مسلم تو نسلِ مسلمانی کے ختم ہونے سے خوش ہیں۔ وہ کب چاہیں گے۔ کہ ایک نامرد مسلمان علاج سے مرد بن کر مسلمانوں کی نسل کو بڑھائے۔ نامرد کو مرد بنانا اور نسلِ مسلمانی کو بڑھانا اگرچہ بہت عظیم خدمت ہے کہ خود آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ (روح البیان جلد ۴ صفحہ نمبر ۶۷) بیشک میں تمہاری وجہ سے امتوں پر کثرت سے جانے والا ہوں۔ اس روائیت سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے مسلمان کو صاحب اولاد ہونا واجب ہے۔ پس جو اس بیماری میں مبتلا ہو۔ وہ ضرور کسی مسلمان طبیب سے علاج کرائے۔ لیکن نماز کے امام کے لیے یہ کام جائز نہیں۔ دیکھو گھوڑی کو گدھے سے وطی کرانا جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ درِّ مختار جلد پنجم صفحہ ۲۴۲ پر ہے:۔ وَجَازَ خِصَاءُ الْبَهَائِمِ وَاِنْزَاءُ الْحَمِیْرِ عَلَى الْخَیْلِ کَعَکْسِہٖ (الخ) یعنی جانوروں کو خصّی کرانا اور گھوڑی پر گھوڑے کی بجائے گدھا چڑھانا۔ تاکہ خچر پیدا ہو شرعاً یہ کام بالکل جائز ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن پاک نے خچر کی تعریف کی ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر سواری کی ہے۔ مگر علماءِ کرام اور صلحاء کے لیے جائز نہیں۔ کہ یہ کام کرائیں یا نزدیک کھڑے ہوں۔ کیونکہ یہ کام فحش ہے۔ بہت سے فحاشی کے کام عوام کے لیے جائز ہوتے ہیں۔ لیکن علماء کے لیے منع، جیسے کہ جانوروں کو نیا کرانا، اسی لیے آقائے دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ نے خود اپنے اور اہل بیت کے لیے اس کام سے خصوصی طور پر ممانعت فرمائی۔ چنانچہ ترمذی شریف صفحہ نمبر ۲۰۳ پر ہے۔ اور مشکوٰۃ شریف کتاب الجہاد صفحہ ۳۳۲ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوْکُرَیْبٍ ثَنَا اِسْمٰعِیْلُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ ثَنَا مُوْسٰی بْنُ سَالِمٍ اَبُوْجَهْضَمٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا دُوْنَ النَّاسِ بِشَیْءٍ اِلَّا بِثَلٰثٍ اَمَرَنَا اَنْ نُسْبِغَ الْوُضُوْءَ وَاَنْ لَّا نَاْکُلَ الصَّدَقَةَ وَاَنْ لَّا نُنْزِیَ حِمَارًا عَلٰی فَرَسٍ ط (ترجمہ):۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے فرماتے ہیں۔ کہ آقاء دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کے امین بندے تھے۔ نبی کریم نے عام لوگوں کے سوا ہم کو کسی خاص چیز کا حکم نہ دیا۔ بجز تین چیزوں کے۔ کہ حکم دیا نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ہم اہل بیت کو ایک یہ کہ اچھی طرح اور پورا وضو کریں۔ اور یہ کہ صدقہ نہ کھائیں۔ اور یہ کہ ہم اہل بیت گدھوں کو نہ چڑھائیں گھوڑیوں پر۔ اس کو نسائی نے بھی روایت کیا۔ یہی روایت حضرت علی سے بھی مروی ہے۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا۔ کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں۔ جو عوام کو جائز ہوتے ہیں۔ مگر معززین اسلام کو منع ہیں۔ موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ

معززاور قابلِ تعظیم حضرات علمائے کرام اور مساجد کے امام ہیں۔ کہ انہیں سے دین کی عزت ہے۔ حضرت حکیم الامت نے تو ایک امام مسجد کو اس کی امامت سے صرف اور صرف اس لیئے علیحدہ فرما دیا۔ کہ ترازو سے تولنے والے سودے کی دکان ڈالی تھی۔ موجودہ دور میں، دکان دار خیانت کرنے سے نہیں بچتا۔ اور پھر وہ عوامی آدمی بن جاتا ہے۔ شانِ امامت باقی نہیں رہتی۔ علماءِ امت ہی کے لیئے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ ؕ (جامع الصغیر جلد اول صفحہ نمبر عشر) ترجمہ تہمت کی جگہوں سے بھی بچو۔ یعنی جس کام یا جس جگہ سے عزت اور وقار میں فرق پڑتا ہو۔ اس سے بچو۔ لہٰذا کیسی بری بات ہے۔ کہ لوگ اور مقتدی تو معززین اور معاشرے میں باعزت اور اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اور امام جس کو سرداری کے لیئے منتخب کیا وہ قوم کا نیچ یا کمی یا قوم کا مزدور رہو۔ اس میں پیارے آقا رسول اللہ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مصلے کی توہین ہے۔ نفسیاتی بات ہے۔ کہ انسان جو کام کرتا ہو گا۔ ہر وقت یا اکثر وقت اسی کے خیالات میں منہمک اور مشغول رہے گا۔ تو کیسی بری بات ہے۔ کہ نماز کے مصلیٰ پر کھڑا ہو کر امام نامردوں کو مردمی طاقت کے خیالات میں اور لوگوں کے آلاتِ تناسل کے تصورات میں ہی مشغول ہو لہٰذا اس فتوے شرعی کے بموجب فوراً اس حکیم شخص کو امامت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اللہ کے نزدیک وہ شخص بہت پیارا ہے۔ جو دنیا و آخرت میں وجیہہ ہو۔ وجیہہ وہ شخص ہے۔ جو ہر ظاہری بات سے پاک اور صاف ہو۔ اور جس کی رب تعالیٰ کی بارگاہِ کریمہ میں بات مانی جاتی ہو۔ اسی لیئے حضرتِ مسیح علیہ السلام کی شان میں باری تعالیٰ ربّ العزت نے ایک جگہ فرمایا:۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ؕ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ؕ یعنی اللہ کی بارگاہ میں اُن کی بات مانی جاتی ہے اور ہر برے کام سے بچنے والے۔ اگرچہ سب انبیاء کی شان یہی ہے۔ مگر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور اُن کی اس معجزانہ پیدائش پر طعن کرتے تھے۔ اس لیئے خصوصی طور پر اُن کے لیئے یہ لفظ ارشاد ہوا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آخر زمانہ امتِ مصطفےٰ کے امام و پیشوا بننے والے تھے۔ اور پیشوا کا وجیہہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیئے یہ فرمایا گیا۔ اور قانون بنایا گیا۔ کہ ہر امام کو وجیہہ ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اور ذلیل کاموں سے بچنا ضروری ہے اسی لیئے قوم کے سامنے مسجد کی صفائی کرنا یا وضوگاہ کی نالی صاف کرنا امام مسجد کو جائز نہیں۔ حالانکہ مسجد کی صفائی عین عبادت ہے۔ یہ تمام گفتگو مقرر شدہ امام میں ہے۔ لیکن وقتی طور پر ہر وہ شخص امام نماز ہو سکتا ہے۔ جو داڑھی والا ہو۔ اور چار انگل پوری داڑھی ہو۔ نہ کم ہو اور نہ اس سے زیادہ اور ظاہراً کوئی گناہ نماز میں اس کے ساتھ نہ ہو:۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

سلام بھیجنے کے کتنے طریقے اور علی علیہ السلام کہنا سخت منع ہے۔

سوال نمبر ۶ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید نے دربارِ رسالت میں سلام کا ہدیہ پیش کیا۔ لیکن آخر میں یہ شعر بھی پڑھا۔

"یعنی وہ اعلیٰ حضرت بریلی کے شاہ
اس مجددِ ملت پہ لاکھوں سلام"

تو بکر جو خود کو اہلسنت نقشبندی کہلاتا ہے۔ کہنے لگا کہ کسی اُمتی پر سلام و درود پڑھنا شرعاً منع ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ زید کہتا ہے۔ کہ اکابر دیوبند کی تکفیر کرنا لازم ہے۔ خود بھی خاص دیوبندیوں کو کافر کہتا ہے مگر یہی بکر کہتا ہے۔ کہ دیوبندی بھی آخر کلمہ گو ہیں مسلمان ہیں۔ اُن کو کافر نہیں کہنا چاہیئے۔ زید کہتا ہے۔ کہ دیوبندی کے پیچھے اہل سنت کی نماز جائز نہیں۔ بکر کہتا ہے۔ جائز ہے۔ چند دنوں سے یہاں ان تین چار باتوں میں جھگڑا چل رہا ہے۔ تمام بستی والوں کی متفقہ رائے سے آپ کو استفتا حاضر کیا جا رہا ہے براہِ کرم جلد از جلد اپنی رائے عالیہ سے نوازا جائے۔ تاکہ مسئلہ صاف ہو۔

سائل :- فقیر محمد نقشبندی مجددی پنڈی بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ۔ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

الجواب بعونِ العلّام الوھّاب

سوال مذکورہ میں بکر کا قول قطعاً غلط ہے۔ دراصل بکر وہابی ہے اور اپنے بڑوں کی طرح خود کو چھپا رہا ہے۔ محض اہلِ سنت کو دھوکا دینے کے لیئے اُس کو اعلیٰ حضرت کے سلام پر اعتراض سوجھا مگر اکابر دیوبند کی بے ادب عبارات کیوں نظر آئیں۔ وہابی حضرات نے رب تعالیٰ کو جھوٹ کا الزام لگایا (براہین قاطعہ) بلغۃ الحیران کے ص۵ پر حسین علی دیوبندی نے معتزلہ کی طرف نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کو بے علم کہا اور اس عقیدے کی مضبوطی بیان کر کے تائید کی حالانکہ معتزلہ کا یہ عقیدہ نہیں خود عقیدہ بنا لیا اور تائید کر دی معاذ اللہ۔ وہ یاد نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت خوانی کے یہ دشمن۔ یارسول اللہ کے نعرے سے ان کو تکلیف ختم نبوت جلسوں میں تاجدارِ ختم نبوت زندہ باد کے نعرے سے ان کو درد پڑتا ہے۔ سنیوں کے اس

نعرے کے مقابل انھوں نے تاج و تختِ ختم نبوّت زندہ باد کا نعرہ مقرر کیا۔ گویا کہ تاج و تخت کو زندہ باد کہہ لو مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کو زندہ نہ کہنے دو۔ نہ کہو۔ یہ ہیں ان بدنصیبوں کی حرکتیں سلام پڑھنے سے جلتے ہیں یہ گستاخیاں بکر کو یاد نہیں۔ صرف کلمہ گوئی کو کیا کرے گا۔ جب کلمے والے اللہ اور رسول سے ہی محبت نہیں۔ یہاں تو بکر نے صرف مذکورہ شعر کا انکار کیا ہے۔ اور امتی کو سلام کرنے سے انکار کیا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے وہابی ساتھی تو نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالےٰ علیہ و آلہٖ وسلم پر سلام پڑھنے سے بھی منکر ہیں۔ بکر کا خود کو اہل سنت نقشبندی کہنا مزید اُس کی وہابیت پر دال ہے۔ کیونکہ آج کل وہابی زیادہ تر نقشبندی بن جاتے ہیں۔ اِس بہانے سے وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی نعت خوانی اور جہراً درود شریف سے منع کرتے ہیں۔ اور اِس گستاخی کا اُن کو موقع مل جاتا ہے۔ اِس لئے کہ طریقت کا پہلا راستہ نقشبندیت ہے۔ وہ ذکرِ خفی سے مدارج طے کراتے ہیں اِس راستے کے سالک کو ذکرِ جہری سے منع کرتے ہیں۔ یہ اُن کا اپنا طریقۂ تدریس ہے۔ اور تصوف کے طالب کو وہ اس طرح باطنی طور پر درسِ معرفت سے نوازتے ہیں۔ وہابی لوگ نعتِ حبیب و ذکرِ رسولِ کریم کے دشمن ہیں وہ جب غلامانِ حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مساجد میں جوشِ عشقِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم میں نعت خوانی کرتے دیکھتے۔ تو جل جاتے ہیں منع کرتے ہیں تو دھتکارے جاتے۔ وہابیت کا خطاب پاتے۔ کسی جگہ زیادہ جوش دکھاتے تو اہل سنت کے شہابِ ثاقب سے رجیم ہوتے۔ آخر بے چارے تھکے ہارے فریب کاری کے دھندے میں مشغول ہوئے۔ تو کوئی لبادہ ہاتھ نہ آیا۔ جستجوئے بسیار کے بعد لبادۂ نقشبندیت ہی ہاتھ لگا۔ کہ اسی میں ذکرِ جہری کی ممانعت ہے۔ وہ عرفاءِ کرام تو صرف مبتدیوں کو ذکرِ جہری سے روکتے ہیں۔ مگر ان روسیاؤں کو تو بہانہ کی تلاش تھی ایک بار کی آڑ تھی۔ ہر شخص کو ذکرِ جہری بھی صرف وہ منع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ ورنہ اپنے مولوی کی گلا پھاڑ تقریر جائز اور ٹکے کے مولوی کو زندہ باد کہنا جائز ہے۔ بس نعت خوانی روکنے کے لیے یہ لوگ نقشبندی بنے۔ اور اِس جال کا تانا۔ بانا سب سے پہلے اشرف علی تھانوی صاحب نے تیار کیا۔ اور دیوبند فیکٹری میں بنا جاتا رہا۔ لہٰذا اِس کے نقشبندی ہونے سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اس لئے حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے ہیں۔ کہ قادری، چشتی، سہروردی مشائخ کی چھان بین نہ کرو۔ مگر جب کوئی نقشبندی کا دعوے دار ہو۔ تو فوراً اِس کی نسبت اور سلسلہ دیکھو۔ اشرف علی وغیرہ کے گستاخانہ کلام کی بابت گفتگو چھیڑ دو۔ اور اعلیٰ حضرت بریلوی علیہ الرحمت کا تذکرہ شروع کر دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ فوراً کھوٹا اور کھرا نکھر جائے گا۔ گویا کہ اعلیٰ حضرت کا ذکر مثلِ تیزاب ہے۔ جو فی زمانہ کھوٹے کھرے سونے کو ایک دم ظاہر کر دیتا ہے سوالِ مذکورہ

میں جس شعر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بالکل جائز ہے۔ اس لیئے کہ اسلام میں سلام پانچ طریقے سے ہیں:۔
پہلا یہ کہ کسی کو حاضر کے صیغے سے سلام کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی کو دور سے سلام پہنچایا جائے جیسے کہ میرا فلاں کو سلام کہہ دینا۔ پہلے کی مثال جیسے کہ السلام علیکم۔ (۳) اپنے آپ کو سلام کرنا۔ جیسے کہ السلام علینا (۴) طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی غائب کا نام لے کر اس کو سلام کرنا۔ جیسے فلاں شخص پر سلام ہو۔ مثلاً زید کو سلام ہو، ان چار صورتوں سے ہر شخص کو سلام کرنا جائز ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور اقوالِ فقہاء سے اس کے بے شمار ثبوت ہیں۔ پہلی صورت کا سلام کرنا اس کا حکم حدیث پاک نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے مسلمانوں جب تم ایک دوسرے سے ملو۔ تو آپس میں سلام کرو چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب السلام ص۳۹۷ پر ہے:۔ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ الصَّغِيْرُ عَلَى الْكَبِيْرِ وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيْلُ عَلَى الْكَثِيْرِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ ۵ (ترجمہ):۔ حضرت ابی ہریرہ سے روایت ہے فرمایا انہوں نے کہ فرمایا آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرے۔ اور اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ اور تھوڑے لوگ بہت لوگوں کو سلام کریں (بخاری) ہم دن رات ایک دوسرے کو سلام بوقتِ ملاقات کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں السلام علیکم التحیات میں دن میں کئی مرتبہ کہا جاتا ہے:۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ ۵ جنت میں فرشتے جنتیوں کو سلام کریں گے:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ ۵ (ترجمہ) اے جنتیو تم پر سلام ہو۔ مبارک ہو تمہیں۔ ہمیشہ جنت میں داخل رہو۔ میدان محشر میں بعد حساب کتاب جنتیوں سے کہا جائے گا:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ ۵ تم پر سلام ہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ جب کوئی شخص قبرستان میں جائے۔ تو ان الفاظ سے قبر والوں کو سلام کرے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ ۵ (ترجمہ):۔ اے مومنوں مسلمانوں تم پر سلام ہو۔ خود آقائے دو عالم نبی حضورِ اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو رب کریم نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب تمہارے پاس مومن حاضر ہوں قیامت تک تو اے پیارے حبیب ان کو سلام فرماؤ۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ سورت انعام آیت نمبر ۵۴:۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۵ (ترجمہ):۔ جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ ہماری آیتوں پر تو انہیں فرمایئے:۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ۔ اس آیتِ مطلقہ سے ثابت ہوا۔ کہ قیامت تک

کوئی بھی کہیں سے مومن میرے آقا کی بارگاہِ عالیہ میں ادب واحترام سے حاضر ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ و الہ وسلم اس کو جانتے اور اس پر سلام بھیجتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے ہر مسلمان کو سلام کرنا ثابت ہوا۔ پس لازم آیا۔ کہ ضمیر حاضر سے نبی غیر نبی ہر ایک پر سلام پڑھنا جائز ہے تو جس طرح یَا نَبِیْ سَلَامٌ عَلَیْکَ کہنا درست ہے۔ اسی طرح ابا جی سلام علیکم کہنا بھی جائز ہے۔ سلام کا دوسرا طریقہ بھی عام مروج ہے۔ درست ہے شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ ہم دن رات خطوں میں لکھتے رہتے ہیں۔ کہ ہمارا سلام تمام بزرگوں کو عرض کرنا۔ اور تیسری نوعیت کا سلام ہم ہر نماز میں اَلتَّحِیَّاتُ پڑھتے وقت پڑھتے ہیں۔ چنانچہ التحیات کے الفاظ ہیں۔: اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ (ترجمہ): ہم پر سلام ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا۔: وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ (ترجمہ) مجھ پر سلام ہو۔ جس دن میں پیدا کیا گیا۔ یہاں بھی نبی غیر نبی سب پر اس طریقہ سے سلام کرنا جائز ثابت ہوا چوتھا طریقہ کہ بندوں کا نام ذاتی یا صفاتی لے کر ان کو سلام کیا جائے۔ یہ بھی شرعًا جائز بلکہ قرآن سے ثابت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے سورۃ طٰہٰ آیت نمبر ۴۷ میں ہے۔: وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی (ترجمہ)۔ اور تمام ہدایت کے متبعوں پر سلام ہو۔ لفظ مُتَّبِع ہدایت۔ مسلمانوں کا صفاتی نام ہے۔ جو صرف مومنوں کی خصوصیت ہے۔ یہاں صفاتی نام لے کر بطریقہ غائب سلام بھیجا گیا۔ جس سے ثابت ہوا۔ کہ غیر نبی مسلمانوں کو بحالتِ غیر موجودگی اس کا نام لے کر سلام بھیجنا جائز ہے۔ دوسری آیت پاک میں اس سے بھی زیادہ وضاحت فرمائی گئی۔ چنانچہ سورۃ نمل آیت نمبر ۵۹ میں ہے۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اے پیارے نبی فرما دو حمدیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ اور سلام اُن لوگوں پر ہے۔ جو اُس کے وہ بندے ہیں۔ جن کو اس نے چن لیا۔ جس طرح کہ حدیث قرآن نے مسلمانوں کو عملی اور اعتقادی صفاتی دو نام عطا فرمائے۔ ایک مومن اور دوسرا نام اہل سنت والجماعت اسی طرح لفظ عِبَادُ اللّٰہِ یا عَبْدُہٗ۔ تمام مسلمانوں کے صفاتی نام ہیں۔ تو یہاں آیت میں مسلمانوں کا صفاتی نام لے کر اُن پر سلام بھیجا جا رہا ہے اس سے بھی ثابت ہوا۔ کہ نام لے کر سلام پڑھنا شرعًا بالکل جائز ہے مذکورہ فی السوال شعر میں سلام بھیجنے کا یہی چوتھا طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ جو بحکم قرآنی بالکل جائز ہے۔ پس جس طرح یہ جائز ہے۔ کہ عبداللہ پر سلام ہو۔ یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے۔: زید پر سلام ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے والد پر سلام اور یہ بھی جائز ہے۔ کہ کہا جائے۔ اعلیٰ حضرت پر سلام ہو۔ اور جب ایک سلام جائز ہوا۔ تو

شرعًا لاکھوں سلام بھیجنے بھی جائز ہیں۔ اِن تمام دلائل سے ثابت ہوا۔ کہ مذکورہ شعر بالکل جائز ہے۔ اور پڑھنا کارِ ثواب ہے۔ بکر کا اِس پر اعتراض اس کی نادانی ہے۔ سلام کرنے کا پانچواں طریقہ یہ ہے۔ کہ غائب کی ضمیر سے کسی کو سلام کیا جائے۔ اور اس کا نام پہلے لیا جائے۔ جیسے کہ یہ کہنا۔ کہ زید اِس پر سلام ہو۔ یا یہ کہنا کہ مولانا ان پر سلام ہو۔ یا زبان عربی میں کہنا۔ کہ زید علیہ السلام۔ یا مولوی علیہ السلام جیسا کہ شیعہ روافض حضرت علی اور امامین کریمین امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو علیہ السلام کہتے۔ اور اُن کی ضد میں خارجی لوگ یا بیوقوف سنی مسلمان کہہ دیتے ہیں۔ صدیق علیہ السلام، عمر علیہ السلام، علی علیہ السلام، حسین علیہ السلام۔ یہ سب منع ہیں۔ بلکہ ناجائز وحرام ہیں۔ اس لیئے کہ لفظِ علیہ السلام عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ :۔ صرف معصومین کے لیئے خاص ہیں۔ اگرچہ ترجمے کے لحاظ سے اُن میں عمومیت ہے۔ مگر منقول شرعی سے یہ مخصوص ہو گئے۔ جیسے کہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نبی کریم کے لیئے اور جَلَّ جَلَالُہٗ اللہ کریم کے لیئے مخصوص ہیں :۔ بطورِ منقول شرعی اور معصوم متفقہ طور پر صرف انبیاء کرام اور ملائکہ عظام ہیں۔ اِس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں بجز روافض کے کہ وہ اہل بیت اور پنجتن اور بارہ ائمہ کو بھی معصوم مانتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ کیونکہ خود ان کی معتبر کتب میں بھی اِس کا ثبوت نہیں ملتا۔ قانونِ شریعت میں مستقل طور پر کسی انسان کو علیہ السلام کہنا منع ہے۔ بجز انبیاء کرام۔ ہاں بالتبع جائز ہے۔ چنانچہ شرح شفاء جلد سوم صفحہ نمبر ۵۰۹ پر ہے :۔ کہ یَجِبُ تَخْصِيْصُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَائِرَ الْاَنْبِيَاءِ بِالصَّلٰوةِ وَالتَّسْلِيْمِ وَلَا يُشَارِكُ فِيْهِ سِوَاهُمْ ؕ (ترجمہ)۔ واجب ہے :۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کو صلوٰۃ وسلام سے خاص کرنا اور نہ شریک کیا جائے اس علیہ السلام میں بجز انبیاء کسی کو۔ امام نووی شرح مسلم جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۶ اور ۲۴۶ پر فرماتے ہیں۔ کہ قَالَ الشَّيْخُ اَبُوْ مُحَمَّدٍ الْجُوَيْنِيُّ۔ وَالسَّلَامُ فِيْ مَعْنَى الصَّلٰوةِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَرَنَ بَيْنَهُمَا فَلَا يُفْرَدُ بِهٖ غَائِبٌ۔ غَيْرُ الْاَنْبِيَاءِ۔ فَلَا يُقَالُ ذَالِكَ اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعَلِيٌّ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَاِنَّمَا يُقَالُ ذَالِكَ خِطَابًا لِلْاَحْيَاءِ وَالْاَمْوَاتِ فَيُقَالُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ؕ شیخ ابو جوینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا۔ کہ سلام مثل درود شریف کے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ درود میں۔ سلام کو درود سے ملایا ہے۔ پس بجز انبیاءِ کرام کسی غائب پر غائب ضمیر سے سلام نہیں پڑھ سکتے۔ تو نہ کہا جائے۔ ابوبکر اور عمر وعلی علیہم السلام ہاں۔ حاضر کی ضمیر سے زندہ مردہ کو سلام کرنا جائز ہے۔ اس لیئے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ شامی جلد پنجم ص ۵۲۳ پر ہے :۔ وَاَمَّا السَّلَامُ فَنَقَلَ اللَّقَانِيُّ

فِیْ شَرْحِ جَوْھَرَۃِ التَّوْحِیْدِ۔ عَنِ الْاِمَامِ اَنَّہٗ فِیْ مَعْنَی الصَّلٰوۃِ فَلَا یُسْتَعْمَلُ فِی الْغَائِبِ وَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ فَلَا یُقَالُ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَامُ۔ وَسَوَاءٌ فِیْ ھٰذَا الْاَحْیَاءُ وَالْاَمْوَاتُ اِلَّا فِی الْحَاضِرِ۔ (ترجمہ):۔ امام لقانی اپنی شرح جوہر توحید میں نقل کرتے ہیں۔ امام جوینی سے کہ سلام مثل صلوٰۃ کے ہے۔ لہٰذا غیر نبی کے لیئے غائب کی ضمیر سے سلام کو استعمال نہ کرو۔ خواہ غائب زندہ ہو۔ یا فوت شدہ۔ ہاں۔ حاضر کی ضمیر سے سلام کرنا زندہ مردہ غیر نبی کو بھی جائز ہے۔ اسی طرح حضرت حکیم الامت مدظلہ العالی نے اپنی شان حبیب الرحمٰن کتاب میں حوالہ عالمگیری کتاب الکراہیۃ صفحہ نمبر ص۱۹۱ پر ارشاد فرمایا۔ مستقلاً کسی غیر نبی پر درود شریف یا صرف سلام بھیجنا بصیغہ غائب منع ہے۔ نہ امام حسین علیہ السلام کہنا جائز ہے۔ نہ۔ امام حسین صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہٖ وسلم کہنا جائز۔ اسی طرح علامہ اسمٰعیل حقی صاحب روح البیان اپنی تفسیر جلد ہفتم ص۲۲۸ پر فرماتے ہیں:۔ وَاَمَّا السَّلَامُ فَھُوَ فِیْ مَعْنَی الصَّلٰوۃِ فَلَا تُسْتَعْمَلُ لِلْغَائِبِ فَلَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ فَلَا یُقَالُ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَامُ کَمَا تَقُوْلُ الرَّوَافِضُ وَتَکْتُبُہٗ وَسَوَاءٌ فِیْ ھٰذَا الْاَحْیَاءُ وَالْاَمْوَاتُ۔ (ترجمہ) اور لیکن سلام پس وہ صلوٰت کے ہم معنٰی ہے۔ پس نہ استعمال کیا جائے غائب کے لیئے نہ اکیلے غیر نبی کے لیئے بضمیر غائب بولا جائے۔ پس نہ کہا جائے۔ علی علیہ السلام جس طرح رافضی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں اور اس حکم میں زندہ مردہ برابر ہے۔ اشعۃ اللمعات جلد اوّل صفحہ نمبر ص۴۲۴ پر ہے:۔ مختار نزد جمہور آنست کہ صلوٰۃ وسلام مخصوص است بانبیاء کرام ومشارکت نیست باایشاں جزایشاں دراں۔ بلکہ ذکر کردہ شود بمغفرت ورحمت ورضوان ونقل کردہ است۔ طیبی کہ آں خلاف اولی است وبعض گفتہ اند حرام است۔ یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہ (ترجمہ):۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ ہی حق ہے۔ کہ صلوٰۃ وسلام انبیاء سے خاص ہے۔ کسی اور کے لیئے جائز نہیں۔ بلکہ اُن کے لیئے صرف غُفِرَ لَہٗ اور رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ اور رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کا لفظ ہی منقول ہے۔ علامہ طیبی نے فرمایا۔ کہ غیر نبی کو علیہ السلام کہنا خلاف اولی ہے۔ اور بعض محققین نے فرمایا۔ کہ حرام ہے۔ بعض نے مکروہ تحریمی اور بعض نے تنزیہی کا حکم لگایا۔ مرقات شرح مشکوٰۃ جلد دوم صفحہ نمبر ص۵ پر ہے:۔ اَلصَّحِیْحُ اَنَّ الصَّلٰوۃَ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ اِبْتِدَاءً مَکْرُوْھَۃٌ کَرَاھَۃَ تَنْزِیْھِیَۃٍ (ترجمہ):۔ صحیح یہ ہے کہ بے شک درود شریف غیر انبیاء پر ابتداءً مکروہ تنزیہی ہے۔ اور چونکہ سلام بھی مثل درود ہے۔ جیسا کہ پہلے ثابت کر دیا گیا۔ اور خود مرقات نے بھی آگے یہی لکھا ہے۔ لہٰذا دونوں مکروہ۔ اِن دلائل

اور حوالوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ انبیاء کرام کے سوا کسی اور انسانوں کو علیہ السلام وغیرہ کہنا سخت حرام ہے یا مکروہ ہے۔ لیکن فرشتے اگرچہ نبی نہیں۔ مگر اُن کو علیہ السلام کہنا جائز ہے۔ جن بزرگوں نے یہ فرمایا۔ کہ مَا یُفْرَدُ بِہٖ غَیْرُ الْاَنْبِیَاءِ ط یا فرمایا۔ مخصوص است با نبیاء۔ یعنی علیہ السلام کہنا انبیاء کرام سے مخصوص ہے۔ یہ خصوصیت حصر اضافی ہے۔ اِس لیئے کہ یہاں صرف دیگر انسانوں کو نکالنا مقصود ہے لہٰذا ملائکہ اس سے خارج نہ ہوں گے ورنہ اُن پہلی عبارات سے تقابل و تعارض لازم آئے گا۔ جن میں انبیاء کرام کے ساتھ فرشتوں کا ذکر بھی ہے۔ جیساکہ ملّا علی قاری مرقات دوم صفحہ نمبر ۵ پر فرماتے ہیں۔ اَلسَّلَامُ کَالصَّلٰوۃِ یَعْنِیْ لَا یَجُوْزُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمَلٰئِکَۃِ اِلَّا تَبْعًا (ترجمہ):۔ سلام مثل صلوٰۃ کے ہے۔ یعنی غیر انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ پر سلام جائز نہیں۔ مگر ساتھ ملاکر۔ اور بہارِ شریعت حصّہ شانزدہم صفحہ نمبر ۹۲ پر ہے۔ مسئلہ کسی کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنا یہ انبیاء و ملائکہ کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام و جبرائیل علیہ السلام۔ کسی دوسرے کے نام کے ساتھ نہ کہا جائے۔ (الخ) اِن تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ جبرائیل علیہ السلام کہنا تو جائز ہوا۔ لیکن علی علیہ السلام۔ صدیق اکبر علیہ السلام کہنا منع ہے۔ ہمارے بعض بزرگوں نے اس بات سے یہ دلیل بھی لی ہے۔ کہ اس بنا پر حضرت جبرائیل کا درجہ حضرت صدیق اکبر سے زیادہ ہے۔ مگر یہ دلیل کمزور ہے۔ کیونکہ پھر تو تمام ملائکہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت جبرائیل کی تخصیص نہ رہے گی۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ نہ ہی وہ صاحب خود۔ اِن عباراتِ مندرجہ سے بطریقِ احسن ثابت ہوگیا کہ علیحدہ اور مستقل طور پر کسی کو علیہ السلام کہنا ناجائز ہے۔ ہاں انبیاء کرام کے ساتھ ملاکر غیر نبی کو بھی درود شریف یا سلام میں شامل کرسکتے ہیں چنانچہ قاضی ثناء اللہ عثمانی مظہری۔ سورۃ احزاب کی تفسیر میں صفحہ نمبر ۳۱۴ پر لکھتے ہیں:۔ ھَلْ یَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ وَالصَّحِیْحُ اَنَّہٗ یَجُوْزُ تَبْعًا وَیُکْرَہُ اِسْتِقْلَالًا لِاِخْتِصَاصِہٖ بِالْاَنْبِیَاءِ عُرْفًا ط (ترجمہ):۔ کیا جائز ہے نبی پر درود یا سلام بھیجنا؟ اور صحیح یہ ہے۔ کہ بے شک ساتھ ملاکر جائز ہے۔ علیحدہ مکروہ ہے۔ بوجہ صلوٰۃ و سلام کے خاص ہونے کے انبیاء کرام سے منقول عرفی میں۔ اسی طرح نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر ۳۳۰ پر ہے:۔ لَا یَجُوْزُ التَّصْلِیَۃُ وَالتَّسْلِیْمُ عَلٰی غَیْرِ الْاَنْبِیَاءِ اِسْتِقْلَالًا عِنْدَ الْمُحَقِّقِیْنَ مِنْ اَھْلِ السُّنَّۃِ خِلَافًا لِلرَّوَافِضِ (ترجمہ):۔ انبیاء کرام کے علاوہ کسی بھی مسلمان پر علیحدہ مستقل طور پر درود شریف

یا سلام بھیجنا منع ہے۔ محقق علماء اہل سنت کے نزدیک بخلاف شیعوں کے۔ قبلۂ عالم حضرت حکیم الامت کے فرمودہ میں لفظِ مستقل اور ملّا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لفظ تبعًا میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل کرنا جائز ہے۔ دیکھو نماز میں اور ہر درود شریف میں وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ پڑھا جاتا ہے۔ یہ جائز ہے۔ کیونکہ تبعًا ہے۔ حالانکہ اہل بیت اور صحابہ کرام سب غیر نبی ہیں۔ اِن تمام دلائل سے بخوبی واضح ہو گیا۔ کہ درود شریف میں بھی تبعًا ہر امتی کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ تو سلام میں بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام میں اعلیٰ حضرت پر بھی تبعًا سلام جائز ہوا۔ اگرچہ آپ غلام اور امتی ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا۔ کہ لفظ علیہ السلام کسی صحابی یا اہل بیت کے لیے استعمال کرنا قطعًا جائز نہیں۔ اس کی بیماری عام طور پر شیعوں کو ہے۔ اور جاہل سنی مقررین میں بھی پائی جاتی ہے۔ عقلًا بھی یہ چیز منع ہونی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن حدیث کے علاوہ عام رواج میں بھی بعض الفاظ ایسے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ جن کا ترجمہ اگرچہ عام ہو مگر ہر ایک کے لیے مستعمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلی شریف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ المعتمد والمستند صفحہ نمبر ۱۴۹ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔ اَلْعُرْفُ یَخُصُّ بَعْضَ الْکَلِمَاتِ بِبَعْضِ الْحَالَاتِ وَالتَّجَاوُزُ عَنْہُ یُعَدُّ سُوْءَ الْاَدَبِ فَلَا یُقَالُ اَبُوْ بَکْرٍ غُفِرَ لَہٗ اَوْ عَلِیُّ الْمُرْتَضٰی عَفَا اللّٰہُ عَنْہُ بَلْ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کَمَا لَا یُقَالُ مُوْسٰی وَعِیْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ بَلْ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَسَلَّمَ عَلَیْہِمَا کَمَا لَا یُقَالُ نَبِیُّنَا عَزَّ وَجَلَّ وَاِنْ کَانَ قَطْعًا عَزِیْزًا (الخ) ترجمہ:۔ عرفِ عام۔ بعض الفاظ کو بعض حالات میں اس طرح خاص کر دیتا ہے کہ اس کو چھوڑنا اور یا اِس عرف و رواج سے ہٹنا بے ادبی شمار ہوتا ہے۔ پس نہیں کہا جا سکتا۔ ابوبکر غُفِرَ لَہٗ یا علی مرتضٰی عَفَا اللّٰہُ عَنْہُ بلکہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔ کہنا چاہیئے۔ جیسے کہ حضرتِ موسیٰ و عیسیٰ کو رَضِیَ اللّٰہُ عنہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ ہی کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہنا گناہ ہے۔ کہ ہمارے نبی عزّ و جلّ اگرچہ تمام انبیاء کرام عزت و جلال والے ہیں۔ اس دلیل عقلی سے بھی ثابت ہوا۔ کہ کسی غیر نبی شخص کو عَلَیْہِ السَّلَامُ کہنا منع ہے اب اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ ممانعت حرام ہے۔ یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی میرے نزدیک مکروہ تحریمی ہے اور کہنے والا گناہگار ہو گا۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

(۲) وہ دیوبندی جو ظاہر ظہور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرتے ہیں:۔ جیسے اشرف علی تھانوی اور خلیل احمد انبیٹھوی اور حسین علی واں بھچراں اور جو سب کچھ سمجھتے ہوئے پھر ان

اچھا سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے پیچھے نماز قطعاً منع ہے۔ ان کی تکفیر واجب ہے۔ کہ دَورِ صحابہ سے لے کر آج تک کسی زمانے میں بھی صرف کلمہ گوئی کافی نہیں سمجھی گئی۔ بارگاہِ ربّ العزت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب واحترام کو ہر موقعہ پر زیادہ اہمیت دی گئی۔ دیکھو منافق لوگ کلمہ پڑھتے تھے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ اور غیب کے منکر تھے۔ تو رب نے قرآن کریم میں فرمایا۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ:۔ آج بھی مرزائی قادیانی، چکڑالوی وَغَيْرُهُمْ فِرَقِ باطل۔ سب ہی کلمہ گوئی کر رہے ہیں۔ مگر متفقہ کافر ہیں:۔
وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ ؕ

کتبــــــــــــــــــــــــــــہ

غلام یٰسین نام رکھنے کا حکم اور مسلمانوں کو کون سے نام رکھنے جائز ہیں اور کون سے منع؟

سوال نمبر ۷:۔ کیا فرماتے ہیں۔ علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقے کاموں کی۔ ضلع گوجرانوالہ پاکستان کی جامع مسجد میں ایک خطیب مقررہ نے بروز سابقہ جمعہ دورانِ تقریر یہ مسئلہ بیان فرمایا۔ کہ غلام یٰسین نام رکھنا منع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ لفظِ یٰسین خدا تعالیٰ کے اسماء میں سے بھی ہے۔ اور غلام کا عربی ترجمہ بیٹا بھی ہے۔ اس طرح غلام یٰسین کا ترجمہ ہو گا۔ خدا کا بیٹا:۔ اور یہ کفر ہے۔ اس لیئے یہ نام رکھنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں کفر کا شبہ ہے۔ یہ مسئلہ اس سے پہلے کسی نے بیان نہ کیا۔ خود میرا نام بھی غلام یٰسین ہے۔ ہم کو آپ کے حکم کا انتظار ہے۔ براہِ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوٰے عطا فرمایا جائے۔ کہ کیا خطیب صاحب کی بات درست ہے یا نہیں اگر واقعتہً یہ نام رکھنا غلط ہو۔ تو نام تبدیل کر لیا جائے:۔ بَيِّنُوْا وَتُؤْجَرُوْا ؕ

سائل:۔ شیخ غلام یٰسین معرفت چشتی اینڈ کمپنی کاموں کی ضلع گوجرانوالہ مورخہ: ۶۸۔ ۸۔ ۱۸

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

عزیزِ گرامی ابھی ابھی آپ کا خط وصول ہوا۔ اگرچہ جوابات استفتاء دار الافتاء مدرسہ غوثیہ نعیمیہ

سے علی الترتیب جاری کیئے جاتے ہیں۔ اور دو دن میں ایک فتوٰے مکمّل کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کا نمبر دو ماہ بعد تھا۔ مگر قبلہ محترم عبداللطیف صاحب مالک چشتی اینڈ کمپنی کی معرفت کا وجوبًا احترام کرتے ہوئے ترتیب قانونی کو بوجہ الفت و محبت توڑ کر فوری طور پر آپ کو جواب دیا جا رہا ہے کیونکہ قانون کو محبوبوں کی خاطر توڑ دینا بھی سنتِ الٰہیہ ہے۔ اللہ کریم اپنے انبیاء کی خوشنودی کے لیے موت و حیات جیسے اٹل قانونِ قدرت بھی توڑ دیتا ہے۔ حالانکہ لَا يَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ کی آیتِ کریمہ قانون کی اہمیت کو بخوبی اُجاگر فرما رہی ہے۔ بہر حال معرفت و نسبت، دنیا و آخرت میں بڑی عظیم نعمت ہے خدا جس کو نصیب کرے۔ اگر یہ معرفت نہ ہوتی۔ تو آپ کو یقینًا دو ماہ تک کلفتِ انتظار، برداشت کرنا پڑتی۔ آپ کا استفتاء وصول ہوتے ہی جو تحقیق میرے ذہن میں تھی۔ وہ فتوے میں درج کی جا رہی ہے۔ امید ہے۔ زیادہ تحقیق کی ضرورت محسوس نہ فرمائیں گے۔ اگر زیادہ وضاحت اور تحقیق درکار ہوئی تو کچھ وقت خرچ کر کے کتب بینی کی جائیگی۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ استفتاء آنے کی صورت میں۔ مکمّل فتوٰی جاری کیا جائے گا۔

جواب ملاحظہ فرمایئے:

قانونِ شریعت کے مطابق۔ اللہ اور رسول کے اسماءِ طیبہ سے اپنے نام رکھنا بلحاظ جائز و ناجائز ہونے کی چند صورتوں پر مشتمل ہے۔

پہلی صورت: یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام بغیر اضافت رکھنے قطعًا ناجائز اور گناہ ہے لہٰذا کسی کو جائز نہیں کہ اپنا نام اللہ رکھے یا اللہ تعالیٰ۔ یا کسی اپنے بیٹے کا نام الٰہ یا معبود رکھ دے۔ ہاں اضافت کے ساتھ یہ نام رکھنا بالکل جائز ہیں۔ مثلاً عبد اللہ یا عبد المعبود نام رکھنا بالکل جائز ہیں۔

دوسری صورت: یہ ہے۔ کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے مادۂ اشتقاق یا مصدر کی طرف اضافت یا بلا اضافت سے نام رکھنا بھی بالکل ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے۔ مثلاً کسی شخص کا نام عبد التوحید یا عبد الکرم یا عبد الرزق رکھنا بھی حرام ہے۔ **تیسری صورت:** باری تعالیٰ رب العزت کی صفاتِ خصوصیہ میں سے بغیر اضافت نام رکھنا بھی قطعًا منع ہے۔ مثلاً کسی کا نام رب تعالیٰ یا ربُّ العالمین۔ خالق، باری تعالیٰ وغیرہ رکھنا حرام ہے۔ ہاں اضافتِ عبدیت سے جائز ہے۔ مثلاً عبد الرب عبد الرحمٰن یا عبد الخالق یا شاکر باری اسی طرح رازق بغیر اضافت جائز ہے۔ مگر رزاق کسی بندے کا نام بغیر اضافت رکھنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ لفظِ رزاق اللہ کریم کی خصوصی صفت ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۲۵۱ پر ہے:۔ فَعُلِمَ اَنَّ الْعَبْدَ يُقَالُ لَهُ الرَّازِقُ بِهٰذَا وَلَا يُقَالُ رَزَّاقٌ

لِاَنَّہٗ مِنْ اَسْمَآءٍ مُخْتَصَّۃٍ بِہٖ تَعَالٰی (ترجمہ) :۔ بندے کو رازق کہنا جائز ہے۔ لیکن رزاق کہنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ لفظِ رزاق اللہ تعالٰے کی خصوصی صفات میں سے ہے۔ **چوتھی صورت** :۔ یہ کہ اللہ تعالٰی کی صفاتِ غیر خصوصی کو بلا اضافت یا اضافت سے نام رکھنا۔ یہ بالکل جائز ہے۔ مثلاً عبدالکریم نام رکھنا بھی جائز اور کریم نام رکھنا بھی شرعًا بالکل جائز۔ **پانچویں صورت** :۔ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالٰے کی طرف اضافت میں عبدیت اور شاکریت کی نسبت چھوڑ کر۔ ایسے لفظ کی اضافت کی جائے۔ جو یا تو بذاتِ خود گستاخی ہو یا اس میں گستاخی کا شائبہ ہو۔ مثلاً کسی کا نام ابن اللہ یا ابن الرب یا صاحبۃ اللہ یا بنتُ اللہ رکھنا، حرام قطعی ہے۔ کہ اس میں صراحتًا گستاخی ہے۔ اور اللہ و رسول کی گستاخی کفرِ حقیقی ہے۔ اسی طرح کسی کا نام غلام اللہ یا امراۃ اللہ یا نساء اللہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے۔ کہ یہ الفاظ مشترکُ المعانی ہیں۔ اُن میں گستاخی کا احتمال نکلتا ہے۔ اس لیے کہ غلام کا ایک معنٰی ہے۔ بیٹا اور لفظِ نساءٌ اور امرأۃٌ بیوی کو بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ص۲۲۷ پر ہے۔ غلام، لڑکا مجازاً، نوکر، بندہ یعنی حقیقی ترجمہ ہے، لڑکا، مجازاً نوکر۔ عبد کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں۔ مجمع البحار جلد سوم صفحہ نمبر ص۳۶ پر ہے :۔ اَلْغُلَامُ یُقَالُ لِلصَّبِیِّ مِنْ حِیْنِ الْوِلَادَۃِ اِلَی الْبُلُوْغِ ؕ (ترجمہ)۔ لفظِ غلام ہر بچے کو بلوغ تک کہا جاتا ہے۔ فقہاءِ کرام بابُ النسب میں فرماتے ہیں :۔ اِمْرَأَۃُ الرَّجُلِ تَلِدُ غُلَامَہٗ اِنْ لَمْ یُنْکِرْ (ترجمہ) اگر خاوند منکر نہ ہو۔ تو بیوی اپنے خاوند ہی کا بیٹا جنتی ہے۔ یعنی نسب ثابت ہو جاتا ہے قرآنِ کریم میں ارشاد ہے لِاَھَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ؕ ہر مسلک کا مُترجِم اس کا ترجمہ یہی کرتا ہے کہ جبرائیل نے کہا۔ میں بخشوں گا۔ اے مریم تجھ کو پاک بیٹا۔ ثابت ہوا۔ کہ غلام کا معنٰے بیٹا بھی ہے :۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ ؕ (ترجمہ) :۔ اے نبی کی بیویو۔ فقہاءِ کرام کتابُ الطلاق بابُ المحرمات میں بہت جگہ ارشاد فرماتے ہیں :۔ اِمْرَأَۃُ الصَّغِیْرِ ؕ (ترجمہ) :۔ یعنی نابالغ کی بیوی لٰہذا اِن مشترک الفاظ کی نسبتِ اضافت اسمِ باری تعالٰے کی طرف سخت ترین گناہ ہے یہ پانچ صورتیں وہ تھیں۔ جو اسماءِ ربُّ العزت سے متعلق تھیں اُن میں بعض جائز اور بعض ناجائز مسلمانوں کو چاہیے۔ کہ نام رکھتے وقت اِن احتیاطوں کو مدِ نظر رکھیں :۔ **چھٹی صورت** :۔ یہ ہے۔ کہ بغیر اضافت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسمِ پاک ذاتی سے۔ اپنا یا۔ اپنے بیٹے کا نام رکھا جائے۔ بالکل جائز ہے۔ بلکہ باعثِ برکت ہے۔ گویا کہ اللہ تعالٰی کا ذاتی نام بلا اضافت رکھنا منع ہے۔ مگر نبی پاک کا ذاتی نام اپنے بیٹے رکھنا جائز ہے۔ مثلاً لفظِ احمد یا لفظِ محمد ہر مسلمان اپنا نام رکھ سکتا ہے۔ اضافت ہو یا نہ ہو۔ یہاں بھی اضافت میں یہ شرط ہے۔ کہ گستاخی ظاہری۔

یا معنوی نہ ہو۔ اسی لیئے محمد آلِ حسن نام رکھنا منع ہے۔ کہ لفظِ آل میں صغریت ہے۔ اس کی نسبت لفظِ محمد کی طرف کرنا گناہِ عظیم ہے۔ فقط آلِ حسن نام رکھنا جائز ہے۔ لہٰذا غلام محمد، احمد بخش، عبد المصطفٰے نام رکھنے بالکل جائز ہیں۔ کیونکہ لفظِ عبد بمعنٰے مطیع ہے۔ **ساتویں صورت** :۔ یہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی صفت سے بغیر اضافت نام رکھا جائے۔ مثلاً نبی رسول نام رکھنا یا ذاتی اسم مبارک اور صفتِ خصوصی کو ملا کر نام رکھا جائے۔ مثلاً محمد نبی یا نبی احمد یہ سب گناہ ہے کیونکہ لفظِ نبی وغیرہ نبی کریم کی خصوصی صفات ہیں۔ اسی طرح نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء کی خصوصی صفت کو اللہ کریم کے ذاتی یا خصوصی نام سے ملا کر نام رکھنا بھی نا جائز ہے۔ مثلاً کسی کا نام نبی اللہ رکھنا۔ یا رسول الرحمٰن رکھنا قطعاً گناہِ کبیرہ ہے :۔ **آٹھویں صورت** :۔ یہ ہے۔ کہ آقائے دو عالم حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی صفاتِ غیر خصوصیہ سے بلا اضافت نام رکھنا بالکل درست ہے۔ مثلاً کسی کا نام رحیم و رؤف، رحمت، نور وغیرہ رکھنا بالکل جائز ہے۔ اسی طرح ذاتی نام کے ساتھ غیر خصوصی صفت لگا کر نام رکھنا بھی ٹھیک ہے۔ جیسے کہ رؤف احمد، محمد کریم۔ ایسے ہی غیر خصوصی صفت کو باری تعالیٰ کے ذاتی نام سے ملا کر رکھنا بھی جائز ہے۔ مثلاً **حبیب اللہ**، کریم اللہ، شفیق الرحمٰن۔ یہ نام شرعاً جائز ہیں۔ یہ تھیں آٹھ صورتیں جن سے معلوم ہو گیا۔ کہ مسلمان کو اللہ اور رسول کے ناموں سے کون سا نام منتخب کرنا جائز ہے۔ کونسا اپنے لیئے وضع کرنا حرام اور نا جائز ہے۔ ان تمام شقوں کو سمجھنے کے بعد مسئلہ مذکورہ کا جواب ملاحظہ ہو۔ قانونِ شرعی کے مطابق غلام یٰسین نام رکھنا بالکل جائز ہے۔ اس لئے کہ صحیح تو یہ ہے کہ لفظِ یٰسین آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسم خصوصی ہے۔ چنانچہ تفسیر معانی التنزیل خازن جلد پنجم صفحہ نمبر ص۱۹۴ پر سورۃ یٰسین کو شروع ہی اس طرح کیا گیا ہے (سُوْرَۃُ یٰسٓ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ۔ مَکِّیَّۃٌ) ترجمہ :۔ یٰسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت مکی ہے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ یہ آقائے کائنات محمد مصطفٰے علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام خصوصی ہے۔ تفسیر مدارک علی اربع تفاسیر جلد پنجم صفحہ نمبر ص۱۹۵ پر ہے :۔

(یٰسٓ) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا مَعْنَاہُ یَا اِنْسَانُ فِیْ لُغَۃِ طَیٍّ وَعَنْ اِبْنِ الْحَنَفِیَّۃِ یَا مُحَمَّدُ لِحَدِیْثِ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی سَمَّانِیْ فِی الْقُرْاٰنِ بِسَبْعَۃِ اَسْمَآءٍ۔

نمبر ۱ مُحَمَّدٌ : ۲ اَحْمَدُ : ۳ طٰہٰ : ۴ یٰسٓ : ۵ اَلْمُزَّمِّلُ : ۶ وَالْمُدَّثِّرُ ۷ عَبْدُ اللّٰہِ ؕ (ترجمہ) :۔ حضرت ابن عباس اور عکرمہ اور ضحاک اور حسن اور سفیان بن عیینہ سب اجلہ فرماتے ہیں۔ کہ یٰسین کے معنی ہیں۔ یا انسان سعید بن جبیر نے فرمایا۔ کہ اسی طرح

مشہور لغت حبشہ میں ہے۔ اور لفظ انسان سے قرآن کریم میں نبی کریم ہی خطاب مراد ہوتے ہیں۔ جیسے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ میں لفظِ انسان سے کثیر مفسرین کے نزدیک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم ہی مراد ہیں۔

ان عبارات صحابہ سے بھی ثابت ہوا۔ کہ یٰسٓ۔ پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصی صفت ہے۔

علماء متقدمین میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اپنے ترجمۂ قرآن میں فرماتے ہیں۔ یٰسٓ ترجمہ۔ اے سید۔ بوستان صفحہ نمبر ۳ پر فرماتے ہیں شعر

تراعز لولاک تمکین بس است ثنائے تو طٰہٰ و یٰسٓ بس است

علماء متاخرین میں سے حضرت مولانا اسرار احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:۔ شعر

ہو کس زباں سے شکر ادا تیرا اے خدا اپنے حبیب پاک کو قرآں میں جا بجا

یٰسٓ کہیں پکارا تو طٰہٰ کہیں کہا حٰمٓ، ن اور کہیں وَالشَّمْسِ وَالضُّحٰی

میں کیا ہوں جو ثناء و صفت آپ کی کروں

تم سب پڑھو درود میں نعتِ نبی کروں

ان فرمودات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ لفظِ یٰسٓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک ہے:۔ دَلَائِلُ الْخَیْرَاتِ،، شریف میں صوفی اکمل وَلِیِّ کامل علامہ محمد جزولی صفحہ نمبر ۱۱۱ پر آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسماءِ حسنہ میں فرماتے ہیں:۔ طٰہٰ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ۵ یٰسٓ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ۵ حتماً واضح ہوا۔ کہ یہ لفظ مبارک رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسم مبارک ہے۔ بعض نے کہا۔ کہ یہ لفظ متشابہات سے ہے۔ مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ لفظِ یٰسٓ بقولِ اجلّہ صحابہ و تابعین مرکب ندائی ہے۔ جس کو لفظ متصلہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابن کثیر کی عبارت سے ثابت کیا گیا۔ اس کا پہلا حرف یا ہے۔ دوسرا سین ہے۔ قبیلہ بنی طے کی عربی لغت میں سین کے معنیٰ ہیں۔ انسان۔ متشابہات وہ حروف ہوتے ہیں۔ جو کسی زبان میں کسی بھی معنیٰ میں مستعمل نہ ہوتے ہوں۔ اور پھر اگر یہ لفظ متشابہات سے ہوتا۔ تو صحابہ کرام کو اس کا معنیٰ و مطلب نکالنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ متشابہات کے پیچھے پڑنا جہلا کا کام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۵ (ترجمہ) متشابہات کا ذاتی علم بجز پروردگار عالم کے کسی کو نہیں بڑے بڑے علم والے یہی کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لے آئے۔ اس کے اس منشاء و مقاصد پر۔ مسلک احناف میں وَالرّٰسِخُوْنَ علیحدہ جملہ ہے۔ مگر روافض شیعہ کے نزدیک

اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ کا عطف ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اگر دونوں کا عطف تسلیم کیا جائے تو یَقُوْلُوْنَ سے دونوں کا تعلق فاعلی لازم آئے گا۔ جو صریحاً کفر کی طرف راجع ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ ذاتی طور پر متشابہات کا علم کسی کو نہیں۔ جیسا کہ روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر ص۳۶۵ پر ہے۔ وَذَهَبَ قَوْمٌ اِلٰى اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمْ يَجْعَلْ لِاَحَدٍ سَبِيْلًا اِلٰى اِدْرَاكِ مَعَانِي الْحُرُوْفِ الْمُقَطَّعَةِ مِنْ اَوَائِلِ السُّوَرِ :۔ (ترجمہ) وہی جو اوپر گزرا :۔

اور علم عطائی صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ اگر لفظ یٰسٓ بھی متشابہ ہوتا۔ تو کسی کو ہمت نہ تھی۔ کہ اس کا مطلب بیان کرتا۔ شوافع بھی اسی عطف کے قائل ہیں بہر حال یہ غلط ہے۔ صاف ظاہر ہوا۔ کہ لفظ یٰسٓ نبی کریم رؤف رحیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ لفظ یٰسٓ قرآن کریم کا نام ہے۔ اور بعض کا قول ہے۔ کہ یہ لفظ اللہ تعالےٰ کا نام ہے۔ اسی کو ہمارے خطیب صاحب مذکور نے اپنا مسلک بنایا۔ مگر یہ دونوں قول بھی غلط ہیں۔ اور یہ بات شعورِ ایمانی کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ اگلی عبارت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہی خطاب ہے۔ اور خطاب سے پہلے ندا فصاحت کے عین مطابق ہے۔ باعتبار لغت یٰسٓ۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام مبارک ہے۔ جیسا کہ لغاتِ کشوری میں صفحہ نمبر ص۵۷۹ پر ہے :۔ اب رہا یہ سوال۔ کہ لفظِ یاسین کا ترجمہ کیا ہے۔ تو لغتِ قبیلہ طے میں اس کا ترجمہ ہے :۔ یا انسان۔ جیسے کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا بیان ہوا۔ مگر اہلِ تحقیق کے نزدیک یہاں اس کا ترجمہ ہے۔ اے کائنات کے سردار۔ چنانچہ تفسیر حسینی پارہ ۲۲ میں یہی لکھا ہے۔ کہ یٰسٓ کے معنیٰ ہیں اے سردار۔ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص۳۶۶ پر ہے۔ حَرْفُ سِيْنٍ اِشَارَةٌ بِكَلِمَةِ يَا سَيِّدَ الْبَشَرِ اَوْ يَا سَيِّدَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ؕ (ترجمہ) :۔ حرفِ سین سے اس طرف اشارہ ہے۔ کہ اے سید البشر یا اے اولین و آخرین کے سردار۔ خود حدیثِ رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ ہی کائنات باری عزاسمہٗ کے سردار معظم ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۵۱۱ پر ہے۔ اور جامع صغیر جلد اول صفحہ نمبر ص۱۰۷ پر ہے :۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۝ (ترجمہ) آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ میں اولادِ آدم یعنی انسانوں کا سردار ہوں۔ قیامت کے دن۔ صرف انسانوں کا ذکر اس لیئے ہے۔ کہ انسان سب مخلوق کے سردار قیامت کا ذکر صرف اظہارِ شان کے لیئے ہے۔ کہ اس دن سرداری مجب آب وتاب سے ظاہر ہو گی۔ ورنہ آج بھی سب مخلوق کی سرداری کا سہرا سرور کائنات علیہ السلام کے سر پر ہی ہے۔ اِس لیئے رب العزت نے ارشاد فرمایا۔ یٰسٓ۔ اے کائنات کے سردار۔ پس ان دلائل متعددہ سے ثابت ہوا۔ کہ یٰسٓ کا ترجمہ ہے۔ اے سردار۔ اور یہ لفظ آپ کا عظیم صفاتی خصوصی نام ہے۔ روح البیان کے نزدیک لفظِ یٰسٓ مفرد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَیُؤَیِّدُہٗ اَنَّہٗ یُقَالُ لِاَھْلِ بَیْتٍ ہٗ اٰلِ یٰسٓ ۝ (ترجمہ):۔ اور تائید کرتا ہے۔ اس کی یہ قول کہ کہا جاتا ہے۔ اہلِ بیت کو آلِ یٰسٓ۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ لفظِ یٰسٓ مفرد ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وَ اٰلِہٖ وَسلم کا نام خصوصی ہے۔ تو جس طرح غلام محمد اور غلام نبی نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح غلام یٰسین بھی نام رکھنا جائز ہے۔ وہ جن خطیب صاحب نے غلام یٰسین نام رکھنا ناجائز بتایا ہے۔ وہ کم فہم معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایسے ناموں سے منع کرنا چاہیئے۔ جو یا تو منحوس ہوں۔ اور یا مشابہ کفر ہوں۔ یا بے معنیٰ ہوں۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے نام تبدیل فرما دیا کرتے تھے غلام یٰسین بہت پیارا اور شاندار نام ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمان انگریزوں کی مثل، سویٹی، کیٹی، پروین، ببو۔ ڈبو۔ نام رکھیں۔ بہتر یہ ہے۔ کہ پیارے آقا کی نسبت سے مسلمان بچوں کے نام رکھیں۔ تاکہ نام کی نسبت سے کام وعمل میں برکتیں ہوں۔ لہٰذا غلام یٰسٓ نام رکھنا جائز ہے۔ ہاں چونکہ لفظِ یٰسین نبی کریم کا ذاتی نام نہیں اور نہ ہی غیر خصوصی صفت ہے۔ بلکہ یہ لفظ آپ کی خصوصی صفت ہے۔ اِس لیئے صرف یٰسٓ نام نہ رکھا جائے۔ جیسے کہ پہلے بتا دیا۔ کہ کوئی شخص اپنا نام صفتِ خصوصی سے نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً نبی یا رسول نام رکھنا منع ہے۔ اسی طرح فقط یٰسین نام رکھنا بھی منع ہے۔ کیونکہ نبی بھی خصوصی صفت اور یٰسٓ بھی خصوصی صفت۔ اور جیسے کہ محمد، نبی یا نبی احمد نام رکھنا منع ہے۔ اور ایسے ہی محمد یٰسٓ نام رکھنا بھی منع ہے۔ صرف غلام یٰسین نام رکھنا جائز ہے:۔

وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ۝

کتبہ

داڑھی مبارک اسلام کا عظیم الشان شعار ہے

سوال عـ۸ـہ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ دین اسلام میں داڑھی کا کیا مقام ہے۔ اور داڑھی مبارک کی شرعی حد کیا ہے۔ کیا شریعت کی رو سے داڑھی کترانا گناہ ہے یا نہیں۔ اور داڑھی مونڈنا یا منڈانا اچھا ہے یا برا۔ داڑھی کترانے والا۔ شریعت میں کیا اچھا مقام رکھتا ہے؟ یا مجرمانہ حیثیت۔ احادیث و قرآن میں یا فقہ اسلامی میں داڑھی شریف کے متعلق کیا حکم ہے۔ سنت ہے یا فرض یا واجب۔ ہمارے علاقے میں جماعتِ اسلامی والے بالکل خشخاش کے برابر داڑھی رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض وہ لوگ جنہوں نے پہلے مودودی صاحب کی دیکھا دیکھی بڑی داڑھی رکھی تھی۔ اب انہوں نے بھی بالکل چھوٹی کرا دی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے مودودی صاحب نے پوری تحقیق کر لی ہے اور ثابت کر دیا ہے۔ کہ داڑھی کی شریعت میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ کوئی رکھے نہ رکھے۔ چھوٹی سے چھوٹی داڑھی بھی اسلامی داڑھی ہے۔ اسلام نے داڑھی کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ مودودی صاحب کی کتاب رسائل و مسائل کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں مسلمان بزرگوں میں اس بات سے کافی تشویش ہے ہم نے بہت سے نوجوانوں کی داڑھیاں رکھائی ہیں مگر اب مودودی اور ان کی پارٹی کے لوگ ایسی زہریلی باتیں کر کے ان نوجوانوں کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ مصریوں عربیوں کی داڑھی کا حوالہ دیتے ہیں۔ کبھی کسی طرف کی باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے ہم کو باہمی مکالمے یا مناظرے کا اس موضوع پر چیلنج دیا ہے۔ آٹھ دن بعد ہم نے اُن سے داڑھی کے مسئلے پر مناظرہ کرنا ہے۔ میں سخت فکر مند ہوں۔ میرے پاس فی الحال ٹھوس دلائل نہیں۔ میں آپ سے پورا واقف نہیں۔ البتہ مجھ کو یہاں کے سب بزرگوں نے آپ ہی کا پتہ بتایا۔ لہٰذا آپ جناب کی خدمتِ اقدس میں یہ سوال نامہ بھیج رہا ہوں۔ مع جوابی لفافہ۔ جلد از جلد جواب ارسال فرما کر شکریے کا موقعہ دیں۔ میری فتح آپ کی فتح ہو گی۔ بَيِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا

سائل:۔ آپ کا خادم:۔ اقبال احمد جعفری بہاولپور شہر طالب علم کالج ایم اے اسلامیات

مورخہ: ۱۹۷۳-۹-۱۱

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

عزیز گرامی مجاہد اہلِ سنّت پیاری تحریر وصول ہوئی۔ داڑھی شریف کے متعلق ہمارے مقتدا محسنِ مسلمین تاجدارِ سنیّت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی علیہ الرحمۃ نے ایک بسوط

کتاب لکھی، جو آپ کو بہت مفید تھی۔ مگر سوئے اتفاق سے وہ اس وقت ہمارے کتب خانہ میں نہیں ورنہ وہی بھیج دی جاتی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی تحریر کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن آپ کو جلدی کے پیش نظر مختصر دلائل لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ آپ کے خط کے بعد بحیثیت مفتئ اسلام ہونے کے اور فتویٰ نویسی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے میں نے خود رسائل و مسائل کا مطالعہ کیا۔ اور مذکورہ فی السوال مقامات کو بغور دیکھا سوال کی مختصر عبارت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نکلیں۔ داڑھی شریف کے متعلق مودودی صاحب کی عبارات موجودہ دور میں نوجوان طبقے کے لیے بہت خطرناک پائیں۔ مودودی صاحب کی اپنی صورت اور پھر ان کی عبارات داڑھی شریف کی مخالفت میں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ مزید کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مودودی اور ان کی پارٹی عقیدۃً ایک وہابی ٹولہ ہے۔ اور عملاً آزاد خیالی ہے۔ جو سراسر منزلِ گمراہی ہے۔ جناب مودودی صاحب کی اپنی داڑھی بالکل شریعت مطہرہ کے مطابق ہے۔ مگر اپنی اس تحریر کے آئینے میں سر سید علی گڑھی کی داڑھی کی طرح محض ایک بہروپ نظر آتا ہے۔ مودودی صاحب کا رسائل و مسائل جلد اوّل میں یہ کہنا کہ شریعت میں داڑھی کا کوئی مقام یا مقدار نہیں۔ عجب لاعلمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ شریعت تو قرآن وحدیث اور اجماعِ اُمت وقیاس کا نام ہے۔ حالانکہ ان تمام میں داڑھی کا پورا مقام ودرجہ واضح ہے۔ کیا مودودی صاحب اور ان کا ٹولہ بھی ان ہی اصول اربعہ کو شریعت مانتا ہے۔ اگر ایسا ہی واقعہ ہے تو داڑھی کے متعلق ایسی غیر ذمہ دارانہ تحریر سے ہم سوائے غفلت یا زمانہ سازی کے کیا اندازے لگا سکتے ہیں قانونِ شریعت میں بے شمار آیات واحادیث اور فقہ آئمہ اربعہ سے اور عقلاً نقلاً داڑھی کا ہر طرح ثبوت ملتا ہے۔ جہاں تک دلائلِ لحیہ کا تعلق ہے۔ تو ایک مومن کامل عاشقِ رسول الفتِ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم میں سرسبز وشاداب کے لیے تو شمائلِ ترمذی اور مسلم شریف کی دو روائتیں ہی کافی ہیں۔

چنانچہ شمائلِ ترمذی صفحہ نمبر ۲ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ ابْنُ وَکِیْعٍ الخ) عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ قَالَ سَئَلْتُ خَالِیْ هِنْدَ ابْنَ اَبِیْ هَالَةَ وَکَانَ وَصَّافًا عَنْ حِلْیَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الخ۔ فَقَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا یَتَلَأْلَؤُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ (الخ) کَثُّ اللِّحْیَةِ:۔ (الخ)۔ ترجمہ:۔ امام عالی مقام حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں یعنی نبی کریم کے مُتَبَنّٰی حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے متعلق سوال کیا۔ اور آپ کا کام بھی یہی تھا۔ کہ لوگوں کے سامنے آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی شکلِ پاک کے اوصاف ہی بیان کرتے رہتے (کیسی پیاری عبادت ہے جسے اللہ تعالیٰ نصیب کرے) تو میرے پوچھنے پر آپ نے فرمایا

کہ پیارے آقا علیہ التحیۃ والثناء بھرے چہرے والے پارعب جسم شریف والے تھے۔ آپ کا چہرہ مقدسہ اس طرح نور بکھیرتا تھا۔ جس طرح چودھویں رات کا چاند ساری کائنات کو منور کرتا ہے۔ اور گھنی داڑھی شریف تھی۔ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۰۱۰ پر اس طرح الفاظ ہیں:۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ۔ قَالَ۔ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرُ شَعْرِ اللِّحْيَةِ ۵ (ترجمہ):۔ حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی پاک کے بال مبارک بہت بھرے ہوئے تھے۔ محبِّ صادق کے لیئے یہ دو حدیثیں ہی دلائل کثیرہ دبراہینِ عدیدہ ہیں۔ اس لیئے کہ حبیب کو محبوب کی ہر ادا پیاری ہوتی ہے۔ اور مومن کے لیئے سراپاءِ ایمان فخرالاسلام احمد مجتبیٰ کی اداؤں کی نقل ہی عبادتِ عظمیٰ ہے اسی لیئے ربِّ کریم نے ارشاد فرمایا:۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ پارہ ۲۱ نمبر ۲۱ آیت ۲۱ ۵ ترجمہ:۔ اے دنیا بھر کے مسلمانوں بے شک تمہارے لیئے اللہ کے رسول کے طور طریقوں میں اچھا نمونہ ہے۔ تمام انبیاءِ کرام خصوصاً آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، علیہم اجمعین و علیہم السلام کا کوئی فعل، کوئی عمل، کوئی طریقہ، کسی عادت یا رواج کی بناء پر نہیں ہوتا۔ نہ محض قومی فیشن کی وجہ سے بلکہ حضراتِ انبیاء کے تمام افعالِ طیبہ طاہرہ قانونِ شریعت ہوتا ہے۔ بلکہ نبی کریم کی عادتِ مبارکہ بھی رواجی نہیں شرعی ہے۔ اسی لیئے آپ کے وہ افعال جو محض عادتِ کریمہ سے ظاہر ہوئے۔ مثلاً کدو، شہد اور دودھ پسند فرمانا، ان کو اختیار کرنا بھی ہر مسلمان کے لیئے مستحب ہے۔ اور جو افعال عادتِ کریمہ سے نہیں اُن پر عمل کرنا ہر مومن پر واجب ہے۔ داڑھی انہی میں سے ہے، جیسا کہ آگے ثابت ہوگا۔ توضیح صفحہ نمبر ۳۱۴ پر ہے۔ يَجِبُ عَلَيْنَا اِتِّبَاعُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ اَفْعَالِهِ الَّتِيْ لَيْسَتْ بِسَهْوٍ وَلَا طَبْعٍ وَلَا مُخْتَصَّةٍ بِهٖ اور یہ کہنا عین مناسب ہے کہ محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے تمام عمل یہاں تک کہ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، سونا، جاگنا ہی اصل دینِ اسلام ہے۔ اگر دین و شریعت سے کردارِ احمد مجتبیٰ کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو دین بے پتوں اور بے جڑ والا درخت ہے۔ احادیث و سنتِ رسول اللہ سے ہی دین کی بہار ہے۔ حدیثوں کو چھوڑ کر دین کچھ بھی نہیں۔ یہ اس لیئے ہے۔ کہ انبیاءِ کرام صرف وہی کام ادا فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہو۔ کیونکہ مقصد بعثتِ انبیاء کرام معاشرے کو درست کرنا اور قومی رواجوں اور فیشنوں کو ختم کرنا ہے۔ دین اور شریعت صرف نماز، روزہ نہیں بلکہ دینِ اسلام، حیاتِ دنیا کے ہر کام پر بالادستی رکھتا ہے۔ نبیِ کریم رؤف و رحیم سب کو اپنے نقشِ قدم پر چلانے کے لیئے تشریف لائے۔ کسی رسم و رواج کو اپنانا شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ غارِ حرا کی نمازیں اور عبادات اور ریاضات کس رواج کے مطابق تھیں۔ اُس ظالم دور میں دریتیم صلی اللہ علیہ وسلم کا

یتیم کا ملجا و ماوی، دادرس، فریادرس، مشکل کشا ہونا، صادق الوعد وامین ہونا کس معاشرے سے متعلق تھا۔ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو معاشرے کا لباس تک اختیار نہ فرمایا۔ بلکہ اپنے اور مسلمان کے لیئے شریعت پاک کا علیحدہ لباس مرتب فرمایا (دیکھو کتبِ احادیث میں باب لباس النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

پس ثابت ہوا کہ انبیاء ومرسلین کے تمام افعالِ طیبہ اعمالِ طاہرہ قوم اور اُمت کے لیئے نمونہ ہے۔ نبی کریم کے عادات وخصائل بھی عبادتِ اسلامیہ ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اہمیت ومدارج کے اعتبار سے بعض فرض، بعض واجب، بعض سنّتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا کی نقل ہی ایمان بخش قانون ہے۔ وہی مومن کامل ہے۔ جو صورتاً، سیرۃً، ظاہراً، باطناً، اوّلاً، آخراً، سرکارِ اولین وآخرین کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرے۔ اور نبی کریم کے ہر عمل اور ہر حکم کو خدائے برتر و قہار کا حکم جانے۔ اور یہ سب کچھ عشقِ مصطفٰے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی پیاری سمجھ والے کے لیئے تو بس یہ دو روائتیں ہی کافی ہیں مگر فی زمانہ اس طرح بیہودہ گستاخانہ ابن الوقت قسم کی تحریروں نے قوم کے اوباشوں کو گمراہی کی حد تک بے باک کر دیا۔ دینی شرم وحیا مفقود، ایمانی ادب واحترام ختم۔ یہیں پر بس نہیں۔ بلکہ مودودی قسم کے لوگوں کی تحریریں پڑھ کر بعض لوگ اسلام پر دلیر بن گئے۔ کبھی نماز کا مذاق کرتا۔ کبھی نمازیوں کو بُرا سمجھنا۔ کبھی مسجد کی تضحیک۔ کبھی علماء اور امام مساجد پر پھبتیاں کستا۔ کبھی داڑھی کو نشانہ بنانا۔ گویا سیاسی پریکٹس ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا۔ کہ ہندو مشرک بھی مسجدوں کا اِس طرح ادب کرتے تھے۔ کہ جب کسی گلی، محلّے، میں ڈھول باجے کے ساتھ گذرتے تو مسجد کے پاس خاموش ہو جاتے۔ مگر اس زمانے کا مسلمان دل میں اتنا ادب بھی قائم نہیں رکھتا۔ یہ سب ایسی صحبتوں اور ایسے رسائل کی تربیت کا ہی اثر ہے۔ حمقاء نے اسلامی باتوں کو نقصان دِہ کہنا شروع کر دیا۔ ایسی باتیں اِسی دَور میں سننے میں آئیں۔ کہ (معاذ اللہ) داڑھی نقصان دِہ ہے۔ اور لڑائی کے وقت مار پڑواتی ہے۔ کہ دشمن اُسی کو پکڑ کر مارتا ہے۔ پوچھو بیوقوفوں سے کس نے کہا ہے۔ کہ داڑھی رکھ کر تم لوگوں سے مار کھاتے رہو۔ کیوں ایسے بیہودہ کام کرو۔ کہ لوگ تم کو ماریں۔ اور پھر داڑھی منڈانے والوں کو لوگ ہاتھ پکڑ کر مارتے ہیں۔ تو چاہیئے کہ سارے داڑھی منڈے لوگ اپنے اپنے ہاتھ بھی کٹا دیں کہ یہ بھی نقصان دِہ ہیں۔ یاد رکھو کہ داڑھی پکڑ کر کوئی نہیں مارتا کیونکہ داڑھی رکھ کر قدرتاً خود بخود اکثر لوگ مہذّب ہو جاتے ہیں بد تہذیبی تو آوارہ مزاجی آزاد خیالی سے آتی ہے۔ مار تو پڑتی ہے ان ریچھ نما سروں اور سر کے ریچھ نما بالوں سے۔ جو اب ایک فیشن بنتا جا رہا ہے۔ ہر مہذّب چیز میں نکتہ چینیاں کرنا۔ اور از راہِ دلگی ہر بات میں ثبوت مانگنا فی زمانہ ایک رواج بن چکا ہے۔ حالانکہ جو زیادہ ثبوت مانگتے پھرتے ہیں۔ وہ عمل بالکل نہیں کرتے۔ لیکن اتمامِ حجت کے لیئے مندرجہ ذیل عبارت میں داڑھی سے متعلق پورے دلائل پیش کیئے جاتے ہیں:۔

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَ رَؤُفِ الرَّحِیْمِ۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ :-
جاننا چاہیئے کہ مسلمان کی داڑھی اسلام کا نشانِ اعظم ہے۔ از آدم علیہ السلام تا سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر تا حضرت اویس قرنی۔ اسی طرح از حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہ تا ایں زمانہ تمام ہادی بزرگ اکابرِ اسلام نے اِس نشانِ اعظم کو اپنے مقدس چہروں سے وابستہ رکھا۔ یہ وابستگی بھی داڑھی شریف کی بلندی مقام کی بہت بڑی دلیل ہے قرآن کریم فرماتا ہے :- وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ط (پ ۱۷ آیت نمبر ۳۲ سورۃ حج) :- ترجمہ :- اور کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کی تعظیم اور ادب کرے کیونکہ تعظیم دلوں کا تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نشانات مثل ممنوعہ علاقوں کے ہیں۔ ان میں عقل و خرد کی دست درازیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ اللہ اور رسول کے ان شعائر میں اپنی ناقص عقل سے کتر و بیونت کو حلال جانے۔ چنانچہ قرآنِ مجید پارہ نمبر ۶ سورۂ مائدہ آیت نمبر ۲ میں ارشاد باری ہے :- یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ :- ترجمہ :- اے ایمان والو! نہ حلال کر لینا تم اللہ کے نشانات کو (اپنی دست درازیوں کے لیئے) اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کے تمام اصول و فروع بالکل مقرر و معین ہیں۔ بخلاف دیگر ادیانِ باطلہ کے اُن کا کوئی طریقہ دینی معین نہ ہوا۔ ہر دور میں کچھ مدت معینہ کے بعد اُن کے بنائے ہوئے دینی اصول تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہی ان کے بطلان کی ایک بڑی نشانی ہے۔ اسلام کے تمام قوانین کی طرح داڑھی کا حکم بھی بالکل معین و محدود ہے۔ حکم شریعت مطہرہ کے مطابق داڑھی رکھنا فرضِ عین ہے۔ اس لیئے کہ نصِ قطعی سے ثابت ہے۔ حدیث پاک کی عبارتُ النص اور قرآن کریم کی اقتضاءُ النص اور دلالتُ النص و اشارۃُ النص جیسی نصوصِ عدیدہ داڑھی رکھنے کا بالوضاحت حکم دے رہی ہے۔ قرآن و حدیث کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگانے کے لیئے صرف عقلِ سلیم کی ضرورت ہے۔ حدیث پاک کی کتاب موطا امام مالک جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲۱ پر ہے۔ حَدَّثَنِیْ عَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِاِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَاِعْفَاءِ اللِّحٰی ﴿
ترجمہ :- حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ پاک صاحبِ لولاک نے حکم دیا کہ مونچھیں پست کرو اور داڑھیاں بڑھاؤ۔ اس حدیثِ پاک کو مسلم شریف جلدِ اوّل صفحہ نمبر ۱۲۹ پر ان الفاظ سے روایت کیا ہے :- عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَحْفُوا الشَّوَارِبَ وَ اَعْفُوا اللِّحٰی ط :-
ترجمہ :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ مونچھیں گھٹاؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ۔ اس حدیث سے فرضیتِ داڑھی ثابت ہوئی کیونکہ اَعْفُوا امر حاضر کا صیغہ ہے اور امر حقیقۃً و اصلاً وجوب کے لیئے ہوتا ہے کسی اور معنی میں لینے کے لیئے قرینہ شرط ہے۔ چنانچہ تلویح علی توضیح صفحہ نمبر ۲۸۱ پر ہے لِاَنَّ الْاَمْرَ علی

اَنَّ الْاَمْرَ الْمُطْلَقَ لِلْوُجُوْبِ وَلَا نِزَاعَ فِیْ اَنَّہٗ قَدْ یَکُوْنُ لِغَیْرِہٖ مَجَازًا اَیْ بِمَعُوْنَۃِ الْقَرَائِنِ ؕ (ترجمہ)

مقصود یہ ہے کہ صیغۂ امر مطلق طور پر وجوب کے ہوتا ہے۔ مجازی معنیٰ میں کسی علامت اور قرینے کی مدد سے ہوگا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ پس چونکہ اس حدیث میں حقیقی معنیٰ یعنی وجوب کو چھوڑنے اور مجازی مراد لینے کا کوئی قرینہ نہیں لہٰذا یہاں وجوب ہی ثابت ہوگا۔ نیز ترکِ داڑھی پر احادیث میں بہت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ جس سے بھی داڑھی رکھنے کی فرضیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ جیساکہ ابھی آئندہ بیان ہوگا۔ کیونکہ نفرت اور وعید صرف ترکِ فرض پر ہوتا ہے۔ نوافل اور مستحبات کا چھوڑنا لائقِ وعید نہیں۔ جیساکہ میں نے حرمتِ قوالی کے بیان میں ثابت کر دیا۔ مزید برآں۔ شریعتِ مطہرہ نے داڑھی کی حد بیان فرمائی جیساکہ ابھی آئندہ بیان ہوگا۔ اور حد صرف فرائض کی ہوتی ہے نوافل وغیرہ کی نہیں نہ استحبابی عبادت کی۔ جیساکہ آگے ثابت کیا جائے گا۔ اور اصولِ فقہ کا قانون ہے کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے جن افعال پاک پر حکم کے دلائل قائم ہو جائیں وہ امت پر بھی واجب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تلویح صفحہ نمبر ۳۱ پر ہے :- یَجِبُ عَلَیْنَا اِتِّبَاعُ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ فِیْ اَفْعَالِہِ الَّتِیْ لَیْسَتْ بِسَھْوٍ وَّلَا طَبْعٍ وَّلَا مُخْتَصَّۃٍ بِہٖ لِلدَّلَائِلِ الدَّالَّۃِ عَلٰی ذٰلِکَ :- ترجمہ: ہم تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ نبی کریم رؤف و رحیم کے ان افعال مبارکہ کی اتباع جو نہ آپ سے خاص ہیں۔ نہ سہواً ہوئے نہ عادتاً۔ ان دلائل کی بنا پر جو ان فعلوں پر قائم ہوئے۔ خیال رہے کہ لفظ واجب، فرض و واجب دونوں حکموں کو شامل ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس مندرجہ بالا حدیث مبارکہ سے داڑھی رکھنے کی فرضیت بالکل عیاں ہوگئی اور یہ حدیث پاک نصِ قطعی ہے کیونکہ کثرت روایات کی بناء پر متواتر کے درجہ میں ہے۔ چنانچہ بیس ۲۰ کتب مشہورہ نے کچھ تغیرِ لفظی کے ساتھ مختلف اُستاد سے اسی حدیث کو روایت کیا۔ ۱ مسلم شریف ۲ موطا امام مالک ۳ مسند امام اعظم ۴ مسند احمد بن حنبل ۵ بخاری شریف ۶ ابو داؤد ۷ ترمذی شریف ۸ نسائی شریف ۹ ابن ماجہ شریف ۱۰ طحاوی شریف ۱۱ ابن عدی کامل ۱۲ طبرانی اوسط ۱۳ بیہقی فی شعبِ الایمان ۱۴ ضیاء صحیحہ ۱۵ ابونعیم فی الحلیہ ۱۶ طبرانی کبیر ۱۷ خطیب بغدادی ۱۸ ابن سعد ۱۹ جامع الرموز ۲۰ جامع صغیر ان کتب کے اخراج نے اس حدیث کو متواتر معنوی بنا دیا۔ چنانچہ تدریب الراوی صفحہ نمبر ۳۷۳ پر ہے :- کَوْنُ الْمُتَوَاتِرِ مَوْجُوْدًا وَّجُوْدَ کَثِیْرَۃٍ فِی الْاَحَادِیْثِ اَنَّ الْکُتُبَ الْمَشْھُوْرَۃَ الْمُتَدَاوِلَۃَ بِاَیْدِی اَھْلِ الْعِلْمِ شَرْقًا غَرْبًا۔ اِذَا اجْتَمَعَتْ عَلٰی اِخْرَاجِ حَدِیْثٍ وَّتَعَدَّدَتْ طُرُقُہٗ تَعَدُّدًا تُحِیْلُ الْعَادَۃُ تَوَاطُؤَھُمْ عَلَی الْکِذْبِ :- ترجمہ: وہ حدیث بھی متواتر ہے جس کو اتنی زیادہ کتبِ مشہورہ نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے۔ اس معتبرہ متواترہ حدیث

کے عبارت النص سے ثابت ہوا کہ داڑھی رکھنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ داڑھی کی مطلق فرضیت کو اجماع سے بھی ثابت کیا جائے گا اور فرضِ مطلق کا منکر شرعاً کافر ہوتا ہے۔ ہاں فرضِ مفید جو اجتہاد سے ثابت ہوتا ہے اس کا منکر کافر نہ ہوگا (کبیری ص) یہ تھی عبارتُ النص جس سے داڑھی رکھنا فرض ثابت ہوا۔
اب دلالۃ النص اشارۃُ النص اور اقتضاءُ النص میں آیاتِ قرآنیہ جن سے داڑھی رکھنے کا واضح ثبوت مل رہا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت یہ ہے: وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۔ ترجمہ: مردود ہونے کے وقت شیطان نے کہا کہ میں ان بندوں کو گمراہ کروں گا۔ اور ان کو دنیوی امیدوں میں پھنساؤں گا اور ان کو حکم کروں گا۔ کہ جانوروں کے کان کاٹیں۔ اور حکم دوں گا ان کو کہ اللہ کی پیدائش کو بگاڑیں۔ اس آیت کریمہ نے دلالۃً داڑھی کی فضیلت اور فرضیت کو بیان فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو بدلنے اور بگاڑنے میں عقلاً و نقلاً داڑھی منڈانا اور کترانا بھی شامل ہے۔ نقلاً تو اس طرح کہ بہت مفسرین داڑھی منڈانے یا کم کرنے کو تغییر خلق اللہ میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی پارہ ۵ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۲ صفحہ نمبر ۱۵۰ پر فرماتے ہیں: وَخُصَّ مِنْ تَغْيِيرِ خَلْقِ اللَّهِ تَعَالَى الْخِتَانُ وَالْوَشْمُ لِحَاجَةٍ وَخَضْبُ اللِّحْيَةِ وَقَصُّ مَا زَادَ مِنْهَا عَلَى السُّنَّةِ ۔ (ترجمہ)
ترجمہ: تغییر خلق اللہ تعالیٰ (جو شیطانی کام ہے) اسی میں خصی کرانا، اور چہرہ گدھوانا کسی بھی ضرورت کے تحت ہو۔ اور داڑھی کو سیاہ خضاب لگانا، داڑھی کو کم کرنا اس سے جو سنت کے مطابق زائد ہو۔ اسی طرح تفسیر نعیمی جلد پنجم صفحہ نمبر ۳۸۴ پر اور تفسیرِ حقانی اردو اسی آیت کے تحت ہے، ثابت ہوا کہ داڑھی منڈانا یا کترانا حرام اور شیطانی امر ہے۔ تغییر خلق اللہ کی ایک صورت مثلہ کرنا ہے۔ اور اس آیت سے اس کی حرمت بھی ثابت ہے۔
فقہاءِ امت کے نزدیک داڑھی کٹانا بھی مثلہ ہے۔ چنانچہ ہدایہ شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۳۶ پر ہے: وَلِأَنَّ حَلْقَ الشَّعْرِ فِي حَقِّهَا مُثْلَةٌ كَحَلْقِ اللِّحْيَةِ فِي حَقِّ الرِّجَالِ ۔ (ترجمہ)
ترجمہ: احرام سے کھلتے وقت عورتیں اپنے سر نہ منڈائیں کیونکہ جس طرح کہ مردوں کی داڑھی منڈانا مثلہ ہے اسی طرح عورتوں کا سر مونڈنا بھی مثلہ ہے۔ مثلے کی حرمت میں کسی کا اختلاف نہیں۔ مثلہ کہتے ہیں کسی کے چہرے بگاڑنے کو۔ اس لئے کہ جمال چہرے میں ہی ہوتا ہے۔ اور صحیح تر یہ ہے کہ چہرے کے اعضاء کے علاوہ جسم کے دوسرے اعضاء کا کاٹنا مثلہ نہیں۔ ورنہ چور کے ہاتھ کاٹنے اور ڈاکو کے ہاتھ پیر کاٹنے کی شرعی اسلامی سزا نہ ہوتی حالانکہ مثلہ اسلامی شریعت نے ہی حرام کیا ہے۔ چنانچہ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۳۱ پر ہے: ثَبَتَ فِي الصَّحِيحَيْنِ وَغَيْرِهِمَا النَّهْيُ عَنِ الْمُثْلَةِ ۔ ترجمہ: بخاری و مسلم اور ان کے علاوہ کتبِ حدیث کی روایات سے مثلے کی ممانعت ثابت ہے۔ چہرے کے اعضاء میں سے داڑھی بھی ایک عضو ہے

اس لیئے اِس کا کاٹنا بھی شرعاً مثلہ ہی بنے گا۔ بخلاف جسم کے دوسرے بالوں کے کہ ان کا کاٹنا مثلہ نہیں کہلاتا نہ کسی حدیث سے ثابت ہے۔ حالانکہ داڑھی کاٹنے کو حدیثِ پاک میں مثلہ فرمایا گیا۔ چنانچہ مجمع البحار جلد سوم نے صفحہ نمبر ۲۷۹ پر نہایہ لابنِ اثیر کے حوالے سے اور جامع صغیر جلد دوم نے صفحہ نمبر ۱۸۲ پر طبرانی کے حوالے سے اور کنوز الحقائق للامام عبدالرؤف مناوی جلد دوم نے صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ابوداؤد کے حوالے سے ایک حدیث نقل فرمائی۔ الفاظ جامع صغیر اور مجمع البحار کے یہ ہیں۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ فَلَیْسَ لَہٗ عِنْدَ اللّٰہِ خَلَاقٌ۔ مُثْلَۃُ الشَّعْرِ حَلْقُہٗ مِنَ الْخُدُوْدِ ترجمہ:۔ روائت ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔ فرمایا۔ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جو شخص بالوں کا مثلہ کرے۔ اس کے لیئے اللہ کے پاس اجر و ثواب کا کچھ حصہ نہیں۔ اور بالوں کا مثلہ چہرے کے بال مونڈنے ہیں۔ رخساروں کے بال داڑھی ہی ہوتی ہے۔ ان ہر سہ کتب مشہورہ کی روایات نے صاف بتادیا کہ داڑھی کا کاٹنا مثلہ ہے اور مثلہ اسلام میں حرام ہے۔ دوسری آیتِ کریمہ جس سے داڑھی رکھنے کا ہر مسلمان کو ثبوت مل رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ؕ:۔ ترجمہ: اور جب رب العزت نے حضرت ابراہیم کو آزمایا۔ کچھ کلمات سے۔ تو آپ نے ان سب کو پورا کر دکھایا (پارہ دوم سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۲۳) اس آیتِ پاک نے بھی دلالۃً داڑھی کی فرضیت کو بیان فرمایا۔ ملّتِ ابراہیمی کی پیروی واجب ہے۔ قرآن کریم میں ہے:۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ؕ۔ ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کرو۔ یہاں اِتَّبِعْ صیغۂ امر بھی وجوب کے معنیٰ میں ہے۔ کیونکہ یہاں کلمات سے مراد مفسّرین کرام کے نزدیک وہ دس فطرتیں بھی ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں مذکور ہے۔ ان میں داڑھی رکھنا بھی ایک فطرت ہے۔ ایسا ہی تفسیر روح المعانی نے اس آیت کے ماتحت صفحہ نمبر ۳۷۴ پر فرمایا۔ اس آیت نے دلالۃً ثابت کیا۔ کہ داڑھی فرض ہے۔ کیونکہ کلمات میں داڑھی شامل ہے جس سے پتہ لگا کہ داڑھی ملّتِ ابراہیمی ہے۔ اور ہم مسلمانوں پر ملّتِ ابراہیمی کی پیروی واجب ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا۔ پھر کسی پیغمبر۔ رسول۔ مرسل علیہم السّلام سے داڑھی کم کرانا ثابت نہیں لہٰذا ظاہر ہوا کہ داڑھی رکھنا بھی ایک فطرتِ انبیاء ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں باب المسواک میں صفحہ نمبر ۴۴ پر ہے:۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَۃِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْیَۃِ وَالسِّوَاکُ۔ (الخ) ترجمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ فرمایا سرورِ دوجہان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے دس چیزیں انسانی فطرت یعنی جبلی عادت میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک مونچھیں ہلکی کرانی، دوسری داڑھی بڑھانی، سوم مسواک کرنی وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ شریعت کے حکم کے علاوہ انسانی شرافت کے لیئے بھی داڑھی رکھنا ضروری ہے۔ گویا کہ ان دس خصلتوں کے بغیر مسلمانی تو درکنار انسانیت بھی مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان خصائلِ عشرہ کا تمام شریعتوں نے حکم دیا۔ خود قرآنِ کریم، انبیاءِ کرام کی ان ہی جیسی خصائل حمیدہ کا ذکر فرما کر تمام امتِ مسلمہ کو عمل کرنے کا حکم فرما رہا ہے۔ چنانچہ پارہ ہفتم سورۂ انعام آیت نمبر ۹۰ میں ارشاد ہے:۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط :۔ ترجمہ:۔ یہی وہ انبیاء کرام ہیں جن کو خصوصی طور پر ان تمام خصائل کی اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی۔ تو اے پیارے حبیب میری بات (ہدایت) کو ان انبیائے کرام کے پاس ہے آپ بھی اختیار فرمائے رکھو۔ اور یہ پہلے بتا دیا گیا ہے کہ نبی کریم کے تمام افعالِ طیبہ و اعمالِ طاہرہ محض امت کے لیئے ہیں۔ کیونکہ رب کریم نے آپ کو نمونۂ قدرت بنا کر معلمِ کائنات بنایا۔ پس جس طرح اساتذہ کے افعال تعلیم تلامذہ ہوتے ہیں۔ بلا تشبیہ یوں ہی سمجھیئے کہ درس گاہ کائنات میں سرورِ کائنات کے افعالِ مقدس تعلیمِ امت کے لیئے ہی ہیں۔ داڑھی مبارک کا تو بہت ہی اہم حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تو بال اور رنگ میں اسلام کی حلت و حرمت پوشیدہ ہے۔ دیکھو ترمذی کتاب الحج صفحہ نمبر ۲۰ پر ہے۔ اب کسی شخص کا یہ کہنا کہ داڑھی معاذ اللہ نبی کریم نے عربی رواج کے مطابق رکھی، اس لیئے یہ شرعی حکم نہیں۔ ایسی بچے کی بیوقوفی کی بات کے مثل ہوگا۔ جو استاد کو تختۂ سیاہ پر لکھتا دیکھ کر اپنی کاپی یا تختی پر صرف اسلیئے نہ لکھے اور اپنے دل میں یہ سمجھ لے کہ استاد کا یہ لکھنا ایک اسکولی رواج یا اس کی اپنی عادت یا ذاتی مذاق ہے جو میرے یا کسی بھی شاگرد کے لیئے ضروری نہیں۔ ایسا شاگرد یقیناً قابلِ سزا ہے۔ تو سمجھ لو کہ داڑھی رکھنے کے متعلق ایسا کہنے والا بھی اُخروی تعزیر کا مستحق ہے۔ خیال رہے کہ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ط کے ترجمہ کا مطلب وہ نہیں جیسا کہ مولوی ابن تیمیہ وہابی نجدی کے شاگرد ملا علی قاری نے مرقات جلد اول صفحہ نمبر ص ۱۳۱ پر لکھا ترجمہ وہی مشہور اور منشاءِ کلام کے مطابق ہے جو ہم نے کیا کہ یہاں نبیِّ کریم کو انبیاءِ سابقین کی اِتِّباع کا حکم نہیں۔ وہ تو خود نبی کریم کے مقتدی تھے۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی اقتداء کا حکم ہے اور وہ بھی اقتدا پر قائم رہنے کا کہ قائم ہونے کا کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کے نزول سے پہلے بھی اِن خصائلِ عشرہ داڑھی وغیرہ پر عامل تھے۔ چنانچہ روح المعانی پارہ ہفتم صفحہ نمبر ۲۱۱ پر ہے:۔ بِاَنَّ الْاَخْذَ بِاُصُوْلِ الدِّيْنِ حَاصِلٌ لَّهٗ قَبْلَ نُزُوْلِ الْاٰيَةِ فَلَا مَعْنٰى لِلْاَمْرِ بِاَخْذِ مَا قَدْ اَخَذَ۔ قِيْلَ۔ اَللّٰهُمَّ اِلَّا اَنْ يُّحْمَلَ عَلَى الْاَمْرِ بِالثَّبَاتِ عَلَيْهِ ط۔ ترجمہ: اعتراض اس طرح سے بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اصولِ دین نماز، روزہ، صبر، شکر، سیرت، صورت، داڑھی وغیرہ۔ پر تو آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پہلے سے ہی عامل تھے۔ تو اس قول کا کیا مطلب ہوگا۔

جو پہلے آیت سے لیا گیا۔ پس اس جواب کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت کے امر کا مطلب یہ کہا جائے۔ کہ اے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم اس اقتداء پر قائم رہیئے۔ یہ تو دیگر مفسرین کا قول تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ اے پیارے نبی۔ انبیاءِ عظام کی اس خدائی ہدایت کی اقتداء پر اپنی امتِ مسلمہ کو قائم رکھیئے کیونکہ باب افتعال متعدی بھی ہوتا ہے اِس مطلب سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ داڑھی کا حکم قرآن کریم کی رو سے ہر مسلمان کے لیئے ضروری ہدایت ہے۔ تیسری آیت پاک جو داڑھی کی فرضیت کے حق میں اشارۃ النص ہے قرآن کریم پارہ نمبر ۳ آیت نمبر ۳۱ سورتِ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ ۝ ترجمہ:- اے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمام مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس آیت کریمہ سے تمام امت کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اتباع افعال کی ہی ہوتی ہے۔ داڑھی مبارک رکھنا بھی افعالِ مقدسہ میں شامل ہے۔ اس لیئے اس میں بھی اتباع نبی کریم رؤف ورحیم شرطِ محبت ہے۔ خیال رہے کہ اتباع اور اقتداء میں بہت طرح فرق ہے۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ اتباع کہتے ہیں کسی کی فرمانبرداری کرتے ہوئے بالکل اس کے نقش قدم پر چلنا۔ نہ ذرہ آگے نہ ذرہ پیچھے نہ داہیں نہ بائیں۔ مگر اقتداء کہتے ہیں وہ راستہ اختیار کرنا جس پر کوئی کبھی چلا تھا۔ یا کسی کا حکم ماننا۔ اسی کو اطاعت بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں پر اتباع صرف نبی کریم رؤف الرحیم کی واجب ہے۔ نہ کہ کسی اور کی۔ اگر کسی نبی کی اتباع کا حکم دیا بھی گیا ہے تو وہ مجازاً ہے۔ یعنی احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کے واسطے سے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۝ سورۃ نحل آیت نمبر ۱۲۳ پارہ ۱۴ ۝ ترجمہ:- ہم نے بذریعہ اپنے حبیب تیری طرف قرآنی وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیمی کی پیروی کر۔ بعض بزرگوں نے اِتَّبِعْ کا فاعل نبی کریم کو ہی سمجھا ہے۔ اور ترجیح بھی اسی کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان کے نزدیک اِتّباع سے مراد موافقت ہے۔ اس لیئے کہ سب کائنات نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تابع فرمان اور اقتداء میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ عزوجل نے صرف متبوع ہی بنا کر بھیجا۔ لہٰذا یہ آیت بھی اشارۃً داڑھی وغیرہ شعارِ اسلامی کی فرضیت ہی ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ آپ کے افعالِ مبارکہ کی اتباع شرعاً واجب ہے۔ جیسا کہ تلویح کی عبارت نے تصریح کر دی۔ چوتھی آیتِ طیبہ جو داڑھی کے حق میں اقتضاءُ النص کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ آیت ۹۴ ارشادِ باری۔ حضرت ہارون نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۝ ترجمہ:- اے ماں جائے میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑ اس آیتِ کریمہ نے سب انبیاءِ کرام کی شکل مبارک کا نقشہ کھینچ دیا کہ اللہ کے نیک بندے اور انبیاء

و مرسلین نے داڑھی مبارک رکھی۔ اور انبیاء کرام کی نقل سیرتاً و صورتاً امت پر واجب ہے۔ اقتضاءً ثابت ہوا کہ ہر مسلمان کے لیئے داڑھی لازمی و ضروری ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی دراز ریش مبارک ثابت کرتی ہے کہ آپ نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اور دیگر انبیاء کرام کے متعلق یہ کہیں ثابت نہیں۔ کہ کسی نے کسی وقت ایک آن کے لیئے داڑھی کٹائی ہو۔ بلکہ حدیث پاک کی دس فطرتوں سے یہی ثابت ہوا کہ سب انبیاء کرام باریش ہی رہے۔ **خلاصہ:** یہ کہ بیس کتب مشہورہ والی متواتر احادیث اور قرآن کریم کی چار آیات مبارکہ سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر داڑھی رکھنا فرض ہے۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ داڑھی سنت ہے۔ یہ قول ہمارے موقف کے خلاف نہیں عام مشہور بھی یہی ہے۔ اس لیئے داڑھی کو سنت کہہ دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ داڑھی کو فرض بھی کہتے ہیں اور سنت بھی۔ اس لیے کہ سنت کا لفظ پانچ معنی میں مشترک ہے ۱ سنت بمعنی حدیث کی کتاب۔ مثلاً یہ مسئلہ کتاب و سنت کا ہے ۲ سنت بمعنی عمل جیسے فرض، واجب، سنت ۳ سنت بمعنی عادت ہے مثلاً سنت اللہ ۴ سنت بمعنی طریقہ ہے۔ جیسے سنتِ خلیل ۵ سنت بمعنی رسم۔ جیسے حدیث پاک میں سنتِ حسنہ اور سنتِ سیئہ کے الفاظ آتے ہیں۔ داڑھی کو سنت کہنا پہلے معنیٰ کے لحاظ سے ہے یعنی سنت سے ثابت ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتنی لمبی داڑھی رکھنی فرض ہے۔ تو یاد رکھو کہ اسلامی قانون کے مطابق صرف ایک مٹھی یعنی چار انگل داڑھی رکھنا فرض ہے۔ نہ اس سے کم جائز اور نہ اس سے زیادہ جائز۔ ایک مٹھی سے کم داڑھی حرام ہے۔ اور ایک مٹھی سے زیادہ رکھنا مکروہ تحریمی ہے۔ اس قانون کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔ **پہلی دلیل:** يَابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۔ ترجمہ۔ اے میری ماں جائے میری داڑھی اور سر نہ پکڑ۔ پکڑی وہ چیز جاتی ہے جو مٹھی کے برابر ہو۔ مٹھی سے کم چیز مٹھی میں نہیں آ سکتی۔ ثابت ہوا کہ مٹھی سے کم داڑھی رکھنی سنتِ انبیاء کے خلاف ہے۔ **دوسری دلیل:** خود آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک صرف مٹھی برابر ہوتی رہی۔ چنانچہ فتاویٰ درمختار جلد اول صفحہ نمبر ۱۵۵ پر ہے اَللِّحْيَةُ اِذَا كَانَتْ بِقَدْرِ الْمَسْنُوْنِ وَهُوَ الْقَبْضَةُ وَصَرَّحَ فِي النِّهَايَةِ بِوُجُوْبِ قَطْعِ مَا زَادَ عَلَى الْقَبْضَةِ ۔ ترجمہ: داڑھی جبکہ ہو سنت کے برابر اور وہ مقدارِ مسنونہ ایک مٹھی ہے۔ اور شرح نہایا علی ہدایہ نے وضاحت فرمائی۔ کہ واجب ہے۔ مٹھی سے زیادہ داڑھی کے بال کاٹ دینا۔ اس کی شرح شامی میں ہے: حَيْثُ قَالَ وَمَا وَرَاءَ ذٰلِكَ يَجِبُ قَطْعُهٗ هٰكَذَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ يَاْخُذُ مِنَ اللِّحْيَةِ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا اَوْرَدَهٗ اَبُوْعِيْسٰى يَعْنِيْ تِرْمِذِيْ وَمُقْتَضَاهُ الْاِثْمُ بِتَرْكِهٖ ۔ ترجمہ: نہایہ نے اس طرح تصریح فرمائی ہے۔ کہ مٹھی بھر داڑھی کے علاوہ بال کاٹنا واجب ہیں۔ اسی طرح نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سے ثابت ہے کہ آپ اپنی داڑھی مبارک سے لمبائی اور چوڑائی کے بال علیحدہ فرما دیتے تھے۔ اس حدیث کو ابو عیسیٰ ترمذی نے بھی نقل فرمایا۔ اور اس حدیثِ مطہرہ سے اقتضاءً ثابت ہوا کہ مٹھی بھر داڑھی سے زائد بال نہ کاٹنا چھوڑے رکھنا سخت گناہ ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰۰ پر یہ ہی محولہ حدیث اس طرح ہے:۔ حَدَّثَنَا هَنَّادٌ نَا عُمَرُ بْنُ هٰرُوْنَ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْخُذُ مِنْ لِحْيَتِهٖ مِنْ عَرْضِهَا وَطُوْلِهَا هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ ؕ ؕ:۔ ترجمہ: ہم سے حدیث بیان کی ہناد نے ان سے عمر بن ہارون نے کہ روایت ہے اسامہ بن زید سے وہ عمرو بن شعیب سے وہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بال لے لیتے تھے اپنی داڑھی مبارک کی لمبائی اور چوڑائی کے۔ یہ حدیث غریب ہے۔ لفظِ غریب سے کسی شخص کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا تین وجہ سے۔ پہلی وجہ۔ یہ کہ غریب حدیث صحیح حدیث ہی کی قسم ہے چنانچہ مقدمہ مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۶ پر ہے اَلْحَدِيْثُ الصَّحِيْحُ اِنْ كَانَ رَاوِيْهِ وَاحِدًا يُسَمّٰى غَرِيْبًا ؕ ترجمہ: اگر صحیح حدیث کی اسناد میں ایک راوی ہے تو اس کا نام غریب ہوگا۔ قانونِ اصولِ حدیث کے مطابق صحیح حدیث کی چار قسمیں ہیں ۱۔ غریب ۲۔ عزیز ۳۔ مشہور ۴۔ متواتر دوسری وجہ۔ یہ کہ اس حدیث شریف کو بطورِ سند دوسری کتب نے بھی قبول کیا ہے جو اس کی قوت پر دال ہے۔ چنانچہ صاحب مرقات نے مرقات جلد چہارم صفحہ نمبر ۴۶۲ پر اسی حدیث کو دلیل پکڑ کر یہ حکم لکھا کہ:۔ اَللِّحْيَةُ عِنْدَنَا طُوْلُهَا بِقَدْرِ الْقُبْضَةِ وَمَا وَرَاءَ ذٰلِكَ يَجِبُ قَطْعُهٗ ؕ (ترجمہ) :۔ ہمارے نزدیک داڑھی صرف وہ ہے کہ جس کی لمبائی فقط مٹھی بھر ہو۔ اور جو زیادہ ہو اس کا کاٹنا واجب ہے۔ اگرچہ آگے چل کر ملا علی قاری صاحب نے واجب کو بمعنی سنتِ موکدہ کہا ہے۔ مگر یہ غلط اور مضبوط دلیل کے بغیر ہے۔ لہٰذا مجھے تسلیم نہیں۔ کیونکہ اس سے بہت سے فتنوں کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ مشکوٰۃ شریف نے بھی اس حدیث کو صفحہ نمبر ۳۸۱ پر نقل فرمایا۔ بابِ الترجل فصلِ ثانی حدیث نمبر ۳۔ تیسری وجہ یہ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اسی فعل طیبہ طاہرہ کی بنا پر تمام صحابہ کرام اپنی اپنی داڑھی مقدس کو درازی میں نہ جانے دیتے تھے بلکہ بڑے اہتمام سے ہاتھ کے ذریعہ چار انگل داڑھی ناپ کر زائد بال کاٹ دیتے تھے۔ جیسا کہ دلیل سوم میں ثابت ہوگا۔ اس عمل صحابہ سے بھی اس حدیث پاک کی صحت و قوت کا پتہ لگ گیا۔ بہر حال ثابت ہوگیا کہ حدِ شرع مٹھی بھر داڑھی ہے۔ اس سے زیادہ لمبی داڑھی گناہِ کبیرہ ہے۔ تیسری دلیل۔ بخاری شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۸۷۵ بابِ تقلیم الاظفار آخری حدیث میں ہے۔ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا حَجَّ اَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضَلَ اَخَذَهٗ ؕ :۔ ترجمہ: اجل فقیہہ صحابی حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب حج یا عمرہ فرماتے تھے تو اپنی داڑھی

مبارک اپنی مٹھی شریف سے ناپتے تھے تو جو بال زائد از قبضہ ہوتے ان کو کاٹ لیتے تھے۔ ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک بھی داڑھی کی شرعی حیثیت صرف چار انگل تھی۔ لمبی داڑھی کو وہ بھی گناہ سمجھتے تھے۔ یہ تو صرف عبداللہ بن عمر کا فعل ثابت ہوا۔ دیگر صحابہ کرام بھی اسی طرح کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کے اسی صفحہ نمبر ۸۷۵ پر فتح الباری کا حاشیہ اس طرح ہے ۵ قَوْلُهٗ فَمَا فَضَلَ اَیْ زَادَ عَلَی الْقَبْضَةِ اَخَذَهٗ بِالْمِقْرَاضِ اَوْ نَحْوِهٖ وَرُوِیَ مِثْلُ ذَالِكَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَفَعَلَهٗ عُمَرُ بِرَجُلٍ وَعَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ یُؤْخَذُ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا مَا لَمْ یَفْحَشْ ۵ :۔ ترجمہ، حدیث پاک میں راوی کا قول فما فضل کا معنی ہے فما زاد یعنی جو بال زائد ہوتے تھے۔ ان کو کاٹتے تھے۔ قینچی یا اس کی ہم مثل چیز سے۔ اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی داڑھی مبارک کے زائد بال کاٹنا مروی ہے۔ اور حضرت فاروق اعظم نے تو اپنے دست اقدس سے ایک لمبی داڑھی والے شخص کے مٹھی بھر سے زائد بال کاٹ دیئے تھے۔ اور حضرت علی کے خاص تربیت یافتہ خواجہ حسن بصری سے روایت ہے کہ داڑھی کو لمبائی، چوڑائی سے کاٹتے رہنا چاہیئے تاکہ حد سے نہ بڑھے۔ اسی حاشیہ کے اگلے الفاظ ہیں۔ فرمان رسول علیہ السلام اُعْفُوا اللُّحٰی اس کاٹنے کے خلاف نہیں۔ کیونکہ یہاں داڑھی کو چھوڑ دینے کا مطلب ہے حد تک چھوڑ دو۔ اور حد کیا ہے یہی مٹھی بھر۔ مطلقاً چھوڑنا مراد نہیں، ورنہ نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا اور صحابہ کرام کا وہ عمل شریف جو ابھی بیان کیا گیا۔ اس کے خلاف نہ ہوتا اور حضرت ابن عمر کے اس فعل شریف میں راوی کا حج یا عمرے کی قید لگانا اس کے اپنے دیکھنے کی بنا پر ہے۔ ورنہ ابن عمر رضی اللہ عنہ یا صحابہ کرام میں سے کسی کا مٹھی بھر سے زائد کاٹنا حج یا عمرے سے خاص نہیں۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس حدیث کی شرح میں فتح باری نے کہا ہے۔ قُلْتُ الَّذِیْ یَظْهَرُ لِیْ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ کَانَ لَا یَخُصُّ هٰذَا التَّخْصِیْصَ بِالنُّسُكِ (الخ) ۵۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس روائت کا مطلب یہ ہے کہ ابن عمر اس فعل کو حج سے خاص نہیں فرماتے ہیں۔ پھر اسی حدیث کو فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷ پر ابوداؤد اور نسائی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ وہاں حج یا عمرے کا ذکر نہیں، چنانچہ کتاب الصوم صفحہ نمبر ۷۷ پر ہے وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِیُّ فِیْ کِتَابِ الصَّوْمِ۔ عَنْ عَلِیِّ بْنِ الْحَسَنِ (الخ) عَنْ مَرْوَانَ بْنِ سَالِمٍ قَالَ رَاَیْتُ ابْنَ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ یَقْبِضُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ۔ (الخ)۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر حدیث میں گذرا۔ یہاں مطلقاً فعل کا ذکر ہے۔ یہی ہمیشہ ہوتا تھا حج کی قید نہیں، حضرت ابوہریرہ سے بھی ایسا ہی ثابت ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۷۷ پر مسند ابی شیبہ کے حوالے سے ہے۔ عن ابی زرعۃ قَالَ کَانَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ یَقْبِضُ عَلٰی لِحْیَتِهٖ فَیَاْخُذُ مَا فَضَلَ عَنِ الْقَبْضَةِ ۵ ترجمہ۔ پوری سند کے بعد ابی زرعۃ تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

فرمایا انہوں نے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی داڑھی شریف پکڑتے تھے تو جو مٹھی سے زائد ہوتی تھی وہ کاٹ دیتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صرف ایک مٹھی داڑھی شریعت میں جائز ہے۔ زائد بالوں کو کاٹنا واجب ہے جیسے کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ چوتھی دلیل یہ کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کے علاوہ تمام تابعین کا طریقہ بھی یہی رہا۔ چنانچہ شرح العنایہ جلد دوم صفحہ نمبر ۷۶ پر ہے۔ وَيُقْطَعُ مَا وَرَاءَ الْقَبْضَةِ - وَبِهِ اَخَذَ اَبُو حَنِيْفَةَ وَاَبُوْ يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ۔ ترجمہ اور مٹھی سے زیادہ داڑھی کاٹی جائے اور اسکو اختیار کیا۔ امام اعظم تابعی اور امام یوسف تبع تابعی اور امام محمد تبع تابعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے۔ اور مرقات شرح مشکوٰۃ ملا علی قاری نے بحوالہ احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۶۳ پر فرمایا۔ اِنْ قَبَضَ الرَّجُلُ عَلٰى لِحْيَتِهٖ وَاَخَذَ مَا تَحْتَ الْقَبْضَةِ فَلَا بَاْسَ بِهٖ وَقَدْ فَعَلَهُ ابْنُ عُمَرَ وَجَمَاعَةٌ مِّنَ التَّابِعِيْنَ وَاسْتَحْسَنَهُ الشَّعْبِيُّ وَابْنُ سِيْرِيْنَ (الخ)۔ ترجمہ اگر مسلمان نے اپنی داڑھی کو ناپا اور مٹھی سے نیچے والے بال کاٹ دیئے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور بے شک حضرت ابن عمر اور تابعین کے بڑے گروہ نے ایسا ہی کیا۔ اور اس کاٹنے کو شعبی اور ابن سیرین نے اچھا جانا۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ اسلامی داڑھی ایک مٹھی بھر ہے نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ پانچویں دلیلِ عقلی ہم سب پر بحیثیت مسلمان ہونے کے فرض ہے کہ صرف اور صرف آقائے دوعالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع کریں۔ نبی کریم رؤف ورحیم کے اقوال و افعال سے ہٹ کر کسی پیر، فقیر، استاد، عالم، مولوی یا ماں باپ دادا کا راستہ اختیار کرنا۔ سراسر بے دینی و گمراہی ہے۔ خواہ اقوال میں ہو یا کردار میں معاشرے میں ہو یا تہذیب میں۔ شکل و صورت میں ہو یا سیرت و اخلاق میں۔ ہمیں صرف اسوۂ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کو مشعلِ راہ بنانا چاہیئے۔ چونکہ نبی کریم علیہ التحیۃ والسلام نے صرف ایک مٹھی داڑھی رکھی۔ نہ کبھی کم کی اور نہ کبھی زیادہ ہونے دی۔ اسی کی اتباع عام صحابہ کرام اور تابعین، تبع تابعین بلکہ آج تک تمام بزرگانِ اسلام کرتے چلے آئے۔ کسی تاریخ یا روایت سے ثابت نہیں کہ کسی بزرگ کی داڑھی مقدس حدِ شرع سے کم یا زیادہ ہو۔ بلکہ ظاہر کلام سے جس طرح یہ ثابت ہوا کہ لمبی داڑھی کو مٹھی تک کم کرنا واجب ہے۔ اسی طرح ایک مٹھی سے کم کرانا بھی حرام ہے۔ چنانچہ شرح قوت المغتذی برحاشیہ ترمذی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۰۰ پر ہے قَالَ الشَّيْخُ فِى اللَّمْعَاتِ وَالظَّاهِرُ مِنْ كَلَامِهِمْ۔ حُرْمَةُ حَلْقِ اللِّحْيَةِ۔ ترجمہ۔ روایات مطہرات کے ظاہر کلام سے داڑھی منڈانے کی حرمت ہی ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنے پیر یا استاد یا کسی مجذوب فقیر کی دیکھا دیکھی داڑھی مونچھ یا فقط داڑھی لمبی کر لیتے ہیں وہ سخت فاجر فاسق ہیں۔ اسی طرح داڑھی کترانے یا منڈانے والے بھی فاسق مُعلن ہیں۔ چھٹی دلیلِ عقلی۔ دیگر قوانینِ اسلامیہ کے علاوہ ایک اہم اور ضروری قانون یہ بھی ہے۔ کہ معاشرے کے ہر پہلو میں مسلمان کو کافر مشرک کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ خاص کر علامتی نشانات میں تو

بہت ہی ضروری ہے۔ کہ مسلمان کافر سے ممتاز و متفرق رہے۔ اسی لیئے اکثر احادیث میں خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ کے کلماتِ طیّبات ملتے ہیں۔ مدنی تاجدار شہنشاہ عرب و عجم سلطانِ ارض و سما کی پیاری تعلیمات کو بغور دیکھنے سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ شکل و شباہت، سیرت و صورت، عبارت و ریاضت، لباس و گفتگو، رہن سہن غرض کہ تمام شعبۂ حیات میں۔ مسلمانوں کو کفار و مشرکین سے یکسر علیحدہ رہنے کے سبق سکھائے گئے۔ کہ اس میں قوم کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔ تو چونکہ داڑھی بھی بہت بڑا نشان تھا۔ اس لیئے اس میں بھی حد بندی اتنی ہی ضروری تھی۔ جتنی دیگر فرائض ہیں۔ عالمِ کفر کی تہذیب پر جب نگاہ ڈالی جائے تو دیگر رسموں کی طرح داڑھی کی بھی ہر قوم میں مختلف رسم ہے۔ چنانچہ مجوسی بالکل داڑھی مونچھ پر استرا پھیرتے ہیں۔ پارسی دو انگل داڑھی رکھتے ہیں۔ یہودی بہت لمبی داڑھی اور مونچھیں بالکل چھوٹی رکھتے ہیں، ہمارے علاقے کے مرزائی برش مار کہ صرف ٹھوڑی پر مختصر۔ اکثر مذہبی عیسائی بالکل چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھتے ہیں۔ انگریز، کفار اور ہندو داڑھی منڈاتے ہیں اور مونچھیں ہندو بڑی رکھتے ہیں انگریز بالکل چھوٹی مختلف نمونوں کی مونچھیں رکھتے۔ اور بدہ مذہب والے کافر بالکل فارغ البال ہونے کا طریقہ اپنائے ہوئے، اور سکھ مونچھیں اور داڑھی دونوں بہت زیادہ لمبی رکھنے کے قائل ہیں۔ ان رسومات کے ہوتے ہوئے لازمی بات تھی کہ مسلمان کی داڑھی ایسے شاندار اور نرالے طریقے سے ہوتی۔ کہ قوم بلحاظ داڑھی بھی سب سے ممتاز نظر آتی۔ اس پیارے غیب دان آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قیامت تک کے سارے حالات سے خبردار ہوتے ہوئے مسلمان کی داڑھی کا ایسا پیارا نقشہ کھینچا۔ کہ حسنِ کائنات سارا اسی میں سمٹا معلوم ہوا اور ملائکہ عرشِ بریں پکار اٹھے:۔ سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحَاءِ وَالنِّسَاءَ بِالْقُرُوْنِ ؎

یہ حدیث کنوز الحقائق حاشیہ جامع صغیر جلد اول بحوالہ مستدرک حاکم صفحہ نمبر ۱۶۴ اور ہدایہ چہارم صفحہ نمبر ۴۸۵ پر ہے۔ ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی داڑھی مبارک سے اور عورتوں کو سر کے بالوں سے اور چٹیا سے۔ یہ کونسی داڑھی تھی جس سے جمالِ انسانی حاصل ہوا یہ کون سا نقشہ تھا جس سے تسبیح ملائکہ کا شور بلند ہوا۔ یہ وہی اور بس وہی نقشۂ جمال تھا جو وَالضُّحٰی کی وجاہت والے مَا زَاغَ کی پھبن والے نور نے چہرۂ وَالشَّمْس پر ابھار کر اَلَمْ نَشْرَحْ کے سینے پر مزین فرما کر پکارا۔ کہ آؤ اے کائنات والو کدھر بھاگے جاتے ہو کس کے نقشِ قدم کے متلاشی ہو:۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (الخ) ؎ ترجمہ: اگر تم اپنے خالق مالک اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میرے نقشِ قدم پر چلو۔ میری سیرت اور میری اسوۂ حسنہ اختیار کرو۔ یہی وہ نقشہ ہے جس میں نہ افراط جائز اور نہ تفریط اسی نقشۂ ریشِ پاک کے ذریعے مسلمان عالمِ کفر و شرک سے فی البدیہہ جدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی برابر داڑھی شریف خود بھی اختیار فرمائی اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا:۔ سو تو بن دلیل۔ جتنا گناہ اور عذاب داڑھی منڈانے پر ہے اتنا ہی گناہ اور عذاب داڑھی

کترانے پر ہے۔ چنانچہ ہدایہ جلد اول صفحہ نمبر ۲۲ پر ہے:۔ وَلَا يَقُصُّ لِحْيَتَهٗ لِاَنَّهٗ فِيْ مَعْنَى الْحَلْقِ۔ ۵
ترجمہ: کوئی مسلمان داڑھی نہ کترائے اس لیئے کہ داڑھی کترانا بھی منڈانے کی مثل ہے۔ آٹھویں دلیل: چونکہ داڑھی
فرائضِ اسلامیہ میں شامل ہے اور ہر فرض ہر لحاظ سے معیّن و مقرر ہوتا ہے۔ اس لیئے داڑھی کو بھی چار انگل کی
طوالت پر مقرر کر دیا۔ اب جس طرح پنج وقتہ رکعات فرائض میں کسی مسلمان، عالم، جاہل، پیر، مرید کو نہ کمی بیشی
کا اختیار ہے اور نہ نہ پڑھنے کا۔ بلکہ کمی بیشی کرنے والا بھی عذاب کا مستحق اور نہ پڑھنے والا بھی۔ اسی طرح داڑھی
کی حدِ شرعی میں بھی نہ کمی بیشی کا کسی کو اختیار ہے اور نہ نہ رکھنے کا۔ بلکہ تارکِ لحیہ بھی فاسق اور گناہگار اور مٹھی
بھر سے کم رکھنے والا بھی فاسق۔ بس ایک مٹھی داڑھی حدِ شرعی ہے۔ خیال رہے کہ مٹھی اور چار انگلیوں کی پیمائش
ٹھوڑی کے نیچے سے شروع ہوگی نہ کہ ہونٹ سے۔ جیسا کہ بعض قاصرِ لحیہ شرارتی لوگ نیچے کے ہونٹ سے ناپ کر
دو انگلیوں کو چار انگلی بنا دیتے ہیں چنانچہ فتح الباری شرح بخاری جلد دوم اسی کَانَ ابْنُ عُمَرَ والی سابقہ مذکورہ
حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:۔ كَانَ ابْنُ عُمَرَ يُمْسِكُ مِنْ اَسْفَلِ ذَقْنِهٖ بِاَصَابِعِ الْاَرْبَعَةِ (الخ) ۵
ترجمہ: حضرت ابن عمر اپنی داڑھی مبارک کو ٹھوڑی کے نیچے سے چار انگل کے ذریعے ناپتے تھے۔ اور فتاویٰ فتح
القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے:۔ وَمِنْ لِحْيَتِهٖ مَاهُوَ اَسْفَلُ مِنَ الذَّقْنِ ۵ ترجمہ اور داڑھی
ذقن کے نیچے سے شروع ہے۔ دلیل نہم: داڑھی کے منڈانے اور کترانے پر قرآن و حدیث اور فقہ میں عذاب و سزا
کی بہت سی دینی، دنیاوی وعیدیں آئی ہیں۔ حالانکہ وعید مستحب یا سنت فعل و حکم پر نہیں آتی۔ چنانچہ فتاویٰ فتح القدیر
شرح ہدایہ جلد ہشتم صفحہ نمبر ۸۵ پر ہے:۔ فَاِنَّ تَارِكَ الْوَاجِبِ يَسْتَحِقُّ الْعُقُوْبَةَ بِالنَّارِ وَتَارِكَ السُّنَّةِ
لَا يَسْتَحِقُّهَا بَلْ يَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَةِ ۵ ترجمہ: اور بے شک واجب کا تارک اخروی عذاب
کا مستحق ہوتا ہے۔ اور سنت کا تارک عذاب کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ محرومیِ شفاعت کا مستحق ہے۔ پہلی وعید
جو داڑھی منڈانے اور بے تحاشا بڑھانے والے کے لیئے قرآن کریم میں وارد ہوئی سورۃ نساء، آیت نمبر ۱۱۵ پارہ
نمبر ۵ پر ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۵ ترجمہ: اور کائنات میں جو بھی ہمارے رسول کی
مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ ہدایت اس کے لیئے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل سے بالکل
ظاہر ہوگئی، اور اتباع کرے مومنوں کے راستے کے علاوہ کی۔ تو دنیاوی عذاب یہ ہے کہ ہم اس کو آزاد چھوڑ دیں گے۔
اور اخروی عذاب یہ کہ ہم اس کو جہنم میں ڈالیں گے وہ برا ٹھکانہ ہے۔ اِس وعید اور جھڑک میں غلط قسم کی داڑھی
والے بھی شامل ہیں، دو وجہ سے ۱۔ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ ط والی آیت میں ثابت کیا گیا کہ داڑھی رکھنا بھی
ہدایت انبیاء ہے اور یہاں بھی تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى۔ کا ہی جملہ ہے اِقْتَدِهْ والی آیت مکی ہے پہلے نازل ہوئی۔

اور یہ مدنی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں ہدایت سے مراد ہے وہی ہدایت جس کا وہاں ذکر ہوا۔ اور اس میں تو داڑھی شامل۔ لہٰذا یہاں وعید میں بھی داڑھی غلط کرنے والا شامل ہے۔ ۲ داڑھی منڈانا تغیرِ خلق اللہ ہے اور شیطانی امر ہے۔ اسی لیے یہ آیت اور فَلَیُغَیِّرُنَّ والی آیت ایک دم نازل ہوئیں۔ یہ آیت نمبر ۱۱۵ ہے اور وہ آیت نمبر ۱۱۹ ہے۔ جب تغیر میں داڑھی منڈانا شامل ہے تو مَن یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ۔ والی آیت میں بھی داڑھی منڈانے والا شامل ہے:: دوسری وعید جو حدیث پاک میں وارد ہوئی۔ چنانچہ طبرانی شریف او جامع صغیر صفحہ نمبر ۱۸۲ پر ہے۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ فَلَیْسَ لَہٗ عِنْدَ اللّٰہِ مِنْ خَلَاقٍ ٭ ترجمہ۔ جو مسلمان بالوں کا مثلہ کرے تو اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔ یعنی اس کے لیے جنت کا انعام نہیں ہے۔ پہلے مجمع البحار کے حوالے سے ثابت کر دیا گیا۔ کہ بالوں کا مثلہ کیا ہے۔ مزید وضاحت سنیئے۔ حاشیہ سراج المنیر جلد سوم صفحہ نمبر ۳۶۲ پر ہے:۔ مَثَّلَ بِالشَّعْرِ اَیْ جَعَلَہٗ مُثْلَۃً بِاَنْ نَتَفَہٗ اَوْ حَلَقَہٗ مِنْ نَحْوِ خَدِّہٖ وَالْمُرَادُ اِنْ لَتَّہٗ شَعْرَ لِحْیَتِہٖ ٭ (ترجمہ) ترجمہ۔ بالوں کا مثلہ یہ ہے۔ کہ رخساروں کے بال نوچے یا مونڈے اور مراد اپنی داڑھی کے بالوں کو ختم کرنا ہے۔ قانونِ زینت کے اعتبار سے مثلہ انتہائی ذِلّت کا سبب ہے۔ اگر کسی کو کانا یا اندھا یا نکٹا کر کے چھوڑ دیا جائے تو یہ اس کی کتنی ذلت ہے۔ اسی طرح پہلے زمانے میں داڑھی مونڈ دینا انتہائی ذلت سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب یہی ذِلّت فیشن بن گئی۔ آئندہ نہ معلوم کیا کیا ہونے والا ہے۔ اگر کسی زمانے میں ناک کٹا نا فیشن بن جائے، یا اندھا، کانا ہونا زینت میں شمار ہونے لگے۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے ایسے مفکّرین و مصنّفین اگر پیدا ہوتے رہے۔ تو یہ دن بھی دور نہیں۔ خدا سب کو عقلِ سلیم اور سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ بخاری شریف جلد دوم ص۸۰ پر ایک اور حدیث پاک اس طرح ہے وَ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰہُ الْمُتَشَبِّہِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ :۔ ٭ ترجمہ: نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لعنت فرماتا ہے۔ ان مردوں پر جو خود کو عورتوں سے مشابہہ کریں۔ اور داڑھی منڈانا بھی مشابہتِ زناں ہے:۔ تیسری وعید جو قانونِ فقہاء کرام میں وارد ہے وہ یہ ہے کہ داڑھی منڈانے یا کترانے یا مٹھی بھر سے زیادہ لمبی رکھنے والے کو قوم کا امام بنانا ناجائز ہے۔ اگر ایسا شخص مصلّٰہ امامت پر کھڑا ہو تو اس کو فوراً ہٹا دیا جائے۔ اور اگر اس کے پیچھے کسی نے نماز پڑھ لی ہو تو اس کو لوٹانا واجب ہے۔ یہ حکم اور مصلیٰ سے ہٹایا جانا انتہائی ذلّت ہے۔ کیونکہ امامتِ اسلامی دین و دنیا کی انتہائی عزّت کا نشان ہے۔ جس سے داڑھی منڈانے والا یکسر محروم ہے۔ اگرچہ عالمِ وقت یا علّامۂ زماں یا پیرِ طریقت ہو۔ اس لیئے بے تحاشہ لمبی داڑھی اور چھوٹی داڑھی والا شرعاً فاسق ہے اور فاسق کو ذلیل کرنا واجب ہے۔ اس کو دینی لحاظ سے کوئی درجہ دینا گناہ ہے۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد دوم صفحہ ۶۶ پر ہے۔ بِخِلَافِ الْفَاسِقِ فَاِنَّہٗ

اِسْتَظْهَرَ فِي شَرْحِ الْمُنْيَةِ اَنَّهَا كَرَاهِيَةُ تَحْرِيْمٍ لِقَوْلِهِمْ وَاَنَّ فِي تَقْدِيْمِهِ لِلْاِمَامَةِ تَعْظِيْمُهُ وَقَدْ وَجَبَ عَلَيْنَا اِهَانَتُهُ - بَلْ عِنْدَ مَالِكٍ وَّرِوَايَةً عَنْ اَحْمَدَ لَا تَصِحُّ الصَّلٰوةُ خَلْفَهُ ؕ - (ترجمہ) بخلاف فاسق گناہگار کے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی شرح منیہ میں ظاہر کیا۔ تمام فقہاء اسلام کے فرمان کی وجہ سے۔ کیونکہ بے شک فاسق فاجر کو امام بنانے اور مصلیٰ پر آگے کرنے میں اُسکی عزت افزائی ہے۔ حالانکہ ہم مسلمانوں پر واجب ہے اس کی ذلت کرنا۔ بلکہ امام مالک کے نزدیک بھی اور ایک روایت امام احمد سے ہے کہ فاسق کے پیچھے بالکل نماز جائز نہیں۔

یہ تھے وہ دلائل جن سے بطریقہ احسن واتم داڑھی کی فرضیت اور حد شرعی ثابت ہوئی۔ محض اتمام حجت اور آپ کی تسکین خاطر کے لیے یہ مختصر فتویٰ ارسالِ خدمت ہے۔ ورنہ اس کے دلائل اور بھی ہیں۔ یہ شیطانی فعل سب سے پہلے شیطان ابلیس نے قوم لوط کے بدکاروں کو سکھایا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بچہ اور امرد ظاہر کرنے کے لیئے داڑھی اور مونچھ صفائی کرانی شروع کی۔ بعض بڑوں سے سنا گیا ہے کہ بال صفا پاؤڈر بھی انہوں نے ہی ایجاد کیا ہے۔ اور اپنی مونچھوں اور داڑھیوں کے لیئے طرح طرح کی دوائیوں کو ایجاد کیا۔ پھر بعض لوطیوں نے مونچھوں کو کٹانا چھوڑ دیا اور داڑھی بدستور منڈتی رہی۔ ان سے مجوسیوں اور پارسیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ پھر ان سے ہندؤں اور ہندؤں سے مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم پارہ نمبر ۱۷ صفحہ نمبر ۷۲ سورۃ انبیاء آیت نمبر ۷۵ پر ہے:- عَنِ الْحَسَنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرُ خِصَالٍ عَمِلَتْهَا قَوْمُ لُوْطٍ بِهَا اُهْلِكُوْا اِتْيَانُ الرِّجَالِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا الخ - وَضَرْبُ الدُّفُوْفِ وَشُرْبُ الْخُمُوْرِ وَقَصُّ اللِّحْيَةِ وَطُوْلُ الشَّارِبِ ط

ترجمہ: حسن سے روایت ہے کہ فرمایا سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دس خصلتیں جو قوم لوط نے کیں اور جن کی وجہ سے وہ ہلاک کیئے گئے وہ یہ ہیں۔ ۱ لواطت کرنا وغیرہ وغیرہ ۶ ڈھول باجہ بجاتے رہنا مثلاً قوالی وغیرہ اور شرابیں پینا۔ ۷ داڑھیاں منڈانا ۸ مونچھیں لمبی کرنا ۹ ریشم مردوں کو پہننا ۱۰ کبوتر بازی۔ بہرحال دلائل کثیرہ سے واضح اور ثابت ہوگیا کہ داڑھی مشت بھر رکھنی فرض ہے۔ اور کٹوا کر کم کرنا یا بالکل منڈوانا کفار کا طریقہ اور باعث عذاب۔ قرآن وحدیث کے ان دلائل واحکام اور فقہاء امت کے فرمودات کو دیکھ کر اور میرے اس فتوے کو پڑھ کر اگر اب بھی اے مسلمانوں عبرت نہ پکڑو اور عمل نہ کرو۔ تو بتاؤ اب کس چیز کا انتظار ہے۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ؕ

ترجمہ: قرآن پاک جیسے آخری کلام کے بعد اب کس بات پر ایمان لاؤ گے۔ :- مسئلہ - امام مسجد پر امامت کیلیئے اشد لازم ہے کہ چار انگل داڑھی ہو کٹی ہوئی نہ ہو۔ بعض فاسق امام اور حافظ لوگ ماہِ رمضان میں توبہ کر لیتے ہیں کہ ہم آئندہ داڑھی نہ کٹائیں گے اور تراویح پڑھا دیتے ہیں عوام انکی توبہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ یہ توبہ غلط ہے اگر سچی توبہ بھی ہو تب بھی جب تک پوری داڑھی نظر نہ آئے امامت نہیں کرا سکتا۔ کیونکہ فسق ظاہر ہے اور توبہ پوشیدہ۔ فاسق کی امامت اسلیئے منع ہے کہ فسق سے اللہ رسول کو ایذا ہے مشکوٰۃ شریف صلا پر ہے کہ نبی کریم نے ایک ایسے امام کو امامت سے

ہٹا دیا جس نے کعبے کی طرف منکر کے تھوکا تھا اور نبی کریم کو اس فعل سے دکھ پہنچا تھا تو داڑھی منڈانا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم

کتبہ

سیّد اور بنی ہاشم کون ہیں، بلوچ حضرت حمزہؓ کی اولاد نہیں کیونکہ حمزہؓ کی نسل نہیں چلی، کیا حضرت علیؓ سیّد ہیں

سوال نمبر ۹ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہماری بستی میں دو شخصوں کا اس مسئلہ پر جھگڑا ہوا کہ زید کہتا ہے کہ حضرت علی سید ہیں اور آپ کی ساری اولاد جو فاطمہ زہرا کے علاوہ دوسری چار بیویوں سے پیدا ہوئی وہ ساری اولاد بھی سید ہے جن کو ہماری اصطلاح میں علوی کہا جاتا ہے :۔ خالد کہتا ہے کہ حضرت علی سید نہیں اور حضرت علی کی علوی اولاد جو امام محمد بن حنفیہ وغیرہ سے چلی وہ بھی سید نہیں سید صرف حضرت امام حسن اور امام حسین کی اولاد کو کہتے ہیں۔ زید بھی اہلسنت ہے اور پیری مریدی کرتا مگر شیعوں سے بھی صحبت رکھتا ہے ہمیں فتوٰے عطا فرمایا جائے کہ کس کی بات درست ہے :۔ کیا حضرت علی اور آپ کی علوی اولاد کو سید مانا جائے یا نہیں براہِ کرم مدلّل فتوٰے عطا فرمایا جائے ہم سب بستی والوں نے متفقہ طور پر آپ کے فتوٰی کے مطابق فیصلہ کرنا ہے، ۲ کیا بلوچی لوگ حضرت حمزہ کی اولاد ہیں

المستفتی محمد اکبر علی نزد گورنمنٹ سکول دولت نگر ضلع گجرات

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

صورتِ مسئولہ میں قانون شریعت کے مطابق زید کا قول غلط ہے خالد صحیح کہتا ہے۔ موجودہ شرعی اصطلاح میں سید صرف حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْهُمَا کو اور اُن کی تا قیامت اولاد کو کہا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ کسی صحابی کی اولاد کو سید نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ صدیق اکبر کی اولاد ہو یا فاروق اعظم کی۔ عثمانِ غنی کی اولاد ہو یا مولا علی مشکل کشا کی رضی اللہ تعالٰی عنہم اجمعین۔ زید کا یہ کہنا کہ حضرتِ علی سید ہیں اور آپ کی اولاد علوی سید ہے۔ قطعاً غلط اور خلافِ حقیقت و درایت و روایت ہے عقلاً نقلاً بھی یہ بات کہیں ثابت نہیں۔ خالد کی یہ بات کہ سادات کی نسل امامین کریمین طیبین طاہرین سے چلی۔ بالکل درست ہے

اور اس کے بہت سے دلائل ہیں۔ ہم نقطہ اہلسنت کے عقائد کو ظاہر و ثابت کرنے کے لیئے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں میری اِس ساری تحریر کا روئے سخن فقط وہ سنی دانشور ہیں جو مزاجِ فہمیدہ رکھتے ہیں۔ یا وہ لوگ ہیں جو ظاہراً تو سنی ہیں مگر مائل بر رفض ہو چکے ہیں۔ لیکن شیعہ حضرات۔ تو اُن سے خطاب نہیں کہ وہ تو اگر حضرتِ علی کو خدا بھی کہہ دیں تو کیا بعید ہے بلکہ اُن کا ایک فرقہ نصیریہ موجودہ بارہ امامیہ تو علی الاعلان علی رب کا نعرہ لگاتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق کوئی علوی سیّد نہیں ہے۔ نسلِ سادات صرف حسنؓ و حسینؓ سے چلی رضی اللہ تعالٰے عنہما۔ اس مسلک پر گیارہ دلائل ہیں :۔

دلیلِ اوّل :۔ یہ باتِ اظہر من الشمس ہے کہ علومِ معقولات علمِ لغت سب پر مقدم ہے۔ بدیں وجہ الفاظِ مشترکہ میں اوّل معنٰے لغوی ہو گا اسی لحاظ و اعتبار پر باقی معنیٰ کا دار و مدار ہے :۔ عربی کے الفاظِ مشترکۃ المعانی اپنے رواج و اصطلاحات و ضروریات کے تحت بنتے چلے جاتے ہیں مگر بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ لغوی معنٰے کی حیثیت بدرجہ اتم قائم ہے اگر تمام جگہ لغت کی جلوہ گری نہ ہو تو الفاظِ مشترکہ سب غلط ہو جائیں لغوی معنٰے کی اسی اصلیت کی وجہ ہے کہ اندھا دھند کوئی شخص بھی مشترک لفظ نہیں بنا سکتا۔ دیکھو عربی میں لفظِ عین کا لغوی معنٰے اصل۔ حقیقت ہے مگر ضرورت کے مطابق اس کو مشترک بنا لیا گیا اور یہ لفظ چار معنٰے میں مشترک ہو گیا ۱ سورج ۲ گھٹنا پیر کا۔ ۳ چشمہ پانی کا ۴ آنکھ۔ لیکن سب جگہ لغوی ترجمے کا لحاظ قائم ہے چنانچہ سورج کو عین اس لیئے کہا گیا کہ فلکیات میں سب کا نور عارضی عطائی بالواسطہ ہے مگر اس کا نور اصلی ذاتی بلاواسطہ ہے ۲ پیر کے گھٹنے کو عین اس لیئے کہا گیا کہ پیر کی قوت اور رگوں کا اصلی مرکزی مقام یعنی ہیڈ آفس یہی ہے ۳ چشمے کو عین اس لیئے کہا گیا کہ پانی کا اصل مقام یہی ہے نہر بحر اسی سے بنتی ہیں ۴ آنکھ کو عین اس لیئے کہا گیا کہ جسم کی معلوماتی قوتوں کا اندرونی بیرونی اصلی مقام یہی ہے کہ جو علم باہر سے اندر جاتا ہے وہ اسی کے ذریعے جاتا ہے۔ کسی شی کی اصلیت دیکھنے کو معائنہ کرنا کہا جاتا ہے۔ اصل کے مشابہ کو بِعَیْنِہٖ کہا جاتا ہے۔ غرضیکہ ہر جگہ لفظوں پر لغت کی حکومت ہے۔ جب یہ سمجھ لیا تو جان لو کہ لفظِ سیّد کے لغوی معنٰے ہیں۔ مَالِکٌ۔ سَوْدٌ سے بنا ہے۔ بروزن فَیْعَلٌ۔ سَیْوِدٌ تھا۔ واؤ کو یاء بنایا اور یاء کا یاء میں ادغام کر دیا۔ ہو گیا سیّد۔ ضرورتِ کثیرہ کے تحت اس کو بھی مشترک بنا یا گیا۔ پس یہ دس معنٰے میں مشترک ہوا۔ چنانچہ لغت کی مشہور کتاب مجمع البحار جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۱ پر ہے :۔ وَالسَّیِّدُ یُطْلَقُ عَلَی الرَّبِّ وَالْمَلِكِ وَالشَّرِیْفِ وَالْفَاضِلِ وَالْکَرِیْمِ وَالْحَلِیْمِ وَمُتَحَمِّلِ اَذٰی قَوْمِہٖ وَالزَّوْجِ وَالرَّئِیْسِ وَالْمُقَدَّمِ۔

(ترجمہ) :۔ اور لفظِ سیّد بولا جاتا ہے۔ ۱ مربی کے لیئے ۲ مالک کے لیئے :۔ ۳

شریف آدمی کے لیئے ۴ لائق کے لیئے ۵ سردار کے لیئے ۶ بردبار شخص کے لیئے ۷ قوم کے وزیر کے لیئے ۸ خاوند کے لیئے ۹ کریم وسخی کے لیئے ۱۰ مقدم شخص یعنی آگے والے شخص کے لیئے :۔ ان دس ۱۰ معنوں میں پہلا لغوی معنیٰ ہے مالک ۔ باقی نو معنے اسی مالکیت کی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے مشترک ہو گئے ۔ کیونکہ مربی پرورشی انتظام اور مربوب کا مالک زمانۂ تربیت میں مالک ہوتا ہے ۔ شریف شرافت کا ۔ فاضل فضیلت کا ۔ سردار یعنی رئیس قوم ۔ اپنی قوم کے قانون کا ۔ حلیم حلم کا ۔ وزیر رعایہ کا ۔ خاوند بیوی کا ۔ کریم کرم کا ۔ پیشرو مقتدیوں کا مختلف حیثیتوں سے مالک ہوتا ہے ۔ ثابت ہوا کہ لفظ سید اہل عرب کے نزدیک مفرد المعنیٰ نہیں بلکہ مشترک المعنیٰ ہے ۔ لہٰذا جب کبھی یہ لفظ سید ذاتِ باری تعالیٰ کے لیئے استعمال ہو گا تو وہاں لغوی معنے مراد ہوں گے یعنی مالک چنانچہ مشکوٰۃ شریف صـ ۴۱۸ پر ہے باب الفخر فصل ثانی :۔

عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الشِّخِّیْرِ قَالَ اِنْطَلَقْتُ فِیْ وَفْدِ بَنِیْ عَامِرٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا اَنْتَ سَیِّدُنَا فَقَالَ اَلسَّیِّدُ اللّٰہُ (الخ) ترجمہ :۔ روایت ہے مطرف بن عبد اللہ بن شخیر سے ۔ انھوں نے فرمایا کہ بنی عامر کے ساتھ میں بھی آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا کہ تم ہم سب نے عرض کیا کہ آپ ہمارے سید ہیں تو نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔ سید اللہ ہے ۔ یہاں سید بمعنیٰ مالک ہے چنانچہ مجمع البحار جلد دوم صـ ۱۵۱ پر اسی حدیثِ مطہرہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔ فَقَالَ اَلسَّیِّدُ ھُوَ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَوَاصِیَ الْخَلْقِ :۔ (ترجمہ) ! آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو سید کہا اس مقصد سے کہ وہی ہے تمام خلق کی پیشانیوں کا مالک یعنی سب کی گردنوں میں اسی کی ملکیت کی رسی ہے ۔ جب لفظ سید کی نسبت بیوی کی طرف ہو گی یا بیوی کے ساتھ لفظ سید کا ذکر ہو گا تو وہاں ۔ سید کے معنیٰ خاوند ہوں گے :۔ چنانچہ حضرتِ زلیخا کے پہلے خاوند عزیز مصر کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے :۔ وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَا الْبَابِ :۔ ترجمہ :۔ اور پایا ان دونوں نے اس زلیخا کے خاوند کو دروازے کے قریب ۔ یہاں سید بمعنیٰ خاوند ہے ۔ کیونکہ اضافت بیوی کے ساتھ ہے ۔ لیکن جب لفظ سید کی نسبت اور اضافت کسی قوم یا گروہ یا جماعت کی طرف ہو تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے ۔ سردار ۔ جیسے کہ آقائے دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ کہ ابو بکر اور عمر جنتی بوڑھوں کے سردار ہیں ۔ یعنی جو دنیا میں بڑھاپے کی عمر میں فوت ہوئے ۔ سوائے انبیاء کرام کے ۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صـ ۵۶۰ پر ہے

وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ :۔ اَبُوْبَکْرٍ وَّ عُمَرُ سَیِّدَا کُہُوْلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ اِلَّا النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ رَوَاہُ التِّرْمَذِیْ

وَرَوَاہُ اِبْنُ مَاجَۃَ عَنْ عَلِیٍّ ۔ (ترجمہ) ۔ حضرت انس رضی نے فرمایا کہ پیارے آقا نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر رضی اور عمر رضی بجز انبیاء و مرسلین کے باقی تمام اولین و آخرین کے سردار ہیں ۔ اور جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ مشکوٰۃ شریف ص ۵۷۰ باب مناقب اہل بیت فصل ثانی ہے ۔ بِاَنَّ فَاطِمَۃَ سَیِّدَۃُ نِسَاءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَنَّ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ ۔ ترجمہ بے شک فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جنتی عورتوں کی سردار ہیں اور حسن رضی و حسین رضی جنتی جوانوں کے سردار ہیں یا جیسے کہ فرمایا سرور کائنات نے ۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ (ترجمہ) :۔ قوم کا سردار قوم کا خدمت گار ہوتا ہے ۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں ان تمام جگہ سید بمعنٰی سردار ہے ۔ قیامت تک ہر قوم کے ہر پیشوا کو سید کہا جا سکتا ہے مگر نسبت اور اضافت کے ساتھ مثلاً ۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ ۔ سَیِّدُ الْقُرَیْشِ وغیرہ اور جب لفظ سید کسی مُلک کی طرف منسوب ہو تو وہاں حاکم یا بادشاہ یا امیر و منتظم مراد ہوتا ہے ۔ مثلاً اورنگزیب عالمگیر بادشاہ کو سید الہند کہا جاتا تھا بحوالہ اورنگ زیب کے خطوط ص ۱۳۱ فارسی) حاکم شہر کو سید البلد کہا جاتا رہا ۔ اور جب لفظ سید کو ایک یا دو آدمیوں کی طرف نسبت کیا جائے ۔ تو مراد ہوتا ہے ۔ محترم اور کریم ۔ مثلاً یا سَیِّدِیْ ۔ ترجمہ ۔ اے میرے کریم یا اے میرے محترم ۔ یہاں بمعنٰے سردار نہیں ہو سکتا کیونکہ سرداری ایک شخص کے لیئے نہیں ہوتی بلکہ قوم یا گروہ کے لیئے ہوتی ہے ۔ اور جب لفظ سید کی نسبت کسی وقت یا زمانے ۔ یا جمادات کی طرف کی جائے تو سیّد کا معنٰی ہوتا ہے ۔ فاضل یا افضل مثلاً جامع صغیر لامام جلال الدین جلد دوم ص ۳۵ پر آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چند احادیث مروی ہیں :۔ ع ۱ سَیِّدُ الْاَدْھَانِ الْبَنَفْسَجُ ع ۲ سَیِّدُ الْاِسْتِغْفَارِ اَنْ تَقُوْلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ ع ۳ سَیِّدُ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ ع ۴ سَیِّدُ الْجِبَالِ الطُّوْرُ سِیْنَاءَ ع ۵ :۔ سَیِّدُ الشَّجَرِ السِّدْرُ ع ۶ سَیِّدُ الْکَلَامِ الْقُرْاٰنُ ۔ ع ۷ سَیِّدُ اِدَامِکُمُ الْمِلْحُ ۔ : ع ۸ سَیِّدُ الطَّعَامِ اللَّحْمُ ۔ ترجمہ :۔ ع ۱ تیلوں کا سید بنفشہ ہے ع ۲ استغفار کا سید لا الٰہ الا انت ہے ع ۳ دنوں کا سیّد جمعہ ہے ع ۴ پہاڑوں کا سیّد طور ہے ۔ ع ۵ درختوں کا سیّد بیری ہے ع ۶ کلاموں کا سید قرآن مجید ہے :۔ ع ۷ سالنوں کا سیّد نمک ہے ع ۸ کھانوں کا سیّد گوشت ہے ان تمام جگہ سیّد بمعنٰی افضل ہے ۔ چونکہ یہ لفظ سید کثیر معنٰی میں مشترک ہے اس لیئے اس کے استعمال کے لیئے نسبت اضافی بمناسب حال شرط ہے ۔ اور جب کسی شخص کو سیّد کہا جائے کسی اضافت سے تو وہاں سرداری یا احترام یا افضیلت مراد ہوتی ہے ۔ لیکن جب بلا اضافت یا اضافت کلیئے سید کہا جائے تو وہاں نسلی و ذاتی سید مراد ہوتا ہے ۔ اور آپ کی نسل سیّد کہلائے گی جس کو اللہ تعالیٰ

یا اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً سید کہا ہوگا۔ **دلیل دوم**۔ مندرجہ بالا قواعد شرعیہ کے تحت یہ ثابت ہو گیا کہ جب سید کا لفظ مضاف ہو کر کسی کے لیے مستعمل ہو تو وہ نسلی سید نہیں ہوگا بلکہ فقط اعزازی سید ہوگا اور اس اعزاز کی بنا پر اس کی اولاد کو سید نہیں کہا جائے گا۔ لیکن جب لفظِ سید مطلق بولا جائے تو منسوب الیہ نسلاً سید ہوگا یعنی وہ اس کی ذات بن جائے گا اور اس بنا پر اس کی آل اولاد کو بھی سید کہا جائے گا۔ اسلامی شریعت میں تمام خلقتِ انسانی میں ذاتاً و نسلاً سید صرف دو پیغمبرانِ عظام ہیں ایک ہمارے آقا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دوسرے پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام۔ حضرت یحییٰ تو اس لیے کہ قرآن کریم نے ان کو مطلق طور پر سید فرمایا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران آیت ۳۹ پارہ سوم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اَنَّ اللہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللہِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (ترجمہ):۔ (اے ذکریا علیہ السلام) بے شک اللہ تم کو بشارت فرماتا ہے یحییٰ (بیٹے) کی جو اللہ تعالیٰ کے ایک کلمے کی تصدیق کریں گے۔ اور وہ سید ہوں گے۔ اور دائمی عورتوں سے دور رہیں گے اور نیک خاندان میں سے نبی ہوں گے۔ یہاں سیّد ہونے کا مطلب ہے ذاتی نسلی سید۔ اگر حضرت یحییٰ کی اولاد ہوتی تو نسلی سید ہوتے۔ ہمارے اردو مترجمین نے یہاں سید بمعنی سردار لکھا ہے وہ صرف اصطلاحی ترجمے کے لحاظ سے۔ ترجمے کے لیے اس کے سوا کوئی لفظ اردو میں دستیاب نہیں ورنہ سردار کے لیے اضافت شرط ہے۔ اور پھر اگر عقل حقیقی اور عشق شباتی کی نظر سے دیکھا جائے تو ہر نبی ولی دنیا کا سردار ہے پھر یہاں خصوصیت سے حضرت یحییٰ کو فقط سید کیوں فرمایا گیا؟ ماننا پڑے گا کہ حضرت یحییٰ کو ذاتی اور نسلی سید بنایا گیا۔ اور چونکہ ہمارے کریم ورحیم آقا ہمہ صفت موصوف نبی ہیں تو جب آپ صفی اللہ کی صفت سے مصطفیٰ ہوئے۔ سدرہ پر پہنچ کر کلیم ہوئے۔ عرش پر پہنچ کر خلیل ہوئے۔ لِیْ مَعَ اللہِ فرما کر روح اللہ ہوئے:۔ غارِ حرا میں کلمۃ اللہ۔ تو: اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ فرما کر۔ ذاتاً و نسلاً سید ہوئے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صـ۵۱۳ پر ہے:۔ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (الخ) رَوَاہُ مُسْلِمٌ اور مشکوٰۃ صـ۵۱۳ پر یہی حدیث پاک ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے بروایت ترمذی شریف۔ ترجمہ۔ آقائے عالمین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ قیامت کے دن اس کا ظہور ہوگا۔ اس حدیثِ مبارکہ میں اگرچہ لفظِ سید مضاف ہے مگر چونکہ اضافتِ کلیہ ہے لہٰذا اس سے بھی سیادتِ ذاتی و نسلی ثابت ہوئی۔ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ کی قید کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں اِلٰی پوشیدہ ہے۔ دراصل تھا۔ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ۔ یعنی میں قیامت تک

سید ہوں۔ اس طرح کہ میری نسل بھی سید ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ ملا علی قاری لکھتے ہیں مرقات جلد پنجم صہ ۲۵ پر ہے۔ وَالتَّقْيِيْدُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ مَعَ اَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيِّدُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ مَعْنَاهُ اَنَّهٗ يَظْهَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سُؤْدَدُهٗ بِلَا مُنَازِعٍ۔ (ترجمہ) یومِ قیامت کی قید کیوں لگائی باوجود اس کے کہ آپ دنیا و آخرت میں تمام انسانوں کے لیے سید ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کا سید ہونا ظاہر ظہور ہو گا بغیر کسی جھگڑے کے۔ گویا کہ بقول مرقات یہاں یَظْهَرُ فعل پوشیدہ ہے اور دراصل تھا۔ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَظْهَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔۔ لہٰذا بات صاف ہو گئی۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نسلاً سید ہیں اور آپ کی ہی اولاد سید ہے۔ کیونکہ آپ نے خود فرمایا۔ اَنَا سَيِّدٌ میں سید ہوں۔ اور آپ نے کیوں فرمایا۔ اس لیے کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا۔ يٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ۔ اکثر مفسرین کے نزدیک لفظِ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سید۔ چنانچہ تراجم خمسہ میں۔ وَلِیٌّ مِنْ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ حضرت شیخ سعدی شیرازی اپنے ترجمۂ قرآن پاک میں لکھتے ہیں۔ ای سید بقرآن حکیم۔ ترجمہ اے سید قرآن حکیم کی قسم تم مرسلوں سے ہو۔ تفسیر خازن علی اربعۃ تفاسیر جلد پنجم صہ ۱۹۰ پر ہے:۔ (یٰسٓ) قیل یا سید البشر۔ (ترجمہ):۔ کہا گیا ہے کہ لفظِ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سب انسانوں کے سید۔ تفسیر مدارک کے صہ ۱۹۵ پر ہے:۔ وَقِيْلَ يَا سَيِّدُ۔ ترجمہ۔ فرمایا گیا ہے کہ یٰسٓ کا ترجمہ ہے اے سید۔ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صہ ۲۶۵ پر ہے۔ حرف یس اشارت بکلمۂ یا سید البشر یا سید الاولین و الاخرین وحدیث انا سید ولد آدم تفسیر ایں حرف بود۔ ترجمہ۔ حرفِ یٰسین نے اسی طرف اشارہ فرمایا کہ اے تمام بشر اور اولین و آخرین تمام کے سید۔ وہ حدیث اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ اسی لفظ کی تفسیر ہے۔ ثابت ہوا کہ رب کریم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سید بنایا۔ اور کائنات میں آپ کا نام سید ہے۔ خود حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیث پاک میں فرمایا کہ یٰسٓ ہمارا نام ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم صفحہ نمبر صہ ۲۶۵ پر اور تفسیر مدارک علی اربع جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۱۹۵ پر ہے:۔ وَفِي الْحَدِيْثِ اِنَّ اللّٰهَ سَمَّانِيْ بِسَبْعَةِ اَسْمَاءٍ مُحَمَّدًا وَاَحْمَدَ وَطٰهٰ وَيٰسٓ وَالْمُزَّمِّلُ (الخ) ترجمہ۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ فرمایا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں میرے سات نام رکھے۔ ۱ محمد۔ ۲ احمد۔ ۳ طٰہٰ۔ ۴ یٰسٓ۔ ۵ مزمّل۔ ۶ مدثّر۔ ۷ عبد اللہ

ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام کا نام یٰسٓ ہے اور یٰسٓ کا معنے ہے سید۔ اور چونکہ یہاں لفظِ سید مطلق بغیر اضافت آیا لہٰذا آپ بدلیلِ قرآنیہ نسلاً سید ہوئے۔ چونکہ لفظ یٰسٓ نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اسم پاک ہے اس لیے آپ کی جملہ اولاد کو آلِ یٰسٓ بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان

جلد ہفتم صفحہ ۳۶۵ اسی طرح لکھا ہے۔ اور تفسیر روح المعانی جلد گیارہویں پارہ بائیس ۲۲ صفحہ نمبر ۲۱۱ پر ہے:۔
وَهُوَ ظَاهِرُ قَوْلِ السَّيِّدِ الْحِمْيَرِيِّ۔ شعر

يَا نَفْسُ لَا تَمْحَضِيْ بِالْوُدِّ جَاهِدَةً
عَلَى الْمَوَدَّةِ إِلَّا آلَ يَاسِيْنَا ۔

(ترجمہ) اے میرے دل کسی کی محبت میں اتنی محنت مشقت نہ کر سوائے آلِ یٰسین کی محبت کے۔ یعنی دنیا میں صرف سیدوں سے پر خلوص محبت لگا۔ کیونکہ وہی محبت کارآمد ہے۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات میں فقط نبی اکرم ہی اصل سید ہیں۔ اور نسلاً سید آپ ہی ہیں لہٰذا فقط آپ کی نسل ہی سید ہو سکتی ہے:۔

دلیل سوم:۔ جب یہ بات بدلائل ثابت ہو گئی کہ حضور اقدس ہی نسلاً سید ہیں تو یہ بات بھی لازمی ثابت ہے کہ صرف نبی اکرم علیہ التحیۃ والثناء کی اولاد ہی سید ہو سکتی ہے۔ اور آپ کی اولاد ہی قانونِ شریعت میں سید کہلا سکتی ہے۔ شرعی طور پر نبی کریم علیہ السلام کی اولاد حضرتِ امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے چلی اور چونکہ یہ دونوں امامین کریمین طیبین طاہرین حضرتِ فاطمہ بتول الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نمبر ۲ اولاد ہیں اس لیئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اولاد پاک خاتونِ جنت سے چلی۔ چنانچہ۔ خود آقاء کل صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہماری نسل فاطمۃ الزہرا سے چلی۔ چنانچہ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ ۱۶۰ پر ہے:۔ عَنْ مَوْلَى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ أَنَا الشَّجَرَةُ وَفَاطِمَةُ فَرْعُهَا وَعَلِيٌّ لِقَاحُهَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ ثَمَرَتُهَا وَشِيْعَتُنَا وَرَقُهَا (الخ) ! حضرت عبد الرحمٰن ابن عوف کے آزاد شدہ غلام روایت کرتے ہیں کہ میں نے خود سنا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ فرماتے ہیں۔ میں درخت ہوں اور فاطمہ زہرا اس کی شاخ ہیں اور علی مرتضےٰ اس کی پیوند کاری والی شاخ ہیں (جس کو پنجابی میں داب اردو میں لُقاح کہتے ہیں:۔) اور حسن وحسین اس کے پھل اور ہماری نسل کے تا قیامت گروہ اس کے پتے۔ یہاں شیعہ سے مراد یہ آج کل کے نائی تیلی مراثی نہیں بلکہ نسلِ پاک سادات۔ اگرچہ اس حدیث کا متن شاذ ہے اور اس کے ایک راوی اسحاق دُبری صدوق ہیں جو ضعیف ہوتا ہے۔ مگر معناً حدیث صحیح کے درجہ میں ہے۔ اس روایت سے تین چیزیں ثابت ہوئیں ۱ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسل پاک حضرتِ حسن رضی اللہ عنہ وحسین رضی اللہ عنہ سے چلی اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سید ہیں اس لیئے آپ کی ہی نسل تا قیامت سید۔ اب ابد تک جو انسان مسلمان امام حسن یا امام حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہما کی اولاد سے ہوگا فقط وہ ہی سید ہوگا۔ ۲ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت سے ہے کہ فاطمہ زہرا کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ آپ نسل پاک جنابِ مصطفیٰ کی

ایمن ہیں آپ بھی سیدہ ہیں۔ کیونکہ والد سید ہو تو بیٹی بیٹا سید ہو۔ لیکن فاطمہ زہرا کی بیٹی حضرت زینب سیدانی نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم نے صرف حسن و حسین کو پھل فرمایا۔ ع ۳ یہ کہ خاتونِ جنت فاطمہ بتول الزہرا کو جتنے بھی خصوصی فضائل ملے وہ اسی وجہ سے ملے کہ آپ کے بیٹے حسن و حسین ہوئے۔ جو نسلِ نبی اور آلِ نبی کے ابتدائی پھول و پھل ہیں۔ مثلاً حضرتِ سیدہ کے ماتھے پاک سے جنت کی خوشبو ع ۲ تمام جانوں کو حضرت عزرائیل قبض کرتے ہیں مگر حضرتِ سیدہ کی روحِ مقدسہ کو خود جناب باری نے قبض فرمایا۔ (روح البیان جلد سوم ص ۲۵) ع ۳ میدانِ محشر میں جنابِ سیدہ طاہرہ کا بصد اہتمام گزرنا جیسا کہ احادیث و تفاسیر میں مذکور ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار فضائل و مراتب کی وجہ یہی ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فضائل۔ آقائے موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کی دیگر تین صاحبزادیوں کو یہ مراتب حاصل نہ ہوئے۔ حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت کلثوم کے تذکرہ میں یہ فضائل منقول نہیں۔ بس وجہ وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ اگر حضرت فاطمہ کی مذکر اولاد نہ ہوتی تو نہ آپ کی اولاد سید ہوتی نہ آپ کو یہ خصوصی فضائل ملتے۔ اسی طرح اگر دوسری کسی صاحبزادی کی بھی مذکر اولاد ہوتی تو وہ بھی سید ہوتی اور اُن کی اولاد جب تک عالم اجسام میں رہتی نسلی سید ہوتی۔ اور اگر فاطمہ زہرا کے دس بیٹے ہوتے تو دس سے ہی سید نسل چلتی۔ مگر چونکہ شجر نبوت کے صرف دو ہی پھل ہوئے اس لیے۔ عالم دنیا میں صرف حسنی و حسینی ہی سید ہوئے۔ ہاں البتہ جس طرح فاطمہ زہرا نسلاً سادات ہیں اپنے والد مقدس کی وجہ سے اسی طرح جنابِ سیدہ زینب۔ جناب سیدہ رقیہ۔ جناب سیدہ کلثوم بھی نسلاً سادات ہیں۔ کیونکہ بناتِ رسول ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھن اجمعین۔ اسی قانون کے تحت۔ حضرت زینب کی اولاد چونکہ بیٹی ہے اس لیے وہ سید نہیں حضرت زینب کے خاوند اور نبی اکرم کے تیسرے داماد حضرت ابو العاص۔ اُن کی اولاد میں ایک بیٹا علی بن ابو العاص بچپن میں فوت ہو گئے۔ اسی طرح۔ حضرتِ سیدہ ام کلثوم زوجہ عثمان غنی کا ایک بیٹا عبداللہ بن عثمان بھی کنوارے فوت ہوئے غرضکہ نواسۂ رسول میں صرف حسن و حسین ہی صاحب نسل کثیرہ ہیں کیونکہ۔ آقائے کائنات غیب دان کل صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ارشاد فرما دیا کہ میرے پھل صرف حسن و حسین ہیں۔ لہٰذا وہ ہی نسل سادات کے نخلِ اوّلین ہیں۔ ان کے سوا اور کوئی شخص سید نسلی نہیں ہاں سید بمعنے سردار پیشوا امام۔ سب ہی صحابہ کرام ہیں۔ حضرتِ علی شیر خدا مشکل کشا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خاتونِ جنت کے وصال کے بعد۔ نواسیٔ رسولِ پاک جناب حضرت امامہ رضؓ سے نکاح فرمایا۔ جن کے بطن سے حضرتِ علی کے چار بیٹے ہوئے ۱ عثمان رضؓ ع ۲ ابو بکر رضؓ ع ۳ عمر رضؓ یہ سب کربلا میں شہید ہوئے۔ اُن کی نسل نہ چلی۔ حضرتِ علی کی چوتھی بیوی حضرت خولہ کے چوتھے بیٹے محمد بن حنفیہ یعنی ابن علی حنفیہ

ان سے حضرت علی کی نسل چلی جس کو علوی کہتے ہیں۔ خلافتِ صدیقی کے دور میں مسیلم کے قبیلے یمامہ سے جنگ ہوئی۔ اس میں ایک قوم بنی حنفیہ تھی اُن کے قیدیوں میں حضرتِ خولہ بنت جعفر بن قیس گرفتار ہو کر آئیں حبشی النسل تھیں حضرتِ علی کو ملیں آپ نے آزاد کر کے ان کی بیوی بنایا یہ بی بی صاحبہ حضرت علی کی چوتھی بیوی ہیں اُن سے چار بیٹے ہوئے سب سے بڑے بیٹے محمد بن حنفیہ ہیں باقی تین کنوارے فوت ہوئے۔ محمد بن حنفی اپنے چھٹے نانا حنیف کی طرف نسبت رکھتے ہیں (از مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ص۶۱۸ مرقاۃ ہشتم ص۳۵ اشعۃ اللمعات جلد چہارم ص۶۵ اور تاریخ اسلام) حضرت علی کی کل نو بیویاں ہوئی ہیں (اکمال اسماء الرجال مشکوٰۃ شریف)۔ مرقات شرح جلد دوم صفحہ نمبر ص۳۲ پڑھے:۔ وَاُمَامَہ هِيَ اِبْنَةُ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنْتِ اَبِي الْعَاصِ۔ تَزَوَّجَهَا عَلِيٌّ بَعْدَ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ (ترجمہ):۔ امامہؓ بیٹی ہیں سیدہ زینب بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علیِ مرتضٰے کرم اللہ وجہہ نے فاطمہ زہرا کے وصال کے بعد امامہؓ سے نکاح فرمایا:۔

دلیل چہارم:۔ دلائل سابقہ سے یہ تو ثابت ہوا کہ اصلِ سید صرف آقاء کائنات ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن آپ کی نسل میں کون سید ہیں تو خود سرکار مقدس کا ارشاد ہے مشکوٰۃ شریف ص۵۶۹ بروایت بخاری شریف۔ عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ اِلٰى جَنْبِهٖ وَهُوَ يُقْبِلُ عَلَى النَّاسِ مَرَّةً وَعَلَيْهِ اُخْرٰى وَيَقُوْلُ اِنَّ اِبْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ۔ (الخ) ترجمہ ابی بکرہ سے روایت فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ممبر پر تشریف فرما تھے اور حضرت امام حسن آپ کی گود میں تھے۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے کبھی پیار سے حسنؓ کو دیکھتے اور فرماتے کہ بے شک میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اس روایت میں حضرتِ حسن کو بلاقید واضافت سید کہا گیا ثابت ہوا کہ آپ نسلاً سید ہیں ع۲ یعلیٰ بن مرہ سے روایت ہے بروایت ترمذی شریف (مشکوٰۃ صفحہ نمبر ۵۷۱) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ حُسَيْنٍ اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَيْنًا۔ حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ:۔ (ترجمہ):۔ یعلیٰؓ نے کہا کہ فرمایا حبیبِ کردگار صلی اللہ علیہ وسلم نے حسینؓ میری نسل سے اور میں حسینؓ کی اصل سے ہوں جو حسینؓ سے محبت کرے وہ اللہ کا پیارا ہو۔ حسینؓ نسلوں میں سے بڑی عظیم نسل والا ہے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ امام عالی مقام کو سبط فرمایا۔ سبط کا لغوی ترجمہ ہے۔ بہت شاخوں والا درخت۔ (لمعات ص۲ شرح مشکوٰۃ) سبطٌ کی تنوین عوضی ہے۔ دراصل تھا سبطی یعنی یہ حسین میری عظیم نسل کا سبط ہے درخت ہے اور جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سید تو حسین بھی سید اور آن کی تمام اولاد بھی سید۔ کیونکہ سید باپ کی اولاد سید ہے۔ تفسیر خازن علی.

اربع جلد اول صنہ ۲۰۶ پر ہے :- قِيْلَ لِلْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا سِبْطَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :- تفسیر روح المعانی جلد اوّل صنہ ۲۹۵ پر ہے :- قِيْلَ لِلْحَسَنَيْنِ سِبْطَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :- ہر دو عبارات کا ترجمہ - امامین کریمین طیبین امام حسنؓ امام حسین کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل پاک کا سبط کہا گیا۔ بات واضح ہو گئی۔ نبی پاک صاحبِ لولاک علیہ التحیۃ و الصلوٰۃ کی نسل صرف ان ہی دو سے چلی۔ حضور اقدس کی بڑی صاحبزادی زینب تھیں ان کا نکاح حضرت ابوالعاص سے ان سے چھوٹی حضرتِ رقیہؓ ان کا نکاح حضرت عثمان رضؓ غنی سے اِن کی وفات کے بعد ان کی چھوٹی بہن بنت رسولِ پاک سیدہ ام کلثوم کا نکاح حضرتِ ذوالنورین سے۔ اُن سے چھوٹی حضرتِ فاطمہ کا نکاح حضرتِ علی سے ہوا مگر بجز حسن و حسین کسی دخترِ پاک سے نسل نہ چلی۔ اس لیئے سبطِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہی ہیں۔ لہٰذا یہی سید ہیں۔ اور نواسے سے نسل چلنا خصوصیت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور پھر دوسری خصوصیت یہ ہوئی کہ حضرتِ علی کی نسل امامین کریمین سے نہیں چلی کہ بیک وقت ایک شخص سے دو کی نسل محال ہے۔ بدین وجہ آقائے کل صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ حسن کو سید فرمایا - اِن کے علاوہ خلفاءِ راشدین عشرہ مبشرہ کسی صحابی کو مطلقاً بلا اضافت سید نہ فرمایا۔ رہا یہ کہنا کہ سَيِّدُ الْكُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔ صدیق و فاروق جنتی بوڑھوں کے سید وہاں بمعنے سردار ہے جیسے کہ پہلے ثابت کیا۔ اس طرح سے سیادتِ نسل ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے۔ کہ سَيِّدَةُ نِسَاءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ اور سَيِّدُ شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ سے بھی سیادتِ نسلیہ ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہاں بھی بوجہ اضافتِ جزئیہ سید بمعنے سردار ہے۔ چاروں صاحبزادیوں امام حسن و حسین رضی اللہ تعالے عنہم اجمعین کی سیادت یعنی سیّد ہونا آلِ نبی ہونے کی بنا پر ہے۔ کیونکہ آلِ نبی صرف تین صاحبزادے چار صاحبزادیاں اور حسن و حسین ہیں۔ چنانچہ نسیم الریاض جلد سوم صنہ ۵۵۸ پر ہے

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ۔ وَهُمْ نَسْلُهٗ وَ اَوْلَادُهٗ (الخ)

وَقِيْلَ اٰلُ الرَّجَالِ وَلَدُهٗ اَيْ نَسْلُهٗ مُطْلَقًا :- لہٰل لغتہ اہلِ بیت میں ان کے ساتھ امہات المومنین اور حضرت علی بھی شامل ہیں گویا کہ حضرت علی اہلِ بیت میں ہیں آل میں نہیں :-

دلیل پنجم :- امواہب کی شرح زرقانی جلد پنجم صفحہ نمبر صنہ ۲۸۴ پر ہے :-

وَ كُلُّ وُلْدِ اٰدَمَ فَاِنَّ عَصَبَتَهُمْ لِاَبِيْهِمْ مَا خَلَا وُلْدِ فَاطِمَةَ فَاِنِّيْ اَنَا اَبُوْهُمْ وَعَصَبَتُهُمْ رواہ اَبُوْ نُعَيْمٍ عَنْ عُمَرَ بِرِجَالٍ ثِقَاتٍ :- ترجمہ :- ہر انسان کا اصل نسب اُن کے باپ سے ہوتا ہے۔ سوائے فاطمہ زہرا کے۔ کیونکہ اولاد فاطمہ کا باپ میں ہوں اور یہ میری نسل ہے اور میں ہی ان کا اصل ہوں اِن ہی الفاظ کی ایک حدیث شریف فقہ کی کتاب ینابیع جلد اول صفحہ نمبر

ص۲۶۷ پر ہے :- اس سے ثابت ہوا کہ صرف فاطمہ زہرا کی اولاد یعنی امام حسنؓ و امام حسینؓ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اولاد ہیں جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ و اٰلہٖ وسلم کی نسلِ پاک چلی۔ اور چونکہ کائنات میں صرف نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نسلی و ذاتی سید ہیں اس لیے آپ کی اولاد کی ذات ہی سید ہوگی۔ اسی طرح ینا بیع جلد اوّل ص۲۶۶ پر ہے۔

وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللهِ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ جَعَلَ ذُرِّيَّةَ كُلِّ نَبِيٍّ فِيْ صُلْبِهٖ وَجَعَلَ ذُرِّيَّتِيْ فِيْ صُلْبِ عَلِيٍّ :- (ترجمہ)

روایت ہے حضرت جابر سے انہوں نے فرمایا کہ فرمایا۔ آقاءِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی ذریت (اولاد) اُن کی اپنی پشت میں رکھی۔ لیکن میری ذریت۔ (اولاد) حضرت علی کی پشت میں رکھی۔ گویا کہ وہ قانون ہے یہ قدرت ہے۔ اور یہ صلبی ذریت سیدہ زینبؓ بنتِ فاطمہؓ اور امام حسنؓ حسینؓ کی شکل میں صلبِ علی سے منتقل ہو کر بواسطہ فاطمۃ الزاہرا عالمِ ظہور پر جلوہ افروز ہوئی حیاتِ طیبہ میں ہی ظاہر ہوئی۔ باقی ذریت جو بعد وفاتِ فاطمۃ الزہرا صلبِ علیؓ مرتضےٰ سے عالمِ ظہور میں آئی۔ وہ اولادِ علیؓ ہے۔ جس سے نسلِ علیؓ چلی۔ اس اولاد کا نبی کریم صلی اللہ علیہ و اٰلہٖ وسلم سے نسباً کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اُن کو سید کہنا گناہ ہے۔ کیونکہ یہ نسل تبدیل کرنا ہے اس طرح کہ کسی بھی علوی کو سید کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علوی والد سے ہٹا کر کسی حسنی یا حسینی شخص کو اس کا باپ قرار دینا ہے۔ یہ سخت گناہ ہے۔ پس جس طرح کوئی غیر سید شخص اپنے کو سید کہہ کر یا کہلوا کر مجرم و گناہ گار ہے۔ اسی طرح علوی شخص اپنے کو سید کہہ کر گناہ گار ہے۔ چنانچہ مسلم شریف جلد اوّل کتاب الایمان باب ۲۲ ص۵۷ پر ہے

عَنْ سَعْدٍ وَّ اَبِيْ بَكْرَةَ كِلَاهُمَا يَقُوْلُ سَمِعَتْهُ اُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِيْ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ ادَّعٰى اِلٰى غَيْرِ اَبِيْهِ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ غَيْرُ اَبِيْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ (ترجمہ)

حضرت ابی بکرہؓ اور سعدؓ سے روایت ہے۔ دونوں فرماتے ہیں کہ میرے کانوں نے سنا اور میرے دل نے تصدیق کی کہ پیارے رسول پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص جانتے بوجھتے اپنے کو دوسرے باپ کی طرف نسبت کرے تو اس پر جنت حرام۔ اسی کے اوپر ایک روایت ہے جس میں ہے کہ وہ کافر ہو گیا۔ اندازہ لگاؤ کہ نسل و نسبت بدلنا کتنا سخت شرعی جرم اور اس کا کتنا بڑا نقصان ہے۔ مگر ہمارے نادان دوست اس کو نہیں سمجھتے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک شخص کو خدا نے علوی بنا دیا ہے۔ تو تم اس کو سید بنانے کے پیچھے کیوں پڑ گئے اور کیوں گناہ مول لیا حقیقت تو متغیر ہو نہیں سکتی مگر تم نے اپنا ایمان گڑبڑ کر دیا۔ **دلیل ششم** :- ! قادر و قیوم باری تعالیٰ جل مجدہٗ۔ ہر طرح مختار کل ہے۔

جس طرح چاہے اپنی مخلوق کو پیدا فرمائے۔ جیسے چاہے قانون بنائے۔ جس کو چاہے قانون کے تحت لائے۔ جس کو چاہے قدرت سے نوازے۔ جہاں چاہے نشانِ قدرت کا اظہار فرمائے۔ قانون یہ ہے کہ ہمیشہ باپ سے نسل چلے۔ مگر قدرت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم کی ذریت بنائے۔ آپ کی خاندانی بیٹی حضرتِ مریم کی طرف سے۔ چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے۔ سورت انعام پ آیت نمبر ۸۴-۸۵ میں ہے وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (۸۴) وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۸۵)۔ ترجمہ:۔ اور تحفہ دیا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق اور یعقوب کا ہم نے سب کو قربِ تجلیات کی ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو ابراہیم سے بھی پہلے ہدایت دی تھی۔ اور حضرتِ ابراہیم کی ذریت میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو راہِ قرب کی ہدایت دی ہم اسی طرح نیکوں کو بدلا دیتے ہیں۔ اور ابراہیم کی ذریت (اولاد) میں سے یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو قرب کی ہدایت دی یہ تمام ہی برگزیدہ تھے علیہم السلام۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو ذریت ابراہیم فرمایا۔ حالانکہ آپ کا والد کوئی نہیں والدہ سے نسل چلی۔ ثابت ہوا کہ قدرتِ الٰہی میں والدہ سے بھی نسل چل سکتی ہے۔ اور حضرت ابراہیم کی اولاد میں بیٹی کی وجہ سے شامل فرمایا۔ تو جب ذریتِ ابراہیم اور نسل پاک خلیل بیٹی سے چل سکتی ہے۔ پیارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام شانوں سے ہمہ صفت موصوف ہیں آپ کی نسلِ طیبہ طاہرہ بھی بیٹی سے چل سکتی ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ۔ دخترِ پاک سے نسلِ مصطفیٰ چلا کر شان قدرت کا اظہار کیا ہی اس لیئے گیا ہے تاکہ محبوب کی شانِ رسل ختم الرسل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام انبیاءِ کرام کے معجزات وخصوصیات سے متصف ہو کر تشریف لائے۔ حضرت عیسیٰ کی یہ خصوصیت بھی یہاں آجائے کہ جس طرح خلیل اللہ کی نسل کا ایک حصہ بیٹی سے چلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل بھی آپ کی بیٹی سے چلے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قدرتِ الٰہی کا نشان نہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم کی نسل اور اولاد کی متحملہ مریم کی شرافت علیٰ نساء العٰلمین ہو گئی۔ فاطمہ طیبہ کی شرافت علیٰ نساء العالمین اس سے زیادہ ہو۔ کہ مریمؑ ذریتِ خلیل کی امینہ اور فاطمہؓ ذریتِ حبیب جنابِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امینہ علیہم الصلوٰۃ والسلام اس آیت نے بھی بتایا کہ نسلِ پاک نبی علیہ التحیۃ والثنا صرف خاتونِ جنت سے ہے لہٰذا وہ ہی سید ہے۔ نہ کہ علی واولادِ علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ **دلیل ہفتم**۔ امام ابنِ حجر مکی کے مشہور فتاویٰ کبریٰ جلد چہارم ص۳۷ پر ہے۔ لِاَنَّ مِنْ خَصَائِصِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَوْلَادَ بَنَاتِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْتَسِبُوْنَ اِلَيْهِ - لَا يُكَافِئُهُ اَحَدٌ فَلَا يُكَافِئُهُ لِمَنِ انْتَسَبَ اِلَيْهِ خَاعِبَاءِ

وَالْعَلَوِيُّ مَثَلًا لَيْسَ كُفُوًا لِلشَّرِيفَةِ وَإِنْ كَانَ مِنْ بَنِي هَاشِمٍ ۔ ترجمہ :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات سے ہے کہ آپکی بیٹیوں کی اولاد ہی آپ کی اولاد ہے۔ لہٰذا جب کوئی کائنات میں آپ کا ہم کفو یعنی برابر خاندان نہیں تو تا قیامت آپ کی نسل کا بھی کوئی کفو (برابر کا خاندان) نہیں۔ بجز اس کے کہ سید کا کفو سید ہی ہو۔ پس عباسی خاندان اور علوی خاندان بھی سید کا کفو نہیں اگرچہ ہاشمی سب ہیں۔ امام حجر کی عبارت کے اس مسئلۂ کفو میں اگرچہ مجھ کو کچھ کلام ہے اور اس سے متفق ہونا میرے نزدیک کچھ ضروری نہیں تاہم بتانا یہ مقصود ہے کہ امام ابن حجر علیہ الرحمۃ بھی سادات کو علویوں سے علیحدہ کر رہے ہیں۔ اور اقتضاء ثابت کر رہے ہیں علوی حضرات سید نہیں۔ اسی طرح مولا علی مشکل کشا بھی اگرچہ ہاشمی مطلبی ہیں مگر سید نہیں،

حیران کن بات۔ یہ ہے کہ یہاں تو ہم صرف مولی علی مشکل کشا کے سید ہونے نہ ہونے کی گفتگو میں ہیں یہ بھی بحمدہٖ تعالیٰ مخالفوں سے ثابت نہیں ہو رہا۔ لیکن حیرانی تو اس بات کی ہے کہ رافضی شیعہ لوگ اور شیعہ نواز لوگ مولی علی کے لیئے جو عقیدہ بھی بتاتے ہیں قرآن وحدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ حضرت علی بکعبہ ولادت ہیں مگر کہیں ثابت نہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ علی مرتضیٰ بمسجد شہادت ہیں مگر کہیں ثابت نہیں۔ ولادت ہوئی ہے تو اس طرح کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بحالت طواف درد شروع ہوا تو آپ فوراً اپنے گھر آگئیں۔ وہاں ولادت ہوئی۔ اور شہادت پاک کوفے کی جامع مسجد کے دروازے پر ہوئی۔ امامت علی مرتضیٰ پر تو یہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں یہاں تک حد سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ امامتِ علی کو نبوت سے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ عقیدۃً و حقیقۃً تو ہم اہلسنت بھی مولی علی مشکل کشا کے امام الاولیاء ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اس عقیدت سے قطعِ نظر اگر تحقیق کے میدان میں آکر دیکھا جائے تو قرآن وحدیث سے کہیں بھی امامتِ علی ثابت نہیں۔ بلکہ نامعلوم اس میں حکمت کیا ہے۔ کہ اللہ رسول نے ہمیشہ علیؓ مرتضیٰ کو امامت سے دور رکھا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر مولا علی کو مدینہ منورہ میں کمزور مسلمانوں کی حفاظت کیلئے چھوڑا۔ امامت عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی کے سپرد فرمائی اور اثناء عصر علی مرتضیٰ کو مقتدی بنایا۔ خود علی مرتضیٰ بھی ہمیشہ امامت سے اس طرح دور رہے کہ اب حضرت علی کے ساتھ لفظِ امام سجتا بھی نہیں۔ جیسے کہ حضرات حسن وحسین کے ساتھ یہ لفظ بالکل سج گیا ہے۔ مثلاً امام حسنؓ وغیرہ۔ اگر کوئی شخص امام علی کہہ بھی دے تو اجنبی سا لگتا ہے۔ قانون شریعت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے تین طرح تعلق ہیں۔ ۱ نسباً ۲ سبباً ۳ حسباً۔ نسباً یعنی اولاد ہونے کا رشتہ وہ صرف اب تا قیامت امام حسن وحسین کو ہے۔ لہٰذا دنیا میں دو قسم کے ہی سادات ہیں یا حسنی سید مگر یہ بہت کم ہیں۔ یا حسینی سید یہ ماشاء اللہ بہت زیادہ ہیں۔ بعض بزرگ والد اور والدہ ہر دو کی طرف حسنی وحسینی سید ہوتے ہیں ان کو نجیب الطرفین سید کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت غوث پاک جیلانی رحمۃ اللہ علیہ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد گیارھویں پارہ نمبر ۲۲

سفر جبر سلے پر ہے :- فَقَدْ كَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مِنْ اَجِلَّةِ اَهْلِ الْبَيْتِ حَسَنِيًّا مِنْ جِهَةِ الْاَبِ وَحُسَيْنِيًّا مِنْ جِهَةِ الْاُمِّ (ترجمہ اوپر ہی ہے) کہ غوث پاک جیلانی والد سے حسنی سید ہیں اور والدہ سے حسینی سید ہیں۔ سببی رشتہ سسرالی تعلق کو کہتے ہیں اما مین حسنین کا رشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی ہے اور یہ نسبی اہل بیت ہیں۔ مولا علی شیر خدا کا رشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سببی ہے اور آپ سببی اہل بیت ہیں۔ تیسرا رشتہ نبی کریم سے حسبی ہے حسبی رشتہ مذہبی تعلق کو کہتے ہیں۔ یہ رشتہ ہر سچے مخلص مسلمان کو آپ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے تاقیامت قائم وجاری وساری ہے۔ اللہ تعالی ہمارے اس رشتے کو قائم ودائم فرماوے۔ آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ عَدَدَ شِهٖ وَزِيْنَةِ فَرْشِهٖ مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَعِتْرَتِهٖ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ :- دلیل ہشتم۔ جس طرح لفظ سید بلا اضافت قرآن اور حدیث میں سرورِ کل صلی اللہ تعالی علیہ وسلم اور امام حسن۔ فاطمہ زہرا اور امام حسین کے لیئے ثابت ہے۔ اور جس بنا پر ان آقاؤں کا نسلاً سید ہونا ثابت ہوا۔ اس طرح کی ایک حدیث بھی حضرت علی شیر خدا کے لیئے وارد نہیں۔ ہاں بعض بناوٹی روائتیں روافض نے وضع کرلیں جن کا سہارا لے کر نام نہاد سنی ظاہراً اہلسنت درحقیقت تفضیلی شیعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سید کہنے لگ گئے اور اس کے بعد علویوں کو سید کہنے کا دروازہ کھولا۔ آخری سطور میں ان روائیوں کی وضاحت کی جائے گی۔ مذکورہ فی سوال پیر صاحب بھی یا تو تفضیلی شیعہ رافضی ہیں یا اُن ہی موضوع روایات کو دیکھ کر دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ بہرحال مخالف کی ان کمزور دلائل کی مکمل تردید بھی ضروری ہے۔ دلیل نہم۔ تمام علماء اہلسنت کا متفقہ عقیدہ ومسلک ہے کہ علوی حضرات سید نہیں اس لیئے کہ جب والد ہی سید نہیں تو اولاد کس طرح سید ہوگی۔ ذات بنانا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے کہ بلا دلائل بنانے لگیں۔ پیشوائے اہل سنت ہمارے مقتدا اعلی حضرت بریلوی علیہ الرحمۃ اپنے فتاوی رضویہ جلد دوم باب کفو صفحہ نمبر ۱۱۸ پر فرماتے ہیں کہ سید یعنی آلِ نبی۔ ثابت ہوا کہ سید صرف آل نبی ہی مشہور ومتعارف ہے۔ اور اسی کتاب النکاح باب کفایت فتاوی رضویہ صفحہ نمبر ۱۲۷ پر ایک مسئلے کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ امیر المومنین مولا علی کرم اللہ تعالی وجہہ الکریم نے اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم کہ بطنِ پاک حضرتِ بتول زہرا رضی اللہ تعالی عنہا سے ہیں امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے نکاح میں دیں اور ان سے حضرت زید بن عمر پیدا ہوئے اور امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالی عنہ نسباً سادات سے نہیں۔ (۲) سیدہ عاقلہ بالغہ اگر ولی رکھتی ہے تو جس کفو سے نکاح کرے گی ہو جائے گا اگرچہ سید نہ ہو۔ مثلاً شیخ صدیقی یا فاروقی یا عثمانی یا علوی یا عباسی (الخ)۔ اعلی حضرت پیشوائے اہل سنت کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہوا کہ علوی سید نہیں اور جب علوی سید نہیں تو حضرت علی بھی سید نہیں۔ یہ دلیل انی ہے۔ کسی بھی اہلِ سنت عالِم نے حضرت علی یا اولادِ علی کو سید نہیں کہا۔ دلیل دہم۔ امام اہلسنت حضرت حکیم الامت مفتی اسلام

حضرت مفتی احمد یار خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب الکلام المقبول صفحہ نمبر ۱۸ پر فرماتے ہیں۔
حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ اولاد جو حضرت خاتون جنت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے ہے اسے سید کہتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ اولاد جو دوسری بیویوں کے بطن سے ہے اسے علوی کہتے ہیں۔ سید نہیں کہتے ہیں۔ جیسے محمد بن حنفیہ وغیرہم (الخ) اس عبارت سے مسلک اہلسنت صاف ظاہر ہوا کہ علوی حضرات نسلاً سیّد نہیں۔ دلیل یازدہم: مسلکِ رفض سے کلام نہیں اُن کی اندھی عقیدت میں تو مولیٰ علی کو رب اور الٰہ بھی کہہ دیا گیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک الکفریات) جہاں تک مذہبِ اہلسنت کا تعلق ہے عقل کا بھی تقاضہ ہے کہ بجز اولادِ فاطمہ زہرا طیبہ طاہرہ کوئی بھی سید نہیں چند وجوہ سے ۱ ایک تو یہی قرآن وحدیث کے دلائل جو اوپر بیان ہوئے۔ دوم یہ کہ اگر علوی حضرات بھی نسلی سید ہوں تو آلِ نبی کا امتیازی نشان کیا ہوگا اور اُن کی افضلیت کس طرح ثابت ہوگی۔ اگر مخالف فضیلت نہ مانے برابری مانے تو مولا علی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ماننا پڑے گا۔ حالانکہ یہ کفر صریح ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علی اور ان کی غیر فاطمی اولاد سید نہیں۔ اور جو لوگ حضرت علی کو نسلی سیّد مانتے ہیں وہ بلا دلیل ہیں۔ صرف جوشِ عقیدت کے تحت ایسی بے مذہبی غلطیاں کرتے ہیں۔ مذکورہ فی السوال پیر صاحب کو چاہیئے کہ ایسے عقیدے سے توبہ ورجوع کریں اور صحیح اہلسنت ہونے کا ثبوت اور عقیدہ اپنائیں۔ کیسا خطرناک وقت آگیا ہے کہ جن مشائخ عظام پر سنیت کو ناز تھا۔ وہ پیشوائی کے بجائے بے راہ روی اختیار کر بیٹھے۔ کھاتے سنیوں کا ہیں۔ چندے اور نذرانے اہلسنت سے چھینتے ہیں پلتے ہیں اہل سنت کے دروازوں سے مگر کوئی صاحبزادہ دیوبندیت کی تبلیغ اور دیوبندیت پھیلانے میں لگ گیا۔ کوئی اپنے مریدوں کو رافضی شیعہ کا گرویدہ بنانے لگ گیا۔ اور نام پھر سنی کا سنی۔

شعر

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ہم محبت نواز ہے پھیر ولیوں۔ بغولیوں۔ علی پوریوں کا چرچہ کیا کرتے تھے۔ مگر اب یہ عشق رسول کے مراکز بھی۔ رامپور دیوبند بنایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ہمارے ہیں کسی سے کیا شکایت۔ بس دست بدعا ہوں کہ ان اندھی عقل والوں کو چراغ ہدایت نصیب ہو کہ اپنے اکابر کو دیکھیں۔ دیا اللہ دینِ سنیت کو قائم و مضبوط فرما دام تذویر سے بچا ام وہ روایات جن سے سیادتِ علوی غیر فاطمی کے ثبوت کا دھوکہ کھایا جاسکتا ہے۔ ان کا جواب دینا بھی اشد ضروری ہے کہ اتمام حجت ہو۔ پہلی روایت۔ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ۱۶۷ پر ہے۔ اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَاَبُوْھُمَا خَیْرٌ مِّنْھُمَا۔ ترجمہ۔ امام حسن وامام حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ اور اُن کے والد اُن سے افضل ہیں۔
مخالف اس روایت سے دلیل لے سکتا ہے کہ حضرت علی سیّد ہیں سید سے افضل سید ہی ہو سکتا ہے۔
جواب۔ یہ توجیہہ بالکل غلط ہے چند وجوہ سے اولاً اس لئے کہ اس ساری روایت میں سیادتِ فضیلت

ہی کا ذکر ہے نہ کہ سیادت خاندانی کا۔ کیونکہ یہاں لفظ سید کو مخصوص گروہ جزئی اضافی کی طرف نسبت کیا گیا ہے۔ اس روایت سے تو سیادتِ نسبی امامین کے لیئے بھی ثابت نہیں حالانکہ لفظِ سید اُن کے لیئے صاف مستعمل ہے چہ جائیکہ مولیٰ علی کی نسبی سیادت ثابت ہو۔ دوم اس لیئے کہ یہاں صرف افضلیت کا ذکر ہے یعنی امامین کریمین کی فضیلت یہ ہے کہ وہ جنتی جوانوں کے سردار ہیں اور اُن کے والد کی فضیلت یہ ہے کہ وہ امامین سے افضل ہیں۔ سوم اِس لیئے کہ اس روایت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کوئی جاہل یہ سمجھ جائے کہ سید سے کوئی افضل نہیں ہو سکتا تو غلط ہے۔ کیونکہ نسبی سیّد ہونا یعنی آلِ رسول ہونا جہان بھر کے خاندانوں پر خاندانی شرافت ضرور ہے مگر افضلیت محض سید ہونے سے وابستہ نہیں۔ اس لیے کہ اسلام میں فضیلت اعمال اور قربِ خداوندی سے ہے۔ پس فرمایا جارہا ہے کہ علی شیرِ خدا حسن و حسین سے افضل ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں نسبی سید ہیں۔ مگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نسبی سید نہیں۔ نسبی سید ہونا صرف شرافت کی دلیل ہے۔ خیر اور فضیلت کی دلیل نہیں۔ مسلکِ اہلسنت میں صدیق و فاروق سب سے افضل ہیں اگرچہ نسبی شرافت میں امام حسن و حسین سے کم ہیں۔ اسی طرح ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فضیلت میں تمام صحابیات سے زیادہ ہیں اگرچہ بلحاظ نسبی شرافت کے فاطمہ زہرا سیّدہ رقیہ، سیّدہ زینب۔ سیّدہ اُمِ کلثوم سے کم ہیں۔ ایسے ہی تاقیامت علماء اولیاء غوث و قطب۔ امام اعظم وغیرہ غیر سید اکابر۔ فضیلت میں عام نسبی سادات سے زیادہ ہیں مگر نسبی شرافت میں کم ہیں۔ مثلاً ایک سید نسبی بے عمل بلکہ بدعمل جاہل ہو وہ بھی نسبی شرافت میں غیر سید عالِم وزاہد اور عبادت گزار سے اشرف ہے۔ مگر فضیلت میں عالِم وزاہد ہی برتر ہے۔ ہاں البتہ اس شرافتِ نسبی و فضیلتِ علمی و کرامتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ نسبی سیّد اگرچہ بدعمل ہو مگر اُس کی گستاخی بے ادبی شرعاً جائز نہ ہو گی۔ جس طرح کہ عالِم اگرچہ بے عمل ہو مگر اس کی گستاخی ناجائز۔ اسی طرح عابد وزاہد اگرچہ بے علم ہو مگر کسی موقعہ پر بھی اس کی گستاخی جائز نہیں۔ فقہاءِ کرام کا یہ فرمان کہ قَدْ وَجَبَ عَلَيْنَا اِهَانَتُهٗ۔ (شامی جلد اول ص۶۶) یعنی فاسق کی اہانت واجب ہے۔ وہاں فاسق کے معنیٰ فاسق معلن ہے اور اہانت سے مراد عزت نہ کرنا ہے۔ بہرحال اس روایت کا مقصد اظہارِ افضلیت ہے۔ اس بنا پر وَ اَبُوْهُمَا خَيْرٌ مِّنْهُمَا کہنا بالکل درست ہے۔ مگر نسبی سیادت کے لیئے یہ دلیل نہیں بن سکتی۔ رہی فضیلت تو شرعی طور پر یہ کہنا بھی جائز ہے۔ وَ اَبُوْ بَكْرٍ خَيْرٌ مِّنْهُمَا وَ عُمَرُ خَيْرٌ مِّنْهُمَا۔ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

چوتھی وجہ یہ کہ خود حاکم نے لکھا کہ صحیحین نے اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ بِهٰذِهِ الزِّيَادَةِ۔ ترجمہ۔ یہ حدیث پاک صحیح ہے مگر اس میں زیادتی ہے اِن الفاظ کی یعنی اَبُوْهُمَا خَيْرٌ مِّنْهُمَا۔ کے الفاظ زیادتی اور ملاوٹ ہے۔ لیکن مستدرک حاکم کی اِس محدثانہ جرح کے باوجود میں الفاظ کی صحت کا قائل ہوں۔ دوسری روایت کتاب الاصابہ کے حاشیہ پر مشہور احادیث کی کتاب استیعاب جلدِ سوم

صفحہ نمبر ۳۶ پر ہے شَکَتْ فَاطِمَةُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فَقَالَ لَھَا سَیِّدٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ زَوْجُکِ (ترجمہ) حضرتِ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے خاوند علی مرتضیٰ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ شکایت کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا حضرت سیدہ کو کہ علی سید ہیں دنیا اور آخرت میں تمہارے خاوند۔ اس روایت سے ثابت ہوا کہ حضرت علی سید ہیں اور آپ کی اولاد علوی بھی سیّد ہیں۔ مخالف اپنے گمان میں یہ استدلال کر سکتا ہے۔ جواب۔ مگر یہ گمان قطعاً فاسد ہے۔ اس لیے کہ پہلے ہی قرآن مجید سے ثابت کر دیا ہے کہ جب لفظِ سیّد کا استعمال بیوی کے ساتھ ہو تو وہاں سیّد بمعنیٰ خاوند ہے۔ پس چونکہ فاطمہ زہرا کے لیئے حضرت علی کو سید کہا گیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ روایتِ مقدّسہ کا مقصد یہ ہے کہ اے فاطمہ تم علی کی شکایت کر رہی ہو۔ حالانکہ یہ علی دنیا و آخرت میں تمہارے خاوند ہیں۔ یہاں سیّد بمعنیٰ خاوند ہے۔ اِس لیئے اس روایت سے بھی مخالف کا مدّعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ تیسری روایت۔ مستدرک حاکم میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یَا عَلِیُّ اَنْتَ سَیِّدُ الْعَرَبِ :۔ یعنی اے علی تم عرب کے سیّد ہو۔ یہاں بھی مخالف استدلال کر سکتا ہے کہ ثابت ہوا کہ حضرت علی نسبی سید ہیں۔ جواب۔ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہم نے پہلے بتا دیا کہ جب لفظِ سیّد اضافت جزئیہ سے مستعمل ہو تو نسبی سیادت ثابت نہیں ہو سکتی۔ پس چونکہ یہاں لفظِ سیّد کو ایک مُلک کی طرف منسوب کیا گیا اس لیئے یہاں سیّد بمعنیٰ حاکم ہے۔ یعنی اے علی تم عرب کے حاکم ہو۔ معلوم ہو گیا کہ اس روایت مبارکہ سے بھی خاندانی سیادت ثابت نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر اسی طرح مولا علی کا سیّد ہونا اور اِن کی غیر فاطمی علوی اولاد کا سیّد ہونا بتاؤ گے۔ تو صدیقِ اکبر۔ فاروقِ اعظم۔ اور اِن کی صدیقی۔ فاروقی اولاد تا قیامت کو بھی نسبی سیّد ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اِن کے بارے میں ارشادِ مقدّسہ ہے۔ سَیِّدَا کُھُوْلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ یہ حضرات جنتی اکابر کے سیّد ہیں۔ جب یہاں نہیں مانتے حالانکہ یہ حدیث ہر طرح صحیح و خبر مشہور اور مسلم بخاری میں ہے۔ تو سیّدُ الْعَرَبِ والی روایت جو کہ محدثین کی جرح میں ضعیف ثابت ہو چکی ہے۔ کا غلط مطلب نکال کر صرف حضرت علی کو سیّد کس طرح کہہ سکتے ہو چنانچہ اس روایت کے بارے موضوعاتِ کبیر صفحہ نمبر ۳۴ کا فیصلہ اس طرح ہے۔ حَدِیْثُ سَیِّدُ الْعَرَبِ عَلِیٌّ (الخ) کُلُّھَا ضَعِیْفَۃٌ بَلْ جَنَحَ الذَّھَبِیُّ اِلَی الْحَاکِمِ عَلَیْھَا بِالْوَضْعِ۔ ترجمہ۔ اس قسم کی روائتیں تمام ضعیف ہیں۔ ذہبی نے حاکم کے متعلق پُر زور کہا کہ انہوں نے ایسی روائتیں بنالی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اِن کو صحیح مان کر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سیّد ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے چوتھی روایت دیلمی کی پیش کی جا سکتی ہے۔ اَنَّ الدَّیْلِمِیَّ رَوَاہُ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ قَالَ عَلِیٌّ

قَالَ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَا یَعْسُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَرَفَعَهٗ اِلَی النَّبِیِّ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ یَا عَلِیُّ اِنَّکَ لَسَیِّدُ الْمُسْلِمِیْنَ وَیَعْسُوْبُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (ترجمہ)۔

امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ فرمایا مولیٰ علی نے میں یعسوب المومنین ہوں۔ اور اس روایت کو مرفوع کیا نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کہ بے شک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی یقیناً تم مسلمانوں کے سید اور مومنوں کے یعسوب ہو۔ جواب:۔ یہ روایت اگرچہ اصول حدیث کے لحاظ سے درست ہے۔ مگر مخالف کا منشا حل نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ لفظ سید کو مطلق نہیں فرمایا گیا بلکہ اضافت کیا گیا۔ لفظِ مُسلِمِینَ کی طرف اور اس طرح نسبی سیادت ثابت نہیں ہوتی ورنہ ہر مسلمان اپنے گروہ کا سیّد ہوتا ہے تو وہ بھی نسباً سید کہلانے کا حقدار بن جائے گا۔ اور اس لیئے کہ اس روایت میں لفظِ یعسوب شرح کر رہا ہے لفظِ سید کی۔ یعنی یہاں سیّد بمعنیٰ یعسوب ہے کیونکہ حضرت علی نے خود کو یعسوب کہا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیدالمومنین ویعسوب کہا علی مرتضیٰ نے دونوں الفاظِ القابی کو جمع کر کے اپنے کو یعسوب کہا۔ شیرِ خدا علی مرتضیٰ کی اس طرز کلامی سے پتہ لگا کہ آپ کے نزدیک یہاں سید بمعنیٰ یعسوب ہے۔ اور لفظ یعسوب کا معنیٰ ہے لشکر کش امیر۔ اس لیئے شہد کی مکھیوں کے سردار کو بھی یعسوب کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بھی لشکرِ نحل کو مفید مقام تک ہانکتا ہے۔ پس اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ اے علی تم مسلمانوں کو صحیح چلانے والے امیر قافلہ اور لشکرِ مومنین کے قائدِ اعلیٰ ہو۔ خلاصہ یہ کہ حضرتِ نسلی سیّد نہیں لہٰذا آپ کی اولاد علوی نسلاً سیّد نہیں۔ ہاں دنیاء اسلام میں اوّل مقام تمام اقوامِ عالَم پر سیّدوں کا ہے۔ پھر صدیقی۔ پھر فاروقی۔ پھر عثمانی پھر علوی حضرات سب پر بلند مقام رکھتے ہیں۔ اور ان کا بہر صورت سب مسلمانوں پر احترام واجب ہے۔ ہمارے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ علویوں کا درجہ بوجہ بنی ہاشم ہو کر قربِ نبوت حاصل کرنے کے صدیقی و فاروقی سے برتر ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ۔ مگر نسبی سیّد ہونے کے لیئے شرطِ اول ہے کہ قرآن مجید میں یا حدیث پاک میں صاف صاف بلا اضافت بلا قید سید کہا گیا ہو۔ حضرت علی کے لیئے کہیں بھی ایسی کوئی صحیح معتبر مبرا دعنز روایت نہ ملی۔ رہا روایت مقیدہ کا میّسر ہونا تو یہ کوئی دلیلِ نسب نہیں۔ دن رات اہلِ عرب یا سَیِّدِیْ، سَیِّدُنَا۔ استعمال کرتے ہیں۔ مخالفین نے اپنے مقصد کے حصول کے لیئے یہاں تک دیدہ دلیری کی کہ بناوٹی روایات بھی بنانے سے خوفِ خدا نہ کیا۔ چنانچہ ایسی ہی ایک خود ساختہ عبارت بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر ابن مردویہ روایت کرتے ہیں۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَلِیُّ اَنْتَ سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ ترجمہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی تم تمام اولادِ آدم کے سیّد ہو۔ اور گستاخ رافضی اس سے دلیل لاتا ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیّدِ وُلدِ آدم ہو کر خاندانی اور نسبی سیّد ہوئے تو علیؓ بھی خاندانی سیّد ہوئے

جواب۔ یہ روایت کسی سخت غالی شیعہ نے اپنے گھر سے بنا لی ہے۔ کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اور یہ عبارت چند وجوہ سے قابلِ نفرت ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ کسی محدث نے اس کو نقل تک نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس میں کوئی سند نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ اس میں دو طریقے سے گستاخی ہے۔ ایک یہ کہ اولادِ آدم علیہ السلام میں انبیاءِ کرام بھی ہیں۔ تو کیا علیِ مرتضیٰ اُن کے بھی سید ہیں (معاذ اللہ) اور کیا علی رضی اللہ عنہ کا درجہ رسولانِ عظام سے بڑھانے کا کفریہ فتویٰ ہے۔ دوم یہ کہ اس عبارت سے نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت علی کا درجہ (نعوذ باللہ) نبیِ پاک سے بھی زیادہ ہو جائے۔ اور یہی عقیدہ بہت سے مردودِ دین کا ہے۔ بدبخت ہے وہ پیر یا مرید جو سنی کہلا کر پھر ایسی گستاخ عبارتوں سے دلیل پکڑے اور اندھا دھند بلا سوچے ان عبارتوں کو سینے سے لگائے اور نہ سوچے کہ یہ شیعہ رافضیوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ وہی رافضی نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حضرت علی کو درجہ دیتے ہیں۔ اور اسی کفریہ عقیدے کو پالنے کے لیئے ایسی عبارتیں بناتے رہتے ہیں۔ اہلِ سنت کو ایسی عبارتوں اور ایسوں سے بچنا چاہیئے۔ چوتھی وجہ یہ کہ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ۱۲۴ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا اَبُوالعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ اَحْمَدَ الْمَحْبُوْبِیْ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُعَاذٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبُوْحَفْصٍ عُمَرُ بْنُ حَسَنٍ حَدَّثَنَا اَبُوْعَوَانَةَ عَنْ اَبِیْ بِشْرٍ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ جُبَیْرٍ۔ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَیْنَ سَیِّدُ الْعَرَبِ فَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا۔ اَلَسْتَ سَیِّدَ الْعَرَبِ قَالَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَعَلِیٌّ سَیِّدُ الْعَرَبِ۔ (ترجمہ) مذکورہ بالا سند سے ابوالعباس فرماتے ہیں کہ فرمایا آقاءِ دوجہان نے ایک مجلس میں کہ کہاں ہیں عرب کے سردار۔ اُمُّ المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا آپ عرب کے سردار نہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں اولادِ آدم کا سید ہوں یعنی تمام جہان کا۔ اور علی ملک عرب کے حاکم ہیں۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں لہٰذا یہ حدیث مقدسہ بالکل ہر لحاظ سے صحیح ہے۔ اس نے صاف بتایا کہ علیِ مرتضیٰ سید ولدِ آدم نہیں ہو سکتے۔ ان چار وجوہ سے ثابت ہوا کہ یہ روایت بالکل بناوٹی ہے۔ ورنہ صحیح حدیث کے ساتھ تعارض لازم آئے گا۔ مخالف یہ بھی دلیل دے سکتا ہے کہ چونکہ اہلِ لغت کی بات بھی قابلِ سند ہوتی ہے۔ اس لیئے لغت کی مشہور کتاب لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۳۲۶ پر ہے۔ کہ علوی وہ سید جو مولا علی علیہ السلام سے سوائے بطنِ اطہر حضرت فاطمہ علیہا السلام کے۔ اس عبارت سے بھی ثابت ہوا کہ علوی حضرات سید ہیں۔ اور یہی کتبِ مشہورہ میں بہت سے علوی بزرگوں کے نام کے ساتھ سید کا لفظ لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً۔ ایک مشہور بزرگ ہیں جن کا نام سید احمد علوی ہے۔ جواب۔ یہ سب کمزور دلیلیں اور لایعنی باتیں ہیں۔ دینِ اسلام کا قانون۔ قرآن حدیث ہے۔ اس کے بعد اجماعِ امت اور قیاس و اقوال فقہاء ہیں۔ جب ان سے

ثابت نہیں ہوا تو ادھر اُدھر ہاتھ مار تا پھرتا ہے۔ دیگر اقوال تائید میں تو پیش کئے جا سکتے ہیں مگر مقابلے میں نہیں۔ رہا لغاتِ کشوری کا حوالہ تو دو وجہ سے ہرگز ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اہلِ لغت کی کتب میں سے نہیں۔ اہلِ لغت اہلِ زبان کو کہتے ہیں۔ یہ عجمی لوگ تو اہلِ لسان کے ریزہ چین ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر کی عربی کتب سے نقمہ چینی کر کے کچھ الفاظ جمع کر لیئے اور اپنی کتاب بنا بیٹھے۔ جہاں دل چاہا اپنی مرضی کا مطلب ٹھونس دیا۔ دوم یہ کہ اس کتاب کا مولف تصدق حسین رضوی خود غالی شیعہ بلکہ ہندو نواز ہے اس کا شیعہ ہونا تو اُس کی سوانح کے علاوہ اُس کی اِس ہی پیش کردہ عبارت سے بخوبی عیاں ہے اور ہندو نواز اور کاسہ لیسی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ ایک ہندو مشرک کو اپنے اسی کتاب کے دیباچہ میں۔ آقاء نامدار۔ آقا ممدوح جیسے پُر عظمت لفظ لکھ کر خود کو سید آلِ رسول بناتے ہوئے ایک ہندو مشرک کی گلی کا کتا اور گدھا کہہ رہا ہے اور اپنی اسی کتاب کا نام تیمنًا و تبرکًا آقاءِ نامدار ہندو کے نام نامی سے منسوب کرتا ہے۔ یعنی خبیث ہندو کے نام سے یمن و برکت کے حصول کا دعویدار ہے۔ ایسی بیہودہ حرکات ایک رافضی ہی کر سکتا ہے جن کے دین میں تقیہ جیسے حرکات ہوں۔ رہا یہ کہنا کہ مشہور علوی بزرگوں کے لیئے سید کا لفظ استعمال کیا گیا تو یہ غلط ہے۔ علوی بزرگ خود اپنے کو ہمیشہ علوی ہی لکھتے رہے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا اُن کو شاہ یا سید کہہ دے تو اس کی اپنی بات ہے جو سند نہیں ہو سکتی۔ اور سید احمد علوی غیر معروف شخصیت ہیں۔ لہٰذا ایسی باتیں دلیل نہیں بن سکتیں۔ پانچویں روایت۔ مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ نمبر ١٢٨ پر اس طرح ایک روایت منقول ہے۔ حَدَّثَنَا اَبُو الْفَضْلِ مُحَمَّدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ الْمُزَکِّیْ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ سَلَمٍ حَدَّثَنِیْ حُسَیْنُ بْنُ قُتَیْبَانِیْ عَنْ اَبِی الْحَسَنِ اَحْمَدُ بْنُ خِضْرٍ شَافِعِیٌّ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اسْحَاقَ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ ابْنِ اُمَیَّةَ قرشی بِالسَّاقِمِ۔ عَنْ اَحْمَدَ بْنِ یَحْیٰی بْنِ اِسْحَاقَ حَلْوَانِیٌّ عَنْ اَبِی الْاَزْهَرِ حَدَّثَنَا اَبُوْ عَلِیٍّ مُزَکِّیْ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ زُهْرِیٍّ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمْ۔ قَالَ نَظَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِلٰی عَلِیٍّ فَقَالَ یَا عَلِیُّ اَنْتَ سَیِّدٌ فِی الدُّنْیَا سَیِّدٌ فِی الْاٰخِرِ۔ (ترجمہ) چودہ نفر کی سند والی اس روایت کے راوی حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی طرف دیکھا تو فرمایا کہ اے علی تم دنیا اور آخرت میں سید ہو۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ مولا علی اور آپ کی اولاد نسبی سید ہے۔ جواب۔ یہ روایت دو وجہ سے قابلِ استدلال نہیں ہے پہلی وجہ یہ کہ یہ روایت سنداً ضعیف ہے۔ اس کے بارھویں راوی معمر ہیں۔ اسماء الرجال میں ان کا پورا نام معمر بن محمد ہے۔ اور محدثین کے نزدیک غیر ثقہ راوی ہیں۔ چنانچہ تقریب التہذیب صفحہ نمبر ٣٤٤ پر ہے۔

ترجمہ۔ معمر بن محمد بن عبید اللہ منکر حدیث ہے۔ دسویں درجہ کے کبائر سے ہے۔
دسویں مرتبے کے راوی قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی تقریب کے صفحہ نمبر ص۱۰ پر ہے۔

دسویں مرتبے کا راوی وہ
ہے جس پر علمِ حدیث میں بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ضعف بھی ہوتا ہے۔ اس جرح سے ثابت ہوا کہ یہ روایت ضعیف ہے اور ضعیف روایت پر اعتماد نہیں ہوتا۔ نہ اُن سے دلیل پکڑنی جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ۔ اگر اس روایت کو ہر طرح سے درست اور صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مخالف کا مدّعا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ روایت کا یہ جملہ

بقانون نحو و منطق مرکّب تقییدی ہے۔ کیونکہ فی ظرفیہ تقیید کے لئے آتا ہے۔ اور جہاں حرف جرّ فی ہو تو وہاں اسم ظرف اپنے مظروف کی قید ہوتی ہے۔ چنانچہ منطق کی مشہور کتاب مرقات کے صفحہ نمبر ص۱۱ پر ہے

ترجمہ۔ مرکب ناقص چند قسم پر ہے۔ ایک مرکب اضافی اور ایک توصیفی اور ان میں سے تیسری مرکّب تقییدی ہے۔ اس کی مثال جیسے کہ فی الدار۔ یعنی زید گھر میں ہے۔ ثابت ہوا کہ حرفِ فی کی وجہ سے ظرفیہ ثابت ہو جاتی ہے۔ اور ظرف ہمیشہ مظروف کی قید ہوتا ہے۔ جہاں ظرف مظروف ہو وہاں مرکّب تقییدی ہوتا ہے۔ مذکورہ روایت میں بالکل اسی طرح حرف جار نے مظروف اور ظرف کو مرکّب تقییدی بنا دیا۔ پس یہاں لفظ اَنتَ اور لفظ سَیّد کا تعلق۔ دنیا اور آخرت سے ہے۔ اور لفظِ سید مظروف ہے فی الدُّنیا اور فی الآخرت کا۔ اور یہ جملے ناقصے ایک ہی جملہ تامّہ کی خبر بن گئے۔ لہٰذا سب جملے کا حکم اور معنیٰ مقصد ایک ہوا۔ جو مقصد دوسرے کا ہوگا وہی پہلے کا۔ حکم میں تغیّر محال ہے۔ آخرت میں سید ہونے کا مطلب نسبی سیادت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آخرت میں نسب نہیں چلتا نہ اَولاد بڑھتی ہے۔ پس لازمی ہے۔ کہ سیّد فی الآخرت کا مطلب یہی ہے کہ اے علی تم آخرت میں سردار ہو۔ سیادت اُخروی صرف سرداری ہو سکتی ہے۔ اور روایت کے جامع مانع الفاظ نے سیادتِ اُخروی کے ساتھ ہی سیادتِ دنیوی کو جوڑا۔ پس یہاں وہی معنیٰ ہو سکتے ہیں یعنی سرداری۔ مطلب یہ ہوا کہ اے علی تم دنیا و آخرت میں سردار ہو۔ لہٰذا مسئلہ صاف ہو گیا۔ اس روایت سے بھی سیادتِ نسبی مراد نہیں ہو سکتی۔ اور مخالف کے ترکش کے تیر سارے خالی ہو گئے۔ اب بحمدہٖ تعالیٰ مخالف کے پاس ایسی کوئی دلیل باقی نہ رہی جس سے علوی بزرگوں کی سیادتِ نسبی ثابت ہو سکے۔ اس فتوے شرعی کی رو سے علوی حضرات کو نسبی سید ماننا ناجائز ثابت ہوا

کیونکہ جس طرح سادات کو سادات کہنا ثابت ہے اسی طرح غیر سید کو سید کہنا اور کہنا بھی گناہ ہے۔ کہ قاعدہ عبادات شریعت میں سخت سید آپ کی جڑ ہے۔ یہ بات بحمدہ تعالیٰ روز روشن کی طرح ہے کہ اہل سنت وجماعت کے پاس ہر مسلک وعقیدے پر بکثرت دلائل ہیں۔ مگر مخالفِ اہل سنت اکثر اپنے استدلال میں ضعیف اقوال موضوع روایتیں اور غلط تاویلیں پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ یہ انصاف کا تقاضہ نہیں کہ پہلے گھڑ لئے قیاس کا عقیدے کا حکم پر ایک عقیدہ بنالیا پھر اس کے لئے دلائل ڈھونڈتے ہوئے غلط روایتیں بنا کر شروع کردیں۔ حضرت کا یہ حیا کیا صحیح احادیث مقدسہ کے مطلب و معنی غلط کر دیئے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی اشارہ نہیں کہ ہر علوی حتی کو سید کہا جائے اور جس طرح جب ہے چاہے مقصود پورا کرے۔ یہی وہ روایات جن کو مخالف اپنا سہارا بنا سکتا تھا ہم نے اصول و تحقیق کے قواعد کے مطابق ان کا صحیح مطلب بیان کردیا جس سے ثابت ہوگیا کہ حضرت علی نسبی سید نہیں نہ ان کی علوی اولاد سید ہو سکتی ہے۔ اگر ہماری اس تحقیق کو نہ مانو گے تو پھر زمانہ فاروقی۔ صدیقی۔ نسل کو سیادت سے کیسے روک سکو گے۔ اگر انہی روایات کی بنا پر تم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علوی خاندان کو نسبی سید کہتے ہو تو ان سے زیادہ مستند احادیث مبارکہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سید ہونے پر وارد ہوئی ہیں۔ پھر اگر اندھی عقیدت میں یہ کاروبار چل نکلا ورنہ پھر ہر شخص خود کو نسبی سید کہے گا خود بخود بن جائے تم اس کو کسی دلیل سے روک نہ سکو گے۔ کیونکہ سید بمعنی سردار تو تمام صحابہ ہیں۔ اور زیادہ تر کے سید تو حضرت آدم علیہ السلام ونوح علیہ السلام وغیرہ جملہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اس بنا پر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ میں سید ہوں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ پھر کسی کو بھی سید ہونے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ اسلام بہت پاکیزہ اور با اصول مذہب ہے یہاں کسی کو ایسی گڑبڑ کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو چودہ سو سال تک کسی نے حضرت علی کو نسبی سید کیوں نہیں کہا؟ نہ علویوں کو سادات میں شامل کیا۔ اب چودھویں صدی کا شوشہ محض کسی کی طرف سے پھیلایا ہوا ہے جو قادیانی سنیوں کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ ورسولہ اعلم۔

کتبہ

حضرت حمزہ کی نسل کا بیان

سوال نمبر ۲: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جو لوگ کہتے ہیں ہم حضرت حمزہ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہم بنی ہاشم اور سید ہیں۔ فرمایا جائے کیا یہ درست ہے۔ اور حضرت حمزہ

کی نسل کون سی ہے۔ بینوا و توجروا ۔ سائل محمد خالد پنجابی کوئٹہ ۔ بلوچستان مورخہ ۲۲ ۴/۱۹۶۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ۃ

الجواب

قانون شریعت کے مطابق ہر شخص کی نسل بیٹے سے چلتی ہے۔ بجز نبی کریم کے کہ آپ کی نسل سادات کرام حضرت فاطمۃ الزہرا بتول خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے چلی۔ اور ہر بیٹا اپنے باپ کی نسل ہوتا ہے تاریخ اسلام میں حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولادِ پاک میں روایات صحیحہ کی رو سے آپ کی ایک صاحبزادی حضرت درہ بنت صحرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ذکر آتا ہے۔ تاریخِ اسلام نے مختصراً اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کو اولاد حمزہ کا تو لقب دیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کو بنی ہاشم نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ شریعت اور فطرت کے قانون میں ہر بچے کو باپ کی نسل اور ماں کی اولاد کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص لونڈی سے نکاح کرے۔ اور اولاد پیدا ہو۔ تو وہ اولاد باپ کی نسبت سے اس کی ہم قوم ہو گی۔ اور والدہ کی نسبت بوجہ اولادیت وہ لونڈی غلام ہو کر مولی کی ملکیت ہو گی۔ چنانچہ فتاوی درمختار جلد سوم صفحہ نمبر ۱۸۸ پر ہے:۔ وَلَا فِي نَسَبٍ حَتّٰى لَوْ نَكَحَ هَاشِمِيٌّ اَمَةً فَوَلَدُهَا هَاشِمِيٌّ كَاَبِيْهِ رَقِيْقٌ كَاُمِّهٖ ط (ترجمہ) :۔ بچہ والدہ کے تابع نہیں ہوتا۔ نسب میں یہاں تک کہ اگر ہاشمی سید مرد کسی لونڈی سے نکاح کرے۔ تو اسی لونڈی کی اولاد باپ کی وجہ سے ہاشمی سید کہلائے گی۔ اور ماں کی وجہ سے غلام بنے گی۔ اسلامی قانون میں صرف بارہ چیزوں میں حمل ماں کے تابع ہوتا ہے۔ اور دس چیزوں میں والد کے تابع ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا۔ کہ حضرتِ حمزہ کی نسل نہ چلی۔ اِس لیئے فقہاء کرام سادات ہاشمی کی فہرستِ سلسلہ میں بنی۔ ابی لہب اور بنی حمزہ کا ذکر نہیں کرتے۔ بنی ابی لہب تو بوجہ کفر و عناد کے سادات سے خارج ہے۔ اور بنی حمزہ کا وجود ہی نہیں۔ چنانچہ فتح القدیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۵ پر ہے:۔ وَلَا يُدْفَعُ اِلٰى بَنِيْ هَاشِمٍ وَهُمْ اٰلُ عَلِيٍّ وَّاٰلُ عَبَّاسٍ وَّاٰلُ جَعْفَرٍ وَّاٰلُ عَقِيْلٍ وَّاٰلُ حَارِثِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ وَمَوَالِيْهِمْ ط (ترجمہ) :۔ زکوٰۃ نہ دی جاوے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم آلِ علی۔ آلِ عباس۔ آلِ جعفر۔ آلِ عقیل اور آلِ حارث بن عبد المطلب اور ان کے موالی ہیں۔ اِس فہرست میں آلِ حمزہ کا ذکر تک نہیں۔ پس ثابت ہوا۔ کہ بلوچیوں کا یہ کہنا کہ ہم ہاشمی ہیں۔ کیونکہ حضرتِ حمزہ کی اولاد ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اگر یہ حضرتِ درّہ ہی کی اولاد ہیں تو بھی ہاشمی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خاندان بیٹے سے چلتا ہے نہ کہ بیٹی سے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مقتدی کو سورت فاتحہ پڑھنی منع ہے

سوال ۱۴۶ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں۔ ہمارے بستی کا ایک وہابی غیر مقلد دیوبندی مولوی یہ کہتا ہے کہ سورت فاتحہ مقتدی بھی ضرور پڑھے۔ اور کہتا ہے وہ حدیث مَنْ کَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ۔ اس لفظ میں لہٗ کی ہٗ ضمیر سے امام مراد ہے نہ کہ لفظ مَنْ مقتدی کیوں کہ ضمیر ہمیشہ قریب کے مرجع کی طرف لوٹتی ہے۔ بعید کی طرف لوٹانا غلط ہے۔ لہٰذا عرض ہے کہ اپنی تحقیق سے فتویٰ عطا فرمایا جائے۔

سائل: محمد خالد مقام کوئٹہ بلوچستان ۔۔۔ مورخہ: ۱۹۷۲-۶-۲۲

الجواب بعون العلام الوهاب

مذکورہ فی السوال دیوبندی صاحب نحوی قواعد سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ ایسی بات نہ کہتے جو عقلاً نقلاً ہر طرح سے غلط ہے۔ سوال کی مشہور روایت مبارکہ۔ مَنْ کَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ ط ۔ (ترجمہ) وہ نمازی جس کا نماز میں کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس نمازی کی قرأت بن جائے گی۔ اس کو علیحدہ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس حدیث پاک میں دو دفعہ لفظ لہٗ مستعمل ہے۔ دونوں میں ضمیر واحد غائب کا مرجع مَنْ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اور لفظ ہٗ سے مراد مقتدی ہے۔ اور یہی منشاء کلام ہے اور محدثین و شارحین کے نزدیک بھی یہی مراد ہے۔ چنانچہ طحاوی شریف جلد اول میں صفحہ نمبر ۱۲۷ پر اس حدیث پاک کی شرح اس طرح مذکور ہے:۔ اَخْرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْمَاْمُوْمَ لِقَوْلِهٖ مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ۔ فَجَعَلَ الْمَاْمُوْمَ فِيْ حُكْمِ مَنْ يَّقْرَءُ بِقِرَاءَةِ اِمَامِهٖ فَكَانَ الْمَاْمُوْمُ بِذٰلِكَ خَارِجًا ط ۔ (ترجمہ) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نماز میں قرأت کرنے سے مقتدی کو علیحدہ کر دیا۔ اپنے اس فرمان پاک سے کہ وہ شخص جس کا امام ہو پس امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے پس مقتدی اس بنا پر خارج ہو گیا قرأت سے۔ اسی حدیث پاک کی شرح میں امام محمد رحمتہ اللہ علیہ اپنے مؤطا کے صفحہ نمبر ۹۳ پر فرماتے ہیں:۔ قَالَ مُحَمَّدٌ اَخْبَرَنَا عُبَيْدُ اللهِ ابْنُ عُمَرَ بْنِ حَفْصِ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ

نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ كَفَتْهُ قِرَاءَتُهٗ ط ۔

ترجمہ:۔ فرمایا امام محمد نے خبر دی ہم کو عبید اللہ ابن عمر ابن حفص ابن عاصم ابن فاروق اعظم نے۔ انہوں نے حضرت نافع سے انہوں نے ابن عمر سے کہ فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے۔ ان محدثین کی شرح سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ روایت مذکورہ کا نقطہ ہٗ دونوں جگہ مَنْ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ قواعدِ نحویہ اور علمِ اصولِ فقہ کے مطابق بھی یہ ہر دو ضمیر مَنْ کی طرف ہی رجوع کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر لَہٗ کی ضمیر لفظِ مَنْ کی طرف نہ لوٹائی جائے تو الفاظِ روایت و مفہومِ روایت بالکل ہی غلط ہو جائیں گے۔ اگر پہلے لَہٗ کو امام کی طرف پھیرا جائے تو اضمار قبل الذکر لازم آتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل منع ہے۔ کیونکہ ضمیر کبھی پہلے نہیں آ سکتی۔ جیسے کہ کوئی شخص آپ سے کہے کہ وہ آیا تھا۔ اور وہ یہ کہتا تھا۔ کسی کا پہلے نام نہ لے تو آپ کو خاک سمجھ نہ آئے گا۔ اور اس کا یہ سب کلام غلط اور فضول ہو گا۔ اسی طرح اگر حدیث پاک کے پہلے لفظ لَہٗ کی ہٗ ضمیر سے امام مراد لو۔ تو کلام لغو ماننا پڑے گا۔ جو حدیث پاک کے شان میں بڑی گستاخی ہے۔ اور ترجمہ بھی غلط ہو گا۔ کیونکہ ترجمہ یہ ہو گا۔ مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ وہ شخص جو کہ ہو اس امام کا امام۔ کیسا غلط ترجمہ ہوا یہ غلط ترجمہ اس لیے کرنا پڑے گا۔ کہ بقول وہابی ہٗ سے مراد امام ہے۔ اور لفظِ اِمام اس کے بعد آ رہا ہے اور لَہٗ کا لام اضافت کے معنی میں ہے۔ نحوی لحاظ سے امام کو مضاف اور ہٗ ضمیر کو مضاف الیہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ حالانکہ ہمیشہ مضاف پہلے ہوتا ہے۔ اور مضاف الیہ بعد میں۔ یہاں اضافتِ مقلوبی بھی ضمیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے لیے دونوں اسم تام ظاہر ہونے شرط ہیں۔ اضافت مقلوبی میں ضمیر نہیں آ سکتی۔ جیسے لفظ محمد دین یعنی محمد کا دین۔ یہاں لفظِ محمد مضاف الیہ ہے اور لفظِ دین مضاف ہے اور یہ اضافت مقلوبی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ مقصد اضافت عام مضاف کو خاص کرنا ہے۔ لفظِ محمد تو پہلے ہی خاص ہے کیونکہ کائنات میں بجز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی محمد نہیں ہاں دین عام ہے کہ دنیا میں بے شمار دین ہیں۔ پس اس مرکب اضافی کو اضافت مقلوبی کر کے دین کو خاص کرنا مقصود ہے۔ اگر یہاں مقلوبی اضافت نہ مانی جائے تو عبارت غلط۔ بلکہ ضمناً گستاخی ہو گی۔ اور ترجمہ ہو گا دین کا محمد۔ تو گویا کہ اور بھی محمد تسلیم ہیں اور یہ وہابیانہ گستاخی ہو گی۔ جیسا کہ مولوی عبدالحی وہابی اپنے فتاویٰ عبدالحی کے صفحہ نمبر ۵۲ پر لکھتا ہے۔ کہ جہان بہت سے ہیں اور ہر جہان کا نبی علیحدہ ہے۔ آدم علیحدہ موسیٰ علیحدہ ہر جہان کا محمد علیحدہ (معاذ اللہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ) اور دلیل پکڑتا ہے یہودیوں کی ایک موضوع اسرائیلی روایت سے کہ جس کے کچھ الفاظ یہ ہیں:۔ اٰدَمُ كَاٰدَمِكُمْ وَنَبِيٌّ كَنَبِيِّكُمْ ط پس ثابت ہوا کہ لَہٗ کی پہلی ضمیر مَنْ کی طرف لوٹ رہی ہے اسی طرح دوسرے لَہٗ کی ضمیر بھی اسی مَنْ کی طرف مرجوع ہے کیونکہ اگر دوسرے لَہٗ کی ضمیر ہٗ کو بقولِ

دیوبندی مذکور۔ امام کی طرف لوٹائی جائے تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس طریقے سے دوسرے لہٗ کو حصر کرنا پڑے گا۔ اور اگلی عبارت کا ترجمہ یہ کرنا پڑے گا کہ پس امام کی قرأت امام ہی کی قرأت ہے حالانکہ یہاں حصر جائز نہیں۔ اس لیئے کہ حصر کی عربی میں چند صورتیں ہیں علامکرار ضمائر جیسے :۔ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ﴿ترجمہ﴾ بے شک وہ ہی فسادی ہیں۔ اور اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿ترجمہ﴾ بے شک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے۔ ع۲ ماخر لفظ کو مقدم کرنے سے بھی حصر پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اِیَّاكَ نَعْبُدُ ﴿ترجمہ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ع۳ حروفِ استثناء سے جیسے مَا قَامَ اِلَّا زَیْدٌ ﴿ترجمہ۔ نہ کھڑا ہوا مگر زید۔ یعنی زید ہی کھڑا ہوا۔ ان تمام اقسام میں سے کوئی قسم بھی یہاں نہیں ہے۔ نہ حصر اضافی اور نہ حصرِ حقیقی۔ تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ روایت مبارکہ کے دوسرے لفظ لہٗ کی ضمیر امام کی طرف مرجوع ہو۔ اصولِ فقہ اور علم نحو کے اعتبار سے بھی یہ بات قطعاً غلط ہے کہ ہ ضمیر واحد مذکر غائب کو امام کی طرف لوٹائی جائے۔ اس لیے کہ اس حدیث پاک کی تمام عبارت جملہ شرطیہ ہے۔ اس کی پہلی جز یعنی مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ یہ شرط ہے۔ اور فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ یہ جزا ہے۔ حرف فاء جزائیہ ہے۔ قواعد کے مطابق جملہ شرطیہ میں تعلیق شرط ہے۔ یعنی جزا کا شرط پر موقوف ہونا۔ کہ شرط ہو تو جزا ہو۔ اگر شرط نہ ہو تو جزا بھی نہ ہو۔ چنانچہ علم اصول کی کتاب نور الانوار صفحہ ۲۱۴ پر ہے۔ وَالْمُرَادُ بِالشَّرْطِ اَنْ لَّا یَصِحَّ الْمَامُوْرُ بِهٖ قَبْلَ وُجُوْدِهٖ وَیَفُوْتُ بِفَوْتِهٖ ﴿ترجمہ﴾۔ اور مراد شرط سے یہ ہے کہ نہ درست ہو حکم دی ہوئی جزا شرط کے وجود سے پہلے اور جزا ختم ہو جائے شرط کے ختم ہونے سے۔ اس قاعدے کے مطابق اگر لفظ لہٗ کی ضمیر امام کی طرف لوٹے تو مطلب یہ ہوگا۔ اگر مقتدی ہے تو امام کی ہو جائے۔ ورنہ امام کے قرأت کرنے کے باوجود اس کی قرأت نہ ہو۔ یعنی اگر اکیلے منفرد نماز پڑھ رہا ہے۔ تو کسی بھی نمازی کی قرأت نہ بنے۔ حالانکہ یہ سخت غلط ہے اور سب کے خلاف ہے۔ اس طرح تو لازم آتا ہے کہ صرف امام کی قرأت درست رہے۔ باقی کسی نمازی کی قرأت صحیح نہ ہو۔ نہ مقتدی کی نہ منفرد کی۔ نیز لازم آیا کہ مقتدی کی قرأت کوئی شی نہ بنے تو یہ ہماری دلیل ہی بن جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ہ ضمیر بھی مقتدی یعنی لفظِ مَنْ کی طرف ہی لوٹ رہی ہے۔ نہ کہ امام کی طرف جیسا کہ وہابی مذکور نے سمجھا۔ اور حدیث پاک کا صحیح مطلب یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو وہ خود قرأت نہ کرے کیونکہ قِرَاءَةُ الْاِمَامِ قِرَاءَةٌ لَهٗ ﴿یہ طحاوی شریف کے الفاظ﴾ امام کی قرأت اس (مقتدی) کی قرأت بن جاتی ہے۔ مگر جو اکیلا نماز پڑھے۔ وہ خود قرأت کرے۔ اور پھر اس حدیث پاک میں لفظ قرأت مطلق ہے۔ جو سورت فاتحہ اور دیگر سورت ہر دو کو شامل ہے۔ حالانکہ غیر مقلد دیوبندی صرف سورت فاتحہ کے پڑھنے کا

مقتدی کو حکم دیتے ہیں، دیگر سورت کو وہ بھی منع کرتے ہیں۔ تو پوچھو نادانوں سے کہ قرأت امام میں کیا صرف فاتحہ ہی امام کی بنے گی۔ باقی قرأت امام کی نہ بنے گی۔ وہ مقتدی کی بن جائے گی۔ بہرحال یہ سب کم عقلی کی باتیں ہیں، غیر مقلد وہابی کا یہ کہنا بھی غلط ہے۔ کہ ضمیر ہمیشہ قریب کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ بلکہ نحوی قاعدے کے مطابق ضمیر کا مرجع قریب و بعید ہر طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شرح جامی باب تنازع الفعلین صفحہ نمبر ۱۹ پر ہے وَ اَمَّا الضَّمِيْرُ الْمُنْفَصِلُ الْوَاقِعُ بَعْدَ هُمَا نَحْوُمَا ضَرَبَ وَاَكْرَمَ اِلَّا اَنَا۔ فَفِيْهِ تَنَازُعٌ (الخ) :- ترجمہ اور لیکن ضمیر منفصل جو واقع ہو، دو فعلوں کے بعد جیسے کہ نہیں مارا مجھ کو اور تعظیم کی اس نے۔ اس عبارتِ مثل میں دو فعلوں کے بعد ضمیر اَنَا آرہی ہے۔ نحویوں کے نزدیک یہ دور کے فعل مَا ضَرَبَ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور قریب کی طرف بھی۔ چنانچہ فرّا نحوی کا مذہب ہے۔ وَاَمَّا عَلٰى مَذْهَبِ الفرّاء فَيَعْمَلَانِ مَعًا ○ (ترجمہ) :- اور لیکن فرّاء نحوی کے نزدیک دونوں فعل اس ضمیر پر عمل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر بقول دیوبندی ضمیر ہمیشہ قریب کی طرف ہی لوٹتی۔ تو یہاں لفظ اَنَا مَا ضَرَبَ کی طرف ہرگز نہ جا سکتا۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ پہلا پارہ آیت نمبر ۱۱۳ ۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ (ترجمہ) یہودی بولے عیسائی کچھ نہیں۔ اور عیسائی بولے یہودی کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ سب اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح تو ان لوگوں نے جھگڑے ڈالے تھے۔ جو بالکل کتاب اللہ کو نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے گا۔ ان یہودیوں و نصاریٰ کے درمیان قیامت کے دن اس بارے میں کہ جس میں وہ جھگڑا کرتے تھے۔ یہاں دو قول ہیں :- نمبر ۱ :- مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۲) وَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ○ ان دونوں جگہ ھُمْ ضمیر جمع غائب ہے۔ اور یہ دونوں دور کے مرجع کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ پہلی ضمیر ھُمْ اگرچہ قریب کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ مگر تمام مفسرین نے اس کو دور کی طرف لوٹایا ہے۔ اس کا پہلا قریبی مرجع اَلَّذِيْنَ ہو سکتا ہے۔ دوسرا دور کا مرجع یہود و نصاریٰ ہے۔ لیکن علماءِ محققین نے اس ضمیر کو دور کے مرجع کی طرف لوٹایا۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد اول صفحہ نمبر ۳۶۲ پر ہے :- اَيْ بَيْنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصٰرٰى لَا بَيْنَ الطَّوَائِفِ الثَّلَاثَةِ ○ ترجمہ :- یعنی فیصلہ فرمائے گا اللہ جلَّ شانُہٗ قیامت کے دن یہود و نصاریٰ کے درمیان۔ اس سے ثابت ہوا کہ ضمیر دور کے مرجع کی طرف جا سکتی ہے۔ اور دیوبندی صاحب نے صرف اپنے مذہب کو بچانے کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے پاس سے ایک قاعدہ بنا لیا۔

تیسری دلیل میں اگر دیوبندی صاحب ضمیر کو قریبی مرجع کی طرف لوٹائیں تو خود اپنے مذہب کے مطابق مشرک ہو جائیں

دیکھو قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ (الخ)۔ اس آیت کریمہ میں لفظ یحیی میں ہ واحد مذکر غائب پوشیدہ ہے۔ جو اس کا فاعل بن رہی ہے۔ اور ہ سے مراد یا لفظ مَا ہو سکتا ہے۔ یا لفظِ رسول یا لفظِ اللہ۔ قریبی مرجع مَا ہے بعیدی اللہ ہے۔ اگر وہابی صاحب اپنے قاعدے سے قریبی مرجع کی طرف یحیی کی ضمیرہٗ کو لوٹائیں۔ تو وہابیوں کا شرک ہوگا۔ کیونکہ اب ترجمہ پوری آیت کا اس طرح ہوگا۔ کہ اے ایمان والو فوراً بات مانو اللہ کی اور رسول پاک کی۔ کہ جب بلائیں تم کو اس چیز کے لیے جو تم کو زندہ کرے۔ اور وہابیوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی بخش صرف اللہ ہے۔ مگر یہاں ضمیر کا قریبی مرجع اس چیز کو زندگی بخش بتا رہا ہے۔ لہٰذا وہابی صاحب اگر ضمیر کو اللہ کی طرف پھیرتے ہیں تو یہ قاعدہ خود ساختہ ٹوٹتا ہے۔ کیونکہ ضمیر کا مرجع دور ہو جاتا ہے۔ اور اگر قریبی مرجع بناتے ہیں تو شرکِ وہابیت لازم آتا ہے۔ دونوں طرف موت ہے۔ لیکن بحمدہٖ تعالیٰ اہل سنت والجماعت بریلویوں کا عقیدہ مضبوط ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے ثابت کر دیا۔ کہ قرآن و حدیث اور نبی کریم کے بلانے اور کلمات طیبہ بھی زندگی بخش ہیں۔ جب ان آیات اور اس کے علاوہ اور بہت آیات میں ضمیریں دور کے مرجع کی طرف جا سکتی ہیں۔ تو حدیث پاک میں قِرَأۃٌ لَہٗ کی ضمیر بھی مَنْ کی طرف لوٹ سکتی ہے وہابیوں کو چاہیئے کہ اس قریبی مرجع والے قاعدے پر کوئی حدیث سے دلیل پیش کریں۔ اگرچہ نحوی قواعد سے بھی کوئی مضبوط و مرجوع دلیل میسر نہیں۔ مگر یہ لوگ جو ہماری تقلیدِ ائمہ مجتہدین پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ تو ان کی نحوی تقلید کیونکر گوارا کی جائے گی۔ اگر یہ لوگ نحو سے دلائل پیش کریں۔ تو نحویوں کے مقلد ہو کر بقولِ خود شرک فی الرسالت میں مبتلا ہو جائیں۔ خیال رہے کہ شرک فی الرسالت ان لوگوں کا نیا تیار کردہ ماڈل ہے۔ قرآن و حدیث میں اس لفظ کا بھی وجود نہیں ملتا۔ گویا کہ ان کے نزدیک نبی بھی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ رب کریم کی خصوصی صفت ہے۔ شعر

ترسم کہ بکعبہ نرسیدی اے وہابی
کین راہ کہ تو روی بشرکستان است

خلاصۂ کلام یہ کہ مقتدی کو مطلقاً قرأت منع ہے۔ دیگر دلائل عقلیہ و نقلیہ کے علاوہ یہ حکم اس مذکورہ حدیث سے بھی بالوضاحت ثابت ہوگیا۔ اس کے رد میں جو بات بھی وہابی کہتے ہیں وہ محض نادانی سے کہتے ہیں

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

سوال ۱۲ بیعت کرنیکا صحیح اور غلط رواج ۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک پیر صاحب جو غوث پاک کی اولاد بنتے ہیں کہتے ہیں تجدیدِ بیعت مرشد کی وفات کے بعد ضروری ہے ۔ اور ایسے مریدوں کو پکڑ کر اپنی بیعت کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو خوشامد یا جبر سے بیعت کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ میں چاروں سلسلوں میں بیعت کر سکتا ہوں لہٰذا جس نے جس سلسلے میں بیعت ہونا ہے وہ میری بیعت کرے بیعت کے بعد ہر مرید سے گیارہ روپیہ نذرانہ وصول کرتے ہیں ۔ ہماری بستی کے ایک پیر صاحب انکے معاون ہیں ۔ فرمایا جائے کیا یہ کام جائز ہے ۔ سد تحند سائل محمد صدیق بجلی گھر زد مر الہ یاں گجرات

الجواب بعون العلام الوهاب

قانون شریعت کے مطابق مذکورہ پیر کے تمام اقوال غلط اور خلاف شریعت و طریقت بلکہ تہذیب کے خلاف ہے ۔ تجدید بیعت صرف اسوقت جائز ہے جب کسی غیر شیخ فاسق جاہل یا بد عقیدہ انسان کی بیعت کی جائے ولی کامل اور عالم دین متقی کی بیعت تا قیامت قائم رہتی ہے کیونکہ اولیاء اللہ مرتے نہیں بلکہ بعد وفات انکی قوتِ امداد زیادہ ہو جاتی ہے ، یہی قرآن و حدیث سے ثابت ہے ۔ اور ایک شخص کا چار سلسلوں میں بیعت کرنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت و طریقت کے چار چار سلسلے بنائے ہر راستہ جدا ہے ۔ ایک شخص بیک وقت دو راستوں پر نہ چل سکتا ہے نہ چلا سکتا ہے ۔ پیر مرید کی مثال ملاح اور مسافر کی ہے جس طرح ملاح و مسافر بیک وقت ایک کشتی اور ایک ہی راہ چل سکتے ہیں اسی طرح ایک پیر ایک ہی سلسلے میں بیعت کر سکتا ہے ۔ جب ایک شخص حنفی شافعی نہیں ہو سکتا تو قادری چشتی میں بیعت بھی نہیں کر سکتا ۔ ہاں البتہ ایک مرید اپنے پیر کی اجازت سے صرف حصولِ فیض کیلئے بیعتِ کسب و بیعتِ طلب کر سکتا ہے اس لحاظ سے خود کو چشتی قادری کہہ سکتا ہے مگر ایک پیر دو بیعتیں نہیں کر سکتا ۔ اس کا کہیں ثبوت نہیں ۔ اگر اس طرح بیعت جائز ہوتی تو چار سلسلے کے بزرگوں کی کیا ضرورت رہتی ۔ ثابت ہوا کہ یہ اس کی اپنی بناوٹی بات ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیر طریقت کی منزلوں سے بالکل بے خبر ہے اور چار سلسلوں کے فرق کو بالکل نہیں جانتا صرف ہوسِ زر اور پیری مریدی کا شوق ہے ۔ اللہ ہدایت دے ۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

۲-۲-۷۹

کتبـــــــــہ

نطفۂ ولادت کا ٹیکہ لگانے کا حکم

سوال نمبر ۱۳ ۔ محترم جناب واجب الاحترام مولانا مفتی صاحبزادہ اقتدار احمد خان صاحب السلام علیکم خیریت موجود خیریت مطلوب بعدہٗ گزارش ہے کہ میں ایک مسئلہ آپکی خدمتِ عالیہ میں ارسال کر رہا ہوں آپ براہِ کرم اس مسئلہ کا تفصیلاً جواب لکھیں مع دلائل شرعیہ تحریر فرما کر شکریہ کا موقع دیں عین نوازش ۔ کیونکہ بجز آپ کے مجھے اس مسئلے کا حل نہیں مل سکا ۔ اور نہ ہی امید ہے ۔ کہ کسی سے ملے ۔ اس لیئے امید واثق کر کے بحکم خدا تعالےٰ فَاسْئَلُوْا

أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کے تحت آپ کی خدمت میں ارسال ہے کہ آپ انشاء اللہ ذرا جلدی وقت نکال کر جواباً مطلع فرمائیں گے۔ فقط والسلام۔

آپ کی دعاؤں کا خواستگار قاضی نور حسین معرفت صوفی فضل حسین زمیندار ٹی سٹال نزد ڈاکخانہ سکھو (مندرہ) تحصیل گوجرخاں ضلع راولپنڈی

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ آج کل اس ترقی یافتہ دور میں سائنسی اصول کے ماتحت مادہ جانوروں کو ٹیکہ لگاتے ہیں جس سے مادہ حاملہ ہوتی ہے اور بچے پیدا ہوتے ہیں۔ نامعلوم وہ انجکشن جو لگایا جاتا ہے وہ سائنس کے ذریعے سے کوئی دوائی ایجاد ہوتی ہے یا کہ وہ نر جانور کا نطفہ ہے۔ اگر ڈاکٹروں نے یہ ہی ایجادات کی ہوں کہ کسی طرح سے جانور نذکر کا نطفہ نکال کر محفوظ کر لیں اور پھر وہ انجکشن لگائیں تو کیا از روئے شریعت یہ طریقۂ کار جائز ہے یا ناجائز۔ آپ مکمل فتویٰ عطا فرمائیں عین کرم نوازی ہوگی۔ بَيِّنُوْا وَ تُوْجَرُوْا

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانون شریعت کے مطابق سوال مذکورہ میں جس وطی اور نطفے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل جائز اور مباح ہے۔ ایسے مادہ جانور کا دودھ بالکل پاک وطیب وحلال ہے اس کا اور اس کے مولودہ بچے کا گوشت بھی بالکل طیب وحلال ہے۔ اس لیے کہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ نطفہ نر جانور ہی سے لیا جاتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ نر جانور کے آلۂ تناسل سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹیوب اچھی طرح باندھ دی جاتی ہے اور بولی ہوئی مادہ پر اس نر کو چھوڑا جاتا ہے، جب نر مادہ پر کودتا ہے تو اس کا آلہ تناسل ٹیوب کی وجہ سے فرج مادہ میں نہیں جاتا بلکہ نرم ٹیوب ہی مثل فرج ہو جاتی ہے اور انزال اُسی کے اندر ہوتا ہے۔ جس سے سارا نطفہ ٹیوب میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس ٹیوب کو اتار لیا جاتا ہے۔ پھر لیبارٹری میں لے جا کر اس نطفہ میں اسی نسل کا دو تولہ دودھ ایک مرغی کا انڈا (صرف زردی یا صرف سفیدی) ایک تولہ گلوکوز انگوری علیحدہ اچھی طرح حل کر کے شامل کیا جاتا ہے جس سے مادہ تولید کے جرثومے میدان وسیع پا کر کھل جاتے ہیں اور ان کے گننے میں آسانی رہتی ہے اور یہ انڈے کی زردی (بعض میں صرف سفیدی) ان جرثوموں کی خوراک کا کام بھی دیتی ہے۔ پھر خوردبین کے ذریعے نسلی جرثوموں کی گنتی کے حساب سے اتنی ہی دوسری چھوٹی ٹیوبیں مہیا کر کے ہر ٹیوب میں ایک جرثومہ اور تھوڑا دودھ ملا نطفہ ڈال کر ٹیوب بند کر دی جاتی ہے۔ گویا کہ ایک نطفہ سے چالیس کے قریب جرثومے حاصل کیے جاتے ہیں اور دودھ انڈا نطفے میں شامل کر کے چالیس نطفے بنا لیے جاتے ہیں اور چالیس ٹیوبوں میں بند کر لیے یہ چالیس ٹیکے بن گئے۔ یہاں اتنی بات ضرور خیال میں رہے کہ نطفہ خواہ کسی مقام

پر ہوا اس کی بقا کے لیے ایک مخصوص مقدار کی ٹھنڈک لازمی ہے۔ صناعِ کائنات نے نطفے کی حفاظت و بقاء حیات کے لیے مقام و مسکنِ نطفہ کو عجیب نظام برودت سے مبیت کر دیا ہے کہ جسمانی حرارت اور تغیر ازمنہ کا اس پر اثر نہیں گویا کہ حفاظتِ نطفہ کے لیے جسم انسانی و حیوانی میں ربِّ قدیر نے ریفریجریٹر اور فرج سسٹم قائم فرمایا ہے۔ اس چیز کے تجربات سے موجودہ ڈاکٹروں نے کم سے کم درجہ حرارت قائم کر کے نطفے کے ان ٹیکوں کا حفاظتی انتظام کیا ہے۔ اور وہ نسلی ٹیکے ان سرد ڈبوں میں ایک سال یا اس سے زیادہ عرصے تک صحیح سالم پڑے رہتے ہیں۔ جب کہ جسم حیوانی میں سال ہا سال زندہ قائم رہتے ہیں۔ تولید کا یہ نظام صرف جانوروں میں شرعاً جائز ہے۔ انسانوں میں حرام کیونکہ نسلِ حیوانی ماں یعنی والدہ سے قائم و منسوب ہوتی ہے۔ اور نسلِ انسانی باپ سے۔ جانوروں میں کوئی باپ ہو بچہ حلالی ہوگا کیونکہ والدہ ایک ہے۔ مگر نسلِ انسانی میں ایک معیّن والد ہونا شرطاً اگر باپ غیر معیّن ہو تو بچہ حرامی ہوگا۔ مذہبی تقرر و تعین صرف انسانی باپ کے لیئے اشد لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں یتیم وہ نابالغ ہے جس کا باپ یعنی والد مر جائے اور حیوانوں میں وہ یتیم ہے جس کی والدہ مر جائے چنانچہ تفسیر صاوی جلد اول صفحہ نمبر ص۳۹ اور تفسیر روح المعانی اوّل صفحہ نمبر ص۳۰۸ پارہ اوّل اور روح البیان جلد اول صفحہ نمبر ص۱۷۲ پر ہے۔ وَ الْیَتَامٰی جَمْعُ یَتِیْمٍ وَهُوَ الصَّغِیْرُ الَّذِیْ مَاتَ اَبُوْهُ قَبْلَ الْبُلُوْغِ وَمِنَ الْحَیَوَانَاتِ الصَّغِیْرُ الَّذِیْ مَاتَتْ اُمُّهٗ: ترجمہ اور لفظِ یتامیٰ یتیم کی جمع ہے اور وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مر گیا ہو اور حیوانات میں وہ چھوٹا بچہ جس کی والدہ مر جائے۔ اسی طرح شرح قصیدہ بردہ صفحہ نمبر ص۱۹۴ پر ہے۔ پس چونکہ جانوروں میں بچے کا نسب صرف ماں سے چلتا ہے اس لیئے کسی جانور کا نطفہ کسی طریقے سے ڈال دیا جائے وہ جانور مولودہ حلالی مانا جائے گا۔ اور اس کا حکم بالکل دوسرے جانوروں کی طرح ہوگا۔ مگر انسانیت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے فلاسفۂ اسلامی کی تحقیق کے مطابق انسانی اور حیوانی نطفے میں چند طرح امتیازی فرق ہیں پہلا فرق یہ ہے تمام جاندار مخلوق میں نر انسان کا نطفہ شدید ترین قوّت والا ہے جو سب نطفوں پر قوی ہے۔ اور حیوانات میں مادہ حیوان کا نطفہ شدید تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں وطی کی رغبت مرد کی جانب سے ہوتی ہے پہلے مرد راغب ہوتا ہے تب عورت آمادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وقت مقرر نہیں جب چاہتا ہے صحبت کرتا ہے اور حمل ٹھہر جاتا ہے لیکن جانوروں میں مادہ کی طرف سے رغبت ہوتی ہے۔ اگر مادہ جانوروں میں وہ رغبت ظاہر ہو تب نر جانور آمادہ ہوتا ہے۔ اگر مادہ میں رغبت پیدا نہ ہو تو نر جانور اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور نہ پیچھا کرتا ہے نہ آمادگی ظاہر کرتا ہے۔ بخلاف انسانوں کے۔ چنانچہ مشہور اسلامی فلسفی اور سائنسدان علامہ زکریا بن محمود قزوینی علیہ الرحمۃ اپنی تصنیف عرائب الموجودات جلد دوم صفحہ نمبر ص۹۲ پر لکھتے ہیں (۱) اَلنَّظْمُ الثَّالِثُ فِیْ تَوَلُّدِ الْاِنْسَانِ)

وَمَا فَضَلَ مِنَ الْغِذَاءِ فِي الْهَضْمِ الْاَخِيْرِ يَبْعَثُ اِلَى النُّخَاعِ اِلَى الْاُنْثَيَيْنِ فَيَسْتَحِيْلُ فِيْهِمَا اِلٰى طَبِيْعَةِ الَّتِيْ يُدَغْدِغُ وَيُهَيِّجُ اِضْطِرَابَ الْقَدَمِ فَلَا يَسْكُنُ اِلَّا بِنَفْضِ تِلْكَ الْمَادَّةِ فَيَكُوْنُ ذٰلِكَ سَبَبَ اِجْتِمَاعِ الذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى ۔ ترجمہ ۔ جب انسان غذا کھاتا ہے تو غذا کلیجی میں تقسیم ہو کر جو باقی بچتی ہے اور آخری ہاضمے سے گزرتی ہے تو بلغمی شکل اختیار کر کے انسانی فوطوں میں چلی جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر منی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہاں وہ منی جوش کھاتی رہتی ہے۔ اور آلۂ تناسل بلکہ سارے جسم میں ہیجان اور آگے بڑھنے کا اضطراب پیدا کر دیتی ہے پس انسان سکون نہیں پاتا مگر اس مادے کے جھڑنے سے پس وہ اضطرابی کیفیت جو مرد میں اس مادے نے پیدا کی سبب بنتی ہے عورت و مرد کی وطی کا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انسانی مرد کا نطفہ جس رحم میں بھی جائے گا نسل انسانی ہی پیدا کرے گا خواہ عورت کے جسم میں جائے یا بکری گائے بھینس کے رحم میں بخلاف جانور کے کہ جب نر جانور کسی مادہ جانور سے وطی کرے تو نر یا مادہ نر مادہ کی جنس پیدا ہوتی ہے۔ فطرت کا یہ قانون بہت تجربوں سے مشاہدوں میں آچکا ہے۔ ان ہی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر ہمارے فقہاء کرام و مجتہدینِ عظام نے شرعی قوانین مرتب فرمائے۔ چنانچہ قانونِ شرعی کے مطابق اگر کوئی آدمی مرد کسی بھی جانور مادہ سے صحبت کرے تو جانور کو ذائیدگی سے پہلے ہی ذبح کر کے دفن یا آگ میں جلا دیا جائے گا نہ اس کا گوشت کھایا جائے نہ اس کو زندہ باقی رکھا جائے گا۔ چنانچہ فتاویٰ درمختار جلد سوم صفحہ نمبر ص ۲۱۳ پر ہے

وَلَا يُحَدُّ بِوَطْءِ بَهِيْمَةٍ بَلْ يُعَزَّرُ وَتُذْبَحُ ثُمَّ تُحْرَقُ وَيُكْرَهُ الْاِنْتِفَاعُ بِهَا حَيَّةً وَمَيِّتَةً ۔

فتاویٰ عالمگیری جلد سوم صفحہ نمبر ص ۳۶۱ پر ایسا ہی ہے۔ یعنی جو انسان جانور سے وطی کرے خواہ جانور حلالی ہو یا حرامی وطی کرنے والے کو حد نہ لگے گی بلکہ شرعی تعزیر کی سزا دی جائے گی اور جانور ذبح کر کے جلا ڈالا جائے گا اس کا نفع حاصل کرنا زندہ یا مردہ کا مکروہ تحریمی ہے۔ امام اعظم نے فرمایا کہ حلالی جانور ہے تو ذبح کر کے گوشت کھانا جائز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ مادہ جانور زندہ نہ رہے۔ اس لیے کہ اگر زندہ رہے گا تو ہو سکتا ہے حمل ٹھہر جائے اور اس سے انسانی بچہ پیدا ہو جو خالصتاً حرامی نسل ہو گا۔ اور یہ ذبح مادہ جانور سے وطی کرنے میں ہے کیونکہ وطی میں لفظ بہیمۃ ارشاد ہوا تاء تانیث سے مادہ ہونا ثابت ہوا۔ اگرچہ جمہور کے نزدیک تاء وحدت کی ہے۔ میرے نزدیک صحیح تر یہ ہے کہ تاء تانیث ہے اور قرآن مجید میں تاء تانیث بول کر سب مذکر و مونث اس لیے مراد لیئے گئے ہیں کہ اصل جانوروں میں مؤنث ہی ہوتا ہے۔ حلت و حرمت کا بھی مؤنث ہی سے پتہ لگتا ہے۔ مذکر کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کی زندگی میں اس کے حلالی ہونے کو ثابت کرے بخلاف مونث جانور کے کہ اس کا دودھ اس کی حلت و حرمت ثابت کر رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے لفظ بہیمۃ مونث ارشاد فرما کر یہ بتا دیا کہ جانوروں میں اصل مادہ جانور ہے اس لیے بچہ ماں کا ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ

مرد اگر جانور سے بھی وطی کرے تو حمل ٹھیرنے کی صورت میں اولاد انسانی ہی ہوتی ہے مشاہدہ بھی سننے میں اسی طرح آیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء ۲ جولائی ۲۵ رجب ۱۳۹۸ھ جنگ اخبار راولپنڈی صہ ۲ پر اس طرح خبر تھی بکری نے انسانی بچے کو جنم دیا۔ ہیلی کا مقام بھارت یکم جولائی یہاں سے ۳۰ میل دور موضع پڈپور ضلع دھارڈار میں ایک بکری نے انسانی بچے کو جنم دیا ہے جس کے تمام اعضاء حتیٰ کہ انگلیاں بھی بالکل انسانوں کی طرح پیشانی سینہ ہاتھ پاؤں بالکل انسانی بچے جیسے ہیں۔ یہ خبر سب نے پڑھی۔ یہ اس لیئے ہوا کہ اس سے کسی آدمی نے وطی کی ہوگی نہ پکڑا گیا حمل بن گیا اور پیدا ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے پہلے ہی جانور کے ذبح کر کے نیست و نابود کر دینے کا حکم دے دیا تاکہ نسلِ انسانی خراب نہ ہو۔ بخلاف اس کے کہ اگر کوئی دوسرا جانور مثلاً کتا یا ہرن یا بھیڑیا بکری وغیرہ سے وطی کرے تو بکری کو ذبح نہ کیا جائے گا بلکہ اس کے حمل کو باقی رکھا جائے گا۔ اور وہ اکثر بکری ہی کی نسل سے ہوتا ہے لہٰذا اس کو کھانا جائز ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۲۹۷ پر ہے فَاِنْ كَانَ مُتَوَلِّدًا مِنَ الْوَحْشِيِّ وَالْاِنْسِيِّ فَالْعِبْرَةُ لِلْاُمِّ ۔ وَقِيْلَ اِذَا نَزَا ظَبْيٌ عَلٰى شَاةٍ اَهْلِيَّةٍ فَاِنْ وَلَدَتْ شَاةً تَجُوْزُ التَّضْحِيَةُ (ترجمہ)۔ جب بچہ مولود وحشی اور گھریلو جانور کے ملاپ سے پیدا ہو تو اعتبار ماں کا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب بھیڑیا گھریلو بکری سے وطی کرے اور بچہ بکری نسل ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ حیوانات میں چوپایہ جانور مادہ میں شہوت زیادہ ہوتی ہے اور نر میں کم۔ لیکن نسلِ انسانی میں عورت میں شہوت کم ہوتی ہے نر مذکر میں زیادہ۔ چنانچہ مشہور طبی کتاب ضیاء الابصار فی حد الباہ مصنف حکیم محمود دہلوی صفحہ نمبر صہ ۱۵ پر ہے۔ لِاَنَّ مِزَاجَ الذُّكُوْرِ حَارٌّ يَابِسٌ وَمِزَاجَ الْاِنَاثِ بَارِدٌ رَطْبٌ ۔ وَالْبُرُوْدَةُ يُمِيْتُ الْقُوَّةَ وَالرُّطُوْبَةُ مُسْتَرْخِيْ لَهَا فَلِهٰذَا الْوَجْهِ قَلَّتِ الشَّهْوَةُ ۔ ترجمہ اس لیئے کہ مرد کا مزاج گرم وخشک ہوتا ہے اور عورتوں کا مزاج ٹھنڈا اور تر ہوتا ہے۔ اور ٹھنڈک قوتِ شہوانیہ کو مردہ کرتی ہے اور تری سست کرتی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں میں شہوت کم ہوتی ہے۔ اور مردوں کی اس شہوانی قوت کا نتیجہ ہے کہ ان کی مونچھیں اور داڑھی ہوتی ہے عورتوں کی نہیں۔ ہمارے فقہاء کرام فرماتے ہیں جو مرد داڑھی رکھے اس کی اولاد داڑھی منڈانے والے مرد کی اولاد سے زیادہ اور مضبوط تر ہوتی ہے۔ قوتِ مردمی انسانی جوہر ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جنتیوں کو یہ قوت بہت زیادہ عطا ہوگی جس کا ذکر قرآن کریم اور احادیث پاک میں متعدد جگہ کنایۃً وعبارۃً موجود ہے۔ انبیاء کرام کو بھی اس قوت کا سب سے زیادہ تحفہ عطا فرمایا گیا۔ اس قوت کے بل بوتے پر مسلمان مومن مقامِ معرفت کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خنثا مقامِ علیا پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مونچھیں منڈانی بدعت ہیں اور داڑھی منڈانا گناہِ کبیرہ کیونکہ اس سے قوتِ مردمی کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ درمختار جلد پنجم صفحہ نمبر صہ ۳۵۸ پر درج ہے۔

وَفِیْہِ حَلْقُ الشَّارِبِ بِدْعَۃٌ (ترجمہ)۔ اور اسی فتاوی مجتبیٰ میں ہے کہ مونچھوں کا منڈانا بدعت ہے تجربے سے ثابت ہے کہ جس عورت کی مونچھیں نکل آتی ہیں اس کی شہوت دوسری عورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نسلِ انسانی میں مرد کا نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں ہوتا ہے اور عورت کا نطفہ پستانوں کے درمیان۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد اول صفحہ نمبر ۱۴۸ پر ہے۔ عِنْدَ خُرُوْجِ الْمَنِیِّ مُنْفَصِلٍ عَنْ مَقَرِّہٖ وَھُوَ صُلْبُ الرَّجُلِ وَتَرَائِبِ الْمَرْأَۃِ اَیْ عِظَامُ صَدْرِھَا کَمَا فِی الْکَشَّافِ (ترجمہ) منی کے نکلنے کے وقت جدا ہو کر اپنے ٹھکانے سے اور وہ مرد کی پشت ہے اور عورت کی سینے کی ہڈیاں ہیں اسی طرح کشاف میں ہے۔ جانوروں میں مادہ کی پشت میں نطفہ ہوتا ہے۔ پشت ریڑھ کی ہڈی کا نام ہے ریڑھ کی ہڈی جڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعد موت قریبِ قیامت انہیں ذرات سے انسانی نشو و نما ہوگی جو ریڑھ کی ہڈی میں ہوتے ہیں تمام جسم فنا ہو جاتا ہے مگر ان کو نہ مٹی فنا کرے نہ آگ نہ پانی۔ پس جس کا نطفہ اس ہڈی میں ہوگا اسی سے نسل آگے چلے گی۔ مذکر انسان سے انسانی نسل چلتی ہے کہ اس کا نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں۔ اور جانور میں یہ نطفہ مادہ کی ریڑھ میں ہے اس لیے حیوانات میں نسل مادہ سے چلتی ہے نہ کہ نر سے۔ خلاصہ یہ کہ جس کی ریڑھ کا نطفہ ہوگا اسی کی نسل مانی جائے گی۔ مذکر حیوانات میں نطفہ ریڑھ میں نہیں ہوتا بلکہ بعض مذکر حیوانات میں نطفہ ہوتا ہی نہیں۔ بعض میں نطفہ مثل ہوا کے بعض جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو مذکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد نہم صفحہ نمبر ۲۵۵ پر ہے۔ اِنَّ کُلَّ حَیْوَانٍ لَا یُخْلَقُ مِنَ النُّطْفَۃِ بَلْ بَعْضُہٗ مِنَ الرِّیْحِ کَالطَّیْرِ فَاِنَّ الْبَیْضَۃَ الْمَخْلُوْقَۃَ مِنْھَا۔ اَلدَّجَاجَۃُ مَخْلُوْقَۃٌ مِنْ رِیْحِ الدِّیْکِ (ترجمہ)۔ بے شک ہر حیوان نہیں پیدا کیا جاتا نطفے سے بلکہ بعض جانور ہوا سے پیدا ہوتے ہیں پس بیشک انڈا اسی ہوا سے پیدا ہوتا ہے۔ مرغی پیدا ہوئی ہے مرغے کی ہوا سے۔ یعنی مرغا یا کوئی بھی پرند؛ جب صحبت کرتا ہے تو مادہ جانور میں صرف ہوا جاتی جس سے ایک حرکت پیدا ہوتی ہے اور حرکت کے ذریعے مادہ کی ریڑھ سے بذریعہ اندرونی نالی نطفہ اسی کے رحم میں چلا جاتا ہے۔ سوائے بطخ کے سب جانوروں کا یہی حال ہے۔ کئی دفعہ اس ہوا کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرغی مرغے کے بغیر بھی انڈے دیتی رہتی ہے۔ جس کا ہم نے تجربہ کیا ہے کہ بعض مرغیوں کو مرغ سے بالکل جدا رکھا گیا اور اچھی گرم خوراک دی گئی تو اس نے انڈے شروع کر دیئے۔ اسی طرح برساتی کیڑے کیچوے اس کے اندر مذکر مونث دونوں کی قوت ہوتی ہے اس کا علیحدہ مذکر کوئی نہیں ہوتا نہ اس کو مذکر کی حاجت۔ روح البیان جلد دہم نے صفحہ نمبر ۳۹۸ پر فرمایا کہ چونکہ مرد کا نطفہ پیٹھ سے آتا ہے عورت کا سینے سے اس لیے مرد والد اولاد کے لیے مشقتیں کرتا ہے اور ماں شفقت کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمِنْ ذَالِکَ یَتَحَمَّلُ الْوَالِدُ مُعِیْنَۃَ الْوَلَدِ وَتَشْتَدُّ رِقَّۃُ الْوَالِدَۃِ وَمَحَبَّتُھَا لِلْوَلَدِ۔ (ترجمہ):-

ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزرا۔ مگر چوپایہ مذکر جانور میں چونکہ نطفہ نہ سینے سے آتا ہے نہ ریڑھ سے اس لیے مذکر حیوان بچے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس تمام گفتگو سے یہ ثابت ہوا کہ جانوروں میں اصل والدہ ہے۔ انسانوں میں اصل والد ہے۔ اس لیئے ایک مادہ میں جتنے بھی مذکر نطفے جائیں اولاد حلالی اور پاک رہے گی بخلاف انسان کے۔ خیال رہے کہ جسم انسان میں پیدائش کے نظام کی تکمیل کے لیے مرد مذکر میں تین چیزیں ہوتی ہیں ع۱ نطفہ ع۲ منی ع۳ مذی۔ ان تینوں کا مقام علیحدہ علیحدہ ہے۔ نطفے کا مقام ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کی ایک باریک نالی دو منہ والی منی کی نالی کے ساتھ جڑی ہوئی آلۂ تناسل تک آتی ہے۔ پھر دو حصوں میں تقسیم ہو کر آلے کے دائیں بائیں متصل ہوتی ہے ایک حصہ میں نر جراثیم اور دوسرے حصے سے مادہ جراثیم نکلتے ہیں۔ منی کی نالی اس سے علیحدہ ہو کر ذکر کے بالکل نیچے ہوتی یہ بہت نازک ہوتی اس کے ساتھ بالکل مذی کی نالی ہوتی ہے اور اس سے اوپر پیشاب کی نالی ہوتی منی کی نالی کے ساتھ تین پٹھے ہوتے ہیں جس میں نرمی سختی پیدا ہوتی ہے۔ گویا آلۂ تناسل چار نالیوں اور تین پٹھوں کا مجموعہ ہے۔ اگر دائیں بائیں کی رگیں کاٹ دی جائیں تو پیدائشی جراثیم جس کو نطفہ کہا جاتا ہے بند ہو جاتا ہے۔ پھر اس مرد کی اولاد نہیں ہوتی لیکن منی نکلتی رہتی ہے۔ انسانی عورت کا نطفہ اس کے پستانوں میں ہوتا ہے۔ اُسکی بھی دو نالیاں ہوتی ہیں وہ دونوں فرج داخلی سے لوٹ کر پھر رحم میں چلی جاتی ہیں۔ اگر یہ دونوں نالیاں بھی کاٹ دی جائیں تب عورت کے اولاد نہیں ہوتی۔ مرد کا نطفہ لمبے کیڑے کی شکل ہوتا ہے جس کو سائنسی زبان میں جرثومہ کہا جاتا ہے۔ اسی شکل پر مذکر حیوان کا نطفہ ہوتا ہے۔ مادہ خواہ عورت ہو یا گائے بھینس بکری یا کوئی پرندہ یا کیڑے مکوڑے ان کا نطفہ مثل انڈے کے گول ہوتا ہے۔ ہاں مسکن اور جائے رہائش علیحدہ ہوتا ہے کہ عورتوں کے پستانوں کے درمیان پرندہ مونث کی ریڑھ کی درمیانی مقام جہاں انڈوں کا گچھا ہوتا ہے۔ چوپایہ مونث میں ریڑھ کے آخری سرے دم کے پاس۔ مذکر چوپایہ میں مخزنِ منی میں ہی اس کا نطفہ ہوتا ہے ایک صحبت سے مذکر کے نطفے ہزاروں کی تعداد میں نکل آتے ہیں۔ جن میں سے ایک رحم میں چلا جاتا ہے اور باقی ضائع ہو جاتے ہیں۔ مونث کا نطفہ ایک صحبت میں ایک ہی انڈا نکل کر رحم میں آجاتا ہے۔ انسانی عورت کا صحبت کے وقت آتا ہے لیکن دیگر جانوروں کا اس گرمی کی وجہ سے صحبتِ نر سے پہلے ہی رحم میں آجاتا ہے۔ جو گرمی مقررہ وقت میں مادہ حیوان کو پہنچتی ہے۔ جس کو پنجابی میں ہرن کہا جاتا ہے۔ اسی فرق کی بنا پر انسانوں میں بیک دم انزال قیام حمل کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جانوروں میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بدیں وجہ جانوروں میں مصنوعی نسل کشی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ مادہ کا نطفہ تو اس کے رحم میں پہلے ہی جا چکا ہے اب صرف مذکر نطفے کی ضرورت ہے خواہ وہ کسی طرح بھی ڈال دیا جائے۔ بخلاف عورت کے کہ اس کو مرد کی صحبت نے گرمی پہنچائی ہے جس سے اس عورت کا نطفہ پستانوں سے منتقل ہو کر رحم میں آئے گا۔ چونکہ طبی ڈاکٹری تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے

کو نر کے ملاپ کے بغیر بھی ٹیکے کے ذریعے مذکر نطفہ رحم میں ڈالنے سے حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے سورۃ نجم۔ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ (ترجمہ) پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے جوڑا نر و مادہ نطفے سے جب وہ نطفہ منی کے ساتھ رحم کے اندر ڈالا جائے۔ لفظِ تمنیٰ بتا رہا ہے کہ صرف وطی ہی سے نطفہ رحم میں نہیں جاتا بلکہ اور بھی بہت سے طریقوں پر نطفہ اندر ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر صرف مذکر کی وطی سے ہی نطفہ اندر جاتا ہوتا تو لفظِ تمنیٰ اور دوسری جگہ مِنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى نہ فرمایا جاتا بلکہ وطی فرمایا جاتا۔ اور میری ذاتی تحقیق کے مطابق یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کسی مصنوعی گرمی کے ذریعے عورت کو گرم کر دیا جائے پھر خاوند کا نطفہ روئی میں لپیٹ کر بیوی کے رحم میں رکھ دیا جائے تو حمل ثابت ہو جائے گا اور بچہ حلالی ہو گا۔ مگر فی الحال یہ بات تجربوں سے عاری ہے اور عبث بھی۔ اگر کسی اور مرد کا یا جانور کا نطفہ عورت کے رحم میں رکھا گیا تو بچہ حرامی ہو گا خواہ انسانی بچہ ہو یا مسخ شدہ۔ دوسری چیز منی ہے۔ منی کا مخزن مذکر انسان یا حیوان کے فوطوں میں ہوتا ہے۔ مونث حیوان کی اور تمام پرندوں کی منی نہیں ہوتی۔ عورت کی منی اس کی فرج داخلی کے پاس ہوتی ہے فم رحم کے قریب۔ منی غذاؤں سے بنتی ہے۔ جب طبی دنیا میں پہنچ کر انسان ذی عقل اپنے نفس میں غور کرتا ہے تو قدرت کے شاہکار دیکھ کر ان میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور ورطۂ حیرت میں عاجز رہ جاتا ہے کہ خلّاقِ کائنات نے جسم انسانی میں کتنا عظیم کارخانہ قائم فرمایا۔ خود انسان جس نے آسمانوں پر پروازیں شروع کر دیں اپنے اندر نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی لئے عقلاءِ کائنات کو حکم دیا جا رہا ہے۔

اے لوگو اپنی ذات میں کیوں غور نہیں کرتے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

عشق و معرفت کی تو وادی ہی جدا ہے۔ خود طلسمِ عقل سے انسان کو اپنے اندر سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ جب انسان غذا کھاتا ہے تو چار مرتبہ نظام ہضم کا ورود ہوتا ہے۔ پہلا مرتبہ ہضمِ فضلہ۔ دوسرا مرتبہ ہضمِ معدہ۔ تیسرا مرتبہ ہضمِ کبدی۔ چوتھا مرتبہ ہضمِ دموی۔ جب غذا کھائی جاتی ہے تو سیدھی معدہ میں جاتی ہے جہاں اس کے تین حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک حصہ فضلہ بن کر دبر سے نکلتا ہے۔ ایک حصہ گردوں کے راستے مثانے میں چلا جاتا ہے جس سے کچھ پیشاب بنتا ہے اور کچھ ودی بن جاتا ہے۔ اور تیسرا حصہ عمدہ کہلاتا ہے یہ عمدہ حصہ کلیجی میں آجاتا ہے جہاں یہ تین حصوں میں پھر تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ ریشہ بن جاتا ہے ایک پانی اور ایک خون۔ خیال رہے کہ غذاءِ انسانی حیوانی میں چار عنصر موجود ہوتے ہیں۔ آگ ہوا مٹی پانی۔ پس جس غذا میں جس عنصر کی زیادتی ہوتی ہے وہ غذا اسی نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اور اسی عنصر کا اثر جسم انسانی پر خاص طور سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں ترکاری بادی ہے فلاں سرد۔ فلاں خشک فلاں معتدل وغیرہ۔ یہ انہیں عناصر کے غلبے کے نام ہیں۔ پھر اس غذا سے حاصل شدہ پانی گوشت سے لگ جاتا ہے اور ریشہ ہڈیوں سے اور خون دل میں۔ پھر خون کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ خالص خون جو جسمانی رگوں میں

جاکر جسم کی پرورش کرتا ہے۔ اسی کی صحت پر جسمانی صحت اور موت و حیات وابستہ ہے۔ دوسرا حصہ بلغم جو سینے پر جمع ہوتا ہے اور دماغی ہڈیوں کو پرورش دیتا ہے۔ تیسرا حصہ منی مخزنِ منی میں جاکر آئندہ نسلی جراثیم کی ڈیوٹی سنبھالتی ہے۔ غذا کی ساری گرمی اسی میں آجاتی ہے۔ اس کی حدت کی بھاپ سے پسینہ آتا ہے۔ اس کو مذی کہا جاتا ہے۔ یہ ہے قدرت کے کارخانے کا وہ کام جو ہماری غذا سے باری تعالیٰ نے ہمارے اندر تیار فرمائے۔ کون ہے جو اس کے اس شاہکار اور صنعاتِ ہشت کا مقابلہ تو در کنار کما حقہٗ سمجھ ہی سکے۔ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ پاک ہے وہ ذات جس کے قبضے میں ملک ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے یہ ہی وہ غذائیں ہیں جن سے نسلوں کی حفاظت کے لیئے جسمِ انسانی کے باطن کو کارخانۂ قدرت بنا دیا۔ اور اسی حفاظتِ غذا کے لیئے ظاہر میں چار ڈاکٹر مقرر فرمائے۔ پہلا ڈاکٹر ہاتھ کہ جو سرد گرم معلوم کر کے قابلِ برداشت بنا کر آگے روانہ کرتا ہے۔ اس لیئے اسلام نے ہاتھ سے کھانے کا حکم دیا ہے۔ اور ہاتھوں کو دھونے کا حکم دیا کہ دستی غلاظت سے غذا ملوث نہ ہو۔ دوسرا ڈاکٹر ناک ہے جو بُرے بھلے بدبو خوشبو کا تھرمامیٹر ہے۔ اور آگے جانے سے پہلے بتا دیتا ہے کہ یہ کھانا کیسا ہے صحت مند ہے یا مضر۔ تیسرا ڈاکٹر دانت ہے جو منہ میں جاتے ہی فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ نوالہ کنکر مٹی والا ہے یا صاف ستھرا۔ پھر آگے بڑھتا ہے تو چوتھا ڈاکٹر زبان سامنے آجاتی ہے جو کڑواہٹ کھٹاس بدمزگی ظاہر کر کے اندر جانے کی اجازت یا رکاوٹ کرتی ہے۔ قربان جاؤ اس اَحْسَنُ الْخَالِقِین رب کریم کے جس نے بلا عوض صرف نطفۂ انسانی اور بقاءِ آدمیت کے لیئے بیرون اتنے ڈاکٹر اور اندرون میں ایسا کارخانہ بنایا۔ یہ تو انسانی تحقیق تھی کہ یہاں عقلِ انسانی کی پہنچ ہے۔ مگر اصل نطفہ کی حقیقت نے تو سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہوا ہے۔ نہ فلسفی جان سکا نہ سائنسدان نہ طبیب کی فہم پا سکا نہ ڈاکٹر کی عقل پہنچ سکی نہ اِدراک۔ سب عقلیں دوڑا کر تھک چکے۔ کسی نے کہا کہ نطفہ کاربن کیلشیم اور سوڈیم ان مادوں سے مل کر بنا ہے یہ موجودہ بے وقوف سائنس والوں کی بات ہے۔ بعض قدیم سائنس دانوں نے کہا کہ نطفہ ایک کیمیاوی گیس سے پیدا ہوا۔ متقدمین فلاسفہ نے کہا کہ نطفہ ہماری خوردہ غذاؤں اور ماکولات سے بنتا ہے۔ مگر یہ سب اختراعی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہی ہے کہ هٰذَا شَيْءٌ لَا يَصِلُ إِلَيْهِ فَهْمُ الْعُقَلَاءِ وَلَا يَعْلَمُوْنَهٗ وَاِنَّمَا هُوَ بِقُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَخَلْقِهٖ لَا بِفِعْلِ الطَّبِيْعَةِ (اربعہ تفاسیر جلد ششم ص۱۱ ترجمہ) یہ نطفہ ایسی چیز ہے کہ جس کی حقیقت میں عقلاء کا فہم نہیں پہنچ سکتا نہ وہ اس کو جانیں، یہ تو اللہ خالق مالک کی عجیب قدرت سے ہی ہے اور اس کی پیدائش ہی ہے نہ کہ طبعی افعال سے۔ منی مذی ودی تو غذاؤں سے بن جاتی ہے مگر نطفہ اصلیہ تو مولود بچے کے ساتھ ہی اس کی ریڑھ وغیرہ مسکنوں میں کروڑوں کی تعداد میں اول ہی ودیعت رکھا ہوتا ہے، گویا کہ ہر نومولود بچہ پیدا ہوتے ہی باطنی طور پر کروڑوں بچوں کا باپ اور ماں بنا ہوتا ہے۔ اب جب کہ رحم مادر میں دونوں

نطفے والدہ والد کا جمع ہو گئے۔ مذکر کے جراثیم نے مادہ کے بیضہ کو پکڑنے کی کوشش کی اگر وہ مونث کا انڈا چھوٹا ہو تو یہ توڑ کر کھا جائے گا۔ اس طرح لڑکا یعنی نر حمل بنے گا اور اگر انڈا بڑا ہو تو یہ مذکر جرثومہ اس انڈے میں داخل ہو گا اور حمل مونث پیدا ہوگا۔ تفسیر صاوی جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۲۳ پر ہے۔ فَمَاءُ الرَّجُلِ غَلِیْظٌ اَبْیَضُ وَمَاءُ الْمَرْأَةِ رَقِیْقٌ اَصْفَرُ فَاَیُّهُمَا عَلَا كَانَ الشِّبْهُ لَهٗ وَاِنْ سَبَقَ مَنِیُّ الرَّجُلِ كَانَ الْوَلَدُ ذَكَرًا وَعَكْسُهٗ اُنْثٰی وَاِنِ اسْتَوَیَا فَخُنْثٰی مُشْكِلٌ یہ لڑائی چالیس گھنٹے یعنی دو دن اور دو راتیں ہوتی رہتی ہے۔ پھر جس کو میرا رب نعلیہ عطا فرمائے یہاں تک کہ لوتھڑا بن جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا پھر باپ کے نطفے سے ہڈی پٹھے اور ماں کے نطفے سے گوشت بال وغیرہ (روح البیان جلد دہم ۲۶) مگر حیوانات میں اس کا عکس ہوتا ہے۔ نطفہ چونکہ ابتدائی جزئیات میں سے ہے اس لئے ماں باپ کی نسلیت کا اس پر بہت اثر ہوتا ہے کہ گویے کا بیٹا پیدائشی گویا ہوتا ہے۔ عالم کا بیٹا علم کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس کے خیالات بھی عاقلانہ ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی اولاد بادشاہی طبیعت ہی رکھتی ہے ذاکر والدین کے نطفے بھی ذاکر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض پیدائشی اولیاء اللہ کے نطفوں میں ذکر الٰہی کی خوشبو رچ بس گئی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ۵ پر ہے۔ یُحْكٰی اَنَّ بَعْضَ اَهْلِ الرِّیَاضَةِ الْمُحَقِّقِیْنَ مِنْ اَهْلِ التَّوْحِیْدِ الْحَقَّانِیِّ كَانَ یَشُمُّ مِنْ فَضَلَاتِهِمْ رَائِحَةَ الْمِسْكِ (الخ) فَهُمْ مِنَ النُّطْفَةِ صُوْرَةً وَمِنَ النُّوْرِ مَعْنًی۔ ترجمہ حکایت ہے کہ بعض اولیاء اللہ کے فضلات یعنی نطفوں میں مشک کی خوشبو آتی تھی (الخ)، پس وہ ظاہر میں نطفہ ہے باطن میں نور ہوتا ہے۔ علامہ قزوینی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب عجائب مخلوقات دوم میں صفحہ نمبر ۹۲ پر بقراط فلسفی کی تحقیق درج کی ہے۔ اِنْ جَرَتْ مِنْ یَمِیْنِهٖ اِلٰی یَمِیْنِهَا كَانَ الْوَلَدُ ذَكَرًا تَامًّا الذُّكُوْرَةِ وَاِنْ جَرَتْ مِنْ یَسَارِهٖ اِلٰی یَسَارِهَا كَانَ الْوَلَدُ اُنْثٰی تَامَّ الْاُنُوْثَةِ (الخ) ترجمہ اگر مذکر نطفہ مونث نطفہ کے دائیں سمت سے ملاپ کرے اور اس کو توڑے تو نر پیدا ہوتا ہے۔ مکمل طور پر اور اگر بائیں سمت سے ملاپ کرے تو حمل مونث پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سب قدرت کی صناعی ہے جس کو حقیقتاً کوئی نہیں جان سکا۔ کرشمۂ قدرت تو دیکھئے کہ باری تعالیٰ نے رحم کی تھیلی ایسی پیدا فرمائی کہ اس کی حقیقت کو آج اس تحقیقاتی دور میں کوئی نہیں جان سکا۔ ایکسرے سکرین میں انسانی حیوانی جسم کی تمام جزئیات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مگر رحم کے اندر کا حال سکرین بھی نہیں بتا سکتی۔ چنانچہ خود باری تعالیٰ اپنی خصوصیات میں ارشاد فرماتا ہے۔ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ترجمہ وہ اللہ رحم کے اندر کی چیز کو بھی جانتا ہے۔ خصوصیت سے اسی لئے ذکر فرمایا کہ اس کی حقیقت کو بھی کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ انسانی عقل تو صرف اتنی تجرباتی تحقیق کر سکتی ہے کہ مصنوعی طریقے سے مذکر کا نطفہ رحم میں ڈال دے۔ اور دیگر بہت سی ایجادات کی طرح یہ ایجاد بھی مسلمان عربوں کی ہے۔ جس کا اعتراف خود عیسائی انگریزوں کو ہے۔ چنانچہ دو مشہور انگریز ڈاکٹر مرانیڈ

ویسٹ اپنی ڈکشنری بلیکس ویٹرنری پانچویں ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۵۸ دوسرے کالم تیسری سطر میں لکھتا ہے کہ آج سے پانچ سو سال پیشتر مصر کے عرب سائنس دان نے روئی کے ذریعے عربی گھوڑوں کا نطفہ دوسرے ملک بھیجا اور اس کے ذریعے عربی گھوڑوں کی نسل برآمد کی۔ ان سے انگریز ڈاکٹروں نے یہ طریقہ سیکھا اور مزید تحقیق کی۔ یہاں تک کہ آج قریہ قریہ مصنوعی طریقوں سے نسل کشی کی جارہی ہے۔ اور حیوانات میں یہ طریقہ قانونِ شرعیہ کے مطابق بالکل جائز ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا۔ بلکہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر فی زمانہ مفید ہے۔ ہاں انسانوں کو یہ کام قطعاً حرام ہے۔ اگر غیر مرد دیگر انسانوں سے ہو۔ یہ حرمت کافر و مسلمان پر یکساں جاری ہوگی۔ اگر کسی کافرہ عورت کے رحم میں بھی غیر خاوند کا نطفہ گیا تو بچہ قانوناً حرامی متصور ہوگا۔ اور خاوند سے نسب ثابت نہ ہوگا نہ وارث بنے گا نہ مورث۔ جانوروں میں جائز ہے۔ خواہ جانور ماکولی ہو یا غیر ماکولی۔ اس کے چند فائدے۔ پہلا فائدہ اس عمل مصنوعی سے ایک دفعہ میں حاصل کردہ نطفے سے ایک سال تک کئی مادہ جانوروں سے بچے لیئے جا سکتے ہیں۔ جس سے بہت سا خرچ بچنے کے ساتھ بلا مشقت بہت سے مویشی پیدا کیئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ مذکر کی وطی سے ایک دفعہ کے نطفے سے صرف ایک بچہ حاصل ہوا باقی نطفہ بیکار دوسرا فائدہ اس نسل کشی سے ایک غریب چرواہا بھی بے شمار جانوروں کا مالک بن سکتا ہے۔ تیسرا فائدہ اس عمل سے غیر ملکی اعلیٰ نسل کے حیوانات گھر بیٹھے حاصل ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ عربی گھوڑے۔ ولایت کی گائیں جو اپنے بیشمار دودھ کی وجہ سے پاکستانی فارموں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ چوتھا فائدہ مذکر کے مرجانے یا بیمار ہوجانے کے بعد بھی اس کا نطفہ جمع شدہ لے کر اسکی اعلیٰ نسل حاصل کی جا سکتی ہے۔ پانچواں فائدہ لنگڑے اور بوڑھے مذکر حیوان جو وطی پر قادر نہ ہو اس کی اچھی نسل بھی لی جا سکتی ہے۔ غرضیکہ اگر ذرا سی احتیاط کر کے خالص طریقے سے نطفہ حاصل ہو جائے تو دنیوی لحاظ سے بہت فوائد ہیں اور شریعت کے قانون کے مطابق ہر وہ دنیوی فائدہ جو شریعت اسلامیہ سے نہ ٹکرائے وہ شرعاً بالکل جائز ہے۔ لہٰذا دلائل مندرجہ بالا کے تحت چونکہ اس مصنوعی نسل کشی میں شریعت کی کسی طرح مخالفت نہیں ہوتی بدیں وجہ یہ عمل جائز اور فائدہ مند ہے۔

خلاصہ یہ کہ:۔ قانون شریعت کے مطابق سوال مذکورہ میں جس نطفے اور نسل کشی کے جدید طریقے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل جائز اور مباح بلکہ مفید ہے۔ ایسے مادہ جانور کا دودھ بالکل جائز پاک و حلال ہے اور اس کے مولودہ بچے کا گوشت حلال و طیب ہے۔ ہاں اس طرح نسل کشی انسانوں میں شرعاً قطعاً جائز نہیں۔ بلکہ فعل حرام اور اولاد حرامی ہوگی۔ بجز خود خاوند کے نطفے کے کہ اگر خاوند کا نطفہ روئی یا کپڑے میں لپیٹ کر بیوی کے رحم میں رکھ دیا جائے اور حمل ٹھہر جائے تو نسب ثابت ہوگا اور حمل نو مولودہ بچہ حلالی متصور ہوگا۔ حیوانات و انسانات کی یہ تفریق اس لیئے ہے کہ جانوروں اور انسانوں میں خلقتاً اور شرعاً پانچ طرح فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسانوں میں نسل و اصل باپ سے چلتی ہے حیوانوں میں ماں سے۔ اسی لیے انسانوں میں یتیم وہ بچہ ہے جس کا باپ مرجائے۔ جانوروں میں یتیم وہ بچہ ہے جس کی ماں مرجائے۔ اور حیوانوں میں بچہ اور حمل والدہ کا اور والدہ کے مالک کا ہوتا ہے۔ مگر انسانوں میں بچہ اور حمل باپ اور باپ والوں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح تفسیر صاوی جلد اول ص۳۹ تفسیر روح البیان جلد اول ص۱۲۷ روح المعانی جلد اول ص۳۱ پارہ اول پر ہے دوسرا فرق یہ ہے کہ تمام جاندار مخلوق میں انسان میں نر اور حیوانات میں مادہ کا نطفہ شدید تر قوت والا ہے اور دوسری طرف عورت کا نطفہ اور مذکر حیوان کا نطفہ غیر قوت والا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں وطی کی رغبت مرد کی جانب سے ہوتی ہے اور عورت میں شہوت کم ہے اور مرد میں زیادہ ہے۔ مرد جب چاہتا ہے وطی کر لیتا ہے اور حمل ٹھہر جاتا ہے عورت کو مرد مائل کرتا ہے بخلاف حیوانات کے کہ ان میں مادہ جانور وقت مقررہ پر خود رغبت اور خواہش رکھتی ہے۔ تب مذکر حیوان مائل بصحبت ہوتا ہے۔ اگر مادہ جانور کو خواہش نہ ہو تو مذکر حیوان کبھی بھی وطی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ تجربات نے بھی ثابت کیا ہے اور کتاب فیضاءُ الابصار فی حد الباہ ص۱۵ پر ہے۔ تیسرا فرق یہ کہ انسانی نطفہ جس رحم میں بھی جائے گا انسانی نسل ہی پیدا ہوگی۔ عورت کے رحم میں جائے یا گائے بھینس بکری کے رحم میں۔ بخلاف جانوروں کے کہ ان کے مذکر کا نطفہ اپنا اثر کم دکھاتا ہے وہاں مادہ کا اثر زیادہ نمودار ہوتا ہے اور اگرچہ کتا یا بھیڑیا بکری سے وطی کرے مگر اکثر بکری کی نسل ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کتب فقہا میں لکھا ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی یہی ہے چنانچہ ۱۹۶۷ء ۲۷ جولائی جنگ اخبار راولپنڈی ص۲ کالم ۴ پر اسی طرح خبر تھی کہ ہندوستان کے ایک شہر پٹھ پور ضلع دھار واڑ میں ایک بکری نے بالکل انسانی بچہ جنم دیا یہ کسی انسانی وطی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ پہاڑی علاقوں میں اکثر بھیڑیے اور کتے بھی بکریوں سے صحبتیں کر لیتے ہیں مگر بچہ مولود بکری کی ہی نسل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر انسان مرد کسی جانور سے وطی کرے تو فوراً جانور مادہ کو ذبح کر کے دفن کر دو۔ یا جلا کر ختم کر دو تاکہ نسل انسانی حیوان سے پیدا نہ ہو مگر ایک حیوان مذکر دوسری نسل حیوان مادہ سے صحبت کرے تو کوئی سزا نہیں نہ مادہ ذبح کی جائے نہ اس کا بچہ حرام ہو۔ جیسا کہ فتاویٰ شامی اور دیگر کتب فقہا نے لکھا ہے۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیری جلد پنجم صفحہ نمبر ص۲۹۷ پر ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نسل انسانی میں نطفہ ریڑھ کی ہڈی میں ہے۔ عورت کا نطفہ پستانوں کے پاس سینے کی ہڈیوں میں ہے۔ جانوروں میں مذکر کا نطفہ خصیتین میں مادہ کا نطفہ پشت میں۔ جس کا دوسرا نام ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی وجہ سے نسلِ حیوانی مونث والدہ سے چلتی ہے اور انسانی نسل باپ سے چلتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے انسانی بچہ بغیر باپ کے نطفے کے ہرگز نہیں پیدا ہو سکتا۔ بخلاف جانوروں کے کہ بہت سے جانور بغیر مذکر کے پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ تمام پرندوں کے نطفے فقط ہوا کی مثل ہوتے ہیں۔ نہ مادہ منویہ ہوتا ہے نہ تذکیری جراثیم نہ جرثومے نہ بیج۔ اور بہت دفعہ مرغی بغیر اپنے مذکر کے انڈے دینا شروع ہو جاتی ہے۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ عورت کا نطفہ جو انڈے کی شکل کا بے جان

باریک ترین ذرہ ہوتا ہے وہ مرد کی صحبت اور رگڑ سے اپنے مسکن سے منتقل ہو کر رحم میں آتا ہے۔ صحبت سے پہلے نہیں آتا۔ مگر حیوان مادہ کا جو نطفہ باریک انڈے کی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ مونث حیوان کی اپنی گرمی اور شدت سے رحم میں وقت مقررہ پر آجاتا ہے تب مادہ جانور کو خواہش ملاپ پیدا ہوتی ہے اسی لیے حیوانی نسل کشی خواہ مذکر حیوان کی وطی کے ذریعے ہو یا نطفہ نکال کر ٹیکے کے ذریعے یا مسلمانوں کے پرانے طریقے کے مطابق جیسا کہ مصنوعی نسل کشی کا طریقہ سب سے پہلے عرب مسلمانوں نے عربی گھوڑوں کی نسل کشی برآمد کرنے کے لیے مذکر گھوڑے کا نطفہ روئی میں محفوظ کر کے ولایت کی گھوڑیوں میں داخل کیا جس کے نتیجے میں عربی گھوڑے اور گھوڑیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انگریز مسٹر ابنڈ ویسٹ اپنی ڈکشنری بیکس ریٹرنری کے پانچویں اڈیشن صفحہ نمبر ۵۷ کالم نمبر ۲ سطر ۳ میں لکھتا ہے کہ آج سے پانچ سو سال پیشتر مصر عرب کے مشہور سائنس دان نے روئی کے ذریعے گھوڑے کا نطفہ گھوڑی کے رحم میں ہاتھ سے داخل کیا جس سے حمل ٹھہر گیا۔ مسلمانوں کی اسی ایجاد کو دیکھ کر عیسائیوں نے نئے تجربات کیے اور آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دفعہ کا نطفہ کشید کر کے تقریباً چالیس پچاس ٹیکے بنا کر ایک سال تک کم ترین درجہ حرارت کی فریج میں محفوظ کر کے بوقت ضرورت مادہ گائے بھینس بکری کو لگا کر حاملہ کر دیتے ہیں۔ اور انڈے کی صرف سفیدی تھوڑا گلوکوز تھوڑا اسی نطفے کی نسل کا دودھ ملا کر نطفے کے ہزارہا نسلی جراثیوں کو تقسیم کر کے ایک نطفے سے پچاس ٹیکے بنا لیتے ہیں جو پچاس مؤنثوں کے کام آتے ہیں۔ نطفہ مذکر حیوان کا ہی ہوتا ہے۔ کسی مصنوعی طریقے سے نہیں بنایا جاتا۔ صرف اسی [illegible] مندرجہ بالا انڈے کی سفیدی وغیرہ ملا کر مصنوعی منی بنا لی جاتی ہے تاکہ نطفے کے جراثیم بڑھ کر خوراک حاصل کرتے رہیں۔ اور سال بھر تک ٹیکے میں زندہ رہیں۔ ٹیکہ ایک ربڑ کی چھوٹی ٹیوب کی شکل کا ہوتا ہے۔ جب مادہ جانور بھینس یا گائے بولتی ہے تو اس پر مذکر حیوان اسی نسل کا اسی طرح چھوڑا جاتا ہے کہ اس کے آلہ تناسل پر فرج کی طرح کی ٹیوب باندھ دیتے ہیں۔ جب مذکر حیوان چڑھتا ہے تو اس کا آلہ تناسل مادہ کی فرج میں نہیں جاتا کیونکہ ٹیوب رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ سارا نطفہ آلہ تناسل سے نکل کر ٹیوب میں جمع ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیوب اتار کر لیبارٹری میں جا کر تقسیم کر کے بہت سے ٹیکے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا قانونِ شرعی کے مطابق حرمت کی کوئی وجہ نہیں۔ پس یہ مصنوعی نسل کشی موجودہ مذکورہ بالا طریقے سے بالکل جائز ہے۔

اور چونکہ اس کے بہت سے فائدے ہیں اس لیے بھی جائز ہے۔ کیونکہ شریعت مطہرہ میں ہر وہ چیز جائز ہے جو مفید ہو اور شریعت کے مخالف نہ ہو۔ پس چونکہ یہ طریقۂ نسل کشی اور شریعت اسلامیہ کے کسی طرح مخالف نہیں بلکہ بعینہٖ مطابق ہیں اس لیئے بالکل جائز ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کتاب الایمان

درود خضری کیا ہے انبیاء کرام اور ملائکہ کا درود شریف

سوال نمبر ۱۴ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں ۱- سیدنا حضرت آدم علیہ السلام نے "بارشاد اللہ جل مجدہٗ" برائے حق مہر سیدتنا حضرت حوا رضی اللہ عنہا جو درود شریف پڑھا تھا وہ کیا تھا۔ ۲- درود شریف خضری کو خضری درود کیوں کہتے ہیں؟ ۳- مقدمین و مؤخرین حضرات کے زمانہ کی ابتداء و انتہا نیز ان کی وجہ تسمیہ کی حکمت سے آگاہ فرمائیے۔

محمد یعقوب خطیب جامع مسجد فیض مدینہ کاموں کے ضلع گوجرانوالہ

بعون العلام الوہاب

الجواب

(۱) مفسرین کرام اس بارے میں اختلاف فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا وہ مہر کیا تھا جو آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت حوا کو عطا فرمایا بعض مفسرین نے فرمایا کہ وہ مہر سونا چاندی تھا جو آپ جنت سے لے کر آئے۔ اور حضرت حوا کو عطا فرمایا۔ حضرت حوا نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ نے اسی سونے چاندی کو اتنا بڑھایا کہ سونے چاندی کی کانیں بن گئیں۔ دنیا میں اس سے پہلے سونا نہیں تھا اسی سونے سے دنیا میں سونے چاندی کی ریل پیل ہو گئی چنانچہ تفسیر در منثور جلد اول ص ۵۶ پر علامہ جلال الدین سیوطی عبدالرحمن بن ابی بکر مطبوعہ مصر فرماتے ہیں۔ وَاَخْرَجَ ابْنُ عَسَاكِرٍ مِنْ طَرِيْقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ لَمَّا خَلَقَ الدُّنْيَا لَمْ يَخْلُقْ فِيْهَا ذَهَبًا وَّلَا فِضَّةً فَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ مَنْفَعَةً لِاَوْلَادِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا وَجَعَلَ ذَالِكَ صِدَاقَ اٰدَمَ لِحَوَّآءَ فَلَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّتَزَوَّجَ بِلَا صِدَاقٍ۔ اس روایت کی بنا پر بعض مفسرین حضرت حوا کا مہر جنت کا سونا چاندی بتاتے ہیں اور اسی بناء پر مندرجہ ذیل چند لطائف

مستنبط ہیں:۔
نمبر(۱) سب سے پہلے حضرت حوّا نے خزانہ جمع کیا۔ نمبر(۲) سونا چاندی جنّت کی دولت ہے اسی لیے قیمتی ہے اور اس کو فنا نہیں۔ (۳) دنیا میں صرف عورت کے لیے سونا چاندی آیا اسی لیے دنیا میں مرد پر حرام ہے (۴) جنت اصل مقام مرد کا ہے عورت صرف اس کے دل بہلاوے کے لیے ہے اس لیئے جنت میں مرد پر جنّتی دولت سونا چاندی حلال ہے۔ جیسے کہ سب فقہاء اسلام فرماتے ہیں (۵):۔ جنت سے بہت سی چیزیں حضرت آدم علیہ السلام اپنے ساتھ لے کر زمین پر تشریف لائے جس میں حجرِ اسود تمام غذاؤں کے بیج۔ اور خوشبوؤں کے بیج بھی شامل تھے۔ مگر سونا چاندی حضرت حوّاء لے کر آئیں۔ جیساکہ مندرجہ بالا اشارۃُ النص سے ثابت ہے۔ اسی لیئے عورتوں کو سونے سے زیادہ پیار ہے۔ (۶):۔ چونکہ حضرتِ حوّا سرزمینِ عرب میں نازل ہوئیں۔ اس لیئے سونے چاندی اسی اطراف میں زیادہ ہیں۔ اور حضرت آدم ہندوستان کی سرزمین میں تشریف لائے اس لیئے خوشبویات غذائی پیداوار وغیرہ اسی کشمیر وغیرہ کے علاقہ میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام علماءِ کرام ومحققین ومدققین کے بیان کردہ لطائف تھے۔ اس مندرجہ روایت کی بناء پر۔ مگر جمہور فقہاء ومحققین فرماتے ہیں کہ حضرتِ حوّا کا مہر درود شریف تھا۔ اسی مسلک کی بناء پر بعض علماء نے تفسیر درِ منثور کی بالا روایت کو ضعیف قرار دیا اور ضعف کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ ابن عساکر اس روایت کی سند میں ہے۔ حالانکہ ابن عساکر ضابطہ اور حافظہ کے اعتبار سے تمام محدثین کے نزدیک کمزور ہیں اس لیئے یہ مذکورہ روایت ضعیف ہے۔ درِ منثور کی یہ روایت مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں اسی لیئے کسی مفسّر نے اس روایت کو اپنی کتب میں نہ لکھا۔ مگر مسلکِ صحیح جمہور بہت سی کتب میں مرقوم ہے۔ چنانچہ حضرت محقق عالم صوفی باصفا علامہ یوسف بن اسماعیل نبھانی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب سعادۃ دارین صـ۸۸ پر فرماتے ہیں کہ حضرتِ آدم علیہ السلام جب نیند سے بیدار ہوئے تو حضرت حوّا کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ قَالَ یَا رَبِّ مَا ھِیَ قَالَ حَوَّا قَالَ یَا رَبِّ زَوِّجْنِیْ مِنْهَا قَالَ هَاتِ مَهْرَهَا قَالَ یَا رَبِّ مَا مَهْرُهَا قَالَ تُصَلِّیْ عَلٰی صَاحِبِ هٰذَا الْاِسْمِ عَشْرَ مَرَّاتٍ قَالَ یَا رَبِّ اِنْ فَعَلْتُ اَتُزَوِّجُنِیْهَا قَالَ نَعَمْ فَصَلّٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ عَشْرَ مَرَّاتٍ فَکَانَ مَهْرُهَا:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دس مرتبہ آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھوایا۔ تفسیر عزیزی جلد اوّل صـ۲۲۷ پر ہے حکم رسید کہ دست باو مرساں تا وقتیکہ مہر او را ادا نہ کنی (حضرت آدم علیہ السلام) عرض کرد کہ مہر کیست حکم شد (الخ) پس حضرت آدم علیہ السلام

دہ یا محمد و آلِ محمد؛ بس اسی طرح نزہۃ المجالس جلد دوم ص۱۸۹ پر ہے مگر وہاں تین مرتبہ درود شریف کا ذکر ہے، چنانچہ ارشاد ہے:- فَقِیْلَ لَہٗ حَتّٰی اَنْ تُؤَدِّیَ مَهْرَهَا قَالَ وَمَا هُوَ قَالَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔ مشہور کتاب طہارت القلوب جلد دوم ص۱۱۳ فَقَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مَهْ یَا اٰدَمُ فَقَالَ لِمَ وَقَدْ خَلَقَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى لِیْ فَقَالُوْا حَتّٰی تُؤَدِّیَ مَهْرَهَا قَالَ مَا مَهْرُهَا قَالُوْا اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی مُحَمَّدٍ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ۔ کتاب مواہب اللدنیہ جلد اول ص۱۰ پر بھی اسی طرح تین مرتبہ درود شریف مہر حوا کا ذکر ہے۔ لیکن ابن جوزی اپنی کتاب سَلْوَةُ الْاَحْزَانِ میں دس مرتبہ درود شریف کا ذکر فرماتے ہیں۔ تفسیر صاوی پہلی جلد ص۲۲ پر بھی تین مرتبہ آدم علیہ السلام کے درود شریف پڑھنے کا ذکر ہے۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ جمہور یعنی کثیر فقہاء و محدثین مفسرین محققین کا یہی مسلک ہے کہ حضرتِ حوا کا مہر درود شریف ہی بنا تھا۔ رہا یہ سوال کہ وہ کونسا درود شریف تھا۔ تو اس کے بارے میں کوئی حتمی تعین ثابت نہیں۔ تین قسم کے درود شریف حضرت آدمؑ کی طرف منسوب ہیں۔ ایک درود وہ جو سب سے پہلے حضرتِ آدمؑ نے زندہ ہوتے ہی پڑھا۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہفتم ص۲۲۳ پر ہے:- وَاَیْضًا لَمَّا خُلِقَ اٰدَمُ سَمَّاهُ اَبُوْ الْبَشَرِ وَرَاٰی نُوْرًا مُحَمَّدٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ عَلٰی جَبِیْنِهٖ فَصَلُّوْا عَلَیْهِ وَقِیْلَ۔ اور کتب عملیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ یہ تھے وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الدَّاعِیْ اِلَی اللّٰهِ الْهَادِیْ الْفَتَّاحِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ ذَوِی الْفَلَاحِ وَالنَّجَاحِ:- وقتِ نکاح بطورِ مہر بھی آپ نے یہی درود شریف پڑھا۔ اس لیے حکم ہے کہ نکاح کے خطبے میں یہ درود شریف ضرور پڑھا جائے۔ چنانچہ روح البیان جلد ہفتم ص۲۲۲ پر اسی طرح درج ہے۔ بعض محققین نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام وہی درود شریف پڑھا کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو سکھایا۔ حضرت جبرئیل امینؑ کے درود شریف کے یہ الفاظ ہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَوَّلُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اٰخِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا ظَاهِرُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا بَاطِنُ:- یہ درود شریف خود حضرت جبرئیل امینؑ نے نبی کریم رؤف الرحیم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سنایا۔ چنانچہ سعادۃِ دارین فی صلاۃ سید الکونین علامہ نبہانی جلد اول صفحہ ۲۲۷ پر ہے:- قَالَ جِبْرَئِیْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَمَرَنِیْ اَنْ اُصَلِّیَ عَلَیْكَ هٰكَذَا الخ اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ حضرت جبرائیل کا درود شریف یہ ہے اور سابقہ قول سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم بھی یہی پڑھتے تھے۔ مگر بعض کا قول یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کا ایک ہی درود شریف ہے۔ از حضرت آدم تا حضرت مسیح۔ اور خود پروردگار عالم تعلیم فرماتا رہا۔ سعادۃ دارین فی صلاۃ سید الکونین کے ص۲۲۰ پر لکھا ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا اللہ میں کونسا درود شریف پڑھوں تب اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ تعلیم فرمائے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ ...

وَمَنْبَعِ الْاَنْوَارِ وَجَمَالِ الْکَوْنَیْنِ۔ وَشَرَفِ الْحَرَمَیْنِ وَسَیِّدِ الثَّقَلَیْنِ الْمَخْصُوْصِ بِقَابَ قَوْسَیْنِ۔

یہ تین درود شریف بعض اقوال سے حضرت آدمؑ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ مگر پہلا درود شریف مہروالا درود شریف ہے۔ اور دوسرے دو کا نام حسب ترتیب صلوٰۃ جبرئیلی، صلوات موسوی کا ہے:۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

(۲) درود خضری حضرت خضر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء کا درود شریف ایک ہے مگر چار نبیوں کا صلوٰۃ علیحدہ ہے: ۱ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درود شریف چوتھے آسمان پر۔ ۲ ادریس علیہ السلام کا جنت میں قیامت تک علیحدہ درود شریف ہے۔ ۳ الیاس علیہ السلام کا دنیا میں۔ ۴ حضرت خضر علیہ السلام کا۔ کیونکہ یہ چار حضرات قیامت تک اپنے اپنے مقامات پر زندہ ہیں۔ قریب قیامت وفات ہوگی، اس لیے ان کے درود مختلف ہیں۔ درود خضریؑ کے الفاظ یہ ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ (۳) چونکہ سائل نے اس سوال میں اپنے مسئولہ کا تعین نہیں کیا اس لیے میں پورے مسئلے کی وضاحت کرتا ہوں۔ دینی مدارس میں جتنے علوم عام مروج ہیں، ان میں سے ہر علم کے علماء کی تقسیم اسی طرح ہے کہ بعض علماء کو متقدمین اور بعض کو متاخرین۔ اور ایک عالم جس نے اس علم میں کوئی بہترین ایجاد یا چھانٹ کی ہو وہ اس تقسیم کا حدِ مرکزی بن جاتا ہے۔ تو جو علماء اس حدِ مرکزی سے پہلے ہوں۔ وہ متقدمین کہلاتے ہیں اور جو بعد میں یا ہم زمانہ ہوں وہ متاخرین کہلاتے ہیں۔ یہی اس تقسیم کی وجہ اور وجہ تسمیہ اور ابتداء و انتہا ہے۔ مگر علوم کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔ متقدمین و متاخرین و حدِ مرکزی بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ چنانچہ علم منطق میں امام رازی نے منطق کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر علمائے منطق کے نزدیک مرکزی حیثیت قائم کی اس لیے امام رازی منطق کے حدِ مرکزی کی حیثیت سے ہیں۔ پس جو اس سے پہلے حکماء اور منطقی ہیں ان کو متقدمین کہتے ہیں جو ان کے بعد ہیں وہ متاخرین۔ اسی لیے شرح تہذیب ص۶ پر ہے۔ کَمَا زَعَمَہُ الْاِمَامُ الرَّازِیْ وَاخْتَارَ مَذْہَبَ الْقُدَمَاءِ۔ علم نحو کے حدِ مرکزی امام ابن حاجب صاحب کافیہ ہیں۔ ان سے پہلے علمائے نحو سیبویہ اخفش وغیرہ نحو کے متقدمین میں ہیں۔ اسی طرح فلسفہ کی چھانٹ امام غزالی اس طرح کی کہ فلسفہ جس کو اہل اسلام جہل مرکب اور زندیقی سے تصور کرتے تھے اور اس کے ورق کو گندگی لگانا جائز سمجھتے تھے۔ اس کو امام غزالی نے اسلام کا آئینہ بنا دیا۔ اس لیے امام شافعی کو اس مسئلہ کی تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا کہ منطق اور فلسفہ لکھے ہوئے کاغذ سے استنجا کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے امام غزالی فلسفی علماء کی نظر میں حدِ مرکزی ہیں۔ لہٰذا ان سے پہلے فلسفی ارسطو فارابی، بوعلی سینا، جالینوس وغیرہ

فلسفہ کے متقدمین ہیں اور ان کے بعد مولانا روم وغیرہ متاخرین ہیں تصوف میں ابوالحسن علی بن ابراہیم خضری جنھوں نے تصوف کی دقیق گتھیوں کو سلجھایا اور متاخرین کے لیے تصوف کا سخت گیر راستہ آسان کیا اور فلسفے کو تصوف سے روشناس کرایا۔ اس وجہ سے صوفیا کی نظر میں آپ کی ذات حدِ مرکزی ہے۔ آن سے پہلے ابوحفص حداد نیشاپوری اور ابوالحسن نوری وغیرہما متقدمین کہلاتے ہیں۔ اور ان کے بعد داتا گنج بخش، ابوالقاسم قشیری، غوثِ پاک عبدالقادر جیلانی متاخرین کہلاتے ہیں۔ ایسا ہی کشف المحجوب صفحہ ۱۶۱ پر ہے۔ علم فقہ حنفی میں صاحب ہدایہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدِ مرکزی ہیں۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

موجودہ طریقے پر صلوٰۃ وسلام کب سے شروع ہوا؟

سوال ۱۵۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین مسائل مندرجہ ذیل میں کہ آج کل مساجد میں مروجہ صلوٰۃ وسلام پر اختلافِ رائے پیدا ہو کر مسلمانوں میں تفریق اور نفرت کا باعث بن رہا ہے ایسے افسوسناک حالات کو دیکھتے ہوئے خود کو مطمئن کرنے صحابہ کرام و ائمہ مجتہدین کی ہدایات کی روشنی میں اپنے لیے صحیح راستہ متعین کرنے کی غرض سے چند سوالات مندرجہ ذیل کی شرعی وضاحت چاہتا ہوں جو قرآن و حدیث اور فقہ حنفیہ کی مستند و معتبر کتب سے مرحمت فرما کر مشکور فرماویں: (۱) حنبلی، شافعی، مالکی مذاہب کے علاوہ حنفی مذہب کا ایک گروہ مروجہ صلوٰۃ وسلام (جو چند سالوں سے مساجد میں اجتماعی طور پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے) کے خلاف ہیں سے دین میں زیادتی اور بدعت کہتے ہیں نیز اس کی دلیل میں احادیث و فقہ حنفیہ سے وَالسَّلَامُ كَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ اور وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ قَدْ عَلِمْنَا كَيْفَ هُوَ وغیرہ الفاظ پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ درود وسلام اسی طریقے سے پڑھنا جائز اور ثواب ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام نے پڑھا۔ اور آئمہ مجتہدین نے بھی عمل کیا۔ اُن کے خلاف بدعت و ناجائز ہے کو صحابہ کے خلاف عمل سے خود شارع علیہ السلام نے منع کیا۔ اور جہاں کہ طریقہ سے مسلمانوں کی بقیہ نماز قضا، صلوٰۃ التسبیح دیگر نوافل اور تلاوت قرآن پاک و تسبیحات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جس کی حدیث میں سختی سے یہاں تک ممانعت کی گئی کہ بآواز بلند تلاوت قرآن پاک بھی نہ کی جائے (۲) دوسرا گروہ اسے جائز و ضروری سمجھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ قرآن و حدیث کے مطابق یہ جائز ہے اور یہ ضروری ہے:- لہٰذا

قرآن و حدیث اور فقہ حنفیہ کی مستند و معتبر کتابوں سے مدلل جواب دے کر دینی اور منصبی فرض ادا کریں :-
الف :- یہ کہ مروجہ صلوٰۃ وسلام مساجد میں کھڑے ہو کر اجتماعی طور پر بلند آواز سے پڑھنا جب کہ دیگر مسلمان اپنی بقیہ نماز، سنت، نوافل یا قضاء نماز، تلاوت قرآن پاک اور تسبیحات میں مشغول ہیں۔ اور ان کے اِن مندرجہ بالا امور میں خلل بھی واقع ہو۔ جائز ہے یا نہیں۔ (ب) :- اس مروجہ سلام کا پڑھنا فرض ہے یا کہ واجب۔ (ج) :- اِس کا پڑھنا سنت ہے یا کہ مستحب؟ (د) :- اِس مروجہ سلام کو ایسی مساجد میں بھی پڑھنا چاہیئے۔ جو کسی ایسے مکتب فکر کے انتظام میں ہوں۔ اور خطیب بھی اسی مکتب فکر کا ہو۔ جو کہ مروجہ صلوٰۃ وسلام کو بدعت و ناجائز سمجھتے ہوں۔ اور اس کے پڑھنے سے انتشار پیدا ہوتا ہو۔ اور نمازیوں میں گروہ بندی کی نوبت آجائے۔ جب کہ یہ طریقہ صحابۂ کرام اور بزرگان سے قرونِ اولےٰ میں ثابت نہیں۔ (ہ) کیا اپنے مکتب فکر کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیئے کسی دوسرے مکتبِ فکر کی مسجد پر ناجائز و جبراً قبضہ کرنے کی کوشش کرنا شرعاً جائز ہے۔ جواب قرآن و حدیث اور فقہ حنفیہ کی مستند اور معتبر کتابوں سے دے کر ممنون فرماویں :-
والسلام مع اکرام ؛ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؕ

سائل :- عبدالقیوم ملک سندھ مرکنٹائل بنک ٹنڈو آدم حیدر آباد سندھ ۳/۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

الجواب

جوابات :- (۱) مذکورہ فی السوال فرقے کو حنفی کہنا ہی غلط ہے۔ یہ اپنے آپ کو اِسی طرح حنفی کہتے ہیں۔ جس طرح یہودی اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے تھے۔ حالانکہ یہودی سابقہ انبیاء کے گستاخ ہیں کہ وَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ؕ اور یہ فرقہ دیوبندی وہابی اللہ اور رسول اور اولیاء اللہ کے گستاخ ہیں۔ یہودی لوگ حضرت ابراہیم کے عقیدوں کے مخالف تھے۔ اِسی طرح یہ فرقہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقیدوں کے خلاف ہے۔ اُن کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے۔ کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ جھوٹ جیسا براکلام بول سکتا ہے۔ حالانکہ امام اعظم کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ اُن کا دوسرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ حضور پاک کے بعد اور نبی آسکتے ہیں۔ اور ختم نبوت کا معنےٰ اصلی نبی ہے۔ دیکھو مولوی قاسم نانوتوی کی کتاب تحذیر الناس۔ حالانکہ امام اعظم ابو حنیفہ ختم نبوت کے قائل ہیں۔ اُن کا تیسرا عقیدہ یہ ہے۔ کہ شیطان کا علم حضور علیہ السلام سے زیادہ ہے۔ دیکھو خلیل احمد کی کتاب براہین قاطعہ حالانکہ حنفی مذہب کی شفا شریف میں لکھا ہے کہ جو شخص نبی پاک سے کسی مخلوق کا علم زیادہ مانے وہ کافر ہے۔ یہ تھے اُن کے چند گستاخانہ حنفی مذہب اور مسلک کے خلاف عقیدے، ایسے اور بھی کئی عقیدے اُن

کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس لیئے اُن کو حنفی کہنا غلط ہے۔ سائل کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی پاک کو دُور سے پکارنا حرام ہے۔ حالانکہ امام اعظم اپنے عقیدہ نعمان میں نبی پاک کو دور سے پکار رہے ہیں۔ چنانچہ عرض کرتے ہیں یَا سَیِّدَ السَّادَاتِ جِئْتُکَ قَاصِدًا۔ الخ بتائیے کہ یہ لوگ حنفی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ جب کہ امام اعظم ابو حنیفہ حضور کو دُور سے حاضر و ناظر سمجھ کر ندا کر رہے ہیں۔ سائل لکھتا ہے۔ کہ مروّجہ مشہور صلوٰۃ وسلام چند سالوں سے ہے، لفظ چند ار دو زبان میں جمع قلت ہے۔ جس سے آٹھ نو سال مراد ہوتے ہیں۔ اگر سائل کی بھی یہی مراد ہے۔ اور مسجد وں سے پاکستان کی مسجدیں مراد ہیں۔ تب افسوس ہے اور افسوس سے لکھنا پڑتا ہے۔ کہ سائل یا تو جان بوجھ کر ایسی جہالت کی بات کر رہا ہے۔ اور پھر یا سائل بھی اُسی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ سائل بخوبی جانتا ہے۔ کہ یہ صلوٰۃ وسلام پاکستان بھر میں سائل کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی رائج اور مشہور تھا۔ پھر سائل کا بلا سوچے اور سمجھے یہ کہہ دینا۔ کہ چند سالوں سے مروّج ہے۔ جہالت اور تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور اگر لفظ چند سے سائل کی مراد سو ڈیڑھ سو سال ہو۔ تو بجا ہے۔ کیونکہ یہ مروّجہ سلام ہندوستان میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے رائج کیا۔ لاہور اور پنجاب میں تکیہ سادھواں مسجد لاہور سے شاہ مولانا عبدالغفار کشمیری نے آج سے نوّے سال پہلے جاری کیا۔ اور ان علاقوں میں صلوٰۃ وسلام کا اُن چند سالوں سے مروّج ہونا تعجب خیز یا قابلِ ترک نہیں۔ کیونکہ اُن علاقوں میں تو مذہب اسلام بھی چند سالوں سے آیا ہے۔ اگر یہ گستاخ دیوبندی صرف اس لیئے سلام کا انکار کریں۔ کہ یہ مذکورہ چند سالوں سے مروّج ہے۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ آئندہ یہ لوگ اسلام و قرآن کو اس لیئے چھوڑ دیں۔ کہ یہ چیزیں بھی ہمارے علاقوں میں چند سالوں سے مروّج ہیں۔ حالانکہ جس طرح اسلام اور قرآن چودہ سو سال سے دنیا میں موجود ہے اسی طرح صلوٰۃ وسلام بھی نبی پاک کی ذات گرامی پر پڑھا گیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد مزار مقدس کے پاس صلوٰۃ وسلام مروّجہ مشہور طریقے پر پڑھا جاتا ہے۔ اور آج بھی تمام حاجی صاحبان اسی طرح مل کر اور کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں۔ فرداً فرداً سب سے پہلے یہ سلام صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھا۔ بہت سے لوگوں کو جمع کر کے سب سے پہلے یہ سلام حضرت امام حسین اور اُن کے قافلوں والوں نے کربلا جاتے ہوئے روضۂ پاک پر پڑھا۔ دیکھو شہادت امام حسین کی کتابیں اور ملاں کاشفی تبریزی کی کتاب سیر اہل بیت عربی پھر یہ سلام شام کے بادشاہ ناصر صلاح الدین نے اپنے ملک کی تمام مسجدوں میں ۵۸۱ھ میں ہر اذان کے بعد جاری کیا۔ جس کا شہرہ ساری دنیا میں ہو گیا اور یہاں تک کہ مسجد نبوی میں بھی ہر نماز کے بعد اسی طریقے سے مل کر پڑھا جانے لگا۔ جو آج تک جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ جاری رکھے۔ اور منکرین کو ہدایت نصیب ہو۔ چنانچہ فتاویٰ

شامی جلد اول صفحہ نمبر صـ۳۶۲ پر ہے :۔ اَلتَّسْلِیْمُ بَعْدَ الاذان حَدِیْثٌ فِیْ رَبِیْعِ الْاٰخِرِ سَنَۃَ سَبْعَ مَا ئَۃٍ وَّاحِدٍ وَّثَمَانِیْنَ فِیْ عِشَاءِ لَیْلَۃِ الْاِثْنَیْنِ (الخ) اور ۔ ردّ المحتار جلد اول صفحہ نمبر صـ۳۶۲ پر ہے :۔ اِنَّ اِبْتِدَا ءَ اَیْ اِبْتِدَاءَ تَسْلِیْمِ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ فِیْ اَیَّامِ السُّلْطَانِ النَّاصِرِ صَلَاحُ الدِّیْنِ بِاَمْرِہٖ ط (ترجمہ) :۔ یعنی مروّجہ طریقے سے سلام پڑھنے کی ابتداء سلطان ناصر صلاح الدین کے حکم سے ۷۸۱ھ میں ہوئی۔ ثابت ہوا ۔ کہ کھڑے ہوکر سب لوگوں کا مل کر سلام پڑھنا جائز ہے۔ حضرت امام حسین نے لوگوں کے ساتھ مل کر اور صدیق اکبر نے علیحدہ سلام کھڑے ہوکر پڑھا۔ جیساکہ کتب معتبرہ سے ثابت ہے اب بھی جب روضۂ مطہرہ کے پاس سلام ہوتا ہے۔ وہاں کوئی وہابی منع نہیں کرتا۔ (۲) فقہ حنفی کی معتبر کتب فتاویٰ درِمختار۔ شامی۔ اور فتاویٰ ردالمحتار وغیرہ سے مدلل ثبوت دیئے گئے۔

الف :۔ سلام کو مسجد میں ہی پڑھنا زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ مسجدیں اسی لیے بنی ہیں۔ مسجد اس لیے نہیں بنی۔ کہ اس میں چیخ چیخ کر دیوبندی مولوی زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ یہ مساجد اللہ کے ذکر کے لیے ہیں۔ چنانچہ رب کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے :۔ وَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ ط ع سورۂ نساء پ۵ ط (ترجمہ) :۔ جب تم نماز پڑھ چکو۔ تو فوراً کھڑے ہوکر اللہ کا ذکر کیا کرو۔ اور پھر اس کے بعد بیٹھ کر اور لیٹ کر بھی جس طرح موقع ہو ذکر کرو۔ اس آیت میں صاف صاف سلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ کھڑے ہوکر نماز کے بعد سلام ہی پڑھا کرتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا ط (ترجمہ) :۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ذکر بنا کر نازل کیا۔ تم سب کائنات کی طرف۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا ذکر اللہ ہیں۔ یہ کہنا کہ سلام سے نماز و تسبیح میں فرق پڑتا ہے یہ صرف عداوت سے عداوتِ رسول کی بنا پر بہانے بازیاں ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ جب وعظ تقریر کے لیے۔ مسجدوں میں گنجائش نکل آتی ہے جو چار چار گھنٹے ہوتے رہتے ہیں۔ اور کسی دیوبندی وہابی کی نماز و تسبیح خراب نہیں ہوتی۔ تو دس منٹ کے سلام سے کیا پہاڑ گر پڑے گا۔ اللہ کے ذکر بہت سی قسم کے ہیں۔ شریعت نے ہر ذکر کے وقت کو معین کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب نماز ہوتی ہے تو تسبیح نہ پڑھو۔ جب سلام ہوتا ہو۔ تو نماز نہ پڑھو۔ ہر چیز کا

وقت متعین کرو۔ اب جو شخص دیر سے نماز میں آیا۔ تو شرعاً وہ مجرم ہے۔ اس شرعی مجرم کی وجہ سے۔ سلام جیسی بہترین عبادت نہیں چھوڑی جائے گی۔ اور پھر بلند آواز سے ہرگز ہرگز نماز خراب نہیں ہوتی۔ دیکھو بازار کی مسجد میں ہر وقت سخت شور پکار رہتا ہے۔ مگر کوئی بولتا نہیں۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں شور مچا رہتا ہے۔ کوئی وہابی شرک بدعت کا فتوٰے نہیں لگاتا۔ خود باری تعالیٰ رب العزت نے ایام تشریق میں بلند آواز سے فرائض کے فوراً بعد تکبیر پڑھنے کا حکم دیا۔ حالانکہ اس وقت بھی بعد میں ملنے والے اپنی نماز ادا کرتے ہیں۔ کیا رب تعالیٰ کو نمازوں کے خراب ہونے کا خیال نہ تھا۔ ان وہابیوں کے دلوں میں لوگوں کی نمازوں کا زیادہ درد ہے۔ فقط ان کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی ہے۔ اس لیئے جب ان بدنصیبوں کی نماز خراب ہوتی ہے۔ تو سلام سے ہوتی ہے۔ نہ بازار کے شوروغل سے نماز خراب ہو۔ نہ تکبیرات تشریق سے۔ نہ دیوبندیوں کے مولویوں کے جلسوں اور نعرہ جل اور خرافات سے نماز خراب ہو۔ (ب):۔ اس مروّجہ مبارک ایمان افروز وہابیت سوز صلوٰۃ وسلام کا پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝:۔ (ترجمہ):۔ اے ایمان والو! میرے نبی پر درود پڑھو۔ اور ذوق شوق جوش خروش سے سلام بھی پڑھو جس طرح آیت مبارکہ میں لفظِ صَلُّوْا امر کا صیغہ ہے۔ اسی طرح لفظِ سَلِّمُوْا بھی امر ہے۔ علم اصول کے مطابق امر وجوب کے لیئے آتا ہے۔ چنانچہ کتاب اصول فقہ ص۹ پر ہے:۔ اَلْاَصْلُ فِی الْاَمْرِ الْوُجُوْبُ ۝ (ترجمہ)۔ یعنی امر کا صیغہ اصل میں ہر چیز کو واجب کرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ سلام پڑھنا بھی واجب اور قانونِ شریعت کے مطابق سلام کا وہی طریقہ ہے۔ جو مروّج اصول پر نبی پاک کو حاضر و ناظر سمجھ کر لفظ یا سے پڑھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں درود اور سلام کا علیحدہ علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ بندوں کو نہ درود شریف پڑھنے کا طریقہ آتا تھا۔ نہ سلام کا درود بھیجنا رب کا فعل ہے اور سلام پڑھنا صرف مسلمانوں کا فعل ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے نبی کا سلام بہت پیارا ہے۔ اس لیئے اس کا طریقہ رب تعالیٰ نے خود بتایا۔ کہ التشہد میں۔ حاضر و ناظر کے صیغہ سے تمام مسلمانوں کو قیامت تک پانچوں وقت اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ کے لفظ سے سلام پڑھوایا گویا یہ رب نے سلام پڑھنے کا طریقہ سکھایا۔ مگر درود شریف پڑھنے کا طریقہ رب تعالیٰ نے نہ بتایا۔ تب صحابہ کرام نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم (سلام پڑھنے کا طریقہ تو آ گیا) ہم درود شریف آپ پر کیوں کر اور کیسے پڑھیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درود ابراہیمی سنا کر بتایا۔ پس صرف سلام کا طریقہ رب نے بتایا۔ اور صرف

درود کا طریقہ نبی پاک نے بتایا۔ لہٰذا جو شخص صرف درُود پڑھنا چاہتا ہو۔ تو وہ درُود ابراہیمی پڑھے۔ اور جو صرف سلام پڑھنا چاہے۔ وہ یا نبیُ سلامٌ علیکَ وغیرہ الفاظ سے پڑھے۔ اور جو دونوں ملا کر پڑھنا چاہے۔ اس کے لیئے فقہاءِ کرام نے اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ جیسے الفاظ مقرر فرما دیئے پس ثابت ہوا کہ موجودہ مروّجہ سلام رب کا بتایا ہوا طریقہ ہے جو اس کے خلاف ہے۔ وہ رب کے خلاف ہے۔ اگر سائل یا کسی وہابی کو میری اس تحقیق پر کوئی اعتراض ہو۔ تو میں اُس سے یہ ضرور سوال کروں گا۔ کہ کیا وجہ ہے۔ کہ آیت میں تو درود و سلام دونوں کا ذکر ہے۔ کیا وَسَلِّمُوْا کا صیغہ صحابہ کو یاد نہ تھا۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی صرف درود شریف کا ہی طریقہ بتا رہے ہیں۔ حالانکہ رب نے دونوں کا حکم دیا ہے۔ ثابت ہوا کہ سلام پڑھنے کا اصلی طریقہ حاضر ناظر کے صیغہ سے ہی ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے یہی طریقہ بتایا۔ اگر کسی وہابی کو میری یہ بات تسلیم نہ ہو۔ تو میں اُن سے پوچھتا ہوں۔ کہ آپ لوگ آیت کریمہ کے لفظ وَسَلِّمُوْا پر کس طرح عمل کرو گے۔ جب کہ وہابی یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ صرف درود ابراہیمی پڑھنا چاہیئے۔ حالانکہ وہاں سلام کا لفظ تک نہیں۔ اور اگر کوئی وہابی گھبرا کر اپنے مذہب کو توڑتا ہوا یہ کہہ دے۔ کہ ہم اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ پڑھیں گے۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ طریقہ رب نے تو نہیں بتایا۔ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ پھر تم یہ طریقہ کہاں سے لے آئے۔ میرے یہ سوالات دنیا بھر کے وہابیوں سے ہیں۔ خوب سوچ کر مدلل جواب دیں۔ بہرحال مجبورًا سب دیوبندیوں اور وہابیوں کو ماننا پڑے گا۔ کہ مروّجہ سلام کا طریقہ لفظ یا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سکھایا ہوا۔ اور پرانا شروعِ اسلام سے ہے نہ کہ چند سالوں سے اگر اپنی جاہلانہ پرانی عادت کے مطابق ضد اور ہٹ دھرمی کریں۔ تو دوسری بات ہے۔ مگر ذی عقل کو میری یہ تحقیق ماننے بغیر چارہ بھی نہیں۔ (ج) بلکہ واجب ہے۔ جیسا کہ ابھی اوپر قرآن پاک اور صحابہ کرام کے اقوال سے ثابت کیا گیا۔ (د) تمام مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ۝ (ترجمہ) تمام مسجدیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ اور کوئی سجدہ نہ کرو۔ منتظم لوگ مسجدوں کے مالک نہیں ہیں۔ مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر محلے والے کا اپنے محلے کی مسجد پر پورا حق ہے جس طرح چاہے وہ عبادت کرے۔ ذکر اور اذکار کرے۔ جو لوگ ذکر اللہ کو روکیں۔ وہ کسی مسجد کے منتظم ہونے کے حقدار نہیں۔ بلکہ حکمِ قرآن کے مطابق وہ ظالم ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا ۝ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

کہ سب سے بڑا ظالم وہ ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں ذکر اذکار سے روکے۔ سلام بھی اللہ اور رسول کا ذکر ہے۔ لہٰذا منع کرنے والا وہابی ظالم ہے۔ صرف نماز پڑھنا ہی اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں! بلکہ اصطلاحِ قرآنیہ میں تو نماز کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نہ کہ ذکر قرآن پاک کے نزدیک ذِکرُ اللہ نماز کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ اور یہی وہ سلام پڑھنا تسبیح اور تہلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ الخ ؕ یعنی نماز کے بعد ذکر کیا کرو۔ پس ثابت ہوا۔ کہ سلام بھی ذکر اللہ ہے۔ ہر اہل محلہ مسلمان کو حق پہنچتا ہے۔ کہ ہر قسم کا ذکر کر سکتا ہے۔ روکنے کو منع کیا جائے گا۔ اگر کوئی منتظم منع کرے۔ تو اس کو مسجد کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے منتظم کا کام مسجد کی خدمت اور آبادی کرنا ہے۔ نہ کہ ذکر اللہ سے روکنا۔ اور بربادی کرنا، جب ملک کی منتظم حکومت ملک کو خراب کرنے لگے۔ تو عوام اس کو نکال کر حکومت کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ تو مسجد کے ویران کرنے والے کا بھی تختہ الٹ دیا جائے۔ جس مسجد میں رسولِ کریم کا نام نہ ہو۔ وہ مسجد ویران ہوتی ہے (۲) انتشار اور فساد ڈالنا تو شریعتِ اسلامیہ میں سخت ترین گناہ ہے۔ مگر یہ دیکھنا ہے۔ کہ فسادی ہے کون۔ اگر کسی شخص کے مکان کو ڈاکو چور ویران کرنا چاہیں۔ اور پولیس ڈاکوؤں سے لڑے۔ ڈاکو پولیس پر حملہ کریں۔ دونوں طرف سے سخت ترین لڑائی ہو۔ تو قانون کس کو مجرم، فسادی کہتا ہے۔ پولیس کو یا چوروں کو مسجدیں سب قانون اسلامیہ کے مطابق اللہ کی ہیں۔ کچھ مخصوص لوگ چور دروازے سے آکر اللہ کا ذکر سلام وغیرہ سے روک کر مسجد اللہ کے گھر کو ویران کرنا چاہیں۔ تو اگر اللہ کے سپاہی اُن کو مسجدوں سے نکال دیں۔ تو قانوناً وہ فسادی نہ ہوں گے۔ بلکہ سلام سے روکنے والے فسادی ہوں گے۔ اسی لیئے اسلام میں کفار سے جہاد کو عبادت قرار دیا گیا۔ اور کافروں کے لڑنے کو فساد چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ؕ بلکہ اگر پولیس چوروں کو نہ نکالے۔ تو مجرم اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کے سپاہی اہلِ سنت حضرات ان روکنے والوں کو نہ نکالیں۔ تو مجرم خلاصہ یہ کہ سلام پڑھنا بہت شاندار عبادت اور اللہ کی فرمانبرداری ہے۔ اور شروع اسلام سے مروّج ہے۔ ہاں زمانہ کے اعتبار سے الفاظ اور طریقوں میں تبدیلیاں ترقیاں ہوتی چلی آئی ہیں۔ کیونکہ اسلام مثل ایک درخت کے ہے درخت میں ایک ہی وقت سب کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی صرف جڑ ہوتی ہے۔ کبھی صرف چھوٹی شاخیں کبھی صرف پتے، کبھی صرف پھول کبھی پھل، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درختِ اسلام کی جڑ لگائی صحابہ کرام کے زمانے میں چند شاخیں ۔ اللہ کریم کا کرم ہے۔ کہ یہ درخت دن بدن پھل پھول رہا ہے۔ اس لیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ میری اُمت مثل بارش کے ہے۔ کہا نہیں جاتا۔ کہ اس کا اوّل اچھا ہے۔ یا آخر چنانچہ مشکوٰۃ شریف نے صفحہ نمبر ۵۸۳ پر ترمذی کی روایت نقل فرمائی۔ عَنْ اَنَسٍ

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مَثَلُ اُمَّتِیْ مَثَلُ الْمَطَرِ لَا یُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُہٗ رَوَاہُ التِّرْمَذِیْ ط ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔ کہ حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میری اُمت کی مثال بارش کی طرح ہے۔ (الخ) کتنا بیوقوف ہے۔ وہ شخص جو درخت کی تازہ کونپلوں کو دیکھ کر صرف اس لیئے نہ مانے کہ یہ کل اس درخت میں نہ تھیں۔ اسی طرح نادان ہیں وہ لوگ جو ہر بات میں یہ حوالہ مانگتے ہیں۔ کہ بعینہٖ ان ہی الفاظ کا ثبوت صحابہ کے زمانے سے پیش کرو۔ حالانکہ صحابہ کبار تو نبی کریم حرف نگانے والے تھے۔ پھر تعجب اور افسوس صرف اس بات کا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام اور نعت خوانی کے لیئے ہم سے ثبوت مانگتے ہیں۔ اپنے کسی کام پر حوالہ پیش نہیں کرتے۔ مثلاً جو قرآن مجید آج زیب و زینت کا ہے۔ وہ تبع تابعین کے زمانے میں نہ تھا۔ اور جس حالت میں تبع تابعین کے پاس پہنچا۔ وہ حالت تابعین کے زمانے میں نہ تھی۔ اور جس حالت میں تابعین کو ملا۔ وہ صحابہ کے زمانے میں نہ تھی۔ اور جس طرح صحابہ کرام نے قرآن مجید کو تدوین کیا۔ نبی پاک نے نہ کیا۔ مگر اس کو کوئی بدعت نہیں کہتا۔ اسی طرح اگر ہم اذان سے بعد یا پھر اذان سے پہلے درود شریف پڑھیں۔ تو حوالہ مانگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ یہ بدعت وا ذان میں زیادتی و گناہ ہے۔ حالانکہ یہ دیوبندی ہر وقت تلاوت کے موقعہ پر آخر میں بالکل قرآن کریم سے ملا کر کہتے ہیں:۔ (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ) بتایئے۔ کس صحابی یا تابعی نے تلاوت کے بعد یہ لفظ کہے۔ کیا یہ قرآن مجید میں زیادتی نہیں۔ بدعت نہیں؟ اذان کے تمام الفاظ مختصر اور مشہور ہو چکے ہیں۔ ان الفاظ کی زیادتی کمی سے عوام دھوکا نہیں کھا سکتے۔ مگر الفاظِ قرآن عوام کے لیئے غیر متعارف ہیں۔ صَدَقَ اللّٰہُ کا لفظ بڑھانے سے زیادتی کا زیادہ احتمال ہے۔ اکثر عوام کا گمان ہو سکتا ہے۔ کہ شائد یہ الفاظ بھی آیتِ قرآنی ہیں مگر ان لوگوں کو یہاں کوئی فکر اندیشہ نہیں۔ کیونکہ اپنی ایجاد ہے۔ پھر اذان وحی الٰہی نہیں اس میں زیادتی بعد میں ہوئی بھی ہے۔ یہاں زیادتی اتنی خطرناک نہیں جتنی کہ قرآن میں جتنی چاہیں ملاوٹ کریں۔ دشمنی ہے۔ تو درود شریف سے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے یا پھر دشمن صلوٰۃ و سلام سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام چودہ سو سال سے آج تک ہر دور میں جاری رہا۔ مگر آج جس شاندار طریقے سے ہو رہا ہے قبل ازیں نہ ہو سکا۔ لہٰذا آج کل اسی طرح سلام پڑھنا واجب و ضروری ہے۔ اس لیئے کہ یہ لوگ اسی سلام کے دشمن ہیں۔ اور دین کے دشمن کو پریشان کرنا بھی واجب ہے دیکھو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے اَدْوارِ مبارکہ سے آج تک قربانی والی عید کو عیدُ الاَضْحٰی کہا جاتا ہے۔ مگر دیو بند اور بریلی ہندوستان پاکستان ہر جگہ اس عید کو ان علاقوں میں بقرعید کا نام دیا گیا۔ دیوبندی وہابی بھی اس کو بقرعید کہتے ہیں۔ علماء

اولیاء کرام نے اس کو جائز رکھنا شروع کر دیا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ لفظ قرونِ ثلاثہ کتب فقہاء عربی، فارسی کہیں موجود نہیں۔ بلکہ علماءِ ہند کی اپنی ایجاد ہے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی اس اسلامی دین کے نام خود ساختہ کو بدعت یا گناہ نہ کہا۔ بلکہ اس نام (بقر عید) کو اتنا جاری اور مشہور کیا۔ کہ بہت سے لوگ اس کا شرعی اور مسنون نام ہی بھول گئے۔ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا۔ صرف ہندوؤں، بت پرستوں، گاؤ ماتا کے پجاریوں کو ذلیل و پریشان کرنے کے لئے۔ اس لئے کہ اس لفظِ بقر عید کا ترجمہ ہے گائے کی ذبح والی عید۔ لفظ بقر کو اسی لئے مخصوص کیا کہ یہ ہندوؤں کا معبود ہے۔ ورنہ تو قربانی بکرے، دنبے اور اونٹ کی بھی ہوتی ہے۔ تو جب ہندوؤں کو ستانے کے لئے دین میں یہ بدعت ایجاد ہو سکتی ہے۔ پس منکرینِ سلام کو پریشان کرنے کے لئے مروجہ نئے شاندار طریقے سے سلام پڑھنا لازم و ضروری ہے۔ یہ منکرین حضرات اسی قسم کی ہزارہا بدعتیں ہر روز دین میں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر نہ گناہ نہ حرام؛ ان کے نزدیک صرف وہ کام بدعت گناہ اور شرک و کفر و حرام اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ جس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت خوانی و عظمت کا اظہار ہو اللہ ان کو ہدایت دے آمین۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَم

کتبہ

یا محمد، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کا حکم

سوال ۱۶: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں۔ کہ نبی پاک صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کو یا محمد صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمْ کہہ کر پکارنا جائز ہے۔ کہ منع ہمارے کراچی کا ایک مولوی اور مشہور خطیب احتشام الحق تھانوی نے چند دن پیشتر ایک جلسے میں تقریر کے دوران یہ کہا۔ کہ نبی پاک کو یا محمد کہہ کر پکارنا منع اور ناجائز ہے۔ اور کہا۔ کہ اس میں بے ادبی ہے۔ اور دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ فرمایا جائے کہ کیا مولوی احتشام الحق تھانوی کی یہ تقریر درست ہے یا غلط۔ اور مولوی احتشام کی دلیل کہاں تک درست ہے۔ جلد از جلد جواب عطا فرمایا جائے۔ ہم آپ کے فتوے کو اشتہار میں شائع کریں گے۔

السائل: محمد خلیل رانا صدر کراچی۔ مورخہ

۱۰ ۵/۶۶

الجواب ــــــ بعون العلام الوهاب

سوالِ مذکورہ میں جس آیت سے استدلال پیش کیا ہے۔ اِس سے مذکورہ خطیب کی کم علمی واضح ثابت ہو رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ تمام حضرات قرآن مجید کی سمجھ سے بالکل کورے ہیں۔ از نجد تا دیوبند اور از راولپنڈی تا گکھڑ وکراچی کسی دیوبندی کو قرآن مجید کی فہم نہیں۔ چنانچہ اگر اشرف علی صاحب تھانوی اٹھتے ہیں۔ تو وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ کا ترجمہ ہی صحیح نہ کر سکے۔ اور اگر نجدی لوگ اٹھے۔ تو انہوں نے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ۝ کے ترجموں میں لغزش کی۔ اور اس کی غلط فہمی سے یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کے نعروں کے ناجائز ہونے پر احمقانہ دلیل بنائی۔ اور ادھر مولوی احتشام الحق تھانوی نے اپنے گستاخ مذہب کو بچانے کے لیئے لَا تَجْعَلُوْا والی مذکورہ فی السّوال آیت سے غلط دلیل پکڑ کے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ صحابہ سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کہنا بالکل جائز اور باعث برکت ہے۔ نہ بے ادبی ہے اور نہ ہی برائی بلکہ نبی پاک کی عظیم نعت ہے۔ اللہ اور رسول اِس نعرے کے بولنے سے اور لکھنے سے خوش ہوتے ہیں۔

لَا تَجْعَلُوْا کا مقصد وہ نہیں۔ جو مولوی احتشام الحق صاحب نے اپنی ناسمجھی کی بنا پر دھوکہ دینے کے لیئے بیان کیا۔ نہ ہی بے ادبی سے بچانا دیوبندی حضرات کا کام دیوبندی تو بے ادب اور بے ادب بنانے والے ہیں۔ اگر احتشام الحق صاحب تھانوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام میں اتنا ہی مخلص ہیں۔ تو ان کو چاہیئے کہ آگے مسلمانوں کو اشرف علی صاحب تھانوی، خلیل احمد دیوبندی، حسین علی واں بھچراں کی گستاخ اور بے ادب عبارتوں سے بچائیں۔ جو عین کفر ہیں۔ مگر اس طرف کبھی نہ آئیں گے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد اپنے گستاخ شرکیہ مذہب کو پالنا ہے۔ اور نبی پاک سے امداد لینے والے اور حاضر و ناظر سمجھنے والے عقیدے سے مسلمانوں کو علیحدہ کر کے گستاخ بنانا ہے خیال رہے کہ شریعت اسلامیہ کے بعض قانون از ابتداء محکم ہیں۔ بعض قانون منسوخ بھی ہوتے رہے۔ مگر شرک اور بے ادبی ایسے عظیم قانون ہیں۔ جو ہمیشہ ہی محکم رہے۔ کبھی منسوخ نہ ہوئے۔ اسی طرح اسلام کے بعض قوانین میں بعض لوگ مستثنیٰ ہو جاتے ہیں۔ جس طرح اداءِ زکوٰۃ، قربانی، حج وغیرہ کہ اس میں غرباء مستثنیٰ فرشتے اور حیوانات و نباتات، جمادات بھی ان مذکورہ احکام سے علیحدہ ہیں۔ لیکن شرک اور گستاخی بے ادبی کی حرمت والے قانون سے کوئی شخص انسان، فرشتہ، جن، حیوان نباتات، جمادات مستثنیٰ اور علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ سب پر گستاخی اور شرک سے بچنا فرض عین ہے۔ چنانچہ ایک

موقعہ پر ابلیس جن نے حضرت آدم علیہ السلام کی گستاخی کی۔ تو اس کو ازلی مردود اور جہنمی بنا دیا گیا۔ ایک دفعہ گرگٹ جانور نے وہابیوں کی طرح حضرت ابراہیم کی گستاخی کی۔ اس کا مارنا حدیث پاک کے حکم سے کار ثواب ہو گیا عیبہ پہاڑ نے نبی پاک سے عداوت اور گستاخانہ دشمنی کی اس کو جہنم کا ایندھن بنا دیا گیا۔ اسی لیئے ہمارے ایک عالم صاحب نے وہابیوں کی فہرست میں ابلیس گرگٹ اور عیبہ پہاڑ کو بھی وہابی ثابت کیا ہے۔:

بہر حال قانون شریعت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ادب و احترام سب سے بڑی عبادت ہے۔ جس طرح عبادت جتنی بھی کی جائے۔ اتنی ہی باعث ثواب واجر ہے۔ بالکل اسی طرح آقاء دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ادب جان وایمان اور روح کی چمک کا باعث ہے۔ گویا کہ نماز، روزہ، سجدہ جسم کی عبادت ہے۔ اور نبی پاک کا ادب واحترام اور نعت خوانی، ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا چرچہ جان و ایمان کی عبادت ہے۔ شعر مغز قرآن روح ایمان جان دین :-: ہست حب رحمۃ اللعالمین۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ادب میں اگر ذرہ بھر کمی کا شائبہ بھی پڑتا ہو تو اس سے اجتناب واجب ہے میری تحقیق اور شرعی فتوے کے ماتحت لفظ یا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم اور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بلند آواز سے کہنا یا مسجد اور مقدس مقام میں بلند جگہ پر لکھنا بہت ہی باعث برکت اور رحمت ہے۔ اس میں بے ادبی کا احتمال تک نہیں۔ بلکہ صوفیاء کرام کے قول کے مطابق بہتر یہ ہے۔ کہ مسلمان اہلسنت اپنے گھروں، دفتروں وغیرہ میں اور مقدس مقامات پر عزت کی جگہ یا محمد، یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا ایک خوبصورت چوکھٹہ فریم کرا کر یا دیواروں پر خوش نما لکھائیں۔ جس گھر میں یہ نام پاک لکھے ہوں گے۔ وہ گھر بہت سی مصیبتوں سے بچا رہے گا۔ اور بجائے صرف یا مُحَمَّدُ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم لکھنے کے یَا مُحَمَّدُ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لکھا۔ اور کہا جائے۔ اور ہر مسجد میں محراب کی جگہ ضرور لکھا جائے۔ اس فتوے پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

دلیل نمبر ۱:۔ اللہ کریم قیامت کے دن میدان محشر میں اپنے حبیب پاک کو بڑے پیار و محبت سے تمام کائنات کے سامنے۔ یا مُحَمَّدُ کہہ کر خطاب فرمائے گا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۴۸۷ پر ہے:۔ فَاَحْمَدُہٗ بِتِلْکَ الْمَحَامِدِ وَاَخِرُّ لَہٗ سَاجِدًا فَیُقَالُ یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَکَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَہٗ (الخ)۔ ترجمہ:۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے فرمایا۔ کہ قیامت کے دن میں ایسی حمد کروں گا۔ جو آج تک نہ کی۔ اور اللہ رب کریم کی بارگاہ میں سر جھکاؤں گا۔ سجدہ کرتے ہوئے۔ پس کہا جائے گا۔ "یا مُحَمَّدُ" اپنا سر اٹھایئے۔ جو فرماؤ گے۔ سنا جائے گا۔

الخ :۔ اس حدیث پاک میں بہت جگہ لفظِ مُحَمَّدُ سے خطاب ہے۔ اگر یہ بے ادبی ہوتی۔ تو سب کے سامنے اس طرح کیوں فرمایا جاتا۔ قرآن کریم کا لفظِ یا مُحَمَّدُ سے خطاب نہ فرمانا۔ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ سے خطاب فرمانا۔ منکرینِ نبوت کے سامنے اظہارِ نبوت و رسالت مقصود تھا۔ کیونکہ کافر لوگ یا مُحَمَّدُ کہنے کو برا نہ جانتے تھے۔ بلکہ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہنے کے منکر تھے۔ وہ کافر لفظِ مُحَمَّدُ کو صرف آپ کا ذاتی نام سمجھتے تھے۔ ترجمے کی طرف توجہ نہ کرتے۔ اس لیے جب ایک دفعہ مُحَمَّدُ کے ترجمے کی طرف ابوجہل کو متوجہ کیا گیا۔ تو اس نے مُحَمَّدُ کہنا بھی چھوڑ دیا۔ مذمم مذمم بکنے اور گستاخی کرنے لگا۔ میرے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو پتہ لگا۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ وہ کسی مذمم کو برا کہتا ہوگا۔ ہم تو محمد ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن کریم میں یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ جیسے کلماتِ طیبہ سے خطاب کرنے سے یہ بھی پتہ لگا کہ کافر اور گستاخ جس لفظ سے دکھ کرتے ہوں۔ یا جس چیز کے منکر ہوں۔ اسی لفظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خطاب کرنا افضل ہے۔ تو چونکہ آج کل وہابیوں کو لفظِ یا مُحَمَّدُ اور لفظِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ سے بہت دکھ ہے۔ اور انہی کے منکر ہیں۔ لہٰذا ان الفاظ کا بہت چرچا کرو۔ اس حدیث پاک میں تو حشر کے میدان میں خطاب کا ذکر ہے۔ دیگر متعدد احادیثِ قدسیہ میں بھی یا مُحَمَّدُ کا خطاب موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ اللہ نے خطاب کیا۔ وہ بڑا ہے۔ ہمارے لیے منع ہے۔ کہ ہم چھوٹے ہیں۔ تو جواب میں دوسری دلیل دیکھو!

دلیل ۲ :۔ حضرت جبرائیل بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کرتے ہیں۔ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ چنانچہ مشکوٰۃ شریف۔ بحوالہ بخاری و مسلم صفحہ نمبر ۱۱ پر ہے بروایت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ (الخ) ط ترجمہ :۔ جبرائیل نے عرض کیا۔ یا محمد خبر دیجیے مجھ کو اسلام کے بارے میں اسی طرح معراج کی رات میں جبرائیل نے یَا مُحَمَّدُ کہہ کر خطاب کیا۔ چنانچہ تاریخ عبد الملک ابن ہشام جلد اوّل بابُ المعراج صفحہ نمبر ۲۱۶ پر ہے :۔ فَقَالَ جِبْرَائِیْلُ هُدِیْتَ وَهُدِیَتْ اُمَّتُكَ یَا مُحَمَّدُ! کیا جبرائیل بھی بڑے ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ آپ تو نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے شاگردوں اور خادموں میں ہیں۔ حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں ؎ :۔ اب دیکھو نور محمدؐ کا سب ہیچ ظہور محمدؐ کا ۔ جبرائیل مقرب خادم ہیں آقا مشہور محمدؐ کا :۔

۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نبی کریم نے اسطرح اپنی ذات کیلیے نقل فرمایا۔ جبرائیل نے اسطرح نہیں کہا ہوگا جسطرح اکثر بزرگ لوگ خود کو، تو سے کلام نقل کر دیتے ہیں اس لیئے کہ اولًا تو نبی کریم کا کلام بالکل غلط بیانی اور ملاوٹ سے پاک ہونا لازم ہے کیونکہ وحی الٰہی اور شریعت ہے کوئی بھی بزرگ یہ کہے مجھے فلاں نے لکھا تو کون ہے جبکہ فلاں نے آپ کہا تو یہ نقل کذب ہے۔ نبی کریم سے ایسا کذب بھی ناممکن دوم اسلیے کہ مشکوٰۃ کی حدیث تو فاروق اعظم سنا رہے ہیں وہ بھی کلام جبرائیل کو یا محمد کہکر ذکر کر رہے ہیں

اگر یا محمدؐ کہنا بے ادبی ہوتا۔ تو حضرت جبرائیل امین کبھی ایسا خطاب نہ کرتے۔ کون بے وقوف کہہ سکتا ہے۔ کہ معاذ اللہ حضرت جبرائیل نے بے ادبی کی یا آپ بے ادب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بے ادب ہی گستاخ ہوتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا گستاخ کافر ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت جبرائیل اس ممانعت سے علیحدہ اور مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ بے ادبی گستاخی سب کے لیے حرام ہے۔ جس طرح باپ کی سب اولاد پر باپ کا احترام فرض، اولاد چھوٹی ہو یا بڑی حاکم ہو یا مملوکہ وزیر ہو جائے یا بادشاہ، عالم ہو یا پیر مرشد، ولی ہو یا غوث، قطب اسی طرح نبی کے سب امتیوں پر نبی عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ کا ادب و احترام فرض ہے۔ جبرائیل ہوں یا میکائیل و اسرافیل، فرشتہ یا جن، انسان ہو یا حیوان۔ جمادات ہوں یا نباتات کیونکہ یہ سب ہمارے نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کے امتی ہیں۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ سورۃ انعام آیت نمبر ۳۸:۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (ترجمہ):۔ دنیا میں کوئی چرند و پرند ایسا نہیں۔ مگر جو اے مسلمانوں تمہاری طرح امت نہ ہوں۔ کس کی؟ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی۔ جب سب مخلوق نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی امت بن گئی۔ تو سب پر ادب فرض۔ اور ادب ادب جیسی عبادت و ریاضت سے مستثنیٰ قطعاً نہیں ہو سکتا۔ پس اگر یا محمدؐ کہنا بے ادبی ہوتا۔ تو حضرت جبرائیل کی جرأت نہ تھی کہ اس طرح اپنے نبی اکرم کو خطاب کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی جبرائیل کو منع نہ فرمایا۔ حضرت حکیم الامت کا مرآۃ جلد اوّل میں فرشتوں کے مستثنیٰ کا ذکر کرنا فقط ایک شاذ احتمال ہے۔ جس کو سند نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ حضرت جبرائیل نے جب یہ خطاب مذکورہ حدیث والا کیا تھا۔ تو اس وقت یہ ممانعت والا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ نہ یہ آیت لَا تَجْعَلُوْا نازل ہوئی تھی۔ اس لیے اس وقت یا محمدؐ کہنا حرام نہ تھا۔ بعد کو جب حرام ہو گیا۔ معاذ اللہ تو دو جواب یاد رکھیے:۔ (۱) اوّل یہ کہ نزولِ احکام صرف انسانوں اور مسلمانوں کے لیے ہیں۔ ملائکہ اور انبیاء کے لیے نزول نہیں ہوتا۔ وہ حضرات پہلے ہی قوانین الٰہیہ سے واقف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی بچپن یا قبل اعلانِ نبوت شراب نوشی وغیرہ افعال کا مرتکب نہ ہوا۔ اسی طرح وہ الفاظ بے ادبی جن سے صحابہ کو بذریعہ نزولِ آیات روکا گیا۔ عام مسلمان بوجہ عدمِ نزول ناسمجھی کی بنا پر اس طرح کلام کر دیا کرتے تھے۔ ان کے لیے اس وقت جرم نہ تھا۔ جب حکم نازل ہوا۔ تب جرم بنا مگر فرشتوں کے لیے پہلے ہی سے یہ جرم تھا۔

یہی وجہ ہے۔ کہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ اور لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا والے جرم کا ارتکاب کبھی پہلے کسی فرشتے سے صادر نہ ہوا، نہ نزول سے پہلے اور نہ بعد۔ کبھی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کو راعنا نہ کہا۔ پس اگر یا مُحَمَّدُ کہنا گناہ ہوتا۔ تو نزولِ آیتِ مذکورہ سے پہلے بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اجازت نہ ہوتی۔ اور اس طرح خطاب کرنا اُن کے لیے جرم بن جاتا ہے۔

(۲) دوسرا جواب تیسری دلیل میں ہے:۔ **دلیل ۳**:۔ حضرت ملک الموت نے آقائے دو عالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ والہٖ وسلم کے وصالِ پاک کے وقت وفات سے کچھ دیر پہلے روحِ طیبہ کو جسم اطہر سے جدا کرنے کی اجازت طلب کی۔ اور عرض کیا۔ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰہَ اَرْسَلَنِیْ اِلَیْكَ چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب وفات النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ و الہٖ وسلم بحوالہ بیہقی شریف صفحہ نمبر ۵۴۷ پر ہے،

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِیْهِ (الخ) ثُمَّ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنِیْ اِلَیْكَ فَاِنْ اَمَرْتَنِیْ اَنْ اَقْبِضَ رُوْحَكَ قَبَضْتُ وَاِنْ اَمَرْتَنِیْ اَنْ اَتْرُكَهٗ تَرَكْتُهٗ (الخ) ترجمہ:۔ جعفر بن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام عاجزی انکساری کے ساتھ ڈرتے ڈرتے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا جب بارگاہ نبوت سے جوابِ سلام عطا ہوا۔ تو عزرائیل نے کہا۔ یا مُحَمَّدُ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف بھیجا ہے۔ اگر آپ حکم کریں۔ تو آپ کی روحِ مبارک قبض کروں۔ اور اگر آپ مجھ کو حکم کریں۔ تو ہرگز نہ قبض کروں گا۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ کیا ادب و احترام ہے۔ کیا شان ہے میرے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کی۔ دیکھو یہ واقعہ آخری ساعاتِ حیاتِ طیبہ کا ہے۔ مگر ملک الموت خطاباً عرض کرتے ہیں کہ یا مُحَمَّدُ اِسی حدیث مبارکہ کے اول الفاظ میں حضرت جبرائیل بھی اسی طرح یَا مُحَمَّدُ کہہ کر خطاب کر رہے ہیں۔ ظاہر اور لازمی بات ہے۔ کہ اس وقت یہ آیت آچکی ہے۔ تو اگر اس آیت کا مطلب یہی ہوتا جو مذکورہ فی السوال دیوبندی وہابی مولوی احتشام الحق نے لیا۔ تو حضرت جبرائیل و عزرائیل بوقتِ وفات اس طرح خطاب کیوں کر رہے ہیں۔ ثابت ہوا کہ یا محمد کہنا بے ادبی نہیں۔ **دلیل ۴**:۔ صحابہ کرام نے ہجرت کے دن نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد پر جلوس نکالا اور گلیوں اور بازاروں عام راستوں میں۔ یَا مُحَمَّدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کے نعرے لگائے۔ جب کہ نبی پاک بھی وہاں ظاہراً موجود تھے۔ بالکل ویسا ہی نقشہ کھینچا۔ جیسا کہ آج کل ہمارے جلسے جلوس میں نعرۂ رسالت ہوتا ہے۔ یعنی اس موقعہ پر یَا مُحَمَّدُ، یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہنا خطاب نہ تھا۔ بلکہ محض بطورِ نعرہ بحصولِ برکت و رحمت

اور اظہارِ خوشی کے لیے تھا۔ اسی طرح آج کل ایسا ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ اس نعرے کو قائم و دائم رکھے چنانچہ مسلم شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۴۱۹ پر ہے کہ :۔ وَتَفَرَّقَ الْغِلْمَانُ وَالْخَدَمُ فِي الطُّرُقِ يُنَادُوْنَ۔ يَا مُحَمَّدُ يَا رَسُوْلَ اللهِ يَا مُحَمَّدُ، يَا رَسُوْلَ اللهِ (مسلم ج ۲ ص ۴۱۹ البراء) (ترجمہ) جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے۔ تو شہر کے نوجوانوں، صحابہ اور مزدور لوگ راستوں میں متفرق ٹولیوں میں پھرتے تھے۔ اور یا مُحَمَّدُ یا رَسُوْلَ اللہِ کہتے تھے۔ اللہ کی بارگاہ میں یہ نعرہ اتنا مقبول ہوا۔ کہ آج تک ساری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ بلکہ اب یہ نعرہ مسلمان کا نشانِ ایمان بن چکا ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کی پہچان مشکل ہے۔ صحابہ کرام نے یہ نعرہ لگایا۔ کون بے دین صحابہ کو بے ادب کہہ سکتا ہے۔ اگر یا مُحَمَّدُ یا رَسُوْلَ اللہِ کہنا بے ادبی ہوتی۔ تو کوئی تو ان نوجوانوں، شیروں، دلیروں کو منع کرتا۔ پتہ لگا۔ کہ یا مُحَمَّدُ کہنا عین ایمان اور ادب ہے۔ ایسے پاکیزہ نعرے اور خطاب کو جو شخص بے ادبی کہتا ہے۔ وہ خود گستاخ ہے۔ اور حضرت جبرائیل عزرائیل، صحابہ کرام کی گستاخی کر رہا ہے۔ **دلیل ۵** :۔

ابن ماجہ شریف صفحہ نمبر ۹۹ پر باب الصلوٰۃ دعائے حاجت میں خود آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک حاجت مند صحابی کو ایک دعا تعلیم فرمائی۔ جس میں یا مُحَمَّدُ کے الفاظ فرمائے۔ اور یہ دعا قیامت تک ہر مسلمان کے لیئے جائز ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف باب صَلٰوةِ الْحَاجَةِ بروایت عثمان ابن حنیف صفحہ نمبر ۹۹ پر ہے :۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّي قَدْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰى رَبِّي فِي حَاجَتِي هٰذِهِ (الخ) قَالَ اَبُوْ اِسْحٰقَ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ (ترجمہ)۔ الٰہی میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ اور متوجہ ہوتا ہوں۔ تیری طرف رحمت والے تعریف کیئے ہوئے نبی کے طفیل۔ یا مُحَمَّدُ بے شک میں متوجہ ہوں۔ آپ کے وسیلے سے اپنے رب کریم کی طرف اپنی اس حاجت میں۔ (الخ) ابو اسحٰق نے فرمایا۔ کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے یہ بات تجربہ شدہ ہے۔ کہ اب بھی انہی الفاظ کے ساتھ یہ دعا بطریقِ مسنونہ پڑھی جائے اگر ذرہ بھر لفظوں میں تبدیلی کر دی جائے تو اثر نہیں ہوتا یہ دعا سکھانے والے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اور سیکھنے والے صحابی رسولِ کریم۔ اگر یا محمد کہنا گناہ ہے تو لگاؤ کس پر کیا فتوے لگانے لگتے ہو۔ **دلیل ۶** :۔ تمام مفسرین کرام قُلْ کی تفسیر میں یا مُحَمَّدُ۔ لکھتے ہیں چنانچہ تفسیر جلالین اور تفسیر ابن عباس تفسیر صاوی وغیرہم میں جہاں کہیں قل۔ واحد مذکر حاضر کا صیغہ آجاتا ہے وہاں وہ یا مُحَمَّدُ لکھتے ہیں۔ اگر یا مُحَمَّدُ کہنا یا لکھنا بقولِ جہلاءِ دیوبند گناہ ہوتا تو یہ مفسر کیوں لکھتے۔ حالانکہ تمام دیوبندی مدارس میں تفسیر جلالین پڑھائی جاتی ہے :۔

دلیل نمبر ۷ :۔ تمام دیوبندی اکابر کے مرشد حاجی امداد اللہ صاحب بھی یا محمد کہنے کو جائز مانتے ہیں۔ چنانچہ اپنی مصنفات کلیاتِ امدادیہ دس رسائل کا مجموعہ کے آخری صفحات نالۂ امدادیہ صفحہ نمبر ص ۲۲۳ پر ایک مناجات میں عرض بہ بارگاہ رسالت اشعار لکھتے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے :۔

شعر

اے رسولِ کبریا فریاد ہے!

یا محمد مصطفےٰ فریاد ہے!

(مطبوعہ مکتبہ تھانوی کراچی)

دلیل نمبر ۸ :۔ سابقہ سات دلائل سے ثابت کر دیا گیا۔ کہ مخلوق میں حضرتِ جبرائیل سے امت تک سب نے یا محمد کہا۔ حضرت جبریل سے لے کر صحابہ کرام، مفسرین عظام، صوفیاء کی دعاؤں اور حاجی امداد اللہ صاحب اکابرینِ امت تک بھی سب نے یا محمد کہا۔ لیکن کسی نے اس کو برا نہ جانا اور نہ ہی آج تک یہ کلمہ بے ادبی میں شمار ہوا۔ حالانکہ یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کا ذاتی نام ہے آخر اس کی بے ادبی نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ تو سنیئے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ہر شخص کے نام نو ۹ قسم کے ہوتے ہیں :۔

(۱) :۔ اسم جنسی :۔ جیسے لفظِ حیوانِ ناطق۔ کہ ہر شخص کا نام جنسی ہے۔ (۲) اسمِ نوعی جیسے لفظِ انسان کے ہر شخص کا نوعی نام ہے :۔ (۳) اسمِ صنفی جیسے لفظِ مرد یا عورت :۔ (۴) اسمِ سنی :۔ جیسے لفظِ بچہ، جوان، بوڑھا۔ کہ ہر شخص کا عمر کے لحاظ سے نام ہوتا ہے (۵) اسمِ دینی :۔ جیسے لفظ مسلمان، لفظِ عیسائی، یہودی وغیرہ (۶) اسمِ قومی :۔ جیسے لفظِ سید، پٹھان وغیرہ (۷) اسمِ ملکی :۔ جیسے لفظ عربی ہندی، پاکستانی وغیرہ (۸) اسمِ ذاتی :۔ جیسے زید، بکر، خالد وغیرہ، (۹) اسمِ وصفی :۔ جیسے لفظ عالم، مولانا، حافظ، قاری، حاکم، آفیسر، تھانیدار، سپاہی، کرنل وغیرہ، مستری، مزدور تمام ناموں میں اصل نام جس سے ذات کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ اسمِ ذاتی ہے۔ اس کو عربی میں عَلَم کہتے ہیں۔ یہ نام ہمیشہ دوسرے ناموں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور دوسرا نام وصفی ہے، یہ نام والے کے وصف اور قابلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ عام طور پر وصفی اور ذاتی نام جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہمارے نام اسم بامسمّٰی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام خود ہم نے یا ہمارے والدین نے رکھے ہوتے ہیں۔ کہ جن میں ہمارے وصف کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی یہ ممکن کیونکہ ہمارے نام ذاتی بچپن میں رکھے جاتے ہیں۔ جب کہ ہمارا کوئی وصف ظاہر نہیں

ہوتا۔ بعد میں جیسے جیسے وصف پیدا ہوتے ہیں۔ نام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ذاتی نام محض
ذاتی غیر وصفی ہوتے ہیں بخلاف آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم
کے کہ آپ کے تمام نام جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ سب کے سب عالم بالا میں خود خالق کائنات پروردگار
عالم نے ہی رکھ دیئے۔ آپ کے دو نام ذاتی اور باقی نام صفاتی ہیں۔ لیکن دیگر ناموں کی طرح فقط ذاتی یا فقط
صفاتی نہیں۔ بلکہ آپ کے ذاتی نام مع صفاتی ہیں۔ اور بعض صفاتی نام مع ذاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظِ محمد
اور احمد آپ کے ذاتی نام بھی ہیں۔ اور آپ کی عظیم نعت بھی گویا کہ آپ اسم با مسمّٰی ہیں۔ کائنات میں بجز آپ
کے کوئی اسم با مسمّٰی نہیں۔ اور اسی طرح آپ کے بعض صفاتی نام مع ذاتی ہیں۔ جیسے لفظِ رسول، مرسل
نبی خاتم النبیین وغیرہ وغیرہ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ کہ یہ الفاظ اگرچہ آپ کے اوصاف اور عہدے کے اعتبار
سے ہیں۔ مگر اب آپ کے ذاتی نام یعنی عَلَم بھی ہیں۔ ذاتی اور صفاتی نام میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ کہ ذاتی نام
بغیر رکھے ہوئے ہم ہر ایک کے لیئے نہیں بول سکتے۔ مگر صفاتی نام ہر اس کے لیئے استعمال کر سکتے ہیں
کہ جس میں یہ صفت پیدا ہو جائے۔ ذاتی اور صفاتی ناموں میں تیسرا فرق یہ بھی ہے۔ کہ ذاتی نام دائمی ہوتا
ہے اور صفاتی نام عارضی۔ جب تک کہ صفت ہے نام ہے۔ اور جب صفت ختم، صفاتی نام بھی ختم
اب ثابت ہو گیا۔ کہ ذاتی اور صفاتی جب علیحدہ علیحدہ ہوں۔ تو ان میں تین طرح فرق ہے۔ لیکن دونوں
ساتھ ساتھ ہوں۔ تو یہ تینوں فرق بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ پس یاد رکھو کہ سب لوگوں کے نام ذاتی
صفاتی علیحدہ ہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے نام میں جدائی نہیں۔
اور کیوں کر ہو۔ کہ آپ تو بچھڑوں کو جوڑنے والے ہیں۔ آپ کے تمام ذاتی نام آپ کی عظیم صفتوں
کو بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ جس طرح آپ کے بعض صفاتی نام آپ کے عَلَم یعنی ذاتی نام بن چکے
ہیں۔ اسی طرح آپکے ذاتی نام صفاتی بھی ہیں مثلاً نبی، رسول، آپکے صفاتی نام بھی ہیں۔ اور ذاتی بھی کہ اب کسی کو رسول، نبی نہیں کہہ
سکتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم پارہ نمبر ۱۸ صفحہ نمبر ۲۲ پر ہے۔ وَ قَالَ اَبُوْ
حَیَّانَ یَنْبَغِیْ اَنْ یَجُوْزَ النَّعْتُ لِاَنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ صَارَ عَلَمًا بِالْغَلَبَۃِ ط (ترجمہ)
ابو حیان نے فرمایا۔ کہ یَا مُحَمَّدُ اور یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وغیرہ الفاظ سے نبی پاک کی نعت کہنی
جائز ہے۔ کہ لفظِ رسول بھی اب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا عَلَم بن چکا
ہے۔ کیونکہ اب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کا غلبہ ہے۔ یعنی سابقہ انبیاء کی نبوت عِنْدَ النَّاسِ
منسوخ ہے۔ اب دنیا میں رسول کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے سوائے
نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی کو یَا رَسُوْلَ کہہ کر نہ پکارا۔ بلکہ

یَآمُوْسٰی، یَآعِیْسٰی، یَآاٰدَمُ، ہی فرمایا۔ اور اسی طرف اشارہ ہے۔ علامہ جامی کے اس شعر کا:۔

یا آدم است با پدرِ انبیاء خطاب!
یَآاَیُّھَا الرَّسُوْلُ خطابِ محمد است

جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو۔ ہمارے اسلامی معاشرے اور رواج میں کسی بزرگ کو محض ذاتی نام سے پکارنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے لیکن صفاتی نام پکارنا عین ادب اور احترام ہوتا ہے۔ اسی لیئے بیوی خاوند کا، بیٹا بیٹی، ماں باپ کا شاگرد استاد کا، مرید اپنے پیر مرشد کا ذاتی نام لے کر ہرگز نہیں پکار سکتے۔ اس لیئے کہ شریعت مطہرہ کے قانون کے مطابق بڑوں کا ذاتی نام لے کر پکارنا منع ہے۔ کیونکہ ہمارے نام فقط محض ذاتی ہیں، ہاں نسبتی نام اور صفاتی نام لینے بالکل جائز ہیں۔ محض ذاتی نام لینے میں بے ادبی ہے۔ نسبتی اور صفاتی نام لینے میں بے ادبی نہیں۔ بلکہ ادب و احترام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی نام پاک بھی محض ذاتی نہیں بلکہ ہر نام صفاتی نام بھی ہے۔ کہ آپ کے ہر نام میں ہزارہا آپ کی صفات ظاہر ہیں۔ لہٰذا جس وقت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفات طیبہ کا خیال مدنظر ہو۔ تو کسی بھی نام سے ندا کی جائے تو جائز ہے، بدیں وجہ جب لفظ محمد کے ترجمے پر غور ہو۔ تو یَا مُحَمَّدُ کہہ کر پکارنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت جبرائیل و میکائیل و عزرائیل نے ندا کی۔ بلکہ خود باری تعالیٰ نے اسی نعت و شان کے اظہار کے لیئے اپنی نبی کو یَا مُحَمَّدُ کہہ کر ندا فرمائی۔ ان خطابات میں محض ذاتی نام مراد نہیں۔ اسی لیئے ہمارے اکابرین علماء نے جہاں کہیں یَا مُحَمَّدُ کہنے سے منع فرمایا۔ وہاں بھی مقصد ہے۔ کہ فقط ذاتی نام سمجھ کر عرض و معروض کرنے کے لیئے ندا کرنا اور پکارنا منع ہے۔ کہ اس میں بوجہ عمومیت بے ادبی کا شائبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حکیم الامت نے جاء الحق حصہ اوّل صفحہ نمبر ۱۷۲ پر فرمایا۔ کہ یا محمد کہہ کر پکارنا منع ہے۔ یعنی یا محمد کا کہنا یا لکھنا منع نہیں۔ بلکہ ندا کرنا اور پکارنا ناجائز ہے۔ اسی طرح جاء الحق جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۷۳ میں ہے۔ کہ۔ برابری کے الفاظ سے یاد کرنا حرام ہے۔ جاء الحق میں پکارنے کی قید اسی لیئے لگائی گئی۔ کہ یَا مُحَمَّدُ ہمیشہ خطاب کے لیئے نہیں ہوتا۔ بلکہ لفظ یا، کبھی ندا کے لیئے کبھی توبہ کے لیئے اور کبھی محض نعرے کے لیئے۔ چنانچہ نحو کی کتابوں میں حرفِ یا کے دوسرے استعمال بھی مرقوم ہیں۔ دیکھو شرح جامی صفحہ نمبر ۱۳۴ پر۔ صحابہ کرام ہجرت کے دن مدینہ پاک کی گلیوں، بازاروں کوچوں میں یَا مُحَمَّدُ اور یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کہتے پھر رہے تھے۔ وہ ندا یا خطاب نہ تھا۔

ورنہ اتنی دُور سے یہ الفاظ نہ بولتے۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر عرض کرتے۔ صحابہ نے حرفِ یا بھی استعمال کیا اور آپ کا ذاتی نام بھی ثابت ہوا۔ کہ یہ پکار یا خطاب نہیں۔ بلکہ فقط نعرہ ہے۔ اور نعرے میں ہمیشہ صفاتی نام ہی مقصود ہوتا ہے۔ اور بقاعدۂ نحوی حرف یا، نعرے کے وقت استعمال کرنا جائز ہے۔ ورنہ یہ صحابہ جو خود عربی ہیں۔ اور عربی نحو صرف سے واقف ہیں۔ وہ اس جگہ نعرے میں حرف یا کیوں استعمال کرتے۔ صحابہ کے اِس نعرے کو کسی صورت خطاب یا پکار نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خطاب کا جملہ تامہ ہونا لازم ہے۔ حالانکہ یہ نعرہ جملہ ناقصہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظِ محمد سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا صفاتی نام مراد ہو۔ تو یا محمد کہہ کر پکارنا ندا کرنا بالکل جائز ہے۔ للہٰذا فی زمانہ ہر جگہ ہر وقت مقدس ومطہر ہو کر یا محمد کہنا باعثِ ثواب۔ کیونکہ اب یہ لفظ بطور نعرہ مستعمل ہے۔ اور نعرہ ہوتا ہی صفاتی ہے۔ استمداد کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاضر وناظر اپنے بالکل قریب سمجھ کر آپ سے عرض ومعروض کرتے وقت بھی یا مُحَمَّدُ کہنا جائز۔ جب کہ یا مُحَمَّدُ کے صفاتی ترجمہ کا خیال ملحوظ ہو رہی وہ آیت کریمہ کہ جس کو وہابیانِ زمانہ نے اپنی دلیل سمجھی۔ اس آیت کا لفظ یا مُحَمَّدُ سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو

(اِس آیت پاک کی مکمل تفسیر)؛۔ اِس آیت پاک کی تفسیر میں تمام مفسرین کرام بہت سے اقوال بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر الحدیث لعلامہ حافظ علیے عمار مصری جلد دوم صفحہ نمبر ص۲۹۳ پر ہے۔ اور تفسیر ابن کثیر لعلامہ اسماعیل ابن کثیر جلد سوم صفحہ نمبر ص۳۰۷ پر ہے۔ کہ دُعا بمعنی التجاء اور مناجات ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کو اپنی اپنی دعاؤں کی طرح نہ سمجھو ہماری دعائیں بعض قبول بعض مردود مگر انبیاء کرام کی سب دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ کہ فَاِنَّ دُعَآءَہٗ مُسْتَجَابٌ فَاحْذَرُوْہُ اَنْ یَّدْعُوْا عَلَیْکُمْ لِتَہْلِکُوْا۔ یعنی نبی کی بد دعا سے بچو۔ کہ یقیناً وہ ہلاک کر دیتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد چیخ چیخ کر پکارنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دینا ہی مراد ہے یعنی لَا تَجْعَلُوْا والی آیت یہ حکم دے رہی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چیخ چیخ کر نہ بلاؤ۔ بلکہ قریب جا کر آہستہ آہستہ سے کلام کرو۔ اُس وقت بہ نیت احترام و توصیف یا مُحَمَّدُ یا رَسُوْلَ اللہِ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر مدارک وتفسیر بیضاوی نے جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۳۲ پر اسی بات کو ترجیح دی۔ اِن مفسرین کے نزدیک لَا تَجْعَلُوْا کا حکم صرف صحابہ کے زمانے میں ہی جاری تھا۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیاتِ ظاہری جلوہ افروز تھے اور لوگ آپ سے بالمشافہ عرض ومعروض کیا کرتے تھے۔ اب یہ حکم منسوخ ہے۔ بعض مفسرین

کے نزدیک مطلقاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا نام ذاتی لے کر بلانا ممنوع خواہ زور سے اور خواہ آہستہ، اُن کے نزدیک یہ حکم اِس صورت میں ہے۔ جب کہ لفظ مُحَمَّدٌ کو ذاتی نام سمجھا جائے تب یَا مُحَمَّدُ کہنا بے ادبی ہے۔ صفاتی نام کی نیت سے یَا مُحَمَّدُ کہنا یا بطور نعرہ یَا مُحَمَّدُ کہنا ان مفسرین کے نزدیک بھی بُرا اور ناجائز نہیں۔ ورنہ پہلے دلائل مذکورہ کا جواب کیا ہوگا۔ چنانچہ تفسیر ابن عباس و جلالین نے یہ ہی کہا ہے کہ بہت سے لوگ ناسمجھی میں یَا مُحَمَّدُ کو بطریقہ ذاتی نام استعمال کیا کرتے تھے۔ جس سے بے ادبی کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ اِس لیئے اللہ تعالیٰ نے ناسمجھوں کو تو منع کر دیا۔ مگر جبرائیل میکائیل وصحابہ کو منع نہ کیا۔ کیونکہ یہ لوگ یَا مُحَمَّدُ کو نبی پاک کی تعظیم و توصیف سمجھ کر کہتے تھے۔ یہ تھے، مفسرین کے نزدیک بعض اقوال اِس آیت کریمہ کی تشریح و تفسیر میں۔ مگر یہ سب غیر مناسب تفسیریں ہیں اس لیئے کہ آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر کے چار درجے ہیں۔ ان ہی درجوں سے آیت کی سچی طرح سمجھ لینا ممکن ہے اگر یہ چار درجے تسلیم نہ کیئے جائیں۔ تو کسی آیت کو سمجھنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیئے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت کی ہزاروں تفسیریں ہو چکی ہیں۔ جن میں اکثر غلط ہیں۔ ایک اجنبی شخص ان غلط تفسیروں کو پڑھ کر گمراہی کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اِس لیئے مفسرین کرام تفسیر سے پہلے ان چار تفسیری مدارج کو سمجھنے اور سمجھانے کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ پس جو تفسیر ان چار مدارج کے ماتحت ہو گی۔ وہ درست ہو گی۔ ان سے علیحدہ ہو کر تفسیر قطعاً غلط اور ناقابل قبول۔ مفسرین کے بتائے ہوئے چار درجے حسب ذیل ہیں:۔

نمبر ایک (۱): ۔تفسیر القرآن بالحدیث المبارکہ مِنْ لِسَانِ رَسُوْلِ کَرِیْمٍ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ: (۲) تفسیر القرآن بسیاقِ القرآن :۔ (۳) تفسیر القرآن بشانِ نزولِ آیات: (۴) تفسیر القرآن بِاَلْفَاظِ الْقُرْآن :۔ یہ چار درجے ہیں۔ کہ جن کے ذریعہ تفسیر کرنا جائز ہے۔ اِن سے ہٹ کر جو تفسیر ہو گی۔ اس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے۔ شریعت میں وہ سراسر غلط ہے۔ مندرجہ بالا جن تفاسیری عبارات کا ذکر کیا گیا۔ وہ سب اِن مدارج اربعہ کی حدود سے باہر ہیں۔ اِسی لیئے شرعاً قابلِ سند نہیں اِن جیسی تفاسیر سے ہی دیوبندی حضرات استفادہ کر کے غلط روش اختیار کرتے ہیں اِنہی اقوال سے مولوی احتشام الحق صاحب تھانوی نے استدلال میں سہارا پکڑا ہے۔ آج اتنے فرقے بھی ان ہی تفاسیر بالرائے سے بنے ہوئے۔ اگر مفسرین قرآن بننے سے پہلے اِن چار درجوں پر غور کر لیا جائے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ ضلالۃ بِالْقُرْآنِ نہ سر اٹھا سکے۔ اب اس آیت کریمہ کے بارے میں

یہ چار درجے کسطرح ہیں۔ جب ان مدارج میں غور و فکر کر کے آیت پر نظر کی جائے۔ تو اس کا مطلب کچھ اور ہی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیری ترجمہ ملاحظہ کیا جائے۔ اے مسلمانو: نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کسی شخص کو آواز دیں۔ تو آپ کی پکار کو لاپرواہی یا سستی سے ٹالا نہ کرو۔ جس طرح کہ ایک دوسرے کی آواز کو کبھی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ جب کسی خطاب وعظ نصیحت کے لیئے یا کسی اپنے کام کے لیئے بلائیں۔ اور جب تک واپس جانے کی اجازت نہ دیں۔ ہرگز ہرگز واپس نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی فرض، واجب یا نفل بھی پڑھ رہا ہو۔ تب بھی نماز چھوڑ کر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی پکار پر دوڑتا چلا آئے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کا کرم دیکھیئے۔ کہ اس کی نماز بھی نہ ٹوٹے۔ پھر وہیں سے اگر شروع کر دے۔ جیسے کہ حالت کی نماز نہیں ٹوٹتی۔ مگر یہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا پکارنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کہ انکی بات چیت، چلنے پھرنے، بازار جانے آنے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کیا شان ہے دربارِ شاہانہ کی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ط اب اس تفسیر کو کسی درجے سے دیکھو۔ غلط نہ ہوگی۔ بخلاف دیگر تشریحوں کے۔ (۱) اس آیت کی تفسیر بالحدیث بھی یہی ہے۔ کہ نبی پاک نے خود یہی مطلب بیان فرمایا۔ اور صحابہ کرام نے عمل کیا (۲) اس آیت کی تفسیر روشِ کلام سے بھی یہی ظاہر ہو رہی ہے۔ اس آیت کا سیاق و سباق اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ سے لے کر بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ تک ہے۔ اس عبارت آیات کا مطلب و مفہوم بلکہ لفظی ترجمہ یہی ہے۔ کہ میرے پیارے حبیب کی مرضی کے بغیر ان کی مجلس سے اُٹھ کر نہ جاؤ۔ ان کے بلانے اور جمع کرنے سے فوراً آ جاؤ:۔ (۳) اس آیت کی تفسیر بالالفاظ بھی یہی بات ظاہر فرما رہی ہے۔ چنانچہ تفسیر روح البیان نے جلد ششم کے صفحہ نمبر ۱۸۵ پر ارشاد فرمایا:۔ کہ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ "اَلْمَصْدَرُ مُضَافٌ اِلَی الْفَاعِلِ (الخ) یعنی لَا تَجْعَلُوْا کی آیت میں لفظِ دعا مصدر ہے اور مضاف فاعل کی طرف ہے۔ کہ نبی جب تم کو پکاریں۔ اگر یا محمد کہنے کی اس آیت سے ممانعت ہوتی۔ تو دُعَآءَ الرَّسُوْلِ نہ ہوتا۔ بلکہ دُعَآءَ کُمْ لِلرَّسُوْلِ ہوتا لہٰذا نحوی اور لفظی لحاظ سے اور لفظی تفسیر کی بنا پر بھی یہی مطلب ثابت ہوتا ہے۔ (۴) باعتبار شانِ نزول کے بھی یہی تفسیر بنتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے مفسرین اس کا شانِ نزول یہی بیان فرماتے ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم جب کبھی وعظ و نصیحت یا جمعہ و عید کے لیئے جمع فرماتے۔ تو منافقین اور ان کی دیکھا دیکھی بعض ان پڑھ یا کم سمجھ۔ نو مسلم بھی جلدی نہ آتے۔ اور جب آتے۔ تو چھپ چھپا کر جلدی بھاگنے کی کوشش کرتے،

ان کے لیے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ غرضیکہ کسی طرح بھی اس آیت کو دیکھا جائے آخری تفسیر ہی ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے جن اکابرین نے اس آیت کے چند مطلب بیان کیئے۔ وہ بھی ترجیح اِس آخری معنٰی کو ہی دیتے ہیں چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد نہم صفحہ نمبر ص۲۲۲ پر ساری تفسیریں قَالَ بَعْضٌ اور قِیْلَ بَعْضٌ بیان کر کے آخر میں فرماتے ہیں کہ نَعَمْ اَلْاَظْهَرُ فِیْ مَعْنَیْ الْاٰیَةِ مَا ذَكَرْنَا ١٧ اَوَّلًا كَمَا لَا يَخْفٰى ہ یعنی اگرچہ بہت سے لوگ اس آیت میں طرح طرح کے مذکورہ ترجمے کرتے ہیں، مگر زیادہ شاندار اور ظاہر وہی تفسیر ہے جو سب سے پہلے اوّل نمبر پر ہم نے بیان کی یہاں تک کہ وہابیوں کے سابقہ پیشوا اشرف علی صاحب تھانوی اپنے ترجمے کے صفحہ نمبر ص۴۳ پر اور موجودہ پیشوا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تفہیم القرآن جلد سوم کے صفحہ نمبر ص۴۲۷ پر اسی تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس آیت سے مخالف کا منشاء ہرگز نہیں حاصل ہوتا۔ نہ ہی لفظِ یا محمد کہنے کی حرمت ممانعت کسی بھی آیت سے ثابت ہوتی ہے، جن لوگوں نے لفظِ دعآءَ الرسول میں رسول مفعولی مضاف الیہ بنایا ہے وہ محققین علماء بھی اسم جنسی اور نوعی اور نسبتی ناموں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے سے ممانعت فرماتے ہیں۔ نہ کہ یا محمد اور یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے۔ ان کا مقصد بھی یہ ہے کہ نبی کریم رؤف ورحیم علیہ التحیۃ والثناء کو ابا چچا بھائی بھتیجا مرد انسان بشر کہہ کر نہ پکارو، ورنہ کیا ان کے سامنے یا محمد کے ثبوت میں وہ دلائل نہ تھے۔ جو ہم نے اوپر بیان کیئے: ثابت ہوا کہ بجز وہابیوں کے کوئی بھی یا محمد کے نعرے سے منکر نہیں۔ سب علماء جائز اور باعث برکت سمجھتے ہیں۔ کہ جس طرح یا اللہ کہنا اور لکھنا جائز ہے۔ اسی طرح یا محمد بھی لکھنا اور کہنا بالکل جائز ہے۔ کہ وہ بھی اسم ذاتی مع صفاتی ہے اور یہ بھی ذاتی مع صفاتی۔ ذاتی نام کی تعریف نحوی یہ ہے۔ کہ جو موضوع لہٗ کے بغیر کسی اور پر نہ بولا جائے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نام صفاتی سمجھ کر پکارنا اور نعرہ لگانا بالکل جائز۔ ہاں البتہ جب بھی نبی کریم کا کوئی نام منہ سے کہا جائے یا کانوں سے سنا جائے تو ضرور اور ضرور صلی اللہ علیہ وسلم کہا جائے۔ بلکہ لکھنا بھی مستحب اور زیادہ اچھا ہے۔ یہ حکم اِس آیت سے نہیں بلکہ بابُ القیام کی لعنت اور آمین والی حدیث سے ظاہر ہوا۔ لیکن ذاتی مع صفاتی کو صرف ذاتی عَلَمْ سمجھ کر پکارنا منع ہے۔ نحو کے اس قاعدے سے بھی اعتراض کرنا حماقت ہے کہ عَلَمْ اور وصف جمع نہیں ہو سکتے یہ قانون اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن لفظِ محمد مستجمع صفات ہے۔ جیسے کہ لفظ اللہ چنانچہ مناظرہ رشیدیہ صفحہ ص۳ پر ہے:- وَاللّٰهُ عَلَمٌ لِذَاتِ الْوَاجِبِ الْوُجُوْدِ الْمُسْتَجْمِعِ لِجَمِيْعِ صِفَاتِ الْكَمَالِ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ہ

کتبہ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح منتقل ہوتا رہا؟

سوال ۱۷: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور کس طرح منتقل ہوتا رہا۔ عالی جاہ اُس کی حقیقت سے مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ جب کہ احادیث سے مجامعت و قربت ہی سبب معلوم ہوتا ہے۔ کیا نطفہ میں نور مخلوط تھا؟ اسی ذریعے سے پاک پشتوں اور رحموں میں منتقل ہوتا رہا ہے یا حقیقت کچھ اور ہے؛ بحر لطف تفصیلاً باحوالہ وضاحت فرما کر جواب باصواب سے جلد مستفیض فرمائیں: وَجَزَاكُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

سائل:- مولوی محمد یعقوب خاں خطیب کاموں کے منڈی ضلع گوجرانوالہ۔ بروز پیر ۲۶ محرم شریف ۱۳۹۲ھ۔

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ بہت اہم ہے اس لیے اس کے جواب کو سمجھنے کے لیے چند باتیں یاد رکھنی بہت ضروری ہیں۔ تاکہ جواب کو بآسانی سمجھا جا سکے (۱) جاننا چاہیئے۔ خلاق کائنات نے دنیا میں بے شمار مخلوق پیدا فرمائی۔ جن کو چار قسموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم مخلوقِ لطیف جیسے فرشتہ، جن، ہوا، روح وغیرہ۔ دوسری قسم حیوانات جیسے انسان، بیل، گھوڑا وغیرہ، تیسری قسم نباتات جیسے درخت بیل بوٹے۔ چوتھی قسم جمادات جیسے اینٹ پتھر، آسمان، زمین، چاند، سورج وغیرہ۔ لیکن اس تمام مخلوق کے طریقۂ پیدائش فطرتاً مختلف ہیں۔ چنانچہ ملک، ہوا، روح اور تمام جمادات بلاواسطہ بغیر وسیلہ یک دم مکمل پیدا کیئے گئے۔ اسی کو امرِ کن کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش میں کسی دوسرے کی مدد وغیرہ کا دخل نہیں۔ بخلاف دیگر مخلوق کے کہ اُن کی پیدائش میں ظاہری طور پر بے شمار وسائل حائل ہیں۔ جن کی بنا پر ان کو خلقتِ کسبی بھی کہا جاتا ہے عالَمِ حیوانات میں ہر جاندار جوڑا جوڑا پیدا کیا گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:- فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ط ترجمہ:- اللہ تعالیٰ نے ان جانداروں سے دو دو جوڑے مذکر، مؤنث پیدا کیئے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:- وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ط وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ مِنْ نُطْفَةٍ (الخ):- ترجمہ: ہم نے ہر چیز کے دو دو جوڑے پیدا فرمائے۔ اور وہ جوڑے نر و مادہ پیدا کیئے۔ اِن آیات سے ثابت ہوا کہ جانداروں کے علاوہ بعض نباتات بھی نر

و مادہ سے پروان چڑھتے اور بار آور ہوتے ہیں۔ لیکن خلاقِ کائنات نے ہر مذکر مونث کا اختلاط اور صحبت و ملاپ بے شمار طریقے سے کیا۔ اور نطفے بھی مختلف پیدا کیئے۔ چنانچہ بعض درخت بھی مختلف نوعیت کی نر و مادہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے کھجور کا درخت انگور کی بیل وغیرہ اور ان کا اختلاط بھی مختلف نوعیت کا چنانچہ بعض صرف قرب سے صحبت یافتہ ہوجاتے ہیں۔ اور ہوا کے ذریعے نطفہ منتقل ہوجاتا ہے بعض کو نر درخت سے پیوند کرانا پڑتا ہے۔ اسی طرح جانداروں میں بھی نر و مادہ کی صحبت مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے علاقوں میں ایک پرندہ قوقیس پایا جاتا ہے۔ جو اپنی شہوت رانی کے لیئے اپنی مادہ سے چونچ رگڑتا ہے۔ جس کی گرمی سے آگ کا شعلہ نکلتا ہے اور دونوں اپنے ہی جمع کیئے ہوئے تنکوں پر جل مرتے ہیں۔ اسی راکھ پر بارش ہوتی ہے۔ جس سے نئے کیڑوں کی شکل میں اس جیسے جانور پیدا ہوجاتے ہیں۔ پھر پرندہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حیوٰۃ الحیوان لعلامہ دمیری صفحہ نمبر ۲۲۱ اور کتاب عجائب المخلوقات جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۳ پر ہے۔ (قوقیس) قَالَ الْقَزْوِيْنِيْ اَنَّهٗ طَائِرٌ بِاَرْضِ الْهِنْدِ (الخ)

ایک اور پرندہ ققنس ہے۔ جبلِ ہند میں پایا جاتا ہے وہ سیٹی بجاتا ہے۔ تو اس کی مادہ حاملہ ہوجاتی۔ ابلیس کی ایک ران میں مذکر ہونے کا اثر ہوتا ہے دوسری میں مادہ کا۔ جب دونوں رانوں کو رگڑتا ہے۔ تو اس کی ذریت پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے:۔ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ لَهٗ فِيْ فَخِذِهِ الْيُمْنٰى ذَكَرًا وَفِيْ فَخِذِهِ الْيُسْرٰى فَرْجًا۔ فَهُوَ يَنْكِحُ هٰذِهٖ بِهٰذَا فَيَخْرُجُ كُلَّ يَوْمٍ عَشْرُ بَيْضَاتٍ يَخْرُجُ مِنْ كُلِّ بَيْضَةٍ سَبْعُوْنَ شَيْطَانًا وَشَيْطَانَةً (الخ) :۔ مینڈک کی پیدائش مختلف طریق سے ہے۔ برساتی مینڈک خشک سالی میں مر کر مٹی بن جاتا ہے۔ پھر بارش ہوتی ہے۔ تو وہی مٹی چھوٹے مچھلی نما کیڑے بن جاتے ہیں جو بعد میں مینڈک کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اسی طرح بچھو کی پیدائش بھی چند مختلف طریقوں سے ہوتی ہے:۔ ۱ زمین کے گندھکی مادے سے بچھو پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے کلر والی زمین میں بچھو زیادہ ہوتے ہیں۔ بعض اطباء کا قول ہے کہ زرد رنگ کی گائے کا گوبر اور اسی کے دودھ کا دہی ہم وزن ملاکر اچھی طرح کسی بنجر اور کلر والی زمین میں گڑھا کھود کر اس میں دہی گوبر ڈال کر اینٹ یا پتھر سے اچھی طرح بند کردو۔ کہ اندر ہوا نہ جائے تو چالیس دن بعد وہ سب گوبر بچھو بنے ہوں گے غرضیکہ خلقِ خلق میں بے شمار قدرتیں اور قوانینِ خداوندی ہیں۔ عقلِ عقلاً حیران سرگرداں ہے۔ یہ تو وہ مخلوق ہے جو عام قانون فطرت کے خلاف پیدا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ مخلوق جو اس فطرتی قانونِ مشہورہ یعنی جماع اور وطی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس میں بھی یکسانیت نہیں۔ بلکہ بے حد امتیازات ہیں۔ چنانچہ انسانی جماع و صحبت اور دیگر حیوانات گائے بکری وغیرہ کے جماع میں کئی طرح فرق ہیں۔ مندرجہ بالا دلائل سے بخوبی واضح ہوگیا کہ پیدائش

مخلوق یا ولادتِ اولاد کا سبب صرف مجامعت و قربت ہی نہیں جیساکہ سائل کو غلط فہمی ہوئی بلکہ بے شمار مختلف طریقے ہیں۔ اب انسانی حیوانی مجامعت کی تفریق سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کی صحبت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان سارے جسم سے صحبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زانی کو سارے جسم پر حد لگتی ہے۔ اور جانور صرف آلۂ تناسل سے ۔ ۲۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جانور کا نطفہ صرف مادہ منویہ ہی کے ذریعے رحم میں پہنچتا ہے۔ مگر انسان کا نطفہ زوج و زوجہ کے ہر عضو سے دخول کرتا ہے صرف مادہ منویہ ہی سے نہیں ۔ ۳۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ جانور کی مجامعت سے صرف انتقالِ جسم ہوتا ہے۔ مگر انسانی صحبت سے مختلف اشیاء۔ (۱) مادہ منویہ سے جسم اور اعضاء۔ (۲) ہم شکلی چہرے اور ہاتھ پیر کی۔ (۳) نفسِ ناطقہ (۴) عقل (۵) فہم (۶) ادراک (۷) حسن (۸) نفسِ امارہ (۹) نفسِ مطمئنہ۔ اور یہ سب چیزیں مختلف اعضاء سے ہوتی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ اصطلاحی نطفے سے ہوتیں تو لازم تھا۔ کہ ہر جانور کو یہ چیزیں حاصل ہوتیں۔ حالانکہ کسی جانور کو ان کا حصول محال بالذات اسی لیئے خالقِ عالم نے انسان کے تمام اعضاء میں قوتِ شہوت ودیعت کی ہے۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ ان کے صرف عضو مخصوصہ میں شہوت ہے یہی وجہ ہے کہ انسانوں پر غسل واجب حیوانوں پر نہیں۔ اگر کسی حلال جانور کو وطی کے فوراً بعد ظاہر گندگی اتار کر پانی میں ڈال دو تو پانی نہ مستعمل ہوگا نہ ناپاک۔ چنانچہ شرح کاشانی صفحہ نمبر ۲۷ پر ہے:- ولهذا تَعُمُّ الشَّهْوَةُ أَجْزَاءَ كُلِّهَا وَلِذَالِكَ أُمِرَ بِالاغْتِسَالِ مِنْهُ۔ فَعَمَّتِ الطَّهَارَةُ كَمَا عَمَّ الفَنَاءُ فِيهَا عِنْدَ حُصُولِ الشَّهْوَةِ - لِأَنَّ الْمَادَّةَ الَّتِي تَنْفَصِلُ مِنْهُ أَصْلُ حَيَاتِهِ (ترجمہ) اور اسی لیئے عام ہوتی ہے شہوت تمام انسانی اعضاء میں کہ وہ تمام اعضاء سے صحبت کرتا ہے۔ اس لیئے انسان پر غسل واجب ہے۔ پس جس طرح مرد کا دخول عام ہے طہارت بھی عام ہوئی۔ اس لیئے کہ وہ مختلف مادے جو مختلف طریقوں سے مرد سے جدا ہو کر رحمِ زوجہ میں پہنچے ولد کی اصل حیات ہے۔ گویا کہ جانور کی صحبت ظاہراً اور حقیقتاً ایک طرز پر ہے کہ دخولِ عضوِ تناسل۔ مگر انسان کی مختلف طریقے سے کہ ظاہراً دخولِ عضو مخصوصہ مگر باطناً یا حقیقتاً ہر عضو بدیں وجہ اجنبی عورت و مرد پر پردہ فرض ہے۔ کہ نہ مرد عورت کے ہاتھ پیر چہرے کو دیکھے نہ عورت اجنبی اور غیر محرم مرد کے چہرے وغیرہ کو۔ اگرچہ ہر دو میں سے ایک نابینا ہو۔ جیساکہ ایک مرتبہ آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو عبداللہ ابن مکتوم نابینا صحابی رضی اللہ عنہ سے پردے کا حکم دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ عورت، مرد کو کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ ان کی شرم گاہ ڈھکنی فرض ہے۔ مگر جانور کی شرمگاہ یا جسم نہیں ڈھکا جاتا۔ کہ انسان کے سب جسم میں شہوت ہے۔ اور جانور کے شرم گاہ میں بھی شہوت نہیں۔

اس لیے انسان ہر دن ہر وقت مجامعت کر سکتا ہے۔ مگر جانور مخصوص دنوں اور وقتوں میں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جانور شہوت رانی کے لیے شرم گاہ کی طرف جاتا ہے۔ مگر مرد بوس و کنار۔ یہاں تک کہ ہاتھ اور سینے کے لمس سے بعض کمزوروں کو انزال تک ہو جاتا ہے۔ اس لیے امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اور حنفی فقہاء بھی اپنے پر غیر مطمئن مرد کو حکم دیتے ہیں کہ روزے یا احرام کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ نہ لے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ کہ آنکھ زنا کرتی ہے۔ ہاتھ پیر وغیرہ زنا کرتے ہیں۔ یعنی حکمی اور حقیقی طور پر نہ کہ ظاہری اور ظاہری زنا پر حد ہے نہ کہ باطنی پر۔ اتنے اختلافات اور فرق معلوم ہو جانے کے بعد اب جاننا چاہیئے کہ جانور یا انسان جب کسی مونث سے صحبت و مجامعت کرتا ہے۔ تو بذریعہ آلہ تناسل صرف مادہ منویہ منتقل ہوتا ہے۔ اور ہر حیوان کے اس مادے میں چار اشیاء ہوتی ہیں۔ آگ، ہوا، مٹی، پانی، انہی کو عناصر اربعہ کہتے ہیں۔ تمام مخلوقات علت انتفاعی کے لحاظ سے دو قسم کی ہے۔ ایک نفع لینے والی اور ایک نفع دینے والی، نفع دینے والی اور اور فائدہ مند مخلوق تو انہی عناصر اربعہ سے مکمل ہو جاتی ہے۔ اسے مزید کسی خلقت کی ضرورت نہیں لیکن فائدے لینے والی مخلوق جو کائنات میں صرف انسان ہی ہیں۔ اُن کی تکمیلِ خلقت کے لیئے عناصر اربعہ کے علاوہ اور بہت چیزیں درکار ہیں۔ اور چونکہ وہ اشیاء صرف آلۂ مخصوصہ سے منتقل نہ ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا صناعِ کائنات جَلّ مجدہٗ نے تمام اعضائے انسانیہ میں وہ قوت ودیعت و منتقل کرنے کی طاقت رکھ دی۔ اسی لیئے کوئی جانور ہاتھ پیروں کے اعتبار سے اپنے ماں باپ کے ہم شکل نہیں ہوتا بخلاف انسان کے کہ وہ ظاہر باطن میں اپنے ماں باپ دادا دادی نانا نانی کے ہم شکل ہوتا ہے۔ نسلی ظریف (مراثی) یا نسلی گرتیے کا بیٹا ظریف اور گویا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیئے شریعتِ اسلامیہ نے ازدواجی تعلقات میں کفو اور خاندان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ کفو برادری کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ انسانی بولی کے علاوہ خوش گلوئی اور مذاقیہ ہونا عناصر اربعہ سے متعلق نہیں۔ نہ یہ مادہ منویہ سے پیدا ہوئیں۔ بلکہ یہ خصوصیات اور ذریعہ سے رحمِ مادر میں آئیں۔ اسی طرح عقل فہم ادراک، شیطانیت، رحمانیت، علم، شعور رحیمی کریمی جیسی تمام صفات باپ ہی کی طرف سے اولاد کو میسر ہوئیں، مگر مادۂ منویہ سے نہیں۔ بلکہ ہاتھ پیر کان ناک سینہ چہرہ سر دماغ نے بھی بیوی کی انہی اعضاء سے مجامعتِ باطنی کی تھی۔ اس تمام گفتگو سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ پیدائشِ خلق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ نسلِ انسانی چونکہ اشرف المخلوقات و موجودات سے فائدہ لینے والی تھی۔ اس لیئے اس کو باپ کی پشت سے عناصر اربعہ کے علاوہ بوقتِ جماع اور بھی ایسی نعمتیں ملیں۔ کہ جن کے ذریعے یہ دیگر اشیاء کو استعمال کر سکے۔ ہاتھ، پیر اور اعضاء

کو اگر چہ بطور آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ فقط آلہ ہے۔ اسی طرح مدارس اور کتب علوم فقط آلہ ہیں۔ اصل علم تو پشت والد سے تخم مادر میں منتقل ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح طبیعت اور مشابہت بھی۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ۲۲ میں ہے:۔ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اَلْحَسَنُ اَشْبَہُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مَا بَیْنَ الصَّدْرِ وَالرَّاْسِ۔ وَالْحُسَیْنُ اَشْبَہُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مَا کَانَ اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ ط:۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت حضرت حسن و حسین میں موجود تھی۔ کیونکہ آپ نانا ہیں۔ یہ مشابہت بذریعہ والدہ ملی۔ اور یہ مشابہت اسی لیے ہے کہ ہر عضو سے انتقال انسانی ہوتا ہے۔ چنانچہ خاوند بیوی کی آنکھوں کے ذریعے ہم شکلی منتقل ہوتی ہے۔ اگر خاوند بوقت صحبت بچشم خود بیوی کی طرف متوجہ ہو۔ تو اولاد بیوی یا بیوی کے والدین سے مشابہ ہوگی۔ اگر بیوی اپنے خاوند کو دیکھتی ہو تو اولاد خاوند کے مشابہ ہوگی۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ششم صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے:۔ وَالصُّوَرُ الَّتِیْ تَشْہَدُ الْاُمُّ وَتَخَیَّلُہَا حَالَ الْمُوَاقَعَۃِ لَہَا تَاْثِیْرٌ عَظِیْمٌ فِیْ صُوَرِ الْوَلَدِ (ترجمہ) ماں بوقتِ جماع جس کی شکل دیکھتی ہوگی۔ اور جس کے خیال میں گم ہوگی اس کی ہم شکلی کا اثر ولد پر پڑے گا۔ ہر انسانی صحبت کے وقت آلہ تناسل سے تو عناصر اربعہ مخصوصہ باپ سے ماں کی طرف منتقل ہوئے۔ لیکن بوسے اور پیار سے نطق انسانی منتقل ہوا یہی وجہ ہے کہ بجز انسان کوئی بھی نفس ناطقہ سے یعنی عقل و شعور و ادراک سے مزین نہ ہوا۔ نہ جن و ملک نہ جانور۔ چنانچہ کتاب تالیقات علی فصوص الحکم جلد دوم صفحہ نمبر ۳۲۸ پر ہے:۔ وَلٰکِنَّ الرُّوْحَ الْاِلٰہِیَّ لَہٗ مَظْہَرٌ اٰخَرُ فِی الْاِنْسَانِ۔ وَہُوَ النُّطْقُ۔ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ لَیْسَ کَائِنًا حَیًّا حَسَّاسًا فَحَسْبُ بَلْ ہُوَ کَائِنٌ نَاطِقٌ اَیْضًا ط:۔ یعنی روحِ الٰہی کا مظہر انسان ہے اور وہ روحِ الٰہی نطق ہے اس لیے کہ انسان کے لیے اس روح کے بغیر فقط حی اور حساس ہونا کافی نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ ناطق بھی ہو۔ بوقت صحبت ہاتھ کے مس سے قوتِ لامسہ اور شباہتِ ید کا انتقال ظاہر ہوتا ہے۔ پسلیوں کے جڑنے سے روح انسانی کا دخول ہوتا ہے۔ جو پہلے قلبِ مادر میں ٹھہری رہتی ہے۔ رانوں کے ملاپ سے نفسِ امارہ منتقل ہوتا ہے۔ کہ یہی شیطان کا مقام ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجامعت کے لیے کپڑے اتارنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ اور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ۔ پڑھے تاکہ شیطان اور شیطانی اثرات دور ہو جائیں۔ آنکھوں کے تعلق سے شرم و حیا اور ہم شکلی منتقل ہوتی ہے۔ آنکھیں بھی روح قیامی کے دخول و خروج کا راستہ ہیں۔ سینے کے مس سے کیفیاتِ قلبیہ کا انتقال ہے۔ اسی سے شباہت صدری کا بھی حصول ہے۔ پیشانی کے قرب اور ملاپ سے نفسِ مطمئنہ ضمیر انسانی کا دخول ہے۔ کہ یہ بھی

نور معرفت کا مقام اول ہے۔ غرض کہ سارا خاوند ساری بیوی سے دخول کرتا ہے جیسے کہ آئینے کے سامنے مرد شبیہی طور پر آئینے میں داخل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَلْاِنْسَانُ مِرْاٰۃُ الْاِنْسَانِ انسان انسان کا آئینہ ہے۔ فصوص الحکم میں ہے:۔ کَذٰلِکَ الْاِنْسَانُ ھُوَ الْمُجَلّٰی الَّذِیْ یُبْصِرُ الْحَقَّ بِہٖ نَفْسَہٗ اِذْ ھُوَ مِرْاٰتُہٗ پھر جس طرح اس رب کریم خلاقِ اعظم سبحانہٗ نے جانوروں میں اتنے تخلیقی اختلافات کے باوجود سراسر اس کی کروڑ ہا حکمتوں پر مبنی ہیں۔ جن تک عقل تو درکنار شعورِ انسانی تک کو پہنچ نہیں۔ مزید خلقتِ انسانی میں فرق فرمائے۔ پھر انسانوں میں کافر مومن، ولی صحابی اور نبی میں بہت عظیم فرق کیئے گئے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔ شعر

کارِ پاکاں راقیاس از خود مگیر .... گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر

آں خورد گردد پلیدی زوجدا ..... ایں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

تو بھلا اس رب العزت نے اپنے حبیب سرورِ انبیاء کرام آقائے دو عالم۔ عرش و فرش کے عطائی مالک جنت و دوزخ کے مختار کی خلقت مبارکہ میں کیا کچھ امتیازات نہ کئے ہوں گے۔ جب انسان کی ادنیٰ اشرفیت کی وجہ سے تمام مخلوق نسلِ انسانی کو پیدائشی طور پر ایک علیحدہ مقام سے نوازا۔ تو کس طرح ہو سکتا تھا۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خلقت وولادت اور انتقالات عام انسانوں کی طرح ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ بقول حضرتِ حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:۔ شعر

خُلِقْتَ مُبَرَّءً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ ‌ ‌ کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ

ترجمہ:۔ اے پیارے نبی آپ تمام مخلوق سے مختلف ہو کر ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے۔ گویا کہ آپ سے پوچھ پوچھ کر آپ کو بنایا گیا:: عام انسان مومن جب صحبت کرتا ہے تو پیشانی کے لمس سے نفسِ مطمئنہ منتقل ہوتا ہے۔ لیکن والدینِ انبیاءِ کرام کی پیشانی سے بوقتِ مقاربت مبارکہ نفسِ الٰہی یا روحِ الٰہی کا انتقال ہوتا ہے۔ اگر وہ باپ کے واسطے سے ہو تو نفس الٰہی اور اگر حضرت جبرائیل کے واسطے سے ہو۔ تو روح الٰہی اور اگر بلا واسطہ خود رب کریم کی طرف سے وارد ہو تو عین نور۔ اسی لیئے حضرت آدم صفی اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ ہوئے۔ یہ دو واسطے نشانِ قدرت ہیں۔ مگر پہلی صورت قانونِ قدرت ہے اسی کو نور اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ باپ کی پیشانی سے والدہ کی پیشانی میں دخول کرتا ہے۔ بجز انبیاء کے کسی کو نہیں ملتا۔ اسی لیئے انبیاء نور ہیں۔ اور والدینِ انبیاء مومن ہیں۔ نہ انبیاء غیر نور ہو سکتے ہیں۔ نہ انکے والدین غیر مومن۔ تعلیقات علی فصوص الحکم جلد دوم صفحہ نمبر ۳۲۵ پر ہے:۔ وَلٰکِنَّ النَّفْسَ الْاِلٰھِیَّ وَالرُّوْحَ الْاِلٰھِیَّ نُوْرَانِیَّۃٌ (ترجمہ) لیکن نفس الٰہی اور روح الٰہی ہر دو نوری ہیں۔ یہ انبیاء

کی روحوں کی شان ہے۔ دیگر انسانوں، حیوانوں کی ارواح نار ہیں۔ کتنا عظیم فرق ہے۔ چنانچہ حاشیہ قاشانی صفحہ نمبر ۲۷۱ پر ہے:۔ فَظَهَرَ اَنَّ الرُّوْحَ يَتْبَعُ فِي الظُّهُوْرِ لِنَشْاَتِهٖ فَكَانَ فِي النَّشْاَةِ الطَّبِيْعَةِ نُوْرًا كَمَا فِي الْمَلَائِكَةِ وَنَارًا كَمَا فِي الْاِنْسَانِ ترجمہ پس ظاہر ہوا کہ روح ظہور میں خلقت کے تابع ہوتی ہے پس روح خلقتِ اولیٰ میں نور رہے۔ جیسے ملائکہ میں اور انسانوں میں نار ہے۔ روحِ اوّل جس کو منطق لوگ عقلِ اوّل کہتے ہیں نورِ محمدی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسی کا سب سے اونچا مقام ہے۔ یہی نور سب سے پہلے پیشانیٔ آدم میں خود باری تعالیٰ عز اسمہٗ نے اپنے دستِ قدرت سے رکھا۔ کہ ارشاد ہے:۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ط اسی کو ملائکہ سے سجدہ کرایا گیا۔ کہ ارشاد ہوا:۔ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ط جھکتے ہوئے گرجاؤ۔ اس کو سجدہ کرتے ہوئے۔ یہی نور منتقل ہوتا ہوا حضرت عبد اللہ کی پیشانی میں آیا۔ اور وہاں سے منتقل ہو کر پیشانیٔ آمنہ میں دخول کیا رضی اللہ تعالیٰ عنہما چنانچہ ارشاد ربانی ہے:۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ بخلاف دیگر انسانوں کے کہ ان کی ارواح آگ کی ہیں۔ چنانچہ شرح قاشانی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۱ پر ہے:۔ فَكَانَ رُوْحُ الْاِنْسَانِ نَارًا لِاَجَلِ نَشْاَتِهٖ اَيِ الرُّوْحُ الْحَيْوَانِيُّ الَّذِيْ بِهٖ حَيَاةُ الْبَدَنِ ط (ترجمہ) پس روحِ انسانی جس سے اس کے بدن کی بقاء اور حیات ہے وہ ناری ہے خلاصۂ کلام کا یہ ہے کہ روح چار قسم کی ہے۔ (۱) نفسِ الٰہی (۲) روحِ الٰہی ملکیہ (۳) روحِ ناری۔ جس کو روحِ قائم بھی کہتے ہیں۔ جسمِ پاکِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ چاروں روحیں عطا ہوئیں۔ بعض انبیاء کو صرف نفسِ الٰہی اور روحِ قائمہ اور بعض کو روحِ الٰہی اور قائمہ۔ دیگر انسانوں کو روحِ ملکی اور قائمہ۔ جانوروں کو فقط روحِ قائمہ عطا ہوئی۔ حرامی ولد الزنا کو بھی فقط روحِ قائمہ ملتی ہے روحِ ملکی سے حرامی اولاد کو نہیں نوازا جاتا۔ نہ وہ مشاہدۂ تجلیات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے حرامی شخص متقی اور ولی نہیں بن سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ وَاَعْظَمُ الْوُصْلَةِ اَلنِّكَاحُ اَيِ الْجِمَاعُ الْحَلَالُ وَهُوَ بِالنِّكَاحِ اَوِ الْمِلْكِ اِذْ بِدُوْنِهِمَا لَا رُوْحَ لَهٗ فَلَا يُشَاهِدُ الْحَقَّ اَبَدًا لِذٰلِكَ حَرَمَ الزِّنَا فِيْ جَمِيْعِ الْاَدْيَانِ ط۔ (قاشانی) ترجمہ سب سے بڑا وصل نکاح یعنی حلال صحبت سے ہوتا ہے۔ اور حلال صحبت لونڈی یا بیوی سے ہوتی ہے۔ اس کے بغیر روحِ ملکی حاصل نہیں ہوتی۔ پس وہ شخص تجلیاتِ حق کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اس لئے ہر دین میں زنا حرام ہے۔ خیال رہے کہ روحِ قائمہ سے اجسامِ کثیفہ یعنی مخلوق کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور روحِ ملکی سے مشاہدۂ تجلیاتِ ربانی ہوتا ہے۔ جس سے ولایتِ کاملہ اور درجۂ ملائکہ حاصل ہوتا ہے اور روحِ الٰہی سے اسرارِ قدرت کا نظارہ ابدی حاصل ہوتا ہے۔ جو انبیاء کا خاصّہ ہے۔ اور نفسِ الٰہی سے ذاتِ خالق کا دیدار ہوتا ہے۔ جو صرف

محمد مصطفیٰ کا خاصہ ہے۔ یہ روح نور اول سے تعبیر ہے یہی پیشانیٔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منتقل ہو کر بطن آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں جلوہ گر ہوا۔ تمام ارواح چہرے کے راستے دخول بطن کرتی ہیں۔ مگر نفس الٰہی ماتھے سے اور روح الٰہی اگر باپ کے واسطے سے ہو تو ماتھے سے۔ اگر بلا واسطہ ہو تو گریبان کی حبل ورید کے ذریعے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ ہی روح دستِ قدرت سے بسبب جبرائیل عطا ہوئی اسی لیے آپ کا لقب روح اللہ ہوا۔ اور آپ سے خدائی کاموں کا ظہور ہوا۔ خود فرماتے ہیں کہ اِنِّیٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ ط (ترجمہ) میں تمہارے سامنے پرندے کی مثل پیدا کروں گا۔ یہ روحِ الٰہی ہے۔ مگر نفسِ الٰہی کا نام روحِ محمدی ہے یہ ایک بے مثل ذات کی بے مثل مخلوق ہے۔ یہ سب سے اول عینِ ذاتِ باری سے اور تمام مخلوق عین اس سے چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دوم صفحہ نمبر ۱۷۲ پر ایک روایت منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی ارشاد فرماتے: کہ اَنَا مِنَ اللّٰہِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ مِنِّیْ ط۔ میں اللہ سے ہوں اور تمام مخلوق مجھ سے ہے۔ اسی روحِ محمدی سے عرش بنا۔ چنانچہ علامہ قاشانی نے اپنی شرح کے صفحہ نمبر ۲۷۵ پر فرمایا: فَاِنَّ الْعَرْشَ مَخْلُوْقٌ مِّنَ الْعَقْلِ الْاَوَّلِ الَّذِیْ ھُوَ رُوْحُہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ ط (ترجمہ)۔ کیونکہ عرش مخلوق ہے۔ اسی عقل اول سے جو روح محمدی ہے صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ عَلَی النَّبِیِّ ثابت ہوا کہ نورِ محمدی پیشانی کے ذریعہ دخول ہوا چنانچہ تفسیر روح البیان دوم نے صفحہ نمبر ۲۷۳ پر اس کی مختصر تفصیل بیان کی ہے۔ بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت عیسیٰ کو روح الٰہی عطا ہوئی۔ (ابن مریم علیہ السلام) اسی طرح غوث پاک عبد القادر جیلانی کو روح محمدی عطا ہوئی۔ وہ بھی بلا واسطہ یہ بھی بلا واسطہ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا لقب روح اللہ ہوا۔ آپ کا لقب روح محمدی۔ جب حضرت مسیح پر روح الٰہی کا غلبہ ہوتا تو آپ کے دہن پاک سے اِنِّیٓ اَخْلُقُ لَکُمْ کا نعرہ نکلتا۔ اور اس کا ظہور بھی ہوتا۔ اسی طرح عبد القادر جیلانی پر روحِ محمدی کا غلبہ ہوتا۔ تو زبانِ مبارک سے ایسے کلمات نکلتے۔ کہ میں نے حضرت نوح کی مدد کی۔ اور میں نے حضرت ابراہیم کو آگ سے بچایا۔ جس کو کسی نے قصیدہ روحی کے اشعار میں جمع کیا۔ اور ایسے قصیدے کا لکھنا چھاپنا پڑھنا گناہ ہے کیونکہ اسرار الٰہیہ ہیں۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ کی اپنی آواز تھی اور نہ یہ عبد القادر جیلانی کی۔ بلکہ وہ روح الٰہی کی آواز تھی۔ اور یہ روحِ محمدی کی۔ اور جس طرح اِنِّیٓ اَخْلُقُ لَکُمْ کہنے کے باوجود نہ حضرت عیسیٰ کو خالق کہہ سکتے ہیں۔ نہ سب انبیاء سے افضل۔ اسی طرح نہ غوث اعظم کو نبی کہہ سکتے ہیں۔ نہ صحابہ تابعین سے آپ کا مقام و درجہ زیادہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ روح اللہ ایک مقام نبی اللہ۔ اسی طرح حضرت غوث پاک کے بھی دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ قطبیت جو ازل میں رسول اللہ کی معرفت آپ کو حاصل ہوا۔ اور جو درس گاہِ محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

سے بعد حصولِ علومِ لدنیہ عطا ہوا۔ جس کی طرف خود قصیدہ غوثیہ میں اشارہ ہے۔ کہ دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا میں نے اتنا علم پڑھا کہ میں قطب ہو گیا۔ دوسرا مقام، مقامِ غوثیت۔ مقامِ قطبیت کی وہ آواز تھی۔ جو قصیدہ روحی میں تھی۔ جس لحاظ سے آپ اوّلین و آخرین اولیا کے سردار ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر اسی مقامِ قطبیت کو ظاہر کر رہا ہے۔ ؎ غوث اعظم درمیانِ اولیاء چوں جنابِ مصطفٰے درانبیاء

اعلیٰ حضرت مجدد ملت مائتہ حاضرہ کا شعر مذکورۃ الذیل بھی اسی طرف مشیر ہے۔ جو ولی قبل تھے یا بعد ہوئے یا ہوں گے۔ سب ادب رکھتے ہیں دل میں میرے آقا تیرا۔ یہاں اولیاء قبل سے مراد صحابہ وغیرہ نہیں بلکہ اولیاء بنی اسرائیل مراد ہیں۔ اور ادب سے مراد شفقت و پیار بھی ہوتا ہے (دیکھو مرقات شرح مشکوٰۃ کتاب الادب) دوسرا مقام غوثیت۔ جس کے لحاظ سے آپ کا درجہ اپنے مشائخ اور اساتذہ علوم ظاہرہ اور داتا گنج بخش وغیرہ اکابرین کے بعد ہے۔ اسی طرف حضرت مجدد الف ثانی کا یہ قول اشارہ کرتا ہے کہ حضرت عبدالقادر جیلانی کا مرتبہ فقط بعد والے اولیاء اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ ہے آپ کا مقامِ غوثیت مجدد صاحب کو سرکار بغداد کے مقام اعلےٰ تک پہچان نہیں ہوئی۔ — — — —

حضور غوث پاک کا مقامِ قطبیت ہی روح محمدی ہے۔ کیونکہ محمدی قطبیت اول ہے چنانچہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتوحات مکیہ باب نمبر ۲۰ صفحہ نمبر ۶۶ پر فرماتے ہیں۔ کہ عالم کا قطب اول مخلوقات سے چار کروڑ سال پہلے پیدا ہوا۔ اور یہی قطب تمام انبیاء کی امداد فرماتا رہا ہے۔ اسی قطب اوّل سے تمام مخلوق پیدا ہوئی۔ اسی قطب اول کا نام روح محمدی ہے۔ ابن عربی کے کلام اور ان روایات مبارکہ کا موازنہ کرو۔ جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خلقت سے متعلق صحابہ کرام کے سامنے مختلف الفاظ میں بیان فرمائیں۔ تو ایک ہی مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہی روح محمدی حضور غوث پاک میں بلا واسطہ ودیعت ہوئی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ میں روح اللہ۔ خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ روح اور نور نطفہ مخصوصہ کے ذریعے منتقل نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی بالواسطہ والد کی پیشانی سے منتقل ہوتا ہے۔ جیسے تمام انبیاء اور خصوصاً حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نور حضرت عبداللہ کی پیشانی سے منتقل ہوا۔ چنانچہ علامہ نبہانی فرماتے ہیں۔ یَنْتَقِلُ نُوْرُ النَّبِیِّ مِنَ الْجَبِیْنَۃِ اِلَی الْجَبِیْنَۃِ سب سے پہلے یہ نور پاک پیشانی حضرت آدم میں منتقل ہوا۔ اور کبھی یہ نور بلا واسطہ منتقل ہوتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ میں روح اللہ اور غوث پاک میں روح محمدی کا انتقال اسی روح محمدی کی طرف قصیدہ غوثیہ کا یہ شعر اشارہ کرتا ہے:۔ ؎ دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰی صِرْتُ قُطْبًا!

یہاں قطب سے مراد یہی روحِ محمدی ہے۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

کافر کی قسمیں اور مرزائیوں کو کیوں اقلیت قرار دیا گیا

سوال نمبر ۱۸ :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں۔ کہ آج احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے کل شیعوں کو کافر قرار دینے۔ اور پرسوں وہابیوں کو مرتد قرار دینے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، مسلمانوں کے تمام فرقے اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، اہلِ سنت، دیوبندی، اہلِ سنت والجماعت بریلوی، شیعہ و شیعہ اسماعیلی، پرویزی، مودودی وغیرہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور ہر ایک دوسرے کو بدعتی، مشرک، منافق، کافر، مرتد، قابل گردن زدنی وغیرہ سمجھتے ہیں۔ تو پھر قادیانی فرقہ کے جرم کی نوعیت کیا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی نے کئی جگہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی ہے مثلاً ؎

وہ پیشوا ہمارا جس کا ہے نور سہارا
نام اس کا ہے محمد دلبر میرا وہی ہے

بعد از خدا بعشقِ محمد مخمرم
گر کفر است ایں بخدا سخت کافرم

ما مسلمانیم با فضلِ خدا
مصطفےٰ مارا امام و پیشوا

ہمت او خیر الرسل خیر الانام
بر نبوت را بر و شد اختتام

ہم تو رکھتے ہیں مسلمانوں کا دین
دل سے ہیں خدامِ ختم المرسلین

تم ہمیں دیتے ہو کافر کا خطاب!
کیوں نہیں آتا تمہیں خوفِ عذاب

اس لیے لاہوری مرزائی مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ بلکہ سنیوں کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں لہٰذا فرمایا جائے۔ کہ کیا وجہ ہے مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی اور اگر باری باری وہابی شیعہ کو اقلیت قرار دیا گیا۔ تو کون مسلمان رہے گا۔

السائل: محمد انور آفیسر مسلم کمرشل بینک منگلا کالونی براستہ دینہ ضلع جہلم

الجواب بعون العلام الوھاب

قانون شریعت کے مطابق کافر دو قسم کے ہیں۔ (۱) کافر عند اللہ (۲) کافر عند الشریعت۔ وہ لوگ جو عند الشریعت کافر نہیں مگر عند اللہ کافر ہیں۔ جیسے بعض دیوبندی اور بعض شیعہ، چکڑالوی اور اہلِ قرآن وغیرہ اُن کے متعلق شریعت کا حکم اور قانون دوسرے کفار کے قوانین اور احکام سے مختلف ہیں۔ اور مندرجہ ذیل چند قوانین کی بنا پر ان پر شرعی فتوے کی نوعیت کچھ اس طرح ہوگی (۱) شرعاً ان کو اجتماعی طور پر کافر نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ ہر شخص کی علیحدہ علیحدہ کفرِ لزومی کی تحقیق ہوگی (۲) شرعی طور ان کو قومی کافر نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ بعد تحقیق اگر کسی بات سے کفر ثابت ہو۔ تو اُن کو انفرادی طور پر کافر کہا جائے گا۔ نہ کہ اجتماعی۔ (۳) یہی وجہ ہے کہ اُن کو کسی بھی دارالاسلام میں اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ اقلیت صرف اجتماعی اور قومی کافروں کے لیے ہوتی ہے۔ (۴) اس قسم کے کافر کے ہر لفظ پر شرعی طور پر مفتیٔ اسلام خوب غور و فکر اور علمی تحقیق کرے گا۔ اگر ایسے شخص کے بولے ہوئے لفظ پر کوئی پہلو اسلام کا نہیں نکلتا۔ ہر طرف سے کفر ہی ثابت ہوتا ہے۔ تب اس کے لیے انفرادی طور پر فتوای کفر جاری کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص اپنے آپ کو دیوبندی یا شیعہ یا وہابی یا چکڑالوی یا پرویزی کہتا ہے۔ تو اس وقت یہ لفظ کہنے سے ہی اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اس کے عقائد اُس کے منہ سے سنے جائیں گے۔ اور پھر وہ عقائد اگر شرعی طور پر صرف کفر ہی ثابت ہو۔ تو اس کو شرعاً کافر کہہ دیا جائے گا۔ دینِ اسلام کے تمام فرقوں کا یہی حکم ہے۔ اس لیے ہر دیوبندی یا شیعہ یا دیگر فرقہائے باطلہ کو اجتماعی طور پر کافر نہیں کہا جاسکتا۔ بخلاف دیگر کفار کے کہ وہ لوگ شرعی کافر ہیں شرعی کافر اجتماعی اور قومی کافر ہوتا ہے۔ ایسے کافروں کے عقائد اور الفاظ کی تحقیق یا تفتیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ قومیت کے لحاظ سے کافر ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنے آپ کو ہندو، سکھ، عیسائی یا یہودی کہتا ہے۔ تو اس اقرار سے ہی اس پر کفر کا فتوای جاری کردیا جائے گا۔ وہاں لفظی چھان بین نہ ہوگی۔ چنانچہ فتاوٰی عالمگیری جلد دوم ص ۲۷۹ پر ہے :۔ مُسْلِمٌ قَالَ اَنَا مُلْحِدٌ يَكْفُرُ (ترجمہ) :۔ مسلمان نے کہا میں ملحد ہوں اتنا کہتے ہی کافر ہو جائے گا۔ ایسے کفار کو اقلیت قرار دیا جاتا ہے۔ ہر دو کفر میں مندرجہ ذیل تین بنیادی اصول ہیں

(۱) نبوت ⁂ (۲) کتاب ⁂ (۳) شریعت ⁂

موجودہ دور کے مرزائی لاہوری ہوں یا قادیانی، ان تین اصول کی بنا پر قومی اور اجتماعی کافر ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ اسلامی فرقوں میں شامل نہیں ہوسکتے۔ اسی وجہ سے حق مسئلہ یہ ہے کہ ان کو مرتد قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ان کا کلمہ پڑھنا بھی شرعی طور پر منافقت ہے۔ نہ کہ اسلام اور منافق کافر مطلق ہوتا ہے۔ نہ کہ مرتد بے دین

بدیں وجہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جانا شرعی حکم ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق کہ جس کی بنا پر یہ اسلامی فرقوں سے ممتاز ہیں۔ قادیانی فرقہ مرزے کو نبی اور اس کی تصنیفات کو اللہ کی وحی اسی کے اقوال بے ہودہ کو نئی شریعت مان کر کافر شرعی ہوئے۔ اور لاہوری فرقہ مرزا غلام احمد جیسے کافر کو جس کو شرعی مرتد کی حیثیت حاصل ہے؛ مسلمان کہہ کر کافر ہوئے۔ مرزا غلام احمد کا کفر اور سارتداد ان ہی تین مندرجہ بالا بنیادی اصول سے ہے۔ کہ اس نے پہلے اپنے آپ کو صحیح شرعی مسلمان بنا کر پھر اپنے لیے نبوت نئی کتاب اور نئی شریعت کا دعوے کیا۔ مرزا غلام احمد کا نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی کچھ نعتیں لکھنا۔ اس کے اسلام کی سند نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ ہمارے آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نعتیں تو ہندوؤں، سکھوں نے بھی لکھیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

*

کتاب الجنایات

مجرموں اور ان کی اسلامی سزاؤں کا بیان اور ناسخ منسوخ آیتوں کی فہرست

سوال ۱۹

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ آج سے چند دن پیشتر ہمارے پاس ایک رسالہ بنام بلاغ القرآن پہنچا جس کے چند صفحات پر شریعت کے ایک بہت عظیم قانون کے خلاف قلم اٹھایا گیا ہے۔ اور لکھا گیا ہے کہ زانی کو رجم کرنے کی سزا اسلام کے خلاف ہے۔ ایم آئی چوہدری ایڈووکیٹ لاہور نے گیارہ دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سنگسار کرنا شرعی حد نہیں ہے۔ اور اس تحریر کو فاضل وفاقی شرعی عدالت نے بارہ نومبر ۱۹۸۰ء کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۹۸۱ء کو ایم آئی چوہدری مذکور منکر احادیث پرویزی چکڑالوی کے حق میں رجم کے خلاف اپنا فیصلہ صادر فرما دیا ہے ایم آئی چوہدری کے گیارہ دلیل مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی دلیل:۔ پرویزی کہتا ہے۔ کہ زانی اور زانیہ خواہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ ان کی حد شرعی صرف سو کوڑے ہر قسم کے زانی کی مکمل حد ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے۔ الآیۃ۔ اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ

جلدۃ:- **دوسری دلیل:**- قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ اور ناسخ نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سزا یعنی سو کوڑے ہر قسم کے زانی کی مکمل حد ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے۔ سورۃ ۲۴ سُورَةٌ أَنزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ (الآیۃ) اس آیت کا ترجمہ اور مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو حد زنا کی بیان فرمادی وہی مکمل برحق ہے۔ جو زنا کی حد سنگساری کو بیان کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ **تیسری دلیل:**- چکڑالوی پرویزی کہتا ہے۔ کہ سنگساری سے موت واقع ہو جاتی ہے حالانکہ قرآن مجید نے زانی اور زانیہ کو زندہ رہنے اور نکاح کرنے کا حق دیا ہے۔ دلیل میں یہ آیت پیش کرتا ہے:- اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً:- زانی زانیہ سے ہی نکاح کرے یہاں بھی الزانی مطلقاً ہے۔ کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ اور نکاح کا بھی حکم دیا جا رہا ہے۔ اگر کسی زانی کی سزا رجم ہوتا۔ تو نکاح کا تذکرہ نہ ہوتا۔ **چوتھی دلیل:**- مخالف کہتا ہے۔ کہ قرآن مجید میں زنا کو فاحشہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:- لَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً (الآیۃ):- زانیہ کی سزا کے لیے قرآن کریم میں لفظِ عذاب آیا ہے لہٰذا لکھا ہے فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ سورۃ ۴ نسا آیت ۲۵ اور سورۂ نور میں بھی زنا کی سزا کے لیے عذاب کا لفظ ارشاد ہوا ہے۔ لکھا ہے۔ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ آیت ۲ پس ثابت ہوا کہ سزا کو عذاب کہا جاتا ہے۔ اور رجم کا نصف ہو سکتا نہیں لہٰذا کوڑوں کی سزا ہی مراد ہے اور زنا کی سزا صرف کوڑے ہی ہیں خواہ زانی زانیہ کنوارے ہوں یا شادی شدہ یا متوفٰی زوجہا۔ اور بیوہ۔ رنڈوا۔ **پانچویں دلیل:**- سارے قرآن مجید میں رجم کا کہیں ذکر نہیں۔ ہاں کوڑوں کا ذکر بالکل صاف صاف ہے۔ اور جس طرح سورۂ نساء میں آیت ۲۵ کے اندر سزاءِ زنا کا نصف ہو جانا مذکور ہے اسی طرح سورۂ ۳۳ احزاب آیت ۳۰ میں سزا کا دگنا ہونا مذکور ہے۔ لہٰذا لکھا ہے يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا۔ ترجمہ:- اے نبی کی بیویو۔ جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بدکاری کرے۔ تو اسے دگنا عذاب دیا جائے گا۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ اس آیت میں بھی زنا کے لیے فاحشہ اور سزا کے لیے عذاب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بیوی شادی شدہ ہی ہوتی ہے اور رجم کی سزا دگنی نہیں ہو سکتی کیونکہ رجم میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ زانیہ و زانی شادی شدہ بھی ہوں تب بھی ان کی سزا کوڑے ہی ہیں۔ کیونکہ کوڑوں کی سزا آدھی بھی ہو سکتی ہے۔ اور دگنی بھی۔ **چھٹی دلیل**- نبی کریم نے ساری زندگی کبھی رجم کی سزا نہ دی۔ کیونکہ نبی پاک قرآنِ پاک کے حکم پر عمل کرانے اور کرنیکے شرعی پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے۔ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (ترجمہ):- اے صاحبِ قرآن۔ لوگوں میں اس کتاب کے ساتھ فیصلے فرمائیے۔ اور یہ بات شک سے پاک ہے کہ نبی کریم پر صرف قرآن ہی نازل ہوا۔ ثابت ہوا کہ رجمِ زانی ہرگز سنتِ رسول نہیں بلکہ خلافِ قرآن۔ خلافِ اسلام اور خلافِ رسولِ مقبول ہے۔ اور بناوٹی حدیثوں کے ذریعے نبی کریم کی طرف غلط منسوب ہے:-

ساتویں دلیل:- رجم کی سزا بہت بعد کی ایجاد ہے۔ قرآن مجید میں بِسم اللہ سے لے کر وَالنَّاس کی

کی سبیں تک کہیں رجم کا ذکر تو درکنار اشارہ بھی نہیں۔ اگر زنا کی سزا کسی کے لیئے رجم ہوتی تو لکھنے میں وضاحتہً یا اشارۃً کس کی شرم تھی۔ اور کیوں نہ لکھی گئی۔ اور یہ کہنا کہ رجم کی آیت لفظاً تلاوتاً منسوخ ہے حکماً باقی ہے۔ یہ کذب ہے اور قرآن کریم کے خلاف کھلی سازش ہے۔ قرآن کریم کی سب آیات محکم ہیں کوئی منسوخ نہیں وہ آیت نَنْسَخْ والی جس سے مخالفِ قرآن لوگ منسوخ مانتے ہیں وہاں شیطانی آیت مراد ہیں مِنْ آیتِ میں تنوین عوض کی ہے اور مضاف الیہ شیطان ہے۔ اصل میں آیت اس طرح تھی مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیٰتِ الشَّیْطٰنِ (الخ) **آٹھویں دلیل:**۔ اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ سارے قرآن میں کہیں بھی رجم کا ذکر نہیں۔ نہ زانی کے لیئے نہ کسی اور مجرم کے لیے۔ پس ثابت ہوا کہ سنگساری کا تعلق قرآنی آیت سے کسی طرح نہیں۔ **نویں دلیل:**۔ سنگساری اور رجم کرنا۔ ظالمانہ بے رحمانہ۔ اور گمراہ قوموں اور شیطانی عمل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں رجم کا ذکر ہے تو وہ کافروں کا شیطانی کام بتایا گیا ہے۔ کہ کفار نے انبیاء کو رجم کرنے کی دھمکیاں دیں۔ دیکھو آزر کا قول حضرت ابراہیم کو ۱۹/۴۶ سورۂ یٰس میں چند رسولوں کو کفار کی دھمکی ۲۳/۱۸ ۔ اصحاب کہف کا اندیشہ ۱۸/۱۹-۲۰ اور ۱۱/۹۱ میں حضرت شعیب کو کفار کی یہی رجم سنگساری کی دھمکی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ جس کام کو قرآن مجید نے خالص کافروں کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ ہر دور میں شیطانی عمل ہو سکتا ہے۔ نبی تو درکنار عام مومن بھی ایسا ظالمانہ شیطانی عمل نہیں کر سکتا ہے۔ **دسویں دلیل:**۔ چونکہ سارے قرآن میں کہیں بھی زنا کی سزا قتل یا رجم کی موت نہیں لہٰذا رجم کی موت قتلِ ناحق ہے اور قتلِ ناحق بحکم قرآنی حرام ہے۔ لہٰذا پہلی آیت ع۲۲ سورۂ اسراء وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ اسی طرح آیت ع۱۵۱ سورہ انعام میں ہے۔ اللہ نے مومنوں کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ وہ شرک نہیں کرتے نہ کسی کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ نہ زنا کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان آیت ع۶۸ قتل صرف قتل کے بدلے ہوتا ہے۔ قرآنی فیصلہ ہے۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ (ترجمہ):۔ جان صرف جان کے بدلے ہے۔ چونکہ زانی نے کسی کو قتل نہیں کیا ہوتا اس لیئے یہ کہنا کہ رجم سنتِ رسولِ مقبول ہے سراسر بہتانِ عظیم ہے۔ **گیارھویں دلیل**۔ اللہ تعالیٰ زانیوں کو زندہ رہنے۔ توبہ کرنے۔ اور اصلاح کا حق عطا کرتا ہے۔ مگر رجم یہ سارے حقوق ختم کرتا ہے۔ سورۂ فرقان آیت ۲۵/۶۸ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا اور ۷۰ آیت ۶۹ میں:۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ۔ اور وہ لوگ زنا نہیں کرتے۔ اور جو زنا کرے وہ گناہ میں جا پڑا مگر جو توبہ کرے اور ایمان لایا اور نیک کام کیئے سو وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ ثابت ہوا کہ زنا کے بعد بھی زندہ رکھا جائے گا تاکہ وہ توبہ اور اچھے عمل سے اچھے بن کر زندہ رہیں۔ لیکن رجم میں یہ مہلت ان کو نہیں ملتی۔ یعنی سزاءِ زنا کے بعد بھی ان کو توبہ کی مہلت ملتی ہے۔ مگر وفاقی شرعی عدالت نے رجم کا آرڈیننس جاری کر کے قرآنی احکام اور منشاءِ خداوندی کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ تھے دلائل جو لاہور کے ایک منکرِ حدیث چکڑالوی پرویزی وکیل ایم آئی چوہدری نے وفاقی عدالت میں پیش کیئے اور شرعی لاہوری عدالت نے مکمل سماعت کے لیئے منظور کر کے

پانچ ججوں کے سپرد کیا۔ جنہوں نے ۸۱-۳-۲۱ کو تین ججوں کے اتفاق سے ایم آئی چوہدری کی بات مانتے ہوئے رجم اسلامی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن دو ججوں نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کو اس غلط فیصلے سے سخت اضطراب ہے للٰذا بحیثیتِ مفتی اسلام ہونے کے ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ ہم کو جلد از جلد شرعی قانون سے آگاہ فرمائیں۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا۔

سائل:۔ شہباز گل پاشا۔ سیٹی ڈاک خانہ گجرات و متعلم مدرسہ مسجد میاں جلال ۸۱-۸-۲

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ رَءُوْفٌ الرَّحِیْمْ اَمَّا بَعْدُ:۔ جاننا چاہیئے کہ تاریخ کے ورقوں سے یہ بات ثابت و ظاہر ہے کہ ہر دور میں دینِ اسلام کی سنگلاخ چٹانوں سے شر انگیز و خباثت کی طوفانی لہریں ٹکراتی ہی رہیں۔ باطل کی پھونکوں حق کی شمعوں کا مقابلہ نکرو نظر ہوتا ہی چلا آرہا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھا ہی جاتا رہا کہ سلاطینِ عالم اور حکام دنیا کی آغوشِ شفقت و حمایت ہمیشہ باطل نظریات کے لیئے کشادہ ہوتی ہی رہی۔ اور بڑی بڑی بادشاہتوں نے جہالت و بطالت کی پشت پناہی کی۔ اہل حق اور ان کی حقانیت سے ان مادہ پرست بڑوں نے ہمیشہ روگردانی کی۔ معتزلہ۔ خوارج و روافض کے ابتدائی دور اس پر شاہد ہیں یہی تاریخی نمونہ ہمارے پاکستان کے ابتدائی دنوں سے اب تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ حالانکہ یہ ملک بالکل ہی نظریاتی ملک ہے۔ اس کی تو جڑ اور بنیاد دین ہی۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ ہے۔ اس کا تو پہلا نعرہ ہی نظامِ قرآن و حدیث ہے۔ اس کے لیئے کسی باطل فرقے کی انگلیاں نہ کٹیں۔ ہاں اس عظیم الشان مقصد والی سلطنت پر باطل کی انگلیاں ضرور بھی اٹھتی رہی۔ مگر اس کی جڑوں کو حیاتِ جاودانی بخشنے کے لیئے اپنے اور اپنے پھول جیسے بچوں کے خون کے نذرانے صرف انہی نے پیش کیئے جو قرآن و حدیث دونوں کے باادب اور دونوں کو ایک عدلیہ میں رکھنے والے تھے۔ جن کا ایمان اسی حقیقت پر تھا کہ حدیث مطہرات کے بغیر قرآن مجید کا قانون نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ جو اگر قرآن پاک کو ایمان کا ایک بازو سمجھتے تھے تو حدیثِ پاک تو دوسرا بازو۔ اُن ہی لوگوں نے پاکستان کے بازو مضبوط کیے جو حدیث کو قرآن کی تفسیر اور فقہ کو حدیث کی شرح کہتے تھے۔ وہی مسلمان باہمت باوقار پاکستان کے معمار اول ہیں جو محدثین اسلام پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے محدثین اسلام جانفشانِ خادمین ایمان نے نہایت عرق ریزی اور پُرخلوص محنتوں سے احادیث میں چھان بین کر کے جو فیصلہ کر دیا وہ بالکل درست اور دائمی ہے۔ جو ان فیصلوں میں شک ڈالے اور اب بھی صحیح احادیث کو باطل خیالات کی وجہ سے نہ مانے وہ بے دین ہے۔ ہمارے سچے محسن قائداعظم محمد علی جناح اپنے عظیم ایمانی مقصد وجودِ پاکستان کے حدوث میں کامیاب نہ ہوتے اگر امام احمد رضا بریلوی کے پیروکار مسلمان اہلسنت علماء و مشائخ ان کا مضبوط ساتھ نہ دیتے۔ اس لیئے کہ

* فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں * موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔

اس تمام کشاکش اور جاں نثاریوں کے باوجود بدنصیبی نے پاکستانیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ قائدِ اعظم نے شاہینوں کا گھونسلا تو بنا دیا۔ مگر عمرِ فانی نے شاہین بنانے کا موقعہ نہ دیا۔ مسلم لیگ نے کلمۂ طیبہ اور نظامِ اسلامی کے پرکشش نعرے کی قوت و ہیبت سے۔ انگریزوں کو تو علاقہ سے نکال دیا لیکن انگریزوں کی غلامی اور انگریزی ظالمانہ نظام کو نہ نکال سکے۔ ہمارے مفکروں دانشوروں نے ملک کا نام تو پاکستان رکھ لیا۔ مگر آنے والے حاکموں کے ذہنوں کو انگریز غلامی کے تصور سے پاک نہ کرسکے۔ ایک نظریاتی ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہے کہ اس کے پینتیس[۳۵] سالہ دور میں۔ ایک رہنما حاکم اعلےٰ ملک کا سربراہ بھی ایسا نہ میسّر ہوا جو ملک کے نظریاتی مقاصد پورے کرتا۔ اوائل میں تو کسی نے توجہ ہی کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ مخالفاً معاندانہ روش اختیار کی۔ بعدہٗ اگر کسی سربراہ نے اس طرف ذرا سی کروٹ موڑی بھی تو اس نے اپنی مرضی کا اسلام اپنی خواہشات کو دینی قانون کا نام دینے کی کوشش کی۔ اس کی راہ ہموار کرنے کے لیئے گروہ باطلہ کو مشیرانِ خواص کی کرسیاں عنایت کی گئیں۔ اور قوتِ باطلہ کی ملک پاکستان میں اتنی حوصلہ افزائی کی گئی کہ اگر کسی سربراہ نے کچھ زیادہ ہی خلوص و سرگرمی سے نظامِ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم قانونِ قرآن و حدیث جاری کرنے کا باہمت ارادہ کیا تو منافقینِ قرآن و حدیث نے عدالتوں وزارتوں کو غلط راہ پر ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ سائل نے اپنے سوال میں جس فیصلے کا ذکر کیا وہ سب کچھ اسی کا شاخسانہ ہے۔ میں نے بحیثیتِ مفتیِٔ اسلام ہونے کے سائل کے سوال اور مخالف کے دلائل کو پوری ذمہ داری کے ساتھ بغور مطالعہ کیا ہے۔ ادارے کا مطبوعہ رسالہ بلاغ القرآن بھی سائل کی طرف سے وصول پاکر کئی بار بہت احتیاط سے پڑھا۔ اس تمام تفتیش و تحقیق کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دلائل نہایت کمزور۔ پرویزیوں کا نظریہ اور مذہب بالکل باطل اور وفاقی شرعی عدالت کے پانچ ججوں میں تین ججوں کا فیصلہ بہت جلد بازی پر مبنی ہے۔ اگر ہمارے فاضل جج صاحبان کو خود تدبرِ قرآنی اور تفکرِ ایقانی کی فرصت نہ تھی۔ تو پاکستان کے علماءِ کرام سے رابطہ قائم کرنا کیا دشوار تھا۔ فقہاء امت کے فتاوٰے کو کیوں نظرانداز کیا گیا۔ یہ بات کس سے پوشیدہ ہے کہ علماءِ امت نے قرآن و حدیث کی تفکر و تدبر و تفسیر میں عمریں صرف کی ہیں۔ جب کہ ہمارے وکلاء اور جج و جسٹس صاحبان نے مادی دنیا میں وقت گزارا ہے۔ اور انگریزی قوانین کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ منشاءِ قرآنی کو جتنا فقیہِ امت سمجھ سکتا ہے۔ اتنا یہ مادیات کے ماہر کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور میں **سات باتیں**۔ بیان کی جائیں گی۔ تب پورا مسئلہ واضح ہوگا:۔

پہلی بات۔ یہ کہ قرآنِ پاک اور حدیثِ مبارکہ کا آپس میں تعلق کیا ہے۔ **دوسری**۔ یہ کہ نسخ کیا چیز ہے اور ناسخ و منسوخ کا آپس میں ربط کیا ہے۔ یعنی کون کس کا ناسخ ہوسکتا ہے۔ اور کیوں۔ ہے۳ **تیسری بات** یہ کہ اسلام میں کُل حدود کتنی ہیں اور تعزیر و حد میں فرق۔ اور حدِّ اسلامی کی تعریف اور اس کا حکم کیا ہے۔ اس کو ماننے نہ ماننے یا اس کو جاری کرنے نہ کرنے سے دنیوی اُخروی کیا فرق پڑتا ہے۔ **چوتھی بات** یہ کہ رجم کی سزا قرآنِ مجید اور

احادیث پاک سے کس طرح ثابت ہے۔ **پانچویں بات** یہ کہ۔ اسلام نے ہمارے جرموں پر ہم کو کتنی قسم کی سزائیں دیں
چھٹی بات یہ کہ اپنے مسلک پر دلائل **ساتویں بات** یہ کہ مخالف کے پیش کردہ دلائل کا مکمل رد اور نا سمجھی اور کمزور
پہلوؤں کو اجاگر کرنا۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ ھُوَ الْمُوَفِّقُ بِالصَّوَابِ:۔

قولِ اول:۔ چونکہ ہمارے مخاطبین مخالفین اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ اگرچہ فہم قرآنی سے خاصے دور ہیں
اس لیے حدیث و قرآن کا تعلق قرآنِ مجید سے ہی پوچھنا ہے۔ کہ قرآن پاک کے نزدیک مقامِ حدیث کیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت پارہ
۲۷ سورۂ نجم۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (ترجمہ):۔ اور تمہارے
مالک یعنی صاحب ہمارے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے ایک بات بھی نہیں کرتے مگر وہی بات کہتے ہیں۔
جو اُن کو الہام کی جاتی ہے۔ اس واضح کلام سے عظیم الشان طریقے سے ثابت ہوا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تمام باتیں
بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں حضور اقدس کی اپنی کوئی بات نہیں یہاں تک کہ گھریلو اور محافلِ خصوصیہ و عمومیہ کی باتیں الہام الٰہیہ سے ہیں
اس آیت کریمہ کا یہی مطلب درست ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی مطلب و مقصد بن سکتا ہی نہیں پانچ وجہ سے:۔

پہلی وجہ:۔ یہ کہ الفاظ عبارتِ پاک میں وَمَا یَنْطِقُ ہے۔ جو نطق سے مشتق ہے۔ اور نطق لغوی لحاظ سے
ذاتی گفتگو اور بول کو کہا جاتا ہے۔ بخلاف قول کے کہ وہ عام ہے اپنی بات یا دوسرے کی بات کے۔ اگر یہاں آیت میں۔ بجائے
مَا یَنْطِقُ کے مَا یَقُوْلُ ہوتا تو الفاظِ قرآن اور وحیِ جلی بھی مراد لی جاسکتی تھی۔ مگر مَا یَنْطِقُ سے الفاظِ قرآنی مراد نہیں لیے
جاسکتے۔ نطق متکلم اور ناطق کی ذاتی گفتگو کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی جلد چہارم علی اربعۃ تفاسیر ص۵۰۸ پر اور تفسیر
روح المعانی جلد دہم ص۱۷۱ پ ع۱۹ پر ہے:۔ وَالنُّطْقُ وَالْمَنْطِقُ فِی الْمُتَعَارَفِ کُلُّ لَفْظٍ یُعَبَّرُ بِہٖ عَمَّا فِی الضَّمِیْرِ:۔
(ترجمہ):۔ مشہور لغت میں اور عام اہل عرب کے مشہور محاوروں میں۔ نطق اور منطق سے ہر وہ لفظ مراد ہوتا ہے جس سے بولنے
والا اپنے دل کی بات اور ذاتی کلام تعبیر کرے۔ تفسیر تنویر المقباس ص۲۳۵ پر ہے۔ (مَنْطِقَ الطَّیْرِ) کَلَامَ الطَّیْرِ (ترجمہ)
قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قول عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ سے مراد پرندوں کا ذاتی کلام ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ ہم انبیاء کرام کو رب تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سکھائی ہے
تو اس وقت آپ نے لفظ منطق ہی فرمایا۔ ثابت ہوا کہ نطق سے مراد ذاتی گفتگو ہے۔ نہ کہ عباراتِ قرآنیہ:۔

دوسری وجہ:۔ یہ کہ تمام اہلِ لغت بزرگوں نے نطق کا ترجمہ ذاتی گفتگو اور بات ہی کیا ہے۔ چنانچہ ولیِ کامل
حضرت شیخ سعدی شیرازی صاحب گلستان بوستان۔ اپنے ترجمۂ قرآن مجید میں لکھتے ہیں۔ و نمیگوید از آرزوئے نفس خود و
نیست سخنِ اُو مگر وحی کہ فرستادہ میشود باو۔ ترجمہ:۔ اور پیارے نبی کوئی بھی بات اپنے خواہشِ دل سے
نہیں کرتے مگر وحی سے ہی بولتے ہیں جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ یہی حضرت سعدی اور دیگر تمام مترجمین نے
عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ میں۔ منطق کا ترجمہ گفتار مرغان۔ یعنی پرندوں کی ذاتی بولی فرمایا ہے۔ اسی بنا پر ثابت

ہوا کہ لفظِ کلام اور قول۔ کسی دوسرے کی نقل کو بھی کہہ دیا جاتا ہے مگر نطق اپنے ہی کلام کو کہا جاتا ہے۔

تیسری وجہ:۔ تفسیر کبیر رازی میں وَمَا یَنْطِقُ کے بارے بہت قول نقل کیئے مگر زیادہ ترجیح اسی کو دی گئی کہ یہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شب و روز کی ذاتی گفتگو مراد ہے۔ اور چونکہ دن رات میں پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مخزنِ علم و حکمت سے ہزار ہا کلمات ادا ہوتے رہتے تھے اس لیئے امام رازی نے فرمایا کہ یہاں لفظ وَحْيٌ يُّوْحٰى سے مراد ہمہ وقتی الہامات ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد ہفتم ص۳۰۶ پر ہے۔ فَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّفَسَّرَ الْوَحْيُ بِالْاِلْهَامِ۔ (ترجمہ):۔ مفسرین کے اقوال نے جب یہ ثابت کر دیا کہ یہاں مَا يَنْطِقُ سے نبی کریم کی ذاتی اور شب و روز کی گفتگو مراد ہے اور اگر ہم اس بات کے قائل ہو جائیں تو ضروری لائق ہے کہ وحی سے مراد الہام لیا جائے اس عبارت سے ثابت ہوا کہ نطق سے مراد عبارتِ قرآن مجید کا تکلم نہیں بلکہ ذاتی اور نجی گفتگو مراد۔ **چوتھی وجہ**:۔ یہ کہ اِنْ هُوَ میں هُوَ ضمیر کا مرجع يَنْطِقُ کا مصدر نُطْقٌ ہے سوا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا ورنہ اضمار بلا مرجع یا اضمار قبل الذکر لازم آئے گا اور یہ دونوں ناجائز ہیں۔ جس طرح سورتِ قدر میں۔ ہٗ ضمیر کا مرجع اَنْزَلْنٰهُ کا مُنَزَّلُ ہے۔

پانچویں وجہ:۔ یہ بات مُتَّفَقًا مُسَلَّمٌ ہے کہ نطق کا معنیٰ ذاتی بولی ہے۔ چنانچہ مولانا رومی فرماتے ہیں۔

؎ نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گِل ✽ ہست محسوس از حواسِ اہلِ دل۔ ترجمہ:۔ پانی بھی بولتا ہے اور خاک بھی اور مٹی بھی۔ اہل دل اولیاء اللہ ان کی بولی سنتے سمجھتے ہیں۔ ان تمام دلائل سے ثابت ہوا کہ آقائے دو عالم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی اور تمام گفتگو الہامِ الٰہی سے کرتے ہیں۔ اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں ہوتی۔ تو یہ صاف واضح ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی گفتگو ہی حدیث کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ بالکل درست ہے کہ حدیث و قرآن بالکل ایک درجہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو عبد اللہ اپنی کتاب ناسخ منسوخ کے ص۳۰۹ پر فرماتے ہیں مِنْهَا شِدَّةُ اِعْتِنَاءِ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ بِالنَّاسِخِ وَالْمَنْسُوْخِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ شَانُهُمَا وَاحِدٌ۔ ترجمہ:۔ صحابہ کرام ناسخ منسوخ کی بہت سخت احتیاط فرماتے تھے۔ حدیث و قرآن دونوں کی ایک دوسرے میں کیونکہ صحابہ کے نزدیک حدیث و قرآن دونوں کی شان ایک تھی۔ المغنی ابن قدامہ جلد نہم ص۳۴ پر ہے:۔ فَاِنْ قِيْلَ فَكَيْفَ يُنْسَخُ الْقُرْآنُ بِالسُّنَّةِ قُلْنَا قَدْ ذَهَبَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا اِلٰى جَوَازِهٖ لِاَنَّ الْكُلَّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنِ اخْتَلَفَتْ طُرُقُهٗ۔ (ترجمہ):۔ اگر کوئی کہے کہ حدیث سے قرآن کیسے منسوخ ہو سکتا ہے تو ہم کہیں گے کہ بعض نے جائز کہا ہے اس لیئے کہ حدیث و قرآن سب ہی اللہ کی وحی ہے اگرچہ نزول کے طریقے مختلف ہیں اور دونوں کا فیصلہ فرض و لازم ہے۔ ہر ایک کا انکار کفر ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ کی عبارت بہت مضبوط طریقے سے یہ بات ثابت فرما رہی کہ شرعی قانون اور اس پر ایمان لانے کی حیثیت سے قرآن و حدیث کا درجہ ایک ہی ہے۔ خود آقائے دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث یہی بتا رہی ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص۲۹ باب الاعتصام میں ہے

وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِ يْكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اِنِّيْ اُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (الخ)۔ ترجمہ: حضرت ابن معدیکرب نے بیان کر فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار بے شک میں دیا گیا ہوں، قرآن کریم اور اس کی مثل اس کے ساتھ۔ یہ مثل کون ہے۔ حدیث پاک ہی ہے۔ اور یہی احادیث مثلِ قرآن ہیں۔ یہ روایت اور یہ آیت ایک دوسرے کی شرح و تفسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مکتوبی صورت میں نازل نہ ہوا بلکہ اسی زبان پر نازل ہوا جس پر حدیث پاک وَمَا يَنْطِقُ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حدیثِ رسولِ پاک تمام کی تمام قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ حدیث پاک کو چھوڑ کر کسی شخص کو قرآن مجید کی سمجھ آسکتی ہی نہیں لہٰذا حدیثِ پاک کا ہر فیصلہ گویا کہ قرآنِ پاک کا ہی فیصلہ ہے۔ حدیثِ مبارکہ کا فیصلہ کسی پر جاری کرنا بھی کتاب اللہ ہی کو جاری کرنا ہے کیونکہ نبی کریم کی ہر بات قرآنی عبارات سے علیحدہ وحیِ خفی اور الہاماتِ الٰہیہ کی ہے۔ یہ جو بعض شیعہ رافضی۔ حضرت علی یا امام حسین کو ناطقِ قرآن مرکب اضافی یا ناطق قرآن۔ یا قرآنِ ناطق کہہ دیتے ہیں یہ سب غلط ہے۔ کیونکہ نطق کے معنٰے ہیں اپنا کلام بولنا جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق کلی طور پر وحیِ الٰہی ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتیں وحی اور الہام ہوں۔ کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل شریعت ہے۔ اور شریعت مِنَ اللّٰهِ تعالٰی ہی ہوتی ہے۔ اس آیت پاک سے جہاں حدیث کی اہمیت اور قرآن و حدیث کا آپس کا تعلق ثابت ہوا وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ باری عَزَّ اِسْمُهٗ ہر وقت نبی کریم سے ہم کلام ہے۔ الہاماتِ باری تعالٰے اگرچہ دیگر انبیاء عظام و اولیاء اللہ کو ملتے ہیں۔ مگر ایسی ہر وقتی کسی کو میسر نہیں۔ دوسری آیت پاک میں ارشاد ہے:۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (ترجمہ):۔ آپ کے رب کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اپنے تمام مقدموں جھگڑوں اور مخالفتوں میں آپ کو کامل حاکم نہ مان لیں پھر اپنے دل میں آپ کے فیصلے سے کوئی تنگی حرج یا اعتراض نہ پائیں بلکہ بے چون و چرا مان لیں۔ تیسری آیت کریمہ میں ارشاد ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ:۔ (ترجمہ) اطاعت کرو تم اللہ کی اور اطاعت کرو رسولِ پاک کی۔ چوتھی آیت میں ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ۔ (ترجمہ):۔ اے پیارے حبیب فرما دو کہ اگر تم اللہ تعالٰی کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ ان تمام آیات میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو بھی سزا جزا کا فیصلہ فرما دیں اگرچہ وہ ظاہراً قرآنِ مجید میں نہ ہو۔ مگر بالکل برحق اور قابلِ نفاذ واجبی فیصلہ ہے۔ اگر کسی نے نبی کریم کے اس ذاتی فیصلے کو نہ مانا اور قرآنِ پاک میں اس فیصلے کی تائید ڈھونڈتا رہا ماننے پر منکر ہو گیا تو وہ کبھی مومن نہیں ہو سکتا۔ عقیدۂ دینی یہی ہے کہ کوئی قانونِ شریعت اس کو قرآن مجید میں نظر آئے یا نہ آئے حدیثِ پاک میں دیکھتے ہی مان لے:۔ **دوسرا قول**:۔ کائناتِ عالم میں ایک دور وہ تھا جب قرآنِ حمید نازل ہو رہا تھا اور حدیث مقدسہ معرضِ وجود میں آتی چلی جا رہی تھیں۔

ایک زبانِ پاک ہی دو طرفہ گوہر افشانی فرما رہی تھی اس دور کی خصوصی شان یہ تھی۔ کہ یہی زبان پاک وحیِ جلی یعنی قرآن مجید کے ذریعے اسی قرآنِ کریم کے عارضی احکام کو منسوخ کر رہی ہے۔: کبھی لفظوں کو اور ان کے معانی کو دوسری آیات کے لفظ منسوخ کر رہے ہیں اور کبھی کوئی آیت دوسری آیت کا فقط حکم منسوخ کر رہی ہے۔ اور کبھی یہی وحیِ جلی یعنی قرآنِ پاک کی آیتیں وحیِ خفی یعنی حدیثِ مبارکہ کے اور پھر کبھی وحیِ خفی حدیثِ پاک کے ذریعے دوسری وحیِ خفی یعنی حدیث شریف کے حکم اور لفظوں یا صرف حکم منسوخ کر رہی ہیں۔ کبھی وحیِ خفی یعنی حدیث پاک کے ذریعے وحی جلی یعنی آیت قرآنی کے صرف حکم کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ناسخ منسوخ کی کل چار قسمیں ہو جاتی ہیں:۔ ع۱ قرآن کے الفاظ کا نسخ قرآن سے اور قرآنِ پاک کے حکم کا نسخ قرآن مجید کی ہی آیت سے ع۲ آیت سے دوسری آیت کے الفاظ اور حکم دونوں کا نسخ ع۳ آیت سے حدیث کا نسخ ع۴ حدیث کا حدیث سے نسخ ع۵ حدیثِ پاک سے فقط حکمِ قرآنی کا نسخ۔ منکرین حدیث چکڑالوی اور پرویزی گروہ ویسے تو بالکل ہی نسخ کا انکار کرتے ہیں مگر نسخِ آیت بالحدیث کے سخت منکر و مخالف ہیں۔ دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں ← وَعَنْ جَابِرٍ۔ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَامِيْ لَا يَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ وَيَنْسَخُ كَلَامِيْ وَكَلَامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔ مشکوٰۃ شریف ص۳۲:۔ (ترجمہ):۔ حضرت جابر سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرا کلام اللہ کے کلام کو منسوخ نہیں کرتا ہاں میرا کلام میرے کلام کو اور قرآن قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں الفاظِ قرآن مراد ہیں یعنی حدیث سے الفاظ آیت منسوخ نہیں ہوتے صرف حکم قرآنی منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں ←

پہلی مثال:۔ آیت سے آیت کے فقط حکم کی تنسیخ تلاوت باقی۔ جیسے جہاد کی آیتوں سے عفو اور درگزر اور کفار پر نرمی کی آیات۔ کہ ان معافی کی آیات کی تلاوت اب تک باقی مگر حکم منسوخ لہٰذا اب کوئی بادشاہ یا حاکم کوئی پیر یا عالم کفار پر حسب حیثیت قتال یا لسان یا قلم یا قلب سے شدت نہ کرے گا۔ تو شرعاً مجرم ہے۔ ع۲ کسی محکم آیت سے دوسری عارضی آیت کا حکم و تلاوت دونوں ختم کر دیئے جائیں گے۔ مثلاً سورۃ حجرات کی ایک آیت اس طرح نازل ہوئی۔ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ:۔ (ترجمہ):۔ دس مقرر گھونٹ شیر خوار بچہ پیئے تو رضاعت ہو گی۔ یہ آیت رضاعت کی آیتوں سے حکماً بھی منسوخ ہو گئی اور الفاظ بھی باقی نہ رکھے گئے۔ اور دوسری آیت سورۃ توبہ کی اس طرح نازل ہوئی تھی ← لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى إِلَيْهِمَا ثَالِثًا وَلَوْ كَانَ لَهٗ ثَالِثًا لَابْتَغٰى رَابِعًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ (ترجمہ) اگر انسان کو دو جنگل بھر کے سونا ملے تب بھی تیسرے کا لالچ کرے گا اور اگر تین جنگل بھر کے مل جائیں تو چوتھے کا حریص ہو گا انسان کا پیٹ صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔ ہاں اللہ توبہ والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اسی طرح آیت سے دوسری آیت کے صرف الفاظ منسوخ مگر حکم باقی مثلاً اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ والی مشہور آیت کا حکم اب تک باقی ہے مگر الفاظ آیت زنا سے منسوخ ہو گئے

ع۳:۔ آیت سے حدیث کا نسخ مثلاً فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ:۔ (ترجمہ) کعبے کی طرف نماز وں میں اپنا منہ پھیر لو اس آیت نے اس حدیث کو منسوخ کر دیا جس میں نمازوں میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم تھا۔ ع۴ حدیث سے حدیث کا نسخ مثلاً۔ زیارت قبور کی اجازت والی حدیث نے۔ ممانعت والی سابقہ حدیث کو منسوخ کر دیا۔ جیسا کہ ابوداؤد میں دونوں حدیثوں کا ذکر ہے۔ ع۵ حدیث سے آیت کا حکم نسخ مثلاً سجدہ تحیت کی تمام آیتیں حدیث نے منسوخ فرمائیں اور بتایا کہ کسی مسلمان کو تحیۃ کا سجدہ جائز نہیں۔ اور جیسے وارث کو وصیت والی آیت۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ والی آیت حدیث سے منسوخ ہے۔ اور جیسے اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ والی آیت نے صرف مذکورہ فی الآیت عورتوں کو مرد پر حرام کیا مگر حدیث نے اس حکم کا وَرَآءَ کو منسوخ کر دیا۔ اس آیت کی ناسخ وہ حدیث ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَلٰى خَالَتِهَا۔ ترجمہ۔ کوئی عورت اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ کی سوت (سوکن) نہ بنے ہر مرد کو ایسا نکاح حرام ہے۔ یہ چند مثالیں تھیں تفصیل تو بہت زیادہ ہے۔ خیال رہے کہ نسخ کا قانون شریعت اسلام میں اتنا اشد اور لازمی ہے کہ باری تعالے نے بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر فرمایا۔ اور علماء اسلام نے اس موضوع پر مکمل تحقیق سے ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ صحابہ کرام کا عقیدہ یہ تھا کہ جو انسان تنسیخ آیات کا منکر ہے وہ مرتد ہے اور جو اس سے غافل ہے وہ گمراہ و گمراہ گر ہے۔ چنانچہ حضرت علی مشکل کشا سے روایت ہے :۔ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ مَرَّ عَلِیٌّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلٰى قَاضٍ فَقَالَ لَهٗ اَتَعْرِفُ النَّاسِخَ مِنَ الْمَنْسُوْخِ قَالَ لَا قَالَ هَلَكْتَ وَاَهْلَكْتَ۔ (ترجمہ) :۔ ابو عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ کہ علی رضی اللہ عنہ ایک واعظ مقرر کے پاس سے گزرے تو اس کو فرمایا کہ کیا تو ناسخ منسوخ کو پہچانتا ہے۔ اس نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا تو گمراہی کا ہلاک ہوا اور تو نے قوم کو گمراہی کا ہلاک کیا۔ اسی ناسخ منسوخ آیتوں کا قرآن مجید میں کئی جگہ اس طرح ارشاد ہے

پہلی آیت :۔ پارہ اوّل سورۃ بقرہ آیت ع۱۰۶ پر ہے :۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ :۔ (ترجمہ) :۔ جب کوئی آیت ہم خود منسوخ فرما دیں یا اپنے نبی کریم کو ہم بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل دوسری آیت لے آتے ہیں اے انسان کیا تو اس بات کو نہیں مانتا کہ بے شک اللہ تعالٰی ہر شیٔ پر قادر ہے۔ اس آیت پاک نے نسخ کی مندرجہ تین قسمیں بیان فرمائیں :۔ —
ع۱ آیت سے آیت کے لفظوں کا نسخ ع۲ آیت سے آیت کا حکم منسوخ ع۳ آیت سے آیت کے الفاظ اور حکم دونوں منسوخ۔ اس آیت کے آخری الفاظ میں ناسخ منسوخ پر ایمان لانے کی شدت سے ذکر فرمایا گیا :۔

دوسری آیت :۔ پارہ ع۳۰ سورۃ الاعلیٰ آیت ع۶ :۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (ترجمہ) :۔ عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے پس آپ اس قرآن کو نہ بھولیں گے۔ مگر جو اللہ چاہے وہ آیت آپ کے ذہن سے بھلا دے گا۔ اس آیت کریمہ میں نسخ کی چوتھی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ یعنی حدیث سے حدیث کا

نسخ یا حدیث سے آیت کے حکم کا نسخ۔ کیونکہ پہلی آیت شریف میں نُنْسِهَا ہے یعنی ہم بھلادیں۔ اور یہاں لَا تَنْسٰى ہے یعنی آپ خود نہ بھولیں گے اسی لَا تَنْسٰى کی نفی اِلَّا نے توڑی۔ تو مطلب ہوا کہ جو اللہ چاہے وہ آیت آپ خود اپنی حدیث کے ذریعے بھولیں گے۔ اور حدیث پاک سے نیا قانون ظاہر فرمائیں گے۔ اہل لغت کے نزدیک نسی کے معنی چھوڑنا بھی ہے تو مطلب ہوا کہ جس کو آپ چھوڑ دیں۔ اللہ نے نبی کریم کو اختیار دے دیا ہے۔ **تیسری آیت**:۔ سورت نحل آیت ۱۰۱:۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ (الخ)۔ ترجمہ:۔ اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدلیں اور اللہ خوب جانتا ہے۔ جو اتارتا ہے ۱؎ یہ آیت سیاق و سباق اور لفظ يُنَزِّلُ سے ثابت کر رہی کہ تبدیلی سے مراد نسخ آیتِ قرآن ہی ہے۔ اس کو سابقہ کتب سماوی کی طرف پھیرنا۔ منکرین کی انتہائی نادانی ہے۔ چونکہ رب تعالیٰ کے نزدیک ناسخ منسوخ بہت اہم چیز ہے۔ اسی لیے رب تعالیٰ نے بہت سی سورتوں میں آیتوں کو نسخ فرمایا۔ علماء اسلام نے اس کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی کہ قرآن مجید کی ایک سو چودہ ۱۱۴ سورتوں میں سے تریتالیس ۴۳ سورتوں میں کوئی آیت نہ کوئی ناسخ ہے نہ کوئی منسوخ۔ اور چالیس ۴۰ سورتوں میں آیتیں منسوخ ہیں لیکن ان میں ناسخ آیت کوئی نہیں۔ اور چھ ۶ سورتوں میں ناسخ آیتیں ہیں لیکن ان میں منسوخ کوئی آیت نہیں۔ اور پچیس سورتوں میں منسوخ آیتیں بھی ہیں اور ناسخ آیتیں بھی ہیں۔ اس طرح یہ ایک سو چودہ کی تعداد والی تقسیم مکمل ہوتی ہے۔ چنانچہ آسانی برحفظ کے لیے اس طرح زائچہ بنایا جاتا ہے۔ مگر چند باتیں پہلے ذہن نشین کرلینی بہت ضروری ہیں:۔ ایک ۱ یہ کہ کل منسوخ آیتیں دو سو گیارہ ۲۱۱ ہیں۔ اور کل ناسخ آیتیں اسی ۸۰ ہیں۔ **دوم**:۔ یہ کہ منسوخ آیتیں پہلے نازل ہوئی تھیں بجز دو آیتوں کے۔ ۱؎ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۴ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ (الخ) ۲؎ سورت احزاب کی آیت ۵۰ اِنَّآ اَحْلَلْنَا (الخ) اور ناسخ آیتیں بعد میں حسبِ موقعہ نازل ہوتی رہیں چنانچہ امام ابو عبداللہ بن حزم اپنی کتاب حاشیہ تفسیر تنویر المقباس ص ۳۱۹ پر لکھتے ہیں:۔ اِعْلَمْ اَنَّ نُزُوْلَ الْمَنْسُوْخِ بِمَكَّةَ كَثِيْرٌ وَّنُزُوْلَ النَّاسِخِ بِالْمَدِيْنَةِ كَثِيْرٌ (ترجمہ):۔ جان تو کہ بے شک منسوخ آیتیں زیادہ مکے شریف میں نازل ہوئیں۔ **سوم**:۔ یہ کہ ناسخ آیتیں علیحدہ ہوتی ہیں اور منسوخ علیحدہ بجز ایک آیت کے۔ سورت مائدہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ (الخ) آیت ۱۰۵ کہ یہ آیت خود ہی اپنی ناسخ ہے۔ آیت کا پہلا حصہ منسوخ ہے آخری حصے سے۔ **چہارم**:۔ یہ کہ ناسخ و منسوخ میں ہر آیت مکمل ناسخ یا منسوخ ہوتی ہے بجز سورت اعراف آیت ۱۹۹ خُذِ الْعَفْوَ (الخ) **پنجم**۔ یہ کہ۔ کفار کو معافی اور درگزر کرنے کی کل ایک سو چودہ آیتیں ہیں جو سینتالیس سورتوں میں ہیں۔ **ششم**:۔ یہ کہ کل پانچ حدیثوں سے پانچ آیتوں کو منسوخ کیا گیا دو ۲ آیتیں اور دو حدیثیں اوپر بیان کر دی گئیں باقی تین اس طرح ہیں۔

پہلی آیت:۔ آیت ۱۷۳:۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ۔ (بقرہ)۔ الخ

اس آیت کے اطلاق کو اس حدیث سے منسوخ کیا گیا ہے:۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُحِلَّتْ لَنَا مَیْتَتَانِ وَدَمَانِ:۔ (ترجمہ):۔ آیت کا ترجمہ اس طرح ہے۔ اے مسلمانو تم پر سب مردار اور سب خون حرام کئے گئے۔ ترجمہ حدیث پاک:۔ ہم مسلمانوں پر دو مردار اور دو خون حلال کیلئے گئے اس حدیث نے اس آیت کی کلیت منسوخ کردی۔ دوسری آیت سورت نساء آیت ۲۴ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً:۔ ترجمہ:۔ تو تم جن عورتوں کو متعہ نکاح میں لانا چاہو۔ تو ان کے اجر انکو فرض سمجھ کر دو دے دو جو بھی آپس میں رضامندی سے مقرر ہو۔ اس آیت کی ناسخ یہ حدیث ہے۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ کُنْتُ اَحْلَلْتُ ھٰذِہِ الْمُتْعَۃَ اَلَا وَاِنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ قَدْ حَرَّمَاھَا۔ اَلَا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ:۔ تیسری سورت نساء آیت ۱۵ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْھِدُوْا عَلَیْھِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ فَاِنْ شَھِدُوْا فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا۔ (ترجمہ):۔ اور تمہاری بیویاں جو زنا کرالیں تو تم ان کے خلاف چار سچے متقی گواہ عدالت میں حاضر کرو جب زنا ثابت ہو جائے تو اس بیوی کو اپنے ہی گھر میں اس کی موت تک قید کردو یا جب تک کوئی نیا قانونِ الٰہی آجائے۔ یہ آیت اس حدیث پاک سے منسوخ ہے:۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ خُذُوْا عَنِّیْ قَدْ جَعَلَ لَھُنَّ السَّبِیْلَ اَلثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ الرَّجْمُ وَالْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ:۔ (ترجمہ):۔ فرمایا آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ قانون شرعی مجھ سے لو بے شک بنادیا گیا ان زانیہ عورتوں کے لیئے یہ قانون شادی شدہ عورت و مرد کو رجم ہوگا اور کنوارے عورت مرد کو سو کوڑے حدِ شرعی ہو گی اور ایک سال کے لیئے شہر بدر تعزیری سزا ہوگی۔ پوچھو ان منکرینِ حدیث لوگوں سے۔ نسخ کے اتنے مضبوط اور حقیقی واقعی قانون کے ہوتے ہوئے پھر تم کس طرح نسخ کے منکر ہوتے ہو۔ نسخ کا انکار درپردہ قرآنِ مجید کی گستاخی ہے۔ کیونکہ سب آیات کو محکم مان کر ناسخ و منسوخ کا ٹکراؤ پیدا کرنا ہے۔ بھلا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ناسخ پر بھی عمل کیا جائے اور منسوخ پر بھی۔ اور پھر یہ انکار خدا تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے جو سراسر بے دینی۔ حالانکہ نسخ کا قانون خود رب کا فرمودہ اور عین حکمتِ الٰہیہ کے مطابق ہے۔ جیسا کہ پہلے دلائل آیتیں سورۃ بقرہ اور سورتِ اعلیٰ کی پیش کی گئیں۔ اور یہ آیت مندرجہ بالا اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ (الخ) بھی ثابت فرمارہی ہے کہ قانونِ نسخ ہوا کرے گا۔ دراصل پرویزیوں چکڑالویوں کا یہ مذہب یہودی مذہب سے لیا گیا ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ منکرِ حدیث کا اکثر مذہب یہودیوں سے لیا گیا ہے نسخ کے انکار میں پرویزی اور یہودی ایک ہی بات کہتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ پہلے بے علم تھا کہ پہلے کچھ اور پھر کچھ چنانچہ حاشیہ تفسیر مقباس صفحہ ۳۱۲ پر یہی لکھا ہے۔ اور پرویز صاحب کی لغات القرآن چہارم صفحہ ۱۶۰۸ پر بھی

یہی ہے۔ آریہ ہند بھی یہی اعتراض کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض تو توریت و انجیل کی تنسیخ پر بھی پڑ سکتا ہے جس کو پرویزی یہودی دونوں مانتے ہیں اس تنسیخ پر تم کیا جواب دو گے کیا باری تعالیٰ توریت انجیل ایک دم نازل نہیں کر سکتا تھا۔

ساتویں یہ کہ منکرین حدیث نے نسخ کا اس لیے انکار کیا کہ وہ نسخ کے حقیقی معنے نہ سمجھے۔ بس اپنی جہالت سے اتنے بڑے مفید اور خود رب تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے منکر ہو گئے۔ نسخ کے لغوی معنی ہیں کسی حکم کا ازالہ کرنا۔ اور دوسرے حکم کو اس کی جگہ نافذ کرنا (لغات القرآن ص۲۷۲۔ منجد عربی صفحہ ۸۷۲) نسخ کی شرعی اور اصطلاحی تعریف ہے کسی قانون کی مدتِ نفاذ ظاہر کرنا۔ اور دوسرا قانون لانا۔ چنانچہ کتاب ناسخ حاشیہ تفسیر مقباس صفحہ ۳۱۱ اور مرقات شرح مشکوٰۃ جلد اول صفحہ ۲۱۵ پر ہے:۔ اَلنَّسْخُ لُغَتًا اَلتَّبْدِیْلُ وَشَرْعًا بَیَانُ لِانْتِہَاءِ الْحُکْمِ الشَّرْعِیِّ الْمُطْلَقِ (الخ) وَقِیْلَ اِنْقِضَاءُ الْعِبَادَۃِ الَّتِیْ ظَاھِرُھَا الدَّوَامُ۔ (ترجمہ):۔ نسخ کا لغوی ترجمہ ہے تبدیلی اور شرعی ترجمہ شریعت پاک کے مطلق حکم کی مدتِ انتہا بیان کرنا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ جو عبادت ظاہراً دائمی معلوم ہوتی تھیں ان کو بند کرا دینا خود منکر حدیث گروہ کے موجودہ سرغنہ نے بھی نسخ کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ مگر وہ توریت و انجیل کی آیات کی تنسیخ مراد لیتا ہے میں کہتا ہوں کہ توریت و انجیل کی آیات منسوخ نہیں ہوئیں وہ تو پوری کتاب منسوخ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آیت کا ذکر ہے۔ منکرِ حدیث کہتا ہے سابقہ امتوں کے حالات کے مطابق نرم اور سخت قانون آتے رہے اس پر میں کہتا ہوں یہ عقیدہ کتنی جہالت کا ہے کتب سابقہ امم سابقہ پر یکدم آئیں مکتوبی شکل میں۔ اور پھر اگر سابقہ امتوں پر حالات کے مطابق نرم سخت احکام و قانون آتے رہے تو امت مسلم اس مشفقانہ رعایت کی زیادہ حقدار ہے۔ کہ محبوب کی امت ہے۔ منکرِ احادیث اپنی کتاب لغات القرآن جلد چہارم ص۱۶۰۸ پر لکھتا ہے۔ قرآن کریم میں خدا نے کسی بات کا حکم دیا اس کے کچھ عرصے بعد سوچا کہ اس طرح حکم کو منسوخ کر دینا چاہیئے چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی۔ میں کہتا ہوں کہ مخالفین نے غلط سمجھا۔ نسخ کا مطلب یہ نہیں کے بعد میں سوچا۔ یہ نظریہ کفریہ اور اتہام ہے۔ نسخ کا مطلب بلا تشبیہ یوں سمجھا جائے کہ ماں کو پہلے ہی معلوم ہے کہ بچے کی خوراک کب کب تبدیل کرنی ہے۔ ڈاکٹر حکیم کو شروع دن سے پتہ ہے کہ مریض کی دوائیاں کس کس وقت تبدیل کرنی ہے۔ استاد خوب جانتا ہے کہ ابتدائی شاگرد کے لیئے لمحہ بہ لمحہ کونسی کتابیں تبدیل کرنی ہیں۔ بس سمجھ لو کہ رب تعالیٰ ان سب سے زیادہ علیم و خبیر ہے۔ وہ اپنے محبوب بندوں کی ضروریات سے بخوبی واقف ہے۔ نسخ قرآنِ مجید کا اٹل قانون ہے۔ اور یہ صرف قرآن پاک کی ہی شانِ کریمی ہے کسی اور کتبِ سماوی کو نہ ملی:۔

آٹھویں:۔ یہ کہ جو آیت منسوخ ہے وہ تاقیامت منسوخ ہے اور جو ناسخ وہ ابد تک ناسخ ہے۔ ان کو تیمم اور وضو وغیرہ آیات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ منکرِ حدیث نے دھوکہ کھایا۔ فافہم:۔ یہ کہ

ناسخ و منسوخ کی جو تعداد ہم نے بیان کی سب علما فقہا کا اس پر اتفاق ۔ ہاں البتہ کسی نے پوری تعداد بیان کی کسی نے نہ کی ۔ کسی نے ناسخ منسوخ کو علیحدہ کیا اور کسی نے ایک جگہ سب کو لکھ کر مکمل تعداد بتادی ۔ بعض نے حکم قرآنی کو تین طرح سے ختم شدہ کہا ۔ ۱ نسخ ۔ ۲ استثناء ۳ خصوصیت ۔ اس طرح سے اُن کے نزدیک نسخ کی تعداد کم ہوگئی ۔ مگر اکثریت نے استثنا اور خصوصیت کو بھی نسخ میں شمار کیا اُن کے نزدیک منسوخ و ناسخ کی تعداد یقیناً زیادہ ہے ۔ منکر حدیث کی کم علمی اور نادانی ہے کہ اس کو تعداد میں اختلاف نظر آیا ۔ **دسویں** : ۔ یہ کہ وہ ایک دور تھا جب ناسخ و منسوخ ہوتا رہا ۔ کہ وحیِ حدیث کو وحیِ قرآن اور وحیِ قرآن کو وحی حدیث منسوخ کرتے رہے اسی طرح وحیِ قرآن کو وحی قرآن ۔ اور وحی حدیث کو وحی حدیث نسخ کرتی رہی ۔ جب یہ دور ختم ہوا تو سب اپنی اپنی جگہ محکم و مضبوط ہو گئیں ۔ اِس دور کے بعد نہ اجتہاد سے منسوخ ہو سکیں ۔ نہ قیاس سے ۔ نہ کسی خبر سے ۔ یہ دور نبی کریم کی حیات طیبہ طاہرہ ظاہرہ و باہرہ کا زمانہ تھا ۔ یہ ناسخ و منسوخ سب کے سب نبی کریم نے صحابہ کو بتادیئے ۔ اور صحابہ نے ہم کو ۔ اب کوئی عالم کوئی پیر کوئی ذی عقل و خرد کوئی نئی آیت ناسخ و منسوخ نہیں بنا سکتا ۔ اگر کوئی بنائے گا تو کاذب ملعون ہے ۔ ہمارے اس عقیدے کو بھی قرآن کریم نے متعدد آیات سے ثابت کر دیا ۔ چنانچہ ۔ پہلی آیت ۔ سورۃ انعام آیت ۱۱۵ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ ترجمہ : ۔ اور پورے ہو گئے آپ کے رب کے تمام کلمے صدق اور عدل کے قانون والے کوئی شخص اُس رب کے اِن کلموں کو تبدیل کرنے والا نہیں ۔ اور وہ رب تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ۔ دوسری آیت سورہ یونس آیت ۶۴ ۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ ۔ ترجمہ : ۔ اللہ تعالیٰ کے کلموں میں تبدیلی نہیں ہو گی ۔ ۳ ۔ سورۃ انعام آیت ۳۴ چوتھی آیت سورہ کہف آیت ۲۷ یہاں بھی یہ ہی بتایا جارہا ہے ۔ پانچویں آیت ۔ سورہ مائدہ آیت ۳ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ۔ ان آیات سے یہی اشارہ ہے کہ اب نسخ نہیں ہو سکتا ۔ **گیارھویں بات** یہ کہ صرف احکام کی آیات میں نسخ ہو سکتا ہے ۔ لیکن وعظ نصیحت حمد و نعت : ۔ وعد و عید خبریں ۔ اور قصص کی آیات میں نسخ نہیں ہو سکتا ۔ **بارھویں** یہ کہ صرف قرآن مجید اور احادیث میں ہی ناسخ منسوخ قانون ہیں اس سے پہلے توریت زبور انجیل میں کوئی آیت ناسخ منسوخ نہ ہوئی ۔ وہ سب کتاب یکدم آئی اور نبوت کی تنسیخ کے ساتھ ایک دم پوری منسوخ ہو گئی ۔ مگر قرآن مجید تھوڑا تھوڑا آیا ۔ اور نرم ۔ سخت قانون ناسخ منسوخ ہوتے رہے پچھلے دور میں جب کسی نبیِ اکرم کو کفار سے درگزر کا حکم ہوتا تو وہ آخر زندگی تک رہتا ۔ سرکش قوم کو جنگ و جہاد سے ختم نہ کرایا جاتا خود رب تعالیٰ عذاب آسمانی سے سرکشوں کو مٹا دیتا ۔ مگر قومِ مصطفیٰ سے یہ سلوک نہیں ۔ بلکہ پہلے نبی پاک کو درگزر کا حکم دیا پھر اس حکم کو منسوخ کر کے نبی پاک کو ہی قتال کا حکم دے کر سرکش قوم پر مسلمانوں کے ہاتھوں ہی عذابِ جہاد سے سرکشوں کو مٹایا گیا ۔ منکرِ حدیث گروہ کے دماغوں میں تو عقل نہیں ہے ورنہ نزولِ قرآن کا طریقہ ہی ناسخ و منسوخ کی حکمت بتا رہا ہے ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آئتیں آئتیں ہو کر قرآن پاک نازل ہو رہا ہے ۔ نسخ احکام

تو رحم وکرم کی دلیل ہے۔ وہ استاد رحیم نہیں ہو سکتا جو ایک دم ابتدائی شاگرد کو اول آخر سب کتب پڑھنے کا حکم دے نسخ کا انکار رحم وکرم وشفقتِ ربانی کا انکار ہے ہم نے احادیث کی روشنی میں جو ناسخ ومنسوخ کی فہرست پیش کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سب احکام محکم نہیں ہو سکتے :۔

قرآن مجید کی وہ ۴۳ سورتیں جن میں کوئی ناسخ منسوخ آیت نہیں

۱ سورت فاتحہ	۲ سورت یوسف	۳ سورت یٰسٓ	۴ سورت حجرات	۵ سورت رحمٰن	۶ سورت حدید	۷ سورت الصف	۸ سورت جمعہ
۹ سورت تحریم	۱۰ سورت ملک	۱۱ سورت الحاقہ	۱۲ سورت نوح	۱۳ سورت قمر	۱۴ سورت مرسلات	۱۵ سورت نبا	۱۶ سورت مطففین
۱۷ سورت نازعات	۱۸ سورت انفطار	۱۹ سورت انشقاق	۲۰ سورت بروج	۲۱ سورت فجر	۲۲ سورت بلد	۲۳ سورت شمس	۲۴ سورت واللیل
۲۵ سورت والضحیٰ	۲۶ سورت الم نشرح	۲۷ سورت والتین	۲۸ سورت قلم	۲۹ سورت قدر	۳۰ سورت لم یکن	۳۱ سورت زلزلہ	۳۲ سورت عادیات
۳۳ سورت قارعہ	۳۴ سورت التکاثر	۳۵ سورت ھمزہ	۳۶ سورت قریش	۳۷ سورت ماعون	۳۸ سورت کوثر	۳۹ سورت نصر	۴۰ سورت تبت
۴۱ سورت اخلاص	۴۲ سورت فلق	۴۳ سورت ناس	•	•	•	•	•

قرآن مجید کی وہ چھ سورتیں جن میں صرف ناسخ آیتیں ہیں

۱	۲	۳	۴	۵	۶
سورت فتح	سورت حشر	سورت منافقون	سورت تغابن	سورت طلاق	سورت الاعلیٰ
ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ	ناسخ
ایک آیت ع۱	ایک آیت ع۱	ایک آیت ع	ایک آیت ع	ایک آیت ع	ایک آیت ع۱

قرآن مجید کی وہ چالیس سورتیں جن میں منسوخ آیتیں ہیں

۱ سورت انعام منسوخ ۱۴	۲ سورت اعراف منسوخ ۲	۳ سورت یونس منسوخ ۴	۴ سورت ہود منسوخ ۳	۵ سورت رعد منسوخ ۲
۶ سورت حجر منسوخ ۵	۷ سورت نحل منسوخ ۵	۸ سورت اسراء منسوخ ۳	۹ سورت کہف منسوخ ایک	۱۰ سورت طٰہٰ منسوخ ۳
۱۱ سورت مومنون منسوخ ۲	۱۲ سورت نمل منسوخ ایک	۱۳ سورت قصص منسوخ ایک	۱۴ سورت عنکبوت منسوخ ایک	۱۵ سورت روم منسوخ ایک آخری آیت ع ۶
۱۶ سورت لقمان منسوخ ایک	۱۷ سورت سبا یعنی مضاجع منسوخ ایک	۱۸ سورت ملائکہ منسوخ ایک	۱۹ سورت صافات منسوخ ۴	۲۰ سورت صٓ منسوخ ۲
۲۱ سورت زُمَر منسوخ ۷	۲۲ سورت فُصلت منسوخ ایک	۲۳ سورت زخرف منسوخ ۲	۲۴ سورت دخان منسوخ ایک	۲۵ سورت جاثیہ منسوخ ایک
۲۶ سورت احقاف منسوخ ۲	۲۷ سورت محمد منسوخ ۲	۲۸ سورت قٓ منسوخ ۲	۲۹ سورت نجم منسوخ ۲	۳۰ سورت جن منسوخ ایک
۳۱ سورت ممتحنہ منسوخ ۲	۳۲ سورت نٓ منسوخ ۲	۳۳ سورت معارج منسوخ ایک	۳۴ سورت قیامت منسوخ ایک	۳۵ سورت الانسان منسوخ ۲
۳۶ سورت عبس منسوخ ایک	۳۷ سورت طارق منسوخ ایک	۳۸ سورت غاشیہ منسوخ ایک	۳۹ سورت والتین منسوخ ایک	۴۰ سورت کافرون منسوخ ایک

قرآن مجید کی وہ ۴۸ سورتیں جنمیں کفار سے درگزر و نرمی کرنیکی آیتیں ہیں یہ سب منسوخ ہیں

۱ سورت بقرہ	۲ سورت آل عمران	۳ سورت النساء	۴ سورت مائدہ	۵ سورت الانعام	۶ سورت الاعراف
۷ سورت الانفال	۸ سورت توبہ	۹ سورت یونس	۱۰ سورت ہود	۱۱ سورت رعد	۱۲ سورت حجر
۱۳ سورت نحل	۱۴ سورت الاسراء	۱۵ سورت مریم	۱۶ سورت طٰہٰ	۱۷ سورت الحج	۱۸ سورت مومنون
۱۹ سورت نور	۲۰ سورت نمل	۲۱ سورت قصص	۲۲ سورت عنکبوت	۲۳ سورت روم	۲۴ سورت لقمان
۲۵ سورت سجدہ	۲۶ سورت احزاب	۲۷ سورت سبا	۲۸ سورت فاطر	۲۹ سورت یٰسٓ	۳۰ سورت صافات
۳۱ سورت ص	۳۲ سورت الزمر	۳۳ سورت مومن	۳۴ سورت حٰم سجدہ	۳۵ سورت شوریٰ	۳۶ سورت زخرف
۳۷ سورت دخان	۳۸ سورت جاثیہ	۳۹ سورت الاحقاف	۴۰ سورت محمد	۴۱ سورت قٓ	۴۲ سورت مزمل
۴۳ سورت الانسان	۴۴ سورت الطارق	۴۵ سورت غاشیہ	۴۶ سورت والتین	۴۷ سورت الکافرون	۴۸ سورت جنّ

قرآن مجید کی وہ پچیس ۲۵ سورتیں جن میں ناسخ اور منسوخ دونوں قسم کی آیتیں ہیں

۱ سورت بقرہ منسوخ ۲۵ ناسخ ۱۶	۲ سورت آل عمران منسوخ ۵ ناسخ ایک	۳ سورت نساء منسوخ ۲۳ ناسخ ۱۳	۴ سورت مائدہ منسوخ ۹ ناسخ ۶	۵ سورت الانفال منسوخ ۶ ناسخ ۵	۶ سورت توبہ منسوخ ۷ ناسخ ۶
۷ سورت ابراہیم منسوخ ایک ناسخ ایک	۸ سورت مریم منسوخ ۵ ناسخ ۲	۹ سورت انبیاء منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۰ سورت حج منسوخ ۲ ناسخ ایک	۱۱ سورت نور منسوخ ۷ ناسخ ۷	۱۲ سورت فرقان منسوخ ۲ ناسخ ایک

سورت ۱۳ شعراء منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۱۴ سجدہ منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۱۵ احزاب منسوخ ۲ ناسخ ایک	سورت ۱۶ مومن منسوخ ۲ ناسخ ایک	سورت ۱۷ شوریٰ منسوخ ۸ ناسخ ۲	سورت ۱۸ زاریات منسوخ ۲ ناسخ ایک
سورت ۱۹ طور منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۲۰ واقعہ منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۲۱ مجادلہ منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۲۲ مزمل منسوخ ۶ ناسخ ایک	سورت ۲۳ مدثر منسوخ ایک ناسخ ایک	سورت ۲۴ تکویر منسوخ ایک ناسخ ایک

۲۵ سورت عصر، منسوخ ایک ، ناسخ ایک

ناسخ ومنسوخ آیات کی مکمل ترتیب وار فہرست

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	اُن کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	بقرہ	انّ الذین اٰمنوا والذین ھاجروا	۶۲	آل عمران	ومن یبتغ غیر الاِسلام دینا فلن یقبل	۸۵
۲	بقرہ	وقولو للناس	۸۲	توبہ	فاقتلوا المشرکین حیث وجد تموُھم آیۃ سیف	۵
۳	″	فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتیَ اللہُ	۱۰۹	توبہ	قاتلوا الّذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم	۲۹
۴	″	فاینما تولّوا فثمّ وجہُ اللہ	۱۱۵	بقرہ	قُل للہِ المشرق والمغرب یہدی من یشاء	۱۴۲
۵	″	اِنّ الّذِینَ یکتمُونَ مَا اَنزلنا	۱۵۹	بقرہ	الا الذین تابوا واصلحوا	۱۶۰
	″	من البینات		″	وَبیّنُوا	
۶	″	اِنّما حرّمَ علیکُمُ المیتۃَ وَالدّمَ	۱۷۲	حدیث	قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم احلت لنا میتتانِ ودمان	
۷	″	کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ	۱۷۷	مائدہ	وَکتبنا علیھم فیھا انّ النّفس	۴۵
	″	الحر بالحر			بالنّفس	
۸	″	کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت	۱۸۰	نساء	یوصیکم اللہ فی اولادکم لِلذّکرِ مثل حظ	۱۱
۹	″	یاایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام	۱۸۲	بقرہ	احل لکم لیلۃ الصیام الرفث اِلی نساء کم	۱۸۷
۱۰	″	وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعامِ	۱۸۴	بقرہ	فمن شھد منکم الشھر	۱۸۵
	″	مسکین		″	فلیصمہُ	

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱۱	بقرہ	قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم لاتعتدوا	۱۹۰	توبہ	فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم	۵
۱۲	״	ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلوکم	۱۹۱	بقرہ	فان قاتلوکم فاقتلوھم	۱۹۱
۱۳	״	فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم	۱۹۳	توبہ	آیۃ سیف	۵
۱۴	״	لا تحلقوا رؤسکم حتیٰ یبلغ الھدی محلہ	۱۹۶	بقرہ	فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ	۱۹۶
۱۵	״	یسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم	۲۱۵	توبہ	انما الصدقات للفقراء والمساکین	۶۰
۱۶	״	یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ	۲۱۷	توبہ	آیۃ السیف	۵
۱۷	״	یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو	۲۱۹	توبہ	خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم	۱۰۳
۱۸	״	یسئلونک عن الخمر والمیسر	۲۱۹	بقرہ	واثمھما اکبر من نفعھما	۲۱۹
۱۹	״	ولا تنکحوا المشرکات حتیٰ یؤمن	۲۲۱	مائدہ	والمحصنات من المومنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب	۵
۲۰	״	وبعولتھن احق بردھن فی ذالک	۲۲۸	بقرہ	الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح	۲۲۹
۲۱	״	ولا یحل لکم ان تاخذوا مما آتیتموھن	۲۲۹	״	الا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ	۲۲۹
۲۲	״	والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین	۲۳۳	״	فان ارادا فصالا عن تراض منھما وتشاور فلا جناح	۲۳۳
۲۳	״	والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیۃ	۲۴۰	״	والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن	۲۳۴
۲۴	״	لا اکراہ فی الدین	۲۵۶	توبہ	آیۃ سیف	۵
۲۵	״	اشھدوا اذا تبایعتم	۲۸۲	بقرہ	فان امن بعضکم بعضا فلیؤد الذی اؤتمن	۲۸۳
۲۶	״	وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم	۲۸۴	״	لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا	۲۸۶
۱	آل عمران	وان تولوا فانما علیک البلاغ	۲۰	توبہ	آیۃ سیف	۵
۲ ۳ ۴	״	کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم ۔ ۳ آیتیں	۸۶ ۸۷ ۸۸	آل عمران	الا الذین تابوا من بعد ذالک واصلحوا	۸۹

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	اللہ کے ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۵	آل عمران	یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ	۱۰۲	تغابن	فاتقوا اللہ ما استطعتم	۱۶
۱	نساء	واذا حضر القسمۃ اولوالقربیٰ والیتامیٰ	۸	نساء	یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ	۱۱
۲	نساء	ولیخش الذین لو ترکوا من خلفہم	۹	بقرہ	فمن خاف من موص جنفا او اثما	۱۸۲
۳	نساء	ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ	۱۰	نساء	ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف	۶
۴	〃	واللاتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم	۱۵	حدیث	قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خذوا عنی الشیب بالشیب	
۵	〃	والذان یاتیانہا منکم فاٰذوہما	۱۶	نور	الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد	۲
۶	〃	انما التوبۃ علی اللہ للذین یعملون	۱۷	نساء	ولیست التوبۃ للذین یعملون	۱۸
۷	〃	یا ایها الذین اٰمنوا لا یحل لکم ان ترثوا	۱۹	〃	الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ	۱۹
۸	〃	انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا	۲۲	〃	الا ما قد سلف	۲۲
۹	〃	الا ما قد سلف۔	۲۳	〃	ان تجمعوا بین الاختین	۲۳
۱۰	〃	فما استمتعتم بہ منہن فاٰتوہن	۲۴	حدیث	قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی کنت احللت	
۱۱	〃	یا ایها الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم۔	۲۹	نور	لیس علی الاعمیٰ حرج ولا علی المریض۔	۶۱
۱۲	〃	والذین عقدت ایمانکم فاٰتوہم نصیبہم	۳۳	انفال	واولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض	۷۵
۱۳	〃	فاعرض عنہم وعظہم	۶۳	توبہ	آیت السیف	۵
۱۴	توبہ	استغفر لہم او لا تستغفر لہم	۸۰	نساء	واذ ظلموا انفسہم جاؤک	۶۴
۱۵	〃	یا ایها الذین اٰمنوا خذوا حذرکم	۷۱	〃	وما کان المومنون لینفروا کافۃ	
۱۶	〃	ومن تولیٰ فما ارسلناک حفیظا	۸۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱۷	〃	فاعرض عنہم وتوکل علی اللہ	۸۱	〃	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱۸	توبہ	اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ	۹۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱۹	//	ستجدون آخرین یریدون ان یامنوکم	۹۱	//	آیت سیف	۵
۲۰	//	فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ	۹۲	//	بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ	۱
۲۱	//	ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ	۹۳	نساء	اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ	۱۱۶
۲۲	//	ان المنافقین فی الدرک الاسفل	۱۴۵	//	اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا	۱۴۶
۲۳	//	فما لکم فی المنافقین فئتین	۸۸	توبہ	آیت سیف	۵
۲۴	//	فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک	۸۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	مائدہ	لا تحلوا شعائر اللہ	۲	توبہ	آیت سیف	۵
۲	//	فاعف عنہم	۱۳	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللہ	۲۹
۳	//	انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ	۳۳	مائدہ	اِلَّا الذین تابوا من قبل اَنْ تَقْدِرُوْا	۳۴
۴	//	فان جاؤک فاحکم بینہم او اعرض عنہم	۴۲	مائدہ	وَاَنِ احْکُمْ بینہم بما انزل اللہ	
۵	//	ما علی الرسول الا البلاغ	۹۹	توبہ	آیت سیف	۵
۶	//	یا ایہا الذین آمنوا علیکم انفسکم	۱۰۵	مائدہ	اِذَا اهْتَدَیْتُمْ	۱۰۵
۷	//	شہادۃ بینکم	۱۰۶	طلاق	وَاَشْهِدُوْا ذوی عدل منکم	۲
۸	//	فَاِنْ عُثِرَ عَلٰی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا اِثْمًا	۱۰۷	طلاق	وَاَشْهِدُوْا ذوی عدل منکم	۲
۹	//	ذالک ادنی ان یاتوا بالشہادۃ	۱۰۸	طلاق	وَاَشْهِدُوْا ذوی عدل منکم	۲
۱	الانعام	قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم	۱۵	فتح	لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ من ذنبک	۲
۲	//	اذا رایت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض	۶۸	نساء	فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث	۱۴۰
۳	//	وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ من حسابہم من شیء	۶۹	نساء	فَلَا تَقْعُدُوْا معہم حتی یخوضوا فی حدیث	۱۴۰
۴	//	وَذَرِ الَّذِیْنَ اتخذوا دینہم لعبا ولہوا	۷۰	توبہ	قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا	۲۹
۵	//	ثُمَّ ذرہم فی خوضہم یَلْعَبُوْنَ	۹۲	توبہ	آیت سیف	۵
۶	//	فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ عَمِیَ فعلیہا	۱۰۵	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۷	الانعام	واعرض عن المشرکین	۱۰۷	توبہ	آیت سیف	۵
۸	//	وما جعلناک علیہم حفیظا وما انت علیہم	۱۰۸	//	آیت سیف	۵
۹	//	ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ	۱۰۹	//	آیت السیف	۵
۱۰	//	فذرھم وما یفترون	۱۲۸	//	آیت سیف	۵
۱۱	//	لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ	۱۲۲	مائدہ	الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین	۵
۱۲	//	یا قوم اعملوا علی مکانتکم	۱۳۶	توبہ	آیت سیف	۵
۱۳	//	ان الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعا	۱۶۰	//	آیت السیف	۵
۱	الاعراف	وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ	۱۸۰	توبہ	آیت السیف	۵
۲	//	واعرض عن الجاھلین	۱۹۹	توبہ	آیت السیف	۵
۱	الانفال	یسئلونک عن الانفال	۱	انفال	واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ	۴۱
۲	//	وما لہم الا یعذبہم	۳۳	//	وما کان اللہ لیعذبہم	۳۳
۳	/	قل للذین کفروا ان ینتہوا یغفر لہم	۳۸	بقرہ	وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ	
۴	//	وان جنحوا للسلم فاجنح لہا	۶۱	توبہ	قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر	۲۹
۵	//	ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا	۶۵	انفال	الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا۔	۶۶
۶	//	والذین آمنوا ولم یہاجروا لکم	۷۲	//	واولوا الارحام بعضہم اولی ببعض	۷۵
۱	توبہ	براءۃ من اللہ ورسولہ	۱	توبہ	آیۃ السیف	۵
۲	//	والذین یکنزون الذھب والفضۃ	۳۴	بقرہ	وآتوا الزکاۃ	۴۳
۳	//	الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما	۳۹	توبہ	وما کان المومنون لینفروا کافۃ	۲۲
۴	//	عفا اللہ عنک لم اذنت لہم	۴۳	نور	فاذا استاذنوک لبعض شانہم فاذن لمن شئت	۶۲
۵	//	استغفر لہم	۸۰	منافقون	سواء علیہم استغفرت لہم ام لم تستغفر	۶
۶ ۷	//	الاعراب اشد کفرا ونفاقا ومن الاعراب من یتخذ	۹۷ ۹۸	توبہ	ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الآخر	۹۹

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	یونس	انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم	۱۵	فتح	لیغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر	۲
۲	″	قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین	۱۰۲	توبہ	آیۃ سیف	۵
۳	″	وان کذبوك فقل لی عملی ولکم عملکم	۴۱	″	آیۃ سیف	۵
۴	″	فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ	۱۰۸	″	آیۃ سیف	۵
۱	ھود	من کان یرید الحیات الدنیا وزینتھا	۱۵	اسراء	من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء	۱۸
۲	″	وقل للذین لا یومنون اعملو	۱۲۱	توبہ	آیت السیف	۵
۳	″	وانتظروا انا منتظرون	۱۲۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	رعد	فانما علیك البلاغ	۴۰	توبہ	آیت السیف	۵
۲	″	وان ربك لذو مغفرت للناس	۶	نساء	ان الله لا یغفر ان یشرك	۱۱۶
۱	ابراہیم	وان تعدوا نعمۃ الله لا تحصوھا ان الانسان	۳۴	نحل	ان تعدوا نعمۃ الله لا تحصوھا ان الله لغفور رحیم	۱۸
۱	حجر	ذرھم یاکلوا ویتمتعوا	۳	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	فاصفح الصفح الجمیل	۸۵	″	آیت سیف	۵
۳	″	لا تمدن عینیك الی ما متعنا	۸۸	″	آیت سیف	۵
۴	″	قل انی انا النذیر المبین	۸۹	″	آیت سیف	۵
۵	″	فاصدع بما تومر واعرض عن	۹۴	″	آیت سیف	۵
۱	نحل	تتخذون منہ سکرا ورزقا حسنا	۶۷	اعراف	قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن	۳۳
۲	″	فانما علیہ البلاغ	۸۲	توبہ	آیت السیف	۵
۳	″	من کفر بالله من بعد ایمانہ	۱۰۶	نحل	الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان	۱۰۶
۴	″	وجادلھم	۱۲۵	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	نمبر آیت	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۵	نحل	واصبر	۱۲۷	توبہ	آیت سیف	۵
۱	اسراء	رب ارحمهما كما ربياني صغيرا	۲۴	توبہ	ما كان للنبي والذين آمنوا أن يستغفروا	۱۱۳
۲	〃	وما ارسلناك عليهم وكيلا	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	قل ادعوا الله او ادعوا الرحمن	۱۱۰	اعراف	واذكر ربك في نفسك تضرعا وخفيا	۲۰۵
۱	مریم	وانذرهم يوم الحسرة	۳۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	يلقون غيا	۵۹	شعرا	الا من تاب وآمن وعمل	۶۰
۳	〃	قل من كان في الضلالة فليمدد له الرحمن	۷۵	توبہ	آیت سیف	۵
۴	〃	فلا تعجل عليهم	۸۴	〃	آیت سیف	۵
۵	〃	فخلف من بعدهم خلف	۵۹	مریم	الا من تاب وآمن	۶۰
۱	کہف	فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر	۲۹	تکویر	الا ان يشاء الله	۲۹
۱	طٰہٰ	ولا تعجل بالقرآن من قبل	۱۱۴	اعلیٰ	سنقرئك فلا تنسى	۶
۲	〃	فاصبر على ما يقولون	۱۳۰	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	قل كل متربص فتربصوا	۱۳۵	توبہ	سیف	۵
۱	انبیاء	انكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم	۹۸	انبیاء	ان الذين سبقت لهم منا الحسنى	۱۰۱
۲	〃	وكل فيها خالدون	۹۹	〃	ان الذين سبقت لهم منا الحسنى	۱۰۱
۱	حج	وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي	۵۲	اعلیٰ	سنقرئك فلا تنسى	۶
۲	〃	يحكم بينهم	۵۶	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	مومنون	فذرھم فی غمرتھم حتی حین	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	ادفع بالتی ھی احسن	۹۶	توبہ	سیف	۵
۱	نور	ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا	۴	نور	الا الذین تابوا	۵
۲	″	الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ	۳	نور	وانکحوا الایامی منکم	۳۲
۳	″	والذین یرمون ازواجھم ولم یکن لھم شھداء	۶	نور	والخامسۃ ان غضب اللہ علیھا	۹
۴	″	لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم	۲۷	نور	لیس علیکم جناح ان تدخلوا بیوتا	۲۹
۵	″	وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن	۳۱	نور	والقواعد من النساء	۶۰
۶	″	فانما علیہ ما حمل وعلیکم ما حملتم	۵۴	توبہ	آیت سیف	۵
۷	″	یا ایھا الذین امنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم	۵۸	توبہ	اذا بلغ الاطفال منکم الحلم	۵۹
۱	فرقان	والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر (الی) ویخلد فیہ مھانا	۶۸	فرقان	الا من تاب وامن وعمل عملا صالحا	۷۱
۲	″	واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما	۶۳	توبہ	آیت سیف	۵
۱	شعرا	والشعراء یتبعھم الغاوون	۲۲۵	شعرا	الا الذین امنوا وعملوا الصالحات	۲۲۷
۱	نمل	وان اتلو القرآن	۹۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	قصص	لنا اعمالنا ولکم اعمالکم	۵۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	عنکبوت	ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن	۴۶	توبہ	آیت سیف	۵
۱	روم	فاصبر ان وعد اللہ حق	۶۰	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	الکا ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۱	لقمان	وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهُ	۲۳	توبہ	آیت سیف	۵
۱	سجدہ	فاعرض عنهم وانتظر انهم منتظرون	۳۰	توبہ	آیت سیف	۵
۱	احزاب	ولا تطع الكافرين والمنافقين ودع اذاهم وتوكل على الله	۴۸	توبہ	آیت السیف	۵
۲	"	لا يحل لك النساء من بعد	۵۲	احزاب	يا ايها النبي انا احللنا لك ازواجك	۵۰
۱	سبا	قل لا تسألون عما اجرمنا ولا نسأل	۲۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	صافات	فتول عنهم حتى حين	۱۷۴	توبہ	آیت سیف	۵
۲	"	وابصرهم فسوف يبصرون	۱۷۵	"	آیت سیف	۵
۳	"	وتول عنهم حتى حين	۱۷۸	"	آیت سیف	۵
۴	"	وابصر فسوف يبصرون	۱۷۹	"	آیت سیف	۵
۱	ص	ان يوحى الي الا انما انا نذير	۷۰	توبہ	آیت سیف	۵
۲	"	ولتعلمن نبأه بعد حين	۸۸	"	آیت سیف	۵
۱	زمر	ان الله يحكم بينهم فيما هم فيه يختلفون	۳	توبہ	آیت سیف	۵
۲	"	قل اني اخاف ان عصيت	۱۳	فتح	ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك	۲
۳	"	فاعبدوا ما شئتم	۱۵	توبہ	آیت سیف	۵
۴	"	ومن يضلل الله فما له من هاد	۲۳	"	آیت سیف	۵
۵	"	قل يا قوم اعملوا على مكانتكم	۳۹	"	آیت سیف	۵
۶	"	انت تحكم بين عبادك فيما كانوا	۴۶	"	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۷	زمر	فمن اهتدى فلنفسه ومن ضل	۴۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	المومن	فاصبر ان وعد الله حق	۵۵	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	فاما نرينهم بعض الذي نعدهم	۷۷	″	آیت سیف	۵
۱	فصلت	ولا تستوي الحسنة ولا السيئة	۳۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	الشوریٰ	و يستغفرون لمن في الارض	۵	مومن	وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ	۷
۲	″	الله حفيظ عليهم وما انت عليهم بوكيل	۶	توبہ	آیت سیف	۵
۳	″	فلذلك فادع واستقم كما امرت	۱۵	″	قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله ولا باليوم	۲۹
۴	″	من كان يريد حرث الآخرة نزد له	۲۰	اسراء	من كان يريد العاجلة عجلنا له	۱۸
۵	″	قل لا اسئلكم عليه اجرا الا المودة في	۲۳	سبا	قل لا اسئلكم عليه من اجر فهو لكم	۴۷
۶	″	والذين اذا اصابهم البغي هم	۳۹	شوریٰ	وَلَمَنْ صَبَرَ وغفر ان ذلك لمن عزم	۴۳
۷	″	وَلَمَنِ انتصر بعد ظلمه فاولئك	۴۱	توبہ	وَلَمَنْ صَبَرَ وغفر ان ذلك لمن عزم	۴۳
۸	″	فَاِنْ اَعْرَضُوْا فما ارسلناك عليهم حفيظا	۴۸	″	آیت سیف	۵
۱	زخرف	فذرهم يخوضوا ويلعبوا	۸۳	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	فاصفح عنهم وقل سلام	۸۹	″	آیت سیف	۵
۱	دخان	فارتقب انهم مرتقبون	۵۹	توبہ	آیت سیف	۵
۱	جاثیہ	قل للذين امنوا يغفروا للذين لَا يَرْجُوْنَ	۱۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	احقاف	وما ادري ما يُفْعَلُ بِيْ ولا بكم	۹	فتح	انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله	۲

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۲	احقاف	فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل	۳۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	سورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً	۴	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ق	فاصبر علی ما یقولون	۳۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	وما انت علیهم بجبار	۴۵	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ذاریات	وفی اموالهم حق للسائل	۱۹	بقرہ	واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ	۴۳
۲	″	فتول عنهم فما انت بملوم	۵۴	ذاریات	وذکر فان الذکری تنفع المومنین	۵۵
۱	طور	واصبر لحکم ربک فانک باعیننا	۴۸	توبہ	آیت سیف	۵
۱	نجم	فاعرض عمن تولی	۲۹	توبہ	آیت سیف	۵
۲	″	وَاَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی	۳۹	طور	وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ	۲۱
۱	واقعہ	ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۱۳ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ	۱۴	واقعہ	ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۳۹ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ	۴۰
۱	مجادلہ	یا ایها الذین امنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی	۱۲	مجادلہ	ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم	۱۳
۱	ممتحنہ	لا ینهاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین	۸	ممتحنہ	انما ینهاکم اللہ عن الذین قاتلوکم	۹
۲	″	اذا جاءکم المومنات مهاجرات	۱۰	″	فلا ترجعوهن الی الکفار	۱۰
۳	″	وان فاتکم شیء من ازواجکم الی الکفار	۱۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	ن قلم	فذرنی ومن یکذب بهذا الحدیث	۴۴	توبہ	آیت سیف	۵

نمبر شمار	نام سورت	منسوخ آیتیں	آیت نمبر	نام سورت	ان کی ناسخ آیتیں	آیت نمبر
۲	ن قلم	فاصبر لحکم ربک	۴۸	توبہ	آیت سیف	۵
۱	معارج	فذرھم یخوضوا ویلعبوا	۴۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	جن	قل انی لا املک لکم ضرا	۲۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	مزمل	قم اللیل	۲	مزمل	الا قلیلا	۲
۲	〃	واھجرھم ھجرا جمیلا	۱۰	توبہ	آیت سیف	۵
۳	〃	وذرنی والمکذبین	۱۱	توبہ	آیت سیف	۵
۴	〃	فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا	۱۹	دھر	وما تشاءون الا ان یشاء اللہ	۳۰
۱	مدثر	ذرنی ومن خلقت وحیدا	۱۱	توبہ	آیت سیف	۵
۱	قیامت	لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ	۱۶	اعلیٰ	سنقرئک فلا تنسیٰ	۶
۱	دھر الانسان	فاصبر لحکم ربک ولا تطع منھم اثما او کفورا	۲۴	توبہ	آیت سیف	۵
۲	〃	ان ھذہ تذکرہ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا	۲۹	توبہ	آیت سیف	۵
۱	عبس	کلا انھا تذکرہ فمن شاء ذکرہ	۱۱	تکویر	وما تشاءون الا ان یشاء اللہ رب العالمین	۲۹
۱	طارق	فمھل الکافرین امھلھم رویدا	۱۷	توبہ	آیت سیف	۵
۱	غاشیہ	لست علیھم بمسیطر	۲۲	توبہ	آیت سیف	۵
۱	والتین	الیس اللہ باحکم الحاکمین	۸	〃	آیت سیف	۵
۱	عصر	ان الانسان لفی خسر	۲	عصر	الا الذین امنوا وعملوا الصالحات	۳
۱	کافرون	لکم دینکم ولی دین	۶	توبہ	آیت سیف	۵

یہ تھی نسخ کی مکمل تفصیل۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ نسخ واقعی حقیقت ہے۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ نسخ آیاتِ قرآنیہ کی چاروں قسمیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ رجم کی آیت بھی حکماً موجود ہے لفظاً و تلاوۃً منسوخ ہے۔ اگر اس آیتِ مشہورہ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّةَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ کا انکار کر دیا جائے تو سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰٓی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کا بھی انکار لازم آئے گا۔ کیونکہ اس آیتِ رجم کے بغیر اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ضد بازی اور جہالت سے تنسیخ کے انکار کو ہم نہیں روک سکتے۔ ورنہ حقیقت میں تنسیخ کا انکار ناممکن ہے۔ پھر خیال رہے حکم کے نسخ کی تین قسمیں اس طرح بھی ہیں کہ ۱ وجوبی حکم کا نسخ ۲ حکمِ جوازی کا نسخ ۳ حکم استحبابی کا نسخ کا۔ مثلاً پہلے آیت منسوخ میں ایک حکم بجالانا فرض تھا۔ ناسخ آیت نے صرف فرضیت منسوخ کی مگر جواز باقی رہا۔ اسی طرح منسوخ آیت میں ایک حکم تھا۔ ناسخ نے اس کا جواز ہی ختم کر دیا۔ اب وہ کام کرنا جائز ہی نہ رہا۔ اسی طرح پہلے کسی آیت میں ایک مستحب کیا گیا تھا دوسری آیت نے اس کا استحباب ختم کر دیا کہ اب وہ کام کرنا نہ کرنا برابر ہے یا نہ کرنا مستحب ہو گیا کرنا بھی صرف جائز رہا۔ یہ تفصیل علماءِ کرام سے پوچھی جا سکتی ہے تفاسیر میں مرقوم ہے۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح آیت کا کلام منسوخ ہوتا ہے کبھی صرف حکم وغیرہ۔ اسی طرح کبھی صرف عمومیت منسوخ ہوتی کبھی آدھا حکم۔ کبھی ایک آیت آدھی آیت کو منسوخ کبھی پوری کو کبھی ایک آیت بہت سی آیات کو کبھی دو ناسخ آیتیں ایک آیت کو منسوخ کرتی ہیں۔ یہ تفصیل بھی تفاسیر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اگر ہماری یہ ساری تفصیلی گفتگو ذہن نشین رہی تو انشاء الرحمٰن جل جلالہ۔ کبھی کوئی منکرِ احادیث بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے پر ایمان لانے کے بعد رجم زانی کا قانون بخوبی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر مزید تسلی کے لیے یہ تیسری بات تفصیلاً بیان کرنا ضروری ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں سزاؤں کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کا ثبوت کس طرح ہے۔ تو خیال رہے۔ سزاؤں کی شریعت میں صرف تین قسمیں ہیں ۱ حد ۲ تعزیر ۳ قصاص۔ حد وہ سزا ہے جو قرآن مجید یا حدیثِ پاک یا دونوں سے ثابت ہو یا اجماعِ صحابہ سے ثابت ہو یا ان تینوں سے ثابت ہو۔ چنانچہ ہدایہ اولین حاشیہ صـ۵۱۳ پر ہے :- الحد وھی الزواجر المقدرۃ الثابتۃ بالکتاب او السنۃ او الاجماع۔

اور فتاویٰ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۳ پر ہے۔ مُقَدَّرَۃٌ اَیْ مُبَیَّنَۃٌ بِالْکِتَابِ اَوِ السُّنَّۃِ اَوِ الْاِجْمَاعِ :- ترجمہ۔ سزا حد :- قرآنِ مجید اور حدیثِ پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہوتی ہے۔ حد وہ سزا ہے جو بالکل مقرر و معین ہو ذرہ برابر کسی کی رائے یا سفارش سے نہ کم ہو سکے نہ زیادہ۔ اور نصِ قطعی سے ثابت ہو۔ چنانچہ فتاویٰ بحر الرائق جلد پنجم صـ۲ پر اور فتاویٰ فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱۲ اور شامی شریف جلد سوم صفحہ نمبر ۱۹۲ ہدایہ اولین صفحہ نمبر ۴۸۵ اور فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صـ۱۴۲ پر ہے وَالْحَدُّ فِی الشَّرِیْعَۃِ الْعُقُوْبَۃُ الْمُقَدَّرَۃُ حَقًّا لِلّٰہِ تَعَالٰی :- (ترجمہ) شریعت پاک میں حد اس

سزا کو کہتے ہیں جو بالکل مقرر اور صرف حق اللہ ہو۔ فقہ شافعی حاشیہ نہ بجوری جلد دوم ص۲۶۵ پر ہے:۔ فَاِنَّ الشَّارِعَ قَدَّرَهَا فَلَا یُزَادُ عَلَیْهَا وَلَا یُنْقَصُ (ترجمہ):۔ اہلِ شریعت یعنی مالک شریعت نے اس سزا کا اندازہ مقرر کر دیا اب نہ زیادہ کی جا سکتی ہے نہ کم۔ دوسری سزا یعنی تعزیر۔ عَزْرٌ سے مشتق ہے۔ اس کا لغوی ترجمہ ہے جھڑکنا ذلیل کرنا۔ شریعت میں اس سزا کو تعزیر کہا جاتا ہے جو قرآن حدیث نے مقرر نہ کی ہو بلکہ حاکمِ اسلام کی مرضی پر ہو۔ چنانچہ فتح القدیر جلد چہارم ص۲۱۱ پر ہے۔ اَلزَّوَاجِرُ الَّتِیْ دُوْنَهَا فِی الْقَدْرِ وَقُوَّةِ الدَّلِیْلِ وَهُوَ التَّعْزِیْرُ وَهُوَ تَادِیْبٌ دُوْنَ الْحَدِّ وَاَصْلُهٗ مِنَ الْعَزْرِ بِمَعْنَی الرَّدِّ وَالرَّدْعِ۔ (ترجمہ):۔ وہ سزائیں جو دلائل اور مقدار میں حد کی مثل نہ ہوں وہ تعزیر ہے۔ مقصود صرف ادب سکھانا اور جرم روکنا ہو اس کا اصلی یعنی لغوی معنیٰ ہے عزر یعنی ذلیل کرنا جھڑکنا۔ تعزیری سزا کتاب اللہ سے بھی ثابت ہے اور حدیث پاک سے بھی:۔

اور حاکم وقت اپنی مرضی سے بھی حسبِ حالات مقرر کر سکتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے۔ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ۔ ترجمہ:۔ نافرمان بیویوں کو یا نصیحت سے سمجھاؤ یا اُن سے بول چال بند کر دو انہیں بستروں میں چھوڑ رکھو اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ان کو مارو۔ یہ آیت تعزیری سزا کو ثابت کر رہی ہے۔ اور واؤ بمعنیٰ اَوْ ہے۔ تعزیر پر عمل واجب نہیں ہوتا حالات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہے۔ اسی لیئے تعزیر کی مقدار کبھی مقرر نہیں ہوتی۔ فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۱۲ پر ہے:۔ اَنَّهٗ لَیْسَ فِیْهِ شَیْءٌ مُقَدَّرٌ بَلْ مُفَوَّضٌ اِلٰی رَاْیِ الْقَاضِیْ:۔ (ترجمہ):۔ بے شک وہ سزا جس کو اسلام نے مقدارِ معین سے بیان نہ کیا بلکہ حاکم کی رائے کے سپرد کیا وہ تعزیر۔ اسی طرح جس سزا کی تقسیم کر دیں کہ یا یہ یا وہ بھی تعزیر ہے۔ جیسے کہ مندرجہ بالا آیت میں نافرمان بیویوں کی سزا کو تعزیر بنایا۔ اور جس طرح تارکینِ زکوٰۃ یا سود خوروں کی سزا کا اس طرح ذکر ہو البقرہ آیت ۲۷۹ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ۔ اسی طرح سورہ مائدہ آیت ۳۳ میں سزا تقسیم ہے چونکہ یہاں بھی سزا منقسمہ ہو گئی اس لیئے یہ تعزیر ہوئی نہ کہ حد۔ تیسری سزا قصاص ہے۔ یہ لفظ قَصْصٌ سے بنا ہے۔ اس کا لغوی ترجمہ ہے۔ مجرم کا پیچھا کرنا (از غریب القرآن ص۳۰۰ و مجمع البحار جلد دوم ص۲۰۱) اور شرعی ترجمہ ہے۔ کسی انسان کو جسمانی نقصان پہنچانے والے مجرم کو اسی قسم کی سزا دینی جیسا اس نے نقصان کیا خواہ گردن کاٹے یا ہاتھ پاؤں۔ ناک کان یا مجرم جسم پر زخم لگائے۔ حدود خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ تعزیر بندوں کا بھی حق ہے اور حق اللہ بھی۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی معاشرے کے جرم سیاسی جرم سب اس میں شامل ہیں۔ قصاص صرف انفرادی حق العبد ہے۔ اسی لیئے حدود سزائیں مقداراً مقرر ہیں اور کسی کے معاف کرانے سے حاکم معاف نہیں کر سکتا۔ قصاص کی مقدار مقرر تو ہے مگر والی وارث یا خود مظلوم مجروح دیت بھی لے سکتا ہے معاف بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۴۳ پر ہے:۔ وَالْحَدُّ فِی الشَّرِیْعَةِ الْعُقُوْبَةُ الْمُقَدَّرَةُ

حَقًّا لِلّٰہِ تعالیٰ حَتّٰی لَا یُسَمَّی الْقِصَاصُ حَدًّا لِمَا اَنَّہٗ حَقُّ الْعَبْدِ وَلَا التَّعْزِیْرُ۔ (ترجمہ) :- حد خالص اللہ کا حق ہے اسی لیئے مقدار معین ہے قصاص کو حد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ حق العبد ہے تعزیر بھی حد نہیں ہو سکتی کیونکہ معین نہیں۔ خیال رہے کہ اللہ رب العزت کے خالص حق شات ہیں۔ ایک عقائد میں پانچ عبادات میں اور ایک سزاؤں میں جن کی فہرست علی الترتیب اس طرح ہے۔ ۱ ایمان لانا۔ ۲ نماز ۳ زکوٰۃ ۴ روزہ ۵ حج ۶ جہاد ۷ شرعی حدود سے سزائیں۔ تعزیری سزائیں تو بے شمار ہیں اور جرموں کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر حدود کی سزائیں صرف پانچ قسم کی ہیں۔

پہلی قسم :- حدِ زنا یہ سزا سب سے بڑی ہے کیونکہ جرم سب سے بڑا ہے۔ اسی لیئے یہ سزا قرآن مجید، حدیث پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے، قرآن مجید سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ اس کا صرف حکم وجوبی اور مقدار ثابت ہے۔ حدیث پاک سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ حکم وجوبی بھی مقدار بھی اور عمل بھی حدیث سے ثابت ہو۔ اجماعِ صحابہ سے ثابت ہونے کا مطلب ہے کہ فیصلہ اور عمل اس پر جاری رہے۔ کبھی عمل بند نہ ہو۔ اگر کسی سزا کا عمل کسی دور میں بند ہو گیا تو وہ تعزیر ہو گی۔ ۲ حدِ قذف ۳ چوری کی حد ۴ شراب پینے کی حد ۵ ڈکیتی کی حد۔ حدِ قذف صرف قرآن مجید سے ثابت ہے عمل حدیث پاک سے۔ چنانچہ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ سورت نور آیت ۴ پارہ ۱۸ پر ہے :- وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً (الخ) :- ترجمہ :- جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمتیں لگا دیتے ہیں اور گواہی چار عدد بھی پیش نہیں کر سکتے ان کو اسی کوڑے مارو۔ چوری کی حد بھی حدیث و قرآنِ پاک دونوں سے ثابت ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے سورہ مائدہ آیت ۳۸ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا ترجمہ :- چور اور چورنی کا ہاتھ کاٹو۔ کلائی نہ کہ فقط انگلیاں کیونکہ اصطلاحی ہاتھ کلائی سے ہے۔ حدیث پاک یہ ہے۔ تُقْطَعُ الْیَدُ فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ فَصَاعِدًا۔ ترجمہ سونے کی اشرفی کے چوتھائی حصہ چوری کرنے سے یا اس کے زیادہ چوری کرنے سے ہاتھ کاٹا جائے گا :- اجماعِ صحابہ سے بھی یہ حد ثابت ہے۔ شراب پینے کی حد صرف اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ المغنی قدامہ جلد نہم صفحہ ۱۵۸ پر ہے :- ثُمَّ سَاَلَ عُمَرُ عَنِ الْحَدِّ فِیْھَا فَقَالَ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اِذَا شَرِبَ ھَذٰی وَاِذَا ھَذٰی اِفْتَرٰی فَاجْلِدُوْہُ ثَمَانِیْنَ فَجَلَدَہٗ عُمَرُ ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً اور اسی صفحہ پر کچھ پہلے ہے :- وَاَقَامُوْا عَلَیْھِمُ الْحَدَّ لِشُرْبِھِمْ اِیَّاھَا فَرَجَعُوْا اِلٰی ذٰالِکَ فَانْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ :- ترجمہ :- حضرت فاروق اعظم نے مولیٰ علی سے پوچھا کہ شرابی کی حد کیا ہے تو آپ نے اس کو قذف اور تہمت پر قیاس کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو ھذیان بکتا ہے اور ھذیان میں لوگوں اور اللہ پر تہمتیں لگاتا ہے۔

لہٰذا شرابی کو اسّی کوڑے لگاؤ تب فاروق اعظم نے شرابی کو اسّی کوڑے کی حد لگائی۔ اور پھر سب صحابہ نے یہی سزا مقرر مقدار سے جاری رکھی اسی پر سب قائم رہے۔ اسی کی طرف سب نے رجوع فرمایا۔ پس اجماع صحابہ منعقد ہو گیا اور فتاویٰ فتح القدیر جلد چہارم صـ۱۱۳ پر ہے :۔ وَالشُّرْبُ وَاِنْ كَثُرَ فَلَيْسَ حَدُّهُ بِتِلْكَ الْقَطْعِيَّةِ :۔ (ترجمہ) شراب اگرچہ بہت لوگ پیتے ہیں۔ لیکن اِس کی حد قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ ڈکیتی کی حد صرف حدیثِ مشہورہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ کتب حدیث سے ثابت ہے کہ قبیلہ بنی عرینہ کے ڈاکوؤں کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حد کی سزا اس طرح دی کہ اُن کے ہاتھ بھی کاٹے اور پیر بھی یہ ان کے ڈاکے کی سزا تھی اور انہوں نے قتل بھی کیا تھا لہٰذا اُن کی آنکھیں پھوڑ کر ان کو صحرا میں ڈلوا دیا۔ ہماری اس تمام گفتگو سے ثابت ہوا کہ حد شرعی صرف قرآن مجید سے ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ احادیث اور اجماع صحابہ سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اور ثبوت حد کے لیے حدیث مشہورہ کافی ہے۔ چنانچہ فتح القدیر جلد چہارم صـ۱۱۲ پر ہے :۔ وَالزَّوَاجِرُ الْمُقَدَّرَةُ الثَّابِتَةُ بِالْكِتَابِ اَوِ السُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ :۔ (ترجمہ) :۔ مقررہ مقدار والی سزائیں یعنی یہی حدودِ خمسہ قرآن مجید سے یا حدیث مشہورہ سے ثابت ہیں۔ خواہ وہ لفظاً خبرِ واحد ہو مگر معناً مشہور ہو نا یا متواتر ہونا کافی ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ ہم نے ثابت کر دیا کہ حدود علاوہ قرآنِ مجید، حدیث پاک اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہماری یہ بات کوئی منکرِ حدیث تسلیم نہ کرے تو وہ اسلام کی پانچ حدیں ثابت نہیں کر سکتا۔ شرابی کی سزا قرآن اور ڈاکو کی سزا قرآن مجید میں کس طرح ڈھونڈو گے۔ پھر منکرین حدیث یہ کیسے ثابت کریں گے کہ حد والی سزائیں صرف قرآنِ کریم میں ہی ہیں۔ چکڑالوی پرویز کہتا ہے کہ ہم کو قرآن سے رجم دکھاؤ مگر میں کہتا ہوں کہ ہم کو یہ قرآن سے دکھاؤ کہ فقط قرآن مجید سے حدِ شرع ثابت ہو گی۔ پرویزیوں کی یہ بات کہ شرعی مقداری حد والی سزائیں صرف قرآن مجید ہی سے ثابت ہوتی ہیں یہ بات بالکل غلط ہے اور دین میں افترا و کذب بیانی ہے۔ اسلام میں صرف پانچ سزائیں حدیں جن کا نقشہ اس طرح ہے :۔

۵	۴	۳	۲	۱
ڈاکو کی حد (قطاع الطریق) ثبوت۔ حدیث پاک	حدِ شرب (شراب) ثبوت اجماعِ صحابہ	حدِ سارق (چوری) ثبوت قرآن کریم حدیث پاک	حدِ قذف (تہمت) ثبوت قرآن مجید سے	حدِ زنا ثبوت۔ قرآن حدیث اجماعِ صحابہ

ان پانچ حدوں کا فائدہ صاحب شرح وقایہ نے اس طرح بیان فرمایا۔ جلد اول حاشیہ چلپی ع۳ صـ۱۵۴ پر ہے، اَنَّ الْحِكْمَةَ فِيْ شَرْعِيَّةِ حَدِّ الزِّنَا صِيَانَةُ الْاَنْسَابِ وَفِيْ حَدِّ الْقَذْفِ صِيَانَةُ الْاَعْرَاضِ وَفِيْ

حَدِّ الشُّرْبِ صِيَانَةُ الْعُقُوْلِ وَفِیْ حَدِّ السَّرِقَةِ صِيَانَةُ الْاَمْوَالِ وَفِیْ حَدِّ قُطَّاعِ الطَّرِيْقِ صِيَانَةُ الطَّرِيْقِ - ترجمہ :- زنا کی حد کا فائدہ نسلِ انسانی کو بچانا ہے۔ تہمت لگانے کی حد کا فائدہ عزتیں بچانا ہے۔ شراب کی حد کا فائدہ مالوں کو بچانا ہے۔ ڈاکو کی حد کا فائدہ راستے محفوظ کرانا ہے۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلام میں صرف پانچ حدیں اور مقداری سزائیں ہیں اور یہ بھی ثابت ہوا کہ تعزیر و حدیں کیا فرق ہے اور یہ بھی بیان ہو گیا کہ حد کی سزا حدیثِ پاک اور اجماعِ صحابہ سے بھی ثابت ہے۔ یہ بتا دیا گیا کہ حد کی تعریف کیا ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کو چھوڑنا ملک و قوم اور معاشرے کو تباہ کرنا تعزیر اختیاری سزا ہوتی ہے مگر حد میں کسی اسلامی حکومت کو کوئی اختیار نہیں۔ ان پانچ حدوں کو جاری کرنا ہر حکومتِ اسلامیہ پر فرض ہے ان کو جاری نہ کرنے سے مندرجہ فوائد سے محرومی کے علاوہ دینوی خرابی ملک و معاشرہ کی تباہی اخلاقی گمراہی اور دینی لحاظ سے قہرِ قہار کا اندیشہ۔ خدا تعالیٰ سب کو قرآن مجید کی سمجھ دے اور جو فرقہ سزاءِ رجم کا منکر ہے اس کو ہدایت دے۔ **چوتھی بات** :- یہ کہ رجم کی سزا قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبات و اجماعِ صحابہ سے کس طرح ثابت ہے۔ یہ چیز بالکل ظاہر ہے تمام انسانی جرموں میں سب سے بڑا جرم زنا ہے اور اس کے بعد بڑا جرم قتل ہے۔ بعض کے نزدیک قتل بڑا جرم ہے اس کے بعد زنا بڑا جرم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل سے بھی نسلِ انسانی کی تباہی اور زنا سے بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قتل سے جان کی تباہی اور زنا سے نسل کے ایمان و اخلاق کی تباہی۔ قتل بھی تین قسم کا ہے اور زنا بھی۔ قتل کی سزا بھی قرآن و حدیث اور اجماعِ صحابہ سے ثابت۔ اور زنا کی سزا بھی۔ اسی طرح۔ قتل کے جرم تین قسم کے ہیں اور زنا بھی تین قسم کا اسی وجہ سے قتل کی سزائیں بھی شروعِ اسلام سے تین قسم کی چلی آرہی ہیں اور زنا کی بھی۔ مگر یہاں قتل و زنا میں مزید یہ فرق ہے۔ کہ قتل کی اسلامی تینوں سزائیں چونکہ پہلی شریعتوں میں سے چلی آرہی تھیں۔ اس لیئے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر زنا کی سب سزائیں شریعتِ مصطفےٰ نے خود ہی اپنی بیان فرمائیں اس لیئے ان میں تبدیلی اور نسخ ہوتا رہا۔ قانونی اعتبار سے زنا تین قسم کا ہے۔ نمبر۱ زنا قابلِ رجم نمبر۲ زنا قابلِ جلدہ یعنی کوڑوں کے قابل نمبر۳ زنا قابلِ معافی۔ یہ قسمیں زانی کی تقسیم کے اعتبار سے ہیں۔ دیگر جرم سب ایک قسم کے ہیں۔ مگر قاتل اور زانی تین تین قسم کے ہیں۔ قاتل عمد۔ نمبر۲ قاتل جہل چوک نمبر۳ صرف زخم کرنے والا یا کوئی عضو کاٹنے والا۔ ان تینوں کی شرعی سزا مختلف ہے۔ نمبر۱ :- اسی طرح زانی تمام عمر میں اپنی زندگی میں کبھی تک حلال وطی نہ کی ہو پہلے زمانوں میں حلال وطی دو قسم کی تھی آج کل ایک ہی قسم کی نکاح سے حلال وطی ہوتی ہے نمبر۲ :- زانی ثیب یعنی شادی شدہ خواہ بوقتِ جرم اس کی بیوی دنیا میں موجود ہو یا نہ ہو۔ نمبر۳ :- غلط نکاح یا دھوکے سے زنا کرنے والا۔ اس کی کئی باریک قسمیں ہیں [illegible]

کیا تو یہ صحبت وطی اگرچہ زنا ہے مگر حد واجب نہیں انکی پوری تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ قابل معافی سے مراد حد کی معافی ہے
ہاں البتہ اس قسم کے بعض زانیوں کو تعزیری سزا لازم ہے۔ مثلاً لواطت یا جانور۔ یا حائضہ بیوی سے وطی کرنے میں بقدر جرم
سزا ملے گی۔ دنیا کے سارے جرموں سے زنا سخت جرم ہے۔ چھ وجہ سے۔

پہلی وجہ:۔ یہ کہ زنا ساری شریعتوں میں حرام رہا:۔ **دوسری** یہ کہ زنا سے نسل حرامی ہوتی ہے
دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہوتی ہے کہ وہ حرامی انسان امام بن سکتا ہے نہ عالم اور نہ ولی اللہ بن سکتا ہے۔ بلکہ دنیا میں بے ادبی
بے حیائی گستاخی دین کی نفرت غرور تکبر گمراہی کج فہمی نادانی کی گندگیاں حرامی اجسام میں جلدی اور زیادہ پیدا ہوتی ہیں
تیسری:۔ وجہ یہ کہ حرامی اولاد سات نسل تک جنت میں نہ جائیگی چنانچہ فتاوی کاملیہ صفحہ نمبر ۴۵ پر ہے:۔
عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ
وَلَدُ زِنًی وَلَا وَلَدُهٗ وَلَا وَلَدُ وَلَدِهٖ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَا شَیْءٌ مِنْ نَسْلِهٖ اِلٰی سَبْعَةِ اٰبَاءٍ
(ترجمہ)۔ حضرت ابی ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرامی انسان اور اس کا بیٹا اس
کا پوتا بھی جنت میں نہ جائیں گے۔ ایک روایت میں ہے اس کی سات نسلیں جنت میں داخل نہ ہوں گی۔ اگرچہ اس روایت
کے مطلب میں کچھ علماء نے مختلف قول کہے ہیں مگر الفاظ حدیث پاک کی شدت تو ثابت ہے:۔ **چوتھی وجہ**
یہ کہ زنا سے دوہرا جرم ہوتا ہے یک وقت دو آدمی مجرم بن رہے ہیں۔ کسی دوسرے جرم میں یہ بات نہیں:۔
پانچویں:۔ وجہ یہ کہ ہر جرم کا مجرم ایک ہی قسم کا ہوتا ہے مگر زنا کا مجرم دو قسم کا۔ ۱ کنوارہ اور ۲ غیر کنوارہ۔
چھٹی:۔ وجہ یہ کہ زنا سے صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ بخلاف دیگر جرموں کے اس سے کسی کا فائدہ کسی کا
نقصان۔ ان وجوہ سے زنا کی سزائیں مختلف ہیں۔ ابتدائی اسلامی دور میں۔ شادی شدہ زانی کو عمر قید کی سزا تھی
اور کنوارے زانی کو۔ جھڑک گالی گلوچ ایذاء کلام۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ
مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ
ترجمہ:۔ تمہاری وہ بیویاں جو زنا کرائیں پھر تم ان پر چار گواہیاں بھی پالو تو ان کو موت تک گھروں میں قید کر دو۔ اس
آیت میں زانی اور زانیہ دونوں شامل ہیں مگر صرف عورتوں کا ذکر کیا۔ دو وجہ سے۔ ۱ پہلی یہ کہ زنا میں اصل عورت ہی محرک ہوتی
ہے۔ عورت قدرت نہ دے تو مرد کی جرأت نہیں ہوتی۔ عورت ہی مرد کو دعوت زنا دیتی ہے۔ مرد نہیں دیتا
دیکھو دنیا میں عورتوں نے ہی زنا کے بازار حسن کھولے ہوئے ہیں نہ کہ مردوں نے اگر کوئی کہے کہ یاتین
مؤنث کے صیغہ میں مرد کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔ تو میں کہوں گا کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ مذکر کے صیغہ میں
عورتیں کس طرح شامل ہوئیں۔ فصاحت کلام میں یہ بات شامل ہے کہ اصل میں فرع کو داخل مانا جاتا ہے
نماز میں اصل مرد فرع عورت۔ بدکاری میں اصل عورت فرع مرد اسی لیے اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ ہوا نہ کہ برعکس:۔

دوسری وجہ: یہ کہ آیت کا منشاء ہے شادی شدہ عورت کے زنا کی سزا کا ذکر کرنا۔ اس لیئے لفظ نسا کو مضاف کیا گیا۔ یعنی عام عورت نہیں بلکہ اے مردو! تمہاری عورت اور تمہاری عورت بیوی ہی ہوتی ہے۔ ہمارے اس بات کی دلیل آیت ایلاء ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ۔ یہاں بھی من نسائھم سے مراد بیویاں ہی ہیں اور بیوی شادی شدہ ہی ہوتی ہے یہ تو شادی شدہ زانی وزانیہ کی سزا تھی۔ دوسری آیت میں کنوارے کی سزا کا ذکر ہے۔ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ **ترجمہ:** اور وہ دو مرد عورت تم میں سے جو زنا کریں تو ان دونوں کو باتوں کی مار دو۔ یہاں تک گھبرا کر توبہ کریں۔ پھر ان کو درگزر کرو اللہ تواب رحیم ہے۔ یہاں اَلَّذَانِ اسم موصول اگرچہ تثنیہ مذکر ہے۔ مگر مراد عورت مرد ہیں۔ دو وجہ سے۔ ایک یہ کہ اللذان سے دو مرد مراد نہیں ہو سکتے۔ نہ آپس میں علیحدہ۔ آپس میں تو اس لیئے نہیں کہ یاتیانھا کی ھا ضمیر کا مرجع زنا ہے کہ پہلے اسی کا ذکر چلا آرہا ہے دو مردوں میں آپس کی بدفعلی کو لواطت یا خباثت کہا جاتا ہے۔ نہ کہ زنا اگر لواطت ہی مراد لی جائے تو قوم لوط کے عذاب سے یہاں اعتراض پڑ جائے گا۔ کہ وہاں اس جرم پر اتنی سختی اور یہاں اتنی نرمی۔ پس لازم آیا کہ یہاں عورت مرد کا زنا ہی مراد ہے۔ دوسری وجہ کنواری عورت کو کسی کی طرف نسبت نہیں کیا جا سکتا اس لیئے اللذان بول کر عورت و مرد بے شادی شدہ مراد لیئے گئے۔ لہٰذا واضح ہو گیا۔ ابتدائی دور میں شادی شدہ زانی وزانیہ کی سزا لِزنا علیحدہ تھی اور کنوارے کی علیحدہ یہ سب فرقوں کو تسلیم ہے۔ تو اب جب مکمل سزا مرتب ہوگی تو دو قسم کے زانیوں کی سزا ایک طرح کس طرح ہو سکتی ہے اور اگر بعد میں ہر دو قسم کے زانیوں کو ایک سزا دینی تھی تو پہلے کیوں تقسیم ہوئی۔ پھر ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے دور کی سزا اور بعد کی سزا کچھ زیادہ مختلف نہیں بلکہ ہم مثل ہیں۔ شادی شدہ کی پہلی سزا جیسے کہ اس آیت سے ثابت ہوا موت پر مکمل ہے اور بعد کی سزا بھی رجم سے موت پر مکمل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی سزا میں قید تنہائی کی دراز مدت تک ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تکلیف دہ موت ہے اور بعد کی سزا میں ایک ہی دن میں پتھروں کی مار سے تکلیف دہ موت ہے۔ دوسرا فرق یہ کہ پہلی سزا ایسی آیت سے ثابت ہے جس کی تلاوت موجود حکم منسوخ اور دوسری سزا ایسی آیت سے ثابت ہے۔ جس کا حکم موجود تلاوت منسوخ۔ رہی یہ بات کہ اس کی تلاوت کیوں منسوخ ہوئی اس کی حکمت آئندہ سطور میں بیان کی جائے گی۔ اور سزاء رجم کے مزید دلائل بھی آئندہ انشاء اللہ بیان ہوں گے۔ اسی طرح کنوارے زانی کی پہلی سزا زبان کے بہت کوڑے ہیں جس کے زخم تا عمر نہیں بھر سکتے۔ اور اور بعد والی سزا اس آیت سے ثابت جس کی تلاوت بھی موجود اور حکم بھی اس کی تلاوت کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے۔ یہ بھی آئندہ اپنے مقام پر بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ یہ بات مزید خیال میں رہے کہ کنوارے کی پہلی سزا والی اسی آیت اَلَّذَانِ میں زانی اور زانیہ کو ایک جگہ شامل کیا گیا۔ مگر کنوارے زانی کی بعد والی سزا میں

صاف صاف علیحدہ فرمایا گیا۔ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا (الخ) ؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں چونکہ پہلے زنا کا ذکر ہے اس لیے ان کی ضمیر لانے کی وجہ سے دونوں کا ذکر اکٹھا کر دیا گیا۔ لیکن سورۂ نور کی اس آیت سے پہلے چونکہ زنا کا ذکر نہیں اس لیے یہاں :۔ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ علیحدہ فرمایا گیا۔ یہاں ضمیر نہیں لائی جا سکتی تھی، کیونکہ مرجع پہلے نہیں آیا۔ نیز اَلَّذَانِ سے تو مرد عورت مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ اسم موصول مبہمات میں سے ہے اسی طرح جمع مذکر میں بھی عورتیں شامل ہو سکتی ہیں۔ مگر زانیین میں اور زانیتین میں عورت مرد شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ تثنیہ مظاہر میں ابہام ہوتا ہے نہ جنسیت ان ہر دو مندرجہ بالا آیتوں سے منکرین احادیث پر دو اعتراض پڑتے ہیں۔ ایک یہ کہ۔ اگر یہاں سزا مختلف ہوئی تو آئندہ کیوں ایک ہوگی۔ دوم یہ کہ اگر آیات کی تنسیخ نہیں ہوتی تو یہ سزا زانی کو اب کیوں نہیں دی جاتی اب صرف کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ اب کیوں کوڑے مرواتے ہو۔ ہم اہل سنت تو اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ زمانۂ جہالت کے اہل عرب جو زنا میں مشہور بلکہ اس پر فخر کرنے والے تھے ان کو زنا سے روکنا ایک دم سختی سے ممکن نہ تھا۔ اس لیے۔ پہلے صرف قید کی سزا سنائی گئی اور کنواروں کو زبانی برا بھلا کہہ کر زنا سے نفرت دلائی گئی پھر جب قلب مومن میں خوف نفرت دھنس گئی تب سختی کا حکم فرمایا گیا۔ یہ پہلی نرم سزا کی پر اثر حکمت تھی کہ اگر کوئی مومن شرِ بشری سے مغلوب ہو کر زنا کر بیٹھتا ہے تو خود ہی رو کر پکارتا ہے۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ طَہِّرْنِیْ ؎۔ اے آقا مجھ کو دنیا میں ہی پاک کر دیجئے

مسئلہ :۔ جرم کے اقرار کے بعد جو سزا ملے گی وہ مجرم مسلمان کو پاک کر دے گی۔ لیکن جو سزا سچی گواہی سے ملے گی وہ مجرم کو شرعی گناہ سے پاک نہ کریں گی۔ کیونکہ۔ سچا اقرار توبہ ہے۔ اور توبہ کے ذریعہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے گواہی توبہ نہیں وہ تو پکڑ اور جبر ہے۔ ہم نے تو نسخِ آیت مان کر دونوں آیتوں کو اپنی جگہ درست کہہ دیا۔ مصیبت تو منکرین حدیث پرویزیوں کو ہے۔ عبداللہ چکڑالوی کے شاگرد اور منکرین حدیث کے سرغنہ پرویز صاحب اپنی کتاب لغات قرآن جلد سوم میں صفحہ ۱۲۶۶ پر اس آیت لفظِ فاحشہ کے مشترک ہونے سے دھوکہ کھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں مراد ہے کہ تمہاری عورتیں بری باتیں بے حیائی کی باتیں کریں تو ان کو گھر میں قید کر دو۔ میں کہتا ہوں کتنی نادانی ہے۔ کسی نے سچ کہا کہ خدا جب دین لیتا ہے۔ عقل بھی چھین لیتا ہے۔ یعنی تعجب کہ اِدھر تو منکوحہ زانی سے اتنی محبت کہ رجم سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے اور اُدھر اتنا ظلم کہ صرف بے حیائی کی باتوں سے عمر قید کی سزا اور پھر آیت کے اگلے لفظ پر دھیان نہیں کہ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا۔ ترجمہ ان بیویوں کو اس وقت تک قید رکھو کہ یا مر جائیں یا اللہ کوئی راستہ بنا دے۔ اگر یہ آیت اب تک جاری ہے تو اب اللہ کب اور کس کو راستہ بتائے گا۔ کیا ان منکروں کو دوسرے قرآن کا انتظار ہے۔ سچ ہے ایک جہالت بچانے کے لیے کئی جہالتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ہماری اس دراز گفتگو میں مختصر وضاحت سے ثابت ہوا کہ رجم کی سزا کس طرح ثابت ہوتی ہے مکمل وضاحت آئندہ سطور میں اپنے مقام کی جائے گی لیکن اس سے پہلے :۔ پانچویں بات یہ بتانا

ضروری ہے۔ کہ اسلام نے ہمارے جرموں پر کتنی سزائیں دی ہیں۔ یہ بات عین انصاف ہے کہ ہر مربی اور سربراہ اپنے مجرم کو سزا دے۔ چونکہ مجرم بہت قسم کے ہیں اس لیئے سزائیں بھی بہت قسم کی ہیں۔ جرم اصولاً تین قسم کے ہیں ۱۔ عقیدے کا جرم ۲۔ عادات کا جرم ۳۔ دنیوی جرم۔ مثلاً بغاوت غداری ملکی انتظامی سیاسی جرم۔ پہلے دو جرموں کی سزائیں شریعتِ اسلامیہ نے مقرر کر دی ہیں عقیدے کے مجرم کافر شرعی اور گستاخ شریعت لوگ ان کی سزا کا نام عذاب ہے۔ کافر کو یہ سزا دنیا میں بھی کسی نہ کسی طریقے سے انفرادی یا اجتماعی انداز میں مل جاتی ہے۔ آخرت یعنی قبر حشر اور میدانِ جہنم میں بھی ملے گی۔ اور گستاخِ شریعتِ پاک جیسے فرقہائے باطلہ کو یہ سزا صرف آخرت میں ملے گی۔ یعنی قبر حشر اور میدان جہنم میں۔ بعض گستاخوں کو بوقت موت بھی عبرتِ دیگراں کے لیئے عذاب کی سزا مل جاتی ہے۔ عذاب کی سزا کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے وہ جس کو چاہے جس کے ذریعے جس سزا کو چاہے معین اور نازل فرما دے۔ اس میں کسی حاکم جج قاضی یا کسی عدالت کچہری کا کوئی اختیار نہیں۔ نہ کوئی مفتی کسی عذاب کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ انبیاءِ کرام بھی عذاب نازل نہیں کرتے بلکہ اپنی دعاؤں سے عذاب نازل کرا سکتے ہیں حضرتِ موسیٰ کے ثبات عذاب کے معجزوں کا بھی یہی مطلب ہے کہ آپ کی دعاؤں سے فوری طور معجزانہ طریق پر عذاب آتے رہے۔ لفظِ عذاب قرآنِ مجید میں تقریباً تین سو تیئس ۳۲۳ دفعہ آیا ہے۔ ان میں صرف چار دفعہ لفظ عذاب لغوی معنیٰ میں ہے یعنی دنیوی عدالت کی سزا باقی سب آیات میں عذاب بمعنیٰ الٰہی سزا ہے۔ عادات کے مجرم کو شریعت نے تین قسم کی سزائیں دی ہیں۔

۱۔ خالص حقوق اللہ کے مجرم کی سزائیں حدود اللہ ہیں۔ صرف پانچ قسم کی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ۲۔ مخلوط جرم کا مجرم اس کی سزا کا نام تعزیر ہے۔ ۳۔ خالص حق العبد اور جسم انسانی کا مجرم مثلاً قاتل جارح وغیرہ اس کی سزا کا نام قصاص ہے۔ تعزیر کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: ۱۔ جسمانی مار پیٹ ۲۔ صرف جھڑکنا ۳۔ ذلیل کرنا ۴۔ صرف شرمندہ کرنا۔ بعض فقہاءِ کرام نے قید کرنا بھی تعزیری سزا بیان کی ہے۔ چنانچہ مغنی لابنِ قدامہ جلد نہم صفحہ ۱۷۸ پر ہے:۔ وَالتَّعْزِيْرُ يَكُوْنُ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ وَالتَّوْبِيْخِ۔ (ترجمہ) :۔ اور تعزیر ہوتی ہے۔ مارنا۔ قید کرنا جھڑکنا۔ مگر یہ درست نہیں۔ اسلامی قانون کی یہ خصوصی اور امتیازی شان ہے کہ اس نے مجرم کو فقط جسمانی سزائیں دی ہیں۔ اسلام میں نہ قید کی سزا جائز ہے نہ مالی جرمانے کی۔ یہ دو نو سزائیں جرم کو مٹاتی نہیں بلکہ بڑھاتی ہیں۔ اسی لیئے موجودہ عیسائی قانون سے روز بروز جرم بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بخلاف جسمانی سزا کے۔ کہ اس سے جرم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ ہمارے جن بزرگوں نے قید یا جرمانے کو بھی تعزیری سزا قرار دیا ہے ان کو مندرجہ روایت سے دھوکہ ہوا۔ فَاَخْرَجَ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔ وزاد الترمذی والنسائی ثم خلی عنہ حسنہ الترمذی وصححہ الحاکم

وَرَوَی عبد الرزاق فی مُصَنَّفِہٖ عَنْ عِرَاكِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ اَقْبَلَ رَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ غِفَارٍ حَتّٰی نَزَلَا بِضَبْحَتَانِ مِنْ مِیَاہِ الْمَدِیْنَۃِ وَعِنْدَ ھُمَا نَاسٌ مِنْ غطفان مَعَھُمْ ظَھْرٌ لَّھُمْ فَاَصْبَحَ الْغَطَفَانِیُّوْنَ وَقَدْ فَقَدُوْا الْبَعِیْرَیْنِ مِنْ اِبِلِھِمْ وَاتَّھَمُوْا الْغِفَارِیَیْنِ فَاَتَوْ بِھِمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَبَسَ اَحَدَ الْغِفَارِیَیْنِ وَقَالَ لِلْاٰخِرِ اِذْھَبْ فَالْتَمِسْ :- (الخ) :- (ترجمہ) :- بنی غطفان کے دو اونٹ گم ہو گئے انھوں نے بنی غفار کے مردوں پر تہمت لگائی اور دونوں کو پکڑ کر بارگاہِ رسالت میں لے آئے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک کو قید کر دیا اور ایک کو ڈھونڈنے کے لیئے بھیجا۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ قید کرنا اسلام میں تعزیری سزا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث واقعی بالکل درست ہے۔ مگر اس سے یہ دلیل لینا غلط ہے۔ کیونکہ قید کرنا اسلام میں تعزیری سزا نہیں۔ جیل اسلامی قانون میں سے ہی نہیں۔ یہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قید فرمانا سزاءً نہ تھا بلکہ صرف روکنے کے لیئے تھا۔ چنانچہ فتاوٰی فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۱۷ پر ہے اَقُوْلُ وَلَا یَخْفٰی عَلَیْكَ اَنَّ الْمُسْتَفَادَ مِنْ تَعْلِیْلِ الْحَبْسِ بِقَوْلِہٖ لِاَنَّہٗ لَوْ خُلِّیَ سَبِیْلُہٗ ھَرَبَ ھُوَ :- اَنْ یَّکُوْنَ الْحَبْسُ اِحْتِیَاطًا لَا تَعْزِیْرًا :- ترجمہ :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قید فرمانے کی وجہ اس کو بھاگنے سے روکنا ہے۔ پس واضح ہوا کہ یہ قید احتیاطاً ہے نہ تعزیری سزا۔ اور روکنے کے لیئے کسی بھی مجرم کو آج بھی قید کرنا مناسب ہے گویا کہ اسلام میں حوالات ہے جیل کوئی نہیں اسی طرح جرمانہ تو سراسر ظلم ہے۔ چنانچہ فتاوٰے ردالمحتار جلد سوم صـ ۲۶۴ اور فتاوٰی بحرالرائق جلد پنجم صـ ۴۱ پر اور فتاوٰی عالمگیری جلد دوم صـ ۱۶۷ پر ہے :- وَعَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ یَجُوْزُ التَّعْزِیْرُ لِلسُّلْطَانِ بِاَخْذِ الْمَالِ۔ وَعِنْدَ ھُمَا وَبَاقِی الْاَئِمَّۃِ لَا یَجُوْزُ :- ترجمہ :- صرف امام یوسف کے نزدیک مال کی تعزیر جائز ہے لیکن امام اعظم۔ امام مالک امام شافعی امام احمد بن حنبل امام محمد کسی کے نزدیک بھی مال سے جرمانہ لے کر مجرم کو چھوڑنا جائز نہیں۔ بلکہ ظلم ہے۔ ہاں صرف مجرم کو بھاگنے سے روکنے کے لیئے کچھ دن کے لیئے اُس کے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ تمام فقہاء نے یہی تصریح کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اخروی سزا کا نام عذاب الٰہی ہے اور عدالتی سزا کا نام۔ حد تعزیر۔ قصاص ہے۔ اصطلاحاً حد شرعی کو عذاب نہیں کہا جاتا۔ ہاں لغتاً صرف ایک جگہ قرآن پاک نے کنواری کنوارے زانی کی حد کو عذاب فرمایا ہے۔ جب یہ سمجھ لیا تو اب چھٹی بات :- میں وہ دلائل ملاحظہ فرمایئے جن سے شادی شدہ زانی و زانیہ کا رجم ثابت ہوتا ہے :-

دلیل اول :- سورۃ نور آیت ۲ :- ارشاد ہے :- اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ :- ترجمہ :- صرف کنواری زانیہ عورت اور کنوارے زانی مرد کو سو کوڑے لگاؤ۔ اس آیت کریمہ میں۔ لفظ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ پر الف لام عہدِ خارجی ہے نہ جنسی ہو

سکتا ہے۔ نہ استغراقی کیونکہ جنسی یا استغراقی ہونے سے تمام قسم کے زانی شامل ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہم نے پہلے بتا دیا کہ بائیس قسم کے زانی وہ ہیں جن کو حد نہیں لگتی یا معافی ہو جاتی ہے یا تعزیر۔ جیسے مجبور۔ مجنون۔ بچہ۔ غلام۔ وطی بالشبہ سے زانی۔ منکرین بھی۔ ان زانیوں کو حد نہیں لگا سکتے۔ اور جب الف لام جنسی و استغراقی نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ عہد خارجی ہو گا۔ ذہنی بھی نہیں ہو سکتا ورنہ فَاجْلِدُوا کا خطاب غلط ہو جائے گا۔ اور بقانونِ نحو الغلام عہدی میں صرف ایک قسم مراد ہو سکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس آیت میں فقط ایک قسم کا زانی مراد ہے وہ کونسا؟ کنوارا بے نکاحا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ دوسری اور تیسری قسم اس میں ہرگز شامل نہیں ہو سکتیں لہٰذا منکوحہ زانی کی سزا سو کوڑے نہیں ہو سکتی۔ انشاء اللہ تعالےٰ ہماری اس دلیل کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ ورنہ آپ کو سب زانی اس میں شامل کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس آیت میں صرف دو قسمیں شامل رہیں باقی نکل جائیں اگر الف لام عہدی مانو تو صرف ایک قسم مراد ہو گی۔ اگر استغراقی یا جنسی مانو تو سب قسمیں مراد ہوں گی اور پھر پاگل مجبور بچے زانی کو بھی سو کوڑے مارنے پڑیں گے۔ حالانکہ یہ منع ہے۔ **دلیل دوم** :۔ دنیا بھر کائنات میں صرف اللہ رسول کا دینِ اسلام ہی ایسا مضبوط قانون پیش فرماتا ہے کہ جس میں ہر مجرم کو نہایت مناسب اور عدل و انصاف سے بہت احتیاط سے سزائیں دیتا ہے۔ نہ افراط ہے نہ تفریط نہ سخت مجرم کو نرم سزا کہ جرم بڑھیں نہ نرم مجرم کو سخت سزا کہ کوئی ظلم سے رو رہے۔ بلکہ سخت تر مجرم کو سخت تر سزا اور سخت مجرم کو سخت سزا نرم مجرم کو نرم سزا۔ سب جرموں میں بڑا جرم زنا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ جرم شادی شدہ کا زنا ہے۔ کیونکہ تمام جرموں کا نقصان ایک ایک لیکن کنوارے زانی سے تین نقصان۔ کہ خود مجرم ۱ زانیہ مجرم ۲ اور ۳ نسل خراب اور شادی شدہ زانی سے دس نقصان ۱ خود مجرم ۲ زانیہ مجرم ۳ نسل خراب ۴ بیوی پر ظلم ۵ اولاد سے بے پرواہی کر کے اولاد پر ظلم۔ ۶ گھر تباہ۔ ۷ سسرالی رشتہ ناراض ۸ بے غیرتی کا پھیلنا۔ ۹ مسلمانوں کی ذلت و خواری دوسری قوموں کی نگاہ میں یہی سب سے بڑا فساد فی الارض ہے۔ ۱۰ کنوارا تو پھر درست ہو سکتا ہے مگر شادی شدہ زانی مرتے دم تک زنا نہیں چھوڑ سکتا سو کوڑے بھی اس سے زنا نہیں چھڑا سکتے تندرست ہو کر پھر شروع ہو جائے گا۔ کنوارا زانی تو شادی کرا کر ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مگر شادی شدہ زانی گویا خبیث بیج ہے اس کے ٹھیک ہونے کا اب کونسا وقت ہے۔ ایسے خبیث شدہ بیج کو تلف کرنا ہی درست ہے۔ ایسے فسادی شہوت کے پجاری کو زندہ رکھنا معاشرے کی تباہی ہے۔ اور اللہ نے فسادی کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ۔ سورت مائدہ آیت ۳۲ ارشاد باری تعالےٰ ہے :۔ اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا (الخ) :۔ ترجمہ :۔ جو لوگ

اللہ رسول سے جنگ اور مقابلے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اور جو لوگ زمین میں فساد معاشرہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا صرف یہ ہے کہ ان کو مار ڈالو یا سولی دے دو۔ اِس آیتِ کریمہ میں فسادی کی سزا قتل اور موت فرمائی گئی۔ فسادی وہی ہے جس کی حرکتوں سے معاشرہ تباہ ہو۔ نسلیں ہلاک ہوں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔ وَاِذَا تَوَلّٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ (ترجمہ):۔ اور جب زمین میں سرکش بے غیرت پھرتا ہے تو اس میں فساد ڈالتا ہے یعنی ہلاکت ڈالتا ہے کھیتوں اور نسلوں میں۔ چونکہ یہاں حرث کے ساتھ نسل کا ذکر ہے۔ اس لیئے حرث سے نسلی کھیتی ہی مراد ہو گی۔ اور فساد سے مراد یہی نسلی ہلاکت ہے کیونکہ واؤ تفسیر یہ ہے۔ اس لیئے کہ ہلاکت حرث و نسل تفصیل ہے فساد کی چنانچہ صاوی تفسیر جلد اوّل ص۸۵ پر ہے قَوْلُهٗ وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ تَفْصِیْلٌ لِلْاِفْسَادِ۔ ترجمہ:۔ فساد کے بعد حرث و نسل کا ذکر فساد کی تفصیل بیان کرنا ہے۔ اور تفصیلِ کلام کے لیئے واؤ تفسیریہ ہوتی ہے۔ تفسیر روح المعانی جلد اول ص۹۶ پارہ دوم میں ہے:۔ اَنَّ الْحَرْثَ هُنَا النِّسَاءُ وَالنَّسْلَ الْاَوْلَادُ (ترجمہ):۔ اس آیت میں حرث سے مراد عورتیں ہیں اور نسل سے مراد پیدا ہونے والے بچے قرآن مجید میں صاف صاف بھی عورتوں کو حرث فرمایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ:۔ (ترجمہ):۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس اپنی کھیتیوں کے پاس آؤ جس وقت چاہو۔ (نہ کہ غیر کی کھیتی کے پاس):۔ ان تمام عبارتوں سے ثابت ہوا کہ نسل تباہ کرنے والا فسادی ہے۔ اور فسادی کی سزا موت ہے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ زانی ہی نسل تباہ کرتا ہے۔ اور شادی شدہ زانی کا زنا ہر لحاظ سے فساد ہی ہے نہ کہ مجبوری۔ بخلاف کنوارے زانی کے کہ وہاں بشری کمزوری کو زیادہ دخل ہے۔ لہٰذا منکوحہ زانی کی سزا کا اشارہ اس آیت میں قتل اور موت کا دیا گیا۔ اور پتھروں سے مار ڈالنا بھی قتل ہے۔ اشارۃ النص سے ثابت ہوا کہ منکوحہ زانی کی سزا رجم ہے۔ **تیسری دلیل** ہے اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ:۔ (ترجمہ):۔ شادی شدہ مرد اور عورت جب زنا کریں تو دونوں کو رجم کر دو یقیناً۔ عبرت کی سزا ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ یہ آیت پاک رجم کی سزا کے لیئے عبارۃ النص ہے۔ اس کی عبارت و تلاوت منسوخ ہے مگر حکم جاری ہے۔ شیخ کے لغوی معنٰے ہیں ع۱ بوڑھا۔ ع۲ خاوند ع۳ ذمہ دار سردار ع۴ بڑا بزرگ قابل تعظیم (منجد) یہاں مراد خاوند اور بیوی یعنی منکوحہ عورت مرد۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اِس کے الفاظ منسوخ فرمانے میں کیا حکمتیں ہیں۔ البتہ ایک صوفی بزرگ نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ چونکہ شادی شدہ کا زنا سب سے زیادہ بے غیرتی اور گندگی کا جرم ہے۔ اس لیئے ان لفظوں کو آیاتِ قرآن سے خارج کر دیا تاکہ اقوامِ عالم کے سامنے قومِ مسلم کی رسوائی نہ ہو۔ دوسری وجہ

کہ اپنے حبیب کا اختیار اور صاحب شریعت ہونا ثابت فرمانے کے لیئے کہ حد جیسی نص قطعی سے ثابت ہونے والی سزا حدیثِ پاک کے الفاظ سے ثابت ہو سکتی ہے اور یہ بتلانے کے لیئے جس طرح آیتِ قرآنی نص قطعی اور حکم الٰہی ہے۔ اسی طرح حدیثِ صحیحہ بھی نص قطعی ہے۔ بلکہ جو لوگ صحبتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پالیں انکا اجماعی فیصلہ بھی نصِ قطعی ہے۔ **تیسری وجہ**: یہ کہ آیتِ کریمہ مَا نَنْسَخْ کا عملی ثبوت پیش فرمانا تھا۔ اور بتانا تھا کہ ہم آیتِ قرآنی کے حکم کو بھی منسوخ فرما سکتے ہیں۔ اور لفظوں کو بھی۔ کیونکہ ہم غالب حکمت والے ہیں۔ منکروں کو ہماری حکمتوں کی سمجھ نہیں آسکتی۔ اب تک تین آیتوں میں رجم کا ثبوت پیش کیا گیا۔ پہلی آیت میں اقتضاءُ النص سے دوسری آیت میں اشارۃ النص سے تیسری آیت میں۔ عبارتُ النص سے۔ لیکن رجم زانی چونکہ بہت اہم سزا ہے، اس لیئے **چوتھی دلیل**:۔ اس طرح ہے۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۳۱۰ پر ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا اَتٰی مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ فَقَالَ لَہٗ لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ اَوْ غَمَزْتَ اَوْ نَظَرْتَ قَالَ لَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَنِكْتَہَا۔ قَالَ نَعَمْ فَعِنْدَ ذَالِكَ اَمَرَ بِرَجْمِہٖ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ (ترجمہ) حضرت ابنِ عباس سے مروی ہے۔ فرمایا انھوں نے کہ جب حضرت ماعز نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہوئے اور زنا کا اقرار کیا تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ماعز شاید تو نے صرف بوسہ لیا ہوگا یا صرف چھوا ہوگا۔ یا صرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔ اور اسی کو زنا سمجھا ہو۔ عرض کیا نہیں۔ یارسول اللہ۔ تو فرمایا کیا واقعی تو نے جماع کیا ہے۔ عرض کی ہاں تب اتنی تحقیق و تفتیش کے بعد آپ نے اس کے رجم کا حکم فرمایا۔ روایت کیا بخاری نے۔ رجم کے معنٰی ہیں پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینا۔ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگیٔ پاک میں صرف پانچ شخصوں کو رجم کرایا۔ دو یہودی زانیوں کو ایک حضرت ماعز ایک یہودی زانیہ۔ ایک قبیلہ غامدیہ کی زانیہ عورت اسی طرح مشکوٰۃ شریف کی احادیث سے ظاہر ہے۔ لیکن مغنی لابنِ قدامہ جلد نہم ص ۳۶ پر ہے:۔ وَقَدْ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الیھود بین الذین زنیا وَمَاعِزًا وَالْغَامِدِیَّۃَ حَتّٰی مَاتُوْا:۔ ترجمہ رسولِ پاک نے دو یہودی مردوں کو ایک ماعز کو ایک غامدیہ عورت کو زنا کی حد میں رجم فرمایا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ مشکوٰۃ شریف میں ص ۳۰۹ پر یہودی مرد و عورت کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مغنی کی اس عبارت میں اَلَّذَیْنِ زَنَیَا سے مراد عورت مرد ہی ہوں نہ کہ دو یہودی مرد کیونکہ مشکوٰۃ شریف میں زَنَیَا کا تثنیہ مذکر کا صیغہ ہی بولا ہے۔ تو اس طرح چار زانی ہی ثابت ہوئے۔ جن کو رجم کیا گیا۔ اور چاروں ہی شادی شدہ تھے۔ پس ثابت ہوا کہ حدیث پاک نے بھی نکاح والے زانی کی سزا رجم ہی فرمائی۔ بلکہ توریت میں بھی ایسے زانی کی سزا رجم ہی تھی جیسا کہ مسلم بخاری اور مشکوٰۃ شریف ص ۳۰۹ پر یہودی روایت سے

ثابت ہے۔ مخالف یہ کہہ سکتا ہے کہ رجم کی یہ حدیث خبرِ واحد ہے اور خبرِ واحد سے حد ثابت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حدِ شرعی کے لیئے نص قطعی ضروری ہے۔ مگر مخالف کی یہ بات دو وجہ سے غلط ہے۔ ایک اس لیئے کہ یہ خبرِ واحد نہیں بلکہ اس کے کثیر راوی ہیں۔ چنانچہ احکام القرآن للجصاص جلد سوم نے صفحہ نمبر ۳۲۴ پر فرمایا قَالَ اَبُوْ بَكْرِ الرَّازِیُّ۔ رَوٰی الرَّجْمَ۔ ابو بکر وعمرُ وعلیٌّ وَجَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَاَبُوْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیُّ ابو ھریرۃ وَبُرَیْدَةُ الْاَسْلَمِیُّ وَزَیْدُ بْنُ خَالِدٍ فِیْ اٰخَرِیْنَ الصَّحَابَةِ۔ (ترجمہ) :۔ فرمایا ابوبکر رازی نے کہ رجم کی حدیث شریف کو صدیق اکبر فاروقِ اعظم۔ علی مشکل کشا۔ جابر بن عبید اللہ اور ابو سعید خدری ابو ہریرہ جیسے کثیر جلیل القدر صحابہ نے روایت کیا۔ اور دو آخری صحابہ بریدہ اسلمی اور زید بن خالد نے بھی روایت کیا۔ خود مشکوٰۃ شریف نے مسلم۔ بخاری۔ ابوداؤد ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ اور شرح سنہ جیسی معتبر کتب کے حوالے سے بیس روایوں کی روایتیں نقل فرمائی ہیں۔ دوم اس لیئے کہ راویوں اور محدثین کی یہ تعداد خبرِ واحد کو بھی مشابہ متواتر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ فتاوی فتح القدیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ہے :۔ لِاَنَّ ثُبُوْتَ الرَّجْمِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَاتِرُ الْمَعْنٰى كَشُجَاعَةِ عَلِيٍّ۔ وَجُوْدِ حَاتِمٍ (وعدل عمر)۔ ترجمہ :۔ رجم کی حدیث شریف اگرچہ سنداً خبرِ واحد ہے مگر عملاً اتنی مشہور زمانہ ہو چکی ہے کہ معنیً متواتر بن گئی۔ جیسے کہ علی کی بہادری۔ حاتم کی سخاوت اور عمر کا انصاف مشہورِ زمانہ ہو گئے۔ ثابت ہوا کہ شہرت واحد کو متواتر حدیث بنا دیتی ہے۔ اَلْمُغْنِیْ لِابْنِ قدامہ جلد نہم (ص ۳۵) پر ہے :۔ اَنَّهٗ قَدْ ثَبَتَ الرَّجْمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَوْلِهٖ وَفِعْلِهٖ فِیْ اَخْبَارٍ تَشْبَهُ الْمُتَوَاتِرَ (ترجمہ) :۔ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی وجہ سے رجم اتنا جاری ہوا کہ وہ خبریں۔ خبرِ متواتر کے مشابہ ہو گئیں۔ پرویزی کہتے ہیں کہ اُس حدیث کو مانو جو قرآن کے مطابق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سب ہی احادیث قرآن مجید کے مطابق ہے۔ جہاں مطابقت نظر نہیں آتی وہ اپنی عقل کا قصور ہے۔ بے عقل کے لیئے تو آیاتِ قرآنیہ بھی آپس میں مطابق نہیں۔ اور پھر بعض احادیث کو بے عقل لوگ مطابق کر سکتے ہی نہیں حالانکہ ان پر عمل ہو رہا ہے مثلاً گدھے کتے کی حرمت والی حدیث کو کسطرح آیت کے مطابق کرو گے۔ پس ثابت ہوا کہ مطابق کرنا ہمارا کام نہیں۔ جب حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے :۔

پانچویں دلیل :۔ شادی شدہ زانی کا رجم اجماعِ صحابہ سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف ص ۳۰۹ پر ہے :۔ وَعَنْ عُمَرَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰيَةُ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا

بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ عَلٰى مَنْ زَنٰى اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ الْحَبَلُ اَوِ الْاِعْتِرَافُ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ :۔ ترجمہ :۔ فاروق اعظم سے روایت ہے۔ فرمایا کہ بے شک اللہ تعالٰی نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ پس جو قانون رب نے نازل کیا۔ اس میں رجم کی آیت بھی شامل ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زانی کو رجم کیا اور آپ کے بعد ہم تمام صحابہ نے بھی رجم کیا۔ اور رجم کرنا اس عورت مرد زانی زانیہ پر بالکل درست ہے جو محصن ہوں۔ بشرطیکہ یہ زنا چار گواہیوں سے ثابت ہو یا عورت کا حمل بتا دے۔ حالانکہ زمانے سے بیوہ یا مطلقہ ہو یا زانی زانیہ چار مرتبہ صحیح صحیح اقرار کر لیں۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوگئیں اول یہ کہ رجم پر اجماع صحابہ ہے۔ کہ فرمایا گیا سب صحابہ نے زانی کو رجم کیا۔ اسی کو اجماع کہا جاتا ہے۔ رجم پر صحابہ کرام کا قولی اجماع بھی ہے۔ عملی اجماع بھی۔ دوم یہ کہ شادی شدہ زانی جب محصن ہوگا تب رجم ہوگا۔ محصن کے چار معنے ہیں اور سب کے سب قرآن مجید میں مستعمل ہیں۔ جو اپنی جگہ آئندہ بیان ہوں گے۔ یہاں محصن کے معنے شادی شدہ۔ احصان کی سات شرطیں ہیں جب یہ ساری ایک مرد یا عورت میں پائی جائیں پھر وہ زنا کرے تو اس کو رجم کیا جائے گا :۔

پہلی شرط :۔ کسی بیوی سے نکاح ہو۔ **دوم** وطی زنا فرجِ عورت میں ہو :۔ **سوم** :۔ نکاح ہر طرح سے صحیح ہو باطل یا فاسد نہ ہو۔ **چہارم** :۔ ہر دو زانی آزاد ہوں غلام نہ ہوں :۔ **پنجم** :۔ بالغ ہوں **ششم** :۔ عاقل ہوں۔ **ہفتم** :۔ زنا کیلئے چھ شرطیں مکمل ہوں۔ یعنی وہ مرد یا عورت پانچ شرطوں کے ساتھ حلال وطی کر چکے ہوں زنا کے وقت خواہ بیوہ ہو یا مطلقہ یا طلاق وغیرہ۔ ان شرطوں کا خلاصہ علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں۔ اس طرح کیا ہے :۔ اَجْمَعَ الصَّحَابَةُ وَاَئِمَّةُ الْاَمْصَارِ عَلٰى اَنَّ الْمُحْصَنَ اِذَا زَنٰى عَامِدًا عَالِمًا مُخْتَارًا فَعَلَيْهِ الرَّجْمُ :۔ (ترجمہ) :۔ صحابہ کرام اور تمام آئمہ کا اس پر اجماع ہے کہ محصن آدمی جب جانتے بوجھتے سمجھتے اپنے ارادے و اختیار سے زنا کرے تو اس پر رجم کی سزا واجب ہے۔ **سوم** :۔ یہ کہ گواہی یا اقرارِ زانی ثبوت کے لیئے ضروری ہے :۔

پرویز صاحب کو اس گواہی سے بھی انکار ہے۔ وہ اپنی کتاب لغات القرآن جلد سوم صفحہ ۱۲۶۹ پر زانی کے لیئے گواہی کو ناممکن قرار دیتے ہیں۔ عجیب احمقانہ باتیں ہیں۔ مغنی لابن قدامہ صفحہ نمبر ۳۵ پر ہے :۔ وَاَجْمَعَ عَلَيْهِ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :۔ ترجمہ :۔ رجم زانی پر صحابہ کرام کا اجماع تھا۔ یہاں تک کی گفتگو سے ہم نے زانی کے رجم کو ثابت کر دیا۔

اب ساتویں بات واضح کی جاتی ہے کہ سائل نے منکرینِ حدیث کے جو اعتراضات رجم کے

خلاف نقل کیئے ہیں۔ اُن کے جواب کیا ہیں۔ میں نے بحیثیت مفتی اسلام ہونیکے سائل کے نقل کردہ اُن گیارہ ۱۱ اعتراضوں کو بغور دیکھا پھران کا مطبوعہ رسالہ بلاغ القرآن کا بہت غور سے مطالعہ کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تمام اعتراضات محض کم علمی نادانی ناسمجھی اور دین کی فہم نہ ہونے کی بنا پر ہے اور بعض جگہ لغت سے بھی ناواقفی کا مظاہرہ ہے۔ لہٰذا جوابات ملاحظہ ہوں۔

مخالف کا:۔ **پہلا اعتراض**:۔ چونکہ قرآن مجید کی یہ آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي مطلق ہے۔ لہٰذا زانی خواہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ یہی حد جاری ہوگی۔ **جواب**:۔ قطعاً غلط ہے۔ یہ آیت مطلق نہیں بلکہ الف لام عہدی سے مقید ہے۔ ورنہ تمام قسم کے زانیوں کو یہ سزا دینی پڑے گی حالانکہ مجبور اور دھوکے سے زانی کو تم بھی یہ سزا نہیں دیتے جیساکہ ہم نے ابھی پہلے ثابت کیا۔ **دوسرا اعتراض**:۔ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہوسکتی۔ اور یہ آیت سُورَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا (الخ) سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ سو کوڑے ہر زانی کی مکمل سزا ہے **جواب** بالکل غلط اور ناسمجھی کی بات ہے۔ ہم نے پہلے ثابت کردیا کہ قرآن مجید کا ناسخ منسوخ بہت ضروری اور باحکمت قانون ہے۔ اس کو ماننے بغیر چارہ نہیں۔ پہلی سطور میں جو فہرست پیش کی گئی ہے۔ اُن سے صاف ظاہر ہے کہ بعض منسوخ اتنی اہم ہیں۔ کہ اب ان پر عمل ہو سکتا ہی نہیں مثلاً۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (ترجمہ):۔ اے مومنو اللہ سے ڈرنے کے حق کے برابر ڈرو۔ بھلا اب کون شخص اس حکم پر عمل کر سکتا ہے۔ کرم ہے رب کا کہ اُس نے اس سخت حکم کو منسوخ فرماکر دوسرا حکم عطا فرمایا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (ترجمہ) اتنا ڈرو جتنی تمہاری بشری طاقت ہے۔ اور ہم نسخ کا منکر یا نسخ کا صحیح مطلب کس طرح کرسکتا ہے۔ آئیں بائیں کرنے سے تو کام نہیں چلتا۔ معترض کی پیش کردہ آیت معترض کی بالکل حمایت نہیں کرتی۔ نہ اس میں رجم کی نفی ہے بلکہ یہ آیت یہ بتا رہی ہے۔ کہ اس میں اکثر احکام مسلمانوں کے لیئے ہیں کیونکہ فَرَضْنٰهَا کا معنیٰ ہے۔ ہم نے فرض کیئے۔ اور فرض واجب مستحب نفل ہونا یہ سب مسلمانوں کے لیئے ہیں کفار پر کوئی چیز فرض واجب نہیں۔ قرآن مجید کو سمجھ کر بات کرنا عقلمندی ہے۔ صرف کھینچا تانی کرنے سے مدعا حاصل نہیں ہوا کرتا۔

تیسرا اعتراض:۔ یہ کہ رجم سے موت ہوتی ہے حالانکہ قرآن پاک نے زانی زانیہ کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے چنانچہ ارشاد:۔ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً۔ یہاں اَلزَّانِيْ۔ مطلقاً ہے۔ موت کی سزا ہوتی تو نکاح کرانے کا ذکر کیوں ہوتا۔ **جواب**:۔ یہ بات روشن ہے کہ اسلام نے کبھی کسی مجرم سے محبت نہیں کی۔ بخلاف یہود و نصاریٰ اور ہندو مشرکوں کے کہ وہ سب حتی المقدور مجرم کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہمارے معاشرے کے پرویزیوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا دراصل یہ عادت انہوں نے یہود و نصاریٰ سے ہی لی ہے:۔ اور محض دھوکہ دینے کے لیئے غلط نا دلیلیں بلکہ تحریفیں کرکے آیتوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ رجم سے یقیناً واقعی موت واقع ہوتی ہے۔ اور ترتیب یعنی منکوحہ زانی کو موت ہی دینا مقصود ہے۔ ایسے مفسد بے غیرت ناسور معاشرہ کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ نہ اسلام ایسے گندے آدمی کو زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ گندے اور

خبیث آدمی کو بچانا ایسا ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کمیٹی والے مکھی مچھر مارنے کے لیے ڈیڈی ٹی چھڑکیں تو کوئی بیکڑالوی کھڑا ہو جائے اور دوائی چھڑکنے والوں کو برا کہنے لگے کہ اللہ نے تو ان کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے تم ان کو کیوں مارتے ہو۔ جیسے حکومت مکھی مچھر تلف کر کے جسمانی صحت مند معاشرہ پیدا کرنا چاہتی ہے اسی طرح اسلام قاتل اور فسادی زانی جیسے گندے انسان کو رجم سے مار کر روحانی صحت مند معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے :۔

مخالف کا پیش کردہ آیت سے استدلال کرنا نہایت ہی کمزور علمی کا ثبوت ہے۔ چار وجہ سے :۔

پہلی یہ کہ آیت منسوخ ہے اگر اس کو منسوخ نہ مانا جائے تو بت پرست عورتوں سے نکاح کرنا بھی جائز ماننا پڑے گا۔ حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے :۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا :۔ (ترجمہ) اور مشرکوں سے کوئی مسلمان نکاح نہ کرے۔ جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں۔ دوم۔ یہ کہ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ زانی ساری دنیا میں صرف زانیہ سے ہی نکاح کر سکتا ہے۔ کسی اور عورت سے نکاح نہیں کر سکتا اگر اس کو زانیہ عورت نہ ملے تو بغیر نکاح کے رہے اور پھر اسی طرح بھوبھل پھانکے اگر مخالف کہے کہ "زانیہ" سے مراد اس کی اپنی زانیہ ہے۔ تو مخالف کو دو مصیبتیں پڑیں گی۔ پہلی یہ کہ مخالف خود اس آیت کو مطلق کہہ چکا ہے اب زانیہ کو مقید اور مخصوص ماننا پڑے گا دوم یہ کہ سو کوڑے کھاتے کھاتے اگر وہ عورت زانیہ مر جائے۔ یا ویسے ہی مر جائے تو زانی بقیہ عمر ساری کس طرح گزارے۔ تیسری :۔ وجہ یہ کہ اَلزَّانِیْ سے مراد صرف کنوارا زانی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ثابت کر دیا۔ کیونکہ اصطلاحِ قرآنی میں لفظ زانی صرف کنوارے زانی کا لقب ہے۔ کیونکہ اس نے بجز زنا کی صحبت کے اور کوئی صحبت نہیں کی ہوتی۔ چوتھی وجہ یہ کہ اگر یہ شادی شدہ زانی کو بھی شامل ہو۔ تو نکاح کرنے کا ذکر کیوں کیا گیا۔ وہ تو پہلے ہی نکاح والا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زنا سے پہلا نکاح ٹوٹ گیا۔ اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زانیہ خاوند کے باوجود کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے جب یہ کام ناممکن ہیں تو سمجھ لو کہ اَلزَّانِیْ سے مراد صرف کنوارا زانی ہے اسی کو نکاح کر کے اور سزا کی توبہ کے بعد با عزت طریقے سے نکاح کرنے کا حکم ہے اور اپنی ہی زانیہ سے نکاح کرنا اس لیے زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ وہ عورت بھی زمانے میں ذلیل نہ ہو نہ نطفہ مخلوط ہو۔ زانیہ کو دوسرا مرد مشکل سے ہی پسند کرتا ہے رجم کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ نفی نہ ثبوت نہ شادی شدہ زانی اس میں شامل۔ مخالف کا یہ استدلال نہایت غلط ہے

چوتھا اعتراض :۔ مخالف کہتا ہے کہ قرآنِ مجید میں زنا کو فاحشہ کہا گیا۔ اور کہا گیا ہے :۔ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ :۔ (ترجمہ) اور لونڈیوں کو زنا کی سزا شادی شدہ عورتوں سے آدھی ہے۔ محصنہ صرف شادی شدہ کو کہتے ہیں۔ اور آدھی سزا رجم نہیں ہو سکتا۔ لازمی ثابت ہوا کہ شادی شدہ زانی زانیہ کو بلکہ ہر زانی کو سو کوڑے ہی سزا دی جائے۔ کنوارا ہو یا شادی شدہ

بیو یا رنڈوا۔ **جواب**۔ ہر فاحشہ زنا نہیں۔ ہر عذاب دنیوی سزا نہیں۔ ہر محصن و محصنہ شادی شدہ نہیں یہ تینوں لفظ مشترک المعنیٰ ہیں معترض کتنا جلد باز نادان ہے کہ دیگر آیات پر غور نہیں فرماتا۔ یہی نہیں بلکہ اس گروہ نے اپنے اسی دین کو بچانے کے لیے بہت جگہ جھوٹ کا سہارا پکڑا۔ کبھی کہتے ہیں۔ ناسخ منسوخ میں علماءِ اسلام کا اختلاف ہے (لغات القرآن جلد چہارم ص ۱۶۰) یہ بالکل غلط ہے قطعاً کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا۔ کبھی کہتے ہیں کہ قصاص کی تعریف میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس طرح کی غلط اور عوامی دھوکے کی باتیں انکی سب ہی کتب میں موجود ہیں۔ جیسا کہ رجم کے فیصلے میں چیرمین شرعی عدالت نے لکھا اور رد المحتار کا جھوٹا حوالہ لکھ دیا۔ حالانکہ وہ عبارت ساری کتاب میں نہیں۔ اس طرح غلط بیانیوں سے دین بچانے کا کیا فائدہ۔ اس اعتراض کا لبِّ لباب اور دار و مدار صرف لفظ محصنات پر ہے۔ معترض نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ شادی شدہ زانیہ عورتیں۔ اور فریب میں اپنی دلیل بنالی حالانکہ محصنہ کے چار معنے ہیں۔ ع۱ مسلمان ہونا چنانچہ سورۂ نساء آیت ۲۵ میں ہے۔ فَإِذَا أُحْصِنَّ۔ جب مسلمان کر دی جائیں ع۲ پاک دامن ہونا چنانچہ سورۂ نور ع۴ وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ :- ترجمہ اور وہ لوگ جو پاک دامن پاکباز عورتوں کو تہمت لگاتے ہیں ع۳ نکاح سے منکوحہ ہونا چنانچہ سورتِ نساء آیت ۲۴ میں ہے۔ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ۔ ترجمہ :- عورتوں میں سے شادی شدہ عورتیں ع۴ آزاد ہونا۔ چنانچہ سورتِ نساء آیت ۲۵ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ۔ ترجمہ :- اور جو شخص کہ بوجہ غربت آزاد مومنہ عورت سے نکاح نہ کر سکے ان چار آیات میں محصنہ کے چار معنی استعمال ہوئے جس سے اس کا مشترک ہونا ثابت ہوا اور مشترک المعنیٰ الفاظ کے لیے دو مشہور قانون وضع ہیں ایک یہ کہ استعمال کے وقت ایک ہی معنے مراد ہوں گے دو یا تین نہیں ہو سکتے دوم یہ کہ معنیٰ معین کرنے کے لیے کسی قرینے کا ہونا شرط ہے ہر شخص اپنی مرضی سے معنیٰ معین نہیں کر سکتا۔ پس سمجھ لو کہ معترض کی پیش کردہ آیت کے الفاظ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ میں محصنات کے معنیٰ کنواری آزاد عورتیں۔ معین ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے معنے یہاں بن ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ یہاں لفظ محصنات کا مقابلہ ہے لونڈی عورتوں سے یہ مقابلہ قرینہ ہے۔ اس بات کا کہ محصنات کا معنیٰ آزاد کیا جائے۔ اور کنواری کی قید اس لیے لگائی جائے گی کہ آزاد منکوحہ ثیبہ یعنی شادی شدہ مراد نہیں لی جا سکتی اگر ہم محصنات کا معنے کریں۔ منکوحہ آزاد عورتیں۔ تو بیک وقت دو معنیٰ استعمال ہوں گے حالانکہ مشترک المعنیٰ الفاظ میں دو معنیٰ بیک دم استعمال نہیں ہو سکتے۔ ثابت ہوا کہ معترض کی اس آیت میں آزاد کنواری زانیہ عورتوں کی سزا کوڑوں کا ذکر ہے نہ کہ آزاد منکوحہ عورتوں کی سزا رجم کا کوڑوں کا ہی نصف لونڈی زانیہ کو لگے گا یہاں آزاد شادی شدہ کا ذکر ہے ہی نہیں۔ اس اعتراض میں لفظ فاحشہ اور لفظ عذاب سے کوئی بحث نہیں۔ **پانچواں اعتراض** :- اس میں معترض کہتا ہے کہ رجم

کا ذکر سارے قرآن میں نہیں اور زنا کی سزا کا ذکر قرآن میں نصف بھی ہے اور دگنی بھی یعنی پہلے پیش کردہ آیت میں محصنہ کی سزا سے آدھی کا ذکر تھا اور سا احزاب کی آیت ۳۰ میں اسی سزا سے دگنا سزا کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ (الخ)۔ ترجمہ اے نبی کی بیبیو جو تم میں سے ظاہر بدکاری کرے تو اس کو دگنی سزا ہے۔ یہاں فاحشہ سے مراد زنا اور عذاب سے اس کی دنیوی سزا ہے۔ اور نساء النبیؐ لازمی شادی شدہ ہیں۔ اور رجم جس طرح آدھا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح دگنا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا انجام موت ہے۔ ثابت ہوا کہ زانیہ کنواری ہو یا شادی شدہ اس کی سزا کوڑے ہی ہے وہ آدھی بھی ہو سکتی ہے اور دگنی بھی آدھی پچاس کوڑے۔ دگنی دو سو کوڑے۔

جواب :- معترض کی پیش کردہ آیت میں۔ نہ فاحشہ سے مراد زنا ہے اور نہ عذاب سے مراد دنیوی عدالتی سزا ہے۔ بلکہ فاحشہ سے مراد بیبی کی نافرمانی اور عذاب سے مراد بعد قیامت کی سزا۔ کیونکہ قرآن مجید میں لفظ فاحشہ تین طرح استعمال ہوا ہے ۱ الفاحشہ۔ جیسے کہ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ ۲ فاحشہ مبینہ جیسے یہاں اسی آیت پیش کردہ میں ۳ فَاحِشَةً جیسے وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً۔ (الخ) استعمالِ فاحشہ کی اس تقسیم سے تین معنے ظاہر ہوتے ہیں ۱ زنا ۲ کسی بزرگ کی سخت ظاہر ظہور نافرمانی اور برا کام ۳ نقصان دہ کام یا عام گناہِ کبیرہ۔ اسی طرح لغات القرآن غریب القرآن صـ ۲۷۲ پر لکھا ہے جب یہ لفظ الف لام کے ساتھ استعمال ہو تو زنا مراد ہوتا ہے اور اگر یہ لفظ نکرہ ہو تو عام گناہ یا بے حیائی کے کام مراد ہوتے ہیں یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ میں اکثر کے نزدیک زنا مراد ہیں۔ اور۔ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً میں فاحشۃً سے مراد بے حیائی کا کام مراد ہے یعنی زنا کی اصلیت اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ زانی زانیہ اور حرامی نسل کو بے غیرت بنا دیتا ہے۔ اگر یہاں فاحشۃً کا ترجمہ زنا کیا جائے تو مطلب یہ بن جائے گا بے شک وہ زنا۔ زنا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط۔ تفسیر صاوی جلد سوم صـ ۲۲۹ پر ہے۔ قِیْلَ اَلْفَاحِشَةُ اِذَا وَرَدَتْ مَعْرِفَةً فَهِیَ الزِّنَا وَاللَّوَاطَةُ وَاِنْ وَرَدَتْ مُنَکَّرَةً فَهِیَ سَائِرُ الْمَعَاصِیْ فَاِنْ وَرَدَتْ مَنْعُوْتَةً کَمَا هُنَا فَهِیَ عُقُوْقُ الزَّوْجِ وَسُوْءُ عِشْرَتِهٖ۔ ترجمہ :- اگر فاحشہ معرفہ ہو تو مراد زنا ہے اگر بغیر الف لام کے نکرہ ہو تو مراد دیگر گناہ کبیرہ ہوں گے اور موصوف ہو کر آئے جیسے کہ یہاں اس آیت یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ میں۔ تو مراد خاوند کی نافرمانی ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہاں بِفَاحِشَةٍ سے مراد گھریلو ناچاقی نافرمانی۔ جب یہاں فاحشۃٍ مبینۃٍ سے مراد زنا ہے ہی نہیں تو عذاب سے مراد بھی حد شرعی کی سزا نہیں دو وجہ سے ایک یہ کہ فاحشۃ کا لفظ موصوف ہے مُبَیِّنَةٍ کا اور مبینۃ کا معنی ہے ظاہر ظہور۔ حالانکہ زنا چھپ کر کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی تفسیر روح المعانی جلد ۱۱ صـ ۱۸۲ پر ہے۔ ثابت ہوا کہ فاحشۃ سے زنا مراد لینا جہالت ہے

دوم یہ کہ کوڑے حدِّ شرعی ہے اور حدِ شرعی میں افرادِ مخصوصہ کے لیئے زیادتی کمی نہیں ہو سکتی۔ لونڈیوں غلاموں کے لیئے حد کی کمی انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طریقے پر ہے۔ اور پھر عذاب کا دُگنا ہونا نساء النبی کے لیئے اُن کی فضیلت اور مدارج کی بنا پر ہے تو لازم آیا کہ جن کو بھی فضیلت قیامت تک تھوڑی بہت ہوتی رہے گی اُس کی حد بھی ایک ایک دو کوڑے بڑھتی رہے۔ مثلاً صحابہ پھر اولیاء اللہ اور پھر علماء پھر امراء اس طریقے سے حد نہ رہے گی کھیل بن جائے گا۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہاں عذاب سے مراد حد شرعی نہیں بلکہ عذابِ اُخروی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عذاب کو رب تعالٰے نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ کہ ارشاد ہوا۔ ذَالِكَ عَلَى اللهِ يَسِيرًا یہ اللہ پر آسان ہے۔ جب کہ حدود کی سزا حکام کے سپرد ہوتی ہے اُن ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دلیل سے بھی معترض کا مقصد حاصل نہ ہوا اور رجم کی مخالفت ثابت نہ ہو سکی۔

چھٹا اعتراض:۔ رجم زانی ہرگز سنّت نہیں بلکہ خلافِ قرآن خلافِ اسلام اور خلافِ رسول ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی رجم نہ کیا۔ رجم کی ساری حدیثیں بناوٹی ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند تھے۔ کہ ارشاد ہے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ۔ ترجمہ اے نبی صرف اِس قرآن سے فیصلہ کیجیئے جو اُتارا اللہ نے یہ بات یقینی ہے کہ صرف قرآن ہی نازل ہوا ہے:۔

جواب:۔ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے کوئی دوپہر کے وقت کہہ دے کہ اس وقت کوئی سورج نہیں کوئی دھوپ نہیں کوئی دن نہیں۔ احادیث سے رجم زانی ثابت ہے اس کا انکار پرلے درجے کی حماقت ہے۔ کثیر احادیث کتب میں موجود ہیں۔ جیسا کہ مختصراً ہم نے پہلے ثابت کر دیا۔ اُن احادیث کو بناوٹی کہنا معاذاللہ اپنے قلم کی بات ہے۔ اس طرح تو کافر قرآن مجید کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے بیہودہ اعتراضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور رجم کی سزا اشارۃً و دلالۃً و اقتضاءً و عبارۃً قرآن مجید سے ہی ثابت ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ ہاں البتہ ظاہر عبارت اور نفاذ کا طریقۂ عملی احادیث کثیرہ متواتر المعنیٰ سے ثابت ہے۔ رہا یہ کہنا کہ قرآن مجید کے سوا کچھ اور نازل نہ ہوا یہ غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ سورتِ نساء آیت ۱۱۳ وَأَنْزَلَ اللهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ (ترجمہ):۔ اور اتاری اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اور سکھایا تم کو وہ جو تم نہ جانتے تھے۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۲۳۱:۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ:۔ ترجمہ:۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہے اور یاد کرو اس کو جو نازل کیا اُس اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت سے اور تیسری جگہ ارشاد ربانی ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ ترجمہ:۔ اور وہ نبی سکھاتے ہیں تم کو اللہ کی کتاب اور حکمت

ان تینوں آیات میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں نازل فرمائیں ۱۔ کتاب ۲۔ حکمت۔ کتابُ اللہ مجموعہ ہے۔ احکام قصص اور شریعت و طریقت اسرار رموز وعظ و نصیحت ہدایت و نور کا۔ اور حکمت کے معنی ہیں قانون۔ اور قانونِ شریعت حدیث پاک ہی ہے کیونکہ قانون وہ ہوتا ہے جس پر عمل کیا جائے حدیث کے بغیر قرآن مجید پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا حدیث ہی قانونِ خداوندی ہے۔ حدیث پاک کے بغیر اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ اَتِمُّوا الْحَجَّ وغیرہ احکام پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ کہاں سے ڈھونڈو گے تعداد رکعات۔ زکوٰۃ کی تفصیل۔ اور حج کا طریقہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم احکام خداوندی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اس فیصلے کو جاری کرنے کے پابند ہیں مگر لازمانہ خادمانہ مجبورانہ شان سے نہیں۔ بلکہ با اختیار محبوبانہ شان سے۔ اسی لیے رب کریم نے فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقُرْاٰنِ یا بِالْكِتَابِ نہ فرمایا بلکہ۔ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فرمایا۔ اتنی دراز عبارت میں یہی حکمت اور راز ہے کہ حدیث بھی فیصلہ کرنے میں شامل ہو جائے۔ اور ناواقفوں کو معلوم ہو جائے کہ حدیث رسول اللہ بھی۔ مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ ہے اور فرموداتِ محمدی بھی کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ہے۔ اللہ نے نبی کریم کو کائنات کا پورا فیصلہ کرنے کا اختیار دے کر بھیجا۔ حدود شرعیہ نبی کریم کی زبان پاک کا نام ہے بلکہ خود کوڑوں کی سزا کی تفصیل بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما سکتے ہیں کہ کس طرح لگاؤ جسم کے کس حصے پر لگاؤ کتنی زور سے لگاؤ۔ قرآن کریم نے ہم کو تو کچھ بھی نہ بتایا اپنے نبی کو بتایا۔ اس لیے واضح کیا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (ترجمہ)۔ اے کائنات والو تم کو ہمارے نبی کتاب و حدیث سکھاتے ہیں۔ ورنہ عربی لغت اور ترجمے سے تو تمام اہلِ عرب پہلے ہی واقف تھے وہ ہی قانون دانِ الٰہی اگر کسی کو رجم کرتا ہے تو نہ خلافِ قرآن ہوگا۔ نہ خلافِ اسلام۔ احمقانہ جلد بازی میں انسان جو چاہے بولتا چلا جائے۔ جب بے لگام ہو جائے تو جس کو چاہو بناوٹ کہہ دو جس کو چاہو لگاوٹ الکتاب والحکمۃ میں واؤ تفسیریہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ کتاب کی تفسیر یا تفصیل حکمت نہیں ہو سکتی۔ کتاب کُل ہے حکمت جُز ہے۔ حکمت کے معنیٰ ہیں قانون۔ حالانکہ کتاب میں قانون کے علاوہ بھی آیات ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ حکمت سے مراد احادیث پاک ہیں۔

ساتواں اعتراض:۔ قرآنِ مجید میں رجم کا اشارہ تک نہیں ہے اگر رجم زانی حدِّ شرعی ہوتی تو لکھتے وضاحت کرنے میں کس کی شرم تھی۔ کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی نہ تلاوتاً نہ حکماً۔ رجم کی آیت منسوخ ماننا جھوٹ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ۔ میں۔ شیطان کی آیت مراد ہے۔ آیت دراصل اس طرح تھی۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةِ الشَّيْطَانِ۔ تنوین عوض کی ہے۔

جواب:۔ اس کا تحقیقی جواب تو مکمل طور پر دے دیا ہے مگر الزامی جواب اس طرح ہے کہ یہیں پر بس نہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے حکم میں نماز کا طریقہ۔ اوقات کی تفصیل رکعات کی تعداد واضح کرنے میں کس کی شرم تھی۔ نیز کُتے گدھے کو اللہ نے حرام کیا یا نہیں اگر کیا۔ تو قرآن مجید میں حرمت ذکر کر دینے میں کس کی شرم تھی۔ نیز معترض کہتا ہے کہ آیت دراصل اس طرح تھی۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةِ الشَّيْطَانِ اللہ تعالیٰ کو اس ہی طرح لکھنے میں کس کی شرم تھی۔ معترض نے اپنے اس جھوٹ پر کوئی ثبوت بھی پیش نہ کیا

کیا معترض کو اختیارِ ذاتی ہے کہ جس طرح چاہے گھر بیٹھے آیتوں کو توڑنا مروڑنا شروع کر دے اپنے اس بیہودہ اور کفریہ عقیدے کا ثبوت پیش کرو اور قرآن سے ثابت کرو اور قرآن مجید سے صاف صاف اسطرح ثابت کرو کہ واقعی یہ آیت اس طرح تھی۔ خیال رہے۔ کہ عقلاً نقلاً اور قانوناً لفظِ آیت مرکب اضافی اور شیطان مضاف الیہ نہیں ہو سکتا۔ نہ معلوم معترض کے دماغ میں یہ دور کی کہاں سے سوجھی۔ عقلاً تو اس لیئے کہ اگر ذرا بھی انسان تدبر سے کام لے تو اسی آیت کے روشِ کلام اور طرزِ بیانی و الفاظ کے ربط سے ہی بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہاں آیت سے آیت قرآن پاک مراد ہے۔ اوّلاً اس لیئے کہ نَنسَخ کے بعد نُنسِهَا فرمایا۔ یعنی آیت کو یا منسوخ کر دیں یا بھلا دیں۔ آیت ایک اور اس کے ختم کرنے کے دو طریقے بھلایا اُس کو جاتا ہے جو پہلے یاد ہو اور بھلانے کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ گویا کہ یہ آیت جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یاد ہے۔ چاہے تو اُس کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں۔ اور کوئی ایماندار یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ معاذ اللہ نبی کریم کو شیطانی آیتیں یاد ہوں گی۔ دوم اس لیئے کہ آگے ارشاد ہے۔ نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا:۔

ترجمہ:۔ آیت منسوخ کر کے یا بھلا کر۔ اُس سے اچھی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ مِنْهَا میں مِنْ تفضیلیہ ہے اسی لیئے مفسرین کرام بِخَيْرٍ کا ترجمہ اَنْفَعُ کرتے ہیں اسی طرح تفسیر صاوی جلد اوّل صـ۴۷ـ پر ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اچھی وہ بھی آیت تھی مگر دوسری آیت اُس سے بھی اچھی ہو گی۔ اور یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے کہ شیطانی آیت میں اچھائی ہو۔ کوئی ایمانی عقل والا شیطان کی آیت کو خیر اور اچھا نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ رب تعالےٰ اُس کو اچھا کہے سوم اس لیئے کہ آگے ارشاد ہے۔ اَوْ مِثْلِهَا۔ یعنی یا اُس منسوخ شدہ آیت کے مثل لائیں گے۔ اس لفظ نے تو مسئلہ بالکل حل فرمایا کہ یہاں آیت قرآنی مراد ہے۔ اس لیئے کہ شیطانی آیت قرآنی آیت کے مثل کس طرح ہو سکتی ہے۔ ایسا کہنے والا تو ایمان سے خارج ہو جائے گا۔ نقلاً اس طرح کہ لفظِ آیت کے تین معنیٰ ہیں ۱ نشانی ۲ عبرت ۳ کلام۔ قرآن مجید میں لفظِ آیت یا آیات تقریباً تین سو اکیاسی (۳۸۱) دفعہ آیا ہے مگر کہیں بھی اُس کی نسبت یا اضافت، شیطان کی طرف نہیں کی گئی۔ نہ کسی حدیث میں نہ فقہ کی کتب نہ کتبِ ادب کہیں ثبوت کا نام نشان تک نہیں۔ ہاں قرآن مجید نے سورت حج آیت باون (۵۲) میں شیطانی کلام کو القاءِ شیطانی فرمایا ہے۔ معترض اپنے رسالے بلاغ القرآن صـ۱۶۲ـ پر آیتِ شیطانی کی مثال میں لفظِ راعنا پیش کرتا ہے کہ یہودی لوگ راعنا کہتے تھے زبان کو لچکا کر اس کو اللہ نے منسوخ کر کے اُنْظُرْنَا اُس کی جگہ مقرر کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے تو معترض کا ہی دین ختم ہوتا ہے کہ نسخ کا ثبوت ہو گیا۔ پھر یہ کہ یہ لفظِ راعنا خود مسلمان کہتے تھے جس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی منافق رَاعِیْنَا کہنے لگے۔ تب مسلمانوں کو اس سے روکا گیا اور نیا لفظ سمجھایا گیا۔ راعنا کوئی آیت نہ تھی بلکہ مسلمانوں کا اپنا کلام تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا۔ اے ایمان والو آئندہ راعنا نہ کہنا الخ)

ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو روکا گیا نہ کہ یہودیوں کو اور روکا اسے جاتا ہے جو پہلے کرتے ہوں تو معلوم ہوا کہ مسلمان پہلے راعنا کہتے تھے جب یہ لفظ مسلمان کہتے تھے تو آیت شیطانی کیونکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے جب منافقوں کے منہ یہ گستاخانہ لچک سنی تو آپ نے فرمایا کہ آئندہ اگر اس طرح یہ لفظ بولا تو میں تم کو قتل کر دوں گا۔ منافق بولے کہ تم بھی یہی کہتے ہو آپ نے جواباً فرمایا ہم تو راعنا کہتے ہیں اور تم بگاڑ کر راعینا کہتے ہو۔ اور پھر اگر یہ لفظ راعنا معاذ اللہ آیت شیطانی ہوتا تو رب تعالیٰ مسلمانوں کو پہلے دن ہی منع کر دیتا اسنا عرصہ کیوں مہلت دی۔ جیسا کہ روح المعانی جلد اول ص ۳۴۸ پر ہے۔ اور پھر یہ لفظ پوری آیت نہیں بلکہ محض جملہ فعلیہ کا جزء ہے۔ قانوناً اس لیے کہ آیتٍ کی تنوین عوضی نہیں ہو سکتی بلکہ تنکیری ہے کیونکہ تنوینِ عوض کے لیے قرینہ ضروری ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ وَ جَعَلْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ :۔ یہاں پہلا بَعْضَهُمْ قرینہ یعنی علامت ہے دوسرے بَعْضٍ کی پہلے نے بتایا دوسرے میں بھی ھُمْ ضمیر مضاف الیہ پوشیدہ اس کے عوض تنوین لگی مگر آیتٍ میں کوئی قرینہ موجود نہیں جو اضافت کو ثابت کرے لہٰذا یہاں نہ تنوین عوض کی ہے نہ لفظِ شیطان مضاف الیہ ہو کر پوشیدہ ہے۔ نیز مَا نَنْسَخْ کا سیاق و سباق بھی بتا رہا ہے۔ کہ یہاں آیتٍ سے قرآنی آیت مراد ہے۔ کیونکہ سباق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ ترجمہ۔ مشرکین وغیرہ کفار نہیں چاہتے کہ تم مسلمانوں پر کوئی خیر کی آیت نازل کی جائے۔ لیکن کافروں کی مراد پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا۔ ترجمہ:۔ ہم اپنی طرف سے لے آتے ہیں۔ اس سے اچھی آیت یا اس کی مثل تعجب اور افسوس ہے :۔ کہ اتنی صاف ...... عبارت کے ہوتے ہوئے پھر بھی صرف اپنی ہٹ دھرمی گمراہی بچانے کے لیے اللہ کے کلام کی گستاخی اور توڑ مروڑ کی جائے۔

آٹھواں اعتراض:۔ معترض کہتا ہے کہ اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ سارے قرآن میں کہیں بھی رجم کا ذکر نہیں نہ زانی کے لیے نہ کسی اور مجرم کے لیے۔

جواب:۔ واقعی اس سے بڑی دلیل آپ کے پاس اور کیا ہو سکتی ہے ان ہی بڑی دلیلوں نے تو آپ لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیا۔ ایسی ہی نکارہ دلیلوں کو آپ لوگ بڑی دلیلیں سمجھ کر تدبر و تفکر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں محترم قرآنِ پاک سے دلائل لینے کے لیے ایمان و عرفان کی نگاہیں چاہئیے۔ آپ کو دلیلیں نہ ملیں حالانکہ رجم زانی اور رجم کا صریحی تذکرہ قرآن مجید میں ہے۔ جیسا کہ کچھ ہم نے بتا دیا۔ اور کچھ آئندہ سطور میں بیان ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہے۔

نواں اعتراض:۔ سنگساری اور رجم ظالمانہ کام ہے۔ اور ظالمانہ کام صرف کفار ہی کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں رجم کو کفار کی طرف نسبت کیا گیا۔ دیکھو آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ کو۔ سورۂ یٰسٓ میں چند رسولوں کو کفار نے رجم کی دھمکی دی اسی طرح اصحاب کہف کو کافروں کے رجم کا اندیشہ ہوا حضرت شعیب کو کفار نے رجم کرنے کی دھمکی دی تو جس کام کو قرآن نے کفار کی طرف منسوب کیا وہ صرف شیطانی ہو سکتا ہے۔ نبی تو درکنار ایک عام مومن بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ **جواب:۔** ہمارے معترض صاحب اپنی منافقت میں

نہایت دیدہ دلیری سے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی یہی نادانیاں گستاخی تک لے جاتی ہیں:۔
معترض صاحب کو صرف رجم ہی ظالمانہ نظر آیا۔ ان کے نزدیک صرف سنگساری ہی بے رحمانہ فعل ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ۔ ہر وہ کام جو انسان کو کافر یا گناہگار بنا دے وہ ظالمانہ ہے۔ اسی طرح جو کام انصاف کے خلاف ہو وہ ظالمانہ ہے:۔
اور جو انصاف کے عین مطابق ہو وہ نہ ظالمانہ ہے نہ بے رحمانہ بلکہ عین عدل اور حکمت پر مبنی اور ضروری ہے۔ قرآن مجید میں ظاہر ظہور رجم کی مار کا ذکر کفار کی طرف بھی منسوب ہے اور اللہ ربِ قہار کی طرف بھی مگر چند فرقوں کے ساتھ۔ پہلا فرق یہ کہ کفار نے صرف رجم کی دھمکی دی مگر رب تعالیٰ نے جس کو رجم کرنا تھا واقعتاً رجم اور پتھروں سے ہلاک کر دیا۔ دوسرا فرق کفار نے نیکوں متقیوں۔ اور نبیوں کو رجم کرنے کی دھمکی۔ مگر رب تعالیٰ نے سرکشوں فسادیوں شیطانوں اور کسی طرح بھی نہ ٹھیک ہونے والوں کو رجم کیا۔ تیسرا فرق کفار نے اپنے ہاتھوں رجم کا ذکر کیا مگر رب تعالیٰ نے آقاءِ دو عالم نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے بذریعہ ملائکہ رجم کیا اور تشریف آوری کے بعد بذریعہ امتِ مسلم۔ چوتھا فرق کفار نے بے گناہ مسلمان کو رجم کی دھمکی دی مگر رب تعالیٰ نے زانیوں لوطیوں گناہگاروں کو عدالت اور قانون کے ذریعے رجم کرایا۔ اور یہ بات بھی یقین کی حد تک ماننی پڑتی ہے کہ توریت میں حکم رجم کی موجودگی کی وجہ سے ضرور زانیوں کو رجم کیا جاتا رہا ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تین جگہ رجم کرنے کا ذکر فرمایا۔ ایک جگہ وہ جب کہ قوم لوط نے بدکاریاں کیں اور لوط علیہ السلام نے بارہا فرمایا کہ اے لوگو تم شادی شدہ ہو تمہاری بیویاں جو میری روحانی بیٹیاں ہیں ان کے پاس جاؤ۔ مگر وہ چونکہ شادی شدہ بے غیرت تھے توبہ کرنا چاہتے ہی نہ تھے اس لیے کیا ہوا۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ سورت ھود آیت ۸۲ (الخ) اور اس پر کنکریلے پتھر برسائے۔ منکرینِ حدیث پر تین سوال ہیں۔ پہلا یہ کہ۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط پر رجم کا عذاب بھیجا۔ کیا ان پر ظالمانہ بے رحمانہ اور معاذ اللہ شیطانی کام کیا۔ اِس کا جواب دو۔ دوسرا سوال یہ کہ۔ قومِ لوط کو رجم کی سزا کیوں دی گئی جبکہ کسی دوسری کافر سرکش قوم کو یہ سزا نہ ملی۔ ان کو طوفانوں ہواؤں چنگھاڑوں کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ سزا ان کے شادی شدہ زانی ہونے کی وجہ سے تھی جس میں اب تھوڑی سی یہ تبدیلی آ گئی کہ اب رجم اس کو کیا جائے گا جو شادی شدہ ہو کر عورت سے زنا کرے۔ اگر ہماری یہ بات تسلیم نہیں تو جواب دو کہ قوم لوط کو اللہ نے فرشتوں سے کیوں رجم کرایا۔:
تیسرا سوال یہ کہ ہم نے ثابت کر دیا کہ شروع زمانوں سے شادی شدہ زانیوں کو رجم کی سزا ملتی رہی آپ ان کے انکار کا ثبوت پیش کرو جس میں صاف لکھا ہو کہ رجم شیطانی کام ہے۔ اعتراض میں آپ نے صرف اپنا وہم گمان پیش کیا آپکے وہم گمان کو ہم نہیں مانتے کیونکہ حقیقت کے خلاف ہے۔ دوسری جگہ۔ سورت ملک آیت ۵ پر لکھا ہے:
وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ۔ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان ستاروں کو شیطانوں کے لیے رجم بنایا۔ ثابت ہوا کہ۔ شیطانوں سرکشوں فسادیوں کو رجم کرنا اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ کام خواہ وہ فرشتوں کے ذریعے کرائے یا اسلامی

عدالتوں کے ذریعے۔ تیسری جگہ۔ قرآن مجید میں بہت جگہ شیطان کو رجیم کہا گیا ہے۔ یعنی رجم اور سنگسار کیا ہوا۔ جب شیطان ابلیس رجم ہو سکتا ہے تو انسانی شیطانی منکوحہ زانی بھی رجم ہو سکتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ زانی پتھر کھا کر مر جاتا ہے۔ برداشت نہیں کر سکتا مگر ابلیس مرتا نہیں۔ اگر شیطان کو رجم نہیں کیا جاتا تو کیا قرآن پاک میں غلط لکھا ہے (معاذ اللہ) اب بتایئے معترض صاحب قرآن مجید میں رجم کا صاف صاف ذکر ہے یا نہیں۔

دسواں اعتراض:۔ چونکہ سارے قرآن میں زنا کی سزا قتل یا رجم نہیں۔ لہٰذا رجم کی موت قتل ناحق ہے۔ اور قتل ناحق بحکم قرآنی حرام ہے۔ سورت اسرا آیت ۳۳ میں لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ قتل صرف قتل کے بدلے ہوتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ اس لیئے یہ کہنا کہ رجم سنتِ رسول مقبول ہے۔ سراسر بہتان ہے۔

جواب:۔ اِلَّا بِالْحَقِّ سے جو ثابت ہے کہ ناحق قتل حرام ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ صرف قتل کے بدلے قتل ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ اور قرآن مجید کی صریحی آیات کے خلاف ہے دین اسلام میں چار قسم کے شخصوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے ۱ مرتد ۲ منافق ۳ فسادی ۴ قاتل۔ چنانچہ سورتِ احزاب آیت ۶۱ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۔ ترجمہ:۔ اور منافق گن گن کر قتل کیئے جائیں۔ یعنی حاکم اسلام منافقوں کو چن چن کر ختم کرے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ سورتِ نساء آیت ۸۹ ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ (الخ)۔ ترجمہ:۔ تو اگر وہ لوگ اسلام سے پھر جائیں پس ان کو پکڑو اور ان کو قتل کردو جہاں کہیں سے جس طرح ہو سکے پاؤ تم۔ یعنی مرتد انسان کو حاکم وقت پکڑوا کر قتل کرا دے۔ ہاں البتہ پہلے پوچھ گچھ کرے علما کے ذریعے اس کے شکوک دور کرائے توبہ کی تلقین کرے کسی طرح مومن نہ بنے تو قتل کرا دے۔ تیسری جگہ ارشاد ہے۔ سورت مائدہ آیت نمبر ۳۳ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا (الخ) یہ آیت ہم نے پہلے بھی بیان کر دی ہے اپنے دلائل کے ضمن۔ اس میں ہر فسادی کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی حاکم اسلام فسادی کو قتل کرے۔ فسادیوں میں زانی محصن (شادی شدہ) پہلے درجے کا فسادی ہے۔ لہٰذا اس کو سخت طریقے یعنی رجم سے قتل کیا جائے۔ چوتھی جگہ قاتل کو قتل کرنا جس کا ذکر معترض کی پیش کردہ آیت میں ہے۔ مجھ کو منکروں کی کم علمی پر اس لیئے افسوس ہے کہ یہ اہل قرآن اور قرآن مجید کے صحیح سمجھ دار ہونے کے دعوے دار ہیں۔ مگر لاعلمی کی یہ حالت ہے کہ خود قرآن مجید کی آیتوں کی بھی خبر نہیں۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ بحکم قرآنی چار شخصوں کے قتل حق ہیں یہ ثابت کر کے معترض کی دسویں دلیل کا خاتمہ کر دیا۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ رجم زانی ناحق قتل نہیں۔ یہ تو وہ قتل تھے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہوئے۔ اس کے علاوہ کچھ وہ قتل ہیں جو حدیث پاک اور تعزیراتِ فقہا سے ثابت ہیں۔ ۱ جیسے لواطت کرنے والے ۲ اور ڈاکو ۳ باغی۔ وغیرہ اٹھارہ قسم کے مجرم تعزیراً قتل کیئے جائیں گے

اب واضح ہو گیا کہ اسلام میں کل بائیس قسم کے قتل حق ہیں۔ اس کے علاوہ تمام قتل ناحق ہیں۔ منکرِ حدیث معترض کا کہنا کہ صرف قاتل کا قتل حق ہے باقی سب ناحق یہ اُن کی جہالت اور کم فہمی ہے۔ **گیارھواں اعتراض**:۔ اللہ تعالیٰ زانیوں کو زندہ رہنے توبہ کرنے اور اصلاحِ حال کا حق عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورت فرقان آیت ۶۸ وَلَا یَزْنُوْنَ۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا (الخ) اور آگے آیت ۶۹: اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ (ترجمہ) :۔ یعنی زانی توبہ کرے اور عمل صالح کرے تو اس کو گناہ سے معافی مل جائے گی۔ اور رجم کے بعد توبہ کی مہلت ہی نہیں ملتی رجم سے قتل ہو جاتا ہے۔ توبہ تو تب ہی ہو سکتی ہے جب زنا کے بعد بھی زندہ رہے۔ ثابت ہوا کہ رجم منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے۔ **جواب**:۔ ظاہری لحاظ سے تو یہ آیتِ کریمہ معترض کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ زانی کو کوڑوں کی سزا بھی نہ دی صرف زانی کو توبہ ہی کافی ہے۔ یہ کورچشمی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ آیات کے الفاظ و معانی میں تدبر نہ کیا۔ بس اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔ خواہ دوسری طرف سے اپنا ستیاناس ہی کیوں نہ ہو جائے محترم اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے نکالنا چاہا۔ بلکہ پوری آیت پاک کا مطلب اس طرح ہے۔ کہ مومن کی شان یہ ہے کہ اُن میں خصوصی طور پر یہ تین عیب نہیں ہوتے۔ ۱ وہ کسی جھوٹے معبود کی عبادت نہیں کرتے ۲ وہ ظلماً جان کو قتل نہیں کرتے ۳ وہ زنا نہیں کرتے۔ اور جو یہ تین کام کرے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ بھاری سزا پائے گا یہ کہ عذاب دوگنا کیا جائے گا۔ اُس کے لیے قیامت کے دن اور قیامت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ تک ذلت میں اس میں رہے گا مگر جو اس کفر سے دنیوی زندگی میں ہی توبہ کرے اور توبہ پر قائم رہنے کی نشانی کے طور پر اچھے عمل کرے کہ نہ شرک نہ قتل ناحق نہ زنا کرے۔ نہ کوئی اور گناہ۔ تو یہی لوگ ہیں جن کے گناہِ سابقہ اللہ نیکیوں سے بدل دے گا۔ ہمارا بیان کردہ مطلب چند وجہ سے لازمی درست ہے:۔

پہلی وجہ:۔ دور سے آیاتِ قرآنیہ میں کفر و اسلام کی نشانیاں ذکر ہوتی چلی آ رہی ہیں پس یہ بھی مومن و کافر کی امتیازی نشانی ہے۔ **دوسری وجہ**:۔ خلود اور عذاب کا دائمی ہونا صرف کافر کے لیے ہے اور صرف زنا سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا۔ **تیسری وجہ**:۔ یہ کہ مُھَانًا یعنی ذلت کی دائمی سزا صرف کافر کو ہو گی۔ مومن کو جہنم کی عارضی سزا بھی ذلت کی نہ ہو گی:۔ **چوتھی وجہ**۔ یہ کہ اگر یہاں زنا کی بات مراد ہوتی تو یضعف یعنی دگنا عذاب مراد نہ ہوتا۔ کیونکہ زانی سزا بھی پائے تو پھر دگنا عذاب کیوں ہوا اور نیز جب جرم ایک ہے تو عذاب دگنا کیوں ہے؟۔ اگر معترض صاحب اب بھی اس مطلب کو نہ ماننے پر مصر ہوں اور علیحدہ زنا کی بات ہی مراد لیں تو ہم کہیں گے پھر اس سے کنوارے کا زنا مراد ہے۔ اور یا وہ زنا مراد ہے جس کی خبر حاکم کو نہ لگے پوشیدہ رہے یا اسلامی حکومت نہ ہو یا سزا نہ دی جاتی ہو تو اس صورت میں سچی توبہ سے رحیم و کریم رب تعالیٰ معاف فرما دے گا

بحمدہ تعالیٰ ہم نے نہایت دیانت داری انصاف کے ساتھ معترض کے تمام شکوک وشبہات اور دلائل واعتراضات واضح طور پر بیان کرکے ایک ایک لفظ کی مکمل تردید وتشفی کردی۔ اب معترض صاحب اللہ دتہ چوہدری فیصل آبادی۔ اور ایم آئی چوہدری ایڈوکیٹ لاہوری صاحب ودیگر منکرین حدیث میرے اس فتوے کو ٹھنڈے دل سے تحقیقِ حق کے لیے باغور وتفکر وتدبر پڑھیں اور زانی کو توبہ کرانے کے ساتھ اپنے باطل نظریات وعقائد سے بھی توبہ کریں اور وفاقی شرعی عدالت کا فرض منصبی واسلامی ہے کہ معترض کے دلائل سے متاثر ہوکر جو فیصلہ حد شرعی رجم زانی کے خلاف صادر کرچکے ہیں اُس سے رجوع کرتے ہوئے اپنا فیصلہ واپس لیں۔ اور صحیح اسلامی نظریئے کے مطابق رجم زانی کا فیصلہ جاری فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو خدمتِ اسلام کا اجر عطا فرمائے:۔ فالحمد للہِ علیٰ ذالِکَ۔

بس ایک سوال باقی ھے۔ جس کا ذکر اور وضاحت اشد ضروری ہے۔ وہ یہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ زنا جرم ایک ہے۔ اس کی نوعیت وطریقہ فعل بھی ایک ہے۔ مگر سزا تین طرح مختلف ہے۔ اس طرح کہ شادی شدہ مجرم زانی کو سنگسار یعنی رجم کرکے ھلاک کردیا جائے۔ اور کنوارے زانی کو سو کوڑے مار کر زندہ رکھا جائے اور لونڈی غلام کو آدھی سزا پچاس کوڑے۔ اور مجبور کو بالکل معاف کردیا جائے۔ تو یاد رکھو اسلام کو مجرم سے صرف جرم کی وجہ سے نفرت ہے۔ جرم جب تک صرف جرم ہی رہے اس وقت تک اس کی سزا بطورِ اصلاح ھوتی ہے لیکن جب جرم فساد اور سرکشی کا روپ دھالے تو مجرم کی اصلاح کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس کو زندگی کا حق دینا معاشرے پر ظلم ہوتا ہے۔ شادی کے بعد انسان عظیم ذمہ داریوں کا خود مختار مالک بن جاتا ہے وہ اپنی اصلاح بذاتِ خود بخوبی ادا کرسکتا ہے۔ اس کو قدرت نے ہر طرح کا قلبی نفسانی ھیجانی سکون عطا کردیا ہے۔ اب وہ اپنی آئندہ بہتر زندگی بنانے کا ذمّہ دار ہے مگر وہ اس طرف توجہ ہی نہ کرے اور اس سکونِ قلبی کی قدر نہ کرے۔ کتے بلے کی طرح حرص وحوس کی گندگی میں پھنستا رہے تو اب وہ مجرم وسرکش ہے کہ جس اچھائی کے لیئے اس کو موقعہ دیا گیا ہے۔ اُس کی طرف راغب نہیں۔ اس کا زنا کسی مجبوری کے تحت نہیں۔ پس ایسے سرکش کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ بخلاف کنوارے زانی کے کہ ابھی اس کو سکون کے موقعہ اور باعزت زندگی بنانے کا اختیار نہ ملا۔ کنوارا شخص اپنے زندگی کو بے کیف اور ھیجانی سمجھتا ہے اس لیئے مجبور ہوکر شیطانی راہ چلتا ہے۔ لہٰذا اُس کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا۔ اور اُس کی سزا سَو دُرّے بھی اُس کے اصلاحِ حال کے لیئے ہے۔ اس سزا کے خوف سے وہ اپنی اصلاح کرے گا۔ طبیعت پر جبر کرنے کی عادت پیدا ہوگی۔ سزا کے بغیر تو اچھے سے اچھا انسان بھی بے مہارا ہو جاتا ہے۔ لونڈی غلام کو دینوی کسی اسٹیج پر مکمل حقوق نہیں ملتے اس لیئے اُس کو اصلاحِ حال کے بہت کم موقعہ میسر آتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہ مجبورِ محض ہوتے ہیں۔ چونکہ اُن کے انعامات بھی آدھے ہیں۔ عزت آدھی درجہ آدھا۔ اس لیئے سزا میں بھی اُن کو آدھا حصّہ دیا گیا۔ لونڈی غلام کنوارا زانی ھو یا منکوحہ ان کو رجم نہ کیا

جائے گا کہ وہ ملکیت غیر ہیں۔ ورنہ اس کے جرم سے نقصان مالک کا ہوگا اور یہ انصاف سے دور ہے شریعت اسلامیہ میں ناجائز ہے واللہ ورسولہ اعلم
کتبہ

ناجائز کھیل کود اور لواطت شرعاً تعزیری جرم ہیں

سوال ع۲۰:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مرغوں بٹیروں کو لڑانا جائز کھیل ہے یا ناجائز اور لواطت کی بدکاری کی اسلام میں کیا سزا ہے، بینوا توجروا۔ سائل۔ نور محمد ٹنڈو الہیار سندھ پاکستان

الجواب بعون العلام الوهاب

(۱):- لواطت کرنے والا اگر زبردست ہے اور زبردستی سے لواطت کر رہا ہے یا مفعول نابالغ ہے یا مجنون ہے۔ تو وہ مفعول گناہ گار نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کے خلاف دونوں کی خوشی ہے۔ تو دونوں گناہگار ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ اَلْفَاعِلُ وَالْمَفْعُوْلُ مَلْعُوْنَانِ ط (۲) مرغوں کو لڑانا ظلم ہے اور کھیل بھی۔ ظلم تو بہر حال حرام ہے۔ کہ نصّ قرآنی سے ثابت ہے لیکن کھیل کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔ کُلُّ لَهْوٍ بَاطِلٌ اِلَّا ثَلَاثَۃً یعنی مسلمانوں کے تمام کھیل حرام ہیں۔ سوائے تین کے۔ ۱ بیوی سے خوش طبعی کرنا ۲ گھڑ دوڑ یا ورزش کے کھیل بشرطیکہ ستر ننگا نہ ہو ۳ تیر۔ بندوق خنجر تلوار کی نشانہ بازی یا گتکا وغیرہ یہ کھیل ان تین میں شامل نہیں ہے اس لیئے قانون شریعت کے مطابق مرغ لڑانا دو طرح ناجائز ہوا۔ ایک ظلم کی وجہ سے اور ایک کھیل ہونے کی وجہ سے یہی حکم شرعاً بندروں کے ناچ دیکھنے کے متعلق ہے۔ بر صرعجا باطل محض ہے یہ سب تعزیری جرم ہیں جن کو بند کرنے کیلیئے حاکم اسلام اپنے اختیار سے حسب حال تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ واللہ ورسولہ اعلم
کتبہ

سادات کے ادب کا بیان

سوال ع۲۱:- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک مسمٰی جاروب کش سڑکوں نالیوں میں جھاڑو دینے والا مسمّٰی عطا ایک سید زادے خالد کو بہت سے بے ہودہ بکواسات کرتا ہے۔ اور اس پر کلہاڑی لے کر حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے تو حرامی ہے تو اپنے باپ کا نہیں۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ اس سلسلہ میں دو معتبر گواہ موجود ہیں جو متقی صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ان کے حلفیہ دستخط درج ذیل ہیں، ان دونوں گواہوں نے یہ چشم دید واقعہ بھرے مجمع میں بیان کیا۔ اب کچھ لوگ کہتے ہیں یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لہٰذا آپ شریعت کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمائیں ہم غلامانِ مصطفیٰ بے تابی سے جواب کے منتظر ہیں

سائل غلام مصطفیٰ۔ گواہ ع۱ محمد یونس و گواہ ع۲ محمد بشیر معرفت ابو المسعود بسمل مدنی خطیب جامع مسجد، اسگنل گھڑیال کیمپ تحصیل مری ضلع راولپنڈی ۷۷-۱۲-۱۲

جناب محترم السلام علیکم آپ کا پیارے انداز میں گرامی نامہ اور استفتا حاضر ہوا۔ حسن اتفاق سے اس کا جواب لکھنے کی سعادت آج دس محرم شریف ۱۳۹۸ھ بروز بدھ بعد نماز فجر ۱۹۷۷-۱۲-۲۱ کو حاصل کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ مجھ کو سادات کے دروازے کا دربان بنائے اور اسی کے طفیل میرے گناہ معاف ہو جائیں

اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو۔

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

سوال مذکورہ میں متذکرہ مسلم بھنگی (جاروب کش) جس کو پنجابی میں مسلی کہا جاتا ہے عطا سخت گناہ اور بد اخلاقی ہے اور شرعی سزا کا مستحق ہے۔ اسلئے کہ قانون شریعت کے نظریہ مطہرہ کے اعتبار سے دنیائے کائنات میں سب سے بڑا مقام و درجہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہے۔ اور ان کی نسبت سے اُن کی اولادِ پاک تا قیامت کا مرتبہ سارے انسانوں سے بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ غوث و قطب کو بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے ادب کے سوا چارہ نہیں۔ یہ نسبت ہی کی شان ہے کہ قرآن کریم میں خود باری تعالیٰ عزَّ اسمُہٗ نے اپنے قانون کے پہنچانے کی اُجرت محبتِ سادات مقرر فرمائی۔ اور بہت شان سے اور اہمیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسلِ پاک کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (ترجمہ) اے پیارے حبیب فرما دیجئے میں اپنی اس ساری تبلیغ پر تم سے تنخواہ یا اُجرتِ مال و دولت نہیں مانگتا۔ ہاں اپنے (آنے والوں) قرابت والوں کی محبت مانگتا ہوں۔ رب تعالیٰ نے اجرت کے ساتھ محبت کا ذکر فرما کر محبّت کو اجرت بنا دیا کہ جس طرح اُجرت دینا فرض و واجب ہوتی ہے اسی طرح سادات سے محبت کر کے تم احسان نہ کرو گے۔ بلکہ جس طرح نماز روزہ، حج، زکوٰۃ سب مسلمانوں پر تا قیامت اشد فرض ہے۔ اسی طرح نبی کریم رؤف و رحیم علیہ التحیۃ والثناء کی اولادِ پاک سیدوں سے محبت کرنا اُن کی ہر طرح خدمت کرنا ہر مسلمان پر فرض و لازم ہے۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، وزیر ہو یا بادشاہ سب سادات کے خدام ہیں اور سب پر سیدوں کا احترام لازم و واجب ہے۔ اور جس طرح نماز میں کوتاہی کرنے والے کو میدانِ محشر میں سزا ہوگی اسی طرح وہ بھی عذاب و عتاب میں مبتلا ہوگا۔ جس نے سیّد کی عزت میں فرق ڈالا۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ جلّ برہانہٗ کو اپنے حبیب کی ہر چیز پیاری ہے۔ یہ سب قانون قرآنِ پاک کی اِس آیت سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین عظام نے یہ توجیہہ بھی بیان فرمائی ہے کہ یہاں بذات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کا حکم ہے۔ جو صرف اہلِ مکہ قریش اور ہاشمیوں سے خطاب ہے۔ مگر یہ بات زیادہ مضبوط اور درست نہیں اس لئے کہ اِس توجیہہ کو تسلیم کرنے میں دو رکاوٹیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر یہاں قریشِ مکہ کی محبت رشتہ داروں والی مراد ہوتی اور اس کا مطالبہ ہوتا تو روشِ کلام کے لحاظ سے یہاں فِي الْقُرْبٰى نہ ہوتا۔ لِلْقُرْبٰى ہوتا۔ کیونکہ قرابت داری کو محبت کا سبب بنایا جاتا۔ اور لام سببیت کا ہوتا ہے نہ کہ فی۔ یہی وجہ ہے کہ جن مفسرین نے محبت قریش والی توجیہہ نکالی ہے اُن کو مجبوراً فی بمعنیٰ لام کہنا پڑا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ خواہ مخواہ اتنی کھینچا تانی کی ضرورت کیا ہے

جبکہ روشن کلام سے بھی قیامت تک کے سادات کا ادب ہی مقصود من اللہ ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس توجیہہ سے یہ منشاءِ قرآنی و مطالبۂ رحمانی بہت ہی محدود رہ جائے گا۔ حالانکہ وسعتِ تبلیغ اِس مطلبے کی وسعت کی متقاضی ہے۔ کیونکہ اِس محبت کو تبلیغ قانون کی اجرت بنایا گیا۔ تو جس شخص تک یہ تبلیغ پہنچی اور جس جس نے اس قانون سے فائدہ حاصل کیا اُس اُس کو اُجرت دینی فرض ہے۔ اور یہ فطری امر بھی ہے کہ جو شخص قانون سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو کورٹ فیس دینی لازم ہے۔ قیامت تک ہر مسلمان نماز روزہ حج زکوٰۃ سے اور نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فائدہ حاصل کر رہا ہے لہٰذا اُس کو اِس کی اُجرت سادات کرام کی عزت و خدمت بھی ادا کرنی فرض ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ نبی کریم شہنشاہِ کائنات کو اِس محبت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جو اہلِ مکہ قریش مسلمان ہو چکے تھے اُن کی مودّت تو خود بخود حاصل ہو گئی کہ محبت کے بغیر ایمان ہی نہیں جیسا کہ ارشاد ہے۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا مُحَبَّتَ لَہٗ اور لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ (الخ) مشکوٰۃ شریف کی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہے۔ محبت کے بغیر ایمان منافقت ہے۔ اور جو قریش مسلمان نہ ہوئے اُن کی محبت بے کار کہ کافر کی محبت نقصان دہ بلکہ ناممکن۔ پس مسلمان کی محبت کا مطالبہ تحصیلِ حاصل اور کافر کی محبت محال بالذات۔ تو ایسا مطالبہ بھی ٹھیک نہیں۔ اب ماننا پڑے گا کہ اِس آیت میں قیامت تک سادات کی محبت کا مطالبہ ہے اور ہر مسلمان پر سید زادے کا ادب و احترام فرض ہے۔ جیسا کہ نماز روزہ فرض ہے۔ اس آیت کے مکی ہونے سے یہ اعتراض نہیں پڑ سکتا کہ امام حسن و حسین کی ولادت مکی نہیں۔ لہٰذا یہاں اولاد کی مودّت مراد نہیں اس لیے کہ حضرت فاطمہ زہرا مکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ کوثر مکی کے نزول پر کوثر سے مراد فاطمہ زہرا لیا گیا۔ اور نسلِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فاطمہ زہرا سے چلی جو قیامت تک رہے گی اِسی کی مودّت مومنوں پر فرض ہے۔ یہ تو قرآن پاک سے ثابت ہوا متعدد احادیث سے بھی اِس فرضیت کی ادائیگی کا ثبوت مہیا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی جلد ۱۳ پارہ ۲۵ صفحہ نمبر ۳۱ پر ہے۔ وَ رَوٰی زَاذَانُ عَنْ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَجْہَہٗ فِیْنَا اٰلَ حٰمٓ اٰیَۃٌ لَا یَحْفَظُ مَوَدَّتَنَا اِلَّا مُؤْمِنٌ (ترجمہ) حضرت زاذان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا کہ مولیٰ علی مشکل کشا کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ حٰم والی سورت میں ایک آیت ہمارے بارے میں ہے۔ ہم سے محبت مومن ہی کرتا ہے۔ وہی ہماری مودّت کو محفوظ کرتا ہے۔ آقا۔ ُکل دانائے سبل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَجَّتِہٖ یَوْمَ عَرَفَۃَ وَھُوَ عَلٰی نَاقَتِہِ الْقَصْوَاءِ یَخْطُبُ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ (ترجمہ) روایت ہے حضرت جابر سے اُنہوں نے فرمایا کہ دیکھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حج مبارک

میں عرفہ کے دن قصواء مبارکہ اونٹنی پر خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو سنا میں نے کہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اے لوگو بے شک میں نے تم میں وہ چیز چھوڑی ہے اگر تم مضبوط پکڑے رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے ایک چیز کتاب اللہ ہے اور دوسری چیز میری عترت میرے اہل بیت ہیں۔ یہ حدیث شریف ترمذی جلد دوم صفحہ نمبر ۲۱۹ پر ہے۔ یہ حدیث شریف اسناداً قوی تر ہے۔ اس فرمان پاک سے قرآن کریم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ حضرات سادات کی شان واہمیت بھی معلوم ہوئی۔ کہ جس طرح قرآن کریم کی عزت اور محبت مسلمان کو گمراہی سے بچاتی ہے اسی طرح پیارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد پاک سید حضرات بھی قابلِ تکریم اور واجبُ التعظیم ہیں۔ اور ان کی عزت سے مومن کی دین و دنیا کی کامیابی وابستہ ہے۔ اور جس طرح قرآن کریم کی گستاخی کفر ہے اسی طرح سادات کی گستاخی بھی کفر ہے۔ اس لیئے کہ اس حدیث پاک نے عترتی کو کتابُ اللہ پر عطف کیا اور بقاعدۂ نحویہ معطوف علیہ کے حکم میں ہی معطوف ہوتا ہے۔ عترتی کی اہمیت اس بات سے مزید ہوتی ہے کہ خود پیارے آقا صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس لفظ کی تشریح اَھْلُ بَیْتِیْ کہہ کر بیان فرمادی۔ تاکہ کچھ اجمال باقی نہ رہے۔ تفسیر ابن کثیر نے جلد چہارم صفحہ ۱۱۲ پر بسند صحیح فرمایا۔ قَالَ اَحْمَدُ حَدَّثَنَا جَرِیْرٌ (الخ) قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَا یَدْخُلُ قَلْبَ اِمْرِئٍ مُسْلِمٍ اِیْمَانٌ حَتّٰی یُحِبَّکُمْ لِلّٰهِ وَلِقَرَابَتِیْ ترجمہ امام احمد بن حنبل نے مسند حنبل میں فرمایا کہ حضرت جریر نے حدیث فرمائی۔ کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے میرے اہلِ بیت اللہ کی قسم کسی مسلمان شخص کے دل میں اُس وقت تک ایمان نہیں داخل ہو سکتا جب تک کہ تم سے اللہ کے لیئے اور میری قرابت داری کی وجہ سے محبت نہ کرے۔ اللہ اکبر کیا شان ہے سیدّوں کی کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم جن کی قسمیں رب فرماتا ہے۔ وہ اللہ کی قسم فرما کر سیدّ کی محبّت کا سبق اپنی امت کو سکھا رہے ہیں۔ اور آگاہ فرما رہے ہیں کہ ایمان کا دارومدار سادات کی محبّت ہے۔ تفسیر روح البیان شریف جلد ہشتم نے صفحہ نمبر ۳۱۲ پر آقائے دوعالم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل خطبہ نقل فرمایا ہے۔ جس کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اور درمیان ایک جملہ مبارکہ اس طرح ہے۔ اَلَا وَمَنْ مَاتَ فِیْ بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ کَافِرًا۔ ترجمہ۔ پیارے آقا صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خبردار اور وہ شخص جو مرا آلِ محمد پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بُغض میں وہ مرا کافر ہو کر۔ اس روایت کو تفسیر کبیر جلد ہفتم نے صفحہ نمبر ۴۰۹ پر تفسیر کشاف سے نقل کیا۔ اور مزید دو روایات نقل کیں کہ۔ مَنْ مَاتَ عَلٰی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مَکْتُوْبًا بَیْنَ عَیْنَیْهِ اٰیِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ دوسری دوایتاً مَنْ مَاتَ عَلٰی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ لَمْ یَشُمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ترجمہ۔ جو سادات کے بُغض میں مرے گا اس کے ماتھے پر بروز قیامت لکھا ہوگا

یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔ اور وہ جنت سے اتنا دور رہے گا کہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔ روح البیان کی یہ روایت اگرچہ سنداً موضوع معلوم ہوتی ہے۔ مگر معناً بالکل درست ہے۔ اس لیئے کہ اس سے پہلے تفسیر ابن کثیر کی صحیح روایت میں ایمان کا مدار محبتِ سادات مقرر فرمایا تو لازمی بات ہے کہ عداوتِ سادات کفر کا مدار بنے گا۔ ورنہ اجتماعِ ضدّین کا اندیشہ ہے بھی خیال رہے کہ قرآن و حدیث کے فرمودات میں قرابت اور اہل بیت سے مراد تاقیامت سید خاندان ہیں۔ نہ کہ تابعیت یا تبع تابعیت اور نہ ہی فقط امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ اس لیئے کہ قرآن کریم میں بھی اور حدیث پاک میں بھی اہلِ بیت کو قرآن کریم سے نسبت و معیّت دی ہے۔ نہ کہ صحابیت یا تابعیت سے اس کی وجہ یہ ہے کہ دورِ صحابیت وغیرہ قلیل ہے اور دورِ قرآن تاقیامت کثیر۔ پس کثیر کے ساتھ معلّق کرنے سے ثابت ہوا کہ اہل بھی وہ ہیں جو تاقیامت ہوتے رہیں گے۔ اور وہ سید ہی ہیں۔ للہذا ان موجودہ سادات کی عزت و محبت ایمان ہے اور ان کی بے ادبی گستاخی کفر یا فسق ہے۔ اگر صرف حضرات حسنین کریمین کی ہی عزت مدار ایمان ہوتا تو اس کا ذکر صحابہ کے ساتھ ہوتا نہ کہ کلام پاک کے ساتھ۔ اور پھر ان کی مودّت اجرتِ تبلیغ اسلام بنتی محبّت و مودّت میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ محبّت صرف قلبی الفت کا نام ہے جو غائبانہ بھی ہو جاتی ہے۔ مگر مودّت اس امداد کو کہتے ہیں جو عقیدت کے ساتھ ہو۔ جیسے غلام آقا کی، مرید پیر کی، شاگرد استاد کی امداد کرتا ہے (مجمع البحار سوم صفحہ ۴۲۵) مودت ہمیشہ موجود سے ہوتی ہے نہ غیب سے نہ معدوم سے۔ پس سوچ لو کہ رب تعالیٰ نے اِلَّا الْمَحَبَّۃَ فِی الْقُرْبٰی نہ فرمایا بلکہ اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فرمایا۔ فقہاءِ کرام فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص عالم دین سے بلا عذرِ دینوی بغض رکھے وہ کافر ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۷۰ پر ہے:۔ مَنْ اَبْغَضَ عَالِمًا مِنْ غَیْرِ سَبَبٍ ظَاهِرٍ خِیْفَ عَلَیْهِ الْکُفْرُ (الخ) وَیُخَافُ عَلَیْهِ الْکُفْرُ اِذَا شَتَمَ عَالِمًا اَوْ فَقِیْهًا مِنْ غَیْرِ سَبَبٍ ترجمہ جو شخص عالم سے بغض رکھے بغیر کسی ظاہری وجہ کے اس پر کفر کا اندیشہ ہے۔ اور اندیشہ کیا جاتا ہے اس پر بھی کفر کا جس نے عالم یا فقیہ کو بغیر ظاہری سبب کے گالی دی۔ اس فرمان سے ثابت ہوا کہ کسی بھی دینی بزرگ کو گالی دینا یا اُن سے بغض رکھنا صرف اس لیئے کہ وہ عالمِ دین ہے کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ تو بتاؤ کہ سیّد جس کی عظمت کا حکم خود خالقِ کائنات نے صادر فرمایا۔ اور جس کو آقائے دو عالم رحمتِ کائنات کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے وہ کس قدر دینی بزرگی والا ہوگا اور اس کی گستاخی کس درجے کفر ہو گی۔ بہرحال سیّد کی گستاخی سخت ترین جرمِ شرعی ہے۔ سیّد وہ لوگ ہیں جو امام حسن اور امام حسین کی اولاد سے ہوں۔ اگرچہ سیّد زادہ فاسق ہو۔ لیکن اس کی گستاخی، اور اس سے محض سیّد ہونے کی بنا پر بغض رکھنا کفر ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سیّد زادے کو پڑھانے والا استاد بھی عالم یا محدّث مفسّر اس سیّد شاگرد کی توہین نہیں کر سکتا بلکہ بامرِ مجبوری مارنے کی صورت میں بھی گمان کرے کہ اپنے آقا زادے کو تادیباً ایسا کر رہا ہوں۔ بلکہ روحانی علاج یا میل

کچیل دور کرنے کی نیت کرے۔ امام اعظم امام شافعی جیسی اعلیٰ ترین شخصیات بھی سیّد کا احترام کرتی رہیں۔ تو ما و شما کس زمرے میں ہیں۔ قانون شرعی کے مطابق جو شخص سید سے صرف اس لیئے بُغض رکھے یا گستاخی کرے کہ نبی کریم کی اولاد ہے تو ایسا شخص کافر ہوگا۔ اور اگر دنیوی وجہ سے گستاخی کرتے تو گمراہ ہے۔ اور لائق تعزیر ہے۔ یہاں تک حکم ہے کہ سیّد زادہ کسی کو برا کہے یا ناراضگی میں سب و شتم کرے تو اس کو بھی برداشت کیا جائے اور نرمی سے سمجھایا جائے جواباً لڑائی مت کرو۔ اور یہ خیال کیا جائے کہ یہ ہمارے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ہیں۔ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمارے آقا زادے و مخدوم ہیں۔ عقل کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سیّد کا احترام کیا جائے۔ اس لیئے کہ عقلاً نقلاً یہ بات درست ہے کہ ہر ادنیٰ اعلیٰ کے ماتحت ہے اور ادنیٰ پر اعلیٰ کا احترام واجب اور یہ بھی قاعدہ کلیہ ہے کہ ادنیٰ کی ہر چیز ادنیٰ ہے اور اعلیٰ کی ہر چیز اعلیٰ ہے۔ مومن انسان کو باری تعالیٰ کی طرف سے تین چیزیں عطا ہوئیں ۱ جسم ۲ روح ۳ ایمان۔ ان میں سب سے ادنیٰ جسم اور سب سے اعلیٰ ایمان۔ بحکم قرآنی جسم کو جان پر اور جان کو ایمان پر قربان کرنا اشد ضروری ہے۔ کہ اگر جان کا خطرہ ہو تو حرام کھالے اور اگر ایمان کا خطرہ ہو تو جان کی پرواہ نہ کرے ایمان بچالے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اعلیٰ چیز کا احترام ادنیٰ پر لازم ہے۔ تو سمجھ لو کہ کائنات میں ذاتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اعلیٰ ہے۔ اور بقاعدۂ مشہورہ اعلیٰ کی ہر چیز اسی درجے کی ادنیٰ کی ہر چیز سے اعلیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کائنات میں جو فضیلت مدینہ منورہ کو ہے وہ کسی شہر کو نہیں۔ وہاں کی مٹی کنکر پتھر ساری دنیا کے کائنات سے افضل۔ پس وہ نسلِ پاک مصطفیٰ جس میں خونِ پاکِ مصطفیٰ موجزن ہے وہ سب دنیا سے افضل کیوں نہ ہوگا۔ جب بادشاہ کی اولاد دنیوی نظر میں رعایا پر افضل ہوئی۔ پیر مرشد کی اولاد سب مریدین کی نظر میں قابلِ ستائش۔ استاد کی اولاد شاگردوں کے لیئے قابلِ عزت ہوتی ہے۔ تو پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ محترم سادات کا مرتبہ تمام امت میں افضل و اشرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرشتے بھی سادات کا احترام کرتے ہیں۔ کہ وہ بھی امت میں شامل ہیں۔ سیّد سے بغض رکھنے والا کبھی درجۂ ولایت پر نہیں پہنچ سکتا۔ خواہ کتنے ہی عمل صالح کرے۔ ہاں تاریخ سے ثابت ہے کہ بے عمل شخص سیّد کا احترام کر کے ولایتِ عظمیٰ کا مقام حاصل کر گیا۔ دیکھو حضرت جنید بغدادی کا واقعہ۔ دنیا میں ہر انسان کا احترام اس کے کمال سے کیا جاتا ہے۔ مگر سید بے کمال بے علم یا نادان مجنون ہو۔ تب بھی اس کا احترام فرض ہے۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا کمال نسلِ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہونا ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔

شعر

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانا نور کا

یہی وہ کمال ہے جس کی بنا پر سیّد کو رب تعالیٰ کی طرف سے وہ رتبہ ملا۔ جو کسی بادشاہ، پیر، فقیر، عالم، مفتی

کو نہ بلایں تو کہتا ہوں کہ اگر کسی ولی اللہ کو مرتبۂ علیا میسر نہ آتا ہو یا کسی شخص کے عقدے نہ کھلتے ہوں یا کوئی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو تو وہ شخص چالیس دن کسی نجیب الطرفین متقی باوضو سیّد کے پیر اور ہاتھ دھوکر پیئے بفضلہٖ شفا ہو گی اور مرادِ قلبی پوری ہو گی۔ سیدوں کا یہ احترام آخر کیوں ہے صرف اور صرف اس لیئے کہ یہ نبی کریم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسلِ پاک ہیں۔ لہٰذا شرعی قانون کے مطابق مندرجہ بالا دلائل کے تحت جو شخص صرف اِس لیئے سید سے بغض رکھتا ہے یا سید کی گستاخی کرتا ہے کہ وہ نبی کریم کی اولاد ہے تو وہ شرعاً مرتد کافر ہے۔ اور جو شخص سید سے ذاتی بنا پر بغض یا دشمنی کرے یا گالی دے تو وہ گمراہ ہے کافر نہیں۔ خاص کر ماں کی گالی دینا سید کو بہت بڑی گمراہی ہے۔ اسلام کے راستے سے ہٹنے کا نام گمراہی ہے خواہ جان کر ہٹے یا بھول کر چنانچہ تفسیر بیضاوی علیٰ اربع تفاسیر جلد اول صفحہ نمبر ۲۳ پر ہے:۔ وَالضَّلَالُ الْعُدُوْلُ عَنْ طَرِيْقِ السَّوَاءِ عَمْدًا اَوْ خَطَاءً ترجمہ:۔ اور گمراہی اسلام کے سیدھے راستے سے ہٹنے کا نام ہے جان بوجھ کر یا خطا سے۔ بحکمِ قرآن مجید سید کا احترام کرنا بھی اسلام کا راستہ ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔ لہٰذا اس کا منکر کافر اور اس سے صرف ہٹنے والا گمراہ ہوتا ہے۔ پس صورتِ مذکورہ میں جاروب کش مسمیٰ عطا اِس گالی گلوچ اور سید زادے کی گستاخی کی بنا پر سخت فاجر فاسق اور گمراہ ہوا۔ شرعی طور پر یہ جرم قابلِ تعزیر ہے۔ اس لیے کہ قانونِ اسلامی میں گالی و گستاخی کی تعزیر کیلئے تین شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ فعلِ اختیاری کی گالی یا تہمت دے فعلِ خلقی کی تہمت نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ گالی یا تہمت شرعاً حرام ہو۔ تیسری شرط یہ کہ عام طور پر اُس گالی کو عار اور شرم سمجھا جاتا ہو۔ چنانچہ فتاویٰ درِمختار مکمل صفحہ نمبر ۳۲۶ پر اور فتاویٰ شامی جلد سوم صفحہ نمبر ۱۸۵ پر ہے:۔ وَالضَّابِطُ اَنَّهٗ مَتٰى نَسَبَهٗ اِلٰى فِعْلٍ اِخْتِيَارِيٍّ مُحَرَّمٍ شَرْعًا وَيُعَدُّ عَارًا عُرْفًا يُعَزَّرُ وَاِلَّا لَا (ترجمہ) اور تعزیر میں قاعدۂ کلیہ شرعیہ یہ ہے کہ جب منسوب کیا کسی شخص نے اس دوسرے شخص کو فعلِ اختیاری میں اور یا ایسے فعل میں جو شرعاً حرام ہو یا عار سمجھا جاتا ہو عرف عام میں تو وہ تعزیر دیا جائے گا ورنہ نہیں۔ سوال مذکورہ میں جاروب کش مسمیٰ کے دوسرے بکواسات کا تو علم نہ ہو سکا کیونکہ سائل نے تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ اس کا سید زادے کو یہ کہنا کہ تو حرامی ہے اپنے باپ کا نہیں۔ سخت سخت قابلِ تعزیر گالی ہے اس میں تعزیر کی تینوں شرطیں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس کو زنا کی تہمت ہے اور زنا فعلِ اختیاری ہے۔ یہ گالی شرعاً بھی حرام ہے اور یہ فعل یا حرامی ہونا شرم اور عار کی بات ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا تعزیر کی سزا والا جرم ہے۔ ہدایہ اولین کے حاشیہ نہایہ میں ۸۱ ص ۵۱۳ پر ہے۔ وَالْاَصْلُ فِيْهَا اَنَّ مَنْ قَذَفَ غَيْرَهٗ بِكَبِيْرَةٍ لَمْ يَجِبْ فِيْهَا حَدٌّ يَجِبُ فِيْهَا التَّعْزِيْرُ:۔ ترجمہ اور قاعدہ کلیہ اس بارے میں یہ ہے کہ بے شک جس نے اپنے غیر کو کسی ایسے بڑے گناہ کی تہمت لگائی جس سے حدِ قذف واجب نہیں ہوتی تو اس سے تعزیر واجب ہو گی۔ تعزیر کی یہ تین شرطیں تو عام مسلمانوں کو

گالی دینے سے ہیں لیکن فقہا علما اور سید حضرات کو گالی دینا اس سے بھی زیادہ نازک مقام ہے کہ اُن اکابرِ اسلام کو ایسی معمولی گالی دینا جو عام کو دینے سے تعزیر نہیں پڑتی۔ مگر یہاں اِس گالی سے بھی تعزیر واجب ہوجاتی ہے چنانچہ ہدایہ شریف اوّلین صفحہ نمبر ۵۱۶ پر ہے:۔ وَلَوْ قَالَ یَا حِمَارُ اَوْ یَا خِنْزِیْرُ لَمْ یُعَزَّرْ (الخ) وَقِیْلَ اِنْ کَانَ الْمَسْبُوْبُ مِنَ الْاَشْرَافِ کَالْفُقَهَاءِ وَالْعَلَوِیَّةِ وَالسَّادَاتِ یُعَزَّرُ ۔ ترجمہ! اور اگر کسی نے کسی کو کہا اے گدھے یا اے خنزیر تو تعزیر نہ ہوگی (کیونکہ یہ فعل اختیاری کی گالی نہیں ہے فعلِ خلقی کی گالی ہے) اور کہا گیا ہے کہ اگر گالی لینے والا افضل واشرف لوگوں میں سے ہو جیسے کہ علماء کرام اور سید حضرات تو تعزیر واجب ہوگی۔ اس عبارت سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ سید کو معمولی گالی دینا بھی تعزیری جرم ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام میں افضل اور اشرف اور شرافت والا وہی آدمی ہے جو دینی لحاظ سے بڑا ہو۔ اسلام میں دنیوی بڑائی کی کوئی قدر نہیں۔ پس جاننا چاہئے کہ بادشاہ، وزیر، امیر ہونا دنیوی بڑائی ہے۔ اور سید ہونا عالم ہونا حافظ قاری امام ہونا ولی اللہ ہونا دینی بڑائی ہے۔ دونوں جہان میں اسی کی قدر ومنزلت ہے۔ شرعی تعزیر کم از کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے ہیں۔ چنانچہ ہدایہ اوّلین صفحہ ۵۱۶ پر ہے:۔ وَالتَّعْزِیْرُ اَکْثَرُهٗ تِسْعَةٌ وَّثَلٰثُوْنَ سَوْطًا وَاَقَلُّهٗ ثَلٰثُ جَلَدَاتٍ ۔ ترجمہ:۔ اور تعزیر زیادہ سے زیادہ ۳۹ کوڑے ہیں اور کم از کم تین کوڑے ہیں۔ سوال مذکورہ میں جاروب کش عطا نے سید زادے کو گالی دے کر تعزیری جرم کیا ہے لہٰذا اگر حکومت کے ذریعے سزا دلوانی ہے تو دس کوڑے لگوائے جائیں کیونکہ کوڑے لگانا صرف حکومتِ وقت کا کام ہے۔ اور اگر حکومت یہ سزا نہ دے تو فتویٰ سے تعزیری طور پر مجرم عطا پر واجب ہے کہ وہ سب کے سامنے اس سید زادے سے معافی مانگے۔ اور جس طرح بھی ہو اس کو راضی کرے خواہ پیسے دے کر یا کسی اور طرح۔ اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اور آئندہ کے لیئے سچی توبہ کرے۔ ورنہ کل قیامت میں اِس سے کہیں زیادہ سزا ہوگی۔ خیال رہے کہ حرامی سید نہیں ہوسکتا کیونکہ نسلِ انسانی باپ سے چلتی ہے زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔ چنانچہ مسلم شریف جلدِ اول اور ترمذی شریف ج۱ ص۱۳۸ موطا امام مالک ص۳۱۹ نسائی ج۲ ص۱۱۱ ابو داؤد جلد اول ص۳۱۰ طحاوی شریف ج۲ ص۱۷ پر ہے:۔ حَدَّثَنَا یُوْنُسُ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ الزُّهْرِیِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ترجمہ اُمّ المومنین حضرت صدیقہ سے روایت ہے کہ فرمایا آقائے دو عالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے کہ بچہ خاوند کا ہوتا ہے۔ زانی کے لیئے محرومی ہے۔ یعنی زانی کا نسب نہیں مانا جائے گا۔ فتاویٰ شامی جلدِ دوم ص۴۱۸ پر ہے:۔ (قَوْلُهٗ لِاَنَّهٗ نِکَاحٌ بَاطِلٌ) اَیْ فَالْوَطْءُ فِیْهِ زِنًا لَا یَثْبُتُ بِهِ النَّسَبُ ۔ ترجمہ یعنی نکاح باطل میں وطی کرنا زنا ہے۔ اور زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا۔ اگر معاذاللہ کوئی سید کسی عورت سے زنا کرے اور اس

سے بچہ پیدا ہو تو وہ لڑکا سید زادہ نہ ہو گا۔ اسی طرح جو سید مرتد ہو جائے وہ سید نہیں رہتا۔ لہٰذا بیرائی شیعہ یا مرزائی یا گستاخ وہابی جو ظاہراً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کرے اس کو سید کہنا گناہ ہے کیونکہ اس کی سیادت ختم ہو چکی۔ اس لیے کہ دینی مدارج میں دین کا ہونا شرط ہے۔ جیسے کہ دنیوی مراتب کے لیئے ڈگریوں کا ہونا لازمہ ہے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتاب العقائد

اہل سنت کو بریلوی کہنے کا بیان

سوال نمبر ۲۲۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید صحیح العقیدہ سنی مسلمان ہے۔ یعنی جو مسائل دیوبندی، وہابی، شیعہ روافض اور اہل سنت والجماعت کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔ ان میں زید اہل سنت کے عقیدے اور تائید پر ہے۔ دیوبندیوں، شیعوں کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو بریلوی کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ بکر کہتا ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو بریلوی نہ کہلائے میں اس کو سنی ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے نزدیک وہابی، دیوبندی ہے۔ اور ان ہی گمراہ فرقے کا ایک فرد ہے میں ڈٹ کر اس کی مخالفت کروں گا۔ یہاں فساد کا اندیشہ ہے۔ سب کی نگاہیں آپ کے فیصلے پر لگی ہیں لہٰذا آپ جلد از جلد مدلل جواب سے نوازیں۔ اور فرمائیں کہ کیا واقعی ہر سنی کے لیئے بریلوی کہلانا لازم ہے۔ کیا زید کی مثل لوگ اہل سنت ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو زید کے متعلق قرآن و حدیث سے فیصلہ صادر فرمایا جائے۔

المستفتی:۔ محمد رفیق معرفت مکتبہ نعمانیہ اقبال روڈ۔ سیالکوٹ مورخہ ۱۱-۱۱-۱۹۷۰ء

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

قانونِ فطرت کائنات میں سب سے بڑی دولت معرفت اور پہچان ہے۔ دنیا و آخرت میں انسان اس کا محتاج ہے۔ بے معرفت والا ہر جگہ ذلیل و خوار ہے۔ انسان کے لیئے دو ہی جہان ہیں۔ اور دونوں ہی میں شہرت و پہچان کے پیچھے بنی آدم دوڑ رہے ہیں۔ مگر بعض خوش نصیب لوگوں نے معرفتِ اُخروی کو سرمایۂ حیات بنایا

اور بعض لوگ دنیوی شہرت کے پجاری بن بیٹھے۔ دنیا یہی ہے مگر ارادے مختلف پرواز ایک ہی ہے۔ مگر جہان علیحدہ علیحدہ راستہ وہی ہے۔ مگر منزل جداگانہ۔ دماغ وہی ہے مگر خیالات بکھرے ہوئے۔ دل وہی ہے مگر پسند اپنی اپنی۔ شعر

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

غرضکہ معرفت ہی ایک ایسی نعمت ہے۔ جس کی بدولت سارا نظام قائم ہے۔ دنیا کے تمام دھندے اسی شہرت و معرفت کی خاطر۔ انبیاء کرام کی تشریف آوری کا مقصد بھی سچی معرفت عطا فرمانا ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل وتائید کے لیے علماء اولیاء بنائے گئے۔ جب معرفت ہی خلق کائنات کا سبب اعظم ہے۔ تو ذہن نشین ہونا چاہیئے۔ کہ ہر معرفت اور پہچان کے لیے ایک نشان ہے۔ خواہ دینی پہچان ہو یا دنیوی۔ اور یہ دونوں معرفتیں رب کریم کو محبوب۔ بشرطیکہ دینی معرفت کو متبوع اور دنیوی کو تابع سمجھا جائے۔ اللہ کریم نے ہر معرفت و پہچان کے لیئے نشان مقرر فرمائے۔ مگر بعض دائمی بعض عارضی بعض جسم سے بعض روح سے متعلّق بعض مضبوط بعض کمزور بعض آنکھوں کی نظر سے وابستہ اور بعض تکلّم لسانی سے۔ معرفت کیا چیز ہے؟ کسی کی ذات وصفات کو پہچاننا ہی معرفت ہے۔ پس بعض نشانات ذات کے معرفے ہیں اور بعض صفات کے فطرتاً ہر نفر کی ذات ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر صفات متعدد پس نشانِ ذاتی ہر نفر کا ایک ہی ہوگا۔ لیکن نشانِ صفاتی بقدرِ صفات۔ شکل وصورت رنگ وڈھنگ کا اختلاف وہ نشان ہے جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر قبیلے اور گروہ کا متفرق ہونا۔ لسانی معارف ہیں۔ کیونکہ زبان سے بول کر معرفت ہوتی ہے۔ خود قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:۔ وَجَعَلْنَا كُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (سورۃ حجرات آیت نمبر ۱۳ ع ۱)۔

ترجمہ:۔ اور ہم نے بنایا تم کو اے انسانو! گروہ اور قبیلے صرف اس لیئے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرو۔ جس طرح قبیلے محض جان پہچان کے لیئے ہیں۔ اسی طرح نام اور عَلَم بھی معرفت کا ایک نشان ہے۔ خواہ ذاتی نام ہو یا ذاتی کنیت ہو یا لقب یا خطاب نوعی ہو۔ یا جنسی صنفی ہو یا ملکی اور وطنی دینی ہو یا دنیوی۔ ذاتی نام کی طرح نوعی اور جنسی اور صنفی نشان بھی ہوتا ہے مگر صفاتی نام بقدر صفات۔ جس شخص کی جتنی صفات ہوں گی اتنے ہی زیادہ اس کے اَسماءِ صفاتیہ ہوں گے۔ اسی لیئے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسی ہزار صفاتی نام مبارک ہیں۔ جو ہر جہان کی مخلوق کو عطا ہوئے۔ چونکہ کُل جہان اسی ہزار ہیں۔ جیساکہ فقہ شافعی سے حاشیہ بیجوری جلد دوم صفحہ نمبر ۲۴۳ پر لکھا ہے۔ ہر جہان کے لیئے ایک ہزار نام۔ مسلمانوں کے لیئے بھی ایک ہزار نام منتخب ہیں۔ جن میں ننانوے نام شریعت کے لیئے اور نوسو ایک نام پاک اہلِ اسرار کے لیئے۔ تمام مخلوق ان ہی اَسماء سے آقائے کائنات فخرِ موجودات کی ثناخوانی کرتی ہے۔ جو اَسماء اُن کو مرحمت فرمائے

نبی کریم رؤف و رحیم کے اسماءِ صفاتیہ کی کثرت آپ کی کثرتِ صفات پر دال ہے۔ قانونی طور پر نشان کو چھوڑنا دنیا اور آخرت کی ذلّت و خواری حاصل کرنا ہے۔ کہ بے نشان کسی مقام پر بھی قابلِ تکریم نہیں۔ مگر دینی نشان سے علیحدہ ہونا زیادہ برا۔ اس لیئے کہ دینی نشان دین والوں سے ملتا ہے اور دنیوی نشان دنیا والوں سے سپاہی، فوجی، وزیر، امیر کا لقب دنیا والوں سے لیا جاتا ہے۔ لیکن غوث و قطب، مومن و متقی، مسلمان، قرآن و حدیث اور اولیائے کرام اور علماءِ عظام سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اور جس طرح کہ ہر انسان دنیوی خطاب و القابات سے پیار محبت کرتا ہے اور اپنے لیئے پسند کرتا ہے اسی طرح واجب ہے کہ اُن ناموں کا بھی احترام کیا جائے جو اللہ اور رسول اور اولیاء علماء کی طرف سے عطا ہوئے۔ بلکہ اپنے لیئے ان کو پسند کیا جائے۔ حکومت کے ناموں، خطابوں سے نفرت کرنے والا حکومت سے متنفّر شمار ہوتا ہے۔ ایسے ہی شریعت و طریقت کے صفاتی ناموں سے متنفّرِ اللہ اور رسول سے باغی و متنفّر مانا جائے گا۔ ہر ذی عقل کوشش کرتا ہے کہ میں اپنے اندر ایسے صفات پیدا کردں جس کی وجہ سے مجھ کو دنیوی خطابات و القابات سے نوازا جائے۔ تو ہر اہلِ دل پر لازم ہے کہ ایسے صفات پیدا کرے جس سے اس کو شریعت و طریقت کے القاب عطا ہوں۔ اسی کوشش کا نام ایمان ہے۔ اور کوشش کے بعد کسی الٰہی لقب کا میسر ہونا ہدایت ہے۔ علماء کے نزدیک ایمان نام ہے۔ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ کا مگر صوفیاء کے مشرب میں پوشیدہ کو ماننے اور احترام کرنے کا نام ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بھی پوشیدہ اور تمام صفات بھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ظاہر، صفات پوشیدہ۔ خیال رہے۔ کہ صفات ہر شخص کے ہمیشہ پوشیدہ ہی ہوئے ہیں۔ صفت کبھی خود بخود ظاہر نہیں ہوتی۔ جب اور جس وقت تک ظاہر کی جائے ظاہر رہتی ہے۔ صفات علومیہ کے بارے میں شیخ سعدی علیہ الرحمت گلستان باب اول پر فرماتے ہیں۔ شعر

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد ۔۔۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ترجمہ:۔ جب تک کہ انسان اپنی صفت علمی کو بذریعہ گفتگو خود ظاہر نہ کرے اس کے عیب و ہنر چھپے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات پر ایمان لانا ہی ایمان ہے۔ صرف آپ کی ذات کو مان لینا ایمان نہیں ذات کو تو ابوجہل وغیرہ سب نے مانا۔ حضرت ابوطالب نے ذاتِ ابن عبد اللہ کی بہت خدمت کی۔ مگر شرعاً اُن کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ نہ ان کو شرعی مومن کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اہلِ تصوّف نے اُن کو ساترین کے درجہ میں مانا ہے۔ مگر یہ اُخروی عند اللہ حکم ہے۔ ہاں البتہ تبرّائی شیعہ حضرت ابوطالب کو مومن کہتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی بعض تفضیلی سنیوں نے بھی یہ ہی کہنا شروع کر دیا۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ صرف خدمتِ ذاتِ پاک کے صلے میں اُن کا نام احترام سے لینا واجب ہے۔ بہر حال آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی تمام صفات کو تسلیم کرنا اور اسی کوشش میں لگے رہنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا اظہار اور چرچا کرنا ایمان اور شکرِ الٰہی ہے۔ چنانچہ جامع صغیر جلال الدین سیوطی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۵۸ پر جامع عبدالرزاق کے حوالے سے صحیح مرسل حدیث منقول ہے:۔ عَنْ قَتَادَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ شُکْرِ النِّعْمَةِ اِفْشَاءُ ھَا ط ترجمہ:۔ حضرت قتادہ تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ وہ نبی کریم علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام سے راوی ہیں۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے۔ کہ نعمت کا چرچا کرنا بھی اس کا شکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس کا چرچا کرنا بھی ایسا شکر حاصل کرنا ہی اصل ایمان ہے۔ اسی کوشش سے دنیا والوں کو اسماء صفاتیہ میسر ہو سکتے ہیں۔ مگر دیوبندیوں وہابی لوگوں کی بدنصیبی دیکھئے کہ ان ہی صفات کے منکر ہیں۔ حالانکہ انہی صفات کو مان کر انسان اپنے اندر طرح طرح کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے ہی خوش نصیبوں کو قرآن کریم حدیث شریف اور اولیاء عظام علماء کرام کی طرف سے بے شمار صفاتی نام عطا ہوئے۔ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ہم جیسے ثناخوانوں غلاموں کو قرآن کریم سے تین صفاتی نام عطا ہوئے پہلا نام مومن۔ چنانچہ قرآن پاک میں کل چالیس جگہ:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پیارے خطاب کر کے نہ اور لفظ مومن کے نام سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں نام لیواؤں کو نوازا گیا۔ دوسرا نام متقی۔ چنانچہ سورۃ بقر کے پہلے رکوع میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (الم) ترجمہ:۔ وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے متقیوں کے لیے۔ تیسرا نام مسلمان چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (سورۃ حج آیت) (ترجمہ) اس اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ پہلی کتابوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی یہ تین اسماء طیبہ عمومی ہیں۔ جو ہر انسان تھوڑے سے عمل اور کچھ محنت سے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے عطا کردہ خصوصی نام کا یہاں ذکر کرنا بے محل ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی عمل یا محنت سے یا عبادت و ریاضت زہد و تقویٰ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ اسماءِ مقدسہ صرف انہی کے لیئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے جیسے نبی، رسول، مرسل اور صدیق ثانی اثنین، رحمۃ للعالمین وغیرہ۔ اسی طرح حدیث پاک کے عطا کردہ خصوصی نام بجز موضوع لہٗ کے کسی کو نہیں مل سکتے جیسے لفظ صدیق و فاروق، اسد اللہ، سیف اللہ وغیرہ۔ اگرچہ کوئی مسلمان کتنا ہی عابد اور زاہد ہو۔ یہاں ایک نکتۂ عظیم ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے پیارے بندوں کے ذاتی نام اپنے لیئے رکھنے جائز ہیں۔ بشرطیکہ اُن کی صفات خصوصیہ کو شامل نہ کیا جائے۔ مثلاً لفظِ موسیٰ عیسیٰ اور لفظِ محمد، احمد اسی طرح صرف ابوبکر

اور لفظ عمر اور عثمان، علی نام رکھنے جائز ہیں۔ مگر لفظ موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ، محمد رسول اللہ، ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضیٰ۔ یا کرم اللہ وجہہٗ وغیرہ الفاظ سے نام رکھنے منع ہیں۔ انبیاء کی صفات خصوصیہ سے نام رکھنا حرام ہے۔ صحابہ کی خصوصیات سے نام رکھنا مکروہ ہیں۔ کیونکہ یہ صفاتی نام اللہ رسول کی طرف سے عطا ہوئے۔ ہاں علی حیدر نام رکھنا جائز ہے۔ حیدر کا لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں عطا کیا۔ خود علی مرتضیٰ کا قول مشہور رہے:۔ اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَہ (ترجمہ) میں وہ ہوں کہ میرا نام میری والدہ نے شیر ببر رکھا۔ اسی طرح بڑوں کا ذاتی نام بطورِ مبالغہ اپنی صفت کے لیئے استعمال کرنا جائز ہے۔ مگر اس میں چار شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس بڑے کا ذاتی نام اس کے کسی کارنامے کی بنا پر یا اس کی انوکھی نرالی صفت میں مشہور ہو چکا ہو۔ جیسے لفظِ رستم۔ کہ یہ نام رستم کا ذاتی ہے مگر اس کی خصوصی بہادری کی بنا پر مشہور رہوا۔ یا جیسے حاتم شخصِ مخصوص کا ذاتی نام ہے۔ مگر سخاوت میں مشہور رہے ایسے ہی نوشیروان بادشاہ کا ذاتی نام ہے۔ مگر بقولِ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ عدل میں مشہور رہے۔ جیسا کہ گلستان فارسی باب اول صفحہ نمبر ۸۳ پر ہے۔ مگر مجدد ملت بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے ملفوظات حصہ ۴ مطبوعہ بریلی شریف صفحہ نمبر ۲۱ پر نوشیرواں کو عادل کہنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح قیس مجنوں عشق میں۔ اور جس طرح کہ لفظِ عمر عدل و انصاف میں مشہور رہو گیا۔ حالانکہ یہ فاروق اعظم کا ذاتی نام ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ان ناموں کو کسی کے لیئے استعمال کرتے وقت کسی علاقے یا وقت یا درجے سے نسبت دینا لازم ہے۔ جیسے کہ رستم ہند، حاتم زماں۔ تیسری شرط یہ ہے۔ کہ جس شخص کے لیئے یہ نام استعمال کیا جائے گا۔ اس میں وہ صفت بہت شاندار طریقے سے اُس وقت میں سب سے زیادہ موجود ہو۔ ورنہ بغیر صفت یا کم صفت والے کے لیئے وہ مبالغے کا نام استعمال کیا جانا بیوقوفی یا گستاخی ہو گی۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ خود موصوف اپنے لیے بطور صفت لقباً یا خطاباً استعمال نہ کرے۔ بلکہ قوم یا حکومت یا دینی یا دنیوی بڑا انسان اس کو لقب عطا کرے ورنہ متکبرین میں شمار ہو گا۔ اگرچہ حاملِ صفت ہو۔ اس لقب اور خطاب کے لائق ہو۔ ان چار شرائط کے ہوتے ہوئے کسی بھی بزرگ کا مبالغہ فی الصفت میں مشہور نام اپنے لیے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا شرعاً جائز ہے۔ کسی کا صفاتی نام رستم پاکستان، حاتم ہند وغیرہ لکھنا، اسی طرح نوشیروانِ ثانی، عمر ثانی کہا جاسکتا ہے اسی لیئے مورخین نے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو عمر ثانی کا لقب دیا۔ اسی مبالغے کی بنا پر نعت گوئی میں حضرت حسان کا ذاتی نام لفظِ حسّان مشہور ہو گیا۔ لہٰذا کسی بھی سچے نعت گو کو جو متقی اور عاشقِ رسول بھی ہو حسّانِ زماں یا حسّانِ وقت یا حسّانِ پاکستان کہنا جائز ہے۔ اور اس کہنے میں بے ادبی نہیں بوجہ صفاتی یادگار ادب و احترام ہے۔ آج ہم کسی مناسب شخص کو عمر ثانی کا لقب دیں تو یہ اقوامِ عالم کے سامنے فاروق اعظم کی عدالت کی یادگار قائم کرنا ہے۔ اسی طرح کسی

خوش عقیدہ اچھی عادت نعت گو شاعر کو حسانِ پاکستان کہنا صحابیِ رسول اللہ حضرتِ حسان کی یادگار قائم کرنا ہے اور فی زمانہ بہت اچھا ہے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے بڑوں کے کارنامے اقوالِ زریں معلوم ہوتے رہیں۔ ہمارے اصاغر اور طلبا کو معلوم ہو کہ ائمہ شریعت و طریقت نے نسلِ انسانی کی بہبود کے لیئے کس طرح جانفشانیاں کیں اور دین اسلام کی کتنی خدمتیں کیں۔ کتنی بدنصیبی اور محرومیت ہے کہ ہمارے نوجوانوں طالب علموں نئی نسل کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ تو اتار اجار رہا ہے کہ گوئٹے شاعر نے یہ کہا شکسپیئر نے یہ فرمایا۔ لینن اتنا عظیم انسان تھا۔ مارکس ایسی اچھی باتیں کرتا تھا۔ مگر ہمارے جوانوں کے کان اُن دل گداز آوازوں سے ناآشنا ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدسہ سے نکلیں ہمارے دل اُن انوار سے بے بہرہ ہیں۔ جو صحرائے عرب میں صدیق اور فاروق کے سکھائے ہوئے اقوال و اسباق سے نچھاور ہوئے۔ نئی نسل کے دماغ اُن تفکرات سے بہت دور ہیں جو غزالی اور رومی کے درس گاہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ آج ہمارے ملک پاکستان کے بڑے بڑے رسالے اور کئی ڈائجسٹ جو خدمتِ انسانیت اور اردو ادب کے علمبردار بنے ہوتے ہیں اپنے رسالوں میں اقوالِ زریں اور اچھی باتیں اور معلوماتِ عالم کے مختلف عنوانات سے گوئٹے، شیکسپیئر، مارکس، حالی وڈ کی طرف جھوٹی خود ساختہ باتیں منسوب کر کے اس متعصب کفر کی تشہیر کرنے کے مترادف۔ اب کون بتائے ان بیوقوف مضمون نگاروں نگرانوں اور مدیروں کو کہ تمہارے یہ کام قومی خدمت نہیں۔ بلکہ مسلم قوم کی دینی، ایمانی، اخلاقی، روحانی تباہی ہے۔ یہ رسائل و ڈائجسٹ اپنی کم فہمی کی بنا پر نسل مسلم کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ آئندہ نسلوں اور موجودہ نوجوان طبقے کے دل و دماغ میں صرف گوئٹے وغیرہ ہی سمائے رہیں۔ ان کی سوچ و فکر یہیں تک ہو۔ کہ کائنات میں صرف کفر نے ہی نامور جنم دیئے ہیں۔ عالمِ اسلام میں کوئی ایسا نامور سپوت پیدا ہی نہ ہوا جو ایسی اچھی نصیحتیں اور سبق سکھائے۔ یہی ارادے قوم کی تباہی کا باعث ہیں۔ کہ قرآن و حدیث کے اقوالِ زریں سے یک دم غافل کر کے لینن مارکس کا غبار سینۂ مسلم میں بھر دیا جائے۔ حالانکہ گوئٹے اور شیکسپیئر کے پاس کیا ہے اُن حمقاء کے پاس جو تھوڑی بہت عقل و خرد میسر آئی۔ وہ ہماری ہی اسلامی کتب کے مطالعہ سے آئی۔ انگریز فلاسفر نے جو اچھے کام کیئے وہ ہماری ہی لائبریریوں سے چوری کردہ کتب کے مطالعہ سے کیئے۔ اُن کے تہذیب و اخلاق ہمارے ہی اکابر کے تفکرات و ملفوظات و مکتوبات سے حاصل ہوئے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ جو کچھ کسی نے علم و خرد و اخلاق و تہذیب سیکھا سب احادیثِ رسول اللہ و فرمانِ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا۔ دولت مند انگریزوں نے ہماری ہی کتب کا ترجمہ کر کے اپنے ناموں سے چھاپا۔ برِصغیر پر نوے سالہ حکومت کے دوران کیا کچھ نہ ہوا۔ کلکتہ بمبئی اور دہلی کی شاہی لائبریری کی عربی فارسی کتب کیوں برطانیہ بھیجی گئیں۔ دیکھو تاریخِ ہند جلد دوم ۱۸۶۰ء کا آنکھوں دیکھا واقعہ صفحہ نمبر ۲۰۱، ۱۴۰۰ء میں غرناطہ کا کتب

خانہ انگریزوں نے کیوں لوٹا۔ جن کو اس وقت فرنگی کا لقب دیا گیا تھا۔ عربی کتب اسلامیہ سے ایک غیر عربی غیر مسلم قوم کو کیا واسطہ تھا۔ مقصد وہی تھا۔ جو آج اس نباہ کن ناسور کی صورت ظاہر ہو رہا ہے۔ انہوں نے سب کچھ ہم سے چرایا۔ ہمارے ہی بزرگوں کے پر نور اقوال ہیں۔ جو ڈائجسٹوں اور رسالوں کی زینت بنتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مضمون نگار نے بجائے مسلم و بخاری کے کسی غیر ملکی مصنّف کے لیبل والی کتب کے مطالعہ سے چوری کردہ عبارت کو اپنے مضمون میں ڈھال کر مہر چین و جاپان کی لگا دی۔ قول حدیث پاک کا ہوتا ہے نیچے نام شیکسپیئر یا گوئٹے کا۔ ہم سے تو ان میٹھے دشمنوں نے یہ سیکھا۔ مگر ہم نے ان کے اسکولوں کالجوں سے کیا سیکھا۔ یہی چوری، فریب کاری، دغا بازی، جھوٹ بلکہ بڑے دل فریب طریقے سے یہ بد خصلتیں ہم کو سکھائی گئیں۔ کہ جرم کا راستہ بتا دیا۔ اور قانونی گرفت کو بالکل نرم کر دیا۔ تنخواہیں ضروریات سے کم کر دیں۔ رشوت پر سخت گیری نہ کی۔ راشن خوراک کم دیا۔ فریب کاری کا راستہ چھوڑ دیا۔ قوموں میں اسی طرح اخلاقی پستی آتی ہے۔ بلکہ کون سے موقعہ پر یہ انگریز اسلام دشمنی سے چوکے۔ اسلام کے ہر چھوٹے بڑے قانون کے مقابل اپنا بے ہودہ طریقہ ایجاد کیا۔ اور جبراً مسلمانوں کو سکھانے کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ سخت تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو۔ الٹے ہاتھ سے کھانا۔ بستر کی چائے چھری کانٹا پکڑنا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔ پیر لٹکا کر کرسی پر بیٹھ کر ہگنا۔ کاغذ سے استنجا کرنا۔ اسی گندے جسم کے ساتھ ایک بڑے برتن میں بیٹھ کر نہانا۔ وہی پلید پانی چہرے اور منہ پر ڈالنا وغیرہ۔ کتنے تکلیف دہ اور گھنونے طریقے ہیں۔ مگر صرف مسلمانوں کو معاشرے میں تباہ کرنے کی خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ اور مسلمانوں کے دل و دماغ میں بڑے ٹھنڈے طریقے سے گھول دیا۔ اب وہ ہی مسلمان ہے۔ کہ اسلام کے صاف پاک اصولوں سے بھاگا پھر رہا ہے۔ ان رسائل و اخبارات وغیرہ کو چاہیئے یہ تھا۔ کہ اپنے مضامین میں بجز فرمودات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ و اولیاء علماء کے کسی غیر کا قول نقل نہ کرتے کہ یہی قومی اور مذہبی روح پھونکنے کا طریقہ ہے۔ یہی سچی تبلیغ دین آج اسی طریقے سے نسلوں کی قسمتیں سدھرتی ہیں۔ شاید مضمون نگار حضرات اس طرح سے اپنی خود ساختہ اخلاقی تہذیب اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور دنیا والوں کو یہ بتانا چاہتے ہوں۔ کہ ہم تنگ نظر نہیں۔ تو یاد رکھو کہ یہ فراخ دلی نہیں بلکہ بیوقوفی و حماقت ہے۔ بھیڑیئے کو بکریوں میں، آگ کو بھوسے میں جگہ دینی کہاں کی اعلیٰ ظرفی اور اخلاقی تہذیب ہے۔ اور میں اس سوال کرنے میں بھی حق بجانب ہوں کہ کیا اس قسم کی قوم کو تباہ کرنے والی ساری اخلاقی تہذیبیں صرف آپ لوگوں کے حصے میں آئیں۔ کبھی کسی ہندو، سکھ، مجوسی، پارسی، عیسائی، یہودی وغیرہ نے اپنے رسالوں میں ہمارے بزرگوں کے فرمودات کو جگہ دی؟ بلکہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی اتنی عیاں ہے۔ کہ انگریز چیف جسٹس نے پنڈت راجپال لاہوری جیسے نبی پاک کے گستاخ کے خلاف بھی قلم کو جنبش نہ دی۔

جس کی گستاخی سے تمام برصغیر کے مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے۔ یہ قوم کی تباہی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ وہ مسلمان نسل جن کا مقصدِ حیات ہی اللہ والا بننا ہے۔ خود اللہ والوں اور ان کی نسبت سے متنفر ہوتی چلی جا رہی ہے کسی کو حنفیت سے دکھ ہے تو کوئی قادریت سے بیزار کسی کے دل میں مالکیت سے غبار ہے۔ تو کوئی نقش بندیت سے متنفر۔ کسی نے شافعیت کے خلاف محاذ آرائی کی ہے۔ کو کسی کے سینے میں چشتیت کا کانٹا۔ کوئی احمد بن حنبل سے مخالف نظر آ رہا ہے۔ تو کوئی سہروردیوں سے برسرِ پیکار، نہ کسی کا ادب نہ احترام، علماء کی گستاخی سے پاک نہیں۔ تو اولیاء اللہ کی طعن سے شرم نہیں۔ علیحدہ راہیں جدا منزلیں یہ سب اسی غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور انہیں اختراعی مضامین کا شاخسانہ ہے۔ مگر ابھی بھی مایوسی نہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ کہ اس دھارے کا رخ موڑا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم اپنی نئی نسل کو یہود و مجوس سے روشناس کرائیں۔ اور ان سے نسبت و تعلق پیدا کرنے کا شوق پیدا کریں۔ ہم پر فرض ہے کہ اپنے اکابر کے بھولے ہوئے سبق اپنی قوم کو یاد کرائیں۔ اور اس کے بجائے کہ ہم موجودہ نامور مسلمانوں کو مارکسِ زماں، ٹارزنِ وقت، شیکسپیرِ قوم جیسے القاب دیں۔ اپنے نامور بزرگوں سے نسبت پیدا کریں۔ پس جائز ہے غزالئ زماں، احسانِ پاکستان، شیرازئ پنجاب جیسے مبارک الفاظ سے خطاب دینا۔ ہاں بزرگوں کی خصوصی صفت سے لقب دینا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ ذاتی نام تو صفت کا مبالغہ بن سکتا ہے۔ جیسے زیدٌ عدلٌ مگر صفاتی نام مبالغے کا صیغہ نہیں بنتا۔ لہٰذا احسانِ پاکستان کہنا جائز صدیقِ پاکستان کہنا گناہ۔ اسی طرح عمرِ ثانی کہنا جائز ہے۔ فاروقِ ثانی کہنا منع ہے۔ صدیقِ ثانی کہنا بھی منع۔ یہ جائز و ناجائز اسلئے ہے کہ لفظ حسان ذاتی نام ہے اور صدیق صفاتی نام۔ یہ فرق ضرور خیال رکھا جائے۔ ابوبکر پاکستان یا علی زماں لقب دینا اس لئے منع ہے کہ یہ نام اگرچہ ذاتی ہیں مگر کسی صفت کا مبالغہ نہ بنے۔ مسلمانوں کو ایک صفاتی نام حدیث پاک سے عطا ہوا اہلِ سنت والجماعت۔ چنانچہ مقدمہ ابنِ ماجہ بابِ اتباعِ سنتِ خلفاءِ راشدین صفحہ نمبر ۵ پر ہے:۔

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ ابْنُ اَحْمَدَ بْنِ اَحْمَدِ بْنِ بَشِیْرِ بْنِ ذَکْوَانِ دِمَشْقِیْ (الخ) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (الخ) سَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِیْ اِخْتِلَافًا شَدِیْدًا فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ (ترجمہ) عنقریب میرے بعد بہت اختلاف دیکھو گے۔ لہٰذا لازم پکڑو میری اور خلفاء راشدین کی سنتوں کو۔ اس حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو عامل بالسنت یعنی اہلِ سنت ہونا لازم ہے۔ اور یہ نام نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ اور مقدمہ دارمی کے ۵۶ بابوں میں سے باب ۱۵ میں ہے:۔ تَرَکْتُمْ سُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ لَضَلَلْتُمْ ترجمہ اے مسلمانوں اگر تم اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دو۔ تو

تم سب گمراہ ہو جاؤ۔ تاریخ ابن خلدون جلد دوم صفحہ نمبر ۱۱۲ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی نمبر ۱ میں امام عالی مقام کے میدان کربلا والے آخری الفاظ اس طرح ہیں۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَوَلَمْ یَبْلُغْکُمْ قَوْلٌ مُسْتَفِیْضٌ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ قَالَ لِیْ وَلِاَخِیْ اَنْتُمَا سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ وَقُرَّۃُ عُیُوْنِ اَھْلِ السُّنَّۃِ ط (ترجمہ) اے یزید کے لوگو! کیا تم کو وہ قول یاد نہیں جو آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفیض ہے۔ وہ قول آپ نے میرے اور میرے بڑے بھائی حضرت حسن کے لئے فرمایا۔ کہ تم دونوں جنتی جوانوں کے سردار ہو۔ اور اہل سنت کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔ اس حدیث سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کا ایک نام اہلِ سنّت بھی ہے۔ شیعہ کتاب احتجاج طبرسی جلد اول صفحہ نمبر ۲۴۶ پر ہے کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے دوران خطبہ ایک سائل کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اَمَّا اَھْلُ الْجَمَاعَۃِ فَاَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَاِنْ قَلُّوْا وَذٰلِکَ الْحَقُّ عَنْ اَمْرِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَعَنْ اَمْرِ رَسُوْلِہٖ۔ الخ :۔ وَاَمَّا اَھْلُ السُّنَّۃِ فَالْمُتَمَسِّکُوْنَ بِمَا سَنَّۃِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ قَلُّوْا ط (ترجمہ) حضرت علی نے فرمایا لیکن اہل جماعت تو وہ میں اور میرے متبع ہیں اگرچہ کم نفر ہوں۔ اور یہی اہلِ جماعت ہونا حق ہے۔ اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق اور لیکن اہل سنت تو وہ اللہ اور رسول کی سنت پر مضبوطی سے عمل کرنے والے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ صحابہ کرام اپنے آپ کو مومن اور مسلمان سمجھنے کے علاوہ اہلِ سنت کہا کرتے تھے۔ لفظ وَالْجَمَاعَۃ کا ثبوت حضرت کے اس فرمانِ پاک کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ کنوز الحقائق جلد دوم صفحہ نمبر ۱۱۷ جامع صغیر جلد دوم صفحہ نمبر ۲ پر اور ترمذی شریف جلد دوم صفحہ ۹ پر ہے۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالَۃٍ وَیَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ط (ترجمہ) حضرتِ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہ فرمائے گا۔ اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے علیحدہ ہو وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ترمذی شریف کے اسی صفحہ نمبر ۳۹ پر ایک حدیث اس طرح ہے :۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ خَطَبَنَا عُمَرُ بِالْجَابِیَۃِ فَقَالَ یَا اَیُّھَا النَّاسُ (الخ) عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ الخ ط ترجمہ حضرتِ ابن عمر سے روایت ہے۔ فرمایا۔ کہ خطبہ دیا ہم کو حضرت فاروق اعظم نے۔ فرمایا۔ اے لوگو! ہمیشہ جماعت کے ساتھ لگے رہنا۔ اور چھوٹے فرقوں سے خود کو بچانا۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن اور حدیث سے ہم کو چار نام عطا ہوئے ۱ مومن ۲ مسلمان ۳ متقی ۴ اہل سنت والجماعت۔ مومن اور مسلمان کے درمیان بعض کے نزدیک نسبت عام خاص

مطلق ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ غلط ہے۔ ہر مسلمان مومن ہے اور ہر مومن مسلمان۔ اسی طرح مومن اور اہلِ سنت میں بھی نسبتِ تساوی ہے کہ ہر مومن اہلِ سنت ہے۔ جو اہلِ سنت نہ ہو وہ مسلمان اور مومن بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ موجبہ کلیہ کا عکس نقیض موجبہ کلیہ ہی ہوتا ہے ہر غیر سنی غیر مسلم ہی ہوگا۔ شریعت کی طرف سے ہم کو چار نام صفاتی عطا ہوئے۔ مالکی، شافعی، حنفی، حنبلی اور طریقت نے بھی ہم کو چار نام عطا فرمائے۔ قادری، چشتی، نقشبندی، اور سہروردی۔ مگر فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے اور حدیث پاک کے عطا کردہ صفاتی نام کسی مقسم کی قسمیں نہیں۔ اس لیئے وہ نام بیک وقت ہر مسلمان کے ہوں گے۔ کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں مومن متقی بھی ہوگا۔ اور مسلمان اہلِ سنت بھی۔ جب ان چار ناموں کی صفت اپنے اندر پیدا کرے گا تب انسانِ کامل کہلانے کا حقدار ہوگا۔ مگر شریعت و طریقت کے عطا کردہ نام اپنے اپنے مقسوں کی قسمیں ہیں پہلی چار اقسام کا مقسم شریعت ہے۔ دوسری کا طریقت اور یہ چاروں نام آپس میں قسیم ہیں۔ اِس لیئے بیک وقت ایک شخص کو اِن چار میں سے ایک ہی نام مل سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی آدمی حنفی بھی ہو اور شافعی بھی۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی شخص قادری بھی ہو اور نقش بندی بھی۔ یہ جو بعض لوگ خود کو قادری، چشتی لکھتے ہیں۔ اس کی نوعیت اور ہے جو نام پہلے لکھا جائے گا۔ اصل وہی ہوگا۔ ہاں البتہ شریعت کے چاروں نام طریقت کے ناموں سے متحد ہو سکتے ہیں مثلاً ایک آدمی حنفی بھی ہو قادری بھی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ منزلِ دین و ایمان ایک ہے۔ قرآن و حدیث اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ مگر اس منزل کے راستے مختلف پہلے شریعت کے۔ پھر انہیں چاروں میں سے ہر ایک کے طریقت کے چار راستے۔ باعتبار منزل کے ہر شخص کو چاروں نام عطا ہوئے۔ اور باعتبار راہِ مقصود کے ہر ایک کو ایک نام۔ اسی طرح یہ سب اہلِ سنت ہی ہیں۔ حنفی ہوں یا قادری۔ مالکی ہوں یا چشتی، نقشبندی۔ ان سب کی اصل اہلِ سنت ہونا ہے۔ جب تک اہلِ سنت نہ ہوں۔ شافعی، مالکی، قادری، چشتی نہیں بن سکتے۔ پس لازم ہوا کہ اہلِ سنت ہونے کے لیئے قادری، چشتی ہونا ضروری نہیں۔ جیسے کہ پہلے قرونِ اولیٰ و ثانیہ میں۔ کہ تمام صحابہ و تابعی اہلِ سنت تو تھے۔ مگر کوئی بھی حنفی، مالکی یا چشتی، نقش بندی نہ تھا۔ کیونکہ وہ منزل کے قریب تھے۔ راستہ ہمیشہ دور والے کو درکار ہوتا ہے۔ بہر حال مسلمان اور مومن متقی ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت ہونا ہر شخص کے لیئے لازم و ضروری ہے۔ گویا کہ اہلِ سنت کا نام ہر حنفی، شافعی، نقشبندی، سہروردی کے لیے دلالت مطابقی ہے یہ آٹھ اسماء صفاتیہ بھی ہر شخص کے لیئے عطا ہوئے۔ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب بادشاہ ہو یا رعایا عالم ہو یا ولی اللہ، پیر ہو یا مرید۔ بشرطیکہ پہلے اہلِ سنت ہو۔ ہر راہ رو منزل کے لیئے ان ناموں کو اختیار کرنا اشد لازم ہے۔ جو ان اسماءِ طیبہ سے علیحدہ یا متنفر ہوگا۔ وہ ہی بے دین اور گمراہ ہے۔ قانونِ فطرت

ہے کہ ہر بڑے اور خطرناک راستے پر راہ گیروں کو بے جانے کے لیئے قائد و پیش رو اور مرشد متعین ہوتے ہیں۔ تو عالم کائنات میں دین کے راستے سے زیادہ مشکل کون سا راستہ ہوگا۔ لہٰذا شریعت و طریقت نے چند نام ایسے بھی عطا فرمائے جو صرف ان لوگوں کو عطا ہوئے جو قائدِ راہِ شریعت اور مرشدِ بحرِ طریقت بننے کا شرف حاصل کریں۔ چنانچہ شریعت پاک نے محدث، مفسر، شارح، محشی، امام، عالم اور محقق جیسے پاکیزہ نام عطا فرمائے۔ اور طریقت نے غوث، قطب، ابدال، اوتاد، افراد اسماءِ نورانیہ سے نوازا۔ یہ تمام نام تو کچھ نہ کچھ خصوصی اہتمام رکھتے ہیں۔ لیکن اہلِ سنت ہونا ان سب کے لیئے ضروری جو اہلِ سنت نہ ہو۔ وہ نہ غوث ہو سکتا ہے نہ محدث و مفسر کہلانے کا حق دار یہ سب اسماءِ طیبہ مسلمانوں کو بطورِ نشان عطا فرمائے۔ تاکہ کائناتِ عالم میں امتِ مصطفوی عجب آن بان سے درخشاں ہو۔ نشانات کی اسی وقت ضرورت ہوتی ہے جب کسی طرف سے امتیازاتِ صدق و کذب ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس سعیِ باطلہ کو ختم کرنے کے لیئے اگرچہ لفظِ اہلِ سنت کا صفاتی نام بطورِ نشانِ مسلم کافی تھا۔ مگر دنیاءِ دون کا شروع سے یہ طریقہ رہا کہ پھول کے ساتھ کانٹے ہوئے ہر شمع کے ساتھ دھواں چلتا رہا۔ ہر کھرے کے مقابل کھوٹ ظاہر کیا گیا۔ ہر سچے کے لباس میں جھوٹے نمودار ہوئے۔ اہلِ سنت ہونا دربارِ الٰہیہ کا عظیم الشان انعام ہے۔ جس سے مسلمانوں کی دینی و دنیوی عزتیں وابستہ ہیں۔ اسی چیز کو دیکھتے ہوئے جھوٹی عزت کے متلاشیوں نے دامِ تزویر کی ٹھانی۔ اور دشمن اہل سنت نے اہل سنت کے بڑھتے ہوئے وقار و احترام کو دیکھتے ہوئے سنیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے غلط عقیدوں کا باطل طبل بجانا شروع کیا۔ اور خود کو اہل سنت کے لیبل سے مشہور کرتے ہوئے شربتِ عشقِ مصطفیٰ کے پیاسوں کو زہرِ ہلاہل سے مردۂ ایمانی بنانا شروع کیا۔ مرورِ زمانہ کے اعتبار سے مختلف اَدوار میں چمنِ اہلسنت پر اس قسم کی بے شمار خزاں کی ہوائیں چلیں۔ مگر ہر موقعہ پر باغِ اہل سنت کے مالی، علماء وصوفیائے غنچۂ سنیت کو خزاں کے تھپیڑوں سے بچایا۔ اور ایسے ایسے نشان مقرر فرمائے جن سے سچے اور جھوٹے سنی اور کھوٹے کھرے مسلمان کا پتہ لگ جائے۔ یہ سب نشان بزرگوں کی نسبتیں ہی تھے۔ اسی زمانے میں صحابہ کرام نے اہل سنت کی دس نشانیاں مقرر فرمائیں۔ چنانچہ تفسیراتِ احمدی صفحہ ۲۳ پر ہے۔ وفی رواية عن ابن عباس انه من كان فيه عشر خصال تفضيل الشيخين وتوقير الختنين وتعظيم القبلتين والصلوٰة على الجنازتين والصلوٰة خلف الامامين وترك الخروج على الامامين والمسح على الخفين والقول بالتقديرين والامساك عن الشهادتين واداء الفريضتين يعنی تفضیل ابو بکر و عمر و توقیر عثمان و علی ترجمہ۔ ابو بکر صدیق اور فاروق اعظم کی فضیلت سارے صحابہ پر حضرت عثمان و علی مرتضیٰ کی عزت کرنا بیت المقدس و کعبہ کی تعظیم کرنا۔ نیک و بد کا جنازہ پڑھنا نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھنا جس کی بدی ظاہر نہ ہو۔ عادل یا جابر حاکم کی دنیوی امور میں اطاعت کرنا بغاوت نہ کرنا چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ سفر و حضر میں خیر و شر کی تقدیر من اللہ ماننا۔ جنت و دوزخ کی گواہی دینا ہر شخص

کے لیے نماز و زکوٰۃ دونوں کو فرض جانتا۔ پھر جہمیہ مرجیہ پھر ان سات فرقوں کی شاخیں تہتر ہوئیں (تفسیرات احمدی)
اس طرح ایک فرقہ وہ تھا جب اہل سنت والجماعت کے مقابل روافض کے علاوہ معتزلی، خارجی، جبریہ، قدریہ
فرقِ باطلہ نے جنم لیا۔ اُس وقت خارجیوں نے اپنے آپ کو جھوٹا سنی بنا کر لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا۔
اور مسلمانوں کو طرح طرح کے حیلے بہانوں کا فر کہنا شروع کیا۔ اُدھر معتزلی فرقے نئے نئے رخنے ڈالنے شروع کئے
انہوں نے اپنا نام اصحابِ عدل و توحید رکھا۔ اپنے آپ کو موحّد کہنے کا رواج سب سے پہلے اسی باطل
فرقہ معتزلہ نے ڈالا۔ جب اُن کا ظلم کسی طرح رکنے میں نہیں آتا تھا۔ تب پروردگارِ عالم نے اہل سنت
کی امداد کے لئے یمن کے قبیلے بنی اشعر کے صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب حضرت ابوموسیٰ
اشعری کی اولاد سے ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری کو علم و عرفان کی نعمت ہائے رنگا رنگ سے مالا مال
کر کے بھیجا۔ آپ نے خوارج و معتزلہ کے فریب کاری کے پردے کو چاک کیا اور بتایا۔ کہ یہ اہل سنت
نہیں بلکہ دجل و فریب کے پروردہ۔ صرف لبادۂ سنیت اوڑھ کر آئے ہیں۔ اُن کی روسیاہیاں تو پس
پردہ ہیں۔ آپ نے ہی اُن کے جال سے پھنسے ہوئے اہل سنت مسلمانوں کو نکالا۔ اور اسلام و اہل سنت کے
صحیح عقائد سمجھائے۔ اس دور میں آپ کا نام ہی رئیس المتکلمین اور امامِ اہلِ سنت تھا۔ ان کی تعلیم
سے سچے مسلمان پیدا ہوئے۔ جھوٹے سنیّوں سے لوگ خبردار ہوئے۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں
اہل سنت کا نشان اور امتیازی نام اہل سنت اشعری تھا۔ چنانچہ نبراس صفحہ نمبر صد ۲ پر ہے:۔
وَاَبُوالْحَسَنِ هُوَ رَئِيْسُ اَكْثَرِ الْمُتَكَلِّمِيْنَ مِنْ اَهْلِ السُّنَّةِ وَهُمْ يُسَمُّوْنَ الْاَشَاعِرَةَ لِذَالِكَ ط (ترجمہ)
ابوالحسن رئیس المتکلمین ہے۔ اور اہل سنت کے رئیس ہیں۔ تمام سنیوں کا نام اُس وقت اہلِ سنت
اشعری انہی کی نسبت سے تھا اس زمانے میں یہی اہل سنت کا نشان تھا۔ اور دنیا میں وہی سنی سمجھا جاتا تھا
جو اپنے آپ کو اشعری کہتا تھا۔ اور جو اشعری نہ کہتا اور اہل سنت ہونے کا دعویٰ بھی کرتا۔ اس کو معاشرے
میں جھوٹا کذاب اور خارجی گنا جاتا تھا۔ پھر ایک زمانہ آیا۔ کہ دوسرے باطل لوگوں نے اہلِ سنت کا بہروپ
بھر کر غلط اور بے ہودہ عقیدوں سے فریب کارانہ طریقہ پر بھولے اور ناواقف اہل سنت مسلمانوں
کو ورغلانا شروع کیا۔ تو امامِ وقت شیخ ابومنصور ماتریدی سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ سنت کو ایک
اسٹیج پر جمع فرمایا۔ اور جھوٹے بناوٹی سنیوں کو قعرِ مذلت میں غوطہ زن کیا۔ اُن کی تربیت سے اہلِ سنت نکھر
کر تاریخ کے پردے پر اُجاگر ہوئے۔ اس وقت جھوٹے، سچے سنی کی شناخت آپ کی نسبت تھی۔ اور اس
وقت صحیح اہل سنت مسلمانوں کو سنی ماتریدی کہا جاتا تھا۔ جو اہلِ سنت خود کو ماتریدی کہتا اس کو سچا
اہل سنت والجماعت سمجھا جاتا۔ جو اس نسبت سے نفرت کرتا، یا شرم کرتا۔ وہ قوم کی نظروں میں

ذلیل وخوار اور فریب کار جھوٹا سنی شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ نبراس علیٰ شرح العقائد صفحہ نمبر ۳۲ پر ہے :-
وَمُقْتَدَاهُمْ فِي الْكَلَامِ هُوَالْاِمَامُ عَلَمُ الْهُدٰى اَبُوْمَنْصُوْرٍ الْمَاتُرِيْدِيْ وَمَاتُرِيْدُ قَرْيَةٌ بِسَمَرْقَنْد وَهُمْ يُسَمُّوْنَ الْمَاتُرِيْدِيْ :- (ترجمہ) :- اور اہل سنت کے مقتدا علمِ کلام میں وہ امام علم الہدیٰ یعنی برحق امام ابو منصور ماتریدی ہیں۔ اور ماترید علاقہ سمرقند کا ایک گاؤں ہے۔ اور تمام اہلسنت والجماعت مسلمانوں کا نام ماتریدی۔ انہی امام اہل سنت کی نسبت سے رکھا جاتا ہے۔ ثابت ہوا کہ تغیر زمانہ کے لحاظ سے ان چودہ صدیہ دورِ اسلامی میں جتنی جتنی ملاوٹیں اور کھوٹ لفظِ اہل سنت سے ناجائز فائدے اٹھاتی رہیں۔ مفکرانِ غمگسار اور علماءِ دل فگار نے اُتنے ہی بندھ باندھ کر اپنی قومِ مسلم کو بچایا۔ اور ہر زمانے میں جماعتِ اہل سنت کو بطورِ نشان وامتیاز کسی نہ کسی مقتداءِ اسلام سے نسبت دی جاتی رہی۔ کبھی اس کے علاقائی نام سے۔ کبھی اُس کے شہر سے۔ یہ محض اس لیئے تھا۔ کہ فریب کاروں کا فریب نہ چل سکے۔ آج وہ باطل فرقے اور جھوٹے سنی فریب کار خود ساختہ بناوٹی لوگ مٹ چکے۔ اُن کے نام ونشان بھی مٹ گئے۔ کیونکہ باطل مٹنے ہی کے لیئے ہے۔ مگر اہلِ سنت کا سچا نشان اب بھی نیّرِ تاباں بن کر چمک رہا ہے۔ اور ابدالآباد تک چمکتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ برطانوی انگریز کی چالبازیوں سے فقط مسلمانوں کی قوّتِ ایمانی کو سلب کرنے کے لیئے۔ اور آقائے دو عالم سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے جمال جہاں آرا کی تجلّیات سے قلوبِ مومن کو خالی کرنے کے لیئے برِّصغیر میں آج سے صرف دو سو سال پہلے نجدی بیج بویا گیا۔ (دیکھو تاریخ دیوبند سید احمد کی سچی تصویر اور کتاب زلزلہ۔ رشید احمد کی حیاتِ طیبہ) نجدی جھاڑ جھنکار نے آناً فاناً سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان کچرے کی کھبریوں سے ایسے بھبھوکے پھوٹے کہ تعفّن سے ناک دم ہوا۔ کہیں دیوبندیت کی یلغار پھوٹی۔ تو کہیں وہابیت نے اڈا جمایا۔ جہاں بیٹھے وہاں سب کا دین وایمان گنوایا۔ طرح طرح سے شرک وبدعت کا داؤ چلایا مگر پھر بھی کام بنتا نظر نہ آیا۔ تب پھر انہوں نے بھی اہلِ سنّت کا بھیس لگایا۔ جسے چاہا اپنا بنایا۔ جسے چاہا بدعتی ومشرک بنایا۔ حتی الامکان اللہ ورسول اور صحبتِ اولیاء سے دور ہٹایا۔ جب ظلم وستم انتہاء سے ڈھایا۔ اور جھوٹے اہل سنت بن کر سچوں کا فرق مٹایا۔ تب اللہ کریم نے بریلی شریف میں ایک نور چمکایا جس نے وہابیت کی لادینیت کو دبایا۔ اور بہکے ہوئے مسلمانوں کو سمجھایا۔ کہ صحابہ کرام کے وقت سے لے کر اب تک سچے اہل سنت اور پروانۂ شمعِ رسالت یہی لوگ ہیں۔ جو گستاخوں سے بچا رہے ہیں دربِ نبی پر بلا رہے ہیں۔ اور حمد باری عز اسمہٗ کے ساتھ صفات انبیاء واولیاء سنا رہے ہیں۔ بریلی کے اسی نور نے کائناتِ سنیت کو نورِ مصطفیٰ سے روشناس کرایا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اصاغر اہل سنت نے

علم و عرفان سے جو کچھ پایا اسی در سے پایا۔ اس ہی شہنشاہ بریلی کی مشفقانہ تعلیم و تربیت نے ہمارے بے بہرہ قلوب کو محبتِ احمد مجتبیٰ سے جگمگایا۔ ورنہ جہلاءِ دیوبندیت اور حمقاءِ وہابیت نے ہم کو نارِ ابدی کے کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ کتنا عظیم احسان ہے۔ اس منکرِ اسلام کا تمام اہلِ سنت پر جس نے سنیوں کو دیوبندی کیچڑ سے نکال کر ایک سچے اور درست مرکز پر جمع کیا۔ آخر کیوں نہ ہم اس سلطان العلماء اور بستان العرفاء کے گیت گائیں۔ اور کیوں نہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ حدیث پاک میں آتا ہے جو محسنوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترمذی شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۱۷ :- باب مَا جَآءَ فِي الشُّكْرِ لِمَنْ اَحْسَنَ اِلَيْكَ حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ الْمُبَارَكِ ثَنَا الرَّبِيْعُ بْنُ مُسْلِمٍ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ زِيَادٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ۔ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ ط (ترجمہ)۔ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو محسن لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر گزار نہیں بن سکتا۔ یہ حدیث ہر طریقے سے صحیح ہے۔ جامع صغیر جلد دوم صفحہ ص۱۸۱ پر بحوالہ مسند احمد اور الضیاء لابی سعید سے مروی ہے :۔ مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ ط هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ ط ترجمہ۔ جس نے محسن انسان کا شکریہ نہ کیا۔ اس نے اللہ کا بھی شکر نہ کیا لہٰذا ہم اہلِ سنت کا اپنے آپ کو جہاں بریلوی کہنا بطورِ نشان ہے وہاں اس محسن کا شکریہ بھی ہے۔ بریلوی نام رکھنا نہ سنت ہے نہ فرض نہ واجب۔ بلکہ جس طرح پہلے زمانوں میں ہر اہل سنت کے لیئے برائے تفریقِ اشعری یا ماتریدی کی نسبت لازم تھی۔ کیونکہ جھوٹوں نے بھی اپنے آپ کو سنی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح فی زمانہ ہر اہلِ سنت کے لیئے لفظ بریلوی کا نشان اور نسبتی و صفاتی نام اشد لازم ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں بہت سے جھوٹے لوگوں نے اپنا نام اہل سنت رکھنا شروع کر دیا۔ صرف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیئے اگر بریلویت کے پیارے لقب کو ہٹا دیا جائے تو جھوٹے اور سچے کا لفظی امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بجز اس لفظ کے دنیا میں اس وقت کوئی دوسرا لقب نہیں۔ جس کو اختیار کر کے ایک اجنبی کو جھوٹے سنیوں سے بچایا جا سکے۔ اگر زید لفظ بریلوی سے نفرت کا اظہار نہ کرتا تو نہ قوم میں انتشار و فساد کا اندیشہ ہوتا نہ اس سوال و جواب کی حاجت پڑتی۔ زمانے کے حالات اور زمانہ ساز لوگوں کے پُرفریب واقعات کو دیکھتے ہوئے بکر کا قول شرعاً بالکل درست ہے۔ ہمارے دوست زید کو چاہیئے کہ آئندہ ایسی بات نہ کرے۔ کہ جس سے علاقے میں مشکوک نظروں سے دیکھا جائے :۔ پس زید پر لازم ہے کہ خود کو بریلوی کہلوائے اور اس لقب سے نہ شرمائے نہ نفرت :۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

گردشِ زمین کے سائنسی عقیدے کی تردید

سوال نمبر ۲۳:- کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ میں کہ تحقیقی طور پر عقیدۂ اسلامیہ کے مطابق زمین و آسمان پھرتے چکر لگاتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے مسلمان سائنس پڑھ کر یہ عقیدہ بنا لیتے ہیں کہ زمین اور آسمان پھرتے ہیں بلکہ آسمان کے وجود کے قائل ہی نہیں۔ اور دلائل میں مندرجہ ذیل چند باتیں کہتے ہیں۔ ۱ سورج اور چاند گرہن اسی لیئے لگتا ہے کہ زمین پھرتی ہے ۲:- چاند گھٹتا بڑھتا نہیں بلکہ چاند کے جتنے حصے پر سورج کی روشنی پڑتی ہے وہ حصہ روشن ہوتا ہے۔ یہ بھی گردش زمین کی وجہ سے ہوتا ہے ۳:- چاند خود روشن نہیں ہے بلکہ زمین کی طرح بے نور ٹھوس کرہ ہے۔ ۴ ہمارے ایک پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ علماحضرات کا یہ کہنا کہ آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے یہ جھوٹ ہے۔ لہٰذا براہِ کرم ہم کو اس کا مدلل مکمل جواب عطا فرمایا جائے۔ اور اس حدیث شریف کا متن بھی لکھا جائے جس میں آسمانوں کا فاصلہ پانچ سو سال کا راستہ ہے۔ فقط والسلام :- بَیِّنُوا وَ تُوجَرُوا

سائل:- نور محمد ٹنڈو اللہ یار صوبہ سندھ پاکستان ۶۶-۱۲-۷

بِعَونِ العَلَّامِ الوَهَّابِ

الجواب

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ :- نَحمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ النَّبِیِّ الکَرِیمِ وَ رَؤُفِ الرَّحِیمِ

اَمَّا بَعد ـ جاننا چاہیئے کہ جس طرح تمام عقائدِ اسلامیہ بے شمار مضبوط دلائل پر قائم و ثابت ہیں اسی طرح یہ عقیدہ بھی عقلاً نقلاً ایماناً ایقاناً۔ احادیث و قرآن اور منکرین اسلام کے اقوالِ زریں کے بے شمار دلائل سے بہت مضبوط ہے کہ زمین آسمان بالکل ساکن و جامد ہیں اقوامِ عالم کے سائنس دان اور مسلمانوں میں اندھی تقلیدِ سائنس کرنے والوں میں کسی کے پاس ایک بھی ایسی دلیل نہیں جس سے زمین کے متحرک ہونے یا سیارہ ہونے کو ثابت کیا جائے۔ کچھ لایعنی باتیں سائنس پڑھے ہوئے لوگ کرتے ہیں جن میں سے کچھ سوال میں درج ہیں۔ مجھ سے بہت دفعہ عیسائی اور مسلمان پروفیسروں سائنس کے ماہروں نے اس مسئلے پر مکالمہ کیا مگر بحمدہٖ تعالٰے چند منٹ کی گفتگو سے ہی متاثر ہو کر ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی زمین و آسمان ساکن ہیں اور چاند سورج متحرک سیارہ ہیں۔ سلجھے ہوئے دماغ والے تو حقیقت کو جلدی تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر بگڑے لوگ ہٹ دھرمی اور سائنس دانوں کی وہمیات پر اس طرح ایمان لائے ہوئے ہیں۔

کو شکست خوردہ ہو کر بھی سچائی کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ میں رب کریم کے بھروسہ پر مندرجہ ذیل سطور میں۔ اس مسئلہ پر دلائل پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقت تسلیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور سائنسی وہمیات کی الجھنوں سے بچائے۔ آمین۔ یا رب العالمین۔ چونکہ چیز بنانے والے کے اقوال چیز کے بارے میں زیادہ معتبر ہوتے ہیں اور زمین و آسمان کا بنانے خود باری تعالیٰ رب العزت ہے۔ اس لیئے اولاً اسی کے فرمودات کو دلائل و استدلال بنایا جاتا ہے۔

دلیل اول۔ قرآن مجید سورۂ حج آیت ع ۶۵ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ (الخ) اور اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:۔ سورۃ فاطر آیت ع ۴۱:۔ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا:۔ (ترجمہ):۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالکل ٹھہرایا ہوا ہے۔ روکا ہوا ہے۔ اس سے کہ گریں۔ ان آیتوں میں رب تعالیٰ نے اپنی قدرتِ عجیبہ کا اظہار فرمایا ہے۔ کیونکہ چلتی پھرتی اڑتی ہوئی چیز کا نہ گرنا تعجب خیز نہیں اس طرح کا مشاہدہ تو دن رات پرندوں اور ہوائی جہازوں سے ہوتا رہتا ہے یہ نہ گرنا زیادہ حیران کن نہیں حیران کن یہی ہے کہ بغیر حرکت کے اتنے بڑے بڑے آسمان و زمین ٹھیرے ہوئے ہیں ان آیات سے ثابت ہوا کہ آسمان و زمین ساکن ہیں۔ **دوسری دلیل**:۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔ سورۂ نحل آیت ع ۱۵:۔ وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ۔ اور دوسری آیت سورۃ الانبیاء آیت ع ۳۱:۔ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ:۔ (ترجمہ):۔ اور لگا دیئے ہم نے زمین میں لنگر تاکہ بالکل حرکت نہ کرے ایک جگہ کھڑی رہے۔ جس طرح بھری جہاز کو چلنے سے روکنے کے لیئے لنگر انداز کیا جاتا ہے تو وہ چل نہیں سکتا یہی بات کائنات کے لوگوں کو زمین کے بارے میں یہاں سمجھائی جا رہی ہے۔ کتنی صاف اور بڑی دلیل ہے اس بات پر کہ زمین بالکل ساکن ہے۔ اہل عقل کو سمجھانے کے لیئے یہ دلیل ہی کافی ہے۔ **تیسری دلیل**:۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورۂ مومن آیت ع ۶۴:۔ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا:۔ (ترجمہ) اللہ وہ ہے۔ جس نے تمہارے لیئے سب زمین کو ٹھیرا ہوا بنایا۔ **چوتھی دلیل**:۔ قرآنِ مجید میں ہے۔ سورۃ ق آیت ع ۷:۔ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ۔ (ترجمہ):۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ کی کیلونکا لنگر ٹھونک دیا۔ ان تمام آیات سے یہی ثابت ہوا کہ زمین بالکل ایک جگہ ٹھیری ہوئی ہے۔ **دلیل پانچویں**۔ تمام متکلمین اور فلاسفہ کی کتب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام کواکب ستارے صرف تین قسم کے ہیں:۔

پہلی قسم:۔ سیارہ ستارے یہ صرف سات ہیں۔ شمس و قمر زہرہ مریخ۔ عطارد مشتری۔ زحل۔ ان سیارگان میں نہ زمین کا نام ہے نہ آسمان کا۔ چنانچہ منطق کی مشہور کتاب مرقات کے ص ۱۱ پر اسی طرح

ہے۔ کواکب کی دوسری قسم متحرکین ہیں۔ اُن کی تعداد بے شمار ہے۔ تیسری قسم ساکنین کی ہے وہ صرف دو ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی۔ یہ اقسام کواکب سماویہ کی ہیں۔ متحرکین اور سیارگان میں فرق یہ ہے کہ سیارگان بار برجوں سے گزرتے ہوئے طلوع ہوتے ہیں اور اُن کے مطالع تاریخوں اور رسالوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن متحرکین کا تعلق برجوں سے قطعی نہیں ہوتا نہ اُن کے مطالع یعنی طلوع وظہور کی جگہ بدلتی ہے۔ بلکہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے انکی حرکت ایک معین مقام سے ہے۔ اُن کی حرکت مثل تیرنے کے ہے۔ اسی لیئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ :۔ (ترجمہ)۔ تمام تمام ستارے اپنے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں (سورت انبیاء آیت ۳۳) آسمان پر غور کرنے سے یہ دو قسم ستاروں کے بخوبی ظاہر ہوئے۔ ایک کا طلوع وغروب بدلتا رہتا ہے۔ اور قسم دوم کا طلوع ایک ہی رہتا ہے۔ اگر زمین پھرتی ہوتی تو کسی بھی ستارے کا طلوع ایک نہ رہتا۔ متحرکین ستاروں کا ہر دن ایک ہی جگہ سے طلوع کرنا بتا رہا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ اسی طرح ساکن ستاروں کا ہم زمین والوں کو ہمیشہ ایک ہی جگہ نظر آنا بتا رہا ہے کہ زمین ساکن ہے۔ مگر یہ تجربہ اور مشاہدہ تب ہو سکتا ہے جب یک دم سب ستاروں پر نظریں دوڑا کر غور وفکر کیا جائے اور ہماری اس دلیل میں تدبر کیا جائے۔ دور بین سے یک وقت صرف ایک ستارہ تو نظر آسکتا ہے سب ستارے دکھائی نہیں دیتے سائنس دانوں کو اسی لیئے دھوکہ لگا انہوں اپنی رصدگاہ اور تجربہ گاہوں سے بذریعہ دور بین سیاروں کو دیکھا۔ وہ ساکن زمین پر کھڑے ہو کر جب چلتے ستارے میں نظر دوڑانے لگے تو دماغ نے دھوکہ کھایا۔ اور ستارے کی روش سے زمین کو چلتا سمجھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ بس شور مچا دیا۔ کہ زمین سیارہ ہے۔ پھر یہ پر بس نہ کی بلکہ اپنے وہمیات سے نئی سے نئی نت نرالی زمین کی رفتاریں اور چالیس بنا ڈالیں۔ اور تعجب یہ کہ دلیل کسی بات پر نہیں۔ ان سائنس دانوں نے اتنی بڑی زمین کو کھلونا سمجھ لیا۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر عجیب مضحکہ خیز نظریات ملتے ہیں۔ میری تحقیق کے مطابق زمین بالکل ساکن ہے۔ اور آسمان کے چند مذکورہ ستارے۔ سیارے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ ایک شخص کھڑی ہوئی بس یا ریل میں بیٹھا ہے۔ اور کسی دوسری بس کو دیکھ رہا ہے، وہ بس چل پڑے تو اپنی بس چلتی نظر آتی ہے۔ اگر یہ شخص اسی بس کو دیکھتا رہے تو اپنی کھڑی بس کو چلنے کا اعتقاد بنا لے گا۔ اگر حقیقت اور سچائی کو جاننا چاہتا ہے تو دوسری سمت میں کھڑی اور ساکن اشیاء کو دیکھے۔ اگر یہ سائنس دان دوسرے کواکب ساکنہ پر بھی نظر کر لیتے۔ تو کبھی زمین کو سیارہ نہ کہتے اور بغیر دلائل ایک نیا مذہب وعقیدۂ باطلہ نہ بناتے ہمارے بعض مسلمان فلاسفر سائنس دانوں کی تائید کرتے ہوئے عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب لغویات ہیں۔ **دلیل ششم**۔ قرآن مجید سے تو زمین کے سکون پر بہت آیات پیش کر دی گئیں جن کی تائید اہلِ عقل نے اپنے تجربوں سے کر لی۔ تجربہ ۱:۔ مشاہدہ کواکب آسمانی جس کا ابھی ذکر ہوا۔ تجربہ ۲:۔ اگر زمین حرکت کرتی ہے تو ہم کو محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ جب کہ ذرا سا زلزلے

۱

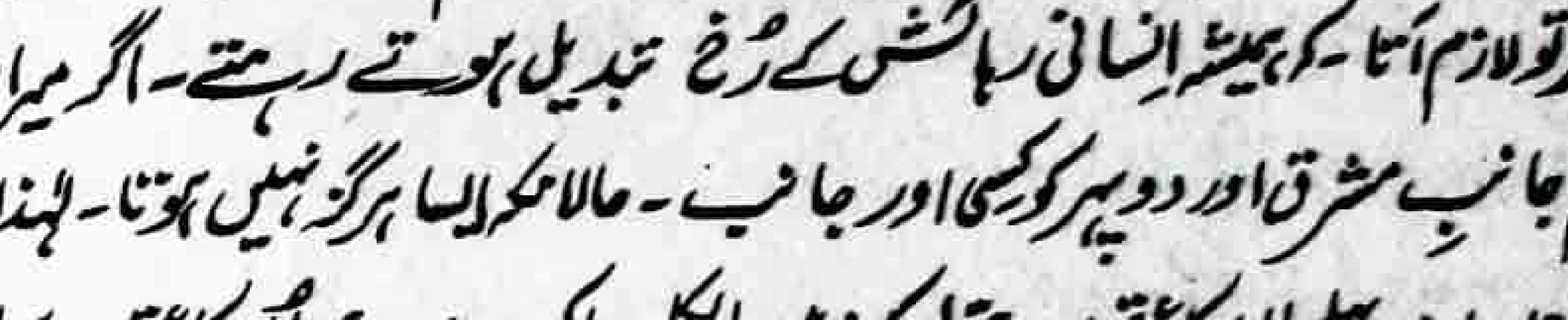
کا جھٹکا بھی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ تجربہ ۲ پھر قطبین کا رخ کیوں نہیں بدلتا وہ روزانہ ایک جگہ کیوں نظر آتے ہیں۔
بعض لوگ ایک آیت قرآنی سے حرکت زمین پر دلیل پکڑتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں سورۃ نمل آیت ۸۸ میں ہے
وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ :۔ اس آیت کا ترجمہ وہ اس طرح کرتے ہیں۔ اور دیکھتا ہے
تو پہاڑوں کو گمان کرتا ہے تو ان کو جامد و ساکت حالانکہ چل رہے ہیں وہ سب پہاڑ بادلوں کی طرح چلنا۔
معترض مخالف کہتا ہے کہ قرآن مجید سے زمین کا چلنا ثابت ہو گیا۔ **جواب** :۔ میں کہتا ہوں یہ دلیل چنا تامین
وجوہ سے غلط ہے :۔

پہلی وجہ :۔ یہ کہ اس کا ترجمہ مخالف نے غلط کیا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ اور دیکھے گا تو پہاڑوں کو
تو گمان کرے گا کہ جامد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے پھرتے ہوں گے۔ اس ترجمہ نے بتا دیا کہ آج کل ایسا نہیں
ہے کبھی آئندہ ایسا ہوگا۔ **دوسری وجہ** یہ کہ یہ واقعہ قیامت کو ہوگا۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیری وضاحت
دوسری آیت نے اس طرح فرما دی۔ سورت کہف آیت ۴۷ :۔ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ (الخ) ترجمہ
اور قیامت کے دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے۔ **تیسری وجہ** :۔ یہ کہ خود اس آیت کے سیاق و سباق
میں بھی قیامت کا ہی ذکر ہے۔ اسی کے واقعات ہیں۔ پس اس کے درمیان پہاڑوں کی حالت کا ذکر ہے کہ
بروز قیامت وہ پہاڑ زمین سے اکھڑ کر بادلوں کی طرح اڑیں گے۔ اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں گے۔
چوتھی وجہ یہ کہ یہاں پہاڑوں کی روش کا ذکر ہے۔ نہ کہ زمین کی حالانکہ گفتگو گردش زمین کے متعلق ہے
پانچویں وجہ یہ کہ پہاڑوں کے چلنے کو بادلوں کے چلنے سے مشابہ کیا گیا۔ اور بادل زمین سے جدا ہو کر چلتے
ہیں تو پھر جڑ کر۔ پھر اگر پہاڑ کے چلنے سے زمین کا چلنا ہی مراد لیا جائے تو صرف پہاڑ کا ذکر بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر
تو یہ کہنا چاہیئے تھا۔ کہ ہر چیز چلتی ہے درخت وغیرہ بھی مگر گمان ہوتا ہے کہ کھڑی ہے۔ بہر حال آج تک
سائنس دانوں کے پاس گردش زمین پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکی فقط وہمیات باطلہ اور خیالات فاسدہ ہیں
جو گھڑ لیئے گئے ہیں۔ گردش زمین و آسمان کے متعلق تین قول سامنے آئے ہیں۔ ۱ ایک فلاسفہ قدیم کا وہ کہتے ہیں
کہ فقط آسمان گردش کرتا ہے۔ نہ کہ زمین اور ایک قول فلاسفہ جدید کا جن کو عرف عام میں سائنسدان کہا جاتا ہے۔
تیسرا قول خود خَالِقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا۔ اور ہر ذی عقل اس بات کو بخوبی سمجھ جائے گا۔ کہ جو کچھ خود
بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کے متعلق جانتا ہے۔ وہ دوسرا نہیں جان سکتا۔ میں ایک چیز بناؤں۔ اور کہوں
کہ اس کے اندر رو ہا ہے۔ مگر دوسرا کہے۔ کہ نہیں تانبا ہے تو یقیناً لوگ مجھ کو ہی سچا سمجھیں گے۔ خیال رہے۔ کہ
کسی بات کو نہ ماننے کی چند وجہ ہوتی ہیں۔ یا تو بولنے والا اکثر جھوٹ کہتا ہو۔ یا زیادہ جاہل ہو۔ اور جہالت
سے خبر دے رہا ہو۔ اور یا نہ ماننے والے کے پاس ٹھوس دلائل ہوں۔ جو اس کے دعوے کو حسی اور یقینی

ثابت کر دیں۔ اور یا کسی کی بات محض ضد یا دشمنی کی وجہ سے نہ مانی جائے۔ ایسوں کے بارے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط اور یا فقط جہالت کی وجہ سے نہ ماننے۔ جیسے کہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ہ پہلی صورت تو عقیدۂ اسلامی میں ناممکن ہے۔ ایسے ہی دوسری بھی اس لیئے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے۔ کہ خدا تعالٰی جھوٹ سے پاک ہے۔ خود فرماتا ہے :۔ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ہ اور اللہ تعالٰی جہالت سے بھی پاک ہے۔ کہ فرماتا ہے :۔ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ہ :۔ رہی تیسری قسم کی صورت تو خود سائنسدان فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ہ کی مانند کبھی کچھ کہتے تھے۔ کبھی کچھ۔ آج سے پچاس سال پہلے سب فلاسفر جدیدہ متفق طور پر کہتے تھے۔ کہ سیارگان صرف سات ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا یہی سات سیارے فلاسفر قدیم اور اسلام میں مسلّم ہیں مگر پچاس سال گزرنے کی دیر تھی۔ کہ فلاسفر جدید کے دماغوں نے چکر کھایا۔ اور کہنے لگے۔ کہ آسمان و زمین گھومتے ہیں۔ اور لگے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کہ کوئی نو دلیل ہاتھ لگے۔ مگر وائے رے دماغی چکر۔ کہ ایک دلیل آتی ہے۔ تو دوسرے دعوای کو ختم کرتی ہے اور دوسری دلیل لی تو پہلا دعوے صفا نکل گیا۔ ادھر آتے ہیں۔ تو ادھر کی خرابی۔ ادھر آتے ہیں تو ادھر کی خرابی۔ آخر تھک ہار کر چیخ اٹھے کہ نہیں نہیں۔ ہماری کوئی تحقیق حتمی نہیں۔ ہمارا کوئی دعوای یقینی نہیں۔ چنانچہ ملاحظہ کرو سائنس کی مشہور کتاب حدائق النجوم صفحہ نمبر ۱۳۲ پر جس میں بہت بڑے روسی سائنسدان کا قول نقل کرتے ہیں۔ جس کا نام مسٹر ہیرڈ ہے۔ کہتا ہے کہ اتنی معلومات و تحقیقات کے باوجود ہم کسی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ہم یہ کہہ دیں۔ کہ زمین بالکل ساکن ہے۔ ٹھوس دلائل تو درکنار۔ اپنے دعوے سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ سائنس کے گرد گھنٹال تو یہ کہتے ہیں۔ مگر ہمارے نئے نویلے سائنس دان کہ جنہوں نے بجز باتوں کے کوئی سائنسی کمال نہ دکھایا۔ فلاسفر بننے کی ٹھان بیٹھے اور شاگرد سعید کی مثل سائنس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اب سائنسدان کچھ کہے۔ مگر یہ بغیر تصدیق کیئے سر تسلیم خم ہیں حالانکہ مسلمان کی شان قرآن کریم نے یہ فرمائی ہے :۔ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا :۔ سائل کے سوال میں جو دلائل حرکت زمین کے حق میں درج ہیں۔ وہ بیت عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اور یہ دلائل تو آج تک کسی سائنسدان کو نہ سوجھے۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے مجھ پر لازم آیا۔ کہ میں سائل کی تسلی کے لیئے فلاسفر قدیم کا عقیدہ بتاؤں۔ اور اس کا رد کروں۔ پھر فلاسفر جدیدہ کا عقیدہ اور ان کے دلائل بیان کروں۔ اور ان کا عقلاً رد کروں۔ جاننا چاہیئے کہ حرکت زمین کے متعلق فلاسفر قدیمہ کے دو گروہ ہیں ایک حکماء متقدمین کا اور ایک حکماء متاخرین کا۔ متقدمین کہتے ہیں۔ کہ زمین گردش نہیں کرتی۔ صرف آسمان گردش کرتا ہے۔ مگر سیارہ نہیں۔ ایک ہی جگہ لٹو کی طرح یا چکی کی مانند گھوم رہا ہے۔ چنانچہ عجائب مخلوقات ص ۲۳ پر ہے

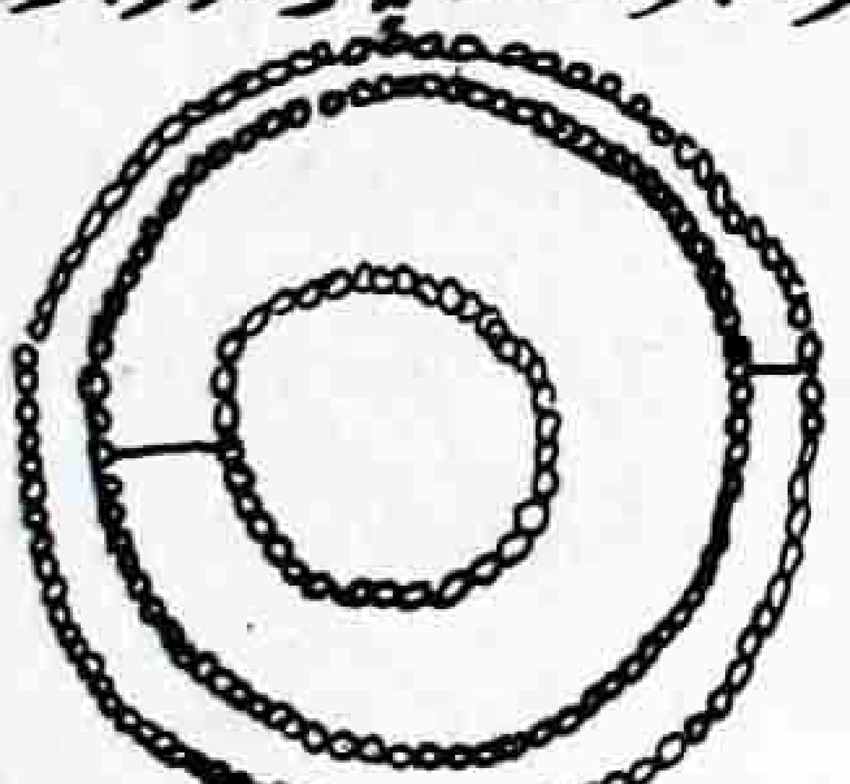
ذَهَبَ الْحُكَمَاءُ اِلٰى اَنَّ الْفَلَكَ جِسْمٌ بَسِيْطٌ كُرَوِيٌّ مُتَنَقِّلٌ عَلَى الْوَسَطِ مُتَحَرِّكٌ عَلَيْهِ ط ترجمہ
حکمانے کہا کہ فلک جسم بسیط ہے ایسا کرہ ہے جو اپنے مقام پر متحرک ہے۔ اور حکماء متاخرین جن کو عرف عام میں
منطقی بھی کہتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے۔ کہ آسمان گردش نہیں کرتا بلکہ زمین گھومتی ہے اور اپنے ہی محور پر قائم اور
چکی کی طرح گھوم رہی ہے۔ چنانچہ کتاب عجائب المخلوقات صفحہ ۲۱۵ پر منطقی۔ عقیدہ درج کرتے ہوئے لکھتے
ہیں۔ اَلْاَرْضُ جِسْمٌ بَسِيْطٌ طَبَاعَةً اَنْ يَّكُوْنَ بَارِدًا يَابِسًا مُتَغَيِّرًا اِلَى الْوَسَطِ ط :۔ (ترجمہ)۔
زمین جسم بسیط یعنی ٹھوس ہے اسکی حالتیں یہ ہیں کہ ٹھنڈی خشک اور ایک جگہ گھومنے والی ہے اسی لیے ان تمام فلاسفہ کے نزدیک صرف سیارے سات ہیں
مگر یہ سب عقائد دلو طرح باطل ہیں (۱) اس لیے کہ خالق کائنات نے یہ گردش بے فائدہ کیوں فرمائی۔ کیوں کہ
سیارہ تو فقط وہ ہی ہیں۔ جن سے دن رات اور تاریخیں ثابت ہوتی ہیں۔ شان باری تعالیٰ ہے :۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هٰذَا بَاطِلًا ۔ خلاقِ کائنات نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں کی۔ مگر یہ گردش ہر طرح بیکار نظر آتی ہے (۲) اس لیے
کہ یہ عقیدہ خود فلاسفہ کے بھی خلاف ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ چاند، سورج اور تمام ستارے اپنے اپنے آسمانوں
میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس عقیدے سے ان کا سیارہ ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ اور زمین کی گردش بھی ناممکن۔ اس
لیے پھر تو لازم آتا۔ کہ ہمیشہ انسانی رہائش کے رُخ تبدیل ہوتے رہتے۔ اگر میرا مکان صبح جانب مغرب ہے
تو شام جانب مشرق اور دوپہر کو کسی اور جانب۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ سب محض باطل ہیں۔ اور
فلاسفہ جدیدہ پہلے ان کا عقیدہ تھا۔ کہ زمین بالکل ساکن ہے۔ پھر اُن کا عقیدہ ہوا۔ کہ آسمان صرف اپنے مقام
پر رہ کر گھوم رہے ہیں۔ جیسا کہ فلاسفہ قدیم کا مذہب تھا۔ جب ان پر مندرجہ بالا اعتراضات کیئے گئے۔ تو اس
عقیدے کو چھوڑ کر دوسرا دعوٰے لے بیٹھے۔ اور کہنے لگے۔ کہ اکسمان زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک اپنے محور پر
مثلاً  گھوم رہی ہے۔ اور دوسرا چکر اس طرح  یعنی گول دائرے میں سیارے کی مثل پھرتی ہے۔ پھر
کسی سائنسدان نے سوچا۔ کہ اس گردش کو ہم سالانہ حساب سے مانیں روزانہ یا ماہانہ سب گردش داخلہ میں نہیں
آسکتے۔ اس لیے کہنے لگے۔ کہ نہیں نہیں۔ زمین تین قسم کی گردش کرتی ہے :۔ (۱) روزانہ اپنی جگہ پر (۲) ماہانہ اور
(۳) دوسری گردش پوری کر کے آگے کی طرف تھوڑا سا بڑھتی ہے : (ع۳) مثلاً اس گردش جیسی
کرتی ہے گویا کہ آج اس جگہ چکر لگایا۔ تو ایک ماہ کے بعد کچھ آگے چکر لگایا۔ اور اس کی ہیئات گردش یہ ہے۔

اُن کے
سے سوال
چکر جس



اس عقیدے پر تین طریقے
کیا گیا :۔ نمبر ع۱ یہ تیسرا
طرح شکل بنائی گئی۔ ایک ہی
سمت کو جا رہی ہے۔ یا گول دائرے میں اگر ایک ہی سمت ہو تو بارہ مہینوں کی تعداد کیسے پوری کرو گے اور ہر تیرھواں مہینہ

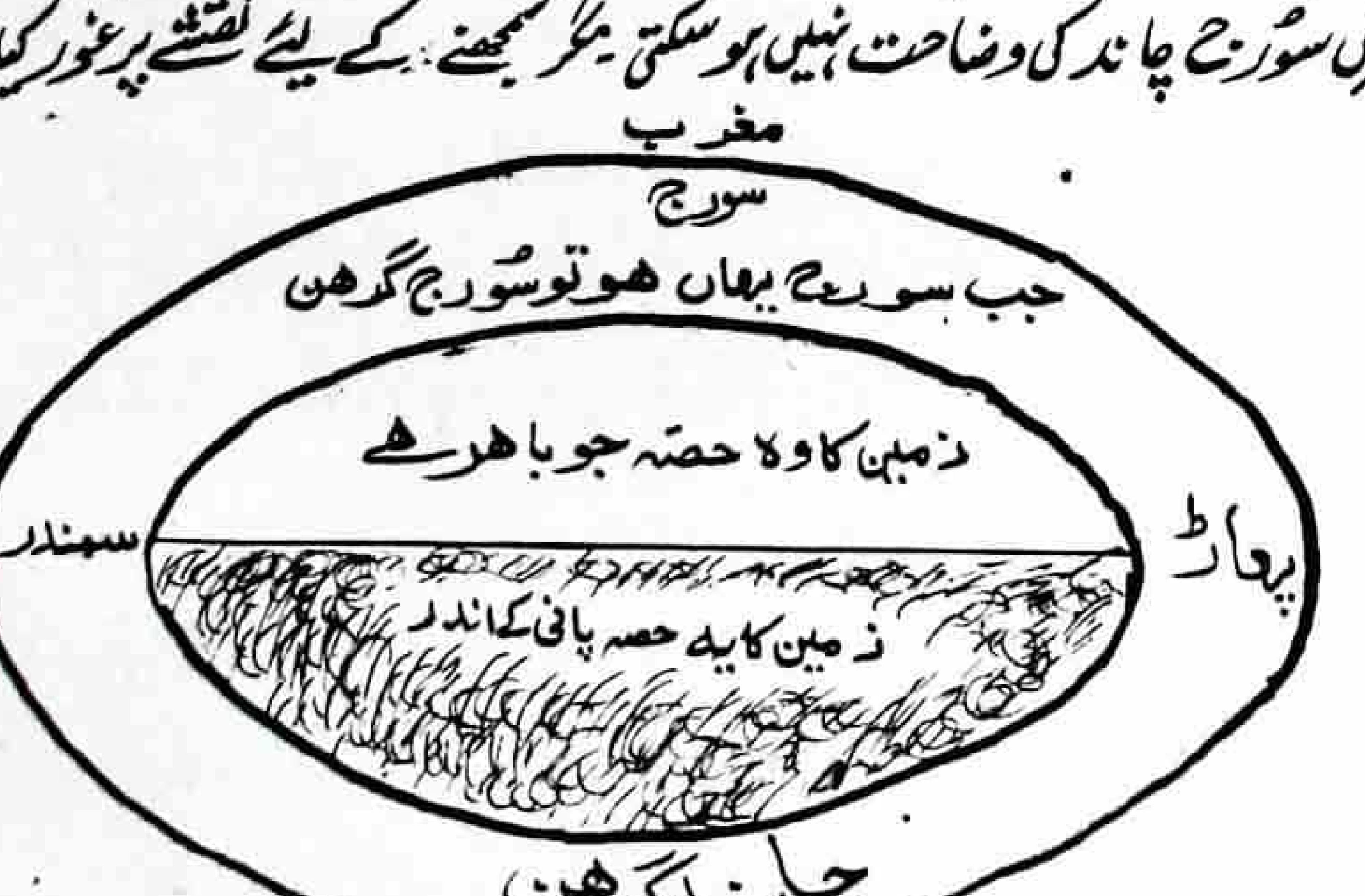
لوٹ کر جنوری کیسے ہوگا۔ پھر تو اس کا بڑھنا غیر انتہائی سمت کی طرف ہے اس طرح تعداد ماہ بھی بارہ نہ ہوگی۔ بلکہ
غیر انتہائی ماہ متصور ہوں گے (۲) زمین کا آگے کی طرف بڑھنا غیر انتہائی ہے۔ یا انتہائی اگر غیر انتہائی ہے۔ تو وہی
اعتراض جو اوپر ذکر ہوا۔ اور اگر انتہائی ہے۔ تو بڑھتے بڑھتے دو قسم کی خرابیاں (۱) یہ کہ کسی چیز سے ٹکرا کر
واپس لوٹی (۲) کیوں واپس آئی۔ آگے جانے سے کون مانع اور پھر تیسری حرکت سے چوتھی حرکت مزید سمجھ
آئی۔ کہ زمین اُن چکروں کے علاوہ دائیں بائیں بھی پھرتی ہے۔ حالانکہ ابھی تک کسی سائنس دان کو اس حرکت کی
نہ سوجھی (۳) اگر تیسرا چکر بھی گول دائرے میں گھومتا ہے۔ تب لازم آئے گا۔ ہر سال یہ چکر دراز ہوتا
جائے۔ اور اس کی شکل یہ ہوگی۔ اس طرح ہر سال چکر دراز ہونے کی شکل میں اوقاتِ ایام
میں بھی یقینی طور پر درازی ہوگی۔ اِس لیے جتنا



لمبا چکر ہوگا۔ اتنا ہی دیر سے پورا ہوگا جتنا چکر چھوٹا ہوگا۔ اتنا
ہی جلد پورا ہوگا۔ اِس کا تجربہ پہیے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے
جب چھوٹا چکر تھا۔ تب دن رات کا محور چوبیس گھنٹوں میں پورا
ہوتا ہے۔ تو اب اتنے عرصے کے بعد چاہیے۔ کہ دن بھی ہزاروں سال کے برابر ہو۔ اور رات بھی اور ماہ بھی
اور سال بھی اِس سے زیادہ بڑے ہوں۔ حالانکہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ دن رات اِسی مقدار کا ہے:۔
جو آج سے تین صدی پہلے تھا۔ اور سال کے دن بھی شروع سے اب تک تین سو پینسٹھ (۳۶۵) ہی ہیں
ہاں صرف لیپ کا سال کچھ دن عام سال سے بڑا ہوتا ہے۔ اور وہ دن اِس چکر کی لمبائی سے نہیں۔ یہی وجہ
ہے۔ کہ اتنے ہی دن زیادہ ہوتے ہیں۔ جو علماء نجوم نے کہہ دیا۔ بعض جہلا فلاسفہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ
آسمان و زمین سب کے سب کسی نامعلوم غیر انتہائی سمت کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سائنس
کی مشہور کتاب اصول علم ھیئات جلد دوم صفحہ ۱۰۳ پر ایسا ہی لکھا ہے یہ بے فائدہ اور عقل سے دراز بات
ہے۔ یعنی کہ زمین نہ ہوئی۔ ریل گاڑی ہوگئی۔ پھر اگر اِس دوڑ میں زمین کی رفتار تیز ہے۔ تو مثل ریل گاڑی کے
سب کو پیچھے چھوڑ جانا چاہیے تھا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ قطب ستارہ اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے:۔ باوجود
اس بات کے کہ وہ زمینوں کے ساتھ معلق نہیں۔ بلکہ آسمان میں ہے۔ اور اگر سب کی رفتار یکساں ہے۔ تو
چاہیے کہ چاند، سورج وغیرہ کبھی غائب نہ ہوں۔ جب یہ فلاسفر ان کے جوابات سے عاجز آ گئے۔ اور ان
مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت نہ پائی۔ تو پانسہ پلٹا۔ اور کہنے لگے۔ نہیں نہیں۔ زمین کی یہ حرکتیں دن
رات سال مہینہ کے نظام چلانے کے لیے نہیں۔ یہ نظام تو چاند، سورج سے چل رہا ہے۔ بلکہ زمین وغیرہ
ہر سیارہ کا اپنے محور پر گھومنا اس وجہ سے ہے۔ کہ طبعیات میں ثابت ہوا ہے۔ کہ کائنات کی ہر چیز

بالطبع آفتاب سے نور و حرارت لینا چاہتا ہے۔ اگر سیارے حرکت وضعیہ نہ کریں۔ تو جمیع اجزاء کو نور و حرارت نہ پہنچے۔ (الخ) یہ دلیل فلاسفہ کی بہت قوی دلیل ہے۔ اس دلیل سے سب دلائل کو ٹھکرا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ دلیل بہت سی کتب میں لکھی ہے۔ چنانچہ حقائق النجوم میں صفحہ ۶۴ پر مشہور سائنس دان مسٹر نیوٹن کے شاگرد مسٹر ٹام کا قول نقل کرتے ہوئے اس دلیل کو پیش کرتے ہیں۔ مسٹر نیوٹن وہی ہے۔ کہ جس نے ۱۶۶۵ء میں سیب کے گرنے سے کشش زمین کا بے ہودہ عقیدہ باندھا تھا۔ مگر میں اس دلیل کو نو طریقوں سے توڑتا ہوں:۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (۱) ابھی تک سب سائنس دانوں نے تمام اجزاء میں صرف تین قوتیں تسلیم کی ہیں۔ (۱) قوتِ جاذبہ؛ (۲) قوتِ نافرہ؛ (۳) قوتِ ماسکہ؛ اس دلیل سے ایک اور قوت ماننی پڑے گی۔ جس کا نام قوتِ شائقہ ہے۔ حالانکہ اب تک کسی نے یہ قوت نہ مانی۔ (۱) جب ہر جز ہی آفتاب سے نور اور حرارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو چاہیئے۔ کہ ہر وقت اڑتا رہے یہاں تک کہ ریت کے ذرے اینٹ، پتھر جز زمین کے اجزاء گہرائیوں میں دبے ہوئے ہیں۔ وہ بھی اوپر آکر حرارت و نور حاصل کریں نہ کوئی مکان سلامت رہے نہ پہاڑ، وہ چیزیں جو زمین میں دبی ہوئی ہیں۔ کیا وہ زمین کی جز نہیں اور کیا ان کو حرارت نہیں چاہیئے؛ (۳) فلاسفہ جدیدہ کہتے ہیں۔ کہ زمین میں اتنے مساوات ہیں۔ کہ اگر سب کو دبایا جائے۔ اور زمین کو شکنجہ میں کسا جائے۔ تو زمین ایک انچ کی رہ جائے۔ تو لازم ہوا۔ کہ زمین کا کوئی جز دوسرے جز سے متصل نہیں بلکہ خاصے فاصلہ پر ہے۔ گویا زمین ایک جالی ہے۔ تو ہر جز اپنے محور پر علیحدہ کیوں نہیں گھومتا۔ اور اپنے اندرونی اجزاء کو حرارت سے کیوں محروم رکھتا ہے فقط کرۂ ارض کا گھومنا تو ہر چیز کو اندرونی نور و حرارت نہیں پہنچا سکتا؛ (۴) کرۂ ارض کی حرکت وضعیہ سے سطح بالا ہی کے سب اجزاء فی الجملہ مستفید ہوں گے۔ اندر کے تمام اجزاء اب بھی مطلقاً محروم رہے۔ تو تمہاری دلیل کے ٹکڑے اڑ گئے۔ تمام اجزاء کا استفادہ کب ہوا۔ اندر کے اجزاء طلب نور و حرارت کے لیئے اوپر کیوں نہیں آئے۔ اگر کوئی بیوقوف فلاسفر یہ کہہ دے۔ کہ اوپر کے اجزاء ان کو اوپر نہیں آنے دیتے۔ تو یہ بھی غلط ہے۔ اولاً اس لیئے۔ کہ جب زمین میں بقول تمہارے اتنے اتنے بڑے مسام ہیں۔ کہ ساری زمین دبانے سے ایک انچ رہ جائے۔ تو نیچے والے اجزاء ان مسامات میں سے گزر کر اوپر کیوں نہیں آجاتے۔ دوم اس لیئے کہ پھر تو صرف اوپر کے اجزاء نے ہی حرارت لی۔ بلکہ ان میں سے بھی بعض کیوں کہ جو اجزاء آفتاب سے حجاب میں ہیں۔ بالمقابل اجزاء ان کے لیئے رکاوٹ ہیں اور قطب جنوبی جہاں چھ ماہ رات رہتی ہے۔ حرارت سے یکسر محروم رہے۔ ان تمام وجوہ سے حرکتِ وضعیہ بیکار ہوئی؛ (۵) سورج کیوں گردش کرتا ہے۔ وہ کس لئے طلب نور و حرارت کرتا ہے۔

(۶) نصف کرۂ ارض تاریک کیوں رہتا ہے (۷) بفرضِ محال سب ہی مقابل آفتاب سہی۔ تو پھر عمود و منحرف کا فرق کدھر کروگے (۸) اگر یہ بھی نہیں۔ تو اختلاف منظر کیوں کر ہوا (۹) سیارے صرف سات یا آٹھ یا نو کیوں ہیں کائنات کی ہر چیز سیارہ کیوں نہیں ہے۔ ان تمام سوالات سے میں نے اپنی تحقیق کے مطابق فلاسفہ کے اقوال حمقاء کا رد بلیغ کر دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ :۔ ہمارا اسلامی فلسفہ جس کو منطق بھی کہتے ہیں۔ جس کو امام رازی اور بو علی سینا نے پیش کیا۔ اور سارے عالم اسلام کا اتفاق ہے۔ وہ یہ ہے کہ چاند سورج اور ستارے زمین و آسمان سب کرے گول مثل گیند کے ہیں :۔ اور جَعَلَ الْاَرْضَ فِرَاشًا اِس مسلک کے مانع نہیں۔ ہاں بعض منطقی کہتے ہیں۔ کہ زمین تھالی کی طرح گول ہے اور دلیل میں۔ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط والی آیت پیش کرتے ہیں۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ زمین مثل انڈے کے گول ہے۔ اور چاند گھٹتا بڑھتا نہیں ہے بلکہ چاند ایک سیاہ کرہ ہے جو سورج کے نور سے منور ہوتا ہے۔ چاند اور سورج گردش کرتے ہیں مخالف سمت پر اسی لیے چاند رات کو چمکتا ہے اور طلوع ہوتا ہے۔ اور سورج دن کو۔ پس جس حصہ کا سورج سے آمنا سامنا ہو جائے۔ وہ ہی منور ہو جاتا ہے چاند اور سورج کا گرہن ہونا بھی اس لیے نہیں۔ کہ زمین گردش کرتی ہے۔ بلکہ یہ دلیل پیش کرنا بھی جہالت کی نشانی ہے منطقی اور اسلامی نقطہ سے چاند اس لیئے گرہن ہوتا ہے۔ کہ دو گردشیں ہیں۔ ایک سردی کی اور ایک گرمی کی۔ اِس لیئے قطب جنوبی میں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات ہوتی ہے۔ جب زمین چاند کے بالکل مقابل آجائے! اور سورج زمین کے نیچے بالکل بیچ میں ہو۔ تو چاند گرہن لگ جاتا ہے اسی لیئے ہمیشہ تیرھویں چودھویں اور پندرھویں رات کو ہی گرہن ہوتا ہے۔ کیونکہ سورج چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے پھر کبھی سورج کے بالکل سامنے چاند آجاتا ہے۔ اور زمین کیلیئے چاند آڑین جاتا ہے۔ تو ہم سمجھ لیتے ہیں۔ کہ سورج گھر گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمیشہ سورج چاند کی اٹھائیس، انتیس کو ہی گرہن ہوتا ہے۔ اور ساتوں آسمانوں میں پانچ پانچ سو سال کا فاصلہ ہے چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے مشکوٰۃ شریف ص۵۱۰ باب بدءالخلق پر ہے :۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ الخ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَهَا خَمْسُ مِائَۃِ عَامٍ (الخ) قَالَ سَمَآءً اِنَّ بُعْدَ مَا بَیْنَهُمَا خَمْسُ مِائَۃِ عَامٍ ثُمَّ قَالَ کَذَالِکَ حَتّٰی عَدَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط اور زمین کا نقشہ یہ ہے۔ کہ زمین آدھی پانی کے اندر ہوتی ہے اور آدھی باہر، جس پر آبادی ہے یہی وَجَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ط ہے۔ نقشہ پر پوری طرح گردشِ سورج چاند کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ مگر سمجھنے کے لیئے نقشے پر غور کیا جائے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ



چاند پر راکٹ جانے کا بیان اور عقیدہ

سوال نمبر ۲۳:۔ کیا فرماتے ہیں۔ علماء دین اس مسئلہ میں کہ کفار آئے دن یہ اعلان کرتے ہیں۔ کہ فلاں راکٹ چاند پر اتر گیا ہے۔ اور ہم انسان کو چاند پر بھیج دیں گے۔ اور چاند ہماری ملکیت بن جائے گا۔ آیا کیا یہ کامیاب ہوں گے یا نہیں کیا چاند آسمان پر ہے۔ اور بموجب حدیث پانچ سو سال کا رستہ ہے۔ اور قرآن مجید کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کامیاب نہ ہوں گے۔ وہ آیت یہ ہے۔ کہ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ۔ ترجمہ:۔ کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لیے کام میں لگا دیا جو کچھ زمین میں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ زمین کی چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے انکے بس میں کر دی ہیں۔ اور آسمان کی چیزوں کا تو ذکر ہی نہیں ہے والسلام (نور محمد سکنہ ٹنڈو الہ یار سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

الجواب

شریعتِ پاک کے اقوال کے مطابق چاند پر پہنچنا ناممکن نہیں۔ نہ کسی آیت پاک سے یہ عدم امکان ثابت ہوا۔ حدیث شریف اور سائل کی پیش کردہ آیت بھی مذکورہ فی السوال منشا ثابت نہیں کرتی۔ اس لیے کہ ایک کا ثبوت دوسرے کا عدم ظاہر نہیں کرتا۔ چنانچہ قرآن مجید میں آسمانوں پر جانے کا ذکر ہے اور جنات و انسان کو کہا گیا ہے۔ کہ تم کہیں بھی چلے جاؤ اللہ کی سلطنت میں ہی جاؤ گے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا ۚ لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ؕ:۔ (ترجمہ) اے جنات و انسان کے گروہ اگر تم طاقت رکھتے ہو۔ کہ آسمان و زمین کی حدود سے نکل جاؤ۔ تو نکل جاؤ۔ مگر اللہ کے قبضے سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس آیت میں آسمانوں سے باہر نکلنے کی قدرت کا ذکر ہے۔ استفعار صرف حکومتِ الٰہیہ سے باہر نکلنے کا ہے۔ لہٰذا چاند پر پہنچنا کوئی محال نہیں۔ بشرطیکہ طاقت ہونی چاہیے۔ اس لیے آیت کریمہ میں اِنِ اسْتَطَعْتُمْ کی قید لگی ہے:۔ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس جملے کو شرط بنایا۔ اور آسمان کی حدود سے نکلنے کو جزا۔ جزا بغیر شرط ناممکن مگر شرط کے ہونے سے ممکن اس مسئلہ پر اور بھی بہت سی آیات واضح ہیں۔ ایک جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد قرآن مجید

میں ہے۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ترجمہ) :۔ کہ اللہ تعالےٰ نے چاند اور سورج کو مسخر فرمایا۔ اگر سائل سوال کرے۔ کہ اِس آیت کریمہ میں (لَکُمْ) نہیں ہے۔ جس سے انسان کے لیئے مسخر نہیں ثابت ہوتا۔ حالانکہ سوال میں مذکورہ آیت لفظِ لَکُمْ کے ساتھ ہے۔ تو میں پارہ نمبر ۲۵ کی آیت کریمہ پیش کروں گا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے :۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط
ترجمہ :۔ اور اللہ رب العزت نے مسخر کر دیا۔ اے انسانوں تمہارے لیئے تمام وہ کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ منشاءِ باری تعالیٰ یہ ہے۔ کہ انسان کو اتنی طاقت بارگاہِ خلاقِ عالم سے عطا ہوئی ہے۔ کہ ہر چیز پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبیبِ خالقِ کائنات خیر البشر فخر الرسل محمد و نبی اکمل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معراج کرائی۔ جس طرح چاند، سورج بلکہ تمام کروں پر عبور حاصل کیا اور ثابت کر دیا۔ کہ قادرِ مطلق نے نفوذِ آسمانی کے لیئے طاقت کی شرط لگائی۔ اور فرمایا :۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ تاکہ پتہ لگے۔ کہ آسمان پر جانا ممکن ہے۔ مگر یہ بے طاقت کا کام نہیں۔ اور دنیا بھر کے سائنسدان اس کو جان لیں۔ اور اقوامِ عالم سمجھ لیں کہ ؎

پتہ لگا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

مگر فرق یہ ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایک رات میں پہنچ گئے لیکن سائنسدان ابھی تک زور لگا رہے ہیں۔ بہر حال مذہبِ اسلام میں چاند پر بذریعہ براق یا بذریعہ راکٹ یا کسی بھی طاقت کے ذریعے جانا نا ممکن نہیں۔ یہ بات ہر شخص کو ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ سائنسی تجربات صرف کفار نے ہی نہیں کیئے بلکہ دنیا کی ایجادات میں مسلمان فلاسفر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جیسا کہ تاریخی کتب سے ظاہر ہے اور یہ سب تجربات قرآن مجید میں تفکر و تدبر سے ہی حاصل کیئے گئے۔ یہاں تک کہ کافر سائنس دان نے بھی جو کچھ حاصل کیا تدبرِ قرآنی سے ہی حاصل کیا۔ مگر اس کے باوجود کہ مسلمانوں نے دنیوی سائنس میں بہت تحقیق کی ہیں ہمارے لیئے کوئی فخر کی بات نہیں۔ کیونکہ مسلمان کی پیدائش اس لیئے نہیں کہ دنیوی محنتوں میں پھنسا رہے وہ تو صرف اُخروی محنتوں اور کمالاتِ دینیہ کے لیئے پیدا کیا گیا ہے مسلمان کی خوشی یہ نہیں کہ وہ راکٹ و جہاز بناتا رہے۔ یہ سب کام تو دنیا داروں کے ہیں۔ مسلمان شہنشاہی آخرت کے لیئے پیدا کیا گیا۔ جیسے بادشاہ کا کام نظام شہنشاہی ہے اور غلام کا کام اس کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ دیکھو ساری دنیا کے کفار ایجادیں کرتے ہیں اور اس کو برتنا مسلمان کے لیئے ضروری ہو گیا۔ بالکل یہی بات ثابت ہو گی کہ سب جہان میرے لیئے اور تو خدا کے واسطے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبہ

آسمان اور فلک میں فرق کیا ہے اس کا بیان

سوال نمبر ۲۵ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین مسائل ذیل میں :۔ (۱) سما اور فلک دونوں الفاظ ایک معنیٰ میں ہیں۔ یا کچھ فرق ہے ؟ (۲) آسمان کا وجود کیا ہے۔ اور کیا کوئی ٹھوس مادہ ہے یا رقیق ہے۔ اگر رقیق ہے۔ تو اگر کوئی چیز گزرے اس میں تر ہوگی یا نہیں۔ اور آسمان کو خلا کہا جا سکتا ہے۔ یا نہیں۔ زید صاحب فرماتے ہیں۔ کہ آسمان جس کو آپ کہتے ہیں۔ وہ خلا ہے۔ کیونکہ روسی خلائی جہاز چاند پر اتر گیا۔ وہاں پر خلا ہی خلا ہے۔ اگر رقیق یا ہوا کی طرح ہے تو جہاز کو تر ہونا چاہیئے۔ اور وہاں ہوا نہیں۔ آسمان۔ کا وجود کس طرح ہے۔ فقط والسلام :

(نور محمد ٹنڈو الٰہ یار حیدر آباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

(۱) لفظِ سما اور لفظِ فلک لغت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ چنانچہ لفظِ سماء کا لغوی ترجمہ ہے۔ بلندی یا بلند اسی لیئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کہ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ط اور لفظِ فلک کا لغوی ترجمہ ہر ذو سطح چیز۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور حدیث قدسی میں ہے، لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ ط یہاں افلاک اپنے لغوی معنیٰ میں ہے۔ اسی لیئے شارحینِ حدیث اس حدیث پاک کی شرح میں لکھتے ہیں۔ یہاں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمین مراد ہیں۔ اور اِن تمام الفاظ کا اصطلاحی ترجمہ آسمان ہے :۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہٗ ارشاد فرماتا ہے :۔ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے :۔ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ط (۲) ابھی تک آسمان کی حتمی حقیقت حتمی طور پر کسی سے آشکارا نہیں ہوئی۔ ہمارے علماء بھی اِس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں بعض فلاسفۂ اسلام فرماتے ہیں۔ کہ آسمان ٹھوس دھاتوں کا بنا ہوا ہے۔ اور اُن کی دلیل وہ آیت کریمہ ہے۔ وَخَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط کیونکہ لفظِ طِبَاقًا جمع ہے طبق کی۔ طبق کہتے ہیں ٹھوس مادے کو۔ اور چاند پہلے آسمان پر ہے مگر ہے نیچے۔ لہٰذا چاند تک پہنچنے سے آسمان تک پہنچنا لازم نہیں آیا :۔ پہلا آسمان چاند سے بھی اوپر ہے۔ یہ فلاسفہ کہتے ہیں۔ کہ ایک آسمان سونے کا ہے۔ ایک لوہے کا

وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہمارے اکثر علماء نجوم فرماتے ہیں۔ کہ ساتوں آسمان رقیق ہیں۔ اور دھوئیں کی شکل ہیں۔ ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا (الخ) اور دوسری آیت یہ ہے كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ط تمام نجوم اپنے اپنے آسمانوں میں گھوم رہے ہیں۔ اور میری تحقیق میں قول درست ہے۔ رقیق شئے میں تر ہونا لازم نہیں۔ دیکھو ہوا رقیق ہے مگر ہم اور ہمارے کپڑے تر نہیں ہوتے۔ حالانکہ بادل پانی سے ہے۔ ہم دھوئیں میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ مگر ہمارا ہاتھ تر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ قول بالکل غلط ہے۔ کہ رقیق ہو تو تر کیوں نہ ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ آسمان مادہ رقیق ہے۔ جیسے دھواں اور ہوا۔ مگر وہ دھواں نہیں نہ ہوا ہے جنس اُس کی کچھ اور ہے۔ قرآن کریم کا یہ فرمان کہ وَهِيَ دُخَانٌ یہاں صرف مثلیت مراد ہے :۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ

کتبـــــــــــــــــــــــــــــــہ

رعد اور برق کی کیا حقیقت ہے

سوال ۲۶ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین مسائل ذیل میں۔ برق اور رعد کی کیا حقیقت ہے، اور حدیث کا متن نقل کر دیا جائے :۔ والسلام :۔

(نور محمد ٹنڈو الٰہ یار حیدر آباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

اَلْجَوَابُ

نظریۂ اسلام کے مطابق رعد اور برق کی حقیقت موجودہ سائنس دان اور پہلے زمانے کے فلاسفہ کے عقیدے سے مختلف ہے۔ ہمارے علماء اور فلاسفہ رعد کی حقیقت کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔ کہ رعد ایک بادل کی خوفناک آواز کا نام ہے۔ جس وقت ہوائیں بادلوں کو چلاتی ہیں۔ تو بادل کے ٹکڑے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ یا بادل جب پھٹتا ہے۔ تب آواز پیدا ہوتی ہے اِسی کو عرف عام میں بادل کا گرجنا کہتے ہیں۔ اور برق اِسی روشنی کا نام ہے۔ جو بادلوں کی رگڑ سے تیزی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اِسی تیزی اور گرمی سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ جس کو آسمان کی بجلی بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ تفسیر روح البیان صفحہ نمبر ۷ پر لکھا ہے :۔ وَالْمَشْهُوْرُ بَيْنَ الْحُكَمَاءِ اَنَّ الرَّعْدَ

يُحْدِثُ مِنْ اِصْطِكَاكِ اَجْرَامِ السَّحَابِ بَعْضُهَا بِبَعْضٍ اَوْمِنْ اَقْلَاعِ بَعْضٍ عَنْ بَعْضِهَا عِنْدَ اِضْطِرَابِهَا بِسُوْقِ الرِّيَاحِ اِيَّاهَا ط لیکن یہ نظریۂ اسلام کے فرمان سے مختلف ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا جب کے آپ کے پاس یہودی عالم حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے عرض کیا۔ کہ بتائیے۔ رعد کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک فرشتہ ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے بادلوں پر مقرر کیا ہے۔ یہودی نے عرض کیا۔ یہ کڑک کیسی ہوتی ہے۔ فرمایا یہ اس فرشتے کی آواز ہے۔ اور برق اس شعاع کا نام ہے۔ جن کے ذریعہ وہ فرشتہ بادلوں کو چلاتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے:۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقْبَلَتِ الْيَهُوْدُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اَخْبِرْ عَنِ الرَّعْدِ الخ) قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے چنانچہ سورتِ رعد آیت ۱۳ میں ہے وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ الخ۔ ترجمہ۔ اور تسبیح پڑھتا ہے رعد اس کی حمد سے اس سے ثابت ہوا کہ تسبیح کا فاعل رعد ہے اور فاعل ذی عقل و حواس ہی ہو سکتا ہے۔ موجودہ سائنس دان کا بھی وہی عقیدہ ہے جو فلاسفر کا ہے۔ مگر صرف ظاہر پر نظر کرتے ہیں۔ حقیقت کو نہیں دیکھتے۔ اسلام حقیقت کو بیان فرماتا ہے۔ جس پر اس کا فیصلہ یقینی ہوتا ہے۔ جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہی نظریہ توریت اور زبور نے پیش کیا۔

کتبہ

سات زمینوں کی کیفیت؟

سوال نمبر ۱۲۹ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اِس مسئلہ میں۔ کہ زمین آپس ملی ہوئی ہے۔ یا سات زمینیں جدا جدا ہیں۔ اور ایک دوسرے سے پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ جس طرح آسمانوں میں ہے۔ اور کیا ہر زمین میں کوئی مخلوق ہے۔ اور ہر ایک زمین میں ایک نبی آیا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن کثیر میں سورت حدید کی تفسیر میں ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ کہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے ہر ایک زمین کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ارشاد فرمایا ہے۔ اور اسی طرح سورت طلاق آیت وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ کے تحت ایک روائیت مروی ہے۔ کہ ہر زمین میں مثل حضرت ابراہیم کے اور اس زمین کی مخلوق ہے۔ اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس کا قول ہے۔ کہ ہر ایک زمین پر ایک نبی آیا ہے۔ اس حدیث کا متن نقل کریں۔ جس سے زمین کا آپس میں ملا ہوا ثابت ہے۔ فقط والسّلام!

(سائل :- نور محمد ٹنڈو الٰہ یار حیدر آباد سندھ)

الجواب بعون العلام الوھاب

فلاسفۂ قدیم و جدید اور شریعتِ اسلامیہ کے علماء نے زمینوں کے بارے میں بہت اختلاف کیا ہے مگر صحیح مسلک یہ ہے۔ کہ زمینیں سات ہیں پیاز کی طرح چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ۴۲ پر ہے۔ وَقَالَ الضَّحَاكُ مُطْبَقَةٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ مِنْ غَيْرِ فُتُوقٍ وَفُرْجَةٍ ط اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے۔ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شِبْرًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى سَبْعِ اَرْضِيْنَ۔ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ کتاب ص۵۹ بَدْءُ الْخَلْقِ باب ۲، اسی طرح ایک اور حدیث شریف ہے :- مَنْ ظَلَمَ قِيْدَ شِبْرٍ طُوِّقَهٗ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ (مسلم شریف حدیث ۱۳۷ باب ۶۳ کتاب المساقاۃ صفحہ ۱۳۷) ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ جس شخص نے کسی شخص کی ایک بالشت کے برابر زمین چھینی۔ قیامت کے دن ساتوں زمینوں تک کا طوق اس کے گردن میں ڈالا جائے گا۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ان تینوں قولوں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ساتوں زمینیں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ بلکہ جڑی ہوئی ہیں۔ سائل کی پیش کردہ احادیث اس مسلک میں قابلِ قبول نہیں کیونکہ وہ روایت جس میں راوی نے لکھا ہے کہ بفرمانِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمین کے درمیان پانچ سو سال کا رستہ ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ حدیث غریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین اس روایت کو سندِ مسلک نہیں بناتے۔ بلکہ اس کے خلافِ مسلک پیش کرتے ہیں چنانچہ اربع تفاسیر جلد ششم صفحہ ص۲۹۵ پر ہے :- وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ سَبْعًا وَلٰكِنَّهَا مُنْبَسِطَةٌ ط مندرجہ بالا صحیح حدیث سے یہی اشارۃ النص سے ثابت ہو رہا ہے۔ کہ زمین اپنے پرت کے لحاظ سے سات ہیں نہ کہ علیحدہ علیحدہ اور صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے غریب حدیث کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔ اس روائت کی اسناد میں ایک راوی حسن ہے۔ جس کے بارے میں دیگر محدثین فرماتے ہیں۔ کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ ابو قُرَیب راوی غیر ثقہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ سائل کی پیش کردہ دوسری حدیث بالکل من گھڑت ہے اور غلط ہے :- تفسیر ابن کثیر نے اگرچہ یہ حدیث بالکل دیگر مفسرین کی طرح نقل کی ہے۔ مگر سب مفسرین اس روایت کو بالکل من گھڑت بتاتے ہیں۔ اس روائت کی اسناد میں ایک راوی واقدی ہے محدثین کے نزدیک وہ بہت جھوٹا ہے اور اکثر جھوٹی روائتیں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ تفسیر روح المعانی

جلد پانزدہم صفحہ ۱۴۳ میں ہے :۔ وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ لَا شَكَّ فِيْ وَضْعِهٖ وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الْوَاقِدِيِّ الْكَذَّابِ ط مؤرخین فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ یہودیوں کے قصوں سے لیا گیا ہے۔ ایسی باتیں یہودیوں کے قصوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان صفحہ ۴۲ پر ہے۔ عَلٰى اَنَّهٗ اَخَذَهَا عَنِ الْاِسْرَائِيْلِيَّاتِ اَيْ اَقَاوِيْلِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ مِمَّا ذُكِرَ فِي التَّوْرَاةِ (الخ) فَهُوَ مَرْدُوْدٌ یعنی یہ سب روائتیں مردود ہیں۔ عبدالحی لکھنوی نے ۔انہی مردود اسرائیلیات کی آڑ میں نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے مثل کو ثابت کرنے کی گستاخ کوشش کی ہے :۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ :۔

کتب

ہندوؤں اور مشرکوں کی مذہبی کتب کے بارے میں تحقیقی بیان

سوال نمبر ۲۸ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علماء دین مسئلہ ذیل میں :۔ زید کا قول ہے "ممکن ہے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جنہیں وہ الہامی مانتے ہیں۔ واقعی آسمانی ہوں ۔ اگرچہ ان کتابوں کو آسمانی نہ ماننے سے اور ہندوؤں کو اہل کتاب تسلیم نہ کرنے سے مسلمان گنہگار نہیں ہوتا ۔کیونکہ واضح طور پر قرآن پاک میں توریت، انجیل اور زبور کے ساتھ زید گیتا یا منوسمرتی کا ذکر نہیں ہے ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنا پیغام بھیجا۔ لہٰذا کوئی بعید نہیں ۔کہ ہندوستان میں بھی خدا کا پیغام آیا ہو۔ پھر آگے اپنے دعوے کے ثبوت میں زید چند الفاظ گیتا کے نقل کرتا ہے ۔وہ یہ ہیں "بہت سے لوگ مجھ کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرتے ہیں۔ تو میں اُن سے بے پرواہ ہوں۔ اس جملے پر خدا کے کلام ہونے کا گمان کیا جاسکتا ہے۔ اور آخر میں یہ بات ثابت کرتا ہوا یہ کہتا ہے ۔کہ اس سے ثابت ہوا۔ کہ ہندوؤں کی پرانی کتابیں آسمانی ہوں گی ۔مگر بعد میں ہندوؤں نے تحریف کر دیں ۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ جس طرح عیسائی تثلیث کی۔ بدولت شرک میں مبتلا ہیں ۔اور انجیل کی تحریف کو خود عیسائیوں نے تسلیم کیا۔ اسی طرح ہندو مشرک بن گئے ؛ فقط والسلام

(مخلص) :۔ نور محمد شاہ جہان پوری ٹنڈو الہ یار حیدر آباد سندھ)

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

سوال مذکورہ میں زید سخت گنہگار ہے۔ کیونکہ غیر کتاب کو کتاب اللہ یا اللہ تعالٰے کا کلام یا کتاب کہنا سخت گناہ ہے۔ احادیث شریفہ سے ثابت ہے۔ کہ کتابیں صرف چار نازل ہوئیں۔ اور صحیح مذہب کی بنا پر صحیفے ایک سو دس نازل ہوئے۔ کتابوں کے نام بھی معین ہیں۔ انجیل (۲) توریت ۳ زبور ۴ قرآن کریم اور اللہ تعالٰی نے جن صحیفوں کے نام کچھ نہیں رکھے۔ اُن کو صحیفہ ہی کہا جاتا ہے۔ اور وہ صحیفے بھی چند مخصوص انبیاء کرام پر نازل ہوئے۔ جن کا ذکر واضح طور پر قرآن و حدیث میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ چنانچہ تفسیر القرآن روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ۱۲۱ پر ہے:۔ رُوِیَ اَنَّ جَمِیْعَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتَابٍ مِائَۃٌ وَاَرْبَعَۃُ کُتُبٍ اُنْزِلَ عَلٰی اٰدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَشْرُ صُحُفٍ وَعَلٰی شِیْثَ عَلَیْہِ السَّلَامُ خَمْسِیْنَ صَحِیْفَۃً وَعَلٰی اِدْرِیْسَ عَلَیْہِ السَّلَامُ ثَلَاثِیْنَ صَحِیْفَۃً وَعَلٰی اِبْرَاہِیْمَ عَشْرُ صَحَائِفَ وَالتَّوْرَاۃُ وَالْاِنْجِیْلُ وَالزَّبُوْرُ وَالْفُرْقَانُ وَفِی التَّیْسِیْرِ صُحُفُ شِیْثٍ وَہِیَ سِتُّوْنَ وَصُحُفُ اِبْرَاہِیْمَ وَہِیَ ثَلَاثُوْنَ وَصُحُفُ مُوْسٰی قَبْلَ التَّوْرَاۃِ وَہِیَ عَشْرٌ وَالتَّوْرَاۃُ وَالْاِنْجِیْلُ وَالزَّبُوْرُ وَالْقُرْاٰنُ ط

ترجمہ:۔ ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ کل کتب جو اللہ تعالٰے نے نازل فرمائیں۔ وہ ایک سو چار ہیں دس صحیفے حضرت آدم علیہ السلام پر اور پچاس حضرت شیث علیہ السلام پر اور تیس حضرت ادریس علیہ السلام پر اور دس حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کل ایک سو اور چار کتابیں۔ تفسیر تیسیر البیان میں ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام پر ساٹھ نازل ہوئے۔ اسی طرح کل ایک سو دس صحیفے بنتے ہیں۔ وَھُوَ الْاَصَحُّ چنانچہ تفسیر عزیزی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۴۹ پر ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ تعالٰی عنہ ازاں حضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم پرسید کہ از باری تعالٰی چند کتب نازل شدہ است الخ۔ در حاشیہ کشاف صد و چہاردہ آوردہ است۔ دہ صحیفہ ازاں جملہ بر حضرت موسٰے سوائے تورات زیادہ کردہ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ ط

لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ آسمانی کتابیں صرف ایک سو چودہ ہیں۔ جن میں ایک سو دس صحیفے اور چار نام والی کتابیں۔ تمام کی تمام مخصوص۔ مندرجہ بالا انبیاء کرام پر نازل ہوئے۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے۔ وید یا گیتا بھی اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے۔ وہ سخت خاطی ہے نبی پاک نے فرمایا۔ کہ مَنْ کَذَبَ عَلٰی مُحَمَّدٍ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ط یعنی جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ گھڑا۔ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ جب نبی پاک کے کلام میں اتنی احتیاط ہے۔ تو غیر خدا کے کلام کو کلام اللہ کہنا کہاں جائز ہوگا۔ زید کو توبہ کرنی چاہیئے۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

کتبہ

کششِ زمین کے سائنسی عقیدے کی تردید

سوال نمبر ۲۹۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل ذیل میں :- (۱) زید کا قول ہے۔ کہ آپ نے اپنے ایک فتوای میں فرمایا ہے۔ کہ کشش زمین کا بیہودہ عقیدہ ہے۔ زید کہتا ہے۔ کہ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ زمین میں کشش ہے۔ اور اس پر چند دلائل کا ذکر کیا ہے۔ اور کہا کہ مولانا صاحب کے پاس کیا دلائل ہیں وہ اپنے دلائل سے مطلع فرمائیں۔ اس کے دلائل یہ ہیں۔: (۱) اگر زمین میں کشش نہ ہو۔ تو کوئی چیز زمین پر نہیں ٹھہر سکتی (۲) ہوا زمین کی گرفت میں کیوں ہے ؟ (۳) کوئی چیز اگر یہاں پر تول کرو۔ تو کچھ ہے۔ اور دوسری جگہ تول کرو۔ تو کچھ ہوتا ہے۔ وزن کم زیادہ کیوں ہوتا ہے۔ وغیرہ دلائل ہیں۔ سوال ۲: تارہ کیوں ٹوٹتا ہے۔ اس کا شرعی نقطہ کیا ہے۔

فقط والسلام:- نور محمد ٹنڈو الٰہ یار حیدر آباد سندھ مورخہ ۱۸-۷-۶۷

بعون العلام الوھاب

الجواب

۱:- کشش زمین کے بارے میں فلاسفر اور سائنسدان حضرات کا اختلاف ۱۶۶۵ء سے شروع ہوا جب کہ مشہور سائنسدان نیوٹن نے سیب کے گرنے سے کشش زمین کے قاعدہ کو گھڑ کر تمام پچھلے سائنس دانوں کے بڑے بڑے قولوں کو ٹھکرا دیا۔ اس سے پہلے کے تمام سائنسدان اور فلاسفر کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ کائنات کے ہر جسم جو ہر میں میلان تحتی کی وجہ ہے۔ اس پر بے شمار دلائل وارد ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کروں گا۔ چونکہ ہر دعوے کے لئے دلیل اشد ضروری ہے۔ لہٰذا میں ہر دو فریق کے دعوے اور دلائل کا ذکر باوضاحت کر کے اپنے مسلک اور اپنی تحقیق کو بیان کروں گا۔ سائنسدان لوگوں کا دعوای ہے۔ کہ کائنات کے ہر جسم میں قوتِ تجاذب موجود ہے۔ حالانکہ وہ صرف زمین میں ہی جذب کی قوت مانتے تو شاید عقلاً اس کو تسلیم کر لیتے مگر ہر جسم میں قوتِ کشش کے ماننے سے اس عقیدے کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ یہ عقیدہ ۱۶۶۵ء میں نیوٹن نے ایجاد کیا۔ جس کو سب موجودہ سائنسدان تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک

سیب گرنے سے نہ اس سے پہلے کسی سائنسدان کو ہوش آیا۔ نہ خود نیوٹن نے ہی اس سے پہلے چیزوں کے گرنے سے یہ کشش معلوم کی۔ اور سائنسدان جس طرح اپنے اور قوانین کے بارے میں بہت اختلاف کرتے ہیں۔ اسی طرح اس عقیدے پر بھی ان کا حتمی اور یقینی فیصلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض سائنسدان کہتے ہیں۔ کہ نیوٹن سے پہلے یہ عقیدہ نہیں تھا۔ اس نے یہ عقیدہ سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر بنایا۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ نہیں بلکہ نیوٹن سے پہلے ایک سائنسدان کیلپر گزرا ہے۔ جس نے گردش سیارگان کے لیے تین قانون بنائے اس کے تیسرے قانون سے نیوٹن نے قوت جاذبہ اخذ کی۔ ہمارے فلاسفر کا عقیدہ ہے۔ کہ کسی جسم میں بھی قوتِ جذب نہیں ہے۔ بلکہ ہر جسم میں طبعی طور پر قوتِ میلان ہے۔ جس کی وجہ سے ہر چیز نیچے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ چنانچہ فلسفہ کی مشہور کتاب ہدیہ سعیدیہ صفحہ نمبر ص ۵۵ پر ہے:۔ فِي اَنَّ كُلَّ جِسْمٍ لَا بُدَّ مِنْ اَنْ يَّكُوْنَ فِيْهِ مَيْلٌ مَّا مَيْلٌ مُّسْتَقِيْمٌ مُّسْتَدِيْرٌ ۵ موجودہ سائنسدان کے دلائل بالکل وضاحت سے مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱ :۔ ہر جسم کشش کرتا ہے۔ کیونکہ ۱۷۴۰ء میں بوگیر نے پہاڑ پر تجربہ کیا۔ ایک گیند کو پہاڑ کے ساتھ باندھ کر لٹکایا۔ تو پہاڑ نے اس کو اپنے ساتھ کشش کر لیا۔ دلیل ۲ :۔ ۱۷۷۵ء میں سکلین نے بوگر کے تجربہ کو غلط قرار دیا۔ اور پہاڑ پر نیا تجربہ کر کے قوتِ جذبات ثابت کی :۔

دلیل نمبر ۳ :۔ ۱۷۹۸ء میں کیونڈش نے پچھلے تجربوں کی غلطیاں خامیاں نکالتے ہوئے اُن کو غلط قرار دیا۔ اور اپنا نیا تجربہ کیا۔ لوہے کی سلاخ سے تجربہ کیا۔ اور قوتِ کشش ثابت کی

دلیل ۴ :۔ ۱۸۸۴ء میں ابرلی نے کان میں تجربہ کیا۔ اور قوتِ جذب ثابت کی :۔

دلیل ۵ :۔ ۱۸۸۱ء میں فان جالی نے پچھلے تمام تجربوں کو غلط قرار دیا۔ اور ترازو سے تجربہ کر کے نیوٹن کے قاعدے کی جان بچائی۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے دس سائنسدانوں نے تجربے کیے۔ مگر موجودہ سائنسدان سب کے تجربوں کو غلط کہتے ہیں۔ صرف بوائز اور ھیل کے تجربوں کو درست مانتے ہیں۔ جس نے ۱۹۳۰ء میں تجربہ کر کے پچھلے سائنسدانوں کو جھٹلایا۔ اور اس کے بعد اب تک کوئی سائنسدان پیدا نہ ہوا۔ جس نے ایسا تجربہ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی اور تجربہ کر کے ھیل کے تجربہ کو بھی غلط کہہ دے۔ سائنسدان کے پاس موجودہ قاعدہ تجاذب پر صرف یہی دلائل ہیں۔ جو کہ میں نے نقل کر دیئے۔ جو دلائل سائل۔ نے سوال میں پیش کیے۔ وہ آج تک کسی سائنسدان کو نہ سوجھے۔ نہ ہی کوئی ذی عقل ان کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے بہر حال جتنے بھی دلائل کشش اجسام کے بارے میں نقل کیے گئے ہیں۔ یا سائنسدان دیتے ہیں وہ سب لغو ہیں اور اسلام ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ چند وجہوں سے۔ پہلی وجہ :۔ قوتِ جاذبہ

اور قوت کشش یا نافرہ یہ سب منطقی قاعدے کے لحاظ سے مادیات کی چھ قسمیں ہیں۔ جن میں سے چوتھی قسم مشاہدات ہیں۔ مگر آج تک بغیر تجربہ کے کسی سائنسدان کو اس کشش کا مشاہدہ نہ ہوا۔ حالانکہ مقناطیس کی کشش کا دن رات مشاہدہ ہوتا ہے۔ (۲) سمندر کے کنارے جہاز بغیر کسی رکاوٹ کے کھڑا رہتا ہے۔ زمین اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ حالانکہ سمندر کے اندر کسی جگہ مقناطیس کا پہاڑ آ جائے۔ تو جہاز کو فوراً کھینچ لیتا ہے۔ اور جہاز ڈوب جاتا ہے (۳) ڈھلوان زمین یا کسی پہاڑی زمین۔ پر چھوٹی چیز پھسلتی ہوئی نیچے آ جاتی ہے۔ اگر زمین میں یا ہر جسم میں کشش ہوتی۔ تو ہر چیز نیچے ہی کیوں گرتی۔ دیواروں سے کیوں نہ چمٹتی:۔ (۴) بفرض محال اگر زمین میں قوت جذب ہوتی۔ تو ایک گڑھے میں کھڑا ہوا انسان صرف نیچے ہی کیوں گرتا ہے۔ دائیں بائیں کی زمین اپنی طرف کیوں نہیں کھینچتی:۔ (۵) ہم ہاتھ کو زمین کے قریب لے جاتے ہیں۔ مگر ہاتھ زمین کے ذرے کو بھی نہیں کھینچتا۔ اگر زمین سے ہاتھ لگاؤ۔ تو بہت سے ذرات ہاتھ سے لگ جاتے ہیں۔ ایسے ہی مقناطیس کو زمین پر قریب کرو۔ تو زمین پر پڑے ہوئے لوہے کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اگر زمین بھی کشش رکھتی ہے۔ تو باوجود بڑا ہونے کے اس لوہے کو مقناطیس کی پکڑ سے روکتی کیوں نہیں سائل کی دلیل علا غلط ہے۔ کیونکہ اشیاء کا زمین پر ٹھہرنا ان کی ساخت اور وزن کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ کشش کی وجہ سے۔ دیکھو ڈھلوان زمین پر گیند نہیں ٹھہرتی مگر مربع یا تکون شئے ٹھہر جاتی ہے۔ یوں ہی سوکھا پتہ اور تنکا نہیں ٹھہرتا مگر وزنی پتھر ٹھہرا رہتا ہے۔ اگر کشش ہوتی۔ تو سب کا ٹھہرنا برابر ہوتا۔ بلکہ ہلکی چیزیں سختی سے چمٹی رہتیں۔ مگر یہاں معاملہ الٹا ہے۔ معلوم ہوا کشش نہیں اوپر سے تنکا پھینکو بہت دیر میں گرتا ہے۔ بھاری پتھر جلدی سے گرتا ہے۔ اگر زمین میں کشش ہوتی۔ تو مثل مقناطیس کے ہلکی چیز کو جلد کھینچتی۔ سائل کی دوسری دلیل بھی غلط ہے۔ کیونکہ ہوا ہرگز زمین کی گرفت میں نہیں۔ اور یہ ایک نیا دعوٰے ہے نہ کہ دلیل۔ اس کے لئے علیحدہ دلیل کی ضرورت ہے۔ سائل کو دلیل اور دعوٰے کے فرق کا بھی پتہ نہیں۔ تیسری دلیل بھی غلط ہے۔ وزن ہر جگہ ایک جیسا رہتا ہے۔ جس کا دن رات مشاہدہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے۔ تو یہ دلیل سائل کے مقصد کے بھی خلاف ہوگی۔ کیونکہ اس کے نزدیک چیزوں کے وزن قوت کشش کی وجہ سے ہیں۔ تو ہر جگہ کشش ایک جیسی لہٰذا وزن بھی ایک برابر۔ اگر سائل کہے۔ کہ قوت کشش مختلف ہے۔ تو یہ ایک علیحدہ دعوٰے ہوگا۔ جس کے لئے علیحدہ دلیل درکار ہے

ہمارے فلاسفرِ اسلامی قوتِ جاذبہ کے قائل نہیں بلکہ ہر جسم میں قوتِ میل مستقیم اور قوتِ مستعدہ کے قائل ہیں یعنی ہر جسم طبعی طور پر نیچے کی طرف گرنے کا میلان رکھتا ہے۔ اور یہ گرنا بتقاضائے وزن ہے۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں :۔

پہلی دلیل :۔ کتاب فلسفہ صفحہ نمبر ۵۵ پر ہے :۔ وَذَالِکَ لِاَنَّ الْجِسْمَ اِقَامَ اَنْ یَّجُوْزَ عَلَیْہِ الْاِنْتِقَالُ مِنْ حَیِّزٍ اِلٰی حَیِّزٍ اٰخَرَ فَلَا یَکُوْنُ ذَالِکَ اِلَّا بِمَیْلٍ مُّسْتَقِیْمٍ :۔ ہر جسم کا منتقل ہونا ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف فقط اِس میل مستقیم کی وجہ سے ہے

دلیل دوم :۔ صفحہ نمبر ۵۳ پر ہے :۔ وَالْقُوَّۃُ مُحَرِّکَۃٌ ھِیَ الْمَیْلُ فَوُجُوْدُ الْحَرَکَۃِ لَا یُمْکِنُ بِدُوْنِ الْمَیْلِ۔ مَثَلًا اِذَا فَرَضْنَا حَجَرَیْنِ (الخ) یعنی حرکت بغیر میلان طبعی کے ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر ہم اُوپر سے دو پتھر پھینکیں۔ ایک کا وزن سیر بھر دوسرے کا وزن چھٹانک تو بھاری پتھر پہلے گرے گا۔ اور دوسرے کی حرکت ہلکی ہوگی :۔ اِنَّمَا ذَالِکَ لِاَنَّ الْمَیْلَ فِی الْاَوَّلِ اَشَدُّ (الخ) اس لیے کہ بڑے پتھر میں میلان زیادہ قوی ہے۔ اس نے جلد فضاء کو چیرا۔ اور جلدی نیچے کی طرف آیا۔ اور اور میری تحقیق بھی یہ ہے۔ کہ سوائے مقناطیس کے کسی چیز میں قوتِ کشش نہیں۔ قرآن مجید میں بھی کششِ زمین کا انکار ہے۔ چنانچہ باری تعالےٰ رب العزت ارشاد فرماتا ہے۔ وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ط یعنی اللہ کے خوف سے پتھر گرتے ہیں۔ معلوم ہوا۔ کہ پتھر وغیرہ ہر چیز خود گرتی ہے۔ نہ کہ زمین کی کشش سے کیونکہ اس دلالۃ النص میں خلاقِ کائنات نے یَھْبِطُ کا فاعل پتھر کو قرار دیا۔ جب کہ سائنسدان کشش کو قرار دیتے ہیں۔ اور بھی بہت آیات و احادیث ہیں کہ جس میں کشش کا انکار ہے اور آیت کریمہ میں پتھر گرنے کی وجہ خَشْیَۃِ اللّٰہِ ہے نہ کہ کشش۔ **جواب ۲** :۔ آسمان سے جو تارا ٹوٹتا ہے۔ اس کو عربی میں شہاب ثاقب کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے شہاب کا ترجمہ ”شعلہ اڑنے والا“ ہے۔ اور ثاقب نقبٌ سے بنا ہے۔ جس کا ترجمہ سوراخ ہے۔ ثاقب کا ترجمہ سوراخ کرنے والا۔ قانونِ شریعت میں شہاب ثاقب وہ شعلہ ہے۔ جو رات کے وقت ستارے کی طرح کبھی اُڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اُس شیطان کو مارا جاتا ہے۔ جو آسمان پر پہنچ کر غیبی باتیں سُنے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے :۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ فَاَتْبَعَہٗ شِھَابٌ ثَاقِبٌ ط اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَجَعَلْنٰھَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ ط یہ شعلہ مثل گولی کے شیطان کو لگتا ہے۔ اسی لیے ثاقب کہتے ہیں۔ اس کو ہماری اصطلاح میں تارا ٹوٹنا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ تارا نہیں ٹوٹتا۔ بلکہ تارے کی مثل شعلہ نکلتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کریمہ سے ظاہر ہے۔ کہ بنایا ہم نے ان تاروں میں رجم شیطانوں کے لیے۔ موجودہ سائنسدانوں کا اِس میں کچھ اور نظریہ ہے :۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کسی ولی اللہ کو اللہ کے نبی علیہ السّلام سے بڑھانے کا کفریہ عقیدہ

سوال نمبر ۲۱۳ :- کیا فرماتے ہیں۔ علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص اپنے پیر کے حق میں ایسے شعر لکھتا ہے۔ کہ جن میں اپنے پیر کو انبیاء سے زیادہ بڑھاتا ہے۔ یہاں تک کہ مندرجہ ذیل اشعار میں حضرت یوسف علیہ السّلام کی توہین کرتے ہوئے۔ اپنے پیر کا خادم بنایا ہے۔ اس شخص کا اپنا نام اسحاق ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں :- ؎

سوہنا گارڈ عرفان دیاں گڈیاں دا
سرور سخی ھادی دو جہان والے ؎

یوسف جیسے لکھاں اہدے ہین خادم ایسا حسن میرے سخی سلطان والے
اہدی دید دی عید دی سک اکو چاہ جنت دا ناں حور و غلمان والے

اہدے قدماں دا صدقہ اسحاق صدقے
عاجز وچ جنت موجاں مان والے !!

فرمایا جائے۔ ایسے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے :-

سائل :- صدرالدین لوہاری مقام ٹانڈہ موٹا ضلع گجرات

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؕ

اَلْجَوَاب

قانون شریعت کے مطابق سوالِ مذکورہ والے اشعار لکھنے والا کافر ہو گیا ہے۔ یہ شعر کسی انسان کیلئے لکھنے درست نہیں۔ ہاں نبی پاک کی شان میں ایسے شعر لکھنے جائز ہیں۔ اگر یہ اشعار مذکورہ فی السوال اسحاق نامی شاعر نے نبی پاک کیلئے لکھے ہیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں اگرچہ شاعر مذکور کی یہ نیت نہیں وہ کسی پیر کیلئے ہی یہ لغویات کر رہا ہے۔ جیسا کہ سیاق و سباق الفاظ اشعار سے بالکل صاف ظاہر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسے شعر نبی کریم کیلئے بنائے تو گناہ نہیں۔ کیونکہ تمام انبیاء اور ملائکہ اور جملہ مخلوق آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی ہیں اور اُمتی نبی کے خادم ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت فریدالدین عطار پند نامہ میں نعت لکھتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :- ؎

آنکہ آمد نُہ فلک معراجِ او انبیاء و اولیاء محتاجِ او

ترجمہ :- نبی کریم کی شان یہ ہے۔ کہ نو آسمان آپ کی معراج میں ہیں۔ اور تمام انبیاء اور اولیاء آپ کے محتاج ہیں۔

مولانا روم صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

اے ہزاراں جبرائیل اندر بشر
بہر حق سوئے غریباں یک نظر

نبی پاک کی شان یہ ہے۔ کہ ہزاروں جبرائیل آپ کے آستانے پر کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں۔ خدا کے لیے ہم غریبوں کی طرف ایک نظر رحمت ہو۔ اور اگر اس شخص نے یہ شعر اپنے کسی پیر کے لیے بنائے ہیں۔ تو یہ شخص مردودِ ازلی ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگر اس کا پیر کسے باشد حیاتِ ظاہری میں ان اشعار اور اپنی طرف نسبت سے راضی تھا۔ تو وہ پیر بھی مردودِ ازلی ہے۔ کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں بعد خدا رب العزت قائدِ دو عالم صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کا درجہ اور شان ہے۔ آپ کے بعد تمام انبیاء مرسلین کا درجہ ہے، انبیاء عظام کے بعد سب مخلوق سے صدیقِ اکبر کی شان بلند ہے۔ چنانچہ علم عقائد کی مشہور کتاب نبراس صفحہ نمبر ۴۸۵ اور مستدرک حاکم میں حدیث شریف حضرت ابوہریرہ سے مرقوم ہے :۔ اِعْلَمْ اَنَّ الْمَذْهَبَ عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ مَا رَوَاهُ الْحَاكِمُ وَابْنُ عَدِيٍّ وَالْخَطِيْبُ اَنَّ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ۔ خَيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ وَخَيْرُ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَخَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِيْنَ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ :۔ یعنی حضرتِ صدیق وحضرت فاروق، انبیاء ومرسلین کے بعد تمام زمین وآسمان والوں سے افضل ہیں۔ ثابت یہ ہوا۔ کہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالٰے عنہم کا درجہ حضرت جبرائیل، میکائیل و اسرافیل سے بھی زیادہ ہے۔ اگرچہ وہ رُسلِ ملائکہ ہیں۔ اس لیے کہ حضرتِ صدیق اکبر کی شان میں جہاں کہیں افضل الخلق بعد الرسل آیا ہے وہاں رُسل سے صاحبِ شریعت نبی مراد ہیں نہ کہ رسول، فرشتے جس طرح اعلیٰ حضرت اپنے سلام میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

یعنی وہ افضل الخلق بعد الرسل ثانی اثنین ہجرت پہ لاکھوں سلام

یہاں بھی لفظِ رُسل سے (۱) موسیٰ علیہ السلام (۲) حضرت داؤد علیہ السلام (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (۴) آقائے دو عالم صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم صاحب کتاب ہیں خیال رہے کہ یہ تقسیم قانون شریعت کے مطابق ہے۔ اور یہ اسماء معینہ و متفرقہ اصطلاحِ شرعی کے اعتبار سے ہیں۔ لہٰذا اس پر سورۃ صٰفّٰت پارہ نمبر ۲۳ کی اِن آیات اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ وغیرہ سے اعتراض دو وجہ سے غلط ہے۔ (۱) ان آیات میں لغوی معنٰے مراد ہے۔ یعنی بھیجا ہوا۔ نہ کہ بمعنی مرسل اصطلاحی یعنی صاحب کتاب نبی، (۲) قرآن کریم پر اصطلاح فقہاء لازم نہیں۔ اس کا اپنا مقام اس کا اپنا مقام، نبراس کی عبارت اور

اعلیٰ حضرت کے اس شعر میں لفظ مرسلین اور رسل سے صاحب کتاب اور صاحب شریعت نبی مراد ہیں۔ صاحب شریعت نبی ہی رسول ہیں۔ ورنہ اگر رسول فرشتہ مراد لیا جائے۔ کہ جس طرح بعض نے کہا ہے۔ تو لازم آئے گا۔ کہ جبرائیل علیہ السلام وغیرہ، غیر رسول نبی سے بھی معاذ اللہ افضل ہو جائیں۔ کیونکہ علم عقائد میں رسول کا درجہ نبی سے زیادہ ہے کہ رسول خاص صاحب شریعت ہوتا ہے۔ اور نبی عام ہے۔ بعض انبیاء محض صاحب تبلیغ تھے۔ اُن سے رسول کا درجہ زیادہ اور رسول سے مرسل کا درجہ بلند۔ پہلا درجہ نبوت پھر اُس کو ہی صاحب شریعت بنا دیا جائے۔ تو رسول اور اگر رسول کو کتاب عطا ہو۔ تو مرسل انبیاء ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں رسول تین سو تیرہ مرسل صرف چار ۱۔ موسیٰ علیہ السلام ۲۔ حضرت داؤد ۳۔ حضرت عیسیٰ ۴۔ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خیال رہے کہ مفتیٰ بہ قول یہ ہے۔ صدیق و فاروق کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام کا درجہ سب سے بلند ہے۔ چنانچہ کتب فقہ و عقائد میں ہے:۔ رُسُلُ الْمَلٰئِکَۃِ اَفْضَلُ مِنْ عَامَّۃِ الْبَشَرِ ط یعنی رسل ملائکہ عام مسلمانوں سے افضل ہیں:۔ جن میں صحابہ کرام، اولیاء، علماء، سب شامل ہیں۔ صدیق و فاروق بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں مگر دیگر احادیث نے ان کی افضلیت علیٰ سائر مخلوق بیان کر کے اِس حکم سے خارج کر دیا۔ کبیری ص۲۸۴ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا درجہ نبی سے کم ہے مگر رسول کا درجہ نبی سے زیادہ چنانچہ شرح عقائد میں ہے:۔

وَالرَّسُوْلُ اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَی الْخَلْقِ لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ الشَّرْعِیَّۃِ فَقَدْ یُشْتَرَطُ ط فِیْہِ الْکِتَابُ بِخِلَافِ النَّبِیِّ فَاِنَّہٗ اَعَمُّ ط اور نبراس میں صفحہ نمبر ص۸۰ پر ہے:۔ قَوْلُ الْجُمْهُوْرِ اَنَّ النَّبِیَّ اَعَمُّ:۔ جہاں کہیں بھی مطلق لفظ رُسُل استعمال ہوتا ہے۔ وہاں صاحب شریعت نبی ہی مراد ہوتا ہے۔ نہ کہ حضرت جبرائیل وغیرہ۔ حضرت جبرائیل کو رسول صرف لفظاً بمعنیٰ قاصد کہا جاتا ہے۔ اس معنیٰ میں ہر اہل عرب اپنے قاصد کو رسول کہہ دیا کرتا ہے۔ جیساکہ متعدّد احادیثِ مشہورہ میں رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آتے ہیں:۔ پس ثابت ہوا۔ کہ مستدرک حاکم کی حدیث کے مطابق حضرت صدیق اکبر کی شان بعد رسول و انبیاء سب فرشتوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور انسانوں سے بھی اِس لیے شرح عقائد صفحہ نمبر ص۱۰۰ پر ہے:۔ وَاَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْاَنْبِیَآءِ اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ ط اور خیالی شرح عقائد نسفی صفحہ نمبر ص۱۴۲ پر ہے قَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَاللّٰہِ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی اَحَدٍ اَفْضَلَ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ ط :۔ اس حدیث میں لفظ رسول بھی ترک فرما دیا۔ تاکہ فضیلت جبریلی کا کوئی شبہ نہ پیدا کر سکے۔ شرح خیالی میں آگے ارشاد فرمایا:۔ وَبِہٖ یَظْهَرُ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَفْضَلُ مِنْ سَائِرِ الْاُمَمِ ط یعنی اِس مندرجہ ذیل حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ابوبکر صدیق

تمام کائنات کی امتوں سے افضل ہیں۔ لہٰذا حضرت جبرائیل سے افضل ہوئے۔ کہ وہ بھی امم میں داخل ہیں۔ صدیق اکبر کے بعد باقی صحابہ درجہ بدرجہ پھر تابعین، پھر تبع تابعین کی شان ارفع واعلیٰ ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف صفحہ نمبر ۵۵۳ پر ہے :۔ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ اُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ (الخ) مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ کائنات میں کوئی بھی غوث، قطب، ابدال، اوتاد، افراد، محدث، مفسر وغیرہ یا کوئی پیر کسی صحابی کے گردِ قدم کو نہیں پہنچتا چہ جائے کہ کوئی معمولی پیر کسی نبی سے افضل ہو۔ (اَلْعِيَاذُ بِاللهِ) جس شخص نے اپنے پیر کے لیئے یہ شعر بنائے یا منسوب کیئے۔ اگر اسی عقیدے پر ہے۔ تو مرتد ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی توہین وگستاخی ہے اور کسی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توہین کفر ہے۔ لہٰذا اس شخص کو چاہیئے۔ کہ فوراً دوبارہ کلمہ پڑھ کر توبہ کرے۔ اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اور بطور شرعی تعزیر ستر مساکین کو کھانا کھلائے اسی طرح وہ جاہل نعت خوان اور گمراہ واعظین جو کسی بھی گدی نشین کی موجودگی میں نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کے نعتیہ اشعار اس جاہل پیر گدی نشین کی طرف صرف چند روپوں کے لالچ میں منسوب کر دیتے ہیں۔ وہ سب گمراہ اور گمراہ گر و بد بخت ہیں :۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے وَاللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کا بیان

سوال نمبر ۳۱ :۔ کیا فرماتے ہیں۔ علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام بنی اسرائیل کے ولی تھے۔ مولوی قاسم نانوتوی نے بھی یہی کہا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ اور پھر زید یہ کہتا ہے۔ کہ بہت دفعہ ولی نبی کے درجے سے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ موسےٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے علم سیکھنے گئے تھے۔ لہٰذا استاد کا درجہ شاگرد سے یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔ زید اپنے اس مضبوط عقیدہ پر قائم ہے۔ فتویٰ صادر فرمایا جائے۔ اور بتایا جائے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام نبوت کے درجے پر ہیں۔ یا صرف ولایت کے درجے پر :۔

سائل :۔ شہاب الدین مقام وڈاکخانہ سہارنپور انڈیا ہندوستان ۔ ۲۲ ۴/۵

الجواب بعون العلام الوھاب

حضرت خضر علیہ السلام اپنے وقت کے نبی تھے۔ آپ کا نام شریف بلیا ابن ملکان ہے۔ آپ ابھی تک اپنی حیات ظاہری میں دنیا پر جلوہ افروز ہیں۔ اولیاء کاملین سے ملاقاتیں فرماتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بیداری کی حالت میں دوپہر کے وقت جمعہ کے دن دیدار اور گفتگو سے مشرف فرمایا۔ بعض اولیاء اللہ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام اولیاء کاملین سے ملاقات فرماتے ہیں۔ بلکہ اُن خوش نصیبوں سے ملاقات فرماتے ہیں جن کو ابدالیت کا درجہ ملنے والا ہو۔ ہر روز عالم کی سیر فرماتے ہیں۔ حضور اقدس کے تشریف لانے کے بعد سے اب تک اشراق کے نفل ریاض الجنت میں ادا فرما کر نبی اکرم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے اجازت لے کر دورۂ کائنات کی ابتدا فرماتے ہیں۔ حضور غوث پاک کے روحانی پیشوا ہیں۔ اب نبی پاک کی امت کے تمام اولیاء کے سرپرست ہیں۔ سب سے پہلے دجال سے انہیں کا مناظرہ ہوگا۔ جس کا حدیث پاک میں ذکر ہے۔ خیال رہے کہ چار انبیاء کرام اب تک اپنی حیات ظاہری میں جلوہ افروز ہیں۔ چنانچہ اشعۃ اللمعات جلد چہارم صفحہ ٢٧٥ پر ہے از امام محی السنہ نقل کردہ اند کہ چہار کس انبیا زندہ اند دو بر زمین خضر والیاس و دو بر آسمان ادریس و عیسیٰ اور تفسیر روح البیان جلد دوم ٢١٩ اور جلد ہشتم صفحہ ٢٨١ پر ہے اَرْبَعَةٌ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ اَحْيَاءٌ اثنان فِي السَّمَاءِ عيسٰى وادريس واثنان في الارض الخضر و الياس ترجمہ۔ ہر سہ عبارت کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے کہ (۱) حضرت خضر علیہ السلام (۲) حضرت الیاس علیہ السلام۔ یہ دو بزرگ زمین پر تشریف فرما ہیں۔ ہر سال حج ادا فرماتے ہیں اور منا میں ایک دوسرے کا حلق فرماتے ہیں! اس وقت جو کلمات ان دونوں بزرگوں کے زبان مبارک سے ادا ہوتے ہیں۔ جو ان کلمات کا وظیفہ رات کو سونے سے پہلے پہلے پڑھے۔ وہ چالیس دن میں ولی اللہ ہو جاتا ہے (۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر تشریف فرما ہیں۔ (۴) حضرت ادریس علیہ السلام جنت میں بحیاتِ ظاہر تشریف فرما ہیں۔ سوال مذکورہ کے زید اور قاسم نانوتوی دیوبندی کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت خضر محض ولی اللہ ہیں۔ باطل اور غلط ہے۔ جن مفسرین نے بھی آپ کو اولیاء میں شمار کیا ہے۔ وہاں اصطلاحی ولی مراد نہیں۔ بلکہ لغوی ولی یعنی مددگار اور ولایتِ الٰہیہ کا مالک مراد ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم بھی ولی ہیں۔ اور انبیاء کی ولایت تمام صحابہ کی ولایت سے زیادہ ہے اور تمام صحابہ کی ولایت اولیاء اصطلاحیہ کی ولایت سے زیادہ ہے اور تمام معروف اولیاء کی ولایت علماء کی ولایت الٰہیہ سے زیادہ جمہور علماء و محققین کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام بہت عظمت والے نبی ہیں چنانچہ تفسیر روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ٢٩٠ پر ہے:۔ وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى اَنَّهٗ نَبِيٌّ غَيْرُ مُرْسَلٍ ط یعنی اکثریت علماء کرام کی اس بات پر متفق ہے۔ کہ حضرت خضر نبی غیر مرسل غیر صاحب کتاب ہیں۔ اسی طرح تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ نمبر ١٨ پر ہے وَاٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ط اے نبوۃ فی قول و ولایۃ فی اخریٰ۔ بڑی جماعت نے حضرت خضر علیہ السلام کو صحیح مذہب کی بنا پر نبی فرمایا۔ اور ایک قول میں ولی کہا گیا۔ تفسیر بیضاوی پارہ پندرہ صفحہ نمبر ٢٣ پر ہے:۔ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا هِيَ الْوَحْيُ وَالنُّبُوَّةُ۔ تفسیر مدارک پارہ پندرہ اسی آیت کی تفسیر میں ہے۔ هِيَ الْوَحْيُ وَالنُّبُوَّةُ ط الی آخر تفاسیر۔

تفسیر ابن عباس میں ہے۔ اسی آیت کے ماتحت ہے: یَقُوْلُ اَکْرَمْنَاہُ بِالنُّبُوَّۃِ تفسیر صاوی جلد سوم میں ہے:۔ اِلٰی نُبُوَّتِہٖ فِیْ قَوْلٍ وَقَدْ صَحَّحَہٗ جَمَاعَۃٌ پس ثابت ہوا۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام برحق نبی تھے جو محققین کرام آپ کی نبوت کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل یہ بھی ہے۔ کہ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔ وَاٰتَیْنٰہُ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا یعنی ہم نے خضر کو اپنے پاس سے رحمت فرمائی۔ اور قرآن کریم میں اکثر مقام پر رحمت سے نبوت اور وحی ہی مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے فرمان کو تفسیر روح البیان نے ثبوتِ نبوت کے لیئے دلیل بنایا۔ چنانچہ روح البیان جلد پنجم صفحہ نمبر ۲۸۰ پر ہے:۔ قَالَ اِمَامُ الْمُسْلِمِ اَنَّ النُّبُوَّۃَ رَحْمَۃٌ کَمَا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّکَ الخ (آیت ۳۲ سورۃ زخرف پارہ ۲۵)۔ گویا کہ اصلِ رحمت، وحی اور نبوت ہے، رحمت دوسرے معنوں میں بالتبع یا مجاز ہے اسی بنا پر محققین فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تمام جہانوں پرند چرند، جمادات و نباتات، جن و ملک وانس کے نبی ہیں۔ کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ دوسری دلیل سورہ مریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَۃً مِّنَّا یہاں بھی رحمت سے مراد نبوت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں۔ نہ کہ ولی ساگرچہ حضرت خضر نبی ہیں مگر چونکہ رسول یا مرسل نہیں۔ اس لیئے آپ سے حضرت موسیٰ کا مقام و درجہ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ زیادہ اور چونکہ حضرت خضر صرف طریقت معرفت کے نبی ہیں اور حضرت موسیٰ صرف شریعت کے جامع کمالات تو صرف ہمارے نبی ہی ہیں اور شریعت کا مقام طریقت سے زیادہ ہے اس لیئے حضرت موسیٰ کا درجہ حضرت خضر سے زیادہ ہے حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام کے پاس طریقت سیکھنے کے ارادے سے تشریف لائے تھے اگر علم سیکھا ہوتا تو حضرت خضر کا درجہ بڑھ جاتا کیونکہ استادِ دینی و مرشد برحق کا درجہ ہمیشہ زیادہ رہا کرتا ہے حضرت موسیٰ کا علم بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ علم شریعت زیادہ وسیع ہے علم طریقت سے آپ کا حضرتِ خضر کے پاس جانا کمی علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ حصولِ زیادتی علم کی بنا پر مگر وہ علم آپ کے لیئے غیر ضروری تھا اسلیئے رب نے سیکھنے نہ دیا ایسا ہی تفسیر صاوی جلد سوم و روح البیان جلد پنجم میں ہے اب جو شخص یہ کہے کہ معاذ اللہ نبی سے غیر نبی کا درجہ بڑھ جاتا ہے وہ جاہل و بے دین ہے خیال رہے۔ کہ حضرت خضر کسی قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے نہ آپ کو عام تبلیغ فرض تھی۔ بلکہ مشائخ و صوفیا کی طرح یہ علم سینہ بسینہ اور اسرار الٰہیہ میں سے ہوتا ہے۔ خواص ہی کو عطا کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ بلیا ابن ملکان ابن فالح ابن عامر ابن شالخ بن ارفخشد ابن سام ابن نوح علیہ السلام۔ اور حضرت نوح علیہ السلام اولاد شیث میں سے ہیں۔ (تفسیر مظہری سورۂ یونس پارہ ۱۱ جلد پنجم):۔ وَاللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

حضرت شاہ دولہ دریائی کی ڈوبی برات کا بارہ برس بعد نکالا جانا

سوال نمبر ۳۰۲ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ غوث پاک کی مشہور کرامت ہے۔ کہ آپ نے بارہ برس کا ڈوبا بیڑا تراد یا تھا۔ اس کی فوٹو بھی بازار میں ملتی ہے۔ مگر اس کا ثبوت کہیں نہیں تھا۔ فرمایا جائے کیا یہ کرامت بچی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ غلط اور بناوٹی ہے۔ وہ لوگ کرامتوں کا بالکل انکار کرتے ہیں براہِ کرم ہم کو اس کا ثبوت عطا فرمایا جائے۔ سائل محمد لطیف ریل بازار گوجرانوالہ۔ نزد گھنٹہ گھر۔ ۵ ۱۱/۸

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

الجواب

مسلک اہلسنت یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات برحق یعنی بالکل درست اور صحیح ہیں۔ یہی تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے پہلے زمانوں میں معتزلی فرقہ اس کا منکر ہوا پھر خارجیوں نے اس کا انکار کیا۔ اور آج کل دیوبندی وہابی اور غیر مقلد وہابی اس کے منکر ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ معتزلیوں کا ہی دوسرا نام وہابی ہوا۔ اور تیسرا نام خارجی ہوا یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے تقریبًا تمام باطل عقائد کو وہابیوں نے شروع کیا ہوا ہے۔ انھیں گندے اور کفریہ عقائد میں سے ایک انکار کراماتِ اولیاء ہے۔ حالانکہ یہ تجربات کے علاوہ قرآن و حدیث کی عبارات کثیرہ و درایات عدیدہ و آیاتِ حمیدہ سے بھی ثابت و ظاہر ہے۔ اور نقلاً عقلاً و تجربًا اس کے بہت دلائل ہیں۔ اس لیئے کہ قانون شریعت کے مطابق افعالِ باری تعالےٰ عَمَّ اِسْمُہٗ دو قسم کے ہیں ایک قسم افعال قانونیہ۔ دوسری قسم افعالِ قدرت افعالِ قانونیہ ملائکہ کے ذریعے کرائے جاتے ہیں۔ جن کو تدبیر بھی کہا جاتا ہے۔ اور ان کے کارندوں کو مدبراتِ امر کہا جاتا ہے۔ ان فرشتوں کے ذمے تمام کائنات کے انتظامی امور ہوتے ہیں۔ جیسے جان ڈالنا زندہ کرنا۔ مارنا۔ رزق دینا بارش برسانا وغیرہ وغیرہ۔ افعالِ قدرت دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم معجزہ جس کا ظہور انبیاءِ عظام سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم کرامات۔ جس کا صدور اولیاء اللہ سے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے قدرتی کام انبیاءِ کرام سرانجام دیتے ہیں اور چھوٹے کام اولیاءِ کاملین سرانجام دیتے ہیں۔ انبیاءِ کرام سے جو قدرتی کام قبل اظہارِ نبوت ہو اس کو ارہاص کہا جاتا ہے۔ بعد ظہور نبوت کو معجزہ کہا جاتا ہے اور ولی اللہ سے جو بھی قدرتی کام صادر ہو جس وقت بھی ہو خواہ بچپن یا ماں کے پیٹ میں یا عالمِ ارواح میں یا جوانی بڑھاپے میں اس کو کرامت ہی کہا جائے گا۔ جس طرح قانونی افعال کا دوسرا نام تدبیر ہے اسی طرح قدرتی افعال

کا دوسرا نام خرقِ عادت ہے۔ بہر حال قانونی افعال ہوں یا قدرتی اُن کا فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے اور اس کے حکم سے فاعل مجازی فرشتے انبیاء کرام اور اولیاء اللہ ہیں۔ اور جس طرح حضرت عزرائیل علیہ السلام اچھے خاصے زندہ شخص کی جان نکال سکتے ہیں۔ اور نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کاملین مردہ انسان میں نکلی ہوئی جان ڈال سکتے ہیں اور جس طرح حضرت عزرائیل کا جان نکالنا اپنی ہمت وطاقت واختیار سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ہے اسی طرح انبیاء کرام کا کسی مردہ کو زندہ کر دینا وغیرہ بھی اپنی طاقت واختیار سے نہیں بلکہ رب قدیر کی عطا کردہ طاقت واجازت سے ہے۔ تو جب فرشتوں کا زندہ کرنا مارنا۔ شرک کفر بدعت نہیں تو انبیاء کرام کے اِس قدرتی طاقت کے ذریعے کسی کو زندہ کرنا بھی شرک کفر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عین ایمان ہے۔ یہی وہ باریک اصلیت ہے جو وہابی گستاخ کو سمجھ نہیں آتی اُن کی نفسانی فہم صرف شانِ انبیاء واولیاء پر بھٹکتی ہے۔ ہر بات تسلیم ہے صرف منکر ہیں تو معجزات وکرامات کے۔ ان کی سمجھ سے یہ بات جدا ہے کہ افعال قانونی ہوں یا قدرتی سب اللہ ہی کے کام ہیں۔ صرف مظہر جدا جدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افعال تدبیری ہوں یا خرقِ عادت سب کا ثبوت قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ قانونی افعال کا ذکر پارہ ۳۰ سورتِ نازعات میں ہے۔ وَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا۔ (ترجمہ):۔ ملائکہ ہیں عالم کی تدبیر انتظامی کرنے والے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (ترجمہ) ملائکہ قطعاً نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ قدرتی افعال کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ اپنے ولیوں سے کراتا ہے۔ عین درست ہے۔ اور یہی اہلسنت کا عقیدہ ہے۔ چنانچہ شرح عقائد ص ۱۰۱ پر ہے:۔ وَکَرَامَاتُ الْاَوْلِیَاءِ حَقٌّ۔ (ترجمہ):۔ اور اولیاء اللہ کی کرامتیں ظاہر ہونا بالکل سچا عقیدہ ہے۔ فتاویٰ درّ مختار شامی جلد دوم ص ۸۶۷ پر ہے:۔ نَقْضُ الْعَادَةِ عَلٰی سَبِیْلِ الْکَرَامَةِ لِاَهْلِ الْوِلَایَةِ جَائِزٌ عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ۔ (ترجمہ) ولایتِ الٰہیہ والوں کے لیئے عاداتِ انسانیہ کے خلاف کام کرامت کے طریقے پر اہل سنت کے عقیدے میں جائز ہے۔ شرح فقہ اکبر میں ملا علی قاری نے لکھا ص ۹۵ پر ہے:۔ فَخَرَجَ غَیْرُ الْخَارِقِ کَطُلُوْعِ الشَّمْسِ مِنْ مَشْرِقِهَا کُلَّ یَوْمٍ وَالْخَارِقُ عَلٰی خِلَافِهَا۔ (الخ) وَالْکَرَامَةُ خَارِقٌ لِلْعَادَةِ:۔ (ترجمہ) پس خارج ہوا جو عادتِ خلق کے علاوہ۔ مثلاً مشرق سے سورج کا طلوع عادتِ خلق کے مطابق اور اس کا الٹ خلاف عادت ہے۔ اور کرامت عادت کے خلاف کاموں کا نام ہی ہے۔ شامی جلد دوم ص ۸۶۳ پر ہے:۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّ الْاَمْرَ الْخَارِقَ لِلْعَادَةِ بِالنِّسْبَةِ اِلَی النَّبِیِّ مُعْجِزَةٌ سَوَاءٌ ظَهَرَ مِنْ قِبَلِهٖ اَوْ مِنْ قِبَلِ اٰحَادِ اُمَّتِهٖ وَبِالنِّسْبَةِ اِلَی الْوَلِیِّ کَرَامَةٌ۔ ترجمہ):۔

قانونی فعل تو وہ ہے جو روزمرہ ہوتا ہے۔ قدرتی انبیاء عظام کے دستِ مبارک سے ہوتے پس خلاصہ یہ کہ بے شک وہ افعال جو عادتِ انسانی کے خلاف ہوں۔ وہ نبی علیہ السلام کی نسبت سے معجزہ کہلاتا ہے برابر ہے کہ ظاہر ہو ان کی طرف سے یا ان کی امت کے کسی ولی کے ہاتھ سے اسی طرح فعل بنسبت ولی اللہ کے کرامت کہلاتا ہے۔ لہٰذا قانونی موت و زندگی ملائکہ مدبر کے ذریعے ہوتی ہے۔ اور قدرتی موت و زندگی انبیاء کرام اولیاء عظام کے ذریعے ہوتی ہے۔ ولی اللہ کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہی ہے اور چونکہ یہ ہر دو افعال باری تعالیٰ ہی کے حکم اور رضا سے ہیں۔ اسلیئے اگر فرشتہ کسی کو موت و زندگی دے تو شرک نہیں اسی طرح اگر نبی یا ولی کسی کو موت یا زندگی عطا فرما دیں تب بھی شرک نہ ہوگا۔ وہابی دیوبندی فرشتوں کی طاقت تو تسلیم کر لیتے ہیں ان کو اگر موت آتی ہے تو انبیاء کرام کی طاقت تسلیم کرتے ہوئے۔ تمام علماء اسلام نہ تدبیر ملائکہ کے منکر ہیں نہ معجزے و کرامت کے اس لیئے کہ تدبیر ہو یا معجزہ یا کرامت سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ وہی ذاتِ وحدہ لاشریک قانون و قدرت کا مالک ہے وہ اپنے کاموں میں مختار کل ہے جس سے چاہے جو کام لے۔ کسی کو انکار یا دم مارنے کا حق نہیں پہنچتا فی زمانہ دیوبندی جن کو وہابی کہا جاتا ہے۔ : وہی دیوبندی وہابی اس کے منکر ہیں جب کہ پہلے زمانے میں معتزلی فرقہ اس کا منکر تھا۔ چنانچہ شرح فقہ اکبر ص ۹۵ پر ہے۔ وَالْكَرَامَةُ لِلْاَوْلِيَاءِ حَقٌّ اَىْ ثَابِتٌ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَلَا عِبْرَةَ بِمُخَالِفَةِ الْمُعْتَزِلَةِ وَاَهْلِ الْبِدْعَةِ فِىْ اِنْكَارِ الْكَرَامَةِ۔ (ترجمہ):۔ کرامات اولیاء حق ہیں۔ اور حق ہونے سے مراد ہے کہ قرآن مجید اور حدیث پاک سے ثابت ہے۔ اور معتزلہ کی اور بدعت والوں کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں کرامت کے انکار کرنے کی صورت میں۔ ملا علی قاری کی اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اس زمانے میں جو لوگ منکرین کرامات تھے اس فرقے کا نام معتزلی تھا دوسری یہ کہ وہابی لوگ ہم کو بدعتی کہتے ہیں۔ حالانکہ بدعتی وہ ہے جو منکر کرامات اولیاء ہے۔ تو گویا خود وہابی ہی بدعتی ہوئے۔ فقہ اکبر امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنی تصنیف ہے اس کی شرح ملا علی قاری صاحب نے کی ہے۔ اس سے امام اعظم کا مسلک کتنا واضح ثابت ہوا کہ وہ خود فرماتے ہیں کراماتِ اولیاء نہ صرف حنفی مسلک ہے۔ بلکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ منکر کرامات ہر دور میں مردود اور بے اعتبار رہا۔ اور یہ کہ ان وہابیوں کا پہلا نام معتزلی تھا پھر خارجی ہوا آج کل وہابی ہے۔ اور لقبِ اصلی بدعتی ہے۔ نہ یہ حنفی نہ اہلِ سنت۔ یہ ماڈل دیوبند میں تیار ہوتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانونی افعال فرشتوں سے کراتا ہے۔ اور قدرتی کام انبیاء کرام کے ذریعے اور اولیاء اللہ کے ذریعہ۔ جو اس کا منکر وہ رب تعالیٰ کا منکر۔ قانونی

موت وحیات کے لیئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ (ترجمہ) :۔ فرما دیجئے موت دیتا ہے تم کو وہ ملک الموت جو تم پر مؤکّل ہے۔ اور احیاءِ قدرتی کے لیئے قرآنِ پاک میں اس طرح ارشاد ہے۔ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ (ترجمہ) ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں مردوں کو زندہ کرسکتا ہوں اللہ کے اذن سے۔ اللہ تعالیٰ کا اذن اور اجازت ہر کام میں لازم ہے۔ تدبیر ملائکہ بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتی ہے اور نبی کا معجزہ بھی ولی کی کرامت بھی بغیر اذن خداوندی کچھ نہیں ہوسکتا۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو یاد رکھو کہ جس طرح ملک الموت عزرائیل علیہ السلام کی خداداد قوت واختیار اور قانونی ڈیوٹی نوکری کا انکار قانونِ الٰہی اور قرآن مجید کی آیت کا انکار ہے جو صراحتاً کفر ہے۔ اسی طرح معجزے اور کرامت کا انکار بھی قدرتِ الٰہیہ کا انکار ہے۔ اور قدرت کا مقابل مجبوری ہے۔ پس جب اللہ کی قدرت کا انکار ہوا تو بداہتاً اللہ کریم کی مجبوری ثابت ہوگی۔ تو جو لوگ کراماتِ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ درپردہ اللہ کو مجبور سمجھتے ہیں۔ (معاذ اللہ) اسی لیئے رب کائنات نے ایک جگہ فرشتوں کے دشمن کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ جو میرے ولیوں کے دشمن اور منکر ہیں ان کو اللہ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ کیونکہ ملائکہ قانونی کارندے ہیں اور اولیاء اللہ قدرتی کارندے۔ کرامت اور معجزہ عام ہے اسباب کو کہ وہ ہوا پر اڑنے کا ہو یا دریا چلانے کا یا مُردہ انسان زندہ کرنے کا اس عمومیت سے ثابت ہوا کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام اور ولی اللہ مُردوں کو زندہ کرسکتے ہیں۔ سابقہ امتوں اور انبیاءِ کرام کے معجزات وکرامات کا ذکر تو قرآنِ پاک اور احادیث مبارکہ میں آگیا۔ لیکن اُمتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا کی کرامات کا ذکر تو کتبِ تاریخ و اذکار اور قصصِ اولیاء کی کتابوں میں ہی دستیاب ہوسکتا ہے۔ اور مسلمانوں کو کرامات ماننے کے لیئے ان کتب کو ماننا ہی پڑے گا۔ چنانچہ کتب اصول وعقائد وسوانحات سے معجزات وکرامات بے حد بے شمار ثابت ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کرنا بھی اسی خرقِ عادت میں شامل کرتے ہوئے انبیاءِ کرام اور اولیاء اللہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ شرح فقہ اکبر ص ۹۵ پر ہے :۔ اِنَّ الْمُعْجِزَۃَ اَمْرٌ خَارِقٌ لِّلْعَادَۃِ کَاِحْیَاءِ مَیِّتٍ۔ (ترجمہ) :۔ بے شک معجزہ امر خارق یعنی قدرتِ الٰہی ہے جیسے کہ مُردوں کو زندہ کرنا ویسے تو تمام اولیاء اللہ کی کرامات ثابت ہیں مگر حضور غوثِ پاک کی کرامات تو شمار سے باہر ہیں۔ چنانچہ حاشیہ نبراس ص ۴۸۴ پر ہے :۔ لَا تُحْصٰی۔ یَعْنِیْ مِنَ الْاَوْلِیَاءِ لَا سِیَّمَا لِلْقُطْبِ الْجِیْلِیِّ۔ (ترجمہ) :۔ ولیوں کی کرامتیں بے شمار مشہور ہیں۔ خاص کر قطبِ عالم غوثِ پاک جیلانی کی کرامات تو بہت ہی

زیادہ مشہورِ عالم ہیں۔ یہ سب کرامتیں تاریخ اور قصص اور تصوف پیر کی کتابوں سے ثابت ہیں۔ ان کے انکار کی جرأت کیسے کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بھی بداخلاقی ہے کہ اپنی مرضی سے جو چاہی کرامت مان لی اور جس کا چاہا انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اسلام کا قانون اور اصول ایک باضابطہ چیز ہے۔ ہر چیز اصول کے مطابق ہی مانی جائے گی۔ اور اصولِ شریعت سے ہی اس کا انکار کیا جا سکتا ہے جس طرح حضور غوثِ پاک کی دوسری بہت کرامات مختلف کتب سے ثابت ہیں اسی طرح یہ بارہ برس بعد ڈوبی ہوئی برات کا زندہ نکالنا بھی چند بزرگوں کی کتب سے ثابت ہے۔ چنانچہ کتاب سلطان الاذکار اور شیخ شہاب سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف شدہ کتاب خلاصہ قادریہ کے صفحہ پر یہ واقعہ تفصیل سے درج ہے۔ اسی طرح مولانا برخوردار ملتانی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب غوث اعظم ص۲۷ پر فرماتے ہیں کہ واقعہ بہت مشہور ہے کسی واقعے کو ماننے کے لیے اتنی شہرت کافی ہے اور ایمان والوں کے لیے تو بزرگوں کے اقوال ہی سند کثیر ہیں کیونکہ انکار کی کوئی شرعی وجہ معلوم نہیں ہوتی اور بلاوجہ انکار گناہ ہے۔ بارہ برس کے بعد ڈوبے ہوئے لوگوں کو زندہ نکال لینا یہ میرے رب کی قدرت کاملہ ہے جس کا ظہور ذاتِ غوثِ پاک سے ہوا اب اس قدرت کا انکار شانِ خداوندی میں اسی طرح گستاخی ہے جس طرح قرآنِ پاک کا بیان کردہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ۔ کہ حضرت عزیر علیہ السلام سو سال تک فوت رہے اور پھر زندہ ہو گئے۔ قرآنِ پاک نے سو سال بعد زندہ ہونے کا ذکر فرمایا۔ اس کو ماننا اور اس کی حقانیت پر یقین رکھنا عین ایمان ہے اس کا منکر کافر صریح ہے حالانکہ سو سال بعد زندگی زیادہ تعجب ناک ہے بارہ سال بعد زندگی سے جو رب تعالیٰ سو سال بعد زندہ کر سکتا ہے۔ اس پر بارہ سال بعد زندہ کرنا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے۔ اور جب اس کا اقرار ہے تو اس کا انکار کیوں وہ بھی قدرت کا کرشمہ تھا یہ بھی۔ نہ وہ قانونی فعل نہ یہ۔ وہاں بھی معجزانہ طور پر قدرتِ الٰہی کو آشکار کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ جلد خراب ہونے والا سالن کھانا پینا سو سال تک نہ خراب ہوا اور لمبی زندگی والا اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مر جانے والا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر گل سڑ گیا وہی دھوپ اور بارشیں جسم پاک عزیر علیہ السلام پر پڑیں مگر معجزانہ طور پر اس کو کچھ بھی نہ ہوا جس طرح یہ سب کچھ قدرتی امر تھا اسی طرح بارہ سال بعد زندہ کرنا بھی قدرتی امر تھا فرق صرف اتنا تھا کہ وہ نبی علیہ السلام کے جسم پر بطور معجزہ ظاہر ہوا اور یہ غوثِ پاک کے دستِ اقدس پر بطور کرامت ظاہر ہوا۔ بلکہ یاد رکھو کہ جس طرح معجزات باری تعالیٰ کے قانون کو ثابت کرنے کے لیے ہوتے ہیں اسی طرح کرامات معجزوں کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ قانون کے منکروں کو معجزات دکھا کر

قائل و مائل کیا جاتا ہے معجزات کے منکروں کو کرامات اولیاء اللہ دکھا کر قائل و مائل و بے بس کیا جاتا ہے۔ پس یقینی حد تک یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ غوث پاک کے زمانے میں شاید حضرت عزیر کے واقعے کے کچھ فرقے منکر ہو گئے ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ نے غوث پاک کے ذریعے بارہ برس بعد ڈوبی ہوئی بارات کو زندہ کر کے اس واقعے کی تائید و توثیق فرمائی ہو۔ اور پھر پوری بارات ڈبو دی تاکہ اس کرامت کے عینی شاہد زیادہ ہوں ایک دو آدمیوں کی بات کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس بارات میں بھی کوئی واقعۂ عزیر کا منکر ہو:۔

بہر حال یہ واقعۂ بارات عقلاً۔ نقلاً۔ شرعاً ہر طرح درست ہے فی زمانہ قرآن پاک سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔ ایسے صحیح سچے اور قابلِ قبول واقع کا صرف اس لیئے انکار کرنا کہ حضور غوثِ پاک کی ذات سے زندہ کرنا محال ہے تو یہ وجہ بے عقلی ہے۔ اس لیئے کہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز کرامتِ غوث پاک مرغی کو زندہ کرنا تو مدارج نبوت جلد اوّل ص۲۱۴ پر اور فتاوٰے حدیثیہ ص۲۵ پر بھی ہے حالانکہ وہ مرغی بھنی ہوئی اور کچھ کھائی تھی۔ اور معتبر کتب اسلامیہ سے ثابت ہے۔ خلاصہ یہ کہ بارات کی کرامت ہو یا مرغی کی شرعاً قابل قبول ہے۔ ہاں وہ کرامات جو جوشِ جنون میں بعض خبثا نے خود گھر بیٹھے بنا کر غوثِ پاک عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب کر دیں اور وہ شریعت کے بھی خلاف ہیں وہ نا قابل قبول ہیں کیونکہ ان کی تائید قرآن و حدیث سے کہیں بھی نہیں ملتی مثلاً غوثِ پاک کا روحوں والی زنبیل چھین لینا (معاذ اللہ) اسی طرح کی کفریہ فسقیہ باتیں لوگوں کو گستاخِ بزرگان بنا دیتی ہیں۔ اس لیئے کہ حضرت ملک الموت عزرائیل علیہ السلام رسل ملائکہ تمام غوثوں قطبوں سے ان کا مقام بلند تر ہے۔ غوثِ پاک عبد القادر جیلانی کا مقام و درجہ صرف اپنے وقت اور بعد والے تمام اولیاء اللہ سے بلند ہے۔ جیساکہ ہم نے سیرتِ امام اعظم میں ثابت کر دیا۔ یہ دراز گفتگو مجھے اس لیئے کرنی پڑی کہ فی زمانہ جس طرح وہابی دیوبندی اہلسنت بن کر حضور غوثِ پاک اور دیگر اولیاء اللہ کی گستاخیاں کرتے پھر رہے ہیں اسی طرح بعض شیطانی لوگ سنّی بن کر صوفیانہ لباس پہن کر غوثِ پاک کے جھوٹے عاشق بن کر یہاں تک بدعقیدگی کر جاتے ہیں کہ ولی کا درجہ نبی سے بڑھا دیتے ہیں حالانکہ مسلکِ اصل سنّت میں کوئی ولی کسی نبی سے برابری نہیں کر سکتا۔ غوثِ پاک عبد القادر جیلانی اور دیگر تمام غوث و قطب تو تابعین و تبع تابعین کے بعد درجہ رکھتے ہیں۔ وہ سرکار ہیں یہ غوث و قطب ان کے خدام ہیں۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والا حاشا حاشا سنی نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ غوث پاک نورِ نظر صاحب لولاک بے شمار کرامات کے مالک و مختار ہیں یہ بات بھی ظاہر و ثابت ہے کہ معجزہ ہو یا کرامت۔ انبیاء کرام اور ان کے ولیوں کو ان پر مختار و مالک بنا دیا جاتا ہے جیساکہ قرآن

قرآن پاک سے ثابت ہے۔ انھیں کرامات میں سے ڈوبی بارات کو بارہ سال بعد نکالنا ہے۔ جیسا کہ استدلالی طور پر قرآن مجید سے بھی یہ کرامت ثابت ہو گا اور تاریخی کتابوں تصنیف اولیاء سے بھی یہ کرامت ثابت ہو گئی۔ اور تاریخی طور پر بزرگوں کے حوالے سے بھی انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ ہاں یہ وضاحت ضروری ہے۔ کہ اس برات کا دولہا کون تھا۔ تو کتب سِیَر سے بھی اور تشہیر فی العوام سے بھی یہ ہی ثابت ہے کہ وہ دولہا حضرت سید کبیر الدین شاہ دولہا دریائی ہیں ان کا نام کبیر الدین ہے چونکہ اس برات کے دولہا یہی تھے فارسی النسل عجمی تھے اور زبانِ مادری فارسی ہی تھی فارسی میں نالکھ شخص کو دولہا یا شاہ دولہا یا نوشاہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں مستعمل ہے۔ اسی لیئے ان کا لقب شاہ دولہا ابھی تک چلا آرہا ہے۔ یہ ہی بارہ برس تک دریا میں ڈوبے رہے اس لیئے ان کا لقب دریائی اب تک مشہور ہے۔ ان کا ایک مزار ہمارے شہر گجرات پنجاب میں ہے اور ایک مزار صوبہ گجرات احمد آباد انڈیا ہندوستان میں ہے۔ چنانچہ کتاب مقاماتِ محمود ص ۳۶۸ پر اسی طرح درج ہے۔ اسی کتاب کے اگلے ص ۳۶۹ پر درج ہے کہ آپ کو غوثِ پاک نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا اور خدمتِ وضو پر مامور کیا تھا ایک دفعہ آپ کو حضور غوثِ پاک نے اپنے وضو کا غسالہ پلایا تو آپ کی عمر ایک سو سال طبعی کے علاوہ پانچ سو سال مزید بڑھ گئی کل چھ سو سال ہو گئے۔ غوثِ پاک نے اپنا خلیفہ بنا کر گجرات آپ کو بھیجا۔ چنانچہ کتاب حقیقتِ گلزارِ صابری ص ۷۷ پر اسی طرح درج ہے۔ تمام تاریخوں میں آپ کا لقب شاہِ دولہا لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی شجرات روحانیہ میں بھی آپ کو شاہ دولہا کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ شجرہ قادریہ جنیدیہ غفوریہ ص ۵۷ پر بھی اسی طرح درج ہے۔ ان تمام کڑیوں کو جوڑنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ہی کی برات کو حضورِ غوثِ پاک نے تِرایا تھا چونکہ آپ نے دریا سے زندہ نکل کر باقی زندگی حضور غوثِ پاک کے قدموں میں گزار دی اِس لیئے آپ کی کوئی اولاد نہ ہوئی مگر آپ کو رب کریم نے صلۂ خدمتِ غوثِ اعظم میں ایسی تا قیامت زندہ کرامت دی ہے۔ کہ دنیا جہان میں اولاد والوں کی اولاد سے آپ کو حصۂ اولاد بشکلِ چوہا عطا ہوا۔ دنیا میں صرف آپ کو ہی یہ کرامت ملی ہے۔ وہ چوہے جس طرح دنیا میں عجیب طرح سے آتے ہیں اسی طرح اپنی جوانی وغیرہ گزار کر روپوش ہو جاتے ہیں ان انسانی چوہوں کا آج تک کسی نے جنازہ اٹھتا نہ دیکھا۔ آپ کی دوسری کرامت یہ مشہور ہے کہ ایک پانی کی بیماری سے جسم انسانی میں موکے نکل آتے ہیں۔ آپ کے مزار پر جھاڑو کی منت ماننے سے وہ موکے جھڑ جاتے ہیں۔ میری خوش بختی کہ یہ مزار مقدس میرے

مکان کے بالکل قریب ہے۔ اور منکرین گستاخوں کا جواب دینے کے لیئے بھی مجھ کو منتخب کیا گیا فالحمد للّٰہ علٰی ذالِکَ اتنے دلائل با ضابطۂ شرعیہ کے ہوتے ہوئے پھر بغیر دلیل محض ضد بازی میں اپنی ناقص عقل سے انکار کرتے چلے جانا جہلا کا کام ہے۔ اہلِ علم کے نزدیک صرف اُن چیزوں کا انکار کیا جائے گا۔ جن میں مندرجہ چار خرابیاں ہوں۔ ۱۔ اصولِ اربعہ فقہیہ شرعیہ کے بعد ظہور میں آئیں اور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق نہ ہو ۲۔ جس چیز میں کسی اسلامی قانون کا مقابلہ پایا جائے وہ کرامت بناوٹی اور شرعًا ناقابل قبول ہوتی ہے۔ ایسی ہی جھوٹی کرامت کو ماننے اور لکھنے کہنے سننے والا بدبخت گمراہ ہوتا ہے۔ مثلاً وہی روحیں چھیننے والی بناوٹی بات جس کا ذکر پہلے ہوا یہ کرامت عقلاً و نقلاً غلط ہے کیونکہ احادیث سے روحوں کے لے جائے جانے کا طریقہ اور ہے تھیلے میں ڈال کر نہیں لے جائی جاتیں۔ ان وجوہ شرعیہ سے یہ کرامت غلط ہے۔ اولیاء اللہ کو کرامت اس لیئے نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے بڑوں کے مقابلے آجائے یا اپنا رعب جماتا پھرے بلکہ صرف کفر اور بے دینی گمراہی کو پسپا کرنے کے لیئے عطا ہوتی ہیں ۳۔ جس کرامت سے کسی دوسرے بزرگ کی شان میں گستاخی ہوتی ہو وہ کرامت بھی غلط ہے جیسے کہ زہرہ رنڈی اور ہاروت و ماروت کا واقعہ کہ اس کا امام رازی نے امام قاضی عیاض نے انکار کیا کیونکہ اس میں گستاخیٔ ملائکہ ہے۔ دیکھو نبراس ص ۱۸۰ پر۔ ۴۔ اسی طرح وہ کرامت جس سے اللہ تعالٰی کی شان میں گستاخی ہوتی ہو۔ جیسا کہ حقیقتِ گلزارِ صابری کے جاہل مصنف نے ص ۹ پر بناوٹی روائتیں درج کر کے اپنی سمجھ میں نبی کریم کی تعریف کرنی چاہی۔ لکھتا ہے۔ حدیث:۔ اَنَا اَحْمَدُ بِلَا مِیْمٍ وَعَرَبٌ بِلَا عَیْنٍ۔ حالانکہ جہالت تو دیکھئے کہ لفظ۔ بلا۔ عربی فقروں میں مستعمل ہی نہیں۔ نہ یہ حرفِ استثناء ہے نہ حرفِ صفت۔ اور شیعوں رافضیوں کی بناوٹی روایت پیش کرتا ہے:۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَعْرِفُ اللّٰہَ اِلَّا اَنَا وَ عَلِیٌّ۔ یہ سب روائتیں گستاخی و کفریہ ہیں۔ اور عقائدِ اہلِ سنّت کے سراسر خلاف۔ بعض جہلا بدباطن لوگوں نے عیسائیوں یہودیوں اور شیعوں کی طرح حضور غوث پاک کو انبیاءِ کرام سے بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اتنی عظیم اعلیٰ و مشہور و کثیر کرامات کے باوجود عقائدِ اسلامیہ کے مطابق غوث پاک کا درجہ انبیاءِ کرام سے کہیں لاکھوں مقام نیچا ہے پس مسلکِ اہلِ سنت میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ بلکہ جو کرامت شریعت کے معیار پر پوری ہو اور اس کا قیاسی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو اس کا انکار جائز ہے اور جو کرامت

شریعت کے معیار پر پوری ہو اور اس کا قیاسی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود ہو اس کا انکار ناجائز ہے اور جو کرامت اس معیارِ شرعی سے ہٹ جائے اس کو ماننا گناہ ہے سوال مذکورہ میں مسئولہ کرامت غوثِ پاک شریعت اور اصولِ قرآن کریم کے مطابق ہے اور کتابوں میں مشہور ہے اس لیے شرعًا بالکل درست و صحیح ہے بلا وجہ ہٹ دھرمی سے انکار گناہ ہے۔ ہاں البتہ یہ فوٹو جو بکتا پھرتا ہے۔ جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے:۔ بالکل بناوٹی ہے۔ اس کو خرید نا چھاپنا۔ گھروں میں لگانا سخت گناہ ہے:۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

وہابیوں کے اہلسنت پر چھ اعتراض اور انکے جوابات

سوال نمبر ۳۳:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے علاقہ کے ایک خبیث ترین وہابی نے کسی محمد اسلم کے نام سے ایک آٹھ ورقی رسالچہ چھاپا اور شائع کیا ہے اس کا عنوان ہے۔ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی۔ ہمارے علاقے میں ہیں تو یہ آٹے میں نمک کی برابر مگر چوہوں کی طرح شور بہت مچائے پھرتے ہیں اس رسالچے میں مندرجہ ذیل سات طرح پر اعتراض کرتا ہے اور دعوٰی کرتا ہے کہ کوئی سنی بریلوی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ براہِ کرم اس کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر سب سوالات کا جواب نہ دیں تو کم از کم اُن باتوں کا جواب ضرور دیں جو وہابی معترض نے حضرت حکیم الامت قبلۂ عالم رحمۃ اللہ علیہ کی کتب پر کئے ہیں۔

پہلا اعتراض:۔ ۱ فرقہ بریلویہ کے نزدیک حضور علیہ السلام کی حیثیت ایک شکاری اور دھوکہ باز کی ہے۔ معاذ اللہ جاء الحق ص ۱۷۵ اَیُّکُمْ مِثْلِیْ کے تحت لکھا ہے کہ اے کفار تم مجھ سے گھبراؤ نہیں میں تمہاری جنس سے ہوں یعنی بشر ہوں شکاری جانوروں کی آواز نکال کر شکار کرتا ہے۔ ثابت ہوا کہ بریلوی فرقہ گستاخ رسول ہے۔ **دوسرا اعتراض**۔ فرقہ بریلویہ کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے خزانے بچانے کے لیے جھوٹ بولا (معاذ اللہ) جاء الحق ص ۹۱ بحث علم غیب میں لکھا ہے کہ یہاں حکم میں کفار سے خطاب ہے یعنی اے کافرو میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں تم چور ہو چوروں کو خزانے نہیں بتائے جاتے۔ تو گویا کہ نبی کریم نے جھوٹ بولا جو کہا کہ اے کافرو میرے پاس خزانے ہیں۔ **تیسرا اعتراض**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر کافر نہیں

ہے۔ معاذاللہ۔ ملفوظات حصہ۳ اول ص۵۳ پر لکھا ہے کہ ایک شخص میاں صاحب تھے انہوں نے کچھ سوال کیئے اسماعیل دہلوی کے متعلق۔ مولانا احمد رضا خان صاحب نے یہ بھی مانا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ مانو اور اس کی تکفیر بھی نہیں کرتے ثابت ہوا کہ بریلوی فرقہ رسول کے منکر کو کافر نہیں کہتے۔ **چوتھا اعتراض**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک کامل ولی وہ ہے جو عورت کے فرج میں نطفہ پڑا دیکھ لے۔ تنویر الخواطر ص۴۳ پر عربی عبارت ہے لَا تَسْتَقِرُّ نُطْفَةٌ فِیْ فَرْجِ اُنْثٰی اِلَّا یَنْظُرُ لَہٗ ذَالِکَ الرَّجُلُ اَیُّھَا:۔ اس کا ترجمہ اس طرح لکھا ہے۔ کسی مادہ کی شرمگاہ میں کوئی نطفہ نہیں قرار پکڑتا مگر وہ کامل اسی کو دیکھتا ہے۔ **اعتراض ۵**. فرقہ بریلویہ کے نزدیک شیطان حضور اکرم سے زیادہ جگہ حاضر و ناظر ہے۔ انوار ساطعہ ص۱۷ پر مولوی عبدالسمیع صاحب رام پوری نے لکھا کہ اصحابِ محفلِ میلاد تو زمین کی تمام جگہ پاک ناپاک مجالس مذہبی وغیر مذہبی میں حاضر ہونا رسول اللہ کا نہیں دعوے کرتے ملک الموت اور ابلیس کا حاضر ہونا اس سے بھی زیادہ تر مقامات پاک ناپاک کفر غیر کفر میں پایا جاتا ہے۔ **اعتراض ۷**:۔ فرقہ بریلویہ کے نزدیک انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں توضیح البیان ص۲۷ پر مولانا ابو وفا غلام رسول سعیدی جامعہ نعیمیہ لاہور نے لکھا کہ۔ کیونکہ وہ انبیاء جھوٹ بولتے تو نہیں مگر بول سکتے ہیں:۔ **اعتراض ۶**:۔ فرقہ بریلویہ کا اعلان کہ نہ ہم سنی ہیں نہ شیعہ اور نہ ہمیں علم ہے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون مقالاتِ مرضیہ ص۸۲ ملفوظ ص۴۶ ملفوظات مہریہ گولڑہ شریف۔ یہ ہیں اس خبیث کے چند اعتراض اگرچہ ہم نے وہابیوں کو منہ توڑ جواب دے دیئے ہیں مگر آپ کے قلم سے علمی و تحقیقی رنگ میں جواب کی تشریف آوری ہمارے لیئے باعث افتخار و خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ اہلسنت پر قائم رکھے ہمارے لیئے آپ کے در کے سوا اور کونسا دروازہ ہے۔ **السائل**۔ ابو طاہر محمد مجیب قادری پٹیالہ سائیکل ورکس کورٹ روڈ جھنگ صدر :۔ ۸۔۷۔۱۱۔ ۹

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ

الجواب

جناب ابو طاہر صاحب سلام مسنون گرامی نامہ بشکل سوال نامہ وصول ہوا سوال نامے کے ساتھ رسلہ آٹھ ورقی رسالہ بھی وصول ہوا اول آپ کا سوال نامہ پڑھا تحریری عبارت سخت ہے، جس میں تنگی کی نظر کی جھلک نمایاں تھی میں چاہتا تھا کہ آپ کو بطور نصیحت آئندہ کے لیئے اس کج خلقی سے منع کروں کیونکہ ہمارا مسلک اور اعلیٰ حضرت بریلوی و حکیم الامت بدایونی کی تعلیم ہم کو دشمن کے ساتھ بھی نرم کلامی و اخلاقِ مشفقانہ ہی کا سبق دیتا ہے۔ مگر بعدہٗ جب رسالہ موصولہ کا مطالعہ کیا تو

وہ بداخلاقی و بدتہذیبی و کج خلقی میں بڑھا چڑھا پایا جس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ آپ کی تحریری سختی اسی کا ردِ عمل ہے بہر حال آپ لوگوں کو نرم کلامی کا ہی شیوہ اپنانا چاہیئے کہ آپ اہل سنت میں آپ کے نبی طیب متوریں اخلاقِ حسنہ کا خزانہ ہے۔ آپ کا دین آپ کو مٹھاس سکھاتا ہے۔ آپ کو تہذیب سے گری بات زیب نہیں کیونکہ تند مزاجی بداخلاقی ان کو ہوتی ہے جس کا مسلک کمزور ہو اور جس کے پاس دلائل و براہین نہ ہوں وہ ہی شکست خوردہ حالت میں غصہ غیض و غضب اور بداخلاقی پر اتر آتا ہے۔ بحمدہ تعالیٰ اہلسنت والجماعت کے پاس اپنے ہر مسلک پر قرآن و حدیث سے دلالۃً و عبارۃً۔ کنایۃً و اقتضاءً۔ اشارۃً و تاویلاً۔ دلائل کثیرہ موجود ہیں۔ یہ میں نے ویسے ہی نہیں لکھ دیا بلکہ تجربتاً آپ اس فتوے کی مندرجہ ذیل عبارت کے علاوہ میرے مطبوعہ فتاوے العطایا جلد اول کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ جس نے بھی بے راہ روی یا گمراہی اختیار کرنے کی کوشش کی اس کو سمجھانے کے لیے اتنے کثیر دلائل میسر آئے کہ مخالف کو جواب کا چارہ نہ رہا۔ یہ سب کچھ میرے مسلک پر میرے رب تعالیٰ جلّ مجدہٗ کا کرم ہے۔ یہ ہمارے مضبوط دلائل کی ہی مار ہے کہ مخالف فریق بجز بداخلاقی کے کچھ نہیں دکھا سکتا جیسا کہ اس رسالچہ کی لایعنی بے سرو پا عبارت سے ظاہر ہے۔ رسالے کو پڑھنے کے بعد ایک غیر جانبدار محقق مورخ سلجھے ہوئے انسان سے مندرجہ تاثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ عا۔ یہ کہ یہ رسالہ کسی نئے دیوبندی نے نہیں لکھا بلکہ کسی پرانے غالی متعصب نے لکھا ہے اور یہ کہنا کہ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی محض جھوٹ اور فریب ہے محمد اسلم نامی کوئی شخص نہیں محض فرضی نام بنایا گیا یہ تاثر مصنف کے پیش لفظ کو بغور پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے کہ مصنف دیوبندی اکابر مولویوں کی تعریف اور بڑائی بیان کرنا چاہتا ہے۔ نبی کریم رؤف و رحیم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو اس رسالے کی اشاعت کے لیئے آڑ بنا رہا ہے ورنہ کیا ضروری تھا کہ بریلویوں کی گستاخی کا ذکر کرتے وقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی موڑ کھائی جائے۔ ع۲۔ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس رسالے کا مصنف اللہ رسول سے محبت کرنے والا نہیں نہ ہی خدا پرست ہے بلکہ دیوبند پرست اور دیوبندی نواز ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ بریلویت سے ہٹنے والا سیدھا بلا سوچے سمجھے دیوبندیت میں جا گھسے "تلاشِ حق" کی جستجو کرنے والا تو ہر دروازے پر جاتا ہے ہر ایک سے ملتا ہے۷۲ تہتر فرقوں میں سے اس کی تلاش سب سے پہلے دیوبندیت میں گھسی اور پھر وہیں پر کیوں رہ گئی تلاش آگے کیوں نہ بڑھی کسی اور رہبر سے کیوں نہ پوچھا جو اسے بتاتا کہ اے کم عقل بارش سے بچ کر پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ جس جماعت کی معمولی باتوں کو گستاخی سمجھ کر تو بھاگا تو نے پناہ کہاں لی جو گستاخیوں کا

گہوارہ ہے۔ اے کم ہمت تو نے ایک ازلی جماعت کو صرف اس لیئے چھوڑا کہ اس کے ایک بیوقوف کم عقل انسان نے معاذ اللہ انبیاءِ کرام کے متعلق یہ لکھ دیا کہ۔ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ مگر پھر تو نے ان لوگوں کا دامن پکڑا جو متفقہ طور پر یہی گستاخانہ بات اللہ تعالیٰ کے لیئے کہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی کتابوں میں امکانِ کذب کا مسئلہ بنا کر صاف صاف لکھتے چلے آرہے ہیں کہ۔ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے مگر بولتا نہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) اور پھر آج تک تمام دیوبندی وہابی اس کفریہ عقیدے پر اصرار کرتے پھر رہے ہیں نہ اس کفر سے رجوع ہے نہ بیزاری مگر یہ مصنفِ رسالہ اسی فرقے کی حمایت میں ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ انہی میں کا ایک ہے۔ ایک نیا جستجو والا تو کبھی ایسا نہ کرے گا کہ ایک نبی کے گستاخ سے ہٹ کر رب تعالیٰ کے گستاخوں میں شامل ہو جائے۔ ع۳ یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسالے کا مصنف سخت کم علم ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعصب میں یکتاءِ زمانہ ہے۔ اس لیئے کہ وہ بریلوی مصنفین کی کتب میں خود ایک عبارت منتخب کر کے پیش کرتا ہے اور پھر خود ہی اس میں گستاخی کا مطلب نکالتا ہے۔ اور پھر خود کہتا ہے کہ دیکھو دیکھو بریلویوں نے گستاخی کر دی۔ حالانکہ جب غیر جانبداری سے اس آٹھ ورقی رسالے کو دیکھ کر پھر بریلویوں کی محولہ کتب کو دیکھا جائے تو وہ مطالب اور توڑ مروڑ کہیں بھی نظر نہیں آتے جو مصنفِ رسالہ نے بڑے شدّ و مدّ سے لکھ کر واویلا کیا۔ یہ ہیں وہ تاثرات جو غیر جانب دار سلجھے دماغ والے کو اس رسالے کے مطالعے سے پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح مصنفِ رسالہ کے اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے جو وہ دینا چاہتا ہے یہ رسالہ کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں نہ ہی اس میں شمۂ علم نہ ذرۂ عقلیت ہے اس کے جواب کی چنداں حاجت نہ تھی نہ ہی میں ان وہابی سنی کے جھگڑے میں پڑنے کو تیار تھا۔ کہ ابتداء ہی سے میرا ذہن ان خرافات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ میری گوشہ نشینی یہ برداشت نہیں کرتی کہ خواہ مخواہ بغیر سوچے سمجھے بلاوجہ کسی کو کافر یا ظالم بناتا پھروں یہ کارِ حمقا ہے۔ میں نے شروع ہی سے تمام اسٹیجوں کو چھوڑ کر منصبِ افتاء کو اپنے لیئے پسند کیا۔ میں صرف مفتیِ اسلام ہی رہنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو فقۂ اسلام سے محبت ہے۔ فی زمانہ مفتیِ اسلام مثل قانونی جج کے ہے جس طرح جج ہر طرح غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اسی طرح مفتی ہر وقت پر بھی غیر جانب دار ہونا لازم ہیں اس مناظرانہ رسالے کے جوابات میں مشغول تو نہ ہونا چاہتا تھا مگر آپ کے استفتا اور پیہم اصرار کی بنا پر اپنے منصبِ افتاء کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے محض تحقیقی فتوٰے نافذ کر رہا ہوں بغیر کسی جانب داری یا تعصب کے بریلویت دیوبندیت دونوں اسٹیجوں سے ہٹ کر اپنی ذاتی تفتیش کے مطابق یہ تحریر لکھ رہا ہوں کیونکہ کسی کے استفسار

پر حقیقتِ حال کو واضح کرنا مفتی پر واجب و لازم ہوتا ہے۔ آپ کے استفتاء کے درج شدہ جواب طلب اعتراضات کے علاوہ موصولہ رسالے کے دیباچہ (پیش لفظ) کی مختصر صحیح مؤرخانہ وضاحت ضروری ہے۔ لہٰذا اس ضمن مصنفِ رسالہ مذکورہ نے ص۳ پر لکھا کہ ان کی یعنی بریلویوں کی اکثر کتب صرف صرف ان لوگوں پر کیچڑ اچھالنے کے لیے لکھی گئیں جنھوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار مقابلہ کیا۔ جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بہادری و جرأت کے جھنڈے گاڑ دیئے تحریک سید احمد شہید۔ تحریک خلافت۔ تحریک ریشمی رومال۔ اور تحریک پاکستان میں ان کا کردار تاریخی صفحات پر سنہری حروف میں رقم کیا جاچکا ہے (الخ)۔ جواب مصنف کی طرزِ تحریر کی بنا پر بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ عبارت ہے جس کو شائع کرنے اور لوگوں کو دکھانے کا مقصد ہے اسی کے لیے اتنے تانے بانے بنے گئے ہیں اور چونکہ بریلوی لوگ اِن کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے صرف بریلوی ہی نہیں بلکہ بجز دیو بندیوں کے دیگر فرقے بھی اس کو نہیں مانتے شیعہ۔ چکڑالوی۔ قادیانی اہل حدیث وغیرہ سب کہتے ہیں کہ یہ تاریخ بناوٹی ہے۔ لہٰذا اس بات کا جواب دینا اور اس کی تاریخی حیثیت معلوم کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ بالکل غیر جانب دار ہو کر میں نے۔ اس تفتیش و تحقیق کرنے کے لیے صرف وہی کتابیں دیکھی ہیں جو دیو بندیوں کی لکھی ہوئی اور انہیں کی مطبوعہ ہیں۔ اس ضمن میں اب تک میں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا وہ حسبِ ذیل ہیں چونکہ میں نے اس چھان بین میں صرف انہی کتب کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے فوقیت دی اور انہی کتب کا مطالعہ کیا جو دیو بندیوں کی تصنیف شدہ دیو بندی مطبوعات ہیں کیونکہ دیو بندی مسلک کو جواب دے رہا ہوں۔ لہٰذا انہی کے قابلِ اعتماد کو مدِ نظر رکھا گیا۔ اس چھان بین کے لیے مجھ کو دراز سفر بھی کرنا پڑا اور دیو بندی اکابر و مبلغین سے رابطہ بھی قائم کرنا پڑا یہ صعوبتیں صرف اس لیے برداشت کیں تاکہ میرا بر فتوائے کسی پہلو کمزور نہ رہے اور نہ ہی تعصب کی راہ کا کسی کو بہانہ مل سکے میں نے اکابر و فضلاء دیو بند سے مناظرانہ و مکالمانہ طرز پر اپنے خدشات کا اظہار کیا تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ میرے خدشات کی قوت کتنی ہے۔ جب وہ حتی القدور تفہیم کے بعد لاجواب ہو گئے تب میں اس خدشات کو بذریعہ تحریر ہذا آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں نہ میری عادت نہ میرا منصب کہ خواہ مخواہ کسی کو زیر کروں۔ اس تفتیش سے پہلے میں صرف یہی جھگڑا سنتا چلا آرہا تھا کہ دیو بندی بریلویوں پر پاکستان دشمنی انگریز دوستی کا الزام لگاتے تھے اور بریلوی دیو بندیوں پر۔ سچائی کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا نہ ہی کبھی تحقیق حال کی طرف طبیعت راغب ہوئی اس لیے کہ دیو بندی

بریلوی کا اصل اختلاف یہ نہیں بلکہ اصل اختلاف تو عظمتِ انبیاء واولیاء بلکہ خود خالق عالم جلّ مجدہٗ کی ذات پاک کی عظمتِ پاک کا مسئلہ ہے جس کے دیوبندی قائل نہیں۔ جیسا کہ مشہورِ زمانہ کتاب جاء الحق حصہ اوّل و دوم میں بالتفصیل وضاحت کی گئی ہے اور یہاں بھی آئندہ سطور میں کچھ مشتے نمونہ کے طور پر وضاحت کر دی جائے گی۔ فی الحال چونکہ قابلِ جواب آٹھ ورقی موصولہ رسالے میں اول صفحات پر اسی کو واضح وظاہر کیا گیا ہے کہ دیوبندی لوگ انگریز دشمن تھے اور رہیں اور سا انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن سے لڑے جنگ کرتے رہے۔ پس ضروری ہوا کہ محض منصفانہ و منقیانہ و عادلانہ ذہن سے اس جھگڑے کو نمٹانے کی غرض سے حقیقت کو واضح کیا جائے۔ مجھ کو اس تفتیش کے ذریعے چار چیزیں بڑی واضح طریقے سے آشکارا ہوئیں۔ اوّلاً یہ کہ دیوبندی اکابر سکھوں سے جنگ کرتے رہے۔ دوم یہ کہ سکھوں سے جنگ انگریز حکومت کے حکم اور ان کی حمایت میں کرتے تا کہ انگریز حکومت مضبوط ہو۔ سوم یہ کہ یہ دیوبندی سپاہ سالار انگریز حکومت سے باقاعدہ ہر طرح کی امداد وصول کرتے رہے۔ چہارم یہ کہ۔ یہ دیوبندی اکابر اسی انگریزی دور میں انگریز حکومت کے حکم سے مسلمانوں سے بھی جنگ کرتے رہے۔ چنانچہ علی الترتیب حوالہ جات کتب مع ضروری مختصر مضمون ملاحظہ ہو۔:

۱: رسالہ الفرقان شہید نمبر ۱۳۵۵ھ کے ص ۷۶ پر لکھا ہے۔

مشہور یہ ہے کہ آپنے (یعنی اسماعیل شہید نے) انگریزوں کی مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا۔

۲: مقالات سرسید حصہ نہم ص ۱۴۲ پر لکھا ہے

اثناءِ وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے وہ بھی تو کافر ہیں اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایہ ہیں اس لیئے ہم پر مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں سے ہم کبھی جہاد میں شریک نہ ہوں:

۳:۔ سوانح احمدی مطبوعہ فاروقی دہلوی ص ۵۷ پر لکھا ہے:۔

یہ بھی صحیح ہے کہ اثناءِ قیام کلکتہ۔ مولانا اسماعیل شہید کے وعظ کے دوران ایک شخص نے یہ فتوے پوچھا کہ سرکار انگریز پر جہاد درست ہے یا نہیں۔ جواب میں مولانا شہید نے فرمایا کہ ایسی بے رو۔ریا۔ غیر متعصب سرکار پر کسی طرح جہاد کرنا درست نہیں:۔

۴:۔ موجِ کوثر مصنف ص ۲۰ مطبوعہ میں لکھتے ہیں:۔

سید احمد سے کسی نے پوچھا کہ سکھوں سے اتنی دور جہاد کرنے جاتے ہو۔ انگریز بھی تو کافر ہیں ان سے کیوں نہیں لڑتے۔ سید صاحب نے جواب دیا۔ سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم نہیں کرتی

۵۔ حیاتِ طیبہ مرزا حیرت دہلوی کی تصنیف مطبوعہ فاروقی دہلوی ص ۲۹۶ پر ہے۔

مولوی محمد اسماعیل شہید نے ایک شخص کو جواب دیا کہ انگریز پر جہاد کرنا کسی طرح واجب نہیں بلکہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو انگریزوں پر حملہ آور ہو اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں

۶۔ کتاب الحیات بعد الممات ص ۲۰۳ پر لکھا ہے۔

اسماعیل دہلوی کا نے اپنے شیخ سید احمد کو امام مان کر مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ پنجاب میں جہاد کیا۔ تو گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی کسی طرح کی مزاحمت نہ کی نہ جہاد میں پیچیدگی پیدا کی۔

۷۔ ترجمانِ وہابیہ مصنف نواب صدیق حسن ص ۵۱-۵۲ پر لکھا ہے۔

نہ انہوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا نہ ہندوستان میں جہاد کا فتوےٰ دیا گورنمنٹ اگر ساری کتب بھی دیکھے تو کسی کتاب میں جہاد یا بغاوت کا فساد سکھانے کی سرکار انگلشیہ سے کوئی بات نہ پاوے گی۔

۸۔ کتاب۔ تحریک جہاد کا قیمتی سرمایہ مکتوبات سید احمد مصنف اقبال کا ہندسی ص ۴ پر لکھا ہے۔

حضرت کی شہادت کے بعد جتنی بھی کتب لکھی گئیں اس میں اس بات کو بار بار ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف حضرت سید احمد شہید نے کوئی حرکت نہیں کی۔

۹۔ مقالات سر سید حصہ نہم ص ۱۴۵ پر لکھا ہے۔

وہ اپنے بال بچوں کو اور مال اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان پر حملہ کرنا ان کے مذہب میں نہایت ممنوع ہے۔

۱۰۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مصنف مسعود عالم ندوی ص ۲۸ حاشیہ پر لکھا ہے۔

لیکن پنجاب کا اکثر علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔

۱۱۔ ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی از محمد سرور ص ۳۶۵ پر لکھا ہے

ایک مرتبہ میں سرحد پار بونیر کے مقام پر گیا جہاں احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید کے مجاہدین کی زندگی دیکھوں جب گیا تو صورت بڑا افسوسناک و تباہ کن حال تھا۔ ان کی تنخواہیں صاحبزادہ عبد القیوم کی معرفت انگریزی حکومت کی مرہونِ منت تھی۔

ع۱۲ ب سوانح احمدی مصنف جعفر تھانیسری ص۲۹
ایک انگریز گھوڑے پر سوار آیا جو بہت سا کھانا سید صاحب اور اُن کے مجاہدین کے لیئے لایا اور کہا کہ پادری صاحب (سید صاحب) کہاں ہیں جب ملاقات ہوئی تو کہا کہ حضور میں نے آپ کے آنے کی خبر سنی تھی تو یہ کھانا حاضر کیا ہے حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کردو قریب دو گھڑی وہ انگریز حضور میں حاضر رہا۔

ع۱۳ :- کتاب مخزنِ احمدی مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ مصنف سید محمد علی مجاہد تحریکِ سید احمد یہ سید احمد کے بڑے بھانجے ہیں اپنی اسی کتاب کے ص۶۴ پر۔ انگریز کے کھانا لانے کا یہی واقعہ فارسی زبان میں لکھتے ہیں۔

ع۱۴ :- سیرتِ سید احمد شہید حصہ اول ص۲۱۹ پر لکھا ہے مصنف ابوالحسن علی ندوی۔
مقام اسرولی سے چار میل پہلے حضرت کے پاس ایک انگریز کی ہندوستانی بیوی آئی اور کھانے کی دعوت دی انھوں نے انکار کیا۔ پھر وہ فرنگی (انگریز) خود آیا تو آپ نے فرمایا۔ تمہاری دعوت کیوں نہ قبول کریں گے آپ نے اُس دن اس کی دعوت کھائی۔

ع۱۵ مکتوباتِ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ مکتوب مرقوم ۱۸ جنوری ۱۹۶۲ء ص۹۵ مصنف غلام رسول مہر وہابی ص۹۵ پر لکھا ہے :-
سید احمد شہید کے پاس ہندوستان گورنمنٹ سے جو ہنڈیاں (گورنمنٹی مالیتی ڈرافٹ) آتی تھیں اُن میں اشرفیوں کا بھی ذکر ہے اور روپوں کا بھی۔

یہاں تک تو یہ ثابت ہوا کہ یہ اکابر دیوبند سکھوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے اور انگریز کے حکم سے یہ سب کچھ ہوا صرف اس لیئے کہ انگریز حکومت مضبوط ہو۔ میں نے مندرجہ بالا جتنی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں وہ سب تقریباً ۱۸۵۶ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان لکھی اور چھاپی گئیں میں نے اپنی تحقیق کے دوران کسی نئے مصنف یا نئے مطبوعہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سابقہ دور میں مجھ کو ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہ ملی جس میں ذرہ بھر یہ لکھا ہو کہ وہابی دیوبندی حضرات انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے رہے اور انگریز سے جنگ کرتے رہے۔ اور اپنی اس تحقیق کے بعد میں چیلنجی طور پر زمانے بھر کے وہابیوں کو دعوتِ عام دیتا ہوں کہ سابقہ دور کی ایک بھی کتاب دکھا دو جس میں ذرہ بھر یہ لکھا ہو کہ کبھی وہابی نے کسی انگریز سے جھگڑا بھی کیا ہو۔

پھر جائے کہ مسلمہ جنگ۔ بلکہ ان ہی کتابوں سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں کہ سکھوں سے جنگ کی انگریزوں سے محبت کی یہی نہیں بلکہ اس پر فخر کرتے رہے کہ ہم نے انگریز کی حکومت مضبوط کی اور انگریز کے سب مخالفین سے لڑائی کی جیسا کہ ابھی اوپر ہم نے نواب صدیق حسن خان وہابی کی کتاب ترجمانِ وہابیہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے تو بیس سال سے ان وہابیوں نے کروٹ بدلی اور کہنا شروع کر دیا کہ ہم انگریز کے مخالف تھے۔ اور یہ کہ ہم انگریز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے جنگ کرتے رہے۔ ان کتب کے مصنف بھی نئے اور مطبوعات بھی جدید اس جدت تصنیف سے ذہنی تجدید کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے اس دور کے وہابی اسی بات پر مصر ہیں اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ کہ ہم انگریز کے دشمن تھے۔ یہی وہ بات تھی جس کے اب مخالف نظر آرہے ہے اور بیس سال قبل اسی پر فخر کرتے تھے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ پہلے انگریزی دور تھا دل بھر کے انگریز کی حمایت کی اور انگریز سے روپیہ چھینا اور ہتھیایا پھر پاکستان بننے کا دور آیا تو ہندوستان نوازی اور ہندو کافر کی حمایت کا بڑھ چڑھ کر بیڑا اٹھایا۔ اور پاکستان۔ قائداعظم اقبال کی سخت توہین آمیز مخالفت کی اور اب جب کہ پاکستان بن گیا۔ تو اس ڈر سے کہ کہیں کوئی حکومتِ پاکستان ہمارا محاسبہ و محاکمہ کر کے واجبی سزا نہ دیدے۔ سابقہ ساری تاریخوں کو جھٹلا کر پاکستان کے حامی ہونے کے دعویدار بنتے چلے جا رہے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی اور سچی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ کہ برصغیر پر تین دور گزرے۔ پہلا دور جب کہ انگریز کا تسلط علاقۂ ہند پر شروع ہوا دوسرا دور جب کہ پاکستان بننے کا دور شروع ہوا۔ تیسرا دور جب پاکستان بحمدہٖ تعالیٰ بن گیا۔ ان تینوں دوروں میں برصغیر کے دو گروہوں کا کردار مندرجہ ذیل طریقوں سے کھل کر سامنے آتا ہے۔ پہلا دور مغل بادشاہ ظفر کے زمانۂ سلطنت میں انگریز نے قابض ہونا چاہا تو اکابر وہابیہ جن کو بعد میں دیوبندی کہا جانے لگا نے انگریز کی بھرپور حمایت کی اور مسلمانوں کی جاسوسیں کر کر کے اسلامی سلطنت کی قوت کو توڑا انہی غداروں کی جاسوسیوں کی بل بوتے پر انگریز نے تسلط جمایا اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا ورنہ عسکری قوت کے سامنے ایک لمحہ یلغارِ انگریز نہ ٹھہر سکی تھی۔ چنانچہ غداروں کی سر فہرست تین آدمیوں کے نام سے شروع ہے۔ پہلا شخص سلطنتِ مغلیہ کا مشیرِ خاص۔ مرزا الٰہی بخش ظفر بادشاہ کا سمدھی۔ سید احمد خان وہابی کا چوتھا خلیفہ مرید تھا اس نے محل کی ہر راز دارانہ بات سے انگریز وائسرائے اور کلکٹر کو آگاہ کیا انگریزوں نے اس کو سربراہی کا لالچ دیا تھا جو پورا نہ ہوا دوسرا شخص حکیم احسن اللہ خان سید احمد خان اور اسماعیل دہلوی کا مرید صادق تھا

ایک ساتھی (بحوالہ کتاب تاریخِ غدر ص۱۲) تیسرا شخص حیدر آباد دکن کا میر صادق۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کا وزیرِ مال بھی رہا تھا۔ جس نے مالی طور پر بھی انگریز کی حمایت کی اور تمام مسلمانوں سے غداری کی۔ یہ تھا ۱۹۵۹ء میں دیوبندی وہابی کردار۔ اسی قسم کی تاریخی عبارت یکم نومبر ۱۹۷۹ء اخبار امروز کے ص۳ پر بعنوان آخری تاجدارِ مغلیہ کے آخری عید قربان۔ شائع ہوا ہے۔ اسی دور میں۔ بریلوی گروہ کے سربراہ فضلِ حق خیر آبادی کو انگریز نے تین جرموں کی بنا پر کالے پانی کی سزا دی اور دریائے شور جزیرۂ انڈمان کی خطرناک جیل میں رکھ کر موت سے ہم کنار کرا دیا۔ پہلا جرم یہ کہ ظفر بادشاہ کی حمایت کیوں کی دوسرا جرم یہ کہ فتوئے جہاد کیوں دیا۔ تیسرا جرم یہ کہ انگریز حکومت کے خلاف شاہی فوج کو کیوں منظم کیا اور اپنے خطبات سے مسلمانوں کو اسلامی فوج میں کیوں بھرتی کرایا۔ میری اس تحقیق کو اپنے پرائے سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس دور کے تمام بریلوی علماء عوام۔ فضل حق صاحب کے جھنڈے تلے ہو کر انگریز کی مخالفت میں کمربستہ رہے۔ چنانچہ۔ ع۱ انتظام اللہ شہابی کی تصنیف بنام غدر کے چند علماء ص۴۸ ع۲ کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مصنف خورشید مصطفیٰ ص۴۵۵ ع۳ ۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ مصنف غلام رسول مہر وہابی ص۲۰۶ ع۴ کتاب بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد مصنف رئیس احمد جعفری دیوبندی ص۲۱۵ پر اور ان کے علاوہ بہت زیادہ تاریخی کتابوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ دہلوی بغاوت کے زمانے میں فضل حق خیر آبادی صاحب نے انگریز کے خلاف جنگ کا فتوٰے دیا اور بہادر شاہ ظفر کے حامیوں میں شامل رہے اور انگریزوں کی جیلیں برداشت کرتے ہوئے جیل کی کال کوٹھری میں ہی انتقال کیا۔ مگر باوجود سرکاری و غیر سرکاری وکلاء کے سمجھانے کے کہ آپ فتوے سے انکار کر دو تو سزا معاف ہونے کے علاوہ اتنی جاگیر بھی دی جائے گی۔ مولانا نے اس پیش کش کو عدالت میں رد کرتے ہوئے صاف کہا کہ میں کافر کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ یہ ملک و ملت و قوم سے غداری ہے۔ یہ تھا برِصغیر کے پہلے دور میں سنی وہابی کے عملی کردار کا تضاد جس کو اسی زمانے کے مورخوں نے بلا تعصب آئینے کی طرح صاف کر دیا۔ اب ایک غیر جانبداری مخلص جج و قاضی و مفتی کیا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور کس کو یہ فیصلہ دے کہ وہ انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انگریز سے لڑتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اتنی تاریخی دستاویزات کے ہوتے ہوئے کوئی بھی منصف مزاج یہ ڈگری دیوبندیوں کو نہیں دے سکتا۔ لامحالہ یہ ڈگری اور تمغۂ جرأت بریلویوں کو ہی ملے گا۔ یہ تھا پہلا دور۔ بعدہٗ اسی برصغیر پر دوسرا دور آیا جب کہ انگریز اپنی مکاریوں اور بے غیرت مسلمانوں کی غداریوں کی بنا پر سرزمینِ ہند پر قابض ہوا تو دو قومیں اس کے لیے درد سر بنگئیں پہلی قوم سرحدی پٹھان اور دوسری قوم سکھ۔ ان دونوں قوموں سے لڑنے کی بجائے انگریز یہ :-

سکت وہمت نہ تھی۔ انگریز نے پھر پکارا المدد۔ تو اسی برِ صغیر کے کچھ لوگ لبیک کہتے ہوئے انگریز کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور کافروں کی حمایت میں غیر ملکیوں کی محبت میں اپنی ہی قوم کے قتل پر آمادہ و کمربستہ ہوئے۔ اپنوں ہی کو تہِ تیغ کیا صرف چند ٹکوں کی لالچ میں اور صاحب بہادر کی مسکراہٹ و رضا کے حصول میں۔ کون تھے یہ لوگ؟ تاریخ سے پوچھنے پر ظاہر ہوا کہ یہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد خان تھے۔ یہ کس نے بتایا؟ خود ان ہی کے حواریوں عقیدت مندوں شاگردوں کاسہ لیسوں نے بتایا، اور خوب فخر سے بتایا ہے کیونکہ یہی وقت کچھ ملنے کا تھا انگریزوں کی حکومت مضبوط ہو چکی تھی مسلمانوں کو پے در پے غداریوں سے کمزور کیا جا چکا تھا۔ قوم کشی ہو چکی تھی اب وقت تھا جاگیریں تقسیم ہونے کا عہدے بٹنے کا۔ تمغۂ غداری کے حصول کا۔ اس لیئے اشتہار چھپے۔ کتابیں بٹیں۔ تقریریں ہوئیں خطبے پڑھے گئے اور بڑے شد و مد اعلانات ہوئے کہ ہم ہیں جنہوں نے انگریزوں کی حمایت کی، ہم ہی ہیں جنہوں نے اپنوں کو مارا اپنا ملک غیروں کو دیا۔ اور عیسائیت کی جڑیں مضبوط کیں۔ اور اسلام کی بنیادوں کو اکھیڑا انگریز کے مقابلے میں جو بھی آیا مسلم یا غیر مسلم ہمارے ہی تیروں کا نشانہ بنا۔ تاریخیں تو چھپ گئیں کتابیں تو شائع ہو گئیں خطبے تو مشہور ہو گئے کہ وہ حقیقت تھی چھپ نہ سکتی تھی مگر ملا کیا۔؟ آخرت کو خدا جانے دنیا میں صرف سر کا خطاب اور شہید کا لقب۔ حضرت جی اسی پر پھولے نہیں سماتے کہ انگریز صاحب بہادر نے ہم کو سر سید احمد خاں کہدیا۔ اور قوم نصاریٰ نے ہم کو شہید کا لقب دے دیا۔ نہ کوئی عہدہ نہ کوئی جاگیر انگریز نے جو کام لینا تھا سو کٹھ پتلی بنا کر لے لیا۔ میں کہتا ہوں کہ کل تک جس پر تم کو فخر تھا آج اس کی اشاعت سے گھبراہٹ کیوں؟ وجہ ظاہر ہے کہ وہ وقت انعام ملنے کا تھا مگر یہ وقت محاسبے کا ہے۔ وہ زمانہ لالچ کے پورا ہونے کا تھا یہ زمانہ محاکمے سے خوف کا بدیں وجہ وہ عرصہ کارگزاری کے اظہار کا تھا یہ عرصہ غداری کے چھپانے کا۔ مگر کہاں تک چھپا سکتے ہو۔ یہ تو ان لوگوں کی خوش قسمتی ہے اور قدرت کی طرف سے غالباً ڈھیل ہے کہ ابھی تک کسی حکومت نے صحیح طور محاسبہ نہ کیا۔ ان دو دوروں کے بعد اسی ایشیائے کوچک پر تیسرا دور اس وقت آیا جب انگریز کی ٹکر جرمن سے ہوئی ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ یہی برطانوی سامراج ہٹلر سے شکست کھانے لگے تو برِ صغیر کے مقبوضہ علاقے کے باشندوں کے سامنے وعدے کیئے کہ تم لوگ ہماری مدد کرو اگر ہٹلر شکست کھا گیا تو ہم تمہارا علاقہ تم کو واپس کر کے برطانیہ چلے جائیں گے۔ چنانچہ۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ سب نے سر دھڑ کی بازی لگا کر خوب مدد کی اور ہٹلر شکست کھا گیا۔ انگریز اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے جب ملک چھوڑنے لگا تو یہاں کے مسلمان

اور ہندو باشندوں میں اختلاف ہوا کہ ملک کس کے سپرد ہو۔ ہندوؤں اور ان کے بڑے لیڈر نہرو گاندھی۔ پٹیل۔ وغیرہ کا منشاء تھا کہ ملک سارا ہم کو ملے۔ اس لیئے انہوں ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ لگایا مگر مسلمان لیڈر تقسیم کے طالب تھے ان کا نظریہ تھا کہ ہندو مسلم علیحدہ دو قومیں ہیں۔ ان کے وطن بھی علیحدہ ہونے چاہیئے۔ چنانچہ علاقۂ ہند سے مولانا احمد رضا خانؒ نے ترکِ موالات و دو قومی نظریے کی تحریک چلائی۔ اور علاقۂ پنجاب سے علامہ اقبال نے اسی تحریک کی حمایت میں علیحدہ مسلم ریاست کا خاکہ پیش کیا جس کو بعد میں چل کر پاکستان کا نام دیا گیا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ نے اسی تحریک کے ضمن میں ۱۸۹۶ء کے دوران پٹنہ کے علاقے میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد کی جس میں تمام اہلسنت علماء و مشائخ کو اس اسٹیج پر جمع کیا کہ مسلمانوں کے لیئے علیحدہ ملک ہونا چاہیئے۔ یہ تحریک تاریخی و عملی طور پر اتنی کامیاب ہوئی کہ اس تحریک نے آگے چل کر عملی جامہ پہنانے والے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بصیرت افروز قیادت کے لیئے راہ ہموار کر دی۔ اس دور میں بھی دیوبندی حضرات نے تمام مسلمانوں سے مختلف راہ نکالی اور ہندو نوازی کرتے ہوئے ہندؤں کے ساتھ لگ گئے اور بجائے دین پرستی کے وطن پرستی کو سامنے رکھا۔ مذہبی اختلاف سے کنارہ کش ہوکر ہم قومیت کا پرچار کرتے ہوئے ہندو نعرے کی حمایت میں اپنا اور اپنے فتووں کا زور لگانے لگے۔ اور ہندؤں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے۔ مودودی صاحب ع۲ عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب حسین احمد مدنی وغیرہ لیڈروں نے اپنی اپنی پارٹیاں تشکیل دیں۔ اور سب جماعتوں کو ہندو جماعت میں لگا یا مسلمانوں کی عالم گیر آواز کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اس تشکیل بازی نے بڑے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو ربِّ قدیر جلَّ مجدہٗ نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اس سیلابِ باطل کو روکنے کے لیئے مقرر فرمایا۔ اور آپ نے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لیئے مسلم لیگ مرتب فرمائی۔ مسلم لیگ کی تحریک کے وقت بھی اس سرزمین میں دو ہی جماعتیں تھیں۔ ع۱:۔ بریلوی۔ ع۲ دیوبندی (اگرچہ دیوبندیت کی شاخیں آج تک بہت ہیں) مثلاً مودودیت وہابیت۔ خاکساریت) ان دونوں کا کردار محمد علی جناح کے ساتھ بھی وہی رہا جو سابقہ پہلے دور میں بہادر شاہ اور انگریز کے ساتھ رہا۔ چنانچہ۔ دیوبندیے مسلم لیگ اور اس کے بانی قائدِ اعظم اور نظریۂ پاکستان کے سخت مخالف رہے اور کانگریس کے ساتھ شامل ہوئے:۔ مودودی صاحب نے بھر پور طریقے سے قائدِ اعظم کی مخالفت کی (دیکھو ان کی کتاب سیاسی کشمکش عبد الماجد دریا بادی وہابی نے اپنے ماہنامے سلک جدید میں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کو مشرک لیگ اور مشرکوں کی جماعت لکھا۔ ابو الکلام آزاد نے الہلال رسالے میں قائدِ اعظم بانی پاکستان کے خلاف

جو گستاخانہ زہر اگلا اس کا دہرانا چنداں مفید نہیں۔ سب عوام و خواص کو یہ معلوم ہے۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے بھی دل بھر پاکستان کی مخالفت کی حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ قائدِ اعظم سے گاندھی ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ تھا اس قوم کا کردار دورِ اوّل اور دورِ ثالث میں پہلے انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتے رہے پھر ہندوؤں کی چاپلوسی کو دھرم بنایا مخالف ہوئے تو صرف مسلمانوں کے نقصان پہنچایا تو صرف کس کو؟ اپنوں کو۔ آخر کیوں؟ صرف لالچ میں۔ ابوالکلام نے تو ہندوستان کی وزارت بھی حاصل کرلی۔ اور ان کے مرید خاص ڈاکٹر ذاکر حسین نے صدارت کی لالچ میں مورتی کو سجدہ بھی کرلیا۔ ادھر تو حال تھا دوسری قوم بریلوی لوگوں کی تاریخ اس سے یکسر مختلف ہے چنانچہ مسلمان لیڈر صدرالافاضل سید مولانا نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی ایسی شاندار حمایت کی جو آگے چل کر پاکستان بننے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ قائدِ اعظم کی ہی حمایت اور ہاتھ مضبوط کرنے کے لیئے۔ آل انڈیا بنارس کانفرنس منعقد فرمائی اور اپنے مشیر خاص پیر جماعت علی شاہ علی پوری صاحب کو اپنی پراثر تقریر سے قائل و مائل کیا کہ قائدِ اعظم کی حمایت دراصل اس وقت اسلام کی حمایت ہے۔ صدرالافاضل مولانا نعیم الدین صاحب قبلہ کا یہ خداداد انفرادی ملکہ تھا کہ آپ کی تقریر دلپذیر سخت سے سخت انسان کے دل کو بھی موم کردیتی تھی۔ جیسا کہ حضرت مولانا نعیمی مرادآبادی حال کراچی مدظلہ العالی نے مجھ کو بتایا۔ اس وقت گویا کہ صدرالافاضل قائدِ اعظم کے دستِ راست کی حیثیت سے تھے۔ پیر جماعت علی صاحب کے کہنے سے پیر مانکی شریف پیر مہر علی شاہ صاحب اور تمام برصغیر کے بریلوی علماء و مشائخ مولانا سید نعیم الدین علیہ الرحمۃ کے جھنڈے تلے جمع ہوکر مسلم لیگ کی حمایت میں کمر بستہ ہوئے اور اسی سلسلے میں بنارس کانفرنس منعقد ہوئی جو تاریخ کی پہلی شاندار و کامیاب سنی کانفرنس تھی سنہ ۱۹۴۹ء اس ہی کانفرنس سے جگمگا اٹھا۔ تمام علاقوں سے۔ جلوس کے جلوس بنارس پہنچے۔ حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خاںؒ گجرات سے عظیم قافلے کر بنارس پہنچے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی حمایت میں یہی وہ کانفرنس تھی جس سے ہندوستان بنیا سامراج انگریز سے سودے بازی کرنے والے ہندو لیڈر اور ہندو نواز دیوبندی حضرات بوکھلا گئے۔ اور اس کانفرنس کو خراب کرنے کی کوشش اور شرارت کرنے کا پروگرام بنایا۔ مگر جب کسی طرح حیلہ گری کارگر ہوتی نظر نہ آئی تو پیر جماعت علی صاحبؒ علی پوری کی تقریر کے اس والہانہ محبت کے فقرے پر ہی شور برپا کردیا جو آپ نے دورانِ وعظ قائدِ اعظم جناح کے وقار کی خاطر اُن کو ولی اللہ کہہ دیا تھا۔ اس خطاب پر شرارت کے لیئے آئے ہوئے دیوبندی حضرات نے اتنا شور مچایا کہ خطرہ پڑ گیا کہ کہیں باقی کانفرنس ناکام نہ ہو جائے۔ مگر صدرِ کانفرنس بانیِ محفلِ سنیت صدرالافاضل سید نعیم الدین کی پراثر صلاحیتوں خطاباتِ دلنواز کا اثر تھا کہ تین گھنٹے بعد یہ شور ختم ہوا اور کانفرنس کامیابی سے

جاری ہوئی یہی وہ کانفرس تھی جس سے مسلمانوں کے دل میں عشق کی حد تک مسلم لیگ سے محبت پیدا ہوئی۔ اور چودہ کروڑ مسلمان کا ووٹ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کو ملا۔ موازنہ صرف یہ کرنا ہے کو بریلوی علماء ومشائخ عظام قائدِ اعظم کے ساتھ کیوں لگے اور دیوبندی لوگوں نے اور وہابی لیڈروں نے مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی مخالفت کیوں کی۔ ظاہراً وجہ صرف یہی ہے کہ قائدِ اعظم کے پاس صرف ایک ہی نعرہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس بے بارک نڈر بے لوث مخلص محسن شخصیت نے صرف یہی تو کہا تھا کہ پاکستان میں قانونِ محمدی کا جھنڈا گاڑھا جائے گا۔ جو اُن سے ملا وہ بھی اسی نعرے کی وجہ سے اور جو اُن کا مخالف ہوا وہ بھی اسی نعرے کا مخالف تھا۔ یہی نعرہ قائدِ اعظم کو کامیاب کرا گیا رہتی دنیا تک عزت بڑھا گیا۔ ورنہ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ کبھی کسی نے اس طرح نظریاتی طور پر ملک نہیں بنایا۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ بنیادِ پاکستان میں قائدِ اعظم کا کمال نہیں بلکہ نامِ پاکِ احمد مجتبےٰ کا کمال ہے صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔ ورنہ کون کسی کی خاطر بچے کٹاتا ہے گھر بار لٹاتا ہے۔ وطن گنواتا ہے۔ خون بہاتا ہے۔ یہ تو شانِ پاک مصطفےٰ ہی کا کرشمہ ہے کہ۔

ع۔ سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

ہاں قائدِ اعظم کا جذبہ قابلِ فخر ہے اور ان علماء ومشائخ بریلویہ کا مخلصانہ ساتھ وحمایت قابلِ ذکر ہے۔ جس سے تاریخِ پاکستان درخشندہ اور جس کی بنا پر قائدِ اعظم محسن بن گئے۔ یہ تھے تین دور جن میں دیوبندی کردار تاریخی طور پر معاندانہ ومخالفانہ ہی ثابت ہوئے۔ یہ ذکر ضمناً ہو گیا ورنہ اصل مقصود درمیانی اور دوسرے دور کا تذکرہ ہے۔ کیونکہ مستفتی کے مرسلہ رسالے کے دیباچہ میں اسی دور کا ذکر کیا گیا ہے اور تاریخ سے بالکل ہٹ کر اسی چیز کا انکار کیا گیا ہے۔ جس کو ان ہی کے اکابر کی محررہ تاریخ فخریہ پیش کر رہی ہے میں نے مندرجہ بالا سطور میں۔ دیوبندی کتب سے ہی ثابت کیا کہ اسماعیل دہلوی اور اس دور کے دیوبندی مرکزی حیثیت رکھنے والے پیشوا یانِ دیوبندیت کا عملی کردار انگریزی حکومت کی محبت اُن سے لگاوٹ اُن کے حکم اور اُن کے چندوں پر ان کی دولتِ برطانیہ پر سکھوں سے جنگ رہی مجھ کو اس تفتیش میں باوجود کوششِ بسیار کے ایک کتاب بھی ایسی نہ ملی۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ دیوبندی لیڈر انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑے ہوں۔ ہاں البتہ مزید یہ ثابت ہوا کہ وہابی ٹولہ انگریز کے حکم سے صرف سکھوں سے برسرِ پیکار رہا بلکہ مسلمانوں سے بھی انگریز کو مضبوط کرنے کے لیئے لڑا اور تمام مسلمان ان جنگجو وہابیوں کو انگریز کا جاسوس سمجھتے تھے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل چند اس ہی زمانے کی خود اُن کی ہی تاریخی تصنیفات سے بہ واضح ہو رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ع۱۔ مکتوب محمد اسماعیل دہلوی سید احمد کتاب سید احمد شہید کے مکتوبات ص۲۴ لکھتے ہیں۔

یہاں یعنی سرحد میں دو معاملے درپیش ہیں ایک تو مفسدوں مخالفوں کا ارتداد ثابت کرنا اور قتل و خون کے جواز کی صورت نکالنا۔

ع۲ :۔ مکتوبات سید احمد شہید ص۱۳۵ ، مکتوب بنام سردار میر عالم میں لکھتے ہیں :۔

منافقین کے ساتھ جہاد کرنا ایک واجب معاملہ ہے اس لیئے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب و جوار میں بدکردار (پٹھان) منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے۔

ع۳۔ تاریخ تناولیاں ص۲۹ پر لکھا ہے۔

القصہ پھر تو خلیفہ نے پائندہ خان سرحدی پٹھانوں کے امیر کے خلاف فتوئے کفر دے کر محمد اسماعیل کے لشکر کے ساتھ مل کر پائندہ خان سے جنگ کا ارادہ و تیاری کی :۔

ع۴ :۔ سید احمد شہید ص۵۶ بنام شاہزادۂ کامران

جب امامت کا کام پورا ہو گیا تو شاہ صاحب نے منکرین امامت کو باغی اور واجب القتل قرار دیا۔

ع۵ مکتوبات سید احمد شہید ص۵۶ بنام شاہزادۂ کامران۔

سوالنامہ آپ نے تو سکھوں سے جنگ کرنی تھی وہ تو پنجاب میں ہیں آپ لوگ یہاں سرحدی مسلمانوں کے علاقوں میں مستم ٹھکرے کیوں آئے ۔جواب نامہ مکتوب۔ چونکہ ان منافقوں نے سرکشوں کی حمایت کی ہے اس لیئے ان کی گوشمالی ضروری ہے اور پہلے جہاد ان مسلمانوں کے خلاف کیا جائے اور یہاں سے فراغت کے بعد پنجاب کے سکھوں سے بات ہو گی۔

ع۶ :۔ کتاب فریاد مسلین ص۱۶ پر ہے :۔

جب سرحدی پٹھان مغلوب نہ ہوئے تو ایک دن بہت سے ملکی جمع کر کے مولوی اسماعیل صاحب خود اُن کے مقابل گئے مد مقابل پٹھان یوسف زئی جرگہ تھا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی مولوی صاحب کی پیشانی پر ایک یعقوب نامی یوسف زئی پٹھان کی گولی لگی۔ اور شہید ہو گئے۔

ع۷ :۔ مضمون الجیہ ہسپانیہ کے عوامل از یوسف جبریل ۔ یہ مضمون روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اگست ۱۹۷۶ء میں بھی چھپا تھا۔ اس کا ایک فقرہ اس طرح ہے۔

اسماعیل شہید جیسے لوگ سر سے کفن باندھ کر نکلے لوگوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے آئے۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی سے شہید ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے :۔

ع ۸ :۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کا مقدمہ کتاب کابل میں سات سال مصنف عبداللہ سندھی صـ۱۶ پر لکھا ہے :۔
بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہید اور ان کے ساتھی شہید کر دیئے گئے اور خود آزاد قبائل میں سے بعض لوگوں نے ہندوستانی مجاہدین کو لوٹا گھسوٹا اور قتل کیا ۔

ع ۹ مقالات سرسید حصہ نہم صـ۱۳۹ پر لکھا ہے :۔
ہندوستان کے گوشۂ شمال و مغرب میں سرحد پر جو پہاڑی قومیں رہتی ہیں وہ سنی المذہب حنفی قومیں ہیں چونکہ یہ پہاڑی قومیں سید احمد و اسماعیل دہلوی کے عقائد کی مخالف تھیں اس لیے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے اور انہوں نے ہی مولوی اسماعیل صاحب و سید صاحب کو شہید کر دیا :۔

ع ۱۰ :۔ کتاب علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صـ۲۴۵ پر لکھتے ہیں ۔
خود مسلمانوں کے ہاتھوں سید صاحب کے غازیوں کے بڑے حصہ کو ایک ہی رات میں ذبح کروایا

ع ۱۱ :۔ الحیات بعد الممات صـ۲۰۲ پر لکھا ہے ۔
اس بے وفا قوم نے عین حالتِ جنگ میں بے وفائی کی جس سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اور منافقوں نے مولوی اسماعیل صاحب کو شہید کر دیا وہ ۱۲۴۶ھ کو ۲۴ ذیقعد ترپن سال کی عمر میں شہید ہوئے :۔
ان تمام حوالاجات سے واضح ثابت ہوا کہ وہابی لوگ اس وقت بھی حنفی مسلمانوں کو مرتد۔ منافق۔ مشرک بدعتی کہتے رہے اور ان پر کفر کا فتوائے لگا کر ان کو قتل کرتے رہے ۔ اور یہ کہ اسماعیل دہلوی وغیرہ کے نزدیک نہ مسلمان پیارے تھے نہ ہم وطن ۔ اُن کے پیارے تو صرف انگریز تھے ۔ کیونکہ وہ دولت مند اور خوبصورت تھے ۔ اور اُن کا سورج چڑھ رہا تھا اور یہ وہابی ہوئے تاریخی ۔ دولت اور چڑھتے سورج کے پجاری سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر مسلمانوں نے اِن وہابی لشکروں کا ساتھ کیوں نہ دیا ۔ یہ بھی خود اُن کی زبانی سنیئے :۔

ع ۱ حاشیہ مقالات سر سید حصہ سولھواں مصنف محمد اسماعیل پانی پتی صـ۲۵۱ پر لکھا ہے ۔
جب حضرت شہید بعزم جہاد صوبہ سندھ اور سرحد کے علاقے میں داخل ہوئے یہ صوبے اس وقت انگریزی کی عملداری میں نہ تھے ۔ تو ان کے متعلق عام طور پر یہ شبہ کیا گیا کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں ۔ اور یہ شبہ اس لیئے کیا گیا کہ حضرت شہید کے تعلقات انگریزوں سے نہایت درجہ خوشگوار تھے :۔

ع ۲ :۔ کتاب سید احمد شہید حصہ دوم مصنف غلام رسول مہر وہابی صـ۲۸ پر لکھتے ہیں :۔
سرحد کے حنفی علماء نے یہ فتوائے دیا کہ ۔ وہ (یعنی مولوی اسماعیل شہید اور سر سید احمد شہید) ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں ۔ ایک نیا دین انھوں نے نکالا ہے کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے

سب کو برا کہتے ہیں انگریزوں نے انہیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے ان کی باتوں میں نہ آنا عجب نہیں تمہارا ملک چھنوا دیں۔

ع۳ کتاب سید احمد شہید مصنف غلام رسول مہر ص۲۹۷ پر لکھا ہے۔

کار دمیں جوان شاہ۔ سید صاحب سے ملاقات کے لیے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطور نذر پیش کیا۔ انہی سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں اسی لیے بد کہتے ہیں۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہوئی کہ مسلمان کیونکر وہابیوں سے متنفر ہوئے۔ اس کا سیاسی پس منظر یہی تھا کہ ان کے انگریزوں سے خوشگوار تعلق تھے۔ اور یہ خوشگواری اس حد تک تھی کہ جو انگریز سے نفرت کرتا یہ وہابی لوگ اس کو مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے اور باقاعدہ جنگ کرتے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ثابت کر دیا اور جو انگریزوں سے جنگ کرتا تو یہی وہابی اس سے نفرت کرتے اس کے خلاف کفر۔ شرک کے فتوے دیتے جیسا کہ ابھی ان ہی کی کتب سے ثابت کیا جائے گا۔ چنانچہ ع۱ حاشیہ مقالات سر سید حصہ سولہواں مصنف و مرتب محمد اسماعیل پانی پتی ص۳۵۲ پر لکھا ہے۔

۱۸۵۷ء میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب علمائے کرام تھے جو عقیدۃً حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسماعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنہوں نے حضرت شاہ اسماعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں۔

ع۲۔ ترجمان وہابیہ از نواب صدیق حسن وہابی ص۵۵

انگریزوں سے جنگ کرنے والے اور جہاد کا فتوےٰ دینے اور مہر لگانے والے غالباً وہی لوگ تھے جو اہلِ سنت اور اہلِ حدیث کو زبردستی وہابی کہتے ہیں۔

ع۳ الاقتصاد فی مسائل جہاد مطبوعہ قاسمی پریس دہلوی ص۴۹ پر لکھا ہے

۱۸۵۷ء میں جو مسلمان انگریز کے خلاف جنگ لڑے وہ سخت گنہگار۔ اور بحکم قرآن و حدیث وہ مفسد۔ باغی اور بدکردار تھے۔ سمجھ دار لوگ اس میں ہرگز شریک نہ ہوئے۔

ع۴۔ تذکرۃ الرشید حصہ اوّل از عاشق الٰہی میرٹھی ص۷۳ پر لکھا ہے۔

بعض کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی (انگریزی حکومت) کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل حکومت گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم اٹھایا۔ اور قائم کیا۔

یہ تھی میری وہ تحقیق جو تاریخی طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دی تاکہ غیر جانب دارانہ طور پر

یہ ثابت ہو جائے کہ مذکورہ فی السّوال صاحبِ تحریر کا یہ نعرہ قطعاً غلط اور جھوٹ ہے کہ وہابیوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جنگ کی۔ صرف زبانی باتیں کرنے سے تو کوئی کسی کو نہیں روک سکتا البتہ تاریخ و ہدایت بتاتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ کلمہ گو مسلمانوں کو کافر، مشرک، بدعتی کہہ کر قتل کیا۔ یہ اتنے کثیر حوالے محض اس لیئے دئے گئے کہ رسالے کا پورا جواب ہو اور اتمامِ حجت ہو جائے۔ ورنہ انگریزی دور میں ان کا کافر انگریز کا ساتھ دینا اور پٹھان مسلمانوں سے جنگ کرنا اور برِ صغیر کے مسلمانوں کو قتل کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ ایسی غداریوں اور بغاوتوں سے اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے یہی ہیں وہ لوگ جن کا پہلا نام خارجی (دیکھو فتاوٰے شامی) دوسرا نام نجدی۔ (دیکھو حدیث پاک) تیسرا نام وہابی چوتھا نام دیوبندی۔ یہ بھی میں جانتا ہوں میری اس صاف صاف باحوالہ اور غیر متعصبانہ تحریر کو یہ تسلیم نہ کریں گے۔ مگر باانصاف لوگ اس حقیقت سے رو گردانی نہیں کر سکتے۔ آج اگر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم انگریز کے دشمن ہیں تو فقط اس لیئے کہ انگریز یہاں موجود نہیں اور آج پھر انہیں پاکستان کی کرسی کی طلب ہے۔ یہ پاکستان کی عوام اور حکومت کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اس قوم کا محاسبہ نہیں ہوا۔ اب رہے وہ اعتراضات جو ضمناً صاحبِ رسالہ نے بریلوی گروہ پر وارد کیئے۔ اُن کے جواب حسبِ ذیل ہیں:۔

پہلا اعتراض:۔ کہ بریلوی لوگوں نے معاذ اللہ نبی کریم کو شکاری اور دھوکے باز کہا۔ جواب یہ اعتراض اتنا کمزور بلکہ متعصبانہ جاہلانہ اور گستاخانہ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کا قطعاً جواب نہ دیا جائے۔ لیکن چونکہ خاموشی سے عوام غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہٰذا کچھ فہمی کی وضاحت ضروری ہے۔ اس اعتراض میں تعصب تو یہ ہے کہ معترض وہابی صاحب نے جو حوالہ جاء الحق صـ۱۷۵ کا پیش کیا وہاں لفظ دھوکے باز نہیں ہے۔ یہ لفظ وہابی صاحب نے اپنے پاس سے لگایا جو سراسر خیانت ہے اور جاء الحق میں صراحتاً کہیں بھی نہیں لکھا کہ نبی کریم شکاری ہیں۔ بلکہ محض تشبیہ ہے۔ اور تشبیہ اصل حقیقت نہیں ہوتی جس طرح دن رات کہا جاتا ہے کہ زید مثل شیر کے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بہت جگہ تشبیہات پیش فرمائی ہیں اور تشبیہ پر اعتراض کرنا یہودی کفار کا طریقہ ہے۔ جیسا کہ پہلا سیپارہ وضاحت فرماتا ہے۔ وہابی معترض کی گستاخی یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ والہٖ وسلم کو کس طرح بے باکانہ طریقے سے بلا جھجک دھوکے باز کی نسبت دے رہا ہے۔ اِن ظالموں کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ جس پر اعتراض کر رہا ہے اس کی کتاب میں اس لفظ کا شائبہ تک نہیں اور یہ خود اپنے پاس سے یہ کفریہ لفظ بڑھا رہا ہے تو گویا اس گستاخی کا خود اسی معترض کو شوق ہے۔ اس اعتراض میں جہالت و حماقت یہ ہے کہ شکار کرنا دھوکے بازی نہیں اور شکاری کو دھوکے باز کہنا شرعاً گناہ ہے۔ قرآن مجید کے خلاف ہے اور تمام اہلِ علم اور اہلِ لغت اس کی تردید کرتے ہیں:۔ باری تعالےٰ ربّ العزّت قرآنِ پاک کی پانچویں سورت مائدہ کی آیت ۲ میں ارشاد فرماتا ہے:۔

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ (ترجمہ)۔ اور حاجیو جب تم احرام سے کھل جاؤ تو شکار کرو۔ اس آیت میں شکار کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ صیغہ امر کا ہے۔ یہ امر اگرچہ استحبابی ہے مگر حکم ہے کس کو؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کو اور تمام مسلمانوں کو تا قیامت۔ یعنی شکار کرنا مستحب ہے جس کا حکم خود اللہ فرماتا ہے۔ کہ شکار کرو۔ اگر معاذ اللہ شکار کرنا دھوکے بازی ہے جیسا کہ وہابی معترض نے کہہ دیا۔ تو گویا معاذ اللہ اللہ کریم نے دھوکے بازی کا حکم دیا۔ اور نبی کریم و صحابہ کو دھوکے بازی کی اجازت مستحب کر دی۔ کیسی کفریہ حماقت ہے۔ بریلویوں کو برا کہتے ہو نادانی تو خود آپ کی ثابت ہو گئی اور قرآن پاک کی گستاخی تو آپ نے کر دی۔ خیال رہے کہ شکار کا لغوی ترجمہ ہے کسی کو اپنے ساتھ مائل کرنا۔ چنانچہ مشہور لغت المنجد ی عربی مصری ص۴۵۶ پر ہے:۔ صَادَ زَیْدًا اَیْ جَعَلَہٗ اَصِیْدًا اَیْ مَائِلَ الْعُنُقِ۔ (ترجمہ)۔ شکار کیا اس نے زید کو یعنی مائل کر لیا اس نے زید کو گردن سے اپنی طرف۔ تمام اہل علم اسباب پر متفق ہیں کہ کسی کو ایک راہ سے ہٹا کر دوسری راہ پر لانا چار طریقے سے ہوتا ہے۔ ۱۔ اچھی راہ سے ہٹا کر بری راہ پر لانا۔ اضلال ہے یہ حرام ہے ۲۔ کسی کو اچھا راہ بتانا ہی نہ بلکہ برے راہ کی ایسی تعریف کرنا کہ چلنے والا اس کو اچھا سمجھے یہ اخداع ہے یہ سخت گناہ ہے بلکہ یہ سخت گناہ ہے بلکہ یہ بھی حرام ہے ۳۔ کسی کو برے راہ سے ہٹا کر اچھے راہ پر لانا یہ تدبیر ہے یہی ایمان ہے۔ کسی شلاشی کو اچھے راہ کی خوبیاں سنا کر اچھے راہ پر لے آنا۔ یہ حیلہ ہے اسی کو ہدایت کہتے ہیں۔ بس یہی چار طریقے ہیں کسی کو اچھی بری طرف مائل کرنے کے۔ اضلال۔ اخداع۔ تدبیر۔ حیلہ اردو میں اس کے ترجمے ہیں ۱۔ گمراہ کرنا ۲۔ دھوکا دینا ۳۔ تدبیر کرنا۔ ۴۔ حیلہ کرنا۔ شریعت میں پہلے دو کام ناجائز ہیں اور دوسرے دو کام جائز و ضروری ہیں۔ دھوکا دینا ہر شریعت ہر قانون ہر رواج اور ہر معاشرے میں سخت ترین عیب اور گناہ ہے۔ بجز کافر بحالت جنگ کے علاوہ کبھی دھوکا دینا جائز نہیں بدیں وجہ دھوکے باز انسان ہر معاشرے میں برا سمجھا گیا۔ اضلال یعنی گمراہ کرنا اور کسی کو غلط پٹی پڑھانا دینی اور مذہبی لحاظ سے قابل نفرت کام ہے۔ لیکن تدبیر کرنا اور اسی طرح کسی کام کا حیلہ کرنا ہر قانون میں ہر وقت جائز ہے۔ فقہاء کرام ہر بری چیز سے بچنے کے لیے عوام کو بچانے کے لیے بے شمار شرعی حیلے بیان فرماتے ہیں۔ اور اس کا نام رکھا کتاب الحیل سے یعنی حیلوں کی کتاب پنجابی مقولہ مشہور ہے۔ کہ حیلے رزق بہانے موت۔ یعنی رزق حیلوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور موت بہانے سے آتی ہے۔ ثابت ہوا کہ حیلہ کرنا بالکل جائز ہے اور حیلہ والا شخص قابل قدر ہو سکتا ہے قابل نفرت نہیں۔ جب یہ سمجھ لیا تو یاد رکھو اہل علم و اہل لغت کے نزدیک شکار کرنا اور شکاری ہونا دھوکے بازی نہیں بلکہ حیلہ کرنا ہے۔ چنانچہ المنجد عربی مصری ص۴۵۲ پر ہے:۔ وَاصْطَادَ الطَّیْرَ قَنَصَہٗ وَاَخَذَہٗ بِحِیْلَۃٍ۔ (ترجمہ)۔ اور شکار کیا اس نے پرندے کو یعنی حیلے

سے پکڑنا ۔ ثابت ہوا کہ شکار کرنے کا مطلب ہے حیلے سے پکڑنا اور حیلہ تو ہر طرح جائز ہے ۔ کیونکہ حیلے کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اپنے اس حق کو جو حاصل نہ ہو رہا تھا تو کسی تدابیر سے حاصل کر لینا ۔ ساری مخلوق حیوانات و جمادات و نباتات چرند پرند ۔ درند ۔ بحری و برّی انسان کے لیئے اور تمام انسان انبیاء کرام کے لیئے پس جس طرح انسان کو شرعاً ہر طرح حیوانات برّیہ و بحریہ کا شکار جائز ہے ۔ اسی طرح انبیاء کرام کو جائز ہے کہ جہنم کی وادیِ بیابان کی طرف دوڑتے وحشی انسانوں کو شکار کر کے شریعت کے جال میں جکڑ کر معرفت کے سنہری پنجروں میں بند کریں اور جنت کے محلوں کی طرف لے جاتے ہوئے عالمِ لاہوت کے باغوں میں چھوڑ دیں کہ کہیں انوار و تجلیات کے بحر انوار میں غوطے لگائیں اور کبھی مشاہداتِ اسرار کے میوے کھائیں ۔ یہ وہ پیارا شکار ہیں اور یہ وہ دل نواز شکاری ہیں کہ

ع ، ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف ۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

یہی وہ شکار ہے کہ عرب کے صحرائیوں کو پکڑ کر ۔ صدیق و فاروق ۔ اسد اللہ و سیف اللہ بنا دیا ۔ کیا ہم اس شکار ہونے پر ناز نہ کریں کیا شکار کر کے پکڑنے والے اور دامنِ رحمت سے باندھنے والے کا احسان نہ مانیں ۔ ہم وہی وحشی تھے ۔ سے جو

۔ آزردہ پھر رہے تھے ہم اس کائنات میں ۔ ہم بےکسوں کی بات بنائی حضور نے (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

بدنصیب وہابی اس کو دھوکا بازی کہتا ہے ۔ جب جسمانی شکار اور حیوانات کا شکار جائز ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بہت شکار کھیلتے تھے دیکھو تاریخ اور قصصِ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تفاسیر قرآن کریم حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو شکار کرنے کی اجازت دی ۔ تو انسانوں کی بہبود کے لیئے انسانوں کا شکار کیوں منع ہوگا ۔ بہت سے صحابہ کبار بھی شکاری تھے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی نے جسمِ حیوانی کو شکار کیا مگر پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہ وبارک وسلم نے دلوں کا شکار کیا کاش ہم بھی آپکے شکار ہو جائیں ۔ دوسرے اعتراض کا جواب معترض کہتا ہے کہ جاء الحق صا ۹۱ پر لکھا ہے ۔ بحث علم غیب میں اے کافروں میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں ۔ اس عبارت پر وہابی معترض اپنا مطلب نکالتے ہوئے ۔ بریلوی لوگوں کو ہدفِ تنقید بنانے کی غرض سے لکھتا ہے ۔ (کہ نبی کریم نے اپنے خزانے بچانے کے لیئے کفار کے سامنے جھوٹ بولا کہ میرے پاس خزانے نہیں ہیں ۔ میں ان دریدہ دہنوں بریلویوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا مختار کل عالم الغیب اور حاضر ناظر کا مال چوری ہو سکتا ہے ۔ اور اس عبارت میں تم نے چوروں کی طاقت حضور اکرم سے زیادہ تسلیم نہیں کر لی ۔) یہ تھی معترض کی عبارت جو اُس نے بلا جھجک نڈر ہو کر پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف جھوٹ ۔ منسوب کر دیا ۔ ایسی بات لکھتے ہوئے مومن کا قلم کانپ جاتا ہے ۔ جاء الحق میں نہیں

کھا کہ معاذ اللہ ۔ ہمارے آقا نے کفار کے سامنے جھوٹ بولا اور کیسے لکھ سکتے تھے بھلا کس کی جرأت ہو سکتی ہے بریلوی علماء تو درکنار عوام بھی ایسی گستاخی سے کانپ جائیں یہ جرأت تو تاریخ نے وہابیوں کی ہی ثابت کی ہے کہ بغیر معاذ اللہ کے اس طرح کی گستاخی لکھنے میں بے باک ہیں ۔ وہابی معترض یہ اعتراض اس آیت کی تفسیر پر کر رہا ہے جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۔ سورۂ انعام کی آیت پ۷ ع۱۵ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۔ سے متعلق جاء الحق حصہ اول ص ۱۴۰ پر فرمائی ہے ۔ میں یہاں اس آیت کی لمبی چوڑی تفسیر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ مفسرین کرام نے بہت تفسیریں فرما دیں ہیں ۔ میں مندرجہ ذیل چند سطور میں معترض کی چند خامیوں کا علمی طور پر ذکر کروں گا جس سے اعتراض کی کمزوری اور معترض کی جلد بازی ۔ حماقت ۔ جہالت اور کج فہمی ثابت ہو جائے گی ۔ اس اعتراض سے بھی مصنف کا مقصد محض عوام کمیٹر کا فریب دینا ہے ۔ بریلویوں کو بدنام کرنا ورنہ حقیقت کچھ نہیں نہ اس تفسیر سے معاذ اللہ جھوٹ ظاہر ہوتا ہے نہ کمزوری ۔ نہ عجز نہ ہی نبی اکرم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مختار کل ۔ غیب دانی ۔ اور حاضر و ناظر پر فرق آسکتا ہے ۔ یہ آیت بھی اپنی جگہ بالکل اسی تفسیری آن بان کے ساتھ نیر تاباں ہے ۔ جو حکیم الامت نے تفسیر کی اور پیارے آقا علیہ السلام مختار کل ۔ غیب دانِ کائنات ۔ حاضر و ناظر بھی بعطاءِ الٰہی تا قیامت ہیں ۔ صرف دیدہ کوری تو نصیب وہابیان و دیابنہ ہے ۔ اعتراض دوم میں خامیاں ہیں ۔

پہلی خامی :۔ یہ کہ اس اعتراض میں ایک خیانت ہے وہ یہ کہ جاء الحق میں کہیں بھی جھوٹ کا ذکر تک نہیں معترض نے خود اپنا مطلب نکالنے کے لیے جھوٹ بولنے کا لفظ بڑھا کر خیانت کی :۔

دوسری خامی :۔ یہ کہ معترض نے نہایت ڈھٹائی بے حمیتی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پاک باز مقدس ہستی کے متعلق خود اپنے الفاظ میں جھوٹ بولنے کی نسبت کر کے بدترین گستاخی کی ۔ مگر یہ گستاخی ان سے متعجب نہیں کیونکہ ان کے اکابر نے تو خدا تعالیٰ کو بھی جھوٹ سے ملوث کر دیا ۔ :

تیسری خامی :۔ تیسری خامی یہ کہ معترض وہابی صاحب اس آیت کی اس تفسیر پر تنقید کرتے ہیں جو مبلغِ عالم حضرت حکیم الامت نے جاء الحق میں فرمائی ہے ۔ حالانکہ یہ تفسیر بالرائے یا ذاتی نہیں بلکہ حدیث پاک ۔ قرآن کریم اور شانِ نزول و منشاءِ باری تعالیٰ کے عین مطابق ہے جیسا کہ دیگر آیات سے ثابت ہو رہا ہے ۔ یہاں تک کہ تمام مفسرین بھی اسی سے ملتی جلتی تفسیر فرماتے ہیں ۔ زیر آیت سورہ انعام پارہ ہفتم کے آیت ۵۱ پر ہے ۔ اسی طرح کی آیت سورہ ہود پارہ بارہواں آیت ۳۱ پر بھی ہے ۔ مگر چند فرقوں سے ۱ یہاں نبی کریم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو فرمانے کا حکم دیا گیا لہٰذا قل سے شروع فرمایا قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ ۔ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۔ اس آیت

میں حضرت نوح علیہ السلام کا قول نقل فرمایا گیا۔ ع۲ یہاں دو جگہ لکم ہے وہاں ایک جگہ۔ جاء الحق کی مذکورہ تفسیر کا دارو مدار لفظِ لکم پر ہے اور لَآ اَقُوْلُ پر لفظِ لکم نے۔ لَآ اَقُوْلُ کی حد بندی کر دی اور آیت پاک کو مقید کر دیا اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مضمونِ آیت خبر نہ رہا بلکہ دعوے بن گیا اور یہ خطاب سب کو نہ رہا بلکہ صرف کم ضمیر کے مرجع کو خطاب ہوا اور وہ کفارِ مکہ کیونکہ یہ آیت مکی ہے آیت اتنی صاف اور واضح طور پر بتا رہی ہے کہ صرف کافروں سے کہا جا رہا ہے۔ لَآ اَقُوْلُ لَکُمْ میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے اور علمِ غیب ہے۔ چوتھی خامی یہ کہ ہمارا معترض بالکل علم سے خالی ہے۔ اس کو نحو۔ صرف علم اصول و معانی سے کوئی لگاؤ نہیں یہ جہالت ہی ہے کہ دیوبندی بن کر اس طرح کے احمقانہ اعتراض کرتا ہے بلکہ وہابی بننا ہی جہالت ہے۔ اور اس تفسیر پر معترض ہے جو تمام مفسرین کے فرمودات سے ماخذ ہے۔ چنانچہ تفسیر مدارک جلد دوم صفحہ ۱۴ پر ہے۔ لَآ اَقُوْلُ لَکُمْ اَیْ لَآ اَدَّعِیْ۔ تفسیر روح المعانی جلد چہارم پارہ ہفتم صفحہ ۱۵۵ پر ہے۔ وَالْمَعْنٰی لَآ اَدَّعِیْ اَنَّ هَاتِیْکَ الْخَزَائِنَ مُفَوَّضَۃٌ اِلَیَّ (ترجمہ): لَآ اَقُوْلُ کا مطلب ہے کہ میں دعوے نہیں کرتا اس کا کہ میرے پاس اللہ کے مقدورات کے خزانے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ اصولی طور پر دعوے اور خبر میں بہت فرق ہیں پس آیت کریم کا دعوے کی نفی ہے نہ کہ حقیقت کی یہ مطلب لفظِ لکم سے ثابت ہوا یعنی صرف کفار کے سامنے دعوے کی نفی فرمائی گئی نہ کہ مسلمانوں کے سامنے لکم نے اس خطاب کو مقید کر دیا اگر یہ جملہ خبریہ ہوتا تو لکم کی قید نہ ہوتی کیونکہ خبر عام ہوتی۔ تمام مفسرین کا یہی قول ہے چنانچہ تفسیر معانی التنزیل خازن جلد دوم صفحہ ۱۶ پر ہے۔ قُلْ لَآ اَقُوْلُ لَکُمْ یَعْنِیْ قُلْ یَا مُحَمَّدُ لِھٰؤُلَآءِ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (ترجمہ): یعنی اے حبیب کریم ان مشرکوں سے خزائن الٰہیہ کی بابت اس طرح گفتگو فرماؤ اور علم غیب کے متعلق بھی ان کو نہ بتاؤ۔ یہ تعلیم حکم رب نے سکھایا۔ کیوں سکھایا اس کی بڑی وجہ تو وہی ہے جو حضرت حکیم الامت نے اپنی تفسیر میں جاء الحق کتاب کے صفحات میں بتائی یہی تفسیر قرآن پاک کی دیگر آیات سے مطابقت رکھتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی وجہ تواضع انکساری فرمائی۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن جلد دوم صفحہ ۱۶ پر ہے۔ وَاِنَّمَا نَفٰی عَنْ نَفْسِہِ الشَّرِیْفَۃِ ھٰذِہِ الْاَشْیَاءَ تَوَاضُعًا لِلّٰہِ تَعَالٰی۔ (ترجمہ): نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے اپنے سے تین چیزوں کی نفی صرف بارگاہِ الٰہی میں انکساری کرتے ہوئے فرمائی نہ کہ حقیقتاً کیونکہ اصلاً آپ کے پاس خزانے بھی ہیں غیب ذاتی بھی ہے۔ اور ملکی صفات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بلکہ جبرائیل و میکائیل علیہما السلام سے زیادہ صفاتِ ملکیہ نبی کریم کے اندر ہیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد سوم صفحہ ۳۵ پر ہے۔ فَمَنْ قَالَ اِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ لَا یَعْلَمُ الْغَیْبَ فَقَدْ اَخْطَأَ

فِيمَا اَصَابَ وَلَا اَقُوْلُ اِنِّي مَلَكٌ - وَاِنْ كُنْتُ عَبَرْتُ عَنْ مَقَامِ الْمَلَكِ - (ترجمہ) :- جو گستاخ یہ کہے کہ بے شک نبی اللہ غیب نہیں جانتے اس نے حقیقت کے خلاف غلط کہا اور آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان لَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّي مَلَكٌ یہ بھی تواضعاً ہے کہ میں فرشتہ نہیں اگرچہ میں قوت میں مقام ملکیت سے بھی عبور کر گیا (معراج کی رات) یہ تھیں مسلمان مفسّروں کی تفاسیر۔ جو سراسر وہابی حضرات کے خلاف ہیں کیونکہ وہابی کہتے ہیں کہ نبی کریم معاذ اللہ کچھ نہیں جانتے نہ آپ کے پاس خزائن الٰہیہ ہیں۔ اور ثبوت کی آیاتِ کثیرہ واحادیث متعددہ سے یکسر کور چشمی کر جاتے ہیں وہابی حضرات اس آیت کو جملہ خبریہ بناتے ہیں۔ یہ ان کی جہالت ہے کیونکہ اس میں رب تعالیٰ کی بھی گستاخی ہے کہ اسی ذاتِ پاک نے یہ کہنے کا حکم دیا۔ اس کو جملہ خبریہ ماننے سے تمام ان آیات کا انکار لازم آئے گا جس میں رب تعالیٰ نے نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غیب کے ثبوت کا ذکر فرمایا۔ معترض کا اس تفسیر میں جھوٹ کا احتمال پیدا کرنا بھی نادانی ہے کیونکہ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ جملہ انشائیہ ہے۔ یعنی میں نہیں بتاتا تم کو۔ یہاں تم کو بتانے کی نفی ہے۔ لفظِ لکم نے اس کی خبریت کو بطرفِ انشائیت منتقل کر دیا۔ جس سے یہ جملہ انشائیہ بن گیا۔ قانون شریعت میں انشاء کی دس قسمیں ہیں ۱ امر ۲ نہی ۳ استفہام ۴ تمنی ۵ ترجی ۶ عقود ۷ نداء ۸ عرض ۹ قسم ۱۰ تعجب۔ مرقات منطق ص ۱۰ پر اور تمام کتب نحاۃ میں اسی طرح ہیں۔ بہت سے موقعوں پر خبر کو انشاء بنانا پڑتا ہے۔ چنانچہ علم فصاحت کی کتاب مختصر المعانی صفحہ نمبر ۲۰۸ پر ہے :-

وَلِاَنَّ اَكْثَرَهَا فِي الْاَصْلِ اَخْبَارٌ نُقِلَتْ اِلَى مَعْنَى الْاِنْشَاءِ - (ترجمہ) :- اور اس لیئے کہ اکثر جملے خبریے جملے انشائیے بنا دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں لَا اَقُوْلُ لَكُمْ میں بھی۔ جملہ انشائیہ میں منتقل کرنے کے بہت طریقے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ خبریت کو کسی نسبت سے مقید کر دیا تو وہ جملہ انشائیہ بن جاتا جیسے میں نے خریدا میں نے بیچا۔ میں نے نکاح کیا۔ میں نے طلاق دی۔ ان تمام جملوں میں ظاہراً خبریت ہے مگر چونکہ خریدنے میں بیچنے والے کی نسبت ہے۔ بیچنے میں گاہک کی نسبت۔ نکاح میں منکوحہ کی نسبت طلاق میں مطلقہ بیوی کی نسبت اشد ضروری بدیں وجہ یہ جملہ خبریہ نہیں رہا بلکہ جملہ انشائیہ ہو گیا ان کا نام عقود ہے اسی لیئے شرعی قانون ہے کہ اگر طلاق میں نسبت الی الزوجہ نہ ہو گی صرف خبریت ہو گی تو طلاق نہ پڑے گی۔ پس اسی طرح سمجھ لو کہ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ میں لَكُمْ کی قید اضافی نے اس جملے خبریہ کو انشائیہ بنا دیا اگر یہاں لَكُمْ نہ ہوتا تو انتقالِ انشائیت بھی نہ ہوتا اور عام سب کے لیئے یہ خبر ہوتی مگر لَكُمْ نے بتایا کہ یہ بات صرف کافروں سے ہے چنانچہ تمام مفسّرین نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہی تائید فرمائی جس سے وہابی خائب و خاسر ہوئے تفسیرات اربعہ جلد دوم

صـ۳۱ پر ہے۔ اَلْخِطَابُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَعْنِیْ قُلْ یَا مُحَمَّدُ لِھٰؤُلَاءِ الْمُشْرِکِیْنَ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ۔ تفسیر روح المعانی جلد چہارم صـ۱۵۵ پر ہے:۔ قُلْ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ الْبَشِیْرُ النَّذِیْرُ لِلْکَفَرَۃِ الَّذِیْنَ یَفْتَرِحُوْنَ۔ (ترجمہ):۔ دونوں عبارتوں کا قُلْ میں خطاب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ اے پیارے محمد بشیر نذیر رسول اِن مشرکوں کافروں سے فرما دو کہ وہ کافر جو مجھ سے رازِ الٰہیہ پوچھتے ہو میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس غیب اور اللہ کے خزانے ہیں۔ صاف پتہ لگا کہ یہ عبارت جملہ انشائیہ ہے اور پھر تو ہماری زبان میں بھی بطور خبر نہیں ہوتا۔ دن رات اس طرح مستعمل ہے۔ جا میں تجھ کو نہیں بتاتا کہ میرے گھر میں دولت ہے۔ یہاں تک تو مفسرین کے اقوال مبارکہ جاء الحق کی تائید میں پیش کیے گئے۔ اس آیت کریمہ کا شانِ نزول بھی اسی کی تائید کر رہا ہے:۔ چنانچہ تفسیر خازن جلد دوم صفحہ نمبر صـ۱۴ پر ہے:۔ نَزَلَتْ حِیْنَ اقْتَرَحُوْا عَلَیْہِ الْاٰیَاتِ۔ قَالُوْا لَہٗ اَخْبِرْنَا بِمَصَالِحِنَا وَمَضَارِّنَا فِی الْمُسْتَقْبِلِ:۔

ترجمہ:۔ جب کفار مکہ نے آیتوں کا سوال کیا تب یہ آیت اتری۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو ہمارے نفع نقصان کے زمانۂ مستقبل کے سارے اسرار سمجھا دو بتا دو۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک کو منع فرما دیا کہ ان کو کہہ دو میں تم کو نہیں بتاتا۔ حالانکہ سب خزانے اور علوم غیبیہ آپ کے پاس ہیں جیسا مفسرین فرماتے ہیں چنانچہ روح البیان جلد سوم صفحہ نمبر صـ۲۵ پر ہے:۔ عَلٰی اَنَّھَا عِنْدِیْ وَلٰکِنْ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ (ترجمہ):۔ علاوہ اس بناء پر کہ یہ سب کچھ میرے پاس ہے مگر میں تم کو نہیں بتاتا۔ اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ چونکہ کفار نے اسرار الٰہیہ کے جاننے بتانے کی خواہش کی تھی تو رب نے منع فرما دیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے منع کیوں فرمایا۔ اور بتانے سے کیوں روکا اگر یہ حقیقت کی خبر تھی۔ تو وہ روایت جھوٹی ہوتی ہیں جن میں ارشاد ہے:۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ ۔ اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ۔ صـ۲ اُوْتِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ۔ ترجمہ:۔ مجھ کو زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں مجھ کو جامع کلمات دیے گئے۔ ہم اپنے انبیاء کو آفاق کائنات کی نشانیاں دکھائیں گے۔ اور اگر ان احادیث کو سچا مانا جاتا ہے تو آیت کو غلط کہنا پڑے گا حالانکہ وہ رب تعالیٰ کا حکم۔ جب یہ دونوں محال تو مطابقت واجب اور مطابقت اسی طرح ہو سکتی ہے جس طرح تمام مفسرین اور حضرت حکیم الامت نے فرمائی کہ احادیث اپنی جگہ بالکل صحیح سچی اور آیت کا حکم بھی درست کیونکہ وہ خبر نہیں بلکہ انشاء وہ ہوتا ہے جس میں جھوٹ سچ کا شائبہ نہیں ہوتا نہ ہی تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ کتاب توضیح صـ۲۰۵ پر ہے:۔ اِمَّا خَبَرٌ اِنِ احْتَمَلَ الصِّدْقَ وَالْکِذْبَ اَوْ اِنْشَاءٌ اِنْ لَمْ یَحْتَمِلْ۔ (ترجمہ):۔ جملہ یا خبریہ ہوتا ہے۔ اگر سچ جھوٹ کا احتمال رکھے یا جملہ انشائیہ ہوتا ہے اگر اسی کو سچ جھوٹ سے تعلق کوئی نہ ہو پس معترض کا یہ کہنا

کہ اگر بقول جاء الحق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب اور خزانوں کو کافروں سے چھپایا تو گویا جھوٹ بولا۔ یہ معترض کی جہالت ہے کیونکہ جملے انشائیہ کو جھوٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جاء الحق میں حضرت قبلہ نے لکھا ہے کہ کفار سے خزانے چھپائے گئے اور فرمایا کہ اسے کافرو تم چور ہو اور چوروں سے خزانے چھپائے جاتے ہیں۔ یہ ہی عبارت ہے جس سے معترض وہابی کو دکھ پہنچا کہ کافروں کو چور کیوں کہہ دیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جاء الحق کی یہ عبارت بھی غلط نہیں بلکہ اقوالِ مفسرین۔ شانِ نزول اور دیگر آیات و منشاءِ حکم باری تعالے سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ سورہ حجر آیت ۱۵ پ ۱۳ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۱۱) اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (ترجمہ) اور ہم نے چھپایا یا حفاظت کی ان آسمانی اسرار الٰہیہ کو جو برجوں میں ہیں ہر مردود سے مگر وہ شیطان جس نے چوری کی راز و اسرار کو سُن کر تو پیچھے لگا اس کے شہابِ مبین۔ اس آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالے بذریعہ شہاب ثاقب اور ملائکہ۔ آسمانی رازوں کو مردود شیطانوں سے چھپاتا ہے۔ حفاظت دو قسم کی ہوتی ہے، ۱ بچا کر ۲ چھپا کر رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت فرمائی اس کو فساد و تبدیل سے بچا کر اسرار کی حفاظت فرمائی چھپا کر شیطان جس طرح ابلیسوں جنوں میں ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ سورہ انعام آیت ۱۱۲ پ ۸ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ (ترجمہ)۔ اور اسی طرح بنایا ہم نے ہر نبی علیہ السلام کے لیئے دشمن انسانوں اور جنوں کے شیطانوں سے۔ تو جس طرح شیطان جن چور ہیں اسی طرح انسانی شیطان بھی چور ہیں اللہ تعالیٰ نے جناتی شیطانوں سے آسمانی اسرار چھپائے اسی طرح انسانی شیطانوں سے بھی اسرارِ کائنات چھپائے اور اپنے پیارے حبیب کو فرمایا۔ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ۔ اے پیارے اِن کافر چور شیطانوں سے کہہ دو کہ میں تم کو نہیں بتاتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے اور علم غیب ہے۔ یہ ممنوعہ حکم کیوں تھا صرف اسی لیئے کہ شیطان چور اسرار کی چوری نہ کرے۔ آسمان پر شہاب کیوں بنائے گئے تاکہ وہاں کے شیطان بھی اسرار کی چوری نہ کریں وہاں فرشتوں سے رکھوالی کرائی گئی اور یہاں انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے۔ معترض کہتا ہے کہ یہ جھوٹ بولنا ہے (معاذ اللہ) مگر قرآن و حدیث فرماتے ہیں کہ یہ جملہ انشائیہ ہے۔ جس میں جھوٹ کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ معترض کہتا ہے کہ اگر حضور مختارِ کل غیب دان اور حاضر و ناظر ہیں۔ تو آپ نے کفار سے خزانے کیوں چھپائے چھپانا تو ڈر سے ہوتا ہے۔ اور ڈرنے والا بزدل ہے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالے مختار کل عالم الغیب۔ اور ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔ اور قوی ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا کی صفت والا ہے تو اس نے آسمانی اسرار شیطانوں سے کیوں چھپائے جو جواب یہاں ہوگا وہ ہی وہاں ہے معترض کہتا ہے کہ آیت کے کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ اے کافرو تم چور۔

دراصل بیچارے معترض وہابی کو دکھ بھی اسی چیز کا ہے کہ ہمارے کافروں کو چور کیوں کہہ دیا۔ اور وہ اس دکھ میں حق بجانب ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ترجمہ الفاظ آیت کا نہیں بلکہ تفاسیری اشاروں کا ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہوا۔ آگے چل کر معترض عجیب احمقانہ تانے بانے بنا رہا ہے۔ لکھتا ہے کہ صدیق سے کب پوچھے گئے یہ کہا تھا کہ میرے پاس خزانے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کہا تھا اُوتِیتُ مَفَاتِیحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ وغیرہ وغیرہ معترض کہتا ہے کہ اگر یہ راز تھا تو بریلوی اب کیوں بتاتے پھرتے کیا اب کفار چوری نہ کریں گے۔ میں کہتا ہوں بریلوی صرف یہ بتاتے ہیں کہ۔ مالک کونین ہیں گو تم کو بتلاتے نہیں۔ دوجہاں کی چابیاں ہیں ان کے دست پاک میں بریلوی یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے آقا کے پاس سب خزانے ہیں مگر خزانوں کا پتہ نہیں بتاتے تو خبیث چوری کیسے کر سکتے ہیں۔ ہاں صحابہ کو اولیاء اللہ کو اور ہم غلاموں کو سب پتہ ہے بلکہ اُن ہی خزانوں سے شریعت والے۔ طریقت والے۔ روحانیت والے۔ جسمانیت والے سب پل رہے ہیں اگر معترض اور اُس کے ساتھی پوچھے کہ کہاں ہیں تو میں کہوں گا۔ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ جاؤ میں تم کو نہیں بتاتا

تکفیری اعتراض کا جواب:۔ معترض کہتا ہے کہ بریلویوں کے امام احمد رضا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر کو کافر نہیں کہتے اسماعیل دہلوی جگہ جگہ لکھتا ہے خدا کے سوا کسی کو نہ مانو۔ مگر امام احمد رضا اس کی تکفیر نہیں کرتے میں کہتا ہوں کہ تم بھی تو آخر مسلمان کہلاتے ہو تم بھی تو اسی آقا صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے در کے ٹکڑے سے پلے ہو نمک خوار ہو کلمہ انہی سے لیا۔ ایمان۔ قرآن اُن ہی سے پایا۔ خدا کا پتہ وہیں سے لگا۔ ع۔ ورنہ تم کیا سمجھتے خدا کون ہے۔ کچھ حق نمک خواری ادا کرو نمک حلال بن جاؤ۔ اور تم ہی ایسے بیہودہ کو کافر کہہ دو۔ مگر تم نے تو اِن گستاخیوں کو دیکھتے بھالتے اسماعیل صاحب کو امامِ مطلق بنا رکھا ہے امام احمد رضا خان علیہ الرحمۃ نے تو کم از کم اس کو۔ برا۔ بے دین سا اور گمراہ تو سمجھا۔ ہاں کافر نہ کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کتب وتصانیف سے ثابت ہے کہ آپ جلد بازی نہ کرتے تھے بلا سوچے سمجھے کچھ نہ بولتے تھے بلا تحقیق وتفتیش تسلی وتشفی کے کبھی کسی کے خلاف نہ ہوتے تھے۔ کبھی بلا وجہ کفر کا فتوٰے نہ لگاتے یہ جلد بازی اور کفر و بدعت وشرک کی تیز رفتار مشین تو سہارنپور کے قریب ہے۔ امام اہلسنت نے اپنے دور کے صرف تین لوگوں پر کفر کا فتوٰے لگایا۔ اور وہ بھی اس وقت تک جب اچھی طرح اُن سے تحریری تقریری گفتگو کر لی ان کی گستاخانہ عبارات کے ان ہی کے منہ سے مطلب سن لیئے مناظرے کر لیئے پورا اتمام حجت کر لیا وہ لوگ لاجواب ہو گئے کوئی پہلو بجز کفر نہ نکل سکا تو بار بار دلائی جب توبہ اور رجوع کی طرف بھی نہ آئے تب کفر کا فتوٰی لگایا اور پھر ایسا مضبوط اور صحیح لگا یا کہ عرب وعجم نے تسلیم کیا۔ اسماعیل دہلوی کون سا چچا کا بیٹا تھا کہ اس کی

رعایت کی جاتی بات صرف یہ تھی کہ فوت ہو گیا تھا۔ اسماعیل صاحب دہلوی کا زمانہ پہلے ہی لد چکا تھا گستاخانہ عبارتیں واقعی دیکھیں اور اب تک دیکھی جا رہی ہیں مگر کس سے تحقیق کی جائے کون متکلم کا مطلب بتائے کون رجوع کرے کس سے توبہ کرائی جائے۔ ہر بات میں کئی پہلو نکالے جا سکتے ہیں کفر بہت نازک ہے اسی امام وقت نے یہ بتایا کہ اگر ننانوے احتمال کفر کے ہوں ایک اسلام کا تو بات کو اسلام کی طرف لاؤ۔ اس احتیاط کے پیش نظر مردہ شخص کو کافر نہ کہا گیا اگر اُس وقت اسماعیل صاحب زندہ ہوتے تو ان سے بھی بات کی جاتی اور کسی نہج پر لا کر شرعی فیصلہ کیا جاتا۔ **چوتھے اعتراض کا جواب**:۔ معترض وہابی کہتا ہے۔ بریلوی عالم اللہ دتہ صاحب لاہوری نے یہ عبارت عربی اپنی کتاب تنویر الخواطر صفحہ ۴۳ لکھی۔ لا تستقر نطفۃ فی فرج انثی الا ینظر الی ذالک الرجل ایھا یہ گستاخی ہے اور صفحہ ۴۶ پر لکھا ہے کہ اوپر والے یہ کلمات طیبہ یعنی پاک کلمات ہیں۔ الجواب میں بحیثیت مفتی اسلام ہونے کے کسی کو سخت لفظ نہ کہہ سکتا ہوں نہ کہنا چاہتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض دیکھ کر جب علامہ اللہ دتا صاحب کی کتاب مذکورہ دیکھی جائے تو ہر شخص کہے گا کہ اس اعتراض میں کتنا فریب ہے کتنی مکاری و دھوکہ بازی۔ علامہ نے صفحہ ۴۳ پر یہ عبارت خود نہیں لکھی بلکہ ایک وہابی مولوی سرفراز گکھڑوی کی کتاب تبرید النواظر صفحہ ۴۴ سے نقل کی ہے اور سرفراز صاحب وہابی نے یہ عبارت سنیوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ سرفراز گکھڑوی وہابی صاحب نے اس عبارت کو لکھتے ہوئے یہ نہ بتایا کہ یہ کس کا قول ہے۔ صرف کتاب غیر معروف بلکہ نام نہاد نجم الرحمٰن کا حوالہ دیا۔ یہ کتاب روئے زمین پر ابھی تک پیدا ہی نہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ گستاخانہ اور بے ادبانہ عبارت خود وہابی سرفراز گکھڑوی صاحب کی ہے اور اپنے اکابر کی طرح یہ بھی جھوٹی عبارتیں بنانے میں مشاق ہیں۔ ان کا ایک پیر مرشد اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنی ایک کتاب رویاء صادقہ میں جھوٹی خوابیں خود بنا کر اپنا کلمہ پڑھوایا اور اشرف علی رسول اللہ لکھا اور مرتے دم تک اس پر ضد کی جب اہلسنت نے پاپوش زنی کی تو بھرے مجمع میں کہہ دیا کہ اب میں لکھ چکا ہوں اب کیسے پھاڑوں۔ اور پھر ان کے ہی ایماء سے غالباً ان کے حواریوں نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور خواجہ خواجگان قبلہ عالم خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف ایک جھوٹ باندھا۔ کہ انہوں نے بھی اپنے مریدوں سے اپنے کلمے پڑھوائے حالانکہ یہ بات سرے سے ہی غلط ہے اولیاء اللہ کی یہ جرأت نہیں کہ اس طرح گستاخی کریں۔ اپنا کلمہ پڑھوانا تو بطورِ آزمائش بھی کفر ہے۔ کہ کم از کم مرید تو اس وقت کافر ہو جائے گا۔ اور پھر کہلوانے والے پر کفر لزومی لاحق ہوا اور کہنے والے پر کفر التزامی۔ بہر حال یہ بھی وہابیوں کی بد ترین تہمت اور ذلیل ترین بناوٹ ہے

خواجہ صاحب اور شبلی صاحب کی پرانی مطبوعہ میں یہ واقعہ قطعاً نہیں تھا۔ ان کے حواریوں نے اب چند سال پیشتر سے اپنے اشرف علی کو بچانے کے لیئے ایک کتاب خود ساختہ شائع کر دی صرف دھوکہ دینے کے لیئے خود اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنی کتاب الظہور صـ ۲۹ پر لکھا کہ یہ بریلوی موجد محفل میلاد۔ صبح کے وقت گہوارہ لٹکاتے اور پورا سوانگ بھرتے ہیں اگر یہی نقل ہے تو خدا خیر کرے ایک عورت کو بھی لاویں گے اور کہہ دیں گے کہ چلایا کرے (بحوالہ کتاب اذکار حبیب صـ ۱۶ مرتبہ شاہ عارف اللہ رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ) اشرف علی وہابی کا یہ کتنا بڑا دھوکہ فریب اور جھوٹ ہے بھلا کب محفل میلاد میں جھولا لٹکایا جاتا ہے اور سوانگ بھرا جاتا ہے۔ تو جب اشرف علی غلط عبارتیں بناتے رہے تو ان کے مرید سرفراز سے کیا بعید ہے۔ مگر یہ مذکورہ معترض اپنی کم عقلی یا جان بوجھ کر نیا دھوکہ دیتے ہوئے علامہ صاحب کی طرف اس کو منسوب کر رہا ہے۔ علامہ اللہ دتہ صاحب نے صـ ۴۶ پر اس عبارت کو کلماتِ طیبہ نہ کہا کوئی گورچشمی پر اتر آئے تو اس کی مرضی۔ بلکہ تنویر الخواطر صـ ۴۶ پر لکھا ہے۔ اس کے مثل کلماتِ طیبہ کو اس عبارت سے صرف واقعاتی تشبیہ دی ہے۔ ہمارے کسی بزرگ نے ایسے لفظ ادا نہ کیئے نہ ہی اس کی کچھ ضرورت۔ لیکن جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ کوئی عیب نہیں۔ رب تعالٰی فرماتا ہے:۔ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ترجمہ اللہ تعالٰے اس کو جانتا ہے جو مؤنثوں کے رحم میں ہے۔ باری عزّاسمہ نے اپنے ولیوں کو اپنی قوت اپنے علم کی دلیل بنا کر بھیجا اس لیئے ان کو بھی وسیع علم عطا فرمایا اور اسی علم کے ذریعے وہ بھی جان لیتے ہیں کہ رحموں میں کیا ہے۔ دیکھنا اور ہے جاننا اور ہے۔ دیکھنا اتنا کمال نہیں جتنا بغیر دیکھے جاننا کمال ہے۔ دیکھنا کیا مشکل ہے یہ تو ڈاکٹر لوگ بھی اپنی سائنسی ایجادات کے ذریعے کر لیتے ہیں۔ ایکسرے کے ذریعے آنتوں کے اندر کی چیز بھی نظر آ جاتی ہے اور بہت سے لوگ اپنی تجرباتی عقل سے حمل کا پتہ لگا لیتے ہیں جو اکثر بالکل درست ہوتا ہے۔ مگر وَلِیّ اِلٰہی صِفَاتِ الٰہیہ سے متّصف کیے جانے کی بنا پر اپنے علم سے جانتا ہے کہ رحم مونث میں کیا ہے۔ علم کے لیئے آنکھ یا آلے کی حاجت نہیں آنکھ بند کر کے بھی علم آ جاتا ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کے لیئے نظر کا استعمال کسی نے نہ کیا۔ اور یہ عبارت بناوٹی حضرتِ شعیب علیہ السلام کو بھی حضرت یحییٰ کی ولادت و شکمِ مادر میں آنے کا پورا علم تھا:۔ جنابِ باری سے علامات کا سوال صرف ایام کے تعین کا پوچھنا تھا۔ نہ کہ حمل کا۔ پس ثابت ہو گیا کہ معترض کا یہ سوال بھی محض دھوکہ بازی تھی:۔

پانچویں اعتراض کا جواب:۔

انوار ساطعہ کی یہ عبارت شرعاً۔ عقلاً۔ نقلاً ہر طرح درست ہے۔ واقعی انبیاءِ کرام اولیاءِ عظام ناپاک جگہ پلید مقام پہ نہیں جاتے۔ انوارِ ساطعہ میں صرف یہ لکھا ہے کہ ہم دعوے نہیں کرتے قدرتِ

قدرتِ حضور کا انکار نہیں یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مقاموں میں حاضر ہونے کی قدرت و طاقت نہیں۔ طاقت
تو ہر جگہ جانے کی ہے۔ مگر خلافِ شان جگہ پر جاتے نہیں۔ دعوئے حضور کی نفی ہے نہ کہ قدرتِ حضور
کی۔ اور یہ عقیدہ عین حدیث پاک کے مطابق ہے۔ چنانچہ۔ حدیث پاک کی معتبر و مشہور کتاب طحاوی
شریف جلد دوم صفحہ نمبر ص۲۶۳ پر ہے:۔ قَالَ یَا عَائِشَۃُ (الخ) اِنَّا لَا نَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ
تَصَاوِیْرُ (ترجمہ):۔ آقائے کائنات نے فرمایا۔ اے عائشہ صدیقہ (رضی اللہ تعالے عنہا)
ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔ یہاں بھی دخول کی نفی ہے نہ کہ قدرت کی
میں کہتا ہوں کہ انبیاء اولیاء کو اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ حاضری کی طاقت بخشی مگر اپنی شانِ ارفعیت کی وجہ
سے گندی جگہ جاتے نہیں۔ شیطان نے بھی التجاؤں سے یہ طاقت پالی مگر وہ ہر جگہ چلا جاتا ہے:۔
اور ہر گندی مندی جگہ موجود ہوتا ہے۔ معترض وہابی دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ دیکھو شیطان کو زیادہ
مان لیا۔ پوچھو ان نادانوں سے کہ کیا یہ افضیلت اور شان کی نشانی ہے؟ کیا گندی جگہ جانا اچھی بات ہے؟
کیا زیادہ پھرنا اچھی بات ہے؟۔ افسوس کہ حسد نے عقل ہی مار دی۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ وہابی صرف
روٹی کھاتا ہے۔ مگر کتا۔ بلا روٹی۔ گندگی۔ حرام غذا۔ اور چوہے وغیرہ بھی کھاتا ہے۔ لہٰذا
کتا بلا وہابی سے افضل ہے تو کیا جواب دو گے۔ معترض صاحب۔ زیادتی اور ہر اچھی بری جگہ چلا جانا
شان و افضیلت نہیں اور نہ ہی اس سے تمہارے شیطان کی عظمت ظاہر ہو۔ انوار ساطعہ والوں
نے تو صرف زمینی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ جو قلیل ہیں۔ مگر عرشی کرسی۔ لوحی۔ قلمی بہشتی۔ عالمِ انوار۔
عالمِ اسرار۔ لاہوت۔ جبروت۔ عالمِ قدس۔ تجلیات۔ عالمِ تقریب۔ عالمِ امکان۔ محافلِ
سماوات اور اس طرح کی کروڑہا محفلیں اور اربوں مقامات ہیں جہاں انبیاء و مرسلین۔ اولیاء واصلین
حاضر و ناظر ہیں وہاں شیطان کی پھٹک بھی نہیں اس کو تو محفلِ ملائکہ تک رسائی و قدرت نہیں
شہابِ ثاقب کی مار گواہ ہے۔ تو شیطان کس طرح زیادہ جگہ حاضر و ناظر ہو سکتا ہے معترض صاحب
کے سب اعتراض غلط ثابت ہو گئے .... اور پھر قبلۂ عالم مولانا سمیع صاحب نے اپنے
لفظوں میں کہیں بھی نہ کہا کہ شیطان زیادہ حاضر ہے۔ یہ تو مذکور معترض نے اپنے دل سے
مطلب نکال لیا۔ لیکن خود وہابی پیشوا خلیل احمد انبیٹھوی صاحب نے تو معاذ اللہ شیطان کا علم
نبی کریم رؤف و رحیم سے زیادہ مانا اور اپنی کتاب براہین قاطعہ ص۵۱ پر لکھتے ہیں کہ شیطان
کے علم کے لئے تو نصِ قطعی آ گئی۔ نبی پاک کے لئے کون سی نص قطعی آئی۔ ان بیوقوفوں نادانوں
کو شیطان کے لئے نصِ قطعی مل گئی۔ مگر جس کے طفیل قرآن مجید کی کل نصوص قطعیہ نازل ہوئیں

اُس کے علم کے لیے کوئی آیت نہ ملی ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

بھلا قرآن مجید میں نبی الانبیا راحتِ قلبِ اصفیا مرسلِ ہر کل سرا۔ نذیر عالمیاں بشیر برانس و جان صَلَّی اللّٰہُ الخَالِقُ جَنَّان عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ کے علم کے ثبوت میں کوئی نصِ قطعی نہ ہو۔ ناممکن ومحال میں کہتا ہوں کہ ساری آیات ہی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ثابت کر رہی ہیں۔ کیا یہ آیت نظر نہ آئی۔ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمْ (سورہ جمعہ آیت نمبر ۲) :۔ ترجمہ :۔ وہ اللہ وہ ہے جس نے مبعوث فرمایا ان بے علموں میں بھا انہی کی اصل میں سے تلاوت فرماتا رہے گا ان کے سامنے اللہ کی آیات اور پاک فرماتا رہے گا ان کو اور علم پڑھاتا رہے گا ان کو۔ اس آیت نے بتایا کہ نبی کریم کی تمام امت بے علم تھی نبی پاک نے ان کو علم دیا تو علم آیا۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کی تعداد کیا ہے؟ قرآن مجید فرماتا ہے۔ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۵۸ (ترجمہ) :۔ اے حبیب فرما دو کہ اے انسانو بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (تاقیامت) دوسری جگہ خود رب نے فرمایا کہ صرف انسانوں کی طرف ہی نہیں۔ بلکہ۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ۝۱ (سورہ ۲۵ فرقان) :۔ (ترجمہ) برکتوں والا ہے وہ ربِ کائنات جس نے نازل فرمایا فرقان اپنے بندے پر تاکہ ہو جائے وہ تمام کائنات والوں کے لیے نذیر۔ عالم ماسوا اللہ کو کہتے ہیں جیسا کہ امام رازی کو تسلیم کرنا پڑا۔ عالمین اس کی جمع کثرت ہے۔ جس میں از فرشی تا عرشی۔ جبرائیل و میکائیل و عزرائیل علیہم السلام۔ جنات و حیوانات فلسفی و منطقی حکماء و فضلاء سائنس دان سب ہی شامل فی الامت ہیں۔ اُمتِ مصطفوی کی اس کثرتِ تعداد کو امیین فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی کتنا ہی عالم و معلم ہوں مگر احمد مجتبٰے کے سامنے اُمیین ہیں اس سے بڑی نصِ قطعی اب کہاں پاؤ گے۔ بلکہ قلیل تفکر سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ شیطان و عزرائیل علیہ السلام کے علم کا نصِ قطعی میں ذکر آنا بھی شانِ محبوبِ پاک صاحب لولاک کا بتاتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ یہ پتھر فلاں پہلوان اٹھا سکتا ہے تو جواب دینے والا کہے کہ یہ پتھر تو فلاں کمزور آدمی اور عام آدمی بھی اٹھا لیتا ہے۔ ظاہرا پہلوان کے اٹھانے کا ذکر نہ کیا مگر منشاءِ کلام ظاہر و باہر اور صاف ہے۔ کہ عام آدمی کا ذکر کرنا بھی شانِ قوتِ پہلوان بتاتا ہے۔ عقلاءِ منکرین کو حیرت ہوئی کہ نبی اکرم ہر امتی کو زمین کے ہر گوشے میں دیکھ سکتے ہیں اور کیا ہر عاشق کے گھر تشریف لا سکتے ہیں حاضر و ناظر ہونے

کی قوت ہے۔ رب نے فرمایا زمین تو معمولی اور قلیل مقام ہے یہاں تو شیطان جیسا رو حانی مریض کمزور مخلوق بھی تم کو دیکھتا حاضر و ناظر ہوتا ہے۔ اور حضرت عزرائیل کی قوت بھی سیر کر لیتی ہے۔ پس اس طرز تکلم سے معلوم ہو گیا کہ شان اپنے محبوب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی بتانا ہے۔ اگر کوئی آپ خلیل انبیٹھوی یہ معترض ہو کہ یَعْلَمُہُم کی ضمیر سے صرف صحابہ مراد ہیں تو اِنَّہٗ یَرٰىکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ میں بدرجہ اولیٰ صحابہ مراد ہو سکتے ہیں کہ وہ غائب ہے یہ حاضر کی ضمیر۔ پھر آج ستانوے سال بعد انوارِ ساطعہ کتاب پر اعتراض کی سوجھی ۱۳۰۳ھ میں خود خلیل صاحب انبیٹھوی نے اسی کتاب کا جواب لکھتے ہوئے اپنی کتاب براھین قاطعہ کے صفحات پر یہ کیوں نہ لکھا کہ بریلویوں نے شیطان کو زیادہ جگہ حاضر و ناظر مان لیا۔ اور آج کے معترض نے انوار ساطعہ کی یہ صحیح عبارت دیکھ کر خود ساختہ مطلب نکال کر بریلویت چھوڑ کر وہابیت میں پناہ لے لی اس کو براھین قاطعہ کی یہ گستاخیاں اور کفریات کیوں نظر نہ آئے کہ خلیل احمد انبیٹھوی براھین کے ص۵۱ پر شیطان کا علم صاف صاف لفظوں میں بڑھا رہا ہے۔ اور ص۲۶ پر دیوبندیوں کو۔ معلم ملائکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اردو استاد بتا رہا ہے اور جھوٹی شیطانی خواب گھڑ رہا ہے۔ پس اندازہ آپ کے اپنے ہاتھ میں فیصلہ رب تعالیٰ کے قبضے میں۔ **چھٹے اعتراض کا جواب:**۔ معترض کہتا ہے کہ فرقہ بریلویہ کا اعلان کہ نہ ہم سنی ہیں نہ شیعہ۔ حوالے میں مولانا فخر الدین ہمعصر مرزا جانِ جاناں کا نام اور دو شعر فارسی کے پیش کرتا ہے جس کے ترجمے سے ہی پتہ چل گیا کہ معترض خاصہ جاہل ہے۔ ملفوظات مہریہ کے ملفوظ ۲۶ کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر بڑے غیض سے بریلویوں کے خلاف تبصرہ کرتا ہے۔ **جواب**۔! ہم بیہودہ اور طرزِ جاہلانہ کا تو کچھ جواب نہ دیں گے کہ وہاں خاموشی ہی بہتر ہے۔ البتہ صحیح حقائق سے آگاہ کیا جاتا ہے معترض وہابی۔ وہ رباعی اس طرح لکھتا ہے۔

نہ سنی ام کہ کنند رافضی گلہ احمق ۔ نہ رافضی کہ کنند سنیم گریبان شق ۔ مرید حضرتِ عشقم وگرنمی دانم

کدام بر سر باطل کدام بر سر حق ۔

اور اس کا ترجمہ خود معترض اس طرح کرتا ہے۔ نہ سنی ہوں کہ احمق رافضی گلہ کرے۔ اور نہ رافضی ہوں کہ سنی بگریباں ہوں میں تو حضرتِ عشق کا مرید ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ کون حق اور کون باطل پر یہ تھی رباعی جس کی آڑ سے کر معترض نے تمام بریلویوں کو ظالم۔ شکم پرور وغیرہ بد تہذیبی کے الفاظ سے خطاب کیا۔ اس کے جواب چند طرح پر ہیں۔ اوّلاً یہ کہ معترض نے جانتے بوجھتے رباعی میں خیانت کی رباعی کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے

نہ سنی ام کہ کنند رافضی گلہ احمق ۔ ترجمہ۔ ملفوظات مہریہ ص۵۱ پر اس طرح لکھا ہے ۔

نہ میں سنی ہوں کہ احمق رافضی گلہ کرے ۔ اور یہ رباعی و ترجمہ۔ ملفوظات کے ص۵۱ پر بالکل صاف صاف

لکھاہے۔ مگر معترض جان بوجھ کر لفظِ احمق کو لفظ احق اسم تفضیل بنا دیتا ہے۔ جس کا ترجمہ زیادہ سچے۔ معترض نے صرف اپنے اعتراض کو مضبوط بنانے اور بریلویوں کو برا کہنے کے لیئے راہ ہموار کرنے کی غرض سے یہ خیانت کی۔ حالانکہ لفظِ احمق بمعنی بیوقوف ہوتا ہے جس کو عربی میں سفیہ کہتے ہیں اس کی جمع سفہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کافروں کو ہی سفہا فرمایا۔ تو مولانا مذکور نے اشارۃً بتا دیا کہ یہ کفریں ہیں۔ لفظِ سنی کے ساتھ کوئی غلط لفظ نہ لگایا۔ اور ان کی عزت بحال رکھی۔ آگے فرمایا کہ جب سے وادیٔ عشق ومستی میں قدم رکھا تمام علومِ ظاہریہ شرعیہ فراموش ہو چکے ہیں اب نہیں یاد رہا کہ کس کو باطل کہوں کس کو حق پر کہوں یہ کام تو متبحر مفتیٔ اسلام کا ہے تدبر و تفکر یں اسی کو قدرت و مہارت ہے۔ اس تشریح کی تائید شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔ شعر

اگر ہفتاد علم از بر بدانی

چوں آشفتی الف با تا ندانی

ترجمہ:۔ اگر تو ستر علم جانتا ہوگا جب عاشق بن جائے تو الف بے تے بھی نہ جان سکے گا۔

مولانا فخرالدین کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اتنے بڑے اہم کام فتوئے کفر کے لیئے غلط جگہ پر آگئے۔ میں ایسا فتوائے دینے کا پہلے اہل تھا اور روافض کے خلاف فتوے دیتا رہا۔ مگر اب مرید عشق ہوں اب کچھ یاد نہیں رہا۔ لہٰذا اب اہل نہیں رہا۔ ہاں اشارہ کر دیا اہلِ ذوق ہو گے تو سمجھ جاؤ گے محظوظ ہو گئے تو بے خبر ہو گے تو حیران ہو گے۔ میری جان تو چھوٹے گی۔ اسی لیئے سید مہر علی شاہ صاحب قبلہ علیہ الرحمتہ نے یہ لکھ دیا۔ ثالثاً جواب اس طرح ہے کہ مولانا فخرالدین تاریخی حیثیت سے بالکل غیر معروف شخصیت ہیں نہ یہ سنیت کے امام ہیں نہ معیار۔ مرزا جانِ جاناں کی تاریخ میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ قابلِ اعتراض وہ بات ہوتی ہے۔ جو مرکز سے خارج ہو۔ پہلے زمانوں میں مرکزِ سنیت امام منصور ماتریدی کا آستانہ تھا پھر امام اشعری مرکزِ سنیت کی حیثیت میں جلوہ گستر تھے۔ پھر اعلیٰحضرت بریلوی پھر صدر الافاضل مراد آبادی۔ پھر آج کل مرکزِ اہلسنت حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمتہ شیخ الحدیث مولانا سردار احمد صاحب لائلپوری علیہ الرحمتہ ہیں۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ مولانا فخرالدین کون بزرگ ہیں معترض وہابی نے کہاں سے جانا کہ یہ کون ہیں صرف لوگوں کو فریب دینے کے لیئے۔ رابعًا جواب اس طرح ہے کہ یہ رباعی ملفوظاتِ مہریہ کے علاوہ پیر صاحب کی دیگر کسی کتاب میں دستیاب نہیں۔

نہ اس کی تشریح کسی طرح پر پیر صاحب نے فرمائی لہٰذا غالب گمان ہے کہ یہ بناوٹ اور اختراع ہے۔ اور ملفوظات میں اکثر ایسی بناوٹیں ہو جاتی ہیں بدیں وجہ امر مسلم متفقًا ہے کہ ملفوظات کسی کے بھی ہوں قابل اعتماد نہیں نہ ہی ملفوظات پر کوئی فتوٰے دیا جا سکتا ہے جیسا کہ خود مرتب ملفوظ ہٰذا نے اسی کتاب ملفوظاتِ مہریہ کے صـ۲ پر اعتراف کر لیا ہے۔ اور اس ملفوظات کو پڑھ کر تو غالب گمان ہوتا ہے کہ اس کا ترتیب دینے والا جمع کرنے لکھنے والا یعنی سننے والا تفضیلی شیعہ ہے کہ اکثر ملفوظ مائل بر رفض اور شریعت کے خلاف ہیں۔

یہ تھے کمزور اور متعصبانہ اعتراض۔ جن کو اٹھا کر وہابی صاحب مذکور نے اہلسنت بریلوی کو برا بھلا کہنے کی راہ نکالی انہی بے سوچے سمجھے اعتراضات کی بنا پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ محمد اسلم کوئی وہابی نہیں اور نہ کسی نے بریلویت چھوڑی صرف دھوکہ بازی کے لیے یہ (ہیڈ نگ) پیش لفظ بنایا۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ دیوبندیت کے مرکزی حیثیت والے خلیل احمد انبیٹھوی کی وہ مندرجہ گستاخیاں نظر نہ آئیں جو انہوں نے اسی انوار ساطعہ کا جواب دیتے ہوئے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں لکھی۔ ان سے نفرت نہ ہوئی ان کا بڑا مرکز اشرف علی تھانوی اپنا کلمہ پڑھوائے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی شانِ عفت میں۔ بے غیرتی کی گستاخی کرے تو معترض وہابیت کو گھن نہ آئے۔ اور ان مرکزی گستاخوں کی وجہ سے وہابیت نہ چھوڑے اور پیچھے پڑے تو عشاقِ مصطفےٰ کے اور چھوڑے تو عاشقوں محبوبوں کی جماعت۔ اور شامل ہو تو بڑے گستاخوں میں ثابت ہوا کہ یہ سب تعصب ہی تعصب ہے حقیقت کچھ نہیں۔ **ساتویں اعتراض کا جواب:**۔ معترض صاحب کہتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت کے ایک عالم ابو وفا غلام رسول سعیدی فاضلِ جامعہ نعیمیہ نے اپنی کتاب میں توضیح البیان صـ۲۷۴ پر لکھا کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ اس اعتراض سے بھی معترض کا تعصب اور محض کیچڑ اچھالنا ظاہر ہو رہا ہے۔ اور یہ ثابت ہو رہا ہے۔ کہ معترض پکا وہابی ہے اس کو بریلویت کی ہوا بھی نہ لگی اور یہ کہنا کہ میں نے بریلویت کیوں چھوڑی۔ نرا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی مذہب کے کسی عقیدے کو بنیادی حیثیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ یا تو مرکزی اکابر کے اقوال سے وہ عقیدہ ثابت ہو یا مجموعی طور پر اس کو تسلیم کیا جاتا ہو۔ انفرادی حیثیت کا قول مذھبی اساس میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ معترض ایک عام مولوی صاحب کی خود اپنی غلط فہمی پر مبنی بات کو پکڑ کر کہتا ہے کہ میں نے بریلویت اس مولوی صاحب کی بات کی وجہ سے چھوڑ دی اور پھر حیرانی کی بات ہے کہ معترض سعیدی صاحب کی اس بات پر بریلویت چھوڑ کر کہاں داخل ہوتا ہے؟ جو فرقہ دیوبندیہ۔ وہابیہ۔ نجدیہ۔ مرکزی اور مجموعی طور پر متفقًا اب تک علی الاعلان کہتا چلا آرہا ہے

کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ (معاذ اللہ) گویا کہ بیوقوف معترض کے نزدیک یہ کہنا درست ہے۔ کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بُرا ہے کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں معترض خدا کی شان گھٹاتا ہے انبیاء کی شان بڑھاتا ہے۔ معاذ اللہ۔ معترض کی انصاف پسندی اور محبتِ خدا اور رسول کا ثبوت یہ تھا کہ دونوں گروہوں سے بے یک دم نفرت کا اظہار کرتا اور دیوبندیوں وہابیوں سے زیادہ نفرت کرتا۔! کیونکہ دیوبندیوں نے رب کریم کو جھوٹ کی تہمت دی۔ اور دیوبندیت کے مرکزی لوگوں نے خدا تعالیٰ کو جھوٹ کا الزام دیا اور مجموعی طور پر سب وہابی دیوبندی لوگوں نے اس بے دین گمراہی کے عقیدے کو تسلیم کیا اس عقیدے پر بڑے بڑے دیوبندیوں راہنماؤں نے ضخیم کتابیں لکھیں چنانچہ خلیل احمد انبیٹھوی نے اپنی کتاب براہین قاطعہ میں اور محمود الحسن صاحبان نے اپنی کتاب جہد المقل میں اسی مسئلہ امکان کذب میں صفحاتِ کثیر سیاہ کر ڈالے ہیں یہ خلیل احمد اور محمود الحسن صاحبان مذہب دیوبند کے مرکزی لوگوں میں شامل ہیں۔ اور ان کی تحریر و تقریر عقائدِ وہابیت کی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں حال ہی میں دیوبند کی طرف سے ایک کتاب بنام ہیں بڑے مسلمان شائع ہوئی ہے۔ جس میں ان مذکورہ بالا حضرتوں کا نام شامل کر کے وہابیوں نے ثابت کیا کہ ان بڑوں کی بات ہمارے مذہب کی بنیاد ہے بخلاف جماعتِ اہلسنت والجماعت۔ کہ ان کے کسی بڑے عالم نے یہ گستاخانہ بات نہ کہی۔ جماعت اہلِ سنت بریلویہ کے مرکزی قائد اعلیٰحضرت احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما جن کی بات تحریراً تقریراً مسلکاً بنیادی حیثیت رکھتی ہے اُن کا بیان فرمودہ صاف صاف عقیدہ ہے کہ نہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے نہ جملہ انبیاءِ کرام علیہم السلام جھوٹ بول سکتے ہیں نہ جملہ ملائکۂ ارضی و سماوی۔ اِن بزرگوں کی کتب میں صاف صاف لکھا ہے کہ انبیاءِ کرام معصوم ہوتے ہیں اور جو معصوم ہو وہ جھوٹ پر قادر ہی نہیں ہوتا۔ جو رب تعالیٰ کو یا انبیاءِ اللہ کو یا ملائکہ کو جھوٹ پر قادر مانے وہ کفر کی حد تک گمراہ ہے۔ یہ تھا بریلوی مرکزی عقیدہ جس کا با دلائل حوالہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا۔ تمام بریلوی مشائخ و علماء نے اسی عقیدے پر اجماع فرمایا ہے کوئی سنی بریلوی اس کا مخالف نہیں ہاں اب ایک بریلوی عالم غلام رسول سعیدی صاحب نے اپنی کج روی سے یہ تخریب کی کہ مسلک و مرکز سے ہٹ کر گمراہانہ بات لکھ دی۔ سعیدی صاحب نہ مرکزی حیثیت کے مالک ہیں نہ ان کا قول اجماعی درجہ رکھتا ہے یہ فاسد بات اِن کی اپنی انفرادی ہے جس سے اہل سنت کو کوئی واسطہ نہیں۔ نہ اتی اہلسنت بریلوی پر اس کا وبال ہے اس استفتاء کے بعد میں نے تحریری طور پر سعیدی صاحب کا سخت محاسبہ کیا۔ اور میرے ساتھ انہوں نے بڑے فاضلانہ انداز میں مناظرہ کیا۔ جس میں انہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور سب عقلی ہتھیار ڈال دیئے۔ جس کا

خلاصہ مندرجہ ذیل پیش کیا جا رہا ہے۔ سعیدی صاحب پر میرا یہ محاسبہ اور محاکمہ اس لیے ہوا کہ دیگر فرقوں اور اہلسنت بریلوی گروہ کے درمیان کثیر بنیادی فرق کے علاوہ ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے تمام فرقے خاص کر دیوبندی وہابی اپنے مولویوں پیشواؤں کی عزت و عظمت سب سے اونچی سمجھتے ہیں۔ اپنوں کی عزت ہر صورت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ خدا تعالےٰ کی عزت رہے نہ رہے کوئی پرواہ نہیں۔ انبیاء کی توہین ہوتی رہے نہ ان کا ایمان بگڑے نہ توحید میں فرق آئے کعبہ و قرآن کی بیحرمتی ہوتی رہے تو کوئی غیرت مند نہ بولے۔ ہاں ان کے مولویوں کی عزت پر آنچ نہ آئے دیکھو ان کے ہی مولویوں نے کہا رب تعالےٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ کسی کو غصہ نہ آیا۔ ان کے ہی مولویوں نے کہا اشرف علی رسول اللہ۔ سب نے کہا واہ واہ۔ ان کے بڑے نے کہا شیطان کا علم نبی کریم سے زیادہ ہے۔ سب نے برملا کہا ٹھیک۔ لیکن کسی نجدی شیخ کی برائی کرکے تو دیکھو شرک و بدعت کا فتوے لگ جائے گا۔ ان کے ہی نجدی پیشواؤں نے کہا گاندھی جی المدد کسی نے فتوے نہ لگایا نہ توحید بگڑے نہ ایمان جائے۔ شاہ سعود کے بت (فوٹو) ہر ہسپتال ہر دفتر میں علاقہ حجاز میں لٹکائے گئے ہیں نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ قرآن مجید کو زمین پر رکھ دیتے ہیں جوتے اوپر کر لیتے نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ کعبے کی طرف پیر کیئے لیٹے رہتے ہیں نہ ایمان جائے نہ توحید بگڑے۔ لیکن کسی حضرت جی کی طرف تو پیر کرکے دیکھو۔ اپنا مولوی ہو تو حاضر و ناظر بھی غیب دان بھی (ارواحِ ثلاثہ) نہ توحید بگڑے نہ ایمان جائے۔ بخلاف اہلسنت بریلوی گروہ کے کہ ان کے نزدیک بجز عظمت رسول اللہ کے کوئی شی نہیں عزتِ پاکِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل ہر چیز ہیچ ہے جس طرح دیوبندی وہابی پیشواؤں نے گستاخیٔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسارتیں کیں اور پھر بھی قوم میں ہیرو بنے پھرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی بریلوی ایسا کرتا تو اپنوں میں ہی خائب و خاسر۔ ذلیل و رسوا ہوتا۔ قسم بخدا۔ ہم نے اگر اعلیٰحضرت بریلوی کو اپنا آقا مانا۔ صدر الافاضل کو پیشوا سمجھا۔ حضرت حکیم الامت کو قائد بنایا تو صرف اس لیئے کہ انہوں نے عشقِ رسول اللہ کے درس پڑھائے۔ اور اس دور میں جب کہ حمقا اپنے تمغوں اور لقبوں کے درپے تھے۔ اپنے کو شیخ الہند وغیرہ کہلانے کے لالچ و تمنا میں مصروف تھے ہم لوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا کہ۔ میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں۔ ان اکابر نے خود کو گدا کہا۔ تو رب نے قوم کا آقا بنا دیا۔ بلند بانگ دعوے ہمیشہ باطل ہی کے ہوتے ہیں۔ مگر حق پرست کہتا ہے کہ ؎۔ میرا اتنا ہی دعوےٰ ہے کہ خادم مصطفےٰ کا ہوں۔ سنی کے سامنے عزت رسول سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اس کے مقابل نہ وہ اپنوں کو کچھ سمجھتا ہے نہ پرایوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ مستفتی محترم نے غلام رسول سعیدی صاحب کی ایک ایمان سوز غلطی کی جب نشاندھی کی تو میں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ یہ

اپنے ہی ہیں۔ فوراً محاسبہ اور گرفت کی تاکہ آئندہ نسلیں جب توضیح البیان کی یہ باطل عبارت پڑھیں گی تو اس کی تردید میں میرا یہ فتویٰ بھی ملاحظہ کرکے اہلسنت کی طرف سے غلط فہمی دور کرتے ہوئے اپنے دین کو بچاسکیں گے۔ اور کوئی بھی بریلویت سے بدظن نہ ہوگا۔

مسئلۂ قدرتِ کذبِ انبیاء پر سعیدی نعیمی تحریری مناظرے کی مکمل روئداد

ع۳۴۳ سعیدی صاحب نے اپنے مسلک پر کہ (معاذ اللہ) انبیاءِ کرام جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مجھ کو یکے بعد دیگر تین عدد خطوط کراچی مدرسہ نعیمیہ سے بھیجے۔ پہلا خط ایک صفحہ۔ دوسرا خط چھ صفحات ڈبل سائز رجسٹر) تیسرا خط چھ صفحات رجسٹر سائز ہر سہ کا خلاصہ بکدم انہی عبارت میں پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت علامہ مفتی اقتدار احمد خان صاحب دام ظلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاج گرامی ہمایوں گرامی نامہ باصرہ نواز ہوا۔ توضیح البیان کے اس عبارت پر کہ انبیاء جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مگر بولتے نہیں آپ کا اعتراض غلط ہے یہ عبارت بالکل درست ہے اور یہی میرا عقیدہ ہے میرے پاس حسب ذیل دلائل ہیں۔ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی ذات سے امید قوی ہے کہ یہ تمام دلائل دیکھ کر پھر توضیح البیان کی عبارت کے بارے میں آپ کو خدشہ نہیں رہے گا۔ طالب دعا غلام رسول سعیدی غفرلہ ۷۸ ۱۲

دلیل نمبر اوّل:۔ یہ مسلک صرف میرا ہی نہیں بلکہ سب اہلِ سنّت کا ہے۔ آپ کے والد محترم حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالےٰ کا بھی یہ ہی مسلک ہے۔ **دلیل دوم**:۔ علامہ تفتازانی مصنف شرح عقائد نسفی ص۱۵۷ پر فرماتے ہیں۔ وَحَقِيْقَةُ الْعِصْمَةِ اَنْ لَّا يَخْلُقَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الْعَبْدِ الذَّنْبَ مَعَ بَقَاءِ قُدْرَتِهٖ وَاِخْتِيَارِهٖ وَهٰذَا مَعْنٰى قَوْلِهِمْ هِيَ لُطْفٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى يَحْمِلُهٗ عَلٰى فِعْلِ الْخَيْرِ وَيَزْجُرُهٗ عَنِ الشَّرِّ مَعَ بَقَاءِ الْاِخْتِيَارِ تَحْقِيْقًا لِلْاِبْتِلَاءِ۔ وَلِهٰذَا قَالَ الشَّيْخُ ابو منصور الماتریدی اَلْعِصْمَةُ لَا تُزِيْلُ الْمِحْنَةَ وَبِهٰذَا يَظْهَرُ فَسَادُ قَوْلِ مَنْ قَالَ اِنَّهَا خَاصَّةٌ فِي الشَّخْصِ اَوْ فِيْ بَدَنِهٖ يَمْتَنِعُ بِسَبَبِهَا صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْهُ وَلَوْ كَانَ الذَّنْبُ مُمْتَنِعًا لَمَا صَحَّ تَكْلِيْفُهٗ بِتَرْكِ الذَّنْبِ وَمَا كَانَ مُثَابًا عَلَيْهِ:۔

دلیل سوم:۔ انبیاءِ کرام معصوم ہوتے ہیں لیکن معصوم ہونے کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے لیا ہے۔ آپ کا مطلب تمام اہلسنت کے خلاف بلکہ صحیح تعریف وہی ہے جو امام اہلِ سنّت ابو منصور ماتریدی اور علامہ تفتازانی نے مراد لی ہے۔ یہی عقیدہ علامہ شمس الدین خیالی کا ہے۔ چنانچہ حاشیہ خیالی صفحہ نمبر ع۱۴۲ پر فرماتے ہیں:۔ وَاَمَّا تَعْرِيْفُهَا فَهِيَ مَلَكَةُ اِجْتِنَابِ الْمَعَاصِيْ مَعَ التَّمَكُّنِ فِيْهَا وَقَدْ يُعَبَّرُ عَنْ تِلْكَ الْمَلَكَةِ بِاللُّطْفِ لِحُصُوْلِهَا بِمَحْضِ.

بِلُطْفِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَفَضْلِہٖ وَمَنِّہٖ ۔ دلیل چہارم: تفصیلی گفتگو سے پہلے چند اصطلاحات کی وضاحت کردوں تاکہ بحث آسان ہو۔ علم عقائد والوں کی اصطلاح میں چند جملے سمجھنے اشد ضروری ہیں ۱۔ واجب لِذاتہٖ جس شی کا وجود عقلاً واجب اور عدم عقلاً محال ہو اور شی اپنے وجود میں جعل جاعل کی محتاج نہ ہو۔ ۲۔ ممتنع لِذاتہٖ جس شی کا عدم عقلاً واجب اور وجود عقلاً محال ہو۔ اور وہ شی اپنے عدم میں جعل جاعل کی محتاج نہ ہو۔ ۳۔ ممکن بالذات۔ یعنی جو محال عادی بھی ہو جاتی ہے۔ جس شی کا ہونا نہ ہونا عقلاً ممکن ہو۔ اگر جاعل نے وجود کو واجب کر دیا تو واجب بالغیر اور اگر عدم کو واجب کر دیا تو ممتنع بالغیر ۴۔ ممتنع بالذات: جو ممتنع بالغیر کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ کیونکہ ممتنع بالغیر کو امکانِ ذاتی لازم ہے:۔ ۵:۔ استحالہ شرعیہ۔ اجو شرعًا ناجائز ہو۔

۶۔ استحالہ عقلیہ۔ اجو عقلاً ناجائز۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز محال شرعی ہو۔ محال عقلی نہ ہو جیسے عبادتِ غیر اللہ۔ ۷۔ ممتنع لِذاتہٖ۔ کی ضد واجب لِذاتہٖ ہوتی ہے:۔

(اقول۔ امخالف نے یہ اصطلاحات اس زعم باطل میں لکھیں ہیں کہ گویا اس کے سوا ان کا علم کسی کو نہیں۔ اسی زعم نے کج روی و گستاخیِ رسول کا دروازہ کھولا اسی غرور نے علما کو رسوا کیا خواہ تفتازانی ہوں یا سعیدی۔ یہ اصطلاحات اپنی جگہ بالکل درست ہیں مگر مخالف کو ان کی سمجھ نہ آئے تو کیا کیا جائے؟ مخالف کے ان تمام دلائل کا جواب اختتام پر یا تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ جَلَّ مَجْدُہٗ دیا جا رہا ہے۔ اسی دلیل ۴ کی اس تمہید کے بعد مخالف لکھتا ہے۔)

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کذب ممتنع لِذاتہٖ ہو تو لازمًا اس کی ضد۔ صدق واجب لِذاتہٖ ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممکن ہیں اور ممکن کی صفت: واجب لِذاتہٖ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر صفات واجب لِذاتہا ہوں تو ان کا محل و موصوف بھی واجب اور اس صورت میں تعددِ واجب لازم آئے گا۔ جو شرک صریح کو مستلزم ہے۔ العیاذ باللہ۔ اقول۔ یہی تو مخالف کی نادانی ہے کہ اس صحیح بات کو توڑ مروڑ کر اپنی غلط بات کے درپے ہے جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا۔ دلیل نمبر پنجم :۔ اَلْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ بخاری جلد دوم صفحہ نمبر ۹۷۸ حضور اقدس صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہو گیا کہ عصمت جعل جاعل پر موقوف ہے اور جو چیز جعل جاعل پر موقوف ہو وہ ممکن بالذات اور واجب بالغیر ہو گی اس لیئے اس حدیث سے ثابت ہوا کہ معصوم کا گناہوں سے بچنا محال عادی ہے محال عقلی نہیں لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے۔ (اقول معاذ اللہ) احناف اہل سنت مسائل کلامیہ

میں امام محمد بن محمد بن محمود ابو منصور سمرقندی ماتریدی متوفی ۳۳۳ھ کے نظریات کے تابع ہیں اور شوافع امام ابو الحسن اشعری کے۔ اور ہر دو کا یہی مسلک ہے جو میں نے لکھا۔ **دلیل ششم** :۔ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ اپنی کتاب شرح فقہ اکبر ص۵۹ پر شیخ ابو منصور ماتریدی سے منقول عصمت کی تعریف کا ذکر کرتے ہیں :۔ اَلْعِصْمَةُ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلُطْفٌ مِّنْهُ وَلٰكِنْ عَلٰى وَجْهٍ يَبْقٰى اِخْتِيَارُهُمْ بَعْدَ الْعِصْمَةِ فِي الْاِقْدَامِ عَلَى الطَّاعَةِ وَالامتناعِ عَنِ الْمَعْصِيَةِ وَاِلَيْهِ مَالَ الشَّيْخُ ابو منصور الماتریدی

دلیل ہفتم :۔ علامہ تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ نے عصمت کی یہ تعریف لکھی ہے :۔ هِيَ لُطْفٌ مِّنَ اللّٰهِ تعالى يَحْمِلُهُ عَلٰى فِعْلِ الْخَيْرِ وَيَزْجُرُهُ عَنِ الشَّرِّ مَعَ بَقَاءِ الْاِخْتِيَارِ تَحْقِيْقًا لِلْاِبْتِلَاءِ۔

دلیل ہشتم :۔ اس کی شرح میں علامہ عبد العزیز پرہاروی لکھتے ہیں :۔ عِلَّتُهُ لِبَقَاءِ الْاِخْتِيَارِ وَهٰكَذَا التَّعْرِيْفُ مَنْقُوْلٌ عَنِ الْمُعْتَزِلَةِ وَلٰكِنْ لَمَّا كَانَ غَيْرَ مُخَالِفٍ لِتَعْرِيْفِ الْاَشَاعِرَةِ فِي الْمَآلِ ذَكَرَهُ تَائِيْدًا لِبَقَاءِ الْقُدْرَةِ۔ (نبراس ص۵۳۵) :۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت ماتریدی اشاعرہ اور معتزلہ سب کے نزدیک عصمت کی یہی تعریف ہے :۔ **دلیل نہم** :۔ علامہ شہاب الدین خفاجی اس کی شرح اپنی کتاب نسیم الریاض جلد چہارم ص۱۲۳ پر لکھتے ہیں :۔ (وَالْجُمْهُوْرُ) اَيْ اَكْثَرُ النَّاسِ وَمُعْظَمُهُمْ (وَكَسْبِهِمْ) لا انهم مُضْطَرُّوْنَ لِعَدَمِ قُدْرَتِهِمْ عَلٰى خِلَافِهِ۔ اِلَّا حُسَيْنًا النَّجَّارَ وَهُوَ حَسَنُ بْنُ مُحَمَّدٍ النَّجَّارُ الَّذِيْ يُنْسَبُ لَهُ الطَّائِفَةُ النَّجَّارِيَّةُ وَهُمْ فِرَقُ الْمُبْتَدِعَةِ الضَّالَّةُ (شفا) :۔ اور نسیم الریاض کی عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ جمہور مسلمین کا عصمت کے بارے یہی مسلک ہے کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں (اقول معاذ اللہ من هذه العقيدة الباطلة) :۔ اور جو لوگ عدم قدرت کا عقیدہ بناتے ہیں وہ فرقہ ضالہ ہے مبتدعہ ہے۔ (اقول۔ جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے) ملا علی قاری نے شرح شفا علی ہامش نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ص۱۳۸ پر نجار کو معتزلی قرار دیا ہے۔ (اقول تعجب ہے کہ ابھی آپ کہہ رہے ہیں معتزلی کا مذہب قدرت علی الذنب ہے اور اب نجار کو اس لیئے معتزلی کہہ رہے ہیں کہ اس نے عدم قدرت کا عقیدہ بنایا۔ صدق السعدی۔ دروغ گو را حافظہ نباشد) **دلیل دہم** :۔ جن لوگوں نے انبیاء کے لیئے گناہوں کو محال قرار دیا ہے وہ روافض کا ایک فرقہ ہے چنانچہ علامہ عبد العزیز پرہاروی نبراس صفحہ نمبر ۵۲۵ پر لکھتے ہیں :۔ قَالَ هُمْ (بَعْضُ الشِّيْعَةِ) اِنَّهَا اَيِ الْعِصْمَةُ خَاصَّةٌ فِيْ نَفْسِ الشَّخْصِ اَيْ وُجُوْدِهِ اَوْ فِيْ بَدَنِهِ يَمْتَنِعُ بِسَبَبِهَا صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْهُ :۔

دلیل ۱۱ یازدہم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اپنی تفسیر نور العرفان صفحہ نمبر

صفحہ ۱۴۳ پر لکھا۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ ممتنع بالذات ہے۔ کیونکہ پیغمبر کا جھوٹ ممتنع بالغیر ہے اور رب تعالیٰ تمام سے زیادہ سچا تو اس کا سچا ہونا واجب بالذات ہونا چاہیے ورنہ اللہ کے صدق اور رسول کے صدق میں فرق نہ ہوگا۔ حکیم الامت قدس سرہٗ کی عبارت سے بھی میرے عقیدے کی تائید ہو رہی ہے۔ (اقول کیا عجیب اوندھی عقل ہے) **دلیل دوازدھم** (یعنی بارھویں دلیل) نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ ۲۹ پر ہے:۔ وَقَدْ تَقَرَّرَ اَنَّ الْعِصْمَةَ عِنْدَ الْمُتَکَلِّمِیْنَ اَنْ لَّا یَخْلُقَ اللّٰہُ فِی النَّبِیِّ ذَنْبًا وَعِنْدَ الْحُکَمَاءِ مَلَکَةٌ تَمْنَعُ مِنَ الْفُجُوْرِ حَاصِلَةٌ مِنَ الْعِلْمِ۔ (الخ) وَقِیْلَ۔ اَلْعِصْمَةُ خَاصَّةٌ فِی النَّفْسِ اَوِ الْبَدَنِ بِسَبَبِهَا یَمْتَنِعُ عَنْ صُدُوْرِ الذَّنْبِ وَیَابَاہُ اَنَّہٗ لَوْ کَانَ کَذٰلِکَ لَمَا اسْتَحَقَّ الْمَدْحَ وَالثَّوَابَ لِاَنَّهَا لَیْسَتْ دَاخِلَةً تَحْتَ الْاِخْتِیَارِ وَهُمْ مُکَلَّفُوْنَ بِالْاِتِّفَاقِ۔ اس عبارت سے پتہ چلا کہ انبیاء کرام بھی مکلف ہوتے ہیں:۔

دلیل تیرھویں:۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت جگہ جبراً و حکماً انبیاء کو گناہوں سے روکا۔ آیات ملاحظہ ہوں:۔

نمبر ایک:۔ حضرت آدم علیہ السلام سے خطاب فرمایا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ع۲ حضرت نوح کو روکا۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ع۳ حضرت موسیٰ و ہارون کو منع کیا ہے وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ ع۴ حضرت داؤد کو کہا گیا۔ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی ع۵:۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے نہی کا خطاب وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ع۶ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ یہ آیت بھی نبی کریم کے لیئے ہے ع۷ نبی علیہ السلام کو خطاب وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ۸۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ ع۹ لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ع۱۰ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ

دلیل چودھویں:۔ میر سید شریف جرجانی اپنی کتاب شرح مواقف صفحہ ۶۹۹ پر لکھتے ہیں۔ وَقَالَ قَوْمٌ اَلْعِصْمَةُ یَکُوْنُ خَاصَّةً فِیْ نَفْسِ الشَّخْصِ اَوْ فِیْ بَدَنِهٖ یَمْتَنِعُ بِسَبَبِهَا صُدُوْرُ الذَّنْبِ فِیْهِ یُکَذِّبُهٗ۔ اَیْ هٰذَا الْقَوْلُ اِنَّہٗ لَوْ کَانَ صُدُوْرُ الذَّنْبِ کَذٰلِکَ اَیْ مُمْتَنِعًا لَمَا اسْتَحَقَّ الْمَدْحَ بِذٰلِکَ اَیْ بِتَرْکِ الذَّنْبِ اِذْ لَا مَدْحَ وَلَا ثَوَابَ بِتَرْکِ مَا هُوَ مُمْتَنِعٌ:۔ وَاَیْضًا۔ فَالْاِجْمَاعُ مُنْعَقِدٌ عَلٰی اَنَّهُمْ اَیِ الْاَنْبِیَاءُ مُکَلَّفُوْنَ بِتَرْکِ الذُّنُوْبِ مُثَابُوْنَ بِالطَّاعَاتِ۔ وَاَیْضًا۔ فَقَوْلُهٗ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ یَدُلُّ عَلٰی مُمَاثَلَتِهِمْ بِسَائِرِ النَّاسِ فِیْمَا یَرْجِعُ اِلَی الْبَشَرِیَّةِ۔ وَالْاِمْتِیَازُ بِالْوَحْیِ لَا غَیْرُ فَلَا یَمْتَنِعُ صُدُوْرُ الذَّنْبِ عَنْهُمْ کَسَائِرِ الْبَشَرِ (اقول۔ کیا فرق رہا ایک گستاخِ رسول میں اور میر سید شریف میں اور

ان کے متبع سعیدی صاحب ہیں دیکھو نبی کی دشمنی کس حال تک پہنچا دیتی ہے ۔ **دلیل پندرھویں۔** قاضی عیاض مالکی شرح شفا جلد دوم کے صد ۱۲۵ پر لکھتے ہیں۔ وَالْجُمْهُوْرُ قَائِلٌ بِأَنَّهُمْ مَعْصُوْمُوْنَ مِنْ ذٰلِكَ مِنْ قِبَلِ اللّٰهِ تَعَالٰى مُعْتَصِمُوْنَ بِاخْتِيَارِهِمْ وَكَسْبِهِمْ اِلَّا حُسَيْنًا النَّجَّارُ فَاِنَّهٗ قَالَ لَا قُدْرَةَ لَهُمْ عَلَى الْمَعَاصِيْ اَصْلًا۔ ۔ اس عبارت سے قاضی عیاضؒ کا عقیدہ بھی پتہ چل گیا۔ لہٰذا آپ کا اعتراض مجھ پر اور میری کتاب توضیح البیان پر غلط ہے۔ مجھ پر اور میری کتاب پر فتویٰ لگانے سے پہلے ان اکابر پر فتوے لگاؤ فقط والسلام غلام رسول سعیدی دارالعلوم نعیمیہ بلاک ۱۵ دستگیر کالونی کراچی نمبر ۳۸ ۔!

باوجود اس بات کے کہ یہ تمام دلائل نہایت کمزور اور سعیدی صاحب کا ان دلائل کی آڑ میں اپنے باطل عقیدہ کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنا نہایت ضلالت و گمراہی ہے اور گستاخیٔ رسول اللہ پر ڈھٹائی کرنا ہے ۔ جو ایک سنی بریلوی کہلوانے والے کے لیے ہرگز زیب نہیں ۔ مگر میں نے نہایت انصاف کے ساتھ سعیدی صاحب کے تمام دلائل لفظاً ۔ حرفاً حرفاً لکھ دیئے اگرچہ یہ گستاخانہ نظریات لکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا ۔ لیکن تین وجوہ کی خاطر لکھے گئے ہیں ۔ پہلی وجہ یہ کہ معترض وہابی صاحب اور دیگر وہابیان کو معلوم ہو جائے ۔ ہمارے سنی عالم غلام رسول سعیدی صاحب نے یہ عقیدہ کسی گستاخی یا تعصب یا دشمنی رسول پاک یا بے ادبی انبیاء کے ارادہ سے نہیں لکھا ۔ بلکہ جلدی میں کم فہمی سے ان دلائل کے ماتحت یہ غلط عقیدہ بنا بیٹھے اور محض کذب باری تعالیٰ کے وہابیانہ عقیدے کو توڑنے کے لیے یہ غلط راہ اختیار کر لیا اور میں حتماً کہتا ہوں کہ جن دلائل مندرجہ بالا کا سعیدی صاحب نے سہارا پکڑا ہے ان کا جواب اور ان کی تردید معترض صاحب یا کسی بھی وہابی دیوبندی کی جرأت نہیں ۔ اگر دیوبندی اکابر ان دلائل کو دیکھیں تو بغلوں میں منہ دبائیں ۔ اور صمیت و بکمیت کے سوا چارہ نہ رہے ۔ اور سعیدی وغیرہ پر ایسے اعتراض کرنا بھول جائیں ۔ بخلاف دیوبندیت اور وہابیت کے کہ وہ لوگ جو بھی عقیدہ بناتے ہیں محض تعصب گستاخی اور دشمنیٔ انبیاء کی بنا پر ۔ بغیر دلائل بناتے چلے جاتے ہیں ۔ دوسری وجہ یہ کہ سعیدی صاحب کے دل میں یہ حسرت باقی نہ رہے کہ اقتدار احمد نعیمی قادری بدایونی نے میری فلاں بات کا جواب نہیں دیا ۔ تیسری وجہ یہ کہ ناظرین و قارئین اس مضمون کو پڑھنے میں پورا فہم حاصل کر سکیں اور سمجھنے میں تشنہ نہ رہیں تا کہ انصاف و عقلِ ایمانی و فہم عرفانی کی خداداد میزان میں تول کر اپنے عقیدے گمراہی سے بچا سکیں اور آئندہ نسلوں کو پتہ لگ جائے کہ باطل کا کہاں تک شور ہوتا ہے اور حق میں کتنا زور ہوتا ہے فَبِسْمِ اللّٰهِ مَا فِيْ اللّٰهِ حَسْبِيَ اللّٰهُ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ اعتصمت باللہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۔

پہلی دلیل کا جواب:- علامہ نے کہا کہ سب اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے یہ بات علامہ کی کم علمی ہے اور بلا تحقیق اتہام محض ہے۔ حقیقت یہ ہے تمام اکابر اہل سنت کا اصلاً عقیدہ یہی ہے کہ انبیاءِ کرام گناہِ کبیرہ و صغیرہ پر ہرگز ہرگز قادر نہیں۔ وہ ہستیاں گناہ کر سکتی ہی نہیں گناہ کے معاملے میں انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام بالکل بے اختیار و بے قدرت ہیں اسی لیئے انبیاءِ کرام صرف امر میں مکلف ہوتے ہیں نہی میں مکلف نہیں ہوتے قرآن پاک میں جتنی بھی نواہی اور ممانعتیں وارد ہوئی ہیں ان میں بعض اگرچہ ظاہراً انبیاء سے خطاب ہیں مگر حقیقتاً وہ تمام ممانعتیں عوام امت کو ہیں۔ ہاں امر میں انبیاءِ پاک مکلف ہوتے ہیں اور ان کو عبادات بلکہ ہر فعل پر یہاں تک کہ سونے جاگنے کھانے پینے پر ثواب ملتا ہے۔ سعیدی صاحب کی پیش کردہ جتنی عبارتوں میں بھی مکلف ماننے کے عقیدے کا ذکر آیا ہے وہ سب مکلف فی الامر کے لیئے ہیں علامہ نے اپنی باطلیت کو بچانے کے لیئے دھڑا دھڑ بزرگوں کی عبارتوں پر قلم تو چلایا ہے۔ مگر بیچارے اپنی ان عبارتوں کو خود بھی نہ سمجھ سکے۔ اگلی سطور میں با دلائل ثابت کیا جائے گا کہ تمام اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ انبیاءِ کرام نہ جھوٹ بول سکتے ہیں نہ بولتے ہیں وہ پاک ہستیاں گناہوں پر قادر ہی نہیں ہاں تین شخصوں نے انفرادی اور ذاتی طور پر یہ لکھ دیا کہ معاذ اللہ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہوتے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک بھی گناہ کبیرہ نہیں بلکہ گناہ صغیرہ مراد ہے۔ اس لیئے کہ سب عبارتوں میں ذنب ہی لکھا ہے اور ذنب دو قسم کا ہے۔ صغیرہ و کبیرہ۔ اسی کا دوسرا نام معصیت ہے۔ جب یہ بزرگ جگہ جگہ لفظِ ذنب استعمال کر رہے ہیں تو ہم کو کیا مصیبت ہے کہ خواہ مخواہ کبیرہ ہی مراد لیں اور ان کو گناہ گار بنائیں۔ جہاں تک ہو سکے مسلمین کی عزت بچانی چاہیئے۔ حدیث پاک میں ہے۔ ذکروا موتاکم بالخیر (جامع صغیر) جب ایک بچنے کی راہ نکل رہی ہے تو کیوں فقط اپنی نادانی کی بنا پر غلط مطلب نکال کر خود بھی گنہگار بنو اور ان کو بھی گنہگار و ملعون کرو۔ اہل سنت میں تین لوگوں میں سے اصل ایک شخص نے عقیدہ بنایا وہ ہیں امام منصور ماتریدی کا۔ جنہوں نے سب سے پہلے کہا کہ انبیاء کو گناہ میں اختیار ہے مگر مراد گناہ صغیرہ لیا۔ ان کی دیکھا دیکھی علامہ تفتازانی کو بھی جرأت ہوئی مگر حد میں رہتے ہوئے۔ مگر تیسرے بڑے میر شریف نے شرح مواقف میں۔ گستاخی میں تجاوز اور بالکل نجدی مار کر گمراہی پھیلائی، امام منصور اپنے زمانے میں اہل سنت کے امام تھے ان کی صرف وہی بات مانی جائے گی جو اصولِ شریعت کے مطابق ہو گی۔ ان کے ذاتی نظریات کے ماننے میں نہ ہم ان کے مقلد ہیں نہ مکلف۔ یہ غلط باتیں ان کے ذاتی ہیں۔ جماعتِ اہل سنت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ذاتی انفرادی اقوال تو لاکھوں ایسے مل جائیں گے کہ جن کو اگر تسلیم کیا جائے تو دین ایک کھلونا بن جائے۔ میر شریف کے بعد ہمارے سعیدی صاحب

کو مصنف بننے کا شوق چرایا تو گستاخی میں دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ لیکن زمانہ بتارہا ہے کہ ابابیل سے فیل ہلاک ہوتے چلے گئے اگر کانٹے نکلتے ہیں تو قدرت پھول بھی ظاہر فرماتی ہے۔ بقول شخصے ہر فرعونے را موسیٰ۔ بہرحال مجھ پہ فرض منصبی ہے کہ میں ثابت کروں کہ تمام اہل سنت کا عقیدہ کیا ہے۔ میں نے جو امام منصور رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی عبارت کا مطلب گناہ صغیرہ کی طرف پھیرا ہے وہ صرف ان کو بچانے کے لیے ورنہ اگر کوئی ثابت کر دے کہ امام منصور نے گناہ کبیرہ ہی مراد لیا ہے تو امام منصور کی تردید کی جائے گی۔ کیونکہ ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد۔ فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد۔ غلط نظریات سے سعیدی صاحب جیسے بھٹک سکتے ہیں۔ مگر میرے رب نے حفاظت فرمائی ہے اور اب مجھ کو اپنے کرم سے محفوظ لوگوں کے خدام میں داخل فرمایا۔ ابتدائے شباب میں جب کبھی گناہ کے قریب ہوا تو میرے کریم رب نے غوث پاک کے صدقہ اس طرح مجھ کو گناہ سے بچایا کہ بعد میں خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی اور اب جب کہ مکمل محمد جوانی کے دور میں ہوں جب کبھی گناہ کرنے کا خیال آتا ہے تو دل پکارتا ہے کہ تیری قسمت میں یہ گناہ نہیں ہے۔ اس آواز کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میں گناہ کرسکتا ہوں مگر کرتا نہیں۔ کس کی بدبختی اس کو اس عقیدے پر لائے کہ معاذ اللہ انبیاء بھی گناہ کرسکتے ہیں مگر کرتے نہیں۔ فَمَا قَدَرُوا الرَّسُوْلَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ کس کی بدقسمتی اس کو مسلک سے بھگا رہی ہے۔ سچا مسلک یہی ہے کہ انبیاء کرام مرسلین عظام کروڑہا قدرتوں پر قادر ہیں۔ مگر گناہ پر قادر نہیں۔ اے ہمارے رب ہم کو اس سچے مسلک پر رہنے کی قدرت عطا فرما۔ امام علامہ قاضی عیاض قدس سرہٗ شفا شریف میں فرماتے ہیں مَنْ اٰمَنَ بِالْوَحْدَانِیَّۃِ وَصِحَّۃِ النُّبُوَّۃِ وَبِنُبُوَّۃِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلٰکِنْ جَوَّزَ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ الْکِذْبَ فِیْمَا اَتَوْا بِہٖ اِدَّعٰی فِیْ ذٰلِکَ الْمَصْلَحَۃَ بِزَعْمِہٖ اَمْ لَمْ یَدَّعِھَا فَھُوَ کَافِرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبوت کی حقانیت اور ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتقاد رکھتا ہو با ایں ہمہ انبیاء علیہم السلام پر ان باتوں میں کہ وہ اپنے رب کے پاس سے لائے کذب جائز مانے بزعم خود اس میں کسی مصلحت کا ادعا کرے یا نہ کرے ہر طرح بالاجماع کافر ہے سبحٰن اللہ حضرت انبیاء علیہم افضل الصلوٰۃ والتسلیم پر کذب جائز ماننے والا با لاتفاق کافر ہوا۔ یہی مذہب مسلک اعلیحضرت کا ہے۔ چنانچہ سبحان السبوح صہ ۳۶ پر ہے کہ اگر عصمت یعنی امتناع صدور و عدم قدرت ہی لیجئے تاہم امتناع ذاتی نہیں کہ سلب عصمت خود زیر قدرت۔ سبحان اللہ اعلیحضرت بریلوی نے کیسی واضح عبارت فرمائی بالکل یہی میرا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں اور عصمت کا معنے امتناع صدور اور گناہ پر عدم قدرت ہے ہاں سلب عصمت ہوسکتی ہے۔ مگر جب تک سلب نہ ہو اور عصمت باقی اس وقت تک ہرگز کوئی نبی علیہ السلام گناہ پر قادر نہیں۔ سعیدی صاحب کہتے ہیں کہ عصمت بھی ہے اور قدرت بھی یہ اجتماع ضدین ہے۔ ایسی غلطی کسی نے نہ کی۔ جنہوں نے قدرت گناہ مانا ہے انہوں نے امتناع صدور و عدم قدرت نہیں مانا سعیدی صاحب کو چاہیئے کہ پردے میں نہ رہیں بلکہ کھل کر سامنے آئیں اور سرے سے عصمت کا انکار کریں

جیسے کہ مودودی صاحب نے اور جیسے کہ قاسم نانوتوی نے تصفیۃ العقائد ص ۱۴ میں کھل کر انکار کیا۔ یہ تھا اعلیٰحضرت کا مسلک جو انکی کتاب سے ظاہر ہوا اسی مسلک کو اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۸ پر فرماتے ہیں۔ اور جب ۲۶ معصوم مِنَ اللّٰہِ وموید بالمعجزات ہو کر کذب کا امکان وقوعی بھی نہ رہے مگر بشرط نفس ذات امکان ذاتی ہو۔ اعلیٰحضرت نے کیسی شاندار وضاحت فرمادی کہ عصمت کی وجہ سے وقوعِ ذنب کا امکان و قدرت بھی نہیں مگر عصمت سے ہٹ کر صرف ذات اور تشخص کو دیکھا جائے تو امکان بالذات ہے۔ یعنی امتناع بالغیر کی وجہ سے قطعاً قدرت نہیں۔ صدر الافاضل سید نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب العقائد ص ۸ مطبوعہ مرادآباد میں لکھا۔ س معصوم کس کو کہتے ہیں۔ ج جو اللہ کی حفاظت میں ہو اور اس وجہ سے اس کا گناہ ناممکن ہو۔ علامہ سید نذیر الحق قادری جو اہل سنت کے اکابر میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب الاسلام ص ۲۲۸ پر لکھا۔ ہم انبیاء کرام کو معصوم کہتے ہیں اور اس کہنے سے یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ ان میں گناہِ خلاوندِ عالم کا مادہ اور سامان ہی نہیں۔ کیونکہ انبیاءِ میں جب کوئی صفت ہی نہیں تو پھر ان سے برے افعال صادر ہونا بھی ممکن نہیں۔ یہ تھے اکابر اہلِ سنت کے اقوالِ زریں۔ کیا سعیدی صاحب کے نزدیک یہ سب شیعہ رافضی اور کیا صدر الافاضل و اعلیٰحضرت نے بھی شیعہ روافض کا مذہب اختیار کیا؟ (معاذ اللہ) حقیقت یہ ہے کہ انبیاءِ کرام کے مقابل بجز آپ کے کسی اہلسنت نے اتنی دیدہ دلیری اور بیباکی کا مظاہرہ نہ کیا یہ باطل راستہ آپ نے ہی اختیار کیا خدا تعالیٰ ہدایت دے:۔

جواب دلیل دوم:۔ سعیدی صاحب نے مجھ کو تین خط یکے بعد دیگرے لکھے جن میں سے ضروری اور صحیح مناظرے سے متعلق باتیں میں نے درج کر دیں ان کے جواب میں میں نے سعیدی صاحب کو چار خط لکھے جن میں پہلا خط تین صفحات پر دوسرا خط چار صفحات پر اور تیسرا خط گیارہ صفحات پر چوتھا خط آٹھ صفحات پر بڑا رجسٹر سائز پر لکھے گئے۔ ان کی پوری عبارت تو درج نہیں ہو سکتی۔ خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ صرف تین آدمی مسلک اہلِ سنت سے ہٹے ہیں باقی جتنے بھی حوالے سعیدی صاحب نے لکھے وہ سب بزرگ صرف لوگوں کے مسلک بیان کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ فلاں نے عصمت کی تعریف یہ کی فلاں نے یہ کی وغیرہ وغیرہ اپنا مسلک ظاہراً یا قرینۃً نہیں بتایا اور پھر تماشہ یہ کہ یہی مصنفین کرام اپنی ان ہی کتابوں میں عصمت کی صحیح اور عدمِ قدرت والی تعریف بھی کر رہے ہیں مگر سعیدی صاحب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ سعیدی صاحب کے دلائل میں جن عبارتوں میں یہ لکھا ہے کہ نبی کا گناہ پر قادر ہونا جمہور کا مذہب ہے۔ یہ بات ان کی اپنی خود ساختہ بات ہے کسی جمہور کا یہ مذہب نہیں ہے۔ وہ کون جمہور ہے جس کو اعلیٰحضرت۔ صدر الافاضل۔ حکیم الامت تو نہ سمجھ سکے مگر آج سعیدی صاحب سمجھ گئے اعلیٰحضرت حکیم الامت رحمۃ

رحمۃ اللہ علیہ نے صاف فرمایا کہ انبیاءِ کرام گناہ پر قادر ہی نہیں ہوتے۔ چنانچہ حاشیہ بخاری غیر مطبوعہ کے صفحہ ۹۷۸ پر ہے:۔ قَوْلُہٗ المعصوم مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ (الخ)۔ لَیْسَ الْمُرَادُ بِالْمَعْصُوْمِ۔ اَلْمَعْصُوْمُ الِاصْطِلَاحِیُّ اَعْنِیْ غَیْرَ قَادِرٍ عَلَی الذَّنْبِ کَمَا ھُوَ شَانُ الْاَنْبِیَاءِ بَلِ الْمُرَادُ بِہِ الْمَحْفُوْظُ کَمَا ھُوَ شَانُ الْاَوْلِیَاءِ اَوِ الْمَمْنُوْعُ کَمَا ھُوَ حَالُ اَکْثَرِ الصَّالِحِیْنَ فَعِصْمَۃُ الْاَنْبِیَاءِ بِطَرِیْقِ الْوُجُوْبِ وَعِصْمَۃُ غَیْرِھِمْ بِطَرِیْقِ الْجَوَازِ کَذَا فِی الْعَیْنِیْ۔ (ترجمہ):۔ اس روایت میں معصوم سے مراد اصطلاحی معصوم نہیں یعنی اصطلاحِ شریعت میں عصمت کا معنیٰ ہے۔ گناہ پر قادر نہ ہونا یہ انبیا کی شان ہے۔ بلکہ یہاں مراد یا معصوم سے محفوظ ہے اور یا مراد ممنوع ہے۔ محفوظ اولیاء اللہ ہوتے ہیں ممنوع صالحین ہوتے عصمتِ انبیاء وجوبی و لازمی شئی ہے اور عصمتِ غیر جوازی چیز ہے۔ سعیدی صاحب کی اس دلیل کی غلطی بالکل عیاں ہے۔ کہ جب انبیاء میں خلقتِ گناہ تھا ہی نہیں۔ تو گناہ کر سکنا کیا مطلب ہے تفتازانی صاحب کا یہ کہنا مع ابقائِ قدرتِ تریم کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قدرت سلبِ عصمت پر ہے۔ جیسا کہ اعلحضرت نے فرمایا سلبِ عصمت زیرِ قدرت ہے اور کس کی زیرِ قدرت! باری تعالیٰ کے زیرِ قدرت کہ جب چاہے عصمت ختم کر دے نہ کہ خود انبیاء کے زیرِ قدرت انبیاءِ کرام اپنی عصمت ختم نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ختم کرنے پر قادر ہے۔ لیکن جب تک عصمت قائم ہے۔ انبیاءِ کرام گناہ پر قادر نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر عصمت ختم ہو جائے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ گناہ کر سکتے ہیں۔ مگر چونکہ عصمت نبوت کو مستلزم ہے۔ سلبِ عصمت سے سلب نبوت بھی ہو گی۔ مگر یہ فطرت اور وعدۂ الٰہیہ کے خلاف ہے اس لیئے ممتنع ہے۔ دلیل دوم کا جواب دینے کے بعد اب اپنی تحاریر کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ جس میں۔ علامہ کی تمام باقی دلیلوں اور ان کی خطوط کی دیگر لغویات کا جواب بھی ہو گا حقیقتِ عصمت وہ نہیں جو علامہ تفتازانی اور مولانا سعیدی صاحب نے لکھ دی توضیح البیان کی عبارت کچھ تو درجلد بازی کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علوم میں جب کبھی اختلافات کی خلیج وقوع پذیر تو اس کی بڑی وجہ یہ ہی ہوتی رہی کہ مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ایک ہی پہلو کو اوّل سے ہی نظریہ بنا لیا اور اسی پر جمود کیا اور جب یہ بات ٹھان لی کہ ہم نے اس نہج پر چلنا ہے اور اسی پر مصر رہنا ہے۔ اسی کو ٹھوس مسلک بنانا ہے تو ذہن و دماغ تحقیق سے عاری ہو جاتے ہیں اور کسی حقیقت کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتے۔ فرقہ پروری کی جڑ بنیاد سب سے بڑی یہی ارادۂ ذہنی اور خیالی کیفیت ہے۔ اور اسی سے انسان میں غرور و تکبر کے سوتے پھوٹتے ہیں پھر انسان سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہو سکتا اور مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ یہی خیالِ خام اس کی دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی شخص کو اپنے علم پر غرور ہوا تو رب کریم نے کسی بھی چھوٹے

انسان سے ایسی خست آمیز شکست دلوائی کہ ساری عمر کی دل تنگی نصیب ہوئی اور اسی افسوس میں فوت ہوگئے۔ چنانچہ ملا واحدی جب شیراز سے ہندوستان آئے تو عبدالحکیم سیالکوٹی سے ایک صیغہ بتانے پر شکست کھاگئے عبدالحکیم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس وقت چھوٹی عمر میں تھے۔ ملا واحدی اسی شکست کے رنج سے جانبر نہ ہوسکے۔ مولانا مہر الدین صاحب قبلہ نے اپنی شرح مبانی کے ص۸ پر علامہ تفتازانی کے متعلق بھی اسی قسم کا واقعہ لکھا ہے کہ لقمان معتزلی کی وجہ سے میر سید شریف جرجانی سے ایسی شکست کھاگئے کہ اسی غم میں فوت ہوگئے۔ آخر یہ ذلت کی شکست کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ جب کسی سے نادانستہ طور پر گستاخی ہو جاتی ہے تو اس کو دنیا میں اس طرح پر سزا دے دی جاتی ہے یہ سزا گستاخیٔ انبیاء کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور جب کوئی دانستہ گستاخی کرے تو اس کو آخرت میں سزا ملتی ہے۔ یہ خوش بختی ہے کہ دنیا میں سزا مل جائے جن کو دنیا میں سزا نہ ملے اُن کو آخرت میں ملتی ہے جب تک توبہ نہ کرے۔ بزرگ صحابی حضرت حسّان آخر عمر میں نابینا ہوگئے تھے خود فرماتے تھے کہ مجھ کو سزا ملی ہے اس بات کی کہ میں نادانی سے واقعۂ تہمتِ ام المومنین میں شریک ہوگیا تھا۔ (تفسیر کا باب بخاری شریف جلد دوم ص۵۹۷) اللہ کریم ہم سب کو گستاخی سے بچائے۔ آمین اگر علامہ تفتازانی اور ماتریدی صاحب کو بھی کوئی سمجھانے والا سمجھا دیتا تو یقیناً وہ دونوں حضرت اس بطلان سے رجوع کر لیتے۔ سعیدی صاحب کو خاصا سمجھا دیا گیا اور وہ اپنے آخری خط میں در پردہ خفیف اشاروں دبے لفظوں میں اپنی شکست تسلیم بھی کر چکے ہیں۔ ان کے ترکشِ علم میں دلائل کے سب تیر ختم ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی تک ان کو توبہ ور جوع کی توفیق نہیں ملی۔ میری دعا ہے کہ یا اللہ میرے سعیدی صاحب دنیا سے اِس گستاخی کے ساتھ نہ جائیں منزلِ مقصود اور راہ ہدایت وادیٔ علم وتحقیق میں تب حاصل ہوتی ہے جب انسان توفیقِ اللہ کے سہارے محض مخلص بن کر خشیت الٰہی سے وابستہ ہو کر ذاتی نظریات ومسالک اختراعیہ یکسر خالی الذہن ہو کر قدم اٹھائے۔ وَقَاكَ عِلْمُكَ۔ کا زعم باطل کبھی خیر کا طالب نہیں ہوتا سعادتِ ابدی تو وقانی فَضْلُ رَبِّیْ سے ہی ملتی ہے۔ جس طرح کہ تمام مسائل میں ایک سے زیادہ پہلو مل جاتے ہیں نظریاتِ کثیفہ ولطیفہ واقوالِ صادقہ وکاذبہ مل جاتے ہیں۔ اسی طرح۔ عصمتِ انبیاءِ کرام میں بھی تین نظریات پائے جاتے۔ پہلا نظریہ اہل سنت کا۔ دوسرا نظریہ حکما کا۔ تیسرا نظریہ معتزلہ کا۔ مسلک اہل سنت میں عصمت کی تعریف یہ ہے کہ گناہ پر انبیاءِ کرام قادر ہی نہیں ہوتے اور اطاعت بشانِ امتیازی پر قادر ہوتے ہیں۔ حکماء کے نزدیک عصمت ایک ملکہ ہے گناہ سے بچنے کا اس ملکے کے باوجود گناہ پر قادر ہوتے ہیں۔ معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ عصمت اللہ کی طرف سے ایک ایسا لطف ہے۔ کہ جس کی وجہ سے

شخص معصوم شخص باوجود قادر ہونے کے گناہ کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظریے باطل ہیں۔ اور درپردہ عصمت کا انکار ہے۔ کیونکہ یہ سنت محفوظین کی ہے نہ کہ معصومین کی تھا اور معتزلہ بوجہ خوفِ طعن کھل کر عصمت کا انکار نہ کر سکے تو عصمت کی تعریف بدلنے کی کوشش کی۔ تاکہ جان بھی بچ جائے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اس دور کے بیباک پیشواؤں نے اِن ہی باطل نظریات کو دیکھ کر کھل کر عصمتِ انبیاء کا انکار کر دیا۔ دیکھو قاسم نانوتوی کی کتاب تصفیہ عقائد صفحہ ۲۱ ۔ صاف منکر ہوا۔ اسی طرح مودودی صاحب صاف انکاری ہوئے۔ بات ایک ہی ہے حکماء و معتزلہ منکر ہوئے ھیرا پھیری کر کے۔ یہ منکر ہوئے صاف صاف۔ علامہ سعیدی صاحب نے بھی معتزلہ کے نظریے کو قبول کیا۔ اور یہی دو نظریے پیش کیے۔ اہل سنت کا مسلک بالکل صاف ہے جس سے امتیازی طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ معصوم اور محفوظ مِنَ اللہ اور ممنوع مِنَ اللہ میں کیا فرق۔ شرح تجرید کے مولف شرح ہذا کے صفحہ ۱۰۸ پر لکھتے ہیں:۔ اَلْعِصْمَةُ عِنْدَ الْاَشَاعِرَةِ هِيَ الْقُدْرَةُ عَلَى الطَّاعَةِ وَعَدْمُ الْقُدْرَةِ عَلَى الْمَعْصِيَةِ وَعِنْدَ الْمُعْتَزِلَةِ هِيَ لُطْفٌ مِنَ اللهِ لَا يَكُوْنُ لَهٗ مَعَ ذَالِكَ دَاعٍ اِلٰى تَرْكِ الطَّاعَةِ وَاِرْتِكَابِ الْمَعْصِيَةِ مَعَ قُدْرَتِهٖ عَلٰى ذَالِكَ۔ وَعِنْدَ الْحُكَمَاءِ هِيَ مَلَكَةٌ تَمْنَعُ صَاحِبَهَا مِنَ الْمَعَاصِيْ۔ (ترجمہ)۔

اہلِ سنت اشاعرہ کے نزدیک عصمت یہ ہے کہ معصوم شخص طاعت پر پورا ہر وقت پر قادر ہے اور گناہ پر کبھی قادر نہ ہو۔ معتزلہ یعنی موجودہ وہابیہ فرقہ کہتا ہے کہ عصمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطف ہے جس کے ذریعے معصوم گناہ نہیں کرتا مگر قادر رہتا ہے حکما یعنی فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ عصمت ایک ذاتی ملکہ اور مہارت ہے۔ جس کے سبب سے معصوم کو گناہ سے بچنے کی مہارت ہوتی ہے۔ یہ دونوں مذہب بالکل غلط اور منشاءِ الٰہیہ کے منافی ہیں۔ شرح تجرید کی یہ عبارت بالکل صاف اور حقیقت پر مبنی ہے۔ یہی اعلیٰحضرت اور صدر الافاضل اور حضرت حکیم الامت نے اختیار فرمائی۔ مگر افسوس کہ ہمارے سعیدی صاحب امتناع اور محال کے چکر میں پھنس کر اتنی صاف عبارت اور اکابرِ دین کے مسلک سے فرار ہوئے اور شرح تجرید کی عبارت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ شرح تجرید کا مصنف نصیر الدین طوسی غالی شیعہ ہے لہٰذا اس کی نقل ہم کو مفید نہیں۔ کتنی نادانی کی بات ہے حضرت یہ نقل نہیں بلکہ خبر ہے۔ آپ کے نزدیک صاحب شرح زیادہ سے زیادہ کافر متصور ہوگا۔ تب بھی خبر معتبر ہے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ کافر کی خبر معتبر ہے۔ چنانچہ فتاوے دُرِّ مختار مجرد صفحہ نمبر ۲۱ پر ہے:۔ وَيَجِبُ طَلَبُهٗ اِنْ ظَنَّ ظَنًّا قَوِيًّا قُرْبَهٗ دُوْنَ مِيْلٍ بِاَمَارَةٍ اَوْ اِخْبَارِ عَدْلٍ:۔ (ترجمہ) متیمم کا پانی تلاش کرنا فرض ہے۔ اگر قوی گمان ہو کہ پانی میل سے کم ہے یہ گمان یا علامات سے ہو یا کسی بھی عادل کے خبر دینے سے ہو۔ اس عبارت میں عادل میں مسلمان ہونے کی قید نہیں ثابت ہوا کہ عادل کافر کی بھی

خبر معتبر ہے۔ کیونکہ کافر بھی اگر اپنے دینی لحاظ سے فاسق و فاحش نہ ہو تو عادل ہے۔ چنانچہ فتاوٰے شامی درمختار جلد چہارم ص۵۲۲ پر ہے۔ وَمِنَ الذِّمِّیِّ لَوْ عَدْلًا فِیْ دِیْنِہٖ عَلٰی مِثْلِہٖ۔ (ترجمہ) اور ذمی کافر کی گواہی اپنے مثل کے خلاف معتبر ہے جب کہ ذمی اپنے دین کے اعتبار سے عادل ہو۔ نتیجہ ثابت ہے کہ کافر عادل کی خبر معتبر ہے اصولِ فقہ کی مشہور و معتبر کتاب نور الانوار ص۱۹۱ پر ہے:۔ وَاِنْ کَانَ لَا اِلْزَامَ فِیْہِ اَصْلًا یَثْبُتُ۔ بِاَخْبَارِ الْاٰحَادِ بِشَرْطِ التَّمْیِیْزِ دُوْنَ الْعَدَالَۃِ یَعْنِیْ یُشْتَرَطُ اَنْ یَّکُوْنَ الْمُخْبِرُ مُمَیِّزًا صَبِیًّا کَانَ اَوْ بَالِغًا حُرًّا کَانَ اَوْ عَبْدًا مُسْلِمًا کَانَ اَوْ کَافِرًا عَادِلًا کَانَ اَوْ فَاسِقًا:۔ (ترجمہ)۔ خبر غیر الزامی میں عدالت شرط نہیں صرف سمجھ شرط ہے لہٰذا ایک شخص کی خبر بھی معتبر ہے خبر دینے والا بچہ ہو یا بالغ آزاد ہو یا غلام مسلمان ہو یا کافر عادل ہو یا فاسق۔ کافر کی صرف گواہی مسلمان کے خلاف مردود۔ پس جب ذمی عادل کی خبر یہاں معتبر ہے شرح تجرید کی یہ عبارت حجت کیوں نہ ہو گی۔ اور پھر ہم کو تو اعلیٰحضرت صدر الافاضل اور حکیم الامت کے صریحاً اقوال حاصل ہیں۔ ان کو کون رد کر سکتا ہے۔ مزید براں یہ مسلک قرآن مجید سے بھی ثابت ہے چنانچہ سورت یوسف پارہ ع۱۲ آیت ع۳۸ پر ہے۔ مَا کَانَ لَنَا۔ اَیْ مَا صَحَّ وَلَا اَمْکَنَ لَنَا (الخ) اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ۔ اس آیت کا مطلب تفسیر مظہری میں اس طرح ہے۔ مَا کَانَ لَنَا۔ اَیْ مَا صَحَّ وَلَا اَمْکَنَ لَنَا (الخ) فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ خَلَقَنَا عَلٰی جِبِلَّۃِ التَّوْحِیْدِ وَعَصَمَنَا مِنَ الشِّرْکِ

ترجمہ:۔ نہیں پہنچتا ہم کو کہ ہم اللہ کا شریک بنائیں کسی چیز کو یعنی قدرت ہی نہیں ہم کو کیونکہ اللہ نے ہم کو جبلتِ توحید پر پیدا کیا اور شرک سے معصوم کیا۔ تفسیر مظہری پ۱۲ ص۳۱ جبلت فطرت کو کہتے ہیں اور فطرت بقولِ حدیث پاک ناممکن التغیر ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر جلد پنجم ص۱۲۹ پر فرمایا۔ وَنَظِیْرُہٗ قَوْلُہٗ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ۔ (ترجمہ)۔ حضرت یوسف کا یہ فرمان مَا کَانَ لَنَا مشابہ ہے رب تعالیٰ کے اس فرمان کے مَا کَانَ لِلّٰہِ تو جب اللہ کا بچہ بنانا ناممکن ہے پس انبیاء کا گناہ بھی ناممکن ہاں یہ ضرور ہے نظیر ہونا صرف ناممکن ہونے میں ہے ورنہ رب تعالیٰ کا محال بالذات ہے انبیاء کا بالغیر۔ لہٰذا یہ کہنا سراسر گمراہی ہے کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مذہب اہل سنت میں صغیرہ کبیرہ۔ شرک۔ کفر۔ انبیاء کرام سے ناممکن ہے۔ اور معصومین بالکل قادر علی الذنب والکذب نہیں۔ اس مسئلے کو مزید آسان کرنے کے لیئے تمہیدی طور پر دس الفاظ ذہن میں کرنے چاہیئے۔ ع۱ امتناع ع۲ محال ع۳ تکلف ع۴ کر سکنا ع۵ نہ کر سکنا ع۶ استحالہ ع۷ بالذات ع۸ بالغیر ع۹ قدرت ع۱۰ عدم قدرت۔ ہمارا اختلاف نہ امتناع میں نہ محال نہ استحالہ میں نہ ان ہر سہ کی تقسیم میں اور نہ معقول میں نہ قسموں میں ہم دونوں کو تسلیم ہے کہ امتناع دو قسم کا ہے ع۱ امتناع بالذات ع۲ بالغیر دونوں کا اتفاق ہے کہ محال دو قسم کا ہے ہم مانتے ہیں کہ استحالہ دو قسم کا ہے اور معصیت معصومین میں ممتنع بالغیر ہی ہے۔ صرف نزاع اس میں ہے کہ معصوم گناہ اور جھوٹ پر قادر ہے یا نہیں۔

سعیدی صاحب نے ان ہی اصول کو مان کر غلط راہ اختیار کی یہ آپ کی کم فہمی و ناسمجھی ہے۔ تمام انبیاء کرام حادث ہیں۔ کوئی قدامت کا قائل نہیں لہٰذا بالذات ممتنع کا بھی کوئی تصور نہیں کرتا۔ گناہ پر قادر نہ ہونا تو ممتنع بالغیر کی بھی صفت ہے۔ علامہ سعیدی نے اپنی اسی ناسمجھی میں مسلکِ اہلِ سنت متقدّمین و متاخرّین سے ہٹ کر اپنے تین مسلک بنائے۔ ع۱ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہیں۔ میں کہتا ہوں نعوذ باللہ منہا ع۲ علامہ صاحب کہتے ہیں انبیاء کرام ممنوعاتِ شرعیہ سے مکلّف ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام کو نہی کے ذریعے جبراً گناہ سے روکا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں استغفر اللہ منہا ع۳ سعیدی صاحب کا تیسرا عقیدہ کہ معصوم ہونے کا صرف یہ مطلب ہے۔ انبیاء پاک گناہ کرتے نہیں۔ البتہ کر سکتے ہیں۔ یہ تینوں عقائد باطل و سراسر گمراہی ہیں۔ کیونکہ مسلکِ اہلِ سنت کے خلاف ہیں مسلک اہل سنت یہ ہیں۔ ع۱ انبیاء کرام کسی گناہِ صغیرہ و کبیرہ پر قادر نہیں وہ پاک ہستیاں گناہ کر سکتی ہی نہیں کیونکہ معصوم ع۲ تکلف دو قسم کا ہے تکلف فی الامر تکلف فی النہی۔ انبیاء کرام صرف امر میں مکلّف ہیں اُن کو ہر نیکی پر ثواب ملتا ہے۔ جن بزرگوں نے انبیاء کو اجماعاً مکلف مانا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ لیکن میر شریف نے یہاں جو بد تمیزی دکھائی وہ اس کی بیہودگی ہے۔ اسی راستہ کو سعیدی صاحب نے اگر اختیار کر لیا تو سزاءِ اخروی کے لیے تیار رہیں۔ انبیاء کرام نہی کے مکلف قطعاً نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ معصوم ہیں۔ اسلام کے تمام فرقے عصمتِ انبیاء کے قائل ہیں۔ کسی نے ڈرتے ڈرتے مانا کسی نے عقیدے سے مانا کسی نے غلو کیا یہی وجہ ہے کہ عصمت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اپنے دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیا۔ شیعہ نے عصمت کو مانا مگر غلو کیا کہ آئمہ بھی معصوم ہیں یہ اُن کا بطلان ہے۔ ان کا علامہ مجلسی کہتا ہے اپنی کتاب حیاۃ القلوب جلد سوم صفحہ نمبر ع۱ پر کہ امام برحق کے لیے عصمت شرط ہے کیونکہ امام برحق ساری کائنات کا قابض ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں حرص ع۱ - حسد ع۲ غضب ع۳ - شہوت ع۴ نہیں ہوتا۔ اور جن میں یہ رذالتیں نہ ہوں وہ معصوم ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اختراعی ہیں۔ لہٰذا صغریٰ کبریٰ حدِ اوسط نتیجہ سب غلط اصغر و اکبر میں بھی توافق نہیں۔ معتزلہ نے عصمت کو مانا مگر ڈرتے ڈرتے۔ لہٰذا عصمت کی تعریف ایسی مسخ کی۔ کہ ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ ماتریدی صاحب کو ایسا چکر آیا کہ چکرا کر معتزلہ کے جال میں گرے۔ تفتازانی بھیڑ چال چل پڑے۔ میر شریف یا موجودہ سعیدی بے چارے کس شمار میں ہیں یہاں مسلکِ اہل سنت متقدّمین کو امام اشعری نے سہارا دیا اور متاخرّین کو امام احمد رضا نے سہارا دیا کہ سچی تعریف کر کے اُنہوں نے سنیوں کو مقامِ نبوّت سمجھایا اور معتزلیوں سے بچایا اور انہوں نے سنیوں کو عشقِ رسول سکھایا اور وہابیوں سے بچایا۔ جن کا نام پہلے اشعری تھا اب بریلوی ہوا اور جن کا نام پہلے معتزلی تھا۔ اب وہابی دیوبندی۔ مجموعی اہل سنت کا شروع سے یہ ہی عقیدہ رہا کہ معصومین

گناہ پر قادر ہی نہیں ہوتے۔ ہاں انفرادی طور پر اگر منصور ماتریدی یا تفتازانی یا کوئی شخص سے مل گیا یا معتزلہ سے مل گیا تو اس بطلان سے اجماعی مسلک پر کچھ فرق نہیں پڑتا یہ کچھ رویاں تو ہر دور میں رہتی ہیں اگر موجودہ زمانے میں کچھ بگاڑ تھا تو سعیدی صاحب نے خانہ پری کر دی۔ ہمارے جن اکابر نے ذاتی طور پر شیعہ یا معتزلی مسلک اختیار کیا وہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ ہم کو لائق نہیں کہ اجماعی مسلک اور دلائل قاہرہ کو چھوڑ کر کسی کے ذاتی نظریوں پر چل پڑیں۔ ہمارے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ اس سے پہلے عصمت کی تعریف میں چار اقوال نقل کیے گئے ۱۔ شرح تجرید کا ۲۔ اعلیحضرت کا ۳۔ صدر الافاضل کا ۴۔ حضرت حکیم الامت کا اب پانچواں حوالہ ملاحظہ ہو نسیم الریاض شرح شفا جلد سوم ص۲۰۶ پر ہے۔ وَالْعِصْمَۃُ تَخْصِیْصُ قُدْرَتِہٖ بِالطَّاعَۃِ دُوْنَ الْمَعْصِیَۃِ۔ ترجمہ اور عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ معصوم کو اطاعت پر تو قدرت عطا فرماتا ہے گناہ پر ان کو قدرت نہیں ہوتی:۔

دوسری دلیل:۔ چھٹا حوالہ نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۵۰ پر ہے:۔ وَعِصْمَتُہٗ عَنِ الْکِذْبِ وَخُلْفِ الْقَوْلِ فَلَمْ یَصْدُرْ عَنْہُ شَیْئٌ مِنْہُ وَھُوَ مُسْتَحِیْلٌ۔ (ترجمہ)۔ اور انبیاء کرام کی عصمت یہ ہے کہ وعدہ خلافی اور جھوٹ وغیرہ گناہ ان سے صادر ہی نہیں ہوسکتے اور وہ محال یعنی ممتنع ہیں۔ ساتواں حوالہ شفا شریف میں اسی جگہ پر ہے۔ وَاِسْتِحَالَۃُ ذَالِکَ عَلَیْہِ شَرْعًا وَاِجْمَاعًا۔ (ترجمہ):۔ انبیاء کرام کا کذب محال ہونا شرعی اور اجماعی مسلک ہے۔ اور محال پر قدرت ناممکن سعیدی صاحب کے قول میں کر سکنا ہے۔ کر سکنا قدرت پر دال ہے۔ چنانچہ لغات کشوری ص ۱۱۵ پر ہے۔ کر سکنا یعنی طاقت وقدرت پانا اسی محال اور استحالے کا معنی ممتنع ہونا ہے جن لوگوں نے معتزلہ جیسی تعریف کی ہے وہ امتناع کے قائل بھی نہیں۔ مگر سعیدی صاحب پر تعجب ہے کہ ممتنع بھی مانتے ہیں اور جھوٹ پر قدرت بھی۔ اس پر اتفاق ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا کذب ممتنع بالذات ہے۔ اور معصوم من اللہ کا گناہ ممتنع بالغیر ہے۔ ممتنع بالذات قدیم ہے اور ممتنع بالغیر حادث۔ ممتنع خواہ کیسا ہی ہو قدرت سے خارج ہوتا ہے چنانچہ المعتقد ص۱۶ پر ہے۔ وَبِالْاِمْتِنَاعِ مَالَا یَتَصَوَّرُ فِی الْعَقْلِ وُجُوْدُہٗ ضَرُوْرَۃً۔ (ترجمہ) امتناع سے مراد یہ ہے کہ عقل اس کے وجود کا تصور بھی نہ کرے۔ اور انبیاء کرام کا گناہ ممتنع ہوا تو تصور بھی ناممکن اسی کو محال بھی کہتے ہیں محال کی تین قسمیں ہیں:۔ ۱۔ محال شرعی ۲۔ عقلی ۳۔ عادی جو چیز ناممکن ہو اس کا ہو سکنا محال اتنی باتیں مان کر پھر کہنا کہ نبی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ گویا کہ ہو سکنے نہ ہو سکنے کی ضدین کو جمع کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ محال بالغیر ہے جس کا خاتمہ ناممکن۔ جب بالغیر ختم ہو تو قدرت ممکن ہے لیکن جب تک غیریت قائم ہے قدرت نہیں ہو سکتی اور یہ کلیہ تو بدیہی ہے نادان

بھی سمجھ جاتا ہے کہ زبان کٹ جائے تو بول نہیں سکتا قدرت گویائی ختم ہے۔ کیا کوئی پیدائشی گونگے یا اندھا کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بول سکتا ہے دیکھ سکتا ہے مگر بولتا دیکھتا نہیں۔ لیکن جو آنکھیں میچ لے اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پس بالکل اسی طرح سمجھ لو کہ عصمت سے امتناع لاحق ہوا لہٰذا ذی عقل نہیں کہہ سکتا کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے مگر بولتا نہیں اس بدیہی عقیدے کا کوئی نادان ترین ہی انکار کرے گا۔ امتناع ذاتی وہ ہے جو ازلی ابدی قدیم ہو۔ انبیاء کا امتناع اس طرح نہیں۔ **تیسری دلیل:۔**

آٹھواں حوالہ نسیم الریاض جلد چہارم ص۱۴۱ پر ہے:۔ اَلْعِصْمَۃُ (الخ) اَنْ لَّا یَخْلُقَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی النَّبِیِّ ذَنْبًا۔ اور الابریز صفحہ نمبر ۲۲۵ پر ہے:۔ فَاِنَّھُمْ جُبِلُوْا عَلَی الْعِصْمَۃِ:۔ (ترجمہ):۔ عصمت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم میں گناہ پیدا ہی نہیں کرتا پس بے شک وہ پیدائشی عصمت پر ہوتے ہیں۔ مقام تعجب ہے کہ جو چیز پیدا ہی نہیں ہوئی اس پر قدرت مانتے ہیں اور کہتے ہیں (معاذ اللہ) نبی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ خدا غارت کرے نفس و شیطان کو کہ کس طرح علماء عقلاء و زہاد خشک کا راستہ مارتا ہے۔ میں سعیدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ رب نے تو گناہ پیدا ہی ان میں نہ کیا پھر ان کا کرسکنا کیونکہ ہوگا کون خالق گناہ نبی ہوگا۔ نواں حوالہ۔ نسیم الریاض شرح شفا جلد چہارم ص۴۱ پر ہے:۔ وَقَدْ تَقَرَّرَ اَنَّ الْعِصْمَۃَ عِنْدَ الْمُتَکَلِّمِیْنَ اَنْ لَّا یَخْلُقَ اللّٰہُ فِی النَّبِیِّ ذَنْبًا۔ وَفِی التَّحْرِیْرِ لِابْنِ الْھُمَامِ اَلْعِصْمَۃُ عَدَمُ الْقُدْرَۃِ عَلَی الْمَعْصِیَۃِ۔ (ترجمہ):۔ متکلمین کے مذہب سے ثابت ہوگیا کہ عصمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی میں گناہ پیدا ہی نہیں فرماتا امام ابن ہمام کی تحریر میں بھی یہی مذہب ظاہر ہو رہا ہے کہ عصمت قدرت نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ دسواں حوالہ شفا شریف ہی مقام وَعِصْمَتُہٗ فِیْ کُلِّ حَالَاتِہٖ مِنْ رِضًی وَغَضَبٍ وَجِدٍّ وَمَزْحٍ۔ (ترجمہ):۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہر حالت میں معصوم ہوتے ہیں۔ رضا ہو یا غضب عام حالت ہو یا خوش طبعی۔ یعنی کبھی بھی گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں کرسکتے۔ ان حوالوں سے پتہ چلا کہ اکابر دین کا مسلک یہی ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہاں ان ہی بزرگوں نے معتزلہ کے عقیدے بھی نقل فرمائے ہیں سعیدی صاحب کی عقل دیکھئے کہ ان بزرگوں کے اپنے مسلک کی عبارات چھوڑ کر منقولہ مذہب غیر کی عبارات لیتے ہیں۔ اور اپنی نادانی سے تہمت بزرگوں پر لگاتے ہیں۔ عصمت انبیاء کی چھ نوعیتیں ہیں نمبر۱ عصمت عَنِ الشرک والکفر نمبر۲ عصمت عَنِ الشَّکِّ یہ ہے کہ نبی شک سے بھی معصوم ہیں اپنی وحی میں یا اس کے سمجھنے میں یا اس کی تعبیر میں غلطی کرسکتے ہی نہیں خواہ وحی جلی ہو یا خفی منامی ہو یا ایقاظی۔ محی الدین ابن عربی فصوص الحکم میں یہاں ٹھوکر کھا گئے اور کہہ گئے کہ معاذ اللہ نبی اپنی خواب کی تعبیر میں غلطی کرسکتا ہے اور ملفوظات مہریہ

میں اس بات کی ناجائز تائید بھی ہوئی مگر یہ سب غلطی ہے۔ انبیاء کرام سے یہ غلطی بھی ناممکن۔ انہوں نے مقام نبوت کو کما حقہٗ سمجھا نہیں ع۲ عصمت عن الکبائر ع۴ عن تسلط الشیطان ع۵ عَنِ الصَّغائر ع۶ عَنِ المیلان اِلی الذنب۔ یہ تقسیم نوعی ہے ان تمام پر عصمت جنسی یعنی عدم قدرت کلی مطابقی ہے۔ امام منصور نے صغائر میں اختیار تسلیم کیا ہے۔ یعنی ان کے مسلک میں نبی گناہ صغیرہ کر سکتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی غلط ہے کیونکہ کائنات میں صرف دو ہی جماعتیں مامور من اللہ ہیں ع۱ جماعت ملائکہ ع۲ جماعت انبیاء کرام اور مامور من اللہ ہی معصوم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معصوم بھی صرف یہ دو ہی جماعتیں ہیں۔ امور الٰہیہ بہت زبردست امانت ہے اس کو لینے والا شخص بھی زبردست ہونا چاہیئے۔ جس میں غلطی۔ خیانت۔ نسیان دینی جھوٹ فریب جیسی قباحتوں کا امکان بھی نہ ہو۔ اور وہ قادر ہی نہ ہو کہ گناہ کر سکے اس لیئے ان کو معصوم بنا دیا جاتا ہے۔ عصمت ملائکہ ہو یا نبوت تعریف و درجہ ہر دو کا یکساں ہے یعنی بوجہ امتناع بالغیر گناہ پر قادر نہ ہونا چنانچہ عصمتِ ملائکہ کے متعلق مسلک اہل سنت اس طرح ہے۔ نسیم الریاض جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۵۵ پر ہے۔ فَهُمْ مَعْصُوْمُوْنَ عَنْ جَمِيْعِ الذُّنُوْبِ كَبِيْرِهَا وَصَغِيْرِهَا وَلَا يَجُوْزُ ذَالِكَ عَلَيْهِمْ وَلَا يَقْدِرُوْنَ عَلَيْهِ۔ (ترجمہ) :۔ پس وہ ملائکہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم ہیں۔ اور ان پر قطعاً گناہ کا جواز نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ فرشتے گناہ پر قادر نہیں ہوتے۔ وجہ عدم قدرت صرف! معصومیت ہے۔ اس عبارت پر سب کا اتفاق ہے۔ یہاں ماتریدی صاحب بھی متفق اور خاموش ہیں۔ اس پر تفتازانی صاحب نے بھی کان لپیٹ لیئے میر شریف بھی مان گئے۔ علامہ سعیدی کے سارے خطوط میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ یہاں بالذات بالغیر کے دھوبے بھول گئے یہاں شرک کا ہوتا نہ چھوٹا یہی معصیت انبیاء کرام کو رب نے بخشی تو وہ بھی قادر علی الذنب نہ ہوئے۔ معصیت ہر دو جگہ یکساں ہے۔ چنانچہ شارح شفا امام شہاب الدین خفاجی اپنی کتاب صفحہ نمبر ۲۵۶ پر فرماتے ہیں۔ وَاتَّفَقَ اَئِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ عُلَمَاءِ الْمِلَّةِ الْاِسْلَامِيَّةِ عَلٰى اَنَّ حُكْمَ الْمُرْسَلِيْنَ مِنْهُمْ حُكْمُ النَّبِيِّيْنَ مِنَ الْبَشَرِ فَهُمْ سَوَاءٌ اَيْ مُسَاوُوْنَ لَهُمْ فِي الْعِصْمَةِ مِنَ الْكَبَائِرِ وَالصَّغَائِرِ۔ (ترجمہ)۔ ملتِ اسلامیہ کے تمام اماموں نے اس پر اتفاق کیا ہے رسل ملائکہ (جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں)۔ معصوم ہونے میں ہر قسم کے گناہِ صغیرہ و کبیرہ سے انبیاء کے برابر ہیں یعنی مساوی ہیں کہ جیسے وہ قادر نہیں یہ بھی قادر نہیں۔ کیسی پیاری ایمان افروز عبارت ہے۔ کہ فرشتوں کو انبیاء کے مثل کہہ کر انبیاء کرام کا پتہ لگے کہ اصل معصیت اور گناہ پر غیر قادر انبیاء ہی کا مقام و درجۂ شان ہے۔ ان کی مشابہت و اتباع میں ملائکہ اجمعین کو بھی یہ مرتبہ عظیم حاصل ہوا۔ ثابت ہوا کہ جس طرح فرشتے بوجہ عصمت گناہ پر

بے قدرت ہیں اسی طرح انبیاءِ کرام بھی لہٰذا جس طرح متفقہ عقیدۂ صحیحہ ایمانیہ میں فرشتوں کو نہیں کہہ سکتے کہ وہ گناہ کر سکتے ہیں مگر۔ اسی طرح انبیاءِ کرام کو بھی یہ کہنا کہ جھوٹ بول سکتے مگر بولتے نہیں سراسر گمراہی ہے اس دلیلِ لمی سے ثابت ہوا کہ جس عصمت کی بنا پر ملائکہ کو گناہ پر عدم قدرت ہے اسی عصمت کی بنا پر انبیاءِ کرام بھی گناہ میں معذور مجبور ہیں۔ جب علت ہر دو جگہ ایک ہے تو معلول میں فرق کیوں ہوگا! ماھیت تو کبھی منقسم نہیں ہوتی۔ **دلیل چہارم**:۔ ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تعریفِ عصمت میں چند قول نقل فرمائے۔ چنانچہ صفحہ نمبر ۷۲ پر ہے:۔ فَقَالَ بَعْضُهُمْ هِيَ مَحْضُ فَضْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِحَيْثُ لَا اِخْتِيَارَ لِلْعَبْدِ فِيْهِ وَذٰلِكَ اِمَّا بِخَلْقِهِمْ عَلٰى طَبْعٍ يُخَالِفُ غَيْرَهُمْ بِحَيْثُ لَا يَمِيْلُوْنَ اِلَى الْمَعْصِيَةِ وَلَا يَنْفِرُوْنَ عَنِ الطَّاعَةِ كَطَبْعِ الْمَلَائِكَةِ۔ (ترجمہ):۔ بعض اکابر نے فرمایا کہ وہ عصمت محض اللہ کریم کا فضل ہے۔ اس طرح سے کہ بندے کا گناہ پر کچھ اختیار نہیں اور یہ عدمِ قدرت یا ان کی انبیائی طبعی پیدائش کی وجہ سے ہے کہ دیگر انسان اس میں ان پیاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ انبیاء پاک نہ گناہ مطلقہ کی طرف مائل ہو سکتے ہیں نہ طاعت سے نفرت کر سکتے ہیں ملائکہ کی معصوم طبیعت کی شکل۔ **دلیل پنجم**:۔ کائنات میں مخلوق پانچ قسم کی ہے۔ ۱ محفوظ ۲ معصوم ۳ ممنوع ۴ مرفوع ۵ مکلف معصوم صرف مامور من اللہ ہیں یعنی انبیاء کرام اور ملائکہ۔ محفوظ صرف اولیاء کاملین ہیں جیسے غوث قطب ابدال اوتاد یہ لوگ مامور من الانبیاء ہیں فتاویٰ شامی جلد اول صفحہ نمبر ۵۴ پر ہے:۔ فَيُشْتَرَطُ فِيْهِ كَوْنُهُ مَحْفُوْظًا كَمَا يُشْتَرَطُ فِي النَّبِيِّ كَوْنُهُ مَعْصُوْمًا كَمَا فِيْ رِسَالَةِ الْاِمَامِ الْقُشَيْرِيِّ۔ (ترجمہ):۔ پس واجبِ فرضی ہے ولایتِ اولیاء اللہ میں محفوظ ہونا جیسا کہ نبی کی نبوت میں معصوم ہونا شرط اور فرض ہے ایسا ہی امام قشیری کا مسلک ہے۔ ممنوع علماءِ ملت اور زاہد لوگ ہیں۔ مرفوع۔ چرند پرند جمادات نباتات دیوانہ۔ اور نابالغ بچہ مکلف کی دو قسم ہیں ۱ مکلف مطلقہ۔ جیسے تمام جنات اور عاقل بالغ انسان۔ ۲ مکلف فی الامر صرف جیسے انبیاءِ کرام اور ملائکہ۔ تمام اہلِ سنت کے عقیدے میں معصوم وہ ہے جو گناہ پر قادر ہی نہ ہو۔ وہ گناہ نہ کرتا ہے نہ کر سکتا ہے محفوظ وہ ہے جو گناہ سے بچتا رہے۔ یعنی کر سکتا ہے مگر کرتا نہیں۔ ممنوع وہ ہے جو گناہ کر سکتا ہے اور کر بھی لیتا ہے مگر دنیا میں ہی اس کو سچی توبہ کی توفیق مل جاتی ہے۔ مرفوع وہ مخلوق ہے جس کو نیکی بدی پر کوئی جزا سزا نہیں نہ شرعی دینوی نہ اخروی مکلف فی النہی والامر یعنی مکلف مطلقہ۔ جو گناہ کر سکتے ہیں کرتے بھی اور سچی توبہ کی توفیق ضروری نہیں۔ مُکَلَّفْ فِی النَّہِی جن کو نیکی پر ثواب یا قرب مدارج۔ بدی و گناہ ان سے ممکن ہی نہ ہو معصوم کا کام

جہان کو بچانا۔ کہ وہ مامور ہے اسی لیے مکلف فی الامر ہیں نہی نہیں۔ محفوظ کا کام خود کو بچانا ممنوع کا کام بچنے کی کوشش کرنا عام مکلفین کا کام۔ قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ (ترجمہ): خود کو بھی بچاؤ اور اپنے لواحقین کو بھی بچاؤ مرفوع کا کام نہ بچنا نہ بچانا۔ محفوظ کو نیکی پر ابتداءً جنت لازم۔ ممنوع کو جنت کا وعدہ ہے یقین نہیں ہو سکتا ہے رب کرم کرے مرفوع کو جزا کی جنت نہیں بالطفیل جنت جیسے دیوانے اور بچے یا فنا۔ عام مکلفین میں انسانوں کی نیکی پر جنت گناہ پر جہنم۔ جنات کو بقول بعض گناہ پر جہنم اور نیکی پر فنا یا فنا کر دینا اور جہنم سے چھٹکارا ہی ان کی نیکی کا بدلہ ہے۔ اور بقول بعض نیکی پر ابدی قیام عالم برزخ میں اور بقولِ بعض نیکی پر جنت۔ بدی پر متفقاً جہنم۔ انبیاء کرام کی نیکی کا ثواب جنت نہیں بلکہ ترقی درجات قیام جنت تو ان کا اصل مقام ہے۔ جیسے کہ انسانوں کا مقام موجودہ زمین۔ جبرائیل علیہ السلام کا سدرہ ملائکہ میں کسی کا عرش کسی کا سماء اوّل۔ دوم۔ سوم وغیرہ اور جنات کا کوہ قاف۔ مقام اصل کی پہچان یہ ہے کہ وہاں پہنچنے کی ہر وقت آزادی ہو۔ سو جنت میں داخلے کی انبیاء کرام کو ہر وقت آزادی اب یا تب۔ اس وضاحت کے بعد یہ کہنا کہ انبیاء کرام گناہ کر سکتے ہیں مگر کرتے نہیں۔ کتنی غلطی ہے یہ محفوظ کی تعریف ہے۔ ورنہ فرق کس طرح کرو گے۔ یہی وہ باطل نظریات ہیں جن سے طرح طرح کی گمراہیاں پھیلیں۔ کسی نے کہا۔ غوثِ پاک انبیاء کرام کے برابر ہیں۔ کسی نے حضرت ابراہیم کے متعلق تین جھوٹ والی روایت گھڑ لی۔ امام رازی نے فرمایا یہ روایت بالکل بناوٹی ہے:۔ (تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۲ پر ہے)

دلیل ششم:۔ عقلاً نقلاً ثابت ہو گیا کہ انسانوں میں صرف انبیاء ہی معصوم ہیں کوئی ولی غوث قطب معصوم نہیں نہ صحابی نہ صدیق و فاروق نہ عثمان و علی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ چنانچہ امام ابن ہمام جن کی بزرگی کا اعتراف مجدد الف ثانی علیہ رحمۃ نے بھی اپنے مکتوبات حصہ پنجم کے صفحہ نمبر ۱۶۶ پر کیا ہے جن کا نام کمال الدین محمد ابن عبد الواحد ہمام متوفی ۶۸۱ھ نے اور امام دباغ نے اپنی کتاب ابریز صفحہ نمبر ۲۲۵ پر لکھا ہے:۔ وَاَمَّا الْاَمْرُ الثَّانِیْ وَھُوَ الْعِصْمَۃُ فَھُوَ مِنْ خَصَائِصِ النُّبُوَّۃِ۔ وَالْوِلَایَۃُ لَا تُزَاحِمُ النُّبُوَّۃَ۔ (ترجمہ) معصوم ہونا نبی کا خاصہ ہے ولایت نبوت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ ولی کی صرف کرامت خرقِ عادت ہوتی ہے مگر نبی علیہ السلام سراپا بذاتِ خود چمتکار ہوتا۔ ربما عادتاً خرقِ عادت ہوتا ہے۔ اب اگر معصوم کی تعریف وہی کی جائے۔ جو سعیدی صاحب نے کی تو معصوم۔ محفوظ ممنوع کا فرق کس طرح کرو گے۔ یا فرق بتاؤ یا سب کو معصوم مانو اور یہ تا قیامِ قیامت نہ کر سکو گے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ انبیاء کرام کے لیے گناہ ممتنع ہے ہاں ممتنع بالذات نہیں کہ یہ خاصۂ الٰہیہ ہے۔ بلکہ بالغیر ہے وہ غیر کیا ہے؟ وہی عصمت ہے۔ تو جب تک عصمت قائم عدمِ قدرت قائم۔ ہاں اگر خدانخواستہ عصمت ختم ہو جائے۔ تب گناہ کا امکان و قدرت

ہو سکتی ہے مگر عصمت نبوت کو مستلزم ہے۔ جب تک نبوت قائم عصمت موجود اور عصمت قائم تو عدم قدرت قائم نبوت کے خاتمے کا مشاہدہ نہیں بلکیت کا زوال قصۂ ہاروت و ماروت سے عیاں ہے۔ لہٰذا نبوت و عصمت قائم رہتے ہوئے یہ کہنا کہ نبی جھوٹ بول سکتا ہے۔ نری گمراہی ہے۔ یہاں تک کثیر حوالوں سے ثابت کر دیا کہ جمہور اہلسنت کا مذہب یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہ جھوٹ بول سکتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ متکلمین علماء کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام منصور ماتریدی نے جو نظریہ پیش کیا وہ ان کا انفرادی عقیدہ ہے مولوی عبدالحئی لکھنوی کا ان کو امام المتکلمین کہنا اگرچہ درست ہے مگر عصمت کی یہ تعریف تمام متکلمین کے خلاف ہے جیسا کہ نسیم الریاض کی عبارت سے ثابت ہوا۔ امام ہونا یا حنفی اہل سنت ہونا علیحدہ بات ہے مگر ایک نظریے میں غلطی کھا جانا علیحدہ بات ہے۔ ایک مسلک سے پھر جانے سے سنیت یا حنفیت پر حرف نہیں آتا جب کہ گناہ صغیرہ بیاختیار مراد ہو۔ مگر صاحب بصیرت کو چاہیے کہ ایسے ذاتی نظریات پر اعتماد نہ کر بیٹھیں ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔ دیکھو۔ اہل سنت کا جمہوری عقیدہ ہے کہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں مگر شرح مواقف نے صفحہ نمبر ۶۹۹ پر لکھا کہ معتزلہ کی طرح دو سنی عالم بھی بھٹک گئے۔ چنانچہ عبارت ہے:۔ فَقَالَ اَکْثَرُ اصحابنا الا نبیاء اَفْضَلُ وَعَلَیْہِ الشِّیْعَۃُ وَاَکْثَرُ اَہْلِ الْمِلَلِ۔ وَقَالَتِ الْمُعْتَزِلَۃُ وَاَبُوْعَبْدِ اللّٰہِ الْحَلِیْمِیْ وَالْقَاضِیْ اَبُوْبَکْرٍ۔ مِنَّا الْمَلَائِکَۃُ اَفْضَلُ وَعَلَیْہِ الْفَلَاسِفَۃُ۔ اَتْبَعَ اَصْحَابُنَا الْوُجُوْہَ (ترجمہ):۔ ہمارے جمہور اصحاب نے عقیدہ فرمایا ہے کہ انبیاء کرام فرشتوں سے افضل ہیں یہی شیعہ اور اکثر دین والوں کا عقیدہ ہے مگر معتزلہ اور ہمارے دو سنی عالم ابو عبداللہ حلیمی اور قاضی ابو بکر اور فلاسفہ نے یہ عقیدہ بنایا کہ معاذاللہ فرشتے انبیاء کرام سے افضل ہیں۔ اہل سنت نے اس نظریہ کو بہت وجوہ سے برا کہا۔ امام غزالی صاحب نے بھی احیاء العلوم کے صفحہ نمبر ۵۲ پر یہی عقیدہ بنایا۔ تو کیا کسی اہل سنت کو جائز ہے کہ وہ حدیث و قرآن کو چھوڑ کر۔ امام غزالی وغیرہ چند احباب کا ذاتی نظریہ قبول کرے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ معتزلہ نے عصمت کی تعریف غلط ہی اس لیے کی کہ پہلے ملائکہ کو افضل کہہ چکے تھے۔ اس باطل عقیدے کو بچانے کے لیے عصمت کی تعریف مسخ کر کے نبی کو گناہ پر قادر مان بیٹھے۔ بعض سنی بھی دھوکہ کھا بیٹھے۔ مقام غور ہے کہ جب نبی مکرم کو گناہ پر قادر مان لیا۔ اور کہہ دیا کہ نبی گناہ کر سکتا ہے تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کذب باوجود مقدور ہونے کے اس کے وقوع میں نہیں آئے گا کیونکہ جب عقلاً تو استبعاد رہا نہیں پھر ایک جانب کی ترجیح اور تخصیص عدم وقوع مقدور کے اندر کیسے ہو گی۔ اور نقلاً استحالہ اسی کلام سے ہو گا جس میں کذب و گناہ ممکن۔ اب وہ کون سا استحالہ ہے جس سے کذب کا عدم وقوع یقینی طور سے ثابت ہو۔ اب جب کہ آپ کو ایسا استحالہ نہ ملے اور یقیناً نہ ملے گا تو آئے تو یہ

کہا ہے کہ جھوٹ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ کل کو یہ بھی کہہ دینا کہ انبیاء کرام جھوٹ بول سکتے ہیں اور بولتے بھی ہیں۔ کیونکہ نا بولنے پر کوئی یقینی گارنٹی نہیں۔ **دلیل ہفتم**۔ نبراس صفحہ نمبر ۵۳۲ پر ہے۔ اِنَّھُم ذَکَرُوا لِلْعِصْمَۃِ تَعْرِیْفَیْنِ اَحَدُھُمَا عَدَمُ خَلْقِ اللّٰہِ الذَّنْبَ فِی الْعَبْدِ فَعَلٰی ھٰذَا یَکُوْنُ الْمَعْصُوْمُ مَنْ لَا یُخْلَقُ۔ ثَانِیْھَا مَلَکَۃٌ نَفْسَانِیَۃٌ (الخ) اَنَّ التَّعْرِیْفَ الْاَوَّلَ مَبْنِیٌّ عَلٰی اُصُوْلِ الْاَشَاعِرَۃِ (الخ) وَالثَّانِیْ مَبْنِیٌّ عَلٰی اُصُوْلِ الْفَلَاسِفَۃِ (ترجمہ) بے شک علماء عظام نے عصمت کی دو تعریفیں ذکر کی ہیں۔ پہلی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام میں گناہ پیدا ہی نہ کیا پس اس تعریف کی بنا پر معصوم وہ ہوگا جو گناہ نہ پیدا کیا جائے۔ اور دوسری تعریف یہ ہے کہ عصمت نفسانی یعنی ذاتی بچنے کا ملکہ ہے۔ بیشک پہلی تعریف۔ اہل سنت اشاعرہ کے قواعد پر مبنی ہے اور دوسری فلاسفہ کے اصول پر۔ اس عبارت سے جہاں یہ پتہ لگا کہ اہل سنت اشاعرہ کا عقیدہ عدم خلق یعنی عدم قدرت ہے وہاں صاحبِ نبراس کے عقیدے کا بھی پتہ چل گیا کہ ان کا عقیدہ عدم قدرت کا ہے کیونکہ علمائے ملت کا طریقہ یہ ہے کہ صحیح قول کو پہلے ذکر کرتے ہیں قولِ باطل کو دوسرے نمبر پر۔ چنانچہ فتاوے شامی جلد اوّل صفحہ نمبر ۶۶ و ۴۰۵ پر ہے:۔ وَفِیْ اٰخِرِ الْمُسْتَصْفٰی لِلْاِمَامِ النَّسَفِیِّ اِذَا ذُکِرَ فِی الْمَسْئَلَۃِ ثَلَاثَۃُ اَقْوَالٍ فَالرَّاجِحُ ھُوَ الْاَوَّلُ اَوِ الْاَخِیْرُ لَا الْوَسْطُ (ترجمہ) مستصفیٰ کتاب کے آخر میں امام نسفی کا قول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں تین قول ذکر ہوں تو معتبر یا پہلا ہوگا یا تیسرا نہ کہ دوسرا۔ یہ علامہ شامی کا اپنا کلام نہیں، بلکہ امام نسفی کا ہے اور یہ قاعدہ صرف فتاویٰ شامی کیلئے نہیں، بلکہ تمام فقہا کا مقرر کردہ ہے۔ ثابت ہوا کہ مُلّا علی قاری اور صاحب نبراس کا عقیدہ عصمت کے بارے یہی ہے کہ انبیاء کرام گناہ پر قادر ہی نہیں۔ غلام رسول سعیدی شرح تحریر کو تو رافضی کہہ کر ٹھکرا سکتے ہیں مگر۔ ۱ اعلیٰحضرت ۲ صدر الافاضل ۳ حکیم الامت ۴ تمام اشاعرہ ۵ تمام متکلمین ۶ مُلّا علی قاری ۷ صاحبِ نبراس ۸ امام ہمام ۹ امام دباغ ان تمام کے خلاف کب تک چلیں گے۔ **دلیل ساتویں**:۔ سے صاف صاف تمام اشاعرہ کے مذہب کا پتہ لگا۔ نسیم الریاض کی عبارت سے صاف صاف تمام متکلمین کے مذہب کا پتہ لگا۔ کہ عدم قدرت ہی سچا عقیدہ ہے۔ مگر جن لوگوں کے گناہ پر قادر ہونے کے عقیدے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صرف امام منصور کا انفراداً ذکر کیا۔ اگر یہ باطل عقیدہ کسی گروہ کا ہوتا تو صاف صاف گروہ کا نام لیا جاتا۔ بخلاف عدم قدرت کے عقیدے پر۔ کہ صاف صاف جماعتوں کا نام بھی لیا سا اور انفرادی حضرات کا بھی نام لیا۔ بلکہ سعیدی تو اپنے ان بنیادی پیشواؤں کے بھی خلاف چلے کہ انھوں نے اپنے اس باطل نظریے کو بچانے کے لیے

امتناع بالغیر کا بھی انکار کیا نبی کو بشرِ متکلم کہہ کر اپنے جیسا مانا مکلف فی النہی میں ملوث ایک بطلان کو بچانے کے لیے اتنی خطائیں کرنی پڑیں۔ مگر آپ امتناع بالغیر مان کر پھر یہ چکر دے رہے ہیں۔ امتناع بالغیر مان کر وہ لازم نہیں آتا جو توضیح البیان میں لکھا۔ بلکہ میرا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ میر شریف وغیرہ کو امتناع کا انکار نہ کرنا پڑتا۔ امتناع مان کر وہی لازم آتا ہے جو حسین نجار وغیرہ اہل سنت نے کہا۔ **دلیل ہشتم:۔** امام فضلِ رسول بدایونی قدس سرہٗ اپنی کتاب المعتقد کے صفحہ ۱۳۰ پر فرماتے ہیں۔ وَفِيهِ كَوْنُ الْكِذْبِ فِي التَّبْلِيغِ مُحَالًا عَقْلِيًّا وَاِنَّ تَجْوِيزَهٗ عَلٰى نَبِيٍّ كُفْرٌ بِالْاِجْمَاعِ۔ اور اسی کے صفحہ نمبر ۱۲۰ پر ہے:۔ مَنْ جَوَّزَ الْكِذْبَ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ فَهُوَ كَافِرٌ۔ (ترجمہ):۔ اور نبی کا پیغام پہنچانے دین کی تبلیغ کرنے میں یعنی لوگوں کو دین دنیا سمجھانے میں جھوٹ بولنا محال عقلی ہے۔ اور بے شک گناہ کو نبی پر جائز سمجھنا یعنی ممکن سمجھنا تمام کے اتفاق سے کفر ہے۔ اس پر اجماعِ امت ہے۔ وہ شخص جس نے جھوٹ کو انبیاء کے لیے ممکن مانا تو وہ شخص کافر ہے۔ جوّز کا معنیٰ ممکن ماننا ہے جواز کا معنیٰ صادر ہونا واقع ہونا نہیں بلکہ امکان ہے یعنی یہ کہنا کہ انبیاء کرام گناہ کر سکتے ہیں یہ کہنا کفر ہے۔ چنانچہ المعتقد صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے:۔ وَبِالْجَائِزِ مَا يُمْكِنُ عَقْلًا وُجُودُهٗ وَعَدَمُهٗ ضَرُورَةً۔ (ترجمہ):۔ جائز سے مراد یہ ہے کہ عقلاً اس گناہ کو ممکن مانا جائے اور ضرورۃً عدم مانا جائے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ بول سکتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ اسی کو امام اہلِ سنت امام فضل رسول نے کفر کہا۔ یہ بات یا معتزلہ نے کہی یا سعیدی صاحب نے ماتریدی صاحب نے اس بات کی جرأت نہ کی انہوں نے ذنبِ صغیرہ پر قدرت مانی ہے۔ تبلیغ سے مراد فعلِ نبی ہے جو عام ہے اسباب کو کہ تبلیغِ قرآن ہو یا حدیث تبلیغ عملی یا قولی ہو۔ یہاں یعلیٰہ آیت قرآن مراد نہیں جیسا کہ سعیدی صاحب نے دھوکہ کھایا وہ کہتے ہیں کہ تبلیغ سے مراد قرآنِ پاک ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے وہ واقعی جھوٹ سے دور ہے وہاں جھوٹ محال ہے۔ مگر یہ ان کی کم عقلی ہے۔ کیونکہ قرآن کا مضمون اور چیز ہے تبلیغ کا مضمون اور چیز ہے۔ یہاں تک کہ عبارتِ مدللہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام گناہوں پر بالکل قادر نہیں ہوتے۔ اور سعیدی صاحب اس کا خلاف کر کے گمراہی کے راستے پر ہیں اب اسی کے ضمن میں اتنا اور سمجھ لو کہ شریعت میں انبیاءِ کرام کو امرِ عبادت تو ہوتا ہے۔ مگر ممانعت نہیں ہوتی کیونکہ ممانعت مکلف فی النہی کو ہوتی ہے۔ منع کسی کام سے اس کو کیا جاتا ہے جس کے اس ممنوعہ کام کی طرف جانے کا اندیشہ ہو اور بچنا واجب ہو۔ انبیاءِ کرام چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لیے وہ ممنوعہ حرام کاموں کی طرف جا سکتے ہی نہیں۔ ان کو ممانعت پہلے ہی حاصل ہے۔ لہٰذا ان کے لیے کوئی نہی علی الحرمۃ وارد نہیں۔ ورنہ

تحصیلِ حاصل لازم آئے گی جو محال ہے۔ قرآن کریم میں جتنی نہی وارد ہوئی ہیں ان میں بعض نہی اگرچہ ظاہراً انبیاء کو مخاطب ہیں۔ مگر درحقیقت وہ مسلمانوں کو ہی مخاطب ہیں۔ چونکہ سعیدی صاحب یا ان کے ہم نوا اس سے دھوکہ دے سکتے ہیں لہٰذا اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اس وضاحت میں مفسرین کے بعض جگہ مختلف اقوال بھی ملتے ہیں مگر میں معتبر اور روشِ کلام کے مطابق اقوال ہی پیش کروں گا۔ اور وہ قول رد کیئے جائیں گے۔ جس میں عظمتِ انبیاء پر حرف آتا ہو۔ کیونکہ ترجیح اس قول کو دی جاتی ہے۔ جو ایمان و ادب کو قائم رکھے مولوی سعیدی صاحب نے اپنی تیرھویں دلیل میں جن آیاتِ نہی کا ذکر کیا ہے ان کا جواب :-

پہلی آیت :- یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاءِ کرام و ملائکہ کسی گناہ پر قادر نہیں۔ اسی لیئے یہ حضرات بابرکات نہی میں مکلف نہیں اور کسی نہی کے خطاب میں داخل نہیں۔ ہاں البتہ امر میں مکلف ہیں یعنی ان پاک و منزہ ہستیوں سے یہ تو کہا جاتا ہے کہ یہ کرو یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ مت کرو۔ یہ قاعدۂ کلیہ تمام اہلسنت مسلمانوں کا ہے مگر سعیدی صاحب چونکہ انبیاءِ کرام کی عزت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ملائکہ کے لیئے تو شاید اس قاعدے کو تسلیم کرتے ہیں مگر انبیاءِ کرام کے لیئے کھلم کھلا اس قاعدے سے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ انبیاءِ کرام کو بذریعہ نہی جبراً گناہ و شرک سے روکا جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) اور اپنی اس بے دینی میں دس آیتیں پیش کیں۔ ان کا شافی جواب دینے سے پہلے۔ اہلِ سنت کے اس قاعدۂ کلیہ پر دلائل ملاحظہ ہوں۔ شقِ اول انبیاءِ کرام و ملائکہ امر میں مکلف ہیں ع ۱ نسیم الریاض جلد چہارم ص ۴۱ پر ہے :- وَهُمْ مُكَلَّفُوْنَ بِالْاِتِّفَاقِ۔ (ترجمہ) :- وہ معصوم ہستیاں بالاتفاق مکلف ہیں ع ۲ تفسیر کبیر جلد اول صفحہ نمبر ع ۳۰۸ پر ہے :- لِاَنَّهٗ ثَبَتَ بِالْاِجْمَاعِ اَنَّ الْمُكَلَّفِيْنَ هُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ (ترجمہ) :- یہ بات اجماع سے ثابت ہوئی کہ بے شک مکلفین وہ فرشتے اور جنات و انسان ہیں ان عبارات سے انبیاء و ملائکہ کو مکلفِ شرعی ہونا ثابت ہوا یہاں صرف امر میں مکلف ہونا مراد ہے۔ اور ان ہر دو آیات میں انبیاءِ کرام ملائکہ جنات اور دوسرے انسان شامل۔ جنات و دیگر انسان کے مکلف فی النہی ہونے کی دیگر عبارات ہیں۔ اور انبیاءِ کرام و ملائکہ کے مکلف فی النہی نہ ہونے کی عبارات بھی صراحتاً ہیں۔

چنانچہ تفسیر روح البیان جلد ہشتم صفحہ نمبر ع ۴۹۰ پر ہے :- ع ۱ :- وَمَذْهَبُ الْعُلَمَاءِ اِخْرَاجُ الْمَلٰٓئِكَةِ عَنِ التَّكْلِيْفِ فِي الْوَعْدِ وَالْوَعِيْدِ وَهُمْ مَعْصُوْمُوْنَ كَالْاَنْبِيَاءِ بِالْاِتِّفَاقِ۔ (ترجمہ) :- اور تمام علمائے عظام کا مذہب ملائکہ کو مکلف ہونے اور ڈرانے دھمکانے سے علیحدہ ماننا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ انبیاءِ پاک کی طرح بالاتفاق معصوم ہیں۔ یعنی مکلف فی النہی نہ ہونا معصوم ہونے کی وجہ سے اور انبیاءِ کرام بھی معصوم لہٰذا وہ بھی مکلف فی النہی۔ نہیں ہو سکتے۔ عقائد کی کتاب ع ۲ ابریز ع ۲۲۵ پر ہے

بِحَیْثُ اَنَّھُمْ لَا یَحْتَاجُوْنَ اِلٰی شَرْعٍ یَتَّبِعُوْنَہٗ۔ (ترجمہ) معصوم حضرات اس حیثیت میں ہیں۔ کہ بے شک وہ کسی قانون کے محتاج نہیں ہوتے جس کی پیروی اُن پر فرض ہو۔ اس عبارت نے یہ بھی ثابت فرما دیا کہ انبیاء کا مکلف نہی ہونا تو درکنار ان کا مکلف فی الامر ہونا بھی بے مثل ہے۔ ہم لوگوں کی طرح ماسلے باندھے کا نہیں۔ ع۳ شرح مسلم الثبوت صفحہ نمبر ع۲۰۵ پر ہے:۔ لَا یَجُوْزُ التَّکْلِیْفُ بِالْمُمْتَنِعِ مُطْلَقًا۔ وَھُوَ الَّذِیْ یَسْتَحِیْلُ وُجُوْدُہٗ عَقْلًا لَا یَدْخُلُ تَحْتَ الْقُدْرَۃِ اَصْلًا:۔ (ترجمہ) جس شخص کے لیئے گناہ ممتنع ہو اُس کو مطلق طور پر مکلف کہنا جائز نہیں اور گناہ کا ممتنع ہونا یہ ہے۔ کہ گناہ کا وجود عقلاً مستحیل ہو یعنی ناممکن نہ داخل ہو قدرت کے تحت بالکل یہی وجہ ہے قرآن پاک میں جتنی بھی نہی کی آیتیں ہیں وہ ظاہراً اگرچہ بعض طریقے سے مخاطب انبیاء سمجھ آتی ہیں مگر اہل سمجھتے ہیں کہ بہ ممانعت امت کو ہے۔ ع۴ چنانچہ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ع۲۵ پر ہے:۔ کَمَا اَنَّ اُمَّتَہٗ اَصْلٌ فِی الْمَنْھِیَّاتِ:۔ (ترجمہ) جس طرح بے شک امت کے لیئے ہی اصل میں نہی وارد ہوتی ہے صرف خطاب کے صیغہ سے شبہ ان کا پڑ جاتا ہے۔ ع۵ تفسیر روح البیان جلد دہم صفحہ نمبر ع۶۰ پر ہے:۔ دَلِیْلٌ عَلٰی عِصْمَۃِ الْمَلَائِکَۃِ (الخ) وَدَلِیْلٌ اَیْضًا عَلٰی اَنَّہٗ لَا نَھْیَ عِنْدَ ھٰؤُلَاءِ الْمَلَائِکَۃِ خَلَا عِبَادَتَہٗ لِلنَّھْیِ عِنْدَھُمْ (ترجمہ):۔ فرشتوں کے معصوم ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ان کو کسی طرح کی نہی نہیں ہوتی اور وہ ممانعت کی عبادت نہیں کرتے۔ اس عبارت نے بتایا کہ عصمت کی دلیل یہ ہے کہ اُن کے لیئے کوئی ممانعت وارد نہیں۔ یہی عصمت انبیاءِ کرام کے پاس ہے تو ان کے لیئے۔ نہی کیونکر ہو سکتی ہے۔ خیال فرماؤ دو عبارتوں سے مکلف ہونے کا ثبوت مل رہا ہے اور پانچ عبارتوں سے مکلف نہ ہونے کا۔ اور ہر دو قسم کی عبارت اکابرین کی ہیں۔ بلا مرجح کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ پس تطابق واجب اور وہ یہی ہے کہ انبیاءِ کرام و ملائکہ مکلف بالاتفاق ہیں لیکن صرف امر میں اور انبیاء اجماعاً مکلّف نہیں یعنی نہی و ممانعت میں اب جب کہ عقلِ عقلا میں یہ بات بیٹھ گئی تو سمجھو کہ اُن آیات کا مقصد کیا منہج کس طرف ہے۔ علامہ سعیدی کی پیش کردہ پہلی آیت لَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ (ترجمہ):۔ اے آدم و حوا اس درخت کے قریب مت جاؤ۔ علامہ کہتے ہیں کہ یہ حکم نہی وجوبی ہے اور آدم علیہ السلام کا درخت کے قریب جانا حرام تھا۔ اس لیئے سختی سے منع کیا گیا۔ جواب الزامی تو یہ ہے کہ پھر یہ آپ کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ انبیاءِ کرام گناہ کرتے نہیں مگر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں حضرت آدم علیہ السلام نے گناہ کر بھی لیا کیونکہ درخت کے قریب گئے اور کھا لیا۔ پس آپ کے متعلق میرا وہ خدشہ درست ہو گیا کہ آج کہا ہے کہ سکتے ہیں مگر کرتے نہیں کل کہو گے کہ کر بھی لیتے ہیں۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ

تفسیر کبیر جلد اول صفحہ نمبر ۳۰۵ پر ہے :- اِنَّ ذَالِكَ النَّهْيَ كَانَ نَهْيَ تَنْزِيْهٍ لَا نَهْيَ تَحْرِيْمٍ ۔ (ترجمہ) لاتقربا کی نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ تنزیہی ہے :۔ صدر الافاضل نے تفسیر خزائن نے ص۶ پر اس کو نہی تنزیہی کہا۔ تفسیرات ارابعہ جلد اول ص۱۱۰ پر اس کو نہی تنزیہی لکھا حضرت حکیم الامت نے نور العرفان ص۹ پر فرمایا کہ ارادہ بھی کھانے میں اور رضاء الٰہی بھی کھانے میں تھی۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ نہی تحریمی میں رضاء الٰہی بھی کرنے میں! ہو۔ ثابت ہوا کہ لَا تَقْرَبَا والی نہی تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔ یعنی ترکِ قرب فرض یا واجب نہ تھا بلکہ مستحب تھا یہ قانونِ شرعیہ ہے کہ کراہتِ تنزیہی میں انسان مکلف نہیں ہوتا۔ چنانچہ شرح مسلم الثبوت ص۱۹۵ پر ہے اَلْمَكْرُوْهُ كَرَاهَةَ التَّنْزِيْهِيِّ كَالْمَنْدُوْبِ ۔ لَا نَهْيَ وَ لَا تَكْلِيْفَ :۔ (ترجمہ) :۔ تنزیہی کراہت مثل مستحب کے ہے لہٰذا اس میں نہی حقیقی یعنی تحریمی نہیں ہوتی اس کا مکلف ہوتا ہے اگر اس کو نہی تحریمی مانا جائے تو حضرت آدم کو گناہگار ماننا پڑے گا۔ کیونکہ نہی تحریمی کا مرتکب فاسق گناہگار ہوتا ہے سعیدی صاحب کو صرف کتابیں لکھنے اور مصنف بننے کا شوق ہے مگر محنت سے جی چراتے ہیں۔ مصنف و مفتی بننا آسان نہیں اگر اس کا شوق ہے تو اللہ کے کرم و فیضان کی دعا کرو اور تحقیق میں محنت کرو۔ ورنہ چھوڑ دو کتابیں لکھنا کہ یہ جہنم کا راستہ بھی بن سکتی ہیں۔ **دوسری آیت** :۔ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (ترجمہ) اے داؤد علیہ السلام خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ سعیدی صاحب نے بس اتنا ہی جملہ لکھا۔ اور غالباً دیکھا بھی اتنا ہی جملہ۔ ان بے چاروں کو زیادہ دیکھنے کی فرصت کہاں پوری آیت سیاق و سباق سے بغور دیکھتے وہاں ہی اس کا جواب نظر آجاتا۔ پوری آیت اس طرح ہے :- يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ۔ (الخ) :- ترجمہ) :- یا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام بے شک ہم نے تم کو تمام علاقے میں بادشاہ بھی بنا دیا ہے پس لوگوں کے درمیان درست فیصلہ فرمایا کرنا خود تحقیق کر لیا کرنا۔ لوگوں کی اپنی خواہشوں پر اعتماد نہ کرنا۔ کہیں تم کو درست رضاء خداوندی کے فیصلے سے پھیر دیں۔ یہاں آیت کا مضمون بالکل ختم ہو گیا۔ اگلی آیت کا منشا جدا ہے۔ اس آیت میں جو مطلب سعیدی صاحب نے لیا یعنی نہی تحریمی مراد لے کر اپنا مسلک درست رکھنا چاہا مگر مقامِ نبوت کا خیال نہ رکھا وہ مطلب یہاں نہیں بن سکتا۔ دو وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ لفظِ ہَوٰی کا معنے ہے خواہش۔ خواہش اچھی بھی ہوتی ہے۔ بری بھی۔ اپنی بھی ہوتی ہے دوسروں کی بھی مگر آیت نے کوئی وضاحت نہ کی کہ یہاں کس کی کون سی خواہش مراد ہے لہٰذا یہ آیت مجمل ہوئی اور بقاعدۂ اصولِ فقہ مجمل کلام سے حرمت ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا نہی تحریمی نہیں ہو سکتی۔ خواہش کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ۱ خواہش نفسِ امارہ یہ خواہش ہر طرح بری ہے :۔ انبیاء کرام اس سے معصوم ہیں ان کو یہ خواہش ہو سکتی نہیں۔ اسی کی نہی۔ نہی تحریمی ہے ۲ خواہشِ ذاتی

برا بھی ہو سکتی ہے بری بھی ۳ اپنی خواہش ۴ دوسرے کی خواہش۔ حضرت داؤد کو فرمایا جا رہا ہے۔ خواہش کے پیچھے نہ چلو پہلے فرمایا گیا لوگوں کا فیصلہ کیا کرو۔ اس سیاق کلام سے ثابت ہوا کہ فیصلہ کرنا سکھایا جا رہا ہے۔ اور ہوٰی سے مراد مدعی یا مدعیٰ علیہ کی ذاتی مرضی ہے۔ خواہ جائز ثابت ہو یا ناجائز۔ اس سے بچایا جا رہا ہے۔ یعنی شرعًا کسی کی جائز خواہش کو پورا کرنا عام لوگوں کے لیئے جائز ہے مگر قاضی اور مفتی کے لیئے یہ بات درست نہیں کہ یک طرفہ فیصلہ کرے۔ اگرچہ سچا ہو۔ پس ثابت ہوا کہ یہ نہی تحریمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاکم صرف مدعی کے بیان پر فیصلہ کردے اور واقعتًہ بھی صحیح ہو جائے تب بھی منصب قضاء کے مناسب یہ کام نہیں۔ لیکن یہ شرعی جرم نہ ہوگا۔ اس نہی میں شرعی جرم سے نہیں روکا بلکہ نامناسب کام سے منع کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ کہ نہی تحریمی میں تعین شرط ہے۔ کہ اس معین سے بچو یا یہ معین کام نہ کرو۔ اس آیت میں ہوٰی کا تعین نہ فرمایا گیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ یہ نہی تحریمی نہیں بلکہ مناسب حال ہے۔

تیسری آیت:۔ وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي۔ (ترجمہ):۔ اے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام تم دونوں میرے ذکر میں ضعف محسوس نہ کرنا۔ یہ بھی نہی تحریمی نہیں۔ بلکہ استحبابی ہے۔ کیونکہ لفظ تَنِيَا وَنِّيٌ سے مشتق ہے۔ بمعنیٰ ضعف وکمزوری (المنجد عربی صـ۱۰۲۲) ضعف وکمزوری کسی شخص کے اختیاری نہیں لہٰذا نہی تحریمی کیسے ہو سکتی ہے نہی تحریمی ہمیشہ اختیاری چیز پر ہوتی ہے نہ کہ اضطراری پر ویسے بھی ہر وقت ذکر اللہ فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اس آیت میں بحالت سفر کا ہمہ وقتی ذکر مراد ہے جو فرض نہیں ہوتا۔ تو کیسے ہو سکتا ہے کہ مستحب فعل کے ترک پر نہی تحریمی وارد ہو۔ کوئی نادان ہی ایسا کہہ سکتا ہے۔ لَا تَنِيَا کا مطلب یہ ہے کہ ذکر میں کمزوری نہ دکھانا دلیر بننا۔ اور کام چاہیں چھوڑ دینا مگر اس سفر میں ذکر اللہ نہ چھوڑنا۔ **چوتھی آیت پ۱۲**:۔ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ یہ نہی بھی تحریمی نہیں بلکہ ترک سوال بطور راحت ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ نمبر صـ۶۴ پر ہے:۔ وَجَبَ جَعْلُ هٰذِهِ الْوُجُوْهِ الْمَذْكُوْرَةِ عَلٰى تَرْكِ الْاَفْضَلِ۔ (ترجمہ):۔ اس قسم کی منہیات کو ترک افضل میں شامل کرنا واجب ہے۔ یعنی چونکہ حضرت نوح کا یہ سوال خطاء اجتہادی تھی۔ لہٰذا استحبابًا منع فرمایا گیا کہ آئندہ ایسی خطا نہ کرنا آپ کی شان کے لائق نہیں۔ اور خلاف شان کوئی بات کرنا گناہ نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی مکلف ہے۔ ہاں افضل ہے کہ ایسی خطا بھی نہ ہو۔ **پانچویں آیت**:۔ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ:۔ اس آیت کا ترجمہ دو طرح ہو سکتا ہے۔ پہلا۔ نہ عبادت کر تو اللہ کے علاوہ کی۔ اکثر مفسرین نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ اور ہمارے مخالف مذکور نے بھی یہی ترجمہ اختیار کیا ہے پھر کہتا ہے کہ یہ نہی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے۔ حالانکہ یہ ترجمہ لے کر پھر پیارے معصوم آقا کو مراد لینا ارتداد سے کم

نہ ہوگی۔ تمام مفسرین نے فرمایا کہ اس نہی میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ تفسیر صاوی جلد سوم صفحہ ۱۷۸ پر اور تفسیر خازن جلد سوم صفحہ ۲۹۴ پر ہے:- فَالْمُرَادُ بِهٖ غَيْرُهٗ لِاَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شَيْئًا اَلْبَتَّةَ فَيَكُوْنُ الْمَعْنٰى لَا تَدْعُ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (ترجمہ):- پس مراد اس خطاب سے نبی کریم کے علاوہ عام امتی لوگ ہیں اس لیئے کہ نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی کسی شی کو نہ پوجا یقیناً۔ پس لاتدع کا معنے ہوگا۔ اے انسان تو نہ پوجنا کسی جھوٹے معبود کو۔ سعیدی صاحب نے آنکھیں بند کر کے اس نہی کو نبی کریم کی طرف پھیر دیا۔ حالانکہ سابق کلام سے تو یہ کلام خود نبی کریم کا ہے اور نبیٔ پاک اس کلام کے متکلم ہیں۔ کیونکہ یہ مضمون قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ سے شروع ہو رہا ہے۔ اگلی آیت اس کا مقولہ ہیں۔ بھلا کبھی ہو سکتا ہے کہ متکلم خود ہی اپنے کلام کا مخاطب ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیارے نبی تم فرما دو لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اعلیٰحضرت کا ترجمہ بھی یہی بتا رہا ہے۔ اس آیت پاک کا دوسرا ترجمہ اس طرح ہو سکتا ہے۔ نہ بلا تو اللہ کے دشمن کو یعنی اے انسان اللہ کے دشمن کو دین کی طرف مت بلا ان کا بلانا بے فائدہ ہے۔ نہ ان کا کچھ نقصان تجھے پہنچے۔ تفسیر کبیر نے اسی ترجمے کی طرف توجہ دی ہے۔ چنانچہ جلد پنجم صفحہ ۴۳ پر ہے:- لَا يُمْكِنُ اَنْ يَكُوْنَ هٰذَا نَهْيًا عَنْ عِبَادَتِ الْاَوْثَانِ۔ (ترجمہ):- ناممکن ہے کہ یہ نہی بتوں کی عبادت کی ہو۔ یعنی لَاتَدْعُ کا یہ ترجمہ کرنا کہ مت پوج یہ درست نہیں اور پھر یہ ترجمہ کر کے اس کا رخ نبی کریم کی طرف پھیرنا ناممکن ہے۔

چھٹی آیت:- وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ۔ یہ نہی بھی نبی کریم کو نہیں ہے بلکہ عام انسان کو ہے۔ جیسا کہ اعلیٰحضرت کے ترجمے نے اشارہ کیا۔ اعلیٰحضرت اپنے ترجمے میں نبی کریم کو بصیغۂ جمع ادب سے خطاب کرتے ہیں اور عام انسان بصیغۂ واحد اگر یہ نہی نبی پاک کو ہوتی تو اعلیٰحضرت اس طرح ترجمہ فرماتے۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ کافروں کی اطاعت نہ کیجئے۔ مگر ترجمہ اس طرح ہے۔ تو کافروں کا کہا نہ مان۔ علاوہ ازیں اطاعت کا لغوی معنٰی ہے۔ بات ماننا۔ عام ہے اس کو کہ دینی بات ہو یا دنیوی۔ نبی کریم کے لیئے کافر کی دینی بات ماننا تو محال شرعی و عقلی ہے۔ پس اس مرجح سے دنیوی بات ترجیح پا گئی۔ اور تعین ہوا کہ یہاں لَا تُطِعْ سے دنیوی بات ماننے سے نہی ہے۔ اور شرعاً کافر کی دنیوی بات ماننا حرام نہیں پس یہ نہی تحریمی نہ ہوئی۔ بلکہ تنزیہی ہوئی اور اس کے برعکس بھی جائز ہے۔ چنانچہ بہت دفعہ نبی کریم نے کافروں کی دنیوی بات تسلیم کی۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے واقعہ سے عیاں ہے۔ باوجود اس احتمال کے روش کلام کے لحاظ سے اس نہی کو عام مسلمان کی طرف پھیرنا جائز ہے۔ تو کیا ضروری ہے کہ ضد کر کے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہی پھیری جائے۔ بہر حال اس آیت سے بھی مقصد مخالف حاصل نہیں ہوتا۔ **ساتویں آیت:-** وَلَا تَقُمْ

عَلٰی قَبْرِہٖ (ترجمہ) :- پوری آیت کا اس طرح ہے۔ نہ جنازہ پڑھنا اس کافر کا اور قبر پر نہ کھڑا ہونا اس کافر کی یہ حقیقی نہی صرف نبی کریم کو نہیں بلکہ اس آیت میں ممانعت تامہ ہے جس کو قانون کہا جاتا ہے۔ اور قیامت تک کے تمام مسلمان مراد اور مخاطب ہیں۔ گویا کہ اس آیت نے ایک مستقل قانون بنا دیا۔ اور یہ نہی قانون ساز عبارت ہے۔ اگر یہ نہی صرف نبی کریم کو ہوتی تو لفظ ابداً نہ ہوتا۔ آٹھویں آیت :- لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ سورہ ۲۰ طٰہٰ پ ۱۶ آیت نمبر ۱۳۱ اس کا ترجمہ اعلیحضرت نے اس طرح فرمایا۔ اور اے سننے والے اپنی آنکھیں نہ پھیلا۔ تفسیر صاوی نے جلد سوم صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے :- وَهٰذَا الْخِطَابُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ وَالْمُرَادُ غَیْرُهٗ لِاَنَّ ذَالِكَ مُسْتَحِیْلٌ عَلَیْهِ لِمَا وَرَدَ :- ترجمہ ظاہراً خطاب نبی پاک کو ہے لیکن حقیقتاً مراد عام امت ہے کیونکہ نبی پاک کے لیئے یہ ارتکاب ناممکن ہے جیسا کہ ثابت ہے اور محال پر نہی ہو سکتی ہی نہیں۔ صاف معلوم ہوا کہ یہ نہی عوام کو ہے نہ کہ نبی کریم کو۔ نویں آیت :- لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ (ترجمہ) :- اے پیارے نبی قرآن مجید یاد کرنے کے لیئے اپنی زبان پاک نہ ہلائیے (ہم خود حفظ کرا دیں گے) یہ نہی تحریمی و تکلیفی نہیں بلکہ کریمانہ کرم ہے۔ جس سے شانِ محبوبی کا اظہار ہے۔ جیسے کوئی استاد اپنے پیارے لائق لاڈلے شاگرد سے کہے۔ اتنا نہ پڑھ تھک جائے گا جا آرام کر میں خود تجھ کو سبق یاد کرا دوں گا۔ میرا یہ مفہوم تفسیر بالرائے نہیں جیسا کہ سعیدی صاحب کو وسوسہ ہوا۔ بلکہ اشارۃ النص سے ثابت ہے۔ :

آیت نمبر دس :- اور گیارھویں۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (ترجمہ) :- یتیم کو نہ جھڑکو۔ سائل کو مت ڈانٹو نہ بھگاؤ۔ یہ آیت بھی نبی پاک کے لیئے نہیں بلکہ قانون بنایا جا رہا ہے۔ اور سب امت کے لیئے نہی ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں نبی کریم کو اجازت ہے کہ جس کو چاہیں ڈانٹیں جھڑکیں۔ اس لیئے کہ نبی اکرم کی جھڑک اور ڈانٹ بھی امت کے لیئے رحمت ہے :- پیارے آقا کی ہر ادا عین حکمت ہے۔ جب استاد کی جھڑک باپ کی ڈانٹ شرعاً جائز ہے تو نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جھڑک تو بدرجہا اولیٰ ہے۔ ایک صحابی تو میدانِ بدر میں صرف نبی پاک کے ہاتھ سے قمچی کھانے کی تمنا میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قربانی کے دن حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دستِ اقدس سے ذبح ہونے کی خوشی میں اونٹ گردنیں آگے کرنے میں جلدی دکھانے لگے۔ آج جبرائیل و میکائیل۔ غوث و قطب۔ نبی کریم کی ایک اٹھتی نگاہ کے متمنی ہیں۔ بھلا کون ہو گا جو نبی کریم کی جھڑک سے کبیدہ خاطر ہو۔ بڑے بڑے اولیا تو مدینہ منورہ کے عوامی ہجوم سے دھکے کھانے کی غرض سے ہر سال حاضری کے لیئے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ ایک بزرگ نے تو یہاں تک فرمایا کہ نجدی حکومت اپنے ظالمانہ رویہ کے باوجود جو اب تک پنپ رہی ہے۔ وہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل۔ ورنہ قوی ہیکل لوگ چھوٹے چھوٹے نجدی شُرطوں کے ہاتھ سے دھکے
کھا کر برداشت کر جاتے ہیں صرف عشقِ مصطفےٰ علیہ السلام کی خاطر اور وہ عشاق ان دھکوں میں لذتِ عشق پاتے ہیں
اگر بقول سعیدی صاحب لا تقہر کی نہی حضور اکرم کی طرف پھیری جائے تو تحصیلِ حاصل لازم آئے گا۔ یا ایھا النبی
اتق اللہ سے تحصیل حاصل کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں امر تنجیزی یا فوری نہیں بلکہ امر ثبوتی ہے یہ تھیں وہ آئیں
جن سے آپ نے غلط استدلال کر کے عصمتِ معصوم کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی جرأت دکھائی۔ اور جو تعریف
محفوظ من اللہ کی تھی وہ عصمت پر چسپاں کی۔ محفوظ اولیاءِ کاملین وہ ہوتے ہیں جو گناہ کر سکتے ہیں۔ مگر کرتے نہیں
میرے ایک دوست حضرت قبلہ حکیم الامت کے شاگرد حاجی رحمۃ اللہ عرف فقیر شاہد و لہا چڑ یا ڈلوی کے
سیاق سباق ماضی حال مستقبل کو اندرونی بیرونی طور سے میں جانتا ہوں میں بر ملا کہتا ہوں کہ انہوں نے ساری
عمر کوئی گناہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ کر سکتے تھے تو وہ بھی معصوم ہو گئے۔ اس سے درگزر۔ حضراتِ صدیق و فاروق
کی شان یہ ہے کہ وہ کر سکتے ہیں۔ مگر کرتے نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ معاذ اللہ یہ حضرات مقامِ عصمت پر
فائز ہو گئے جب کہ عقیدۂ حقیقیہ مسلّم ہے کہ عصمت انسانوں میں صرف انبیاء کو ہے۔ چنانچہ المعتقد صفحہ نمبر
۱۱۷ پر ہے:۔ اَلْعُصْمَةُ وَهِيَ مِنْ خَصَائِصِ النُّبُوَّةِ عَلٰى مَذْهَبِ اَهْلِ الْحَقِّ۔ (ترجمہ)
معصوم ہونا اہلِ تحقیق کے مذہب میں انبیاء کا خاصّہ ہے۔ اور اگر کوئی نادان یہ کہہ دے کہ صحابہ و اولیاء
معصوم تو نہیں مگر شان ان کی بھی یہ ہی ہے۔ تو عصمت بیکار ہو گی۔ ماننا پڑے گا۔ انبیاءِ کرام نہ گناہ کر سکتے ہیں
نہ کرتے ہیں یہی سچی تعریفِ عصمت ہے۔ نبراس علی شرحِ العقائد صفحہ نمبر ۵۲۳ پر ہے:۔ لَا يَلْزَمُ
اَنْ يَّكُوْنَ غَيْرُ الْمَعْصُوْمِ مُذْنِبًا لِجَوَازِ اَنْ يَّكُوْنَ الشَّخْصُ خَالِيًا عَنْ هٰذِهِ الْمَلَكَةِ وَلٰكِنْ
لَا يَصْدُرُ عَنْهُ بِمَحْضِ حِفْظِ الْحَقِّ۔ (ترجمہ):۔ یہ ضروری نہیں کہ غیر معصوم انسان ضروری
ہی گناہ کرے۔ کیونکہ جائز ہے کہ یہ ملکہ جن کو نہیں ملا اُن سے بھی گناہ تا عمر صادر نہ ہو فقط حفاظتِ الٰہیہ
سے۔ ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے بھی عصمت کی تعریف غلط کی ہے وہ لوگ حقائق کے مقابل اپنی غلطی کو بچانے
کے لیئے اس کہنے پر مجبور ہیں کہ گناہ کی بابت نبی و غیر نبی برابر ہے۔ حالانکہ یہی عقیدہ گمراہی ہے صحیح عقیدہ
یہی ہے۔ کہ انبیاءِ کرام بے مثل ہیں ان کا ہر قول فعل جسد و روح بے مثل یہاں تک اشیاءِ مشترکہ بھی
ان کی بے مثل ہیں۔ ان کا مکلف فی الامر ہونا بھی بے مثل ہے۔ تمام مخلوقِ مکلّفہ کو تکلیف جبری ہے مگر
ان ہستیوں کا مکلف ہونا بھی تکلّفِ عشقِ الٰہی ہے انبیاءِ کرام پر جو کچھ فرض و واجب ہوتے ہیں وہ
اُن کی روحانی لذتِ عشق کے لیئے ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ پیارے مُقدّس بزرگ عبادت کرنے نہ کرنے
میں مختار ہوتے۔ چاہیں تو نماز پڑھیں خواہ نہ پڑھیں۔ چار کی تین پڑھیں۔ یا چار کی دو پڑھیں

کوئی عتاب نہیں۔ کوئی غوث و قطب پیر و عالم تو ایسا کر دیکھے یہ مناظرہ۔ ۳۰-۹-۷۸ کو شروع ہوا۔ اور
۱۲/۱۰/۷۸ کو میرے آخری چوتھے خط پر ختم ہوا اور اس حالت میں ختم ہوا کہ سعیدی صاحب کے ترکش علم
کے سب تیر ختم ہو چکے تھے اور اشارۃً و دلالۃً شکست تسلیم کر چکے تھے مگر ہٹ کی پٹی آنکھوں پر تھی
منطقی فلسفی غبار دماغ پر تھا اس لیئے ظاہراً کھلی کھلی جرئتِ رجوع نہ کر سکے ہیں چند وہ سوال جو ابھی تک
تشنۂ جواب ہیں اور صاف صاف ان کو بتائے گئے حسب ذیل ہیں۔ ع ۱ :۔ عصمتِ انبیاء اور عصمتِ
ملائکہ میں کیا فرق ہے۔ باحوالہ بتایا جائے۔ سوال ع ۲ :۔ جب کذب انبیا ممکن ہوا تو کیا آپ کے مذہب
میں انبیاء کرام علیہم السلام کو بالامکان کاذب بلکہ فاسق و فاجر کہا جا سکتا ہے (العیاذ باللہ) اگر نہیں
تو امکانِ کذب سے بھی آج توبہ کرو۔ سوال ع ۳ :۔ جب انبیاء کرام باوجود عصمت کے گناہ کر سکتے ہیں
تو کرنے سے کون مانع ہے اور نہ کرنے کی کیا گارنٹی ہے۔ اور یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ کرتے نہیں
باحوالہ سمجھایا جائے۔ سوال ع ۴ :۔ جب انبیاء کرام کا جھوٹ ممکن ہوا تو ساری آیات قرآنیہ و احادیث
مشکوک ہو گئیں۔ اِس شک کو کس طرح دور کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود تو پکار کر بتانا نہیں ہے۔
اس کے کلام تو دو ہی ذریعوں سے ملتے ہیں۔ ع ۱ :۔ انبیاء ع ۲ :۔ ملائکہ اسی وجہ سے ان کو معصوم بنایا ہے۔
سوال ع ۵ :۔ معصوم اور غیر معصوم متقی مسلمان میں کیا فرق ہے سوال ع ۶ :۔ معصوم بنانے کی کیا حکمت ہے
سوال ع ۷ :۔ کیا وجہ ہے کہ اعلیٰحضرت اور صدر الافاضل اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے
ماتریدی اور شرح مواقف کی تعریف کو مردود کر کے۔ اشاعرہ متکلمین۔ ابن ہمام۔ حسین نجار کی تعریف کو
اختیار فرمایا۔ کیا اب بھی کوئی مقال ہے یا اساتذہ سے بھی اعتزال ہے۔ تو یہ آپ کی ہی مجال ہے۔ جو
سراسر حق سے فرار ہے۔ نہ کہ مقابلہ اقتدار۔ واللہ اگر صدر الافاضل حیاتِ ظاہری میں ہوتے تو آپ کو
یہ عبارت کاٹنے پر مجبور کر دیتے۔ اور رجوع کا فوری حکم دے دیتے۔ مگر ہائے افسوس اب وہ
مشفق نگاہیں کہاں ڈھونڈیں۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

کتاب العلم

بیٹیوں کو میراث اور جہیز دینے کا حکم

سوال نمبر ۳۵ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ بعض عوام ہمارے علاقے کے کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو جب لاکھوں کا جہیز دے دیا جاتا ہے تو ان کو میراث سے حصہ دینا درست نہیں ہزاروں بیٹیاں اس رواج کی بنا پر اپنے باپوں کی میراث سے محروم رہتی ہیں اور باپ کی لاکھوں کی میراث بیٹے ہی لے لیتے ہیں اسی طرح کا ایک جھگڑا یہاں ہے صورتِ مسئلہ اس طرح ہے۔ ع۱:۔ ایک شخص فوت ہو گیا۔ اس کی کچھ زمین ہے جس میں اس کے مکانات تعمیر ہیں پسماندگان میں ع۱ بیوہ تین لڑکے۔ چار لڑکیاں۔ ایک بھائی موجود ہے اس متوفی کی میراث کیسے تقسیم ہو گی۔ دوسرا مسئلہ اس طرح ہے۔ تین بھائیوں میں سے دو بھائی فوت ہو چکے ان کا تیسرا بھائی بھی فوت ہو گیا تھا۔ اس کی بیوہ بھی اب فوت ہو گئی اولاد میں صرف اس کی ایک لڑکی سگی ہے دونوں بھائیوں فوت شدگان کی اولاد نرینہ ہے فرمایا جائے کہ ان کی میراث کس طرح تقسیم ہو گی۔

الراقم حافظ غلام محی الدین فاروقی بجے منگا کالونی منگا ۶ شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ ۱۹۷۹ء ۔ ۷ ۔ ۲

الجواب بعون العلام الوهاب

قانونِ اسلامیہ کے مطابق تمام عبادات سے زیادہ اہم عبادت فوت شدہ کی میراث تقسیم کرنا ہے اس لئے کہ یہ حقوق العباد ہے۔ اور اس لئے کہ بعض حالات میں ورثاء میں یتیم بھی شامل ہوتے ہیں لہٰذا کسی وارث کا حصہ نہ دینا یا کم کرنا اشد ظلم ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت ہے کہ اگر کوئی وارث کسی دوسرے حقدار وارث کا حصہ خود لے لے یا تقسیم کے وقت کسی وارث کو خارج کر دے تو اس کی نماز روزہ سب بیکار اور وہ ظالم شخص دنیوی اخروی مجرم ہو گا:۔

پہلی دلیل:۔ اللہ تعالیٰ نے تمام عبادات کی تفصیل انبیاء کرام اور پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بیان فرمائی مگر میراث تقسیم کرنے کی تفصیل خود بیان فرمائی۔ چنانچہ قرآن پاک میں تمام ذی فرض وارثوں کا ذکر پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے جلد پنجم صـ ۶۶۲ پر ہے:۔ وَلَمْ يُفَوِّضْ تَقْدِيْرَهٗ اِلٰى مَلَكٍ مُقَرَّبٍ وَلَا نَبِيٍّ مُرْسَلٍ بِخِلَافِ سَائِرِ الْاَحْكَامِ كَالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ۔ (ترجمہ):۔ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے میراث کے حصے مقرر کرنا کسی فرشتے یا کسی نبی مرسل علیہ السلام کے سپرد نہ فرمائے۔ بخلاف تمام باقی احکام کے جیسے کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ۔ ثابت ہوا کہ میراث کی تقسیم کتنی ضروری اور اہم ہے۔ باری تعالےٰ کا خود اپنے ذمۂ کرم پر یہ کام لینا ثابت کر رہا ہے کہ یہ کام اہم ترین ہے جب انبیاء کرام اور ملائکہ کے سپرد نہ فرمایا حالانکہ وہاں ظلم ناممکن تو کس بندے کی جرئت ہے جو میراث کی تقسیم کے قانون خود بنائے اور جب انبیاء کرام کے فرمودہ قانون توڑنے گناہ عظیم ہیں تو خود باری تعالیٰ کے فرمودہ قوانین توڑنے اور اس کی خلاف ورزی کرنا اور مختلف حیلے بہانوں سے کسی وارث کو محروم رکھنا کتنا بڑا ظلم اور گناہ کبیرہ ہوگا۔ اور پھر ایسے مجرم کی سزا کتنی سخت ہوگی جرم کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم دنیا کے فانی مال کے لیئے کس کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ **دوسری دلیل**:۔ بہت سی عبادات فرض ہیں مگر کسی کی فرضیت اتنی بڑی نہیں کہ وہ خود سراپا فرض کہلائے۔ دیکھو۔ نماز۔ زکوٰۃ۔ فرض ہیں مگر ان کا نام فرض نہیں بلکہ نماز ہے زکوٰۃ ہے وغیرہ وغیرہ بخلاف میراث کے کہ اس کا نام ہی اسلام میں فرض ہوگیا اور اس کے جاننے کا نام علم فرائض ہوا۔ فتاوے درِ مختار مجلد مکمل صـ ۸۰۷ پر ہے:۔ وَسُمِّيَ فَرَائِضُ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَسَّمَهٗ بِنَفْسِهٖ وَاَوْضَحَهٗ وُضُوْحَ النَّهَارِ بِشَمْسِهٖ۔ (ترجمہ):۔ اس عبادت کا نام فرض رکھا گیا۔ اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اس کو تقسیم فرمایا اور سورج کی طرح صاف صاف واضح فرمایا۔ تاکہ کوئی انسان اس میں غلطی کر کے جہنمی نہ بن جائے۔ علامہ شامی نے اس کی شرح اس طرح فرمائی۔ (قسمہ) اَىْ اَوْلٰى قَدَّرَهٗ كَمَا قَالَ الزَّيْلَعِيُّ لِاَنَّهٗ مَعْنَى الْفَرْضِ:۔ (ترجمہ):۔ مصنف نے کہا کہ تقسیم فرمایا۔ بہتر یہ تھا کہ مصنف کہتے قَدَّرَ یعنی ٹھیک ٹھیک اندازہ بیان کر دیا جس طرح امام زیلعی نے کہا۔ اس لیئے کہ فرض کے معنیٰ ہیں اندازہ بیان کرنا۔ اور اندازہ وہ ہو سکتا ہے۔ جس میں نہ کمی ہو سکے نہ زیادتی جیسے نماز وغیرہ عبادات۔ کہ نہ اس میں کچھ کم ہو سکے نہ زیادہ حالانکہ ان عبادات کے اندازے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔ تو وراثت جیسی اہم عبادت جس کا اندازہ خود ربِ قدیر نے بیان فرمایا اس میں کوئی کس طرح کمی کر سکتا ہے اور کس طرح کسی وارث کو محروم کر سکتا ہے۔ **تیسری دلیل**:۔ کائنات میں کروڑہا قسم کے علوم ہیں۔ مگر علم میراث سب سے زیادہ اہم اور بوجھل ہے کہ سارے علم ملائے جائیں تو دنیا کے آدھے علم

بنتے ہیں مگر یہ علم اکیلا آدھا علم ہے۔ حدیث پاک میں اس کو آدھا علم فرمایا گیا۔ چنانچہ ابن ماجہ شریف صـ ۱۹۵ پر ہے۔
عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا فَإِنَّهُ نِصْفُ الْعِلْمِ وَهُوَ يُنْسٰى وَهُوَ أَوَّلُ شَيْءٍ يُنْزَعُ مِنْ أُمَّتِي ۔ (ترجمہ) ۔ حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ فرمایا آقائے کائنات حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اے ابوہریرہ علم فرائض سیکھو اور سکھاؤ کیونکہ یہ کائنات کا آدھا علم ہے یہی جلدی بھلایا جاتا ہے اور یہی سب سے پہلے میری امت میں سے اٹھایا جائے گا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں پہلی یہ کہ اس علم کو فرض کا علم کہتے ہیں اور فرض کس کا نام؟ میراث کا گویا یہ حقوق العباد سراپا فرض ہوئے اور مبالغۃً کہا گیا ہے زَيْدٌ عَدْلٌ زید سراپا عدل ہے۔ اسی طرح میراث اتنا بڑا فرض ہے کہ گویا خود فرض بن گیا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا سیکھنا بھی اہم فرض کیونکہ امر وجوب کے لیئے ہے۔ اور جس کا سیکھنا فرض اس پر عمل تو اور بھی زیادہ۔ تیسری یہ کہ یہ علم سب سے پہلے اٹھایا جائے گا۔ اس سے بھی اس کی اہمیت ثابت ہوئی۔ اس طرح کہ جب علم اٹھ جائے گا تو کوئی بھی تقسیم کرنے والا نہ رہے گا اور لوگ بلا تقسیم وارثوں کے یتیموں کے۔ بھائی اپنی بہنوں کے وراثت کے حصے غضب کر لیں گے۔ بہنوں کو یعنی متوفے کی بیٹیوں کو محروم کر دیا کریں گے۔ اور ظالم و خائن کہلا کر اشرارِ خلق بنیں گے اور ان پر قیامت نازل ہو جائے گی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اشرار خلق پر قیامت طاری ہوگی جب کوئی منصف نہ رہے گا۔ سب ظالم ہی ظالم رہ جائیں گے۔ ثابت ہوا کہ میراث صحیح تقسیم نہ کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے **چوتھی دلیل**:۔ مسلم شریف جلد دوم صـ ۳۷ پر ہے کہ ایک شخص بشیر نامی صحابی رضی اللہ تعالےٰ عنہ بارگاہِ اقدس میں آیا۔ اور عرض کیا یا رسول میں اپنے ایک بیٹے نعمان کو اپنا اتنا اتنا مال دینا چاہتا ہوں۔ اس کی شرح نووی نے لکھا۔ وَفِي رِوَايَةٍ۔ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفَعَلْتَ هٰذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ۔ قَالَ لَا قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوا فِي أَوْلَادِكُمْ:۔ (ترجمہ):۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اپنی سب اولاد کو اتنا اتنا دیا ہے۔ عرض کیا نہیں۔ فرمایا آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ اللہ سے ڈرو۔ اور اپنی اولاد میں انصاف کرو۔ مقام غور ہے کہ جب زندہ مرد کو اپنے مالِ ملکیتی میں یہ اختیار نہیں کہ ایک بچے کو دے دوسرے کو نہ دے یا بیٹے کو دے بیٹی کو نہ دے یا اس کا الٹ تو وفات یافتہ کی دولت و جائیداد میں کسی دوسرے کو کسطرح اجازت ہو سکتی ہے کہ کسی وارثِ شرعی کو محروم کرے جب اللہ تعالےٰ عطا فرما رہا ہو تو کس کی طاقت ہے کہ حصہ مارے اور خدا تعالیٰ کا مقابلہ کرے۔ لہٰذا اے وارثو۔ اللہ سے ڈرو اور قیامت کی نشانی نہ بنو۔ کوئی بیٹی کسی بیٹے کو یا کوئی بیٹا کسی بیٹی کو محروم نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی لڑکا ایسا کرے گا کہ اپنے باپ کے ترکے میں

بیٹی کو شرعی حصہ نہ دے گا اور وہ مال خود کھائے گا تو وہ اس پر حرام ہوگا۔ اور وہ اس کا جہنم کی آگ ہے :۔

دلیل ۵ :۔ ترمذی شریف جلد دوم ص ۳۰ پر ہے۔ سعد بن ربیع جنگِ احد میں شہید ہو گئے ان کی ایک بیوہ دو لڑکیاں ایک بھائی پسماندگان وارث تھے۔ سعد بن ربیع شہید کے بھائی یعنی لڑکیوں کے چچا نے سعد کی ساری دولت چھین لی لڑکیوں اور بیوہ کو کچھ نہ دیا۔ بیوہ نے بارگاہِ رسالت میں مقدمہ پیش فرمایا تو ابھی نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی فیصلہ نہیں فرمایا تھا کہ وحی میں آیات میراث نازل ہوئی۔ جس میں خاص طور پر بیٹیوں کے حصہ کی اہمیت وضاحت کی گئی۔ یعنی رب کریم نے اشارۃً فرمایا کہ اے پیارے حبیب یہ مقدمہ اتنا اہم ہے کہ اس کا فیصلہ ہم خود فرمائیں گے۔ اب جو بدبخت بیٹا اپنے باپ کی جائیداد سے اس کی بیٹیوں کو میراث نہ دے یا کسی رشتہ دار آدمی میت کی بیٹیوں کو باپ کی ترکہ جائیداد سے محروم کر دے وہ کتنا بڑا ظالم ہے۔ ترمذی شریف کی فرمودہ منقولہ حدیث پاک کے کچھ الفاظ اس طرح ہیں۔ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ بِنْتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قُتِلَ اَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ شَهِيْدًا وَّاِنَّ عَمَّهُمَا اَخَذَ مَالَهُمَا فَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالًا ۔ (الخ) :۔ (ترجمہ) وہی ہے جو اوپر گزرا۔ ترمذی نے اس باب کا نام ہی۔ باب میراث البنات۔ رکھا۔ **دلیل ۶** :۔ مشکوٰۃ شریف ص ۲۶۳ پر ہے :۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ :۔ (ترجمہ) :۔ حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا کہ فرمایا رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام وارثوں کو ان کی میراث دے دو تو جو بچ جائے وہ قریبی عصبہ مرد کو دے دو۔ اس حدیث سے نبی کریم رؤف رحیم پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ذیشان واجب ولازم بن کر ثابت ہوا کہ اے مسلمانوں ہر اہل ذی فرض وارث کو اس کا پورا پورا حصہ فوراً دے دو۔ خبردار نہ کسی کا حصہ چھیننا نہ روکنا نہ بہانے بنا کر کسی وارث کو محروم کرنا۔ لفظ الحقوا امر کا صیغہ ہے جو وجوب کے لیے آیا ہے۔ واجب کو ادا نہ کرنے والا شرعی مجرم گناہ گار ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ کے مطابق اگر کوئی شخص میت کی مستحق بیٹی کو میراث کا حصہ نہ دے گا تو فاسق فاجر ہوگا اور حرام روزی کا مرتکب ہوگا۔

دلیل ۷ :۔ بخاری شریف جلد اوّل صفحہ نمبر ۳۵۲ پر ہے :۔ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ ۔ (ترجمہ) :۔ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے مسلمانو! اپنی اولاد کے عطیوں میں انصاف کرو۔ اس کے حاشیے میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا۔ قَوْلُهُ اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ (الخ) ۔ هٰذَا وَاجِبٌ اَشَدُّ الْوُجُوْبِ وَغَفَلَ عَنْهُ النَّاسُ ۔ (ترجمہ) :۔ حدیث پاک کا فرمان اِعْدِلُوْا (الخ) یہ بہت سخت واجب حکم ہے

حالانکہ لوگ اس سے غافل ہیں۔ ثابت ہوا کہ کسی وارث کو میراثی حصے سے محروم کرنا سخت گناہ اور لائق عذاب ہے۔ اور جو شخص بھی وہ حصہ چھینے گا اس کے لیئے حرام مال کی شکل ہوگا۔ دلیل ۸ :- میراث کو شریعتِ پاک کی زبان میں فرض کہتے ہیں اور فرض کے لغوی معنٰے ہیں کاٹنا۔ چنانچہ مرقات شرح مشکوٰۃ شریف جلد سوم ص ۲۸۷ پر ہے :-

اَلْفَرْضُ اَصْلُہٗ اَلْقَطْعُ یُقَالُ فَرَضْتُ لِفُلَانٍ اِذَا قَطَعْتَ لَہٗ مِنَ الْمَالِ شَیْئًا :- (ترجمہ) :-

فرض کا لغوی معنٰی ہے کاٹنا۔ اور کاٹنے کا مطلب ہے اس طرح جدا ہونا کہ اس سے جوڑ نہ سکے۔ جیسے کہ درخت کی شاخ جب کٹ جائے تو ہرگز جوڑی نہیں جا سکتی اسی طرح مقصد یہ ہے کہ وہ مال جو پہلے ایک ہی جگہ جڑا ہوا تھا مال والے کے مرنے کے بعد ایسا کٹے گا اور ایسے حصے ہوں گے کہ کوئی حصہ دوسرے سے جڑ نہیں سکے گا۔ جو بیٹی کا حصہ ہے وہ بیٹی کو ملے گا کسی کی طاقت نہیں کہ بیٹے کے حصے سے اس کو جوڑ دے۔ جو جوڑنے کی ناجائز کوشش کرے گا وہ شرعی مجرم ہوگا۔ دلیل ۹ :- زمانۂ جاہلیت میں نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے میراث تقسیم کرنے کا ایک ظالمانہ طریقہ رائج تھا وہ یہ کہ میت کا ترکہ میت کے یتیم بچوں کو دیا جاتا نہ اس کی بیٹیوں کو بلکہ یہ سارا مال بیٹے لے لیتے یا میت کے حلیف اور وعدے والے جس سے فوت شدہ مرد اپنی زندگی میں میراث کا وعدہ کر لیتا وہ لے لیتے۔ یہ ایسا ظالمانہ رواج تھا کہ اس پر ایک کافر اور حریص و پیٹ پرست کو تو فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی مومن رحم دل یتیم پرور درد مند اور اولاد والے کو یہ ظلم ہرگز پسند نہیں آ سکتا۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ نمبر ۴۵۷ پر ہے :-

فَاِنَّ اَھْلَ الْجَاھِلِیَّۃِ کَانُوْا یَجْعَلُوْنَ جَمِیْعَ الْمِیْرَاثِ لِلذُّکُوْرِ دُوْنَ الْاِنَاثِ (الخ) - ترجمہ :-

بے شک دورِ جاہلیت والے کفار تمام میراث لڑکوں کو دے دیتے تھے اور بیٹیوں کو کچھ نہ دیتے تھے اس ظلم کو باری تعالیٰ نے ختم فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا۔ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ :- (ترجمہ) :- اے مسلمانو! تم کو اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے اور وصیت اس آخری اور اٹل حکم کو کہتے ہیں جو ایسا واجب ہو کہ اس کو توڑا نہ جا سکے۔ چنانچہ تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ نمبر ۵۱۳ پر ہے :-

مَعْنٰی قَوْلِہٖ ھٰھُنَا یُوْصِیْکُمْ اَیْ یَفْرِضُ عَلَیْکُمْ لِاَنَّ الْوَصِیَّۃَ مِنَ اللّٰہِ اِیْجَابٌ :- (ترجمہ) :-

یہاں یوصیکم کا معنٰی ہے کہ تم پر فرض کیا اس لیئے کہ وصیت اللہ کی طرف سے گویا واجب کرنا ہوتا ہے اور چونکہ اللہ کے فرض کردہ حکم کے خلاف کرنا حرام ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بیٹیوں کو میراث نہ دینی حرام ہے

کیا کرم ہے اس کریم کا جس نے مظلوم اور کمزور اولاد سے کیسا پیار فرمایا کہ جب والدین کو بھی اپنی بے بس بے کس اولاد کی پرواہ نہ تھی تو رب کائنات جو کروڑہا ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا اس نے اپنے حبیب پاک صاحب لولاک کے ذریعے دین اسلام کا ایسا عظیم الشان قانون عطا فرمایا۔ جس نے ہر شخص کے ہر قسم کے

علیحدہ علیحدہ حقوق مسلمانوں پر واجب ولازم فرمادیئے اور خود فرمادیا کہ یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوْلَادِکُمْ اللہ وصیت فرماتا ہے۔ تم کو یہ آخری حکم ہے۔ اس میں تبدیلی ناممکن۔ یہ فرضی حکم صرف تمہاری اولاد کے بارے میں ہے اس کا بہت خیال رکھنا خبردار تمہارے مال کے جس طرح تمہارے بیٹے مستحق ہیں اسی طرح تمہاری بیٹیاں بھی حق دار ہیں۔ سب سے پہلے ان کو دو پھر ان سے بچے تو اوروں کو دے دو ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔ (ترجمہ):۔ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے گا اس لیئے کہ مرد پر اخراجات اور ذمہ داریاں زیادہ ہیں مثلاً بال بچوں کا نفقہ وغیرہ بیٹی پر یہ نہیں۔ اسلام نے میراث کو تین وجہوں پر تقسیم کیا۔ ع۱ نسب کی وجہ سے ع۲ نکاح کی وجہ سے ع۳ ولاء کی وجہ سے مگر اب فی زمانہ حال صرف دو وجہ باقی ہیں ع۱ نسب اور ع۲ نکاح۔ ولاء یعنی لونڈی غلام کی میراث اب نہیں کیونکہ لونڈی غلام نہیں ہیں۔ پہلے تھے اس لیئے پہلے کے مفسرین نے تینوں کا ذکر فرمایا چنانچہ تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ نمبر ص۱۵۳ پر اور تفسیر خازن جلد دوم ص۲ پر ہے وَاَسْبَابُ الْاِرْثِ ثَلٰثَۃٌ نَسَبٌ وَنِکَاحٌ وَوِلَاءٌ۔ (ترجمہ وہی ہے جو اوپر گذرا)۔ اور سب میں سب سے اہم اولاد یعنی بیٹا بیٹی جیسا کہ یُوصِیکُمْ سے ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے قوانین وراثتِ اسلامیہ میں اولاد کا ذکر فرما کر زمانۂ جاہلیت کے رواجوں کو توڑا۔ کتنے بدنصیب ہیں وہ مسلمان جو بیٹیوں کو میراث سے محروم کر کے پھر زمانۂ جاہلیت کے رواج کو پسند کر رہے ہیں صرف حرص دنیا کی خاطر اللہ رسول کو ناراض کر رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی بھی دور ہو کوئی وقت اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں ہو سکتی بیٹیوں کے حصے کوئی نہیں روک سکتا۔ رہا جہیز دینے کا سوال اور جہیز کا بہانہ تو یہ بہانہ چار وجہ سے غلط ہے پہلی یہ کہ جہیز صرف بیٹی کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بیوی کے ساس سسر سالے اور خاوند کا بھی حصہ دیا جاتا ہے جیسا کہ رواج ہے۔ دوسری یہ کہ جہیز شریعت کے خلاف ہے بلکہ فی زمانہ ایک مصیبت بنا ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز دیا تھا اس کی دو وجہ تھیں ع۱ حضرت علی اتنے مفلس تھے کہ ان کے گھر میں کچھ بھی نہ تھا صرف گھر چلانے کے لیئے خاتون جنت چند برتن لے آئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز فاطمہ زہرا کے کسی اور بیٹی کو جہیز نہ دیا اس لیئے کہ ان کے خاوند حضرت عثمان بہت امیر تھے۔ ع۲ یہ کہ نبی کریم علیہ التحیہ والثناء کی میراث نہ تھی کہ نبی علیہ السلام کا مال وقف ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر نبی کریم نے اپنی بیٹیوں مطہرات کو اپنی زندگی پاک میں دے دیا تو اس پر قیاس روا نہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ جہیز باپ نے دیا ہے نہ کہ بھائی نے وہ اپنی بیٹی کو اپنی زندگی میں جو چاہے دے بعد وفات بھائی کیا لگتا ہے کہ جہیز کے بدلے میں اس کی میراث چھین لے۔ چوتھی وجہ یہ کہ۔ بقانونِ شریعت برے رواج کو ختم کرنا چاہیئے نہ کہ اچھے اور شرعی فرض کو۔ جہیز برا رواج ہے اور میراث شرعی فرض

اگر تم میں ہمت اور توفیق ہے تو بری رسم یعنی کثرتِ جہیز کو بند کرواؤ۔ شریعت کے قانون کو کیوں توڑتے ہو یہ تو ظلم عظیم ہے جس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔ بہر حال۔ بیٹی کا حصہ ضرور ضرور دینا پڑے گا خواہ قانوناً خواہ شرعاً خواہ خوفِ خدا سے۔ یا مصالحت سے۔ اس کام کو نافذ کرنا فرض ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر نے صاف صاف فرما دیا۔ جلد دوم ص ۲۱۶ پر ہے:۔ فَالْمُرَادُ يَأْمُرُكُمْ وَيَفْرِضُ عَلَيْكُمْ :۔ (ترجمہ):۔ یعنی خدا کی حکم سے مراد ہے کہ تم پر میراث صحیح تقسیم کرنا فرض ہے۔ اور یہ حکم صرف چند لوگوں کے لیئے نہیں بلکہ تمام کائنات کے مسلمانوں کے لیئے ہے خواہ جہیز دیا ہو یا نہ دیا ہو۔ بیٹی چھوٹی ہو یا بڑی کنواری ہو یا صاحبِ اولاد غریب ہو۔ بیٹی یا امیر۔ میراث کا حصہ دینا پڑے گا۔ یہ ایک ربانی امتحان ہے۔ تفسیر ابن کثیر اوّل نے صفحہ نمبر ۴۵۷ پر فرمایا:۔ لِاَنَّهٗ يَبْتَلِي بِهِ النَّاسَ كُلُّهُمْ :۔ (ترجمہ):۔ علم میراث کا نام فرض اس لیئے رکھا گیا ہے کہ تمام مسلمان اس فرض میں مبتلا ہیں۔ اور سب کی پوچھ قیامت میں ہوگی کہ کس نے صحیح تقسیم کی اور کس نے وارثوں کے حصے خود کھائے۔ بہر حال قانونِ شریعت کے مطابق بیٹیوں کو لازمی وراثت کا حصہ دیا جائے گا۔ اور آپ کی بستی والوں کو جہیز جہیز کا بہانہ بنانا بے کار ہے۔ جہیز وراثت کا بدلہ نہیں بن سکتا۔ ان تمام دلائل سے مسئلہ باہتمام واضح ہو گیا اب بھی اگر کوئی چوں چرا کرے تو شرعی مجرم ہوگا۔ اور مستحقِ عذابِ نار رہے آپ کا سوال مسئلہ تقسیم اگر چہ یک طرفہ ہے مگر اس کا جواب پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ جواب حتمی فیصلہ نہیں ہے اس لیئے کہ صرف آپ کے بیان پر فتوٰے دیا جا رہا ہے۔ میراثی مسائل کے فتاوٰے یک طرفہ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں صرف طریقۂ تقسیم کا سوال ہوتا ہے اور تقسیمِ کار تمام ورثا کی شرکت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں فریق ثانی ہوتا ہی کوئی نہیں۔ ہاں جن صورتوں میں سائل بحیثیت مدعی یا مستغیث ہو تو وہاں یکطرفہ فتوٰی حرام ہے۔ کہ اس میں مدعی علیہ یا مستغاث علیہ کی حق تلفی اور ظلم ہے۔ اسی طرح جب مفتی نے فتوٰے جج یا قاضی کو دینا ہو تو یک طرفہ فتوٰی صرف ایک بیان پر دینا جائز ہے۔ کیونکہ اب تفتیشِ حال کی ذمہ داری قاضی یا جج پر ہوگی مفتی کا کام صرف شرعی حکم بتانا ہوگا نہ کہ سنانا اور نافذ کرنا۔ لیکن جب مفتی فتوٰے سائل کو دے جیسا کہ آج کل ہم لوگ فتوٰی دیتے ہیں تو مفتی پر واجب ہے کہ سائل اگر مدعی یا مستغیث کی صورت میں ہے تو تفتیشِ حال خود مفتی کرے کیونکہ وہ فتوٰے عدالتِ قانونیہ میں گئے بغیر نافذ ہو جائے گا۔ اور احتمالِ یقینی ہے کہ دوسرے فریق کا بیان سنے بغیر جو فتوٰی نافذ ہوگا وہ ظلم ہوگا۔ فی زمانہ جو لوگ علمائے کرام سے فتوے طلب کرتے ہیں وہ شریعت کا جج اور قاضی سمجھ کر طلب کرتے ہیں کہ محض مفتی اور فتوے کو شرعی فیصلہ قرار دیا جاتا ہے نہ کہ فقط فتوٰی اس لیئے میں کہتا ہوں کہ فی زمانہ مفتیٔ اسلام کو قاضی بن کر خود تحقیق کرتے ہوئے دوسرے فریق کا بیان سن کر

فتوای لکھنا واجب ہے تاکہ فریق ثانی کو مفتی و فتوے پر طعن کا موقعہ نہ ملے۔ یہ فقہاءِ متقدمین فرماتے ہیں کہ مفتی کو فقط ایک شخص کے بیان پر فتوای دینا جائز ہے۔ وہ اُن کے اپنے زمانے کی بات ہے جب ملکوں میں اسلامی حکومتیں قائم تھیں اور مستفتی قاضی ہوتا تھا نہ کہ عام مدعی۔ آج کل یہ بات نہیں نہ قاضی رہے اور نہ جج مستفتی بنتے ہیں۔ عدالتیں کافرانہ قانون پر فیصلے کرتی ہیں۔ اس لیئے مفتی اسلام بدرجۂ قاضی ہیں خود ان پر دو طرفہ تفتیش واجب۔ لیکن جن صورتوں میں سائل محض سائل ہے نہ کہ مدعی وہاں تحقیق کے بغیر بھی فتوای جائز ہے۔ جیسے کہ مذکورہ فی السوال وراثتی مسائل کہ وہاں صرف تقسیم کا طریقۂ شرعی ہی پوچھنا مقصود ہے ان وجوہ کی بنا پر آپ کو یک طرفہ فتوای دیا جارہا ہے۔ وراثتِ مسئولہ کی پہلی شکل میں۔ اگرچہ ان مسائل میں بھی حتمی فیصلے کے لیئے غیر جانبدار گواہی لینا ضروری ہے تاکہ کوئی وارث نہ رہ جائے فتوای لینے والے کا بیان جھوٹا ہونا ممکن ہے۔ سائل کے اس سوال کی تحریر کے مطابق طریقۂ تقسیم کچھ اس طرح ہے:۔

مـ ۸ زید

سگا بھائی ایک	بیٹے تین عدد	بیٹی چار عدد	بیوہ ایک
محروم	۶ حصے	چار حصے	ایک حصہ

یعنی فوت ہونے والے بھائی کی جائیداد سے آٹھواں اس کی بیوہ کو۔ پھر بقیۂ جائیداد کے دس حصے کیئے جائیں گے اور اس طرح مسئلے کی تصحیح کرکے دو دو حصے تین بیٹوں کو اور ایک ایک حصہ چار بیٹیوں کو دیا جائے۔

دوسرا مسئلہ غیر واضح ہے نہ یہ بتایا کہ اس فوت شدہ بھائی کی بیوی پہلے مرگیا یا خاوند کے بعد یہ تو لفظِ بیوہ سے سمجھ آگیا خاوند پہلے فوت ہوا ہے نہ یہ پتا کہ دونوں بھائی اس مسئولہ مورث بھائی سے پہلے فوت ہوگئے یا بعد۔ ہم اپنی سمجھ کے مطابق ان دونوں بھائیوں کو بعد میں فوت کرتے ہیں اور نہ یہ بتایا کہ یہ دونو سگے بھائی ہیں یا اخیافی یا علاتی۔ ہم اپنے رواج کے مطابق ان دونوں کو سگے بھائی مانتے ہیں پھر یہ بھی نہ بتایا کہ بیوہ کے اور دونوں بھائیوں کے کتنے وارث ہیں۔ اگر یہ سب بات واضح کردی جاتی تو یہ مناسخہ کا مسئلہ پورا حل کردیا جاتا۔ بہرحال اصل مسئلہ یعنی شقِ اوّل کا طریقۂ تقسیم بتایا جاتا ہے۔ نقشۂ وراثت اس طرح ہے:۔

مـ ۸ / ۱۶ بکر

دو بھائی: ایک بھائی	دو بھائی: ایک بھائی	ایک بیٹی	ایک بیوہ
۳	۳	۸	۲

اس مسئلہ کو اولاً ثمن یعنی آٹھ سے تقسیم کیا گیا۔ ثلث صحیح نہ ہونے کی بنا پر ثمن کو نصف کے مخرج یعنی دو سے ضرب دے کر سولہ سے تقسیم کیا تو آٹھواں یعنی دو بیوہ کو آدھا حصہ یعنی آٹھ بیٹی کو ان ذی فرضوں سے بچے چھ حصے۔ وہ دونوں عصبہ بنفسہٖ سگے بھائیوں کو آدھا آدھا یعنی تین تین دے دیئے۔ اس طرح اس مسئلہ مناسخہ کی پہلی تقسیم ہوئی۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

انبیاء کرام کسی مخلوق کے شاگرد نہیں ہوتے

سوال نمبر ۳۶:۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ کیا انبیاء کرام کسی غیر مخلوق کے شاگرد ہو سکتے ہیں۔ ایک تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ حضرت اشمویل علیہ السلام بیت المقدس کے ایک عالم کے پاس توریت کا سبق لیتے رہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ نبی۔ غیر نبی کا شاگرد ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اب تک سنتے آئے ہیں۔ کہ انبیاء کرام صرف اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہوتے ہیں۔ وہیں سے تمام علوم سیکھ کر آتے ہیں۔ لہٰذا بڑی کرم نوازی ہے کہ آپ اس کا جواب عطا فرمائیں۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔

السائل:۔ صوفی عبدالغفور صاحب کیمبل پور:۔ مورخہ: ۱۹۶۷-۲-۱

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ۔

قانونِ الٰہیہ کے مطابق انبیاء کرام کا واحد گروہ اور جماعتِ مبارکہ ہی وہ ہے۔ جس کو رب کریم نے دنیا میں تمام مخلوق کو پڑھانے کے لئے بھیجا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کے علوم سب مخلوق سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جبرائیل و میکائیل علیہما السلام سے بھی زیادہ ہیں دنیا میں آج تک جتنے بھی علوم پیدا ہوئے یا قیامت تک پیدا ہوں گے۔ وہ سب علوم انبیاء کرام کے پاس ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی صنعت کاری سے لے کر منطق و فلسفہ موجودہ سائنس، علم فلکیات وغیرہ علومِ عقلیہ تک بے شمار علوم ظاہری ہیں۔ ان کو بھی انبیاء کرام بخوبی سب کائنات سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ ستر ہزار علوم ایسے ہیں۔ جو بجز انبیاء کرام کوئی نہیں جانتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جس قوم کی طرف انبیاء کرام میں سے جس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے اسی علم کو ظاہر فرمایا جن کی وہاں ضرورت تھی۔ باقی علوم ظاہر نہ فرمائے۔ کہ ظہور کی حاجت نہ تھی مگر اس عدمِ ظہور سے نفی نہ ثابت

نہیں ہوتی۔ کہ تجاربِ عدیدہ سے علومِ مخفی کا ثبوت ہے۔ یہ سب علوم کس نے سکھائے؟ سب رب تعالیٰ نے ہی سکھائے۔ چنانچہ حضرتِ آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ؕ (ترجمہ) اللہ کریم نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء یعنی علوم سکھا دیئے۔ حضرتِ آدم اوّل نبی ہیں:۔ باعتبارِ نبوّت اصلِ انبیاء کرام ہیں۔ اور قاعدہ مشہور کے مطابق كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ ؕ:۔ ہر شیٔ اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ تو تمام انبیاء کرام علوم میں اپنی اصل کی حیثیت پر ہیں۔ جس سے یہ ہی علوم سب میں لازم و ثابت ہوئے۔ پھر دنیا جہان کا قاعدہ ہے۔ کہ جس ڈگری سے جج یا مجسٹریٹ یا تھانیدار بنایا جاتا ہے۔ وہ ڈگری ہر جج مجسٹریٹ اور تھانیدار کو حاصل ہونی لازم ہے۔ پس جاننا چاہیئے۔ کہ حضرت آدم کو یہ علوم محض نبوت کے لیئے سکھائے گئے۔ نہ کہ انسانیت یا بشریت کی بنا پر۔ ثابت ہوا۔ کہ یہ علوم نبوّت کی ڈگری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو بوجہ قاعدہ ہر نبی علیہ السلام کے لیئے یہ ڈگری درجۂ نبوّت پر فائز ہونے کے لیئے لازم ہوئی۔ اور یہ ڈگری کہاں سے ملتی ہے۔ صرف بارگاہِ ربُّ العزت سے۔ اِسی لیئے فقہاء کرام فرماتے ہیں نبوّت کسبی نہیں۔ بلکہ عطائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے حضرت سلیمان کے لیئے فرمایا:۔ وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ ؕ (ترجمہ):۔ ہم گروہ انبیاء کرام پرندوں کی بولی سکھائے گئے یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے صرف اپنا ذکر نہ فرمایا۔ بلکہ صیغۂ جمع متکلم سے پتہ لگا۔ کہ تمام انبیاء کرام کا ذکر ہے۔ اب غور کرو کہ پرندوں کی بولیاں انبیاء کرام نے کِس سے سیکھیں۔ دنیا میں کون سا مدرسہ ہے۔ جہاں یہ تعلیم ہوتی ہے۔ کون ہے بجز رب تعالیٰ کے سکھانے والا خود فرماتا ہے:۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ؕ (ترجمہ):۔ اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا فرمایا۔ یہ کہنا۔ کہ معاذ اللہ! انبیاء کرام دنیا کے انسانوں سے پڑھتے اور علم سیکھتے ہیں ایسی ہی بدتمیزی کی بات ہے جیسے کہ مولوی خلیل احمد انبیٹھوی وہابی نے اپنی کتاب براہین قاطعہ مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند ۱۳۵۵ھ کے صفحہ نمبر ۲۶ پر یہ ایسا جملہ خبیثہ لکھا۔ جس کا مفہوم ہے۔ کہ جب سے مدرسہ دیوبند بنا۔ نبی کریم نے اُردو یہاں سے سیکھ لی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا:۔ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ (ترجمہ):۔ اے میرے رب کریم بے شک تُو نے مجھ کو سلطنت دی۔ اور بیانوں کا انجام نکالنا سکھایا۔ یہاں بھی تعلیم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ صرف قانون اور معرفت کی تعلیم ہی نہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام صنعت کاری بھی انبیاء کرام اپنے اللہ تعالیٰ سے سیکھ کر آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم سورتِ انبیاء آیت نمبر ۸۰ پارہ نمبر ۱۷ پر ہے:۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ ؕ (ترجمہ):۔ اور ہم نے اُن کو اے لوگو تمہارے لیئے لباس کی کارہ گری سکھائی۔ غرض کہ کسی کو طب کا علم کسی کو لکڑی کا کام خود اپنے پیارے نبیوں کو سکھایا۔ اور ایسے

مدرسے میں پڑھایا کہ کوئی انسان نہ جان سکا۔ تاکہ تمام کائنات انبیاء کے زیرِ رعب رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :۔ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (ترجمہ) :۔ ہمارے یعقوب بہت علم والے تھے۔ کیونکہ ہم نے جو ان کو سکھایا تھا۔ اور لیکن اکثر کو پتہ نہیں۔ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے :۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط (ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو وہ سکھا دیا۔ جو تم نہ جانتے تھے۔ سورت رحمٰن میں فرمایا :۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ط خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ط (ترجمہ) :۔ رحمٰن نے نبی کریم کو قرآن سکھایا۔ انسان کامل محمد مصطفٰے کو پیدا فرمایا۔ پھر اسی وقت ان کو ساری کائنات کا بیان سکھا دیا۔ تمام مفکرین و مفسرین کے نزدیک یہاں لفظِ انسان سے مراد محمد صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ کیونکہ دیگر انسانوں اور مخلوق کو سکھانا انبیاء کرام کی ڈیوٹی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ سورت جمعہ آیت نمبر ۲ :۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ط (ترجمہ) میرے نبی تمام مخلوق کے سامنے میری آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔ (صرف تعلیم کے لیے)۔ اور اُن کو پاک فرماتے ہیں۔ اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں گویا کہ بتایا یہ جا رہا ہے۔ کہ ہم تو اپنے انبیاء کو سکھاتے ہیں۔ اور باقی مخلوق کو ہمارے نبی سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ مخلوق تو بے شمار ہے کسی نے کچھ سیکھنا ہے کسی نے کچھ۔ لیکن نبی ہر قوم میں ایک۔ بلکہ آقائے دو عالم تو ساری کائنات میں واحد نبی ہیں۔ اس لیئے اُن کو سارے ہی علوم و زبانیں سکھانی لازم ہیں۔ عقلاً بھی یہ بات تسلیم ہے۔ کیونکہ اگر کسی اسکول کالج میں مختلف کلاسیں بہت مضامین کی ہوں۔ اور استاد ایک ہی ہو۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ استاد اِس سارے کالج کے تمام علوم کا صرف ماہر ہی نہیں۔ بلکہ ہر ایک کو پڑھانے کا بھی سلیقہ رکھتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا تعلیم گاہ تو عرش و فرش تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اِس درس گاہ کے معلم صرف انبیاءِ کرام ہیں۔ جو مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کو ہر قسم کی تعلیم دیتے رہے۔ خاص کر نبی کریم رؤف الرحیم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو قیامت تک ساری مخلوق کو پڑھانے کے لیئے تشریف لائے۔ تو اب ہر ذی عقل خود جان سکتا ہے۔ کہ انبیاء کرام اور نبی کریم کا علم کیسا ہوگا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بے شمار مقام پر اِس چیز کا ذکر فرمایا۔ کہ ہم نے اپنے نبیوں کو پڑھایا، سکھایا۔ مگر قرآن و حدیث میں ایک جگہ بھی ذکر نہیں۔ کہ کسی نبی نے کسی نبی یا غیر نبی مخلوق سے کچھ ذرہ بھر سیکھا ہو۔ یا پڑھا ہو۔ نہ کہیں ثابت۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ انبیاءِ کرام مخلوق سے سیکھ سکتے ہی نہیں۔ اس کی چند وجہیں ہیں :۔

پہلی وجہ :۔ عقلاً یہ چیز روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ جس جگہ کسی شخص کو پڑھانے کے لیئے بھیجا جائے۔ وہاں پہنچ کر وہ پڑھتا نہیں۔ نہ وہ بے پڑھا جاہل ہوتا ہے۔ بلکہ کسی دوسرے مدرسے میں

پڑھ کر پڑھانے کا تجربہ سیکھ کر اُستادی کی سند حاصل کر کے پھر دوسرے مدرسے میں بطور استاد بھیجا جاتا ہے دنیا کی تعلیم گاہوں میں ان کا نام مدرس، ماسٹر، پروفیسر وغیرہ ہوتا ہے۔ اور ان پڑھنے والی مخلوق ہو تمام اور یہ حضرات خدا کے علم پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا ناممکن ہے۔ کہ جس مدرسے میں پڑھانے کے لیئے آئیں۔ تو بلا پڑھے آ جائیں۔ اور وہی پڑھنا شروع کر دیں۔ ایسا عقیدہ بنانا۔ مبعوث فرمانے والے اللہ تعالیٰ کی گستاخی ہے۔ اور ایک مذاق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ کریم نے مخلوق میں سب سے بڑا درجہ انبیاء کرام کا رکھا ہے۔ اور قانون شرعی کے مطابق دینی اور روحانی استاد کا درجہ بہر صورت شاگرد سے بڑا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء کرام کا فرمان ہے۔ کہ دینی استاد کا درجہ والد سے بھی زیادہ ہے۔ کہ والد اولاد کو عالمِ بالا سے عالمِ اسفل کی طرف لایا۔ لیکن استاد نے پھر اسفل سے اعلیٰ پر پہنچایا۔ اور اس لیئے کہ استاد دینی۔ خواہ شریعت کا یا طریقت کا۔ اپنے شاگرد اور مرید کا نبی کریم سے رشتہ جوڑتا ہے۔ اور وہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ باپ کا تعلق بعد وفات ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ كُلُّ سَبَبٍ وَّنَسَبٍ يَنْقَطِعُ بِالْمَوْتِ اِلَّا سَبَبِيْ وَنَسَبِيْ (شامی جلد اوّل باب غسلِ میت صفحہ نمبر ۸۰۳ پر دیکھو) ترجمہ:۔ قیامت میں تمام تعلق اور برادریاں ٹوٹ جائیں گی سوائے میرے تعلق اور رشتہ داری کے۔ اسی لیئے بعض اولاد دینی لحاظ سے ماں باپ سے درجے میں عنداللہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی شاگرد دینی استاد یا مرشدِ کامل سے درجے میں بڑھ نہیں سکتا۔ اگرچہ غوث و قطب ہو جائے۔ پس چونکہ شریعت کے اس قانون سے شاگرد کا درجہ ہمیشہ اُستادِ روحانی سے چھوٹا ہی رہتا ہے۔ اور ادھر اللہ کے نبی کا درجہ کسی مخلوق سے کم ہو نہیں سکتا۔ اس لیئے دنیا کی مخلوق میں کوئی شخص نبی کا استاد نہیں بن سکتا۔ تیسری وجہ یہ ہے۔ کہ ہر علم کسی مقصد کے لیئے سیکھا جاتا ہے۔ استاد وہی ہو سکتا ہے جو شاگرد کے مقصد کو پورا کرے۔ حصولِ مقصد کے بغیر تعلیم و تعلم بیکار بلکہ ناممکن۔ مثلاً ایک شخص قرآن کریم کی صرف ادائے لفظی سیکھنا چاہتا ہے۔ تو اُس کو ہر پڑھا لکھا آدمی یا امام مسجد پڑھا دے گا۔ اگر وہ علم تجوید سیکھنے کا خواہش مند ہے۔ تو ایک عام امام مسجد اُس کا اُستاد نہیں بن سکتا۔ بلکہ کوئی کامل قاری ہی استاد بن کر پڑھا سکتا ہے اور اگر ایک شخص اسی قرآن کریم سے علم شریعت سیکھنا چاہتا ہے۔ تو قاری بھی اُستاد نہیں بن سکتا۔ اگر کسی نے فلسفۂ قرآنی حاصل کرنا ہے۔ تو امام رازی جیسا یگانہ روزگار ہی اُس کا استاد بن سکتا ہے۔ اگر کسی نے طریقت و معرفت کا حصول لینا ہے۔ تو عبدالقادر جیلانی جیسے بزرگ ہی سکھا سکتے ہیں۔ تو پتہ لگا۔ کہ طالب معرفت کا ہر شخص استاد نہیں بن سکتا۔ قرآن مجید ایک ہی ہے۔ مگر مقصدِ حصول جدا گانہ اس بنا پر ہر ایک اُستاد نہیں ہو سکتا۔ تو مقامِ غور و تفکر ہے کہ انبیاء کرام کا مقصدِ علم کیا ہو گا۔ اور جب

طالبِ طریقت کے لیئے غوثِ اعظم جیسے اُستاد کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ تو بتائیے۔ ایک نبی اللہ کی ضرورت کیا ہو گی۔ اور دنیا کا کون شخص اُس کی ضرورت کو پورا کر سکے گا۔ کسی کی مجال ہے۔ کہ نبی کی استادی کا دم بھرے صحابہ کرام نے آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سیکھا۔ تو آج کائنات میں جن و ملک میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ اَللّٰہُ اَکْبَرْ۔ سیکھنے والے صحابی نے کیا سیکھا اور سکھانے والے آقا صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم نے کیا سکھایا۔ کسی کی ہمت نہیں۔ کہ اندازہ ہی کر سکے۔ جب ساری کائنات کا علم نبی کریم کے شاگرد و صحابی کے برابر نہیں۔ تو بتائیے۔ کہ نبی کو کون شخص پڑھا سکتا ہے بس عقل سلیم والوں کو ماننا پڑے گا۔ شعر:-

دنیا میں لکھے نہ پڑھے جناب والا شاگردِ رشیدِ حق تعالے

شعر:- انبیاء دنیا میں آتے نہیں پڑھنے کے لیئے (کیونکہ)
وہ تو آتے ہیں زمانے کو پڑھانے کے لیئے

چوتھی وجہ:- دنیا کا قاعدہ ہے۔ کہ کسی پروفیسر، پرنسپل کا شاگرد، کسی اسکول ماسٹر کی شاگردی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس میں پروفیسر، پرنسپل کی بدنامی ہے۔ قانون اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی عام انسان کو بھی کسی ڈیوٹی پر بھیجا ہوتا ہے تو پہلے اسکو کامل بناتے ہیں پھر اسکو بھیجتے ہیں لیکن اللہ جلّ شانہٗ اپنے انبیاء کرام کو اکمل ترین بنا کر مبعوث فرماتا ہے۔ اور ہر فن میں اکمل تر فرماتا ہے۔ اس لیئے کہ انبیاء کرام کو کائنات کی سرداری کا تاج بخشا جاتا ہے۔ کسی طرح کمی کیسے ہو سکتی ہے۔ دیکھو قوم صالح پہاڑ کاٹنے اور سنگتراشی میں کامل تھے۔ تو اللہ کریم نے صالح علیہ السلام کو ایسا اکمل ترین بنا کر بھیجا۔ کہ انہوں نے پتھر سے زندہ اونٹنی نکال کر دکھا دی۔ قوم نوح لکڑی کی اشیاء بنانے میں کامل تھی۔ تو نوح علیہ السلام کو ایسا اکمل بنا کر بھیجا۔ کہ دنیا میں بغیر کسی سے سیکھے۔ گیارہ منزلہ بحری جہاز بنا کر عقول البشری کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ قوم داؤد اوزار بنانے میں کامل تھی۔ تو اللہ جلّ شانہٗ نے داؤد علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ لوہے کو موم کر کے اقوام عالم کو حیران کر دیا۔ قوم موسیٰ اپنے فن میں ماہر تھی۔ کہ رسیوں، بانسوں کو سانپ بنا سکتی تھی۔ مگر اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ جَلَّ جَلَالُہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ انہوں نے ایسا سانپ بنا کر دکھایا۔ کہ جو ستر ہزار سانپوں کو کھا کر پھر ویسی ہی پتلی سی لاٹھی بن جائے۔ قوم مسیح طب کے علاوہ کھلونا سازی میں کامل تھی۔ رب اکرم نے مسیح علیہ السلام کو ایسا اکمل تر بنا کر بھیجا۔ کہ مٹی کے پرندے اڑا کر بھی دکھا دیں۔ اہلِ عرب کو اپنے تکلم پر بڑا ناز تھا اور افسانہ گوئی فصاحت و بلاغت میں کامل تھے۔ تو رَبُّ الْعَالَمِیْنَ نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالے علیہ وآلہٖ وسلّم کو ایسا اکمل الاکملین بنا کر بھیجا۔ جنہوں نے ایسا قرآن سنایا۔ کہ عرب کی فصاحت و بلاغت نے

دم توڑ دیا:۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَبَائِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ ط :۔ دنیا میں کونسا ایسا مدرسہ ہے۔ جہاں یہ چیزیں سکھائی جاتی ہوں۔ پس ماننا پڑے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ہی پڑھ کر سیکھ کر انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے دنیا کے سب استاد صرف کامل بنا سکتے ہیں۔ اکمل تر بنانا رب کا ہی کام ہے۔ حضرت اشمویل علیہ السلام کا مذکورہ فی السوال واقعہ قطعاً غلط ہے۔ کسی تفسیر سے اشارۃً بھی یہ بات ثابت نہیں۔ کہ کسی نبی اکرم نے کچھ بھی کسی انسان یا جن، فرشتے سے سیکھا ہو۔ نہ ہی حضرت شمویل علیہ السلام کا بیت المقدس کے کسی عالم سے پڑھنا یا توریت سیکھنا ثابت۔ صرف اتنا واقعہ تفسیر جمل علیٰ حاشیہ جلالین جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۲۸ پر ہے۔ کہ:۔ فَلَمَّا کَبُرَ سَلَّمَتْہُ التَّوْرَاۃَ فِیْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ وَکَفَّلَہُ الشَّیْخُ مِنْ عُلَمَائِہِمْ ط (ترجمہ):۔ پس جب کہ اشمویل علیہ السلام کچھ بڑے ہوئے تو اُن کی والدہ محترمہ مکرمہ نے توریت شریف اُن کے سپرد کر دی۔ اور بیت المقدس کے علماء کرام میں سے ایک شیخ کی کفالت میں دے دیا۔ یہ تھی وہ عبارت جس سے سائل کو یا تو غلط فہمی ہوئی یا کسی وہابی دیوبندی نے فریب دیا۔ کیونکہ یہ بات اُن کے عقیدے سے ملتی جلتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی مرزائی قادیانی نے چکر دیا ہو۔ اور ثابت کرنا چاہتا ہو۔ کہ انبیاء لوگوں سے پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اُس کا مرزا غلام احمد بقول سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ایک ہندو ماسٹر سے پڑھتا رہا۔ بہت کند ذہن تھا۔ بہر حال یہ بات قطعاً غلط ہے۔ بادی النظر میں تو شائد کسی کا ذہن استادی، شاگردی کی طرف مائل ہو۔ لیکن بنظرِ عمیق غور کرنے سے اِس عبارت سے بھی تعلیم و تعلّم کا ذرّہ اشارہ نہیں ملتا۔ اس لیئے کہ اگر والدہ محترمہ کا مقصد پڑھانا ہوتا۔ تو اوّلاً اتنی بڑی کتاب نہ پکڑاتیں۔ بلکہ ابتدائی تعلیم میں چھوٹے بچوں کو قاعدہ پکڑایا جاتا ہے۔ پوری کتاب توریت شریف کا تھما دینا اِس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ والدہ محترمہ کو ان کی لیاقتِ خداداد کا پتہ لگ گیا تھا۔ اور لفظِ سَلَّمَتْ بتا رہا ہے۔ کہ توریت شریف کو ان کی حفاظت و ضمانت میں دیا تھا۔ نہ کہ تعلیم کے لیئے:۔ باوجود اس بات کے کہ آج کل قرآن کریم کے بے شمار نسخے دستیاب ہیں۔ پھر بھی بوجہ ادب و احترام چھوٹے بچے کو نہیں پکڑایا جاتا۔ تو وہ زمانہ جب کہ ساری دُنیا میں صرف چند ہی عدد میں توریت شریف موجود تھی۔ بھلا ایک عام بچے کو کس طرح دی جا سکتی تھی۔ پھر لفظِ کفالت، تعلیم پر دال نہیں۔ کیونکہ کفیل صرف دیکھ بھال کرنے والے اور منتظم کار کو کہا جاتا ہے۔ یعنی بیت المقدس کے ایک عامل عالم شیخ حضرت شمویل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت گار تربیت و پرورش کا انتظام کرنے کیلیئے مقرر ہوگئے۔ خلاصہ:۔ یہ کہ اس عبارت سے پڑھنا کہیں ثابت نہیں ہوتا:۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ط

سجدۂ تلاوت کرنے اور اسکے واجب ہونے کا بیان اور سجدوں کی تعداد

سوال نمبر ۳۷ :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ع۱ سجدۂ تلاوت فرض ہے یا سنت۔ ع۲ نماز کے علاوہ سجدۂ تلاوت کس طرح کیا جائے ع۳ نماز کے اندر مثلاً تراویح میں سجدۂ تلاوت کا طریقہ کیا ہے۔ اس دفعہ ۱۹۶۳ء مطابق ہجری ۱۳۸۲ھ کے ماہِ رمضان شریف میں زید حافظِ قرآن نے تین دفعہ اس طرح سجدے تلاوت کرایا کہ تراویح دو رکعت شروع کرنے سے پہلے اعلان کیا کہ پہلی رکعت میں سجدہ ہے مگر علیحدہ سجدہ نہیں کرایا جائے گا بلکہ سب حضرات رکوع میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرلیں پھر امام حافظ مذکور نے سجدے کی آیت پڑھ کر اور چار آیتیں آگے پڑھ کر رکوع کیا جس میں سب نے سجدے کی نیت کی تھی۔ تقریباً دو یا تین سجدے اسی طرح کرائے گئے پھر لوگوں نے شور مچایا کہ یہ غلط ہے کبھی کسی کو اس طرح کرتے نہ دیکھا۔ تب حافظ مذکور نے باقی سجدے مروجہ مشہور طریقے سے علیحدہ سجدے میں ہی کیئے اور کرائے۔ فرمایا جائے کیا یہ طریقہ صحیح ہے ع۴ سجدوں کی تعداد کتنی ہے۔ اور کس کس آیت اور پارے میں ہے۔ ع۵ :- نماز کے علاوہ تلاوت میں سجدے کرنے کی اہمیت کیا ہے بہت سے لوگ خصوصاً عورتیں یا مسجد کے طلبا جو ختم شریف پڑھنے آتے ہیں اور پورا قرآن مجید برائے ایصالِ ثواب پڑھتے ہیں وہ سجدے نہیں کرتے۔ ہمارے سنیوں کے ایک مولوی احترام الحق تھانوی صاحب کراچی کے رہنے والے کہتے ہیں۔ سجدوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ سجدوں کے بغیر بھی تلاوت صحیح باعثِ ثواب ہے اور ایصالِ ثواب ہو جاتا ہے۔ ہمیں ان کی اس بات پر اعتماد نہیں لہٰذا مدلل طور پر صحیح مسئلے سے آگاہ فرمایا جائے۔ بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا :- سائل محمد شرف الدین کراچی۔ سائل محمد ریاض خانیوال ۶۲-۶-۱۲۔ سائل حافظ رحمت علی مقام مائی دی جھگی احاطہ ع۹۴ لائلپور ۶۲-۸-۶

(نوٹ) :- یہ استفتاء مختلف ماہ میں تین طرف سے وصول ہوا۔ کچھ تغیرِ لفظی سے ہم نے تینوں کو ایک جواب ارسال کیا اس لیئے ایک سوال پر تینوں سائلوں کا نام درج ہے :- (ادارہ) :-

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ

ع۱ :۔ سجدۂ تلاوت نہ فرض ہے نہ سنت بلکہ واجب ہے۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صفحہ ۱۳۲ پر ہے :۔ وَالسَّجْدَةُ وَاجِبَةٌ فِي هٰذِهِ الْمَوَاضِعِ عَلَى التَّالِي وَالسَّامِعِ سَوَاءٌ قَصَدَ سَمَاعَ الْقُرْاٰنِ اَوْ لَمْ يَقْصِدْ :۔ (ترجمہ) :۔ ان مندرجہ ذیل مقام میں پڑھنے والے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے سننے والا سننے کا ارادہ کرے یا نہ کرے۔ اور فتاوٰے درمختار میں ہے جلد اوّل صفحہ نمبر ع۷۱۵ بَابُ سُجُوْدِ التِّلَاوَةِ يَجِبُ بِسَبَبِ تِلَاوَةِ اٰيَةٍ۔ ترجمہ :۔ تلاوت کے تمام سجدے۔ آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں۔ ع۲ نماز کے علاوہ کسی بھی وقت سجدہ کی آیت تلاوت کرنے سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اُس کے ادا کرنے کیلئے ایسا وقت ہونا ضروری ہے جن وقتوں میں نوافل مکروہ نہیں ہوتے وہ پانچ وقت ہیں ع۱ طلوعِ آفتاب ع۲ غروب آفتاب ع۳ زوال آفتاب ع۴ بعد نماز عصر ع۵ بعد نمازِ فجر۔ ان وقتوں میں اگر تلاوت کی تو سجدہ اس وقت نہ کرے۔ بلکہ جب صحیح وقت آجائے تب سجدہ ادا کرے۔ اور سجدہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کھڑا ہو جائے اور قبلہ رخ ہو کر اللہ اکبر کہتا ہوا سجدے میں گر جائے اور بالکل اُسی طرح سجدہ کرے جس طرح نماز کا سجدہ ہوتا ہے۔ تین مرتبہ سجدے کی تسبیح پڑھے۔ اس کے بعد یہ سجدے میں پڑے پڑے یہ دعا پڑھے :۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ هٰذِهِ السَّجْدَةَ التِّلَاوَةِ ذُخْرًا فِي يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَنُوْرًا عَلَى الصِّرَاطِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ يَا رَبِّ :۔ (ترجمہ) :۔ یا اللہ میرے اس سجدۂ تلاوت کو قیامت کیلئے ذخیرہ بنا اور پل صراط پر نور بنا۔ اے میرے رب اے میرے رب۔ سجدۂ تلاوت میں وہی شرطیں سے جو سجدۂ نماز میں ہیں۔ یعنی جسم پاک باوضو۔ لباس پاک۔ جگہ پاک۔ طریقۂ ادا سر سے پیر تک بہت احتیاط سے پیشانی بھی زمین سے لگے اور دونوں پیر کی انگلیاں بھی قبلہ رخ ہوں چارپائی اور نرم فوم یا گدے پر نہ یہ سجدہ جائز نہ سجدۂ تلاوت۔ جب سجدے سے فارغ ہو تو اسی طرح اللہ اکبر کہکر کھڑا ہو جائے۔ یہ ایک سجدہ مکمل ہوا نہ سلام پھیرے نہ ہاتھ باندھے نہ تشہد پڑھے۔ کھڑے ہوکر سجدے کرنا مستحب ہے۔ بیٹھ کر بھی کر سکتا ہے۔ جو چیزیں نماز کو توڑتی ہیں وہی سجدۂ تلاوت کو توڑتی ہیں مثلاً بے وضو ہونا۔ ناپاکی لگنا سجدے میں زور سے ہنسنا۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل ص ۱۳۵ پر ہے :۔ وَشَرَائِطُ هٰذِهِ السَّجْدَةِ شَرَائِطُ الصَّلٰوةِ اِلَّا التَّحْرِيْمَةَ :۔ ترجمہ سجدۂ تلاوت کی تمام شرطیں وہی ہیں جو نماز کی ہیں سوائے ہاتھ اٹھاکر تحریمہ کہنے کے۔ یعنی

سجدۂ تلاوت کے لیئے نہ ہاتھ اٹھایا جائے نہ تکبیر تحریمہ کہی جائے۔ فتاویٰ عالمگیری نے مزید فرمایا کہ اگر گھوڑے پر بیٹھ کر تلاوتِ آیتِ سجدہ کی تو گھوڑے پر سجدہ جائز ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز نہیں کیونکہ سجدۂ تلاوت واجب ہے اور واجب نماز تو گھوڑے یا چلتی سواری پر جائز نہیں۔ اسی طرح یہ واجب بھی زمین پر اُتر کر کرنا پڑے گا۔ تاکہ قبلہ رخ درست رہے۔ نماز کے علاوہ سجدۂ تلاوت کسی بھی نماز کے اندر کرنا منع ہے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو نماز بھی ٹوٹ جائے گی۔ اور سجدہ بھی ادا نہ ہو گا۔ یعنی مستقل علیحدہ سجدۂ تلاوت کیا تو۔ لیکن اگر بیرونی سجدے کو نماز کے رکوع میں یا سجدے میں نیت کر لیا تو نماز نہ ٹوٹے گی۔ البتہ سجدہ بھی ادا نہ ہو گا۔ اسی طرح کتب فقہ میں ہے۔ نماز کے علاوہ تلاوت سے صرف اس پر سجدہ واجب ہو گا جو پڑھ رہا ہے یا سُن رہا ہے۔ پڑھنے والے کے لیئے باہوش ہونا ضروری نہیں لہٰذا سوتے میں یا نشے میں یا عارضی بیہوشی یا عارضی جنون۔ یا آسیب زدہ کا بحالتِ جنات کی حاضری تلاوتِ آیت سجدہ کرنے سے سجدہ واجب ہو جائے گا۔ جب وہ درست حالت میں ہو یا جاگے تو اُس کو بتایا جائے تو نے فلاں آیتِ سجدہ اُس حالت میں تلاوت کی تھی اب باوضو ہو کر سجدہ کرے لیکن سامع اگر گونگا بہرہ، ہو یا مجنون مدہوش یا آسیب زدہ ہو تو اُس پر سجدہ واجب نہ ہو گا۔ لیکن مقتدی اگرچہ گونگا ہو اس پر بھی امام کی تلاوت سے واجب ہو گا۔ ہاں مقتدی کی تلاوت سے کسی پر واجب نہ ہو گا۔ نہ خود پڑھنے والے پر نہ امام پر نہ دیگر مقتدیوں پر۔ اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ سجدے کی آیت ایسی آواز سے پڑھی کہ اپنے کان سُن لیں تب سجدہ واجب ہو گا۔ بشرطیکہ آیت کا آخری لفظ پڑھے۔ اگر ساری آیت پڑھی مگر آخری لفظ چھوڑ دیا تب بھی سجدہ واجب نہ ہو گا۔ اسی طرح صرف آیت لکھنے سے یا زبانی ہجے کرنے سے بھی سجدہ واجب نہ ہو گا۔ جتنا جلدی ہو سکے سجدے کرے موت کا پتہ نہیں ہوتا۔ مگر مجبوراً تاخیر بھی جائز ہے۔ نمبر ۳ نماز کے اندر سجدے کی آیت تلاوت کرنے سے بھی سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اُس کی ادا کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ عام مشہور اور مروّج ہے۔ اور تراویح میں یہی کرنا چاہیئے دوسرے دو طریقے بحالتِ مجبوری یعنی وقت کی کمی کی بنا پر جائز کیئے گئے ہیں۔ اس لیئے تراویح میں وہ طریقہ نہ اختیار کرنا چاہیئے۔ پہلا طریقۂ مشہورہ کہ جس رکعت میں جس وقت پوری آیتِ سجدہ تلاوت کر لی گئی اُسی وقت کھڑے ہو کر فوراً سجدے میں چلا جائے اور صرف سجدے کی تین تسبیح پڑھ کر پھر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو کر رکعت پوری کرے ایک دو آیت اور پڑھ کر پھر نماز کے رکوع سجدے میں نیت نہ کرے۔ نماز کے سجدے میں کوئی دعا وغیرہ نہ پڑھے ورنہ نماز ٹوٹ جائے گی۔ دوسرا طریقہ یہ کہ سجدے کی آیت تلاوت کر کے

فوراً رکوع میں چلا جائے اور سب مقتدی وامام اسی رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرلیں تو یہ رکوع اس وقت نماز کا رکوع اور تلاوت کا سجدہ شمار ہوگا۔ یعنی ایک کام سے دو فائدہ حاصل کئے گئے تیسرا طریقہ یہ کہ آیتِ سجدہ کے تلاوت کرتے ہی نماز کا رکوع کرے پھر نماز کا سجدہ کرے اور پہلے سجدے میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرے۔ مگر یہ دونوں طریقے بحالتِ مجبوری ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ کوئی شخص نماز فجر میں آیت سجدہ تلاوت کرے اور طلوع آفتاب بالکل قریب ہو سجدۂ تلاوت علیحدہ مستقل کرنے سے وقتِ نماز ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو رکوعِ نماز یا سجدۂ نماز میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنے کی اجازت دی گئی یہی دشواری نمازِ عصر میں غروبِ آفتاب سے یا بعد نماز عصر سورج پیلا ہونے کے قریب گذشتہ ایام کی نماز قضا کرتے وقت آیت سجدہ کے تلاوت ہوجانے سے پیش آسکتی ہے۔ ایک مجبوری سورت اقرأ میں بھی پیش آجاتی ہے۔ کہ سورت اِقرأ کی آخری آیت میں سجدہ ہے۔ اس آیت کے لیے بھی نماز میں مستقل سجدہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مستقل سجدے کے لیئے لازم ہے کہ پھر اٹھ کر دو تین آیتیں پڑھ کر پھر نماز کا رکوع سجدہ کرے مگر یہاں نہیں ہوسکتا کیونکہ سورت ختم ہوگئی لہٰذا اس سجدے میں بامرِ مجبوری دوسرا اور تیسرا طریقہ ہی اپنایا جائے گا۔ یعنی رکوعِ نماز یا سجدۂ نماز میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرنی پڑے گی۔ اگرچہ سورۂ اعراف و سورہ نجم کی آخری آیت سجدہ ہے مگر یہ بڑی سورتیں ہیں اُن کے ساتھ دوسری سورت پڑھی جاتی ہے۔ مگر اِقرأ چھوٹی ہے ایک رکعت میں ایک ہی پڑھی جاتی ہے۔ پس حفاظ حضرات کو چاہیئے کہ تراویح میں تیرہ سجدے پہلے مشہور طریقے پر کریں اور آخری سجدہ دوسرے یا تیسرے طریقے سے کریں۔ لیکن مذکورہ فی السوال حافظ امام نے جو طریقہ اختیار کیا وہ قطعاً غلط ہے۔ کہ اس نے آیتِ سجدہ تلاوت کرکے فوراً رکوع نہ کیا بلکہ چند آیات اور پڑھ کر پھر نماز کا رکوع کیا اور اس میں ہی سجدۂ تلاوت کی نیت کرلی۔ اس طرح مذکورہ فی السوال یہ تین سجدے ہرگز ہرگز ادا نہ ہوئے۔ چنانچہ فتاوٰے عالمگیری جلد اوّل صـ ١٣٣ پر ہے:۔ وَاِنْ قَرَءَ آیَۃَ السَّجْدَۃِ فِی الصَّلوٰۃِ فَاِنْ کَانَتْ فِیْ وَسْطِ السُّوْرَۃِ فَالْاَفْضَلُ اَنْ یَسْجُدَ ثُمَّ یَقُوْمَ وَ یَخْتِمَ السُّوْرَۃَ وَیَرْکَعَ وَلَوْ لَمْ یَسْجُدْ وَرَکَعَ وَنَوَی السَّجْدَۃَ یُجْزِیْہِ قِیَاسًا وَبِہٖ نَاْخُذُ وَلَوْ لَمْ یَرْکَعْ وَلَمْ یَسْجُدْ وَاَتَمَّ السُّوْرَۃَ ثُمَّ رَکَعَ وَنَوَی السَّجْدَۃَ لَا یُجْزِیْہِ وَلَا یَسْقُطُ عَنْہُ بِالرُّکُوْعِ وَعَلَیْہِ قَضَاءُ ھَا بِالسُّجُوْدِ مَادَامَ فِی الصَّلوٰۃِ (ترجمہ):۔ نماز کے سجدۂ تلاوت کے لیئے بہتر یہی ہے کہ فوراً مستقل سجدہ کرے پھر کھڑا ہوکر ایک دو آیت پڑھ کر پھر رکوعِ نماز کرے اگر فوراً آیت سجدہ کے بعد رکوع کیا اور اس میں ہی نیت سجدہ کرلیا تب بھی جائز ہے۔ لیکن اگر سجدے کی آیت کے بعد فوراً سجدہ یا رکوع نہ کیا پھر چند آیات

پڑھکر پھر رکوعِ نماز میں ہی نیت سجدہ کر لیا تو یہ ناجائز ہے سجدۂ تلاوت نہ ہوگا۔ بلکہ جب تک اسی نماز میں ہے مستقل سجدہ کر کے سجدۂ تلاوت کی قضا کرے اور اس قضا کا گناہ بھی پڑے گا۔ چنانچہ اسی فتاوٰی کے صـ۱۲۵ پر ہے :۔ اَمَّا الصَّلَاتِیَۃُ اِذَا اَخَّرَھَا حَتّٰی طَالَتِ الْقِرَاءَۃُ تَصِیْرُ قَضَاءً وَیَاثِمُ ترجمہ :۔ اگر بحالتِ نماز سجدہ کی آیت پڑھ کر فوراً کسی طرح سجدہ ادا نہ کیا اور قرأت لمبی کر دی تو سجدہ قضا ہو جائے گا۔ اور نمازی گناہ گار ہو گا۔ اگرچہ نماز میں ہی قضا کرے لیکن موجودہ صورت میں تو زید نے جو سجدہ سمجھا وہ ہوا ہی نہیں اور سب نمازی بے سجدہ رہ گئے۔ سب پر گناہ ہوا سب توبہ کریں۔ کیونکہ نماز ختم ہو گئی قضا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم صـ۱۲۲ پر ہے کہ افضلیت مستقل سجدہ کرنے میں ہے باقی دو طریقے یعنی نماز کے رکوع سجود میں نیت کر لینی تو مندرجہ مجبوریوں کے تحت جائز کیئے گئے ہیں۔ اور اسی بحر الرائق کے صـ۱۱۹ پر ہے :۔ اِذَا تَلٰی آیَۃَ السَّجْدَۃِ وَلَمْ یَسْجُدْ وَلَمْ یَرْکَعْ حَتّٰی طَالَتِ الْقِرَاءَۃُ ثُمَّ رَکَعَ وَنَوَی السَّجْدَۃَ لَمْ تَجُزْ چنانچہ فتاوٰے درمختار علی شامی جلد اوّل صـ۲۲۷ پر ہے :۔ وَلَوْ تَلَاھَا فِی الصَّلٰوۃِ سَجَدَھَا فِیْھَا لَاخَارِجَھَا لِمَا مَرَّ وَاِذَا لَمْ یَسْجُدْ اَثِمَ فَتَلْزِمُہُ التَّوْبَۃُ :۔ اس کی شرح فتاوٰے شامی کے اسی صفحہ پر یہی لکھا ہے :۔ (ترجمہ) :۔ اور اگر آیت سجدہ نماز میں پڑھی تو سجدہ بھی نماز میں ہی کر سکتا ہے۔ بعد نماز نہیں کر سکتا۔ اگر نمازیوں نے سجدہ نہ کیا تو گناہ گار ہوئے سبھی توبہ کرنی لازم ہے۔ اور فتاوٰی بحر الرائق جلد دوم صـ۱۲۲ پر ہے :۔ اِذَا لَمْ یَسْجُدْ فِی الصَّلٰوۃِ حَتّٰی فَرَغَ فَاتَتْہُ یَاثِمُ لِاَنَّہٗ لَمْ یُؤَدِّ الْوَاجِبَ وَلَمْ یُمْکِنْ قَضَاءُھَا لِمَا ذَکَرْنَا وَھٰذَا مِنَ الْوَاجِبَاتِ الَّذِیْ اِذَا فَاتَ وَقْتُہٗ تَقَرَّرَ الْاِثْمُ عَلَی الْمُکَلَّفِ وَالْمَخْرَجُ لَہٗ عَنْہُ التَّوْبَۃُ کَسَائِرِ الذُّنُوْبِ :۔ ترجمہ وہی ہے جو اوپر گزرا۔ اور توبہ کا طریقہ کتبِ تصوف میں اس طرح لکھا ہے۔ کہ سب گناہگار مجرم ایک جگہ باوضو نفل دو رکعت پڑھیں اور بتوسطِ آقا صلی اللہ علیہ وسلم رب کریم کی بارگاہ میں توبہ کریں اور معافی مانگیں گناہ کا نام بھی لیں۔ اگر گناہ مشہور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ بڑا رحیم و کریم ہے۔ آئندہ کے لیئے ایسی خلافِ شرع حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔ بہر حال زید مذکور نے اپنی نادانی سے سب نمازیوں کو گناہ میں مبتلا کر دیا اور خود زیادہ مجرم بنا۔ ان عبارات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نماز کے اندر تو سجدۂ تلاوت فوراً کرنا چاہیئے۔ ایک آیت بھی دیر لگے تو قضاء مگر نماز کے علاوہ جب بھی ادا کرے گا ادا ہی ہو گا قضا نہ ہو گا اگرچہ دیر منع ہے۔ چنانچہ فتاوٰے ہندیہ جلد اوّل صـ۱۳۵ پر ہے :۔ وَاَدَاؤُھَا لَیْسَ عَلَی الْفَوْرِ حَتّٰی لَوْ اَدَّاھَا فِیْ اَیِّ وَقْتٍ کَانَ۔ یَکُوْنُ

مُوَدِّیًا لَا قَاضِیًا۔ (ترجمہ وہی ہے جو اوپر گذرا) بحالتِ رکوع یا سجدۂ نماز میں سجدۂ تلاوت کی نیت کرنے کے لیئے ضروری ہے کہ سب مقتدیوں کو پہلے بتا دیا جائے تاکہ وہ بھی نیت قائم کرلیں بخلاف مستقل سجدے کے کہ اس میں اگر پہلے نہ بھی بتایا گیا تو رواجی طور پر ہر نمازی فوراً سمجھ جائے گا کہ یہ سجدۂ تلاوت ہے۔ اگرچہ بتا دینا پھر بھی بہتر ہے تاکہ نابینا لوگوں کو دھوکہ نہ لگے اور حسبِ عادت رکوع میں ہی نہ اٹک جائیں جب کہ باقی سب سجدے میں ہوں۔ ۴ تلاوت کے سجدے تین ائمہ مجتہدین امام اعظم امام شافعی امام احمد حنبل کے نزدیک چودہ ۱۴ ہیں یہاں ہم پارے اور سورتوں کے نشان بتاتے ہیں۔ اور آیت کا صرف نمبر بتایا جائے گا۔ آیت کی عبارت نہ لکھی جائے گی تاکہ فتوٰی پڑھنے والے کو سجدہ نہ پڑے :۔ پہلا سجدہ پارہ ۹ سورت اَلْاَعْرَاف آیت نمبر ۲۰۶ دوسرا سجدہ پارہ ۱۳ سورۃ رعد آیت ۱۵ تیسرا سجدہ پارہ ۱۴ سورۃ نحل آیت ۵۰ چوتھا سجدہ پارہ ۱۵ سورۃ اَلْاَسْرَاء آیت ۱۰۹ پانچواں سجدہ پارہ ۱۶ سورۃ مریم آیت ۵۸ چھٹا سجدہ پارہ ۱۷ سورۃ حج آیت ۱۸ ساتواں سجدہ پارہ ۱۹ سورۃ فرقان آیت ۶۰ آٹھواں سجدہ پارہ ۱۹ سورۃ نمل آیت ۲۶ نواں سجدہ پارہ ۲۱ سورۃ سجدہ آیت ۱۵ دسواں سجدہ پارہ ۲۳ سورۃ ص آیت ۲۴ :۔ گیارھواں سجدہ پارہ ۲۴ سورۃ حٰمٓ آیت ۳۸ بارھواں سجدہ پارہ ۲۷ سورۃ نجم آیت ۶۲ تیرھواں سجدہ پارہ ۳۰ سورت انشقاق آیت ۲۱ چودھواں سجدہ پارہ ۳۰ سورۃ اِقْرَاء آیت ۱۹ یہ تھے قرآن مجید کے وہ چودہ سجدے جن کی آیتیں تعداد میں تین اماموں کا اتفاق ہے۔ مگر امام مالک فرماتے ہیں کہ سجدے صرف گیارہ عدد ہیں۔ امام شافعی اور ہمارا اس بات میں اختلاف ہے کہ ہمارے نزدیک سورۃ حج میں ایک سجدہ اور سورۃ صٓ میں ایک سجدہ۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ سورہ صٓ میں کوئی سجدۂ تلاوت نہیں بلکہ داؤد علیہ السلام کا سجدۂ شکر ہے۔ اور سورہ حج میں دو ۲ سجدے ہیں ہمارا قول ہے کہ یہ سجدۂ صٓ حضرت داؤد کے لیئے شکر تھا مگر ہمارے لیئے واجب ہے دوسرا اختلاف ائمہ کا یہ ہے کہ تمام سجود تلاوت واجب ہیں یا سنت۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالٰی عنہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ تمام سجدے واجب ہیں۔ ہمارا مسلک تو فتاوٰی شامی جلد اوّل صفحہ ۵۱۷ فتاوٰے بحرالرائق جلد دوم صفحہ ۱۱۹ فتاوٰے فتح القدیر جلد اوّل صفحہ ۳۸۲ سے ظاہر ہے امام احمد کا مسلک مُغْنِی لِابْنِ قُدَامَہ جلد اوّل صفحہ ۴۴۵ پر اسی طرح درج ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ امام احمد شافعی مالک علیہم الرحمۃ یہ سب بزرگ سجودِ تلاوت کو سنت مانتے ہیں جیسا کہ ان کی کتب میں لکھا ہے۔ چنانچہ بلغۃ السالک مالکی فقہ جلد اوّل صفحہ ۱۴۱ اور شافعی فقہ مُغْنِی المحتاج جلد اوّل صفحہ ۲۱۴ پر ایسا ہی ہے

بہر حال شافعی یا مالکی حنبلی ہوں یا کوئی اور دلائل و مسائل میں امام اعظم کے شاگردوں کے برابر بھی نہیں بعد کے غیر مقلد وہابی مرف امام اعظم کی گستاخی کرنا ہی جانتے ہیں۔ اور گستاخی کرتے ہوئے امام اعظم کو صاحب الرائے کہتے ہیں۔ امام اعظم سے زیادہ نہ امام شافعی کو حدیث آتی ہے نہ امام مالک و امام حنبل کو۔ یہ سب تینوں ائمہ امام اعظم کے بالواسطہ یا بلا واسطہ حدیث و فقہ میں شاگرد ہیں۔ سجدۂ تلاوت کے واجب ہونے پر امام اعظم کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ قرآنِ مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے سورہ انشقاق آیت ۲۱:۔ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ۔ (ترجمہ):۔ اور جب اُن کے سامنے قرآن مجید پڑھا جائے تو سجدہ نہیں کرتے۔ اِس آیت سے ثابت ہوا کہ آیاتِ سجدہ کے تلاوت سے سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ سجدہ نہ کرنا کفار کی نشانی بتایا گیا کیونکہ یہاں ذکر کفار کا ہے لہٰذا یہ وجوب سجدہ کے بارے میں تاویلاً اقتضاء النص سے اور اقتضاء النص دلیل ظنی ہوتی ہے۔ یہ آیت وجوب سجدۂ تلاوت کے حق میں قطعی الثبوت ظنی الدلالت ہے۔ اور ایسی دلیل سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ نہ کہ فرض یا سنت چنانچہ فتاوےٰ شامی جلد اوّل صـ۸۷ پر ہے:۔ اَلثَّانِیْ قَطْعِیُّ الثُّبُوْتِ ظَنِّیُّ الدَّلَالَةِ كَالْاٰيَاتِ الْمُؤَوَّلَةِ (الخ) وَبِالثَّانِیْ وَالثَّالِثِ اَلْوَاجِبُ وَكَرَاهَةُ التَّحْرِيْمِ:۔ (ترجمہ):۔ جن کلمات طیبات کا ثبوت قطعی ہو لیکن کسی خاص مسئلہ پر دلالت ظنی ہو۔ جیسے تاویل کی گئی آیات وہ دوسری قسم کی دلیل ہیں اُن سے کرنے والے اعمال میں واجب کا ثبوت ہوتا ہے اور نہ کرنے والے کاموں کو مکروہ تحریمی بنا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس آیت نے سجدۂ تلاوت کو واجب بنا دیا۔ **دوسری دلیل:۔** اِس آیت پاک میں کفار کی نشانی بتائی گئی ہے کہ وہ آیات کی تلاوت کے وقت سجدہ نہیں کرتے اور مسلمانوں کو کفار کی مخالفت ہر طرح کرنی واجب ہے چنانچہ فقہ اسلامی کی مشہور کتاب فتاویٰ فتح القدیر جلد اوّل صـ۳۸۲ پر اور فتاویٰ بحرالرائق جلد دوم صـ۱۱۹ پر باب سجدۂ تلاوت میں ہے۔ وَمُخَالِفَةُ الْكَفَرَةِ وَاجِبٌ ترجمہ آیات سجدہ میں بہت جگہ کفار کے سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے اور بہت آیات میں انبیاءِ کرام کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو انبیاءِ کرام کی متابعت اور کفار کی مخالفت واجب ہے۔ سجدے میں متابعت اور مخالفت کیا ہے یہی کہ سجدہ کیا جانا واجب ہو:۔

تیسری دلیل:۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے:۔ وَاَخْرَجَ اِبْنُ اَبِیْ شَيْبَةَ فِیْ مُصَنَّفِهٖ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجْدَةً

عَلٰی مَنْ سَمِعَہَا وَعَلٰی مَنْ تَلَاہَا۔ دوسری حدیث شریف بخاری شریف میں تعلیقاً ہے:۔
اَخْرَجَہٗ عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ وَعَنِ الزُّہْرِیِّ عَنِ ابْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّ عُثْمَانَ مَرَّ بِقَاصٍ فَقَرَءَ سَجْدَۃً لِیَسْجُدَ مَعَہٗ عُثْمَانُ فَقَالَ عُثْمَانُ اِنَّمَا السُّجُوْدُ عَلٰی مَنِ اسْتَمَعَ (ترجمہ) فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سجدۂ تلاوت واجب ہے سجدے کی آیت پڑھنے والے اور سننے والے پر۔ ۲ بخاری شریف میں تعلیقاً روایت ہے کہ عثمان غنی نے بھی یہی فرمایا کہ سننے والے پر بھی سجدہ لازم ہے۔ اس حدیث پاک میں لفظ علیٰ آیا ہے۔ جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے چنانچہ شرح عنایہ جلد اوّل ص ۳۸۲ پر ہے:۔ وَعَلٰی کَلِمَۃُ اِیْجَابٍ۔ (ترجمہ):۔ اور حرف علیٰ واجب کو ثابت کرنے والا ہے۔ فتح القدیر جلد اوّل ص ۳۸۲ پر ہے۔ یعنی لفظ علیٰ مِنْ صِیَغِ الْاِلْزَامِ۔ (ترجمہ):۔ علیٰ کا حرف لزوم پیدا کرتا ہے۔ قرآن و حدیث کے ان تمام دلائل سے بہت مضبوط طریقے سے ثابت ہوا کہ تلاوت کے تمام سجدے واجب ہیں۔ ہماری پیش کردہ یہ روایتیں خبر واحد ہیں اور خبر واحد سے بھی وجوب ثابت ہوتا ہے دیکھو فتاویٰ شامی جلد اوّل ص ۸۷ حنبلی مالکی شافعی حضرات کے پاس صرف ایک دلیل ہے جس سے وہ سجدوں کو سنّت کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ فقہ شافعی مغنی المحتاج جلد اوّل ص ۲۱۴ پر ہے: وَلِقَوْلِ ابْنِ عُمَرَ۔ اُمِرْنَا بِالسُّجُوْدِ یَعْنِیْ لِلتِّلَاوَتِ فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ اَصَابَ وَمَنْ لَّمْ یَسْجُدْ فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ۔ (ترجمہ):۔ ابن عمر رض کا قول ہے کہ ہم مسلمان تلاوت کے سجدوں کا حکم دیئے گئے تو جو شخص سجدہ کرے وہ درست ہے اور جو شخص سجدہ نہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ مخالفوں کی دلیل مگر یہ دلیل چار وجہ سے ناقابل قبول ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ روایت بے سند ہے۔ لہٰذا مجہول ہے اور مجہول روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ جو روایت ہم نے پیش کی ہے اس کی مضبوط سند ساتھ موجود ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس روایت کے الفاظ بھی مخالف کا منشا پورا نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں پہلے ہے اُمِرْنَا (ہم حکم دیئے گئے) اور حکم بلا قرینہ وجوب کو ہی ثابت کرتا ہے۔ پھر کہا گیا فَقَدْ اَصَابَ (اس نے درست کیا) یہاں ثواب کا ذکر نہیں۔ صرف درستی کا ذکر ہے۔ حالانکہ سنّت پر ثواب ہوتا ہے صرف درستی نہیں۔ درستی تو عام کام میں جائز ہوتی ہے پھر اسی میں ہے فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ اس پر گناہ نہیں۔ حالانکہ ترکِ سنّت پر گناہ ہے۔ تیسری وجہ اس روایت کو اگر درست بھی مانا جائے۔ تب بھی اس سے سنّت ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ مستحب ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ یہ ابن عمر کا اپنا قول ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمان سے سنیت ثابت ہوتی ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ اگر سنّت بھی ثابت ہو جائے تو لازماً سنّتِ مؤکدہ ہی ثابت ہوگی کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تمام آیاتِ

سجدہ میں نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیاتِ تلاوت کی ہوں۔ اور سجدہ نہ کیا ہو۔ جب کہ یہ سجدہ نہ کرنا علامتِ کفر ہے۔ تو جس جس آیت کا سجدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کیا وہ مؤکدہ ہوگی اور مؤکدہ کا ترک بھی گناہ ہے حالانکہ مخالف کی دلیل میں لَا اِثْمَ ہے۔ خلاصہ یہ کہ مذکورہ پیش کردہ مخالفین کی دلیل بہت ہی کمزور ہے۔ اور سجدۂ تلاوت واجب ہی ہے۔ سائل کے پانچویں سوال کا جواب۔ مولوی احترام الحق تھانوی وہابی ہے ان کی کوئی بات سننے کے قابل نہیں ہوتی یہ لوگ تو ایصالِ ثواب کے ہی منکر ہیں اب ان کو ایصال ثواب کی کیا فکر پڑ گئی جو تلاوت کے سجدوں کی اہمیت کو ختم کر رہے ہیں۔ خیال رہے کہ ایصالِ ثواب صرف مستحب ہے ضروری نہیں بلکہ قرونِ اولیٰ میں اس کو کبھی بھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی کہ اب ایک رواج لازمی بن گیا ہے۔ اسی رواج نے تلاوت کے اصل مقصد کو ختم کر دیا۔ اسی رواج سے امیر لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خود تلاوت کرنا ہی چھوڑ دی۔ بس دینی مدرسوں کے طلبا کو بلایا اور کچھ روپے دے کے قرآن مجید پڑھوا لیا ایصالِ ثواب کرا دیا۔ حالانکہ شرعًا ایسی اُجرام طلبی اور تجارت قطعًا ناجائز ہے۔ موجودہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن مجید صرف مُردوں کو بخشنے کے لیے ہے۔ خود پڑھو نہ پڑھو۔ عمل کرو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان فاسد خیالات سے بچائے۔ ایصالِ ثواب نہ فرض ہے نہ واجب نہ سنت مگر سجدۂ تلاوت واجب جیسا کہ ہم نے دلائل کثیرہ سے ثابت کر دیا۔ اور یہ مسئلہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ عبادت میں واجب رہ جائے تو عبادت ناقص ہوتی ہے دیکھو کتب فقہ باب الکراہت۔ باب السہو وغیرہ۔ تلاوت عبادت ہے اس کے سجدے تلاوت کے واجب ہیں۔ جب سجدۂ تلاوت ادا نہ ہوگا اس محفل کی تلاوت ناقص ہوگی اور ناقص عبادت کا ایصالِ ثواب بہتر نہیں۔ ترکِ واجب گناہ ہے چنانچہ فتاویٰ شامی جلد اول ص۳۰۹ پر ہے۔ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ مُؤَوِّلًا وَلَا مُسْتَخِفًّا يَفْسُقُ بِخُرُوْجِهٖ عَنِ الطَّاعَةِ بِتَرْكِ مَا وَجَبَ عَلَيْهِ۔ ترجمہ:۔ اگر کوئی شخص نہ تو واجب میں تاویل کرسکتا ہو نہ واجب کو بیکار اور ہلکا سمجھنے والا ہو صرف سستی غفلت سے واجب کام چھوڑ دے تو وہ سخت گنہگار ہوگا اس لیے کہ وہ اطاعتِ شریعت سے نکل گیا واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے یہی وجہ ہے کہ اندرونِ نماز سجدۂ تلاوت کی تاخیر متفقًا مکروہ تحریمی ہے۔ اور علاوہ نماز کا سجدۂ تلاوت تاخیر سے کرنا اکثر فقہاء کرام کے نزدیک مکروہ ہے۔ چنانچہ فتاویٰ بحرالرائق جلد دوم ص۱۱۱ پر اور طحطاوی شریف ص۲۶۱ پر ہے:۔ وَيُكْرَهُ تَأْخِيْرُ السُّجُوْدِ عَنْ وَقْتِ التِّلَاوَةِ فِي الْاَصَحِّ اِذَا لَمْ يَكُنْ مَكْرُوْهًا لِاَنَّهُ بِطُوْلِ الزَّمَانِ قَدْ يَنْسٰى [illegible]

ترجمہ: صحیح مذہب یہ ہے کہ اگر تلاوت مکروہ وقت نہ ہو تو تلاوت کر کے سجدے میں دیر لگانا سخت مکروہ ہے۔ اس لیے کہ دیر لگنے سے وہ بھول بھی سکتا ہے۔ اور واجب کا بھول کر چھوڑ دینا سخت گناہ ہے [illegible] غفلتوں کے زمانے میں اور دین سے بے رغبتی کے دور میں لہٰذا بحکم الٰہی [illegible] تلاوت کے بعد فورًا سجدے کرو۔ اور سجدوں کے بعد ایصالِ ثواب کرو۔ سجدوں سے پہلے ایصالِ ثواب بہتر نہیں۔

جو ایصالِ ثواب کو سجدوں سے زیادہ اہمیت دے وہ فاسق اور گمراہ ہے غور تو کرو کہ جس نے ثواب عطا کرنا ہے اسی کے وجوبی حکم کی تم پرواہ نہیں کرتے تو ثواب پہنچے گا کس طرح۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ تاخیرِ سجدۂ تلاوت آخرِ عمر تک جائز ہے۔ مگر یہ قول غلط اور غیر مفتٰی بہ ہے وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

کتبہ

قریب قیامت قرآن مجید اٹھائے جانے کا بیان

سوال ۳۸۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل ذیل میں۔ کہ قرآن مجید کس طرح اٹھایا جائے گا۔ اور کیا کوئی حدیث اس بارے میں ہے تو اُس کے الفاظ نقل فرما دیں معہ حوالہ کتب۔ فقط والسلام

نور محمد سکنہ ٹنڈو الہیار حیدر آباد سندھ

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

اَلْجَوَاب

قریب قیامت ملک شام کی طرف سے سرخ آندھی چلے گی، جہاں جہاں وہ ہوا پہنچے گی۔ وہاں وہاں قرآن مجید کے ورقوں سے الفاظ ختم ہو جائیں گے چنانچہ حدیث پاک میں ہے:۔ عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ يُطْرَقُ النَّاسُ رِيحٌ حَمْرَاءُ يَعْنِي فِي آخِرِ الزَّمَانِ مِنْ قِبَلِ الشَّامِ فَلَا يَبْقَى فِي مُصْحَفِ رَجُلٍ وَلَا فِي قَلْبِهِ آيَةٌ

محوّلہ از تفسیر ابن کثیر جلد سوم پارہ پندرہ ۱۵ زیر آیت ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک صفحہ ۶۲ ط

اسی طرح اور بھی روایات ہیں جن میں واضح بیان ہے کہ کاغذ سے الفاظ اڑ جائیں گے۔ واللّٰہ ورسولہ اعلم

کتبہ

نماز میں قرآن مجید صحیح پڑھنے کا بیان

سوال ۳۹:۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس مسئلہ میں کہ الف اور عین میں تمام لوگ قرآن پاک پڑھنے میں فرق نہیں کرتے زمیں فرق نہیں کرتے ذ اور ظ میں فرق نہیں کرتے۔ ض کی جگہ د پڑھنا اگر سمجھایا اور بتایا جائے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ اسی طرح آتا ہے۔ خدا تعالیٰ قرأت کے متعلق کیا فرماتا ہے۔ حرف کے صحیح ادا ہونے پر۔ یعنی یہ پتہ نہ لگے کہ میں نے کیا پڑھا ہے۔ تو ایسے لوگوں کے لیے فرمائیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ قرآن مجید کے تلاوت کرنیکا کیا ثواب ہے۔ اور حرف کو اپنی جگہ پر کہنے کا کیا ثواب ہے۔ اور بعض مقامات جو کہ قرآن پاک میں ایسے ہیں۔ کہ جن کی شکل لکھنے میں اور ہے پڑھنے میں اور۔ مہربانی فرما کر آپ اس کی تشریح فرمائیں

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ط

الجواب

قرآن مجید پڑھنے کے متعلق شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر تلاوت کلام پاک کی نماز میں غلطی کرتا ہے حالانکہ صحیح پڑھ سکتا ہے تو اس کی نماز فوراً ٹوٹ جائے گی اور سخت گناہ گار بھی ہوگا۔ اگرچہ غلطی معمولی ہو۔ یا بڑی۔ اور اگر جان بوجھ کر غلطی نہیں کرتا۔ بلکہ دھوکے سے زبان سے نکل جائے۔ یا پڑھنے والے کی زبان پر ہی وہ لفظ صحیح نہ آتا ہو تو اس کے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ غلطی ایسی بڑی نہ ہو۔ جس سے کفر لازم آتا ہو یعنی صرف ادائگی کی طریقہ پر غلطی معمولی ہو۔ تب فقہاء کرام کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ نماز نہ ہوگی۔ اور اگر غلطی کفر کی حد تک پہنچ جائے تو نماز ٹوٹ جائے گی چنانچہ فتاوی قاضی خاں جلد اوّل میں ہے۔ بِذِكْرِ حَرْفٍ مَكَانَ حَرْفٍ فِي كَلِمَةٍ وَلَمْ يَتَغَيَّرِ الْمَعْنٰى بِاَنْ قَرَأَ اَنَّ الْمُسْلِمُوْنَ اَنَّ الظَّالِمُوْنَ وَمَا اَشْبَهَ ذٰلِكَ لَمْ تَفْسُدْ صَلٰوتُهٗ لِاَنَّهٗ لَا يُغَيِّرُ الْمَعْنٰى ط

یعنی اگر معنیٰ آیت کے نہ بدلیں۔ تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ اور اگر معنیٰ بدل جائیں اور بدلنے کا فرق سب کو معلوم ہو جاتا ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اسی طرح فتاوی عالمگیری جلد اوّل بابُ زلّۃ قاری میں ہے۔ اور مجدد اعظم اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتاب الجام الصاد صـ ۱۹ پر ایسا ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نماز کی قرأت میں اس طرح غلطیاں کرتا ہے کہ ج کو ز اور ز کو ج یا ض کو ظ یا ظ کو ز یا ض کو د پڑھتا ہے اور الف کو ع یا ع کو الف پڑھتا ہے۔ تو اگر اس کا عقیدہ ہی ایسا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہاں وہی حرف ہے جو میں پڑھتا ہوں تو نماز فوراً ٹوٹ جائے گی۔ چنانچہ شامی جلد اوّل صفحہ نمبر صـ ۵۹۱ پر ہے۔ وَاِنْ عَلِمَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ كَيْفَ هُوَ اِلَّا اَنَّهٗ جَرٰى عَلٰى لِسَانِهٖ لَا تَفْسُدُ وَاِنْ اِعْتَقَدَ اَنَّ الْقُرْاٰنَ كَذٰلِكَ تَفْسُدُ لِهٰذَا ۱ھ اگر حروف کو ایسا کہے تو نماز بالکل ٹوٹ جائے گی۔ اور ایسے شخص کو امام بنانا بالکل ناجائز ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اور اگر حرف کو صحیح سمجھتا ہے۔ مگر ادا کے طریقے کو غلط کرتا ہے اور صحیح کرنے پر قادر نہیں ہے۔ تو اس کے لیے معافی ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ایسے شخص کو امام نہ بنایا جائے اور جو شخص ض کو ظ یا ز کی آواز سے پڑھتا ہے۔ جیساکہ آج کل کے وہابی وَلَا الضَّالِّيْنَ کو وَلَا الظَّالِيْنَ پڑھتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں نماز بالکل فاسد ہو جائے گی۔ چنانچہ شامی جلد اوّل میں صفحہ نمبر صـ ۵۹۲ پر ہے۔ اور ایسا ہی فتاوی عالمگیری جلد اول صفحہ صـ ۸۰ پر ہے۔ اور فتاوی ہندیہ صفحہ نمبر صـ ۱۴۳ پر ہے وَلَوْ قَرَأَ وَنَخْلٌ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ قَرَأَ بِالظَّاءِ اَوْ بِالذَّالِ تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ : ض کا اصلی آواز دال کو پُر کر کے پڑھنا ہے۔ بغیر پُر کئے پڑھنے سے ض نہ ہوگا د ہوگا۔ اور ہر حرف کو اس کی اصلی آواز کے خلاف جان بوجھ کر پڑھنا بہت سخت گناہ ہے۔ اور نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں قرأت کی بہت احتیاط کرنی چاہئے۔ وہابی لوگ ض کو ذ کی طرح پڑھتے ہیں اور اس پر بضد ہیں۔ یہ ان کی جہالت ہے۔ حالانکہ تمام عرب اہلِ زبان ض کو پُر د کی طرح ہی پڑھتے ہیں۔ اہلِ لسان کا عمل شریعت میں مضبوط دلیل ہے۔ لہٰذا وہابیوں کے پیچھے نماز اس لیے بھی منع ہے۔

لہٰذا عرض ہے کہ آج تک کی صدیوں کے کون کون سے مجدّد کس کس زمانے میں تشریف لائے ؟ ان کے زمانے میں کن کن فتنوں کا ظہور تھا۔ کہ جن کو آکر ان بزرگوں نے بند کیا ؟ ان مجدّد کرام کے نام گیا گیا ہیں
بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ؂

السائل :۔ مولوی شمس الدین الہ آبادی کراچی مورخہ ۱۹۶۱/۱/۲

الجواب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابِ ؂

قانونِ شریعت کے مطابق یہ بات حتماً مسلّم ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ اپنے پیارے حبیب رؤف ورحیم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ان کی امت کو ضلالت سے بچانے کے لیے ہر سو سال بعد آنے والی صدی کے بالکل ابتدا میں اپنے کسی کامل اکمل بندے کو مجدّدیت کا تاج پہنا کر امتِ نبی کریم کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۵۸۹ کتاب الملاحم کے شروع میں پہلی حدیث ہے :۔
حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ الْمَهْرِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ اَیُّوْبَ عَنْ شَرَاحِیْلَ بْنِ یَزِیْدَ الْمَهْرِیِّ عَنْ اَبِیْ عَلْقَمَةَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ فِیْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا ط (ترجمہ) سلیمان بن داؤد مہری نے ابوداؤد سے روایت کی ان سے ابن وہب نے ان کو خبر دی سعید بن ایوب نے انہوں نے شراحیل بن یزید مہری سے روایت لی انہوں نے علقمہ سے انہوں نے ابوہریرہ سے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ میری امت کے لیے ہر صدی کے شروع میں مبعوث فرماتا رہے گا۔ ایسے شخص کو جو دین پاک کو صاف ستھرا کرتا رہے (الخ) اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا۔ جامع الصغیر نے جلد اول صفحہ ۷۴ پر اس کو صحیح کہا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں :۔ (۱) پہلی یہ کہ ہر مجدّد صرف ایک صدی کے لیے ہوگا نہ کم نہ زیادہ۔ بعض نقشبندی لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہزار سال کے مجدّد ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ بلکہ آپ بھی دیگر مجددین کی طرح فقط ایک صدی کے مجدد ہیں۔ الف ثانی کا مطلب دوسرے ہزار کی ابتدا جو گیارہویں صدی ہے۔ نہ کہ پورے ہزار سال۔ کیونکہ پورے ہزار سال تو اب ہو ہی نہیں سکتے۔ قیامت قریب ہے۔ اور موجودہ نقشبندیوں کا یہ قول خود ساختہ اس حدیث منورہ کے بھی خلاف ہے۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی۔ کہ جس عالم کو مجدد بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنی بعثت کی صدی سے پہلی صدی میں پیدا ہو کر عالم واکمل مشہور ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ لفظ یَبْعَثُ

بَعْث" سے بنا ہے اور بَعْث" کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کسی کام کے لیئے اُٹھ کھڑا ہونا۔ اور اس کام میں مصروف ومشغول ہو جانا ہے۔ چنانچہ لغات کشوری صفحہ ۵۵ پر اور منجد عربی صفحہ ۳۹ پر ہے۔ بَعَثَهٗ عَلَی الشَّیْءِ اَیْ حَمَلَهٗ عَلٰی فِعْلِهٖ فَاَقَامَهٗ الخ (ترجمہ) اس شخص کو مبعوث کیا۔ کسی چیز پر یعنی اس کے کرنے پر مشغول کیا اور قائم کیا۔ بَعْث" کا شرعی ترجمہ یہ ہے کہ پیغام خداوندی کی تبلیغ شروع کر دینا۔ اور جو خدمت دین اس کے سپرد ہوئی اس میں مشغول ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعثتِ انبیاءِ عظام، ولادتِ انبیاءِ کرام سے تقریباً چالیس سال بعد ہوتا ہے۔ اس روایت صحیحہ میں بھی لفظ بعثت مستعمل ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اپنی تبلیغی صدی سے پہلی صدی میں اس مجدد کی ولادت وتکمیل علوم معنوی وظاہری ہو چکی ہو۔ اور دوسری صدی شروع ہوتے ہی اس کو مبعوث کر دیا جائے۔ کیونکہ روایت کے دوسرے لفظ ہیں: عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ ؕ ہر صدی کے راس پر۔ اور راس کے معنیٰ ہیں سر، یعنی بالکل ابتدا۔ اور ابتداءِ تبلیغ یعنی بعثت تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ اس کے پہلے صدی کا کثیر زمانہ بھی پایا ہو۔ اور علوم حقیقیہ سے بھی کما حقہٗ واقف ہو چکا ہو۔

تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ ہر عالم مجدّد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اُس عالم یا ولی اللہ یا مختار حاکم بادشاہ وغیرہ کو مجدّد کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس نے دو صدی کے انتہائی وابتدائی زمانے کے پانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے دینی فتنے کا خاتمہ یا زور توڑا ہو۔ کہ جس کے وجود سے امت مسلمہ کے شدید گمراہ ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پاک میں ہے۔ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا ؕ کہ وہ شخص اُمّت مسلمہ کیلئے اس کے دین کو ستھرا کرے گا۔ چوتھی بات یہ ثابت ہوئی کہ وہ مجدد فرد واحد ہوگا۔ نہ کہ جماعت کثیرہ اگرچہ دیگر علماء اس کے معاون بن جائیں مگر اصل مجدّد فقط ایک شخص ہی ہوگا۔ اس لیے کہ حدیث مذکورہ بالا میں مَنْ اسم موصول ہے۔ جو صرف وحدت کو چاہتا ہے۔ پانچویں بات یہ ثابت ہوئی کہ مجدد کا وہ زمانہ، صحابہ کرام کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے۔ کوئی صحابی مجدّد نہیں اس لیے کہ روایت طیبہ میں ہے۔ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ ؕ یعنی وہ مجدّد ہر صدی کے بالکل شروع میں مبعوث ہوگا۔ جب کہ امت کی گمراہی کا سخت اندیشہ ہو تو تجدیدی کارنامے کر کے باطل فتنے کو فرو کرے۔ اکابر صحابہ میں سے کسی نے بھی صدی کا ابتداء نہ پایا۔ اس لیے کہ پہلی صدی کی ابتداء میں خود آقائے کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے تھے۔ اور کسی کے گمراہ ہونے کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ دوسری صدی کی ابتداء میں دور صحابہ تقریباً انتہائی مراحل میں پہنچ چکا تھا۔ خاص کر وہ چند صحابہ کرام جن کے افعالِ طیبہ اور حسین کردار کو تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب اکابر وصال ربانی فرما چکے تھے۔ جیسے صدیق اکبر فتنۂ منع زکوٰۃ وفتنۂ مسیلمہ کذاب کو مٹانے والے اور فتوحات اسلامیہ کے بانی فاروق اعظم اور قرآن کریم کے مخلوط کرنے کے فتنے کو ختم کرنے والے عثمان غنی اور جیسے کہ علی المرتضیٰ جنھوں نے اپنے عدالتی

اور فقہی فیصلوں سے دین کو عجیب طرح سے روشن کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجدد نہیں۔ اس لیے کہ مجدد کا درجہ صحابہ کرام سے کم درجے پر ہے۔ صحابی کو مجدد کا درجہ دینا ایسا ہی معیوب ہے جیسا کہ وزیر اعظم کو تھانیدار کا درجہ دیا جائے۔ اسی طرح یہ کہنا ایک لحاظ سے گناہ ہے کیونکہ صحابی کی گستاخی ہے۔ کہ مجدد کا درجہ مجتہد اربعہ کے بھی بعد ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس حدیث پاک نے جہاں مجدد آنے کی خبر دی۔ وہاں مجدد کی تعریف نوعیت اور شخصیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ تاکہ ہر ایرہ غیرہ کو مجدد نہ کہہ دیا جائے۔ اس حدیث کی روشنی میں سابقہ چودہ صدیوں کے مجددین کرام اور ان کے دینی کارناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) پہلی صدی کے مجدد (یعنی مجدد کی پہلی صدی نہ کہ اسلام کی) حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے خارجیوں کے فتنے کو توڑ کر تجدید اسلام فرمائی۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۹ھ میں اور وفات شریف ۱۱۲ھ میں ہوئی۔ اس طرح آپ نے اپنی صدی کے بارہ سال پائے۔

(۲) دوسری کے مجدد امام احمد بن حنبل ہیں۔ آپ کی عمر شریف ستر سال ہوئی اور ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔ آپ نے معتزلہ فرقے کو ہلاک فرمایا۔ خلق قرآن کریم کے فتنے کی بڑھتی ہوئی آگ کو بجھا کر تجدید اسلام فرمائی۔ اس زمانے میں امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ ہوئے۔ مگر خدمت تجدید امام احمد کے مقدر میں ہوئی۔ اسی میں آپ کی شہادت ہوئی۔ (۳) تیسری صدی کے مجدد امام نسائی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ کے باطل عقائد کو فنا کر کے مجددیت کا خطاب پایا۔ آپ کی ولادت ۲۰۷ھ میں اور وفات ۲۴۰ھ میں ہوئی۔ فرقہ جہمیہ کے چند باطل عقیدے یہ تھے۔ (۱) کہ عذاب قبر کوئی نہیں (۲) اور معاذ اللہ خالق دو ہیں (۱) خالق خیر (۲) خالق شر ان کفریہ عقیدوں کے باوجود پھر بھی یہ خود کو مسلمان کہتے تھے؛ چوتھی صدی کے مجدد امام بیہقی یا امام ابو بکر قلانی ہیں یہ دونوں بزرگ ہم زمانہ ہیں۔ انہوں نے تیسری صدی کے بیس ۲۰ سال اور چوبیس ۲۴ سال پائے۔ اور چوتھی صدی کے بیالیس ۴۲ اور پچپن سال پائے۔ اس لیے ان کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ امام بیہقی ہی مجدد ہیں انہوں نے فرقہ رافضیہ کا زور توڑا۔ اور مسلمانوں کو ان کے کفریہ عقیدوں سے بچایا اور طہران ولبنان میں تجدید اسلامی کا جھنڈا گاڑا پانچویں صدی کے مجدد امام محمد بن محمد غزالی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ قدریہ کے باطل عقیدوں سے مسلمانوں کو بچایا۔ ان کی ولادت ۴۵۰ھ میں اور وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی؛ چھٹی صدی کے مجدد امام فخر الدین رازی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ اور فلاسفہ کے باطل عقیدوں کو اسلامی فلسفے کے ذریعے سے ہی ختم کیا اور عالم کے قدیم ہونے کے کفریہ عقیدے کا رد بلیغ فرمایا۔ انہوں نے پانچویں صدی اور چھٹی صدی کا زمانہ پایا۔ ساتویں صدی کے مجدد امام تقی الدین ابن دقیق عبدی ہیں۔ یہ ۶۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۰۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوستان کے بعض علاقوں میں اسلام پھیلایا اور آریہ مذہب کا زور توڑ کر ان کی غلط توحید سے جو مسلمانوں میں فتنہ پڑا تھا اس کا خاتمہ کیا۔ آپ شام سے

ہجرت کر کے ہند میں خدمت اسلام کے لیے تشریف لائے ۔ آٹھویں صدی کے مجدد حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ انہوں نے بہشت بریں جانے والے بہائی مذہب کا زور توڑ دیا۔ ان کی عمر شریف تریسٹھ سال ہوئی۔ اور ۸۱۵ھ میں وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی صدی کے صرف پندرہ سال پائے ۔ نویں صدی کے مجدد امام جلال الدین سیوطی ہیں۔ انہوں نے بھی فلاسفہ کی پھیلتی ہوئی بے دینی اور فلسفے کے گمراہ کن چکروں سے مسلمانوں کو بچایا۔ یہاں تک کی فہرست کتاب عون المعبود شرح ابوداؤد صفحہ ۱۸۱ پر موجود ہے ۔ دسویں صدی کے مجدد ملا علی قاری ہیں۔ جنہوں نے اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کا تختہ الٹایا۔ گیارہویں صدی کے مجدد امام شیخ احمد سرہندی ہیں۔ جنہوں نے جہانگیر کے کفریہ قوانین سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کو بچایا۔ بارھویں کے مجدد امام محی الدین اورنگ زیب شہنشاہ ہند ہیں۔ ان کی ساری زندگی ملحدین سے مقابلہ کرتے گزری۔ تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز ہیں۔ جن کی وفات شریف ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔ چودھویں صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ جن کے کارنامے نمایاں ان کی سوانح حیات میں موجود ہیں۔ آپ کی ولادت شریف ۱۲۷۲ھ میں ہے اور وفات شریف ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

کتبہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور مَا فَوْقَ الْاَسْبَاب کے معنی

سوال ۴۰ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کا لفظ آتا ہے۔ وہاں انبیاء اور اولیاء مراد ہیں اور ان سے ہی مانگنا شرک ہے۔ جو لوگ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد بت لیتے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاف فرما دیا:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط لوگوں نے بنا لیا اپنے پادریوں اور راہبوں کو ارباباً اللہ کے سوا۔ زید کہتا ہے کہ بت کیسے مراد ہو سکتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پادریوں اور جوگیوں کو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط فرمایا۔ ثابت ہوا کہ بت مراد نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور پادری اور جوگی تو ان کے زندہ لوگ ہوتے ہیں اور ان کو وہ اپنا ولی وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اور ان سے مرادیں، بخشش مانگتے ہیں۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں برا فرمایا گیا پس اولیاء سے مانگنا بھی برا ہی ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ زید کہتا ہے۔ کہ مَافَوْقَ الْاَسْبَاب مدد مانگنا شرک ہے مَافَوْقَ الْاَسْبَاب مدد مانگنا نہ نبیوں سے جائز اور نہ ولیوں سے۔ اسی طرح مَافَوْقَ الْاَسْبَاب کسی نبی، ولی کو پکارنا بھی شرک ہے،

لہٰذا فرمایا جائے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور مَافَوْقَ الْاَسْبَابُ کے کیا معنی ہیں بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا ط

سائل :- مولوی نورالدین خاں عرف کشمیری باد را راولپنڈی شہر - مورخہ ۲۲-۸-۷۰ء

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابُ ط

الجواب

سوال مذکورہ کی خشک عبارت بتارہی ہے۔ کہ زید مسلکاً وہابی ہے۔ تقاضائے ادب یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ہو تو علیہ السلام کہنا لازم ہے۔ اللہ کریم جل مجدہٗ کا نام پاک لکھنا یا بولنا ہو تو لفظ تعالیٰ یا جل جلالہٗ وغیرہ ضرور کہنا چاہیئے۔ اولیاء اللہ کا ذکر ہو تو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہنا اچھا ہے۔ صحابہ کرام کے لیے رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنا ہی ادب ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جو لفظ عام انسانوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام کے لیے استعمال کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ یا نبی کریم کو اللہ میاں یا رسول میاں کہنا گناہ ہے۔ اسی طرح اللہ صاحب یا محمد صاحب کہنا یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے۔ ان سے وہابیوں نے بھی یہ طریقہ لے لیا۔ مگر مسلمانوں کو ایسا جائز نہیں۔ سوال مذکورہ میں لفظ انبیاء و اولیاء بغیر تعظیم کے لکھنا وہابیوں کی ہی نشانی ہے۔ سوال مذکورہ کا تحقیقی جواب سمجھنے کے لیے پہلے لفظ دُوْنَ اور مَافَوْقَ الْاَسْبَابِ کا معنیٰ سمجھنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک یہ لفظ سمجھے نہ جائیں۔ اسی طرح غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ یہ بات اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ ط ہے کہ اگر تعصب اور عنادِ رسول علیہم السلام کی پٹی اتار کر قرآن کریم سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اور رب کریم کے کرم و مہربانی سے سچی سمجھ بھی نصیب ہو جائے۔ تو سوائے اہل سنت والجماعت بریلویہ کے کوئی اور مسلک باقی نہ رہے۔ یہ بدعقیدگیاں صرف اسی طرح سے پھیلتی ہیں۔ کہ قرآن کریم کے مطالعہ کرنے والوں کو نہ اصول کا پتہ نہ فروع کا، نہ علم صرف سے مطلب، نہ قواعد نحویہ سے نہ منطق کے ضابطوں کو جانا، نہ ادب عربی سے لگاؤ۔ نہ لغت کی گتھیاں سلجھائیں۔ نہ علم معانی میں غوطہ زن۔ حالانکہ ایک آیت سمجھنے کے لیے بھی اتنے علوم درکار ہیں۔ صاحب تفسیر بیضاوی جلد اول صفحہ نمبر ۹ پر فرماتے ہیں۔ قرآن کریم سمجھنے کے لیے پندرہ علوم میں مہارت ہونی لازم ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنے کے لیے اٹھارہ علم پڑھنے لازم ہیں۔ اسی لیے درس نظامی میں پہلے دیگر علوم پڑھا کر آخر میں دورۂ قرآن و حدیث کرایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ اگر انسان بلا سوچے سمجھے ان کا ترجمہ و تفسیر شروع کر دے۔ تو بجز گمراہی و گمراہ گری کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انہی الفاظ میں سے ایک لفظِ دُوْن ہے۔ یہ لفظ لغت اور اصول کے اعتبار سے کل پانچ معنیٰ میں مشترک ہے۔

عٰ۱ :- دون کے معنی سواء بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جلد اول ترمذی شریف صفحہ نمبر ۳۰۲ پر ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَبْدًا مَامُوْرًا مَا اخْتَصَّنَا
دُوْنَ النَّاسِ بِشَیْءٍ اِلَّا بِثَلٰثٍ الخ ۃ (ترجمہ) روایت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ
عنہ سے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ آقائے دو عالم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم صاحب امر اور صاحب
اختیار بندے تھے۔ نہیں خاص کیا ہم اہلبیت کو لوگوں سے مگر تین چیزوں میں۔ یہاں دون کے معنی سواء
ہیں۔ اس لیے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ اس وجہ سے خصوصیت میں دون سواء کے معنی میں ہوا۔ یہاں بجز اس
کے کوئی دوسرا ترجمہ نہیں بن سکتا۔ خیال رہے۔ کہ لفظ مشترک کا معنی معین کرنے کے لیے کوئی قرینہ شرط
ہے۔ یہاں خصوصیت قرینہ ہے۔ دون کا دوسرا ترجمہ ہے حفاظت۔ جامع صغیر للسیوطی کے حاشیے پر
کنوز الحقائق للمناوی رحمۃ اللہ علیہ نے صفحہ نمبر ۱۱۵ جلد دوم پر مسلم بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے۔
مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَہِیْدٌ ۃ (ترجمہ) جو شخص اپنے حلال طیب مال کی حفاظت کرتا ہوا۔ قتل کر دیا
جائے تو وہ شہید ہے۔ یہ ہی روایت مجمع البحار جلد اول ۳۷۷ پر الکرمانی شرح قسطلانی کے حوالے سے
بھی نقل فرمائی۔ یہاں دون کے معنی حفاظت کے ہیں۔ اس لیے کہ مال کی حفاظت ہی کی جاتی۔ مال سے نہ
نہ لڑائی دشمنی اور مقابلہ ہوتا۔ نہ مال کے سواء کوئی قتل کیا جاتا ہے۔

ع۳: دون کا تیسرا معنی مقابلہ ہے۔ چنانچہ ایک عربی شاعر سبعہ معلقہ کی شرح میں اپنے محبوب و
معشوق کی طاقت و شجاعت کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ دُوْنَہٗ مِثْلُ الرَّمَادِ ـــ اِنَّھَا مُتَحَیِّرٌ مِنْھَا عُجَابٌ

ترجمہ:۔ ہر چیز میرے اس محبوب کے مقابلے راکھ کے ڈھیر کی مثل ہے۔ بے شک دنیا حیران ہے۔ اس
قوت سے تعجب ناک طریقہ پر۔ یہاں مقابلے کا معنی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اظہار طاقت ہے

ع۴:۔ دون کا چوتھا معنی ہے قریب۔ چنانچہ قرآن کریم سورۃ قصص پارہ نمبر ۲۰ میں حضرت شعیب
علیہ السلام کی صاحبزادیوں کا ذکر فرمایا گیا۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِہِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدَانِ ۃ ترجمہ
اور پایا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان لوگوں کے پاس ایک طرف کو دو عورتوں کو جو اپنی بکریوں
کو روکے ہوئے تھیں۔ یہاں لفظ دون کا معنی نزدیک۔ سوا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قومیت کے لحاظ سے
جدا نہیں تھیں۔ اور فردیت کے لحاظ سے ہر انسان ایک دوسرے کے سواء ہے۔ اور یہ سوائیت
بدیہی چیزیں ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں مقابلے کا معنی بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ مقابلہ بازی نہ تھی
نہ یہاں حفاظت کے معنی ہو سکتے ہیں۔ کہ مقصد کے خلاف ہے ۔۔۔ لَلتَّقْوٰۃ ترجمہ:
پانچویں معنی ہیں۔ حقیر ذلیل۔ چنانچہ عربی مقولہ مشہور ہے اَلشَّہِیْقُ دُوْنَ!

نالائق آدمی لائق شخص سے حقیر ہوتا ہے۔ بعض عرب کہتے ہیں:۔ اَلشَّھِیْقُ دُوْنَ الزَّفِیْرِ ط
گدھے کی پہلی آواز آخری آواز سے گھٹیا ہوتی ہے۔ لفظ شہیق کا لغوی ترجمہ ہے فضول باتیں کرنے والا
(منجد عربی صفحہ ۳۱۷) گدھے کے رینگنے کی ابتدائی آواز کو بھی شہیق کہتے ہیں۔ اور آخری موٹی
آواز کو زفیر کہتے ہیں۔ کشوری صفحہ ۲۸۵ یہاں دون کے معنیٰ ذلیل اور گھٹیا ہیں۔ منجد عربی صفحہ
نمبر ص ۲۲۹ پر ہے:۔ اَلدُّوْنُ اَیْضًا اَلْخَسِیْسُ اَلْحَقِیْرَۃُ ط (ترجمہ) دون کے معنیٰ ذلیل اور حقیر بھی ہیں۔ یہ
پانچ معنیٰ عام مشہور ہیں۔ منجد نے چھٹا معنیٰ ایک اور بھی کیا ہے۔ کہ دون کے معنیٰ سامنے ہونا۔ چنانچہ
صفحہ نمبر ص ۲۲۹ پر ہے:۔ وَبِمَعْنٰی اَمَامٌ یُقَالُ مَشٰی دُوْنَہٗ اَیْ اَمَامَہٗ ط ترجمہ دون کے معنیٰ آگے ہونا
کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص چلا۔ اُس کے دون یعنی اس کے آگے۔ یہ تھی لفظ دُوْنَ کی اصطلاحی لغوی تحقیق۔
قرآن کریم میں یہ لفظ بہت معنیٰ میں استعمال ہوا ہے: مختلف آیات میں مختلف قرینوں کے لحاظ سے
معنیٰ ہوتا ہے۔ مگر یہ رموز و قرائن سمجھنا محققین علماء کا کام ہے۔ ہر کس و ناکس کے ترجمے محض خرابی کا
باعث بنیں گے۔ اگر دُون کا ترجمہ ہر مقام پر ایک ہی کیا جائے تو پانچ نقصان شدید لازم آئیں گے:۔
ع۱: مقصد قرآن مجید فاسد ہوگا۔ جس سے گمراہی پھیلے گی، ع۲: آیات کا تعارض ٹکراؤ پیدا ہوگا۔
ع۳: بلکہ کبھی کفر لازم بھی آ سکتا ہے: ع۴: ترجمہ کرنے والے کی جہالت ظاہر ہوگی: ع۵: اغیار کو قرآن
پر اعتراض کا موقع ملے گا۔ اسی لیے علماء کرام نے لفظ دون کے معنیٰ کی اس طرح تفریق فرمائی ہے۔ کہ جب
قرآن پاک میں یہ لفظ عبادت یا معبودیت کے لیے استعمال کیا جائے۔ تو ترجمہ ہوگا سواء یا غیر اور جب لوگوں
کے لیے استعمال کیا جائے۔ تو معنیٰ مقابل۔ یہی وجہ ہے۔ کہ طریقت میں ولی دو قسم کے ہیں:۔
ع۱ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ ط ع۲ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ط سوال مذکورہ کی پیش کردہ آیت کریمہ میں تین
وجہ سے قطعاً اولیاء کرام و انبیاء عظام کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی یہ کہ لفظ دون کا معنیٰ یہاں مقابل ہے
اور ترجمہ یہ کیا گیا۔ انہوں نے راہبوں یا پادریوں نے معبود بنا لیا اللہ کے مقابل۔ کوئی مسلمان کسی ولی یا
بزرگ، عالم، مفسر، محدث کو نہ رب سمجھتا ہے نہ الٰہ۔ بلکہ مومن مسلمان کے عقیدہ میں صرف یہ ہے کہ اولیاء
اللہ اور انبیاء عظام، بزرگ، پیر، فقیر اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاجت روا مشکل کشا ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ
تعالیٰ کے اسی طرح منتظم سپاہی ہیں۔ جس طرح ملائکہ منتظمین عالم سپاہ اور خدائی لشکری ہیں۔ حالانکہ اس
آیت پاک میں حاجت روا، فریاد رسی کا ذکر نہیں۔ یہ تو بہت نیچا درجہ ہے۔ سابقہ کافروں نے اپنے بڑے
لوگوں کو رب اور معبود کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی تردید میں یہ آیت آئی۔ دوسری وجہ۔ اس آیت پاک
میں انبیاء و اولیاء کو شمار کرنا سراسر خدا تعالیٰ پر افترا اور جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ یہاں راہب اور پادری

کا لفظ ہے۔ اولیاء اللہ کو راہب کہنا سخت تریں گستاخی ہے۔ اسی طرح انبیاء عظام یا اولیاء کرام کو پادری وغیرہ کا لقب دینا سخت توہین اور بدتمیزی ہے۔ یہود و نصاری اپنے پادریوں کو خدائی کرسی پر بٹھاتے تھے۔ بلکہ اب بھی ان کے عقیدے میں یہ بات کامل ہے۔ کہ ہمارے پوپ، پادری گناہ بخشنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے پیسے لے کر گناہ بخشنے کا دھندا کھول رکھا ہے۔ اس کا مفصل ثبوت "ازبلا" نامی کتاب میں دیکھو۔ بہرحال یہ فاسد عقیدہ صرف یہود و نصاری کا تھا، اور ہے۔ بحمد اللہ کوئی سچا اہل سنت والجماعت مسلمان انبیاء کرام یا اولیاء اللہ کے لیے ایسا عقیدہ ہرگز نہیں رکھتا۔ صرف حاجت روا مشکل کشا فریاد رس مانتے ہیں۔ اگر یہودی اور عیسائی بھی اسی حد تک رہتے تو یقیناً ان کو کافر نہ کہا جاتا۔ ان بدنصیبوں نے تو رب کا درجہ دے دیا۔ اسی لیے یہ نہ فرمایا اِتَّخَذُوْا اَدْفَعَ الْبَلَاءِ کیونکہ اس حد تک جائز تھا۔ تردید اس بات کی ہے کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی یہود و نصاری نے تو اللہ کے مقابل رب بنا لیا۔ اور صرف لغوی طور پر رب نہ بنایا کہ جس کا معنیٰ مالک یا مربی ہوتا۔ اس میں پھر بھی کچھ تو یہ درجات کی گنجائش تھی۔ مگر انہوں نے تو مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اللہ کے مقابل میں رب بنایا۔ جو سراسر کفر تھا۔ حاشا حاشا۔ کوئی مسلمان اس طرح کسی نبی علیہ السلام یا ولی اللہ کو نہ رب تسلیم کرتا ہے نہ معبود۔ بلکہ اولیاء اللہ کو با اختیار، ذی شان عبد اللہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ عقیدہ عین ایمان، اور منشاء الٰہی کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ عقیدہ بھی کفر یا شرک یا کم از گناہ ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں عالموں، پیروں، غوثوں، قطبوں، ولیوں سے مدد مانگنے کی تردید فرما دیتا۔ مگر زمانے بھر کے وہابی ایک آیت بھی اس طرح کی نہیں دکھا سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ ولی اللہ اور پیر فقیر سے مدد مانگنا جائز ہے۔ اور یہ پیارے مشکل کشا ہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام کا دور تھا۔ اور ساری کائنات میں مسلمان صرف صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہی تھے۔ کس صحابی نے کسی نبی علیہ السلام کو معبود کیا۔ یا کسی ولی اللہ کو خدا تعالیٰ کا درجہ دیا جو صحابہ کرام کے متعلق یہ باطل عقیدہ رکھے اس کے اپنے ایمان کی خیر نہیں۔ تو اس آیت میں اولیاء اللہ کیسے داخل ہوئے۔ لفظ ولی اللہ صرف مسلمانوں میں مستعمل ہے۔ جیسے کہ لفظ علماء و محدث، مفسر وغیرہ مسلمان اکابر کے ہی القاب ہیں۔ یہود و نصاری میں یہ الفاظ رائج نہیں۔ آج بھی کسی عیسائی نے اپنے بڑے مذہبی پیشوا کو محدث، مفسر یا ولی اللہ نہیں کہا۔ بلکہ پادری اور راہب کے الفاظ ہی مسموع ہیں۔ یہی القاب ان کے لیے قرآن پاک میں استعمال ہوئے۔ مگر افسوس ہے وہابیوں پر کہ اپنے پاس سے ایسی باتیں بنا لیتے ہیں۔ محض اس لیے کہ آیت میں توڑ مروڑ کا موقعہ مل سکے۔ اور اسی طرح کفار کی آیتوں کو مسلمان پر چسپاں کر کے شرک کی مشین کھولی جا سکے۔ اللہ ان کے شر سے سب مسلمانوں کو بچائے۔ دوسرا لفظ

جس سے عام طور پر بے سمجھی سے دھوکہ دیتے ہیں وہ ہے مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ اس کا لفظی ترجمہ ہے وہ چیز جو اسباب سے اوپر یعنی علیحدہ ہو۔ یہ لفظ نہ قرآن کریم میں ہے۔ نہ حدیث پاک میں۔ یہ وہابی دیوبندی لوگوں کی اپنی ایجاد ہے۔ جو انہوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اور انبیاء کرام و اولیاء کرام کے آستانوں سے دور کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ یہی ایک لفظ نہیں۔ بلکہ اس طرح کے بے شمار لفظ ان کی شرک ساز مشینوں سے دیوبند فیکٹری میں تیار ہوتے ہیں۔ جن کو اگر ایک جگہ پر جمع کیا جائے تو واضح ہو جائے کہ دیوبندی دین۔ اسلام سے بالکل علیحدہ دین ہے۔ اب حال ہی میں ان لوگوں نے تقلید کے خلاف "شرک فی الرسالت" کا لفظ ایجاد کیا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ وہابیوں کا عقیدہ ہے کہ کسی نبی، ولی سے مدد مانگنا کسی قسم کی بھی ہو شرک ہے۔ لیکن اپنے دیگر عقیدوں کی طرح جب یہ لوگ اس بات کو بھی قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کر سکتے۔ تو گھبراہٹ میں "مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ" کی گھڑیلو قید لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ نبی، ولی سے وہ مدد مانگنی حرام ہے جو اسباب سے علاوہ ہو۔ پوچھو ان داناؤں سے کہ اگر یہ شرک ہے تو ہر طرح شرک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جو چیز شرک ہے وہ ہر طرح ہر وقت شرک ہی ہے۔ یہ کیا کہ صبح کو شرک نہیں رات کو شرک ہو۔ اس طرح شرک نہ ہو اور اس طرح شرک ہو جائے۔ دیکھو عبادت غیر اللہ کو شریعت نے شرک فرمایا۔ تو جس وقت جس طرح بھی کی جائے، شرک ہی ہوگا۔ یہ تو تھا ان پر الزامی جواب۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ "مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ" کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اسباب ہی سے ہونا ہے۔ ہاں البتہ لوگوں اور زمانے کے اختلاف اور تغیر سے اسباب بھی متفرق ہوتے ہیں۔ ایک طاقت والے کے لیے ایسے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ جو کمزور کے لیے نہیں۔ امیر، دولت مند کو وہ اسباب مل جاتے ہیں جو غریب کے پاس نہیں۔ پڑھا لکھا وہ کام کر دکھاتا ہے۔ جس کے اسباب جاہل، اَن پڑھ کو میسّر نہیں آتے۔ آج سائنسی ترقی سے وہ وہ اسباب موجود ہیں۔ جو چند سال پیشتر متصوّر بھی نہ تھے۔ سابقہ زمانوں میں دور کی بات سننا کم عقلوں کے نزدیک مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج ٹیلیفون، وائرلیس وغیرہ نے اس کو مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ سے نکال دیا دور سے امداد کے لیے پہنچنا وہابیوں کے نزدیک مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ ہے لیکن ہوائی جہاز اور راکٹ نے ثابت کر دیا کہ یہ کام بھی مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ نہیں۔ وہابی اپنے خود ساختہ قاعدے کی بناء پر اولیاء کرام کے لیے۔ دور کی آواز سننے اور دور کی امداد کے منکر ہیں۔ حالانکہ یہ کام تو فی زمانہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے پاس ٹیلیفون یا وائرلیس اور راکٹ یا ہوائی جہاز ہو۔ ایک دفعہ

۱۹۶۵ء کی جنگ میں۔ وائرلیس کے ذریعے پندرہ منٹ میں صدر ایوب صاحب کو گجرات میں بلایا گیا۔ اور صدر ایوب صاحب نے اتنی دور سے مصیبت زدہ گھبرائے ہوئے فوجی دستے کی آواز بھی سن لی۔ اور اپنے تیز رفتار طیارے کے ذریعے پہنچ بھی گئے۔ اس طرح کا دن رات مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر کوئی وہابی اس کو شرک نہیں کہتا۔ پس ثابت ہوا کہ دنیا میں کوئی کام مَافَوْقُ الْاَسْبَاب نہیں جب دنیاداروں میں اتنی طاقت اور حاجت روائی کی قوت ہے تو غور کرو۔ کہ اولیاء اللہ، پھر صحابہ، پھر انبیاء کرام میں کتنی عظیم طاقت ہے اور ہوگی۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی طاقت شعور انسانی سے بالاتر ہے۔ یہ راز کسی تھیوری سے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ راکٹ اور ہوائی جہاز کی مشینری کو بہت سوں نے سمجھ لیا۔ مگر خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کھڑاؤں کی پرواز کا راز آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔ ٹیلیفون اور وائرلیس کی گتھیاں ہزاروں نے سلجھالیں۔ مگر یَاسَارِیَۃُ الْجَبَلْ کا فارمولا کسی نے نہ جانا ٹیلیفون، ٹیلی ویژن بنانے والے تو بہت پیدا ہوسکتے ہیں۔ مگر مسجد قبا میں بیٹھ کر خانہ کعبہ کا نظارہ کرانے والے کہاں سے لاؤ گے۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِہٖ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلٰوۃً وَّسَلَامًا عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لیکن یہ سب کچھ اسباب کے تحت ہی ہو رہا ہے۔ مَافَوْقُ الْاَسْبَاب کوئی چیز نہیں۔ ہاں اپنے اپنے اسباب علیحدہ ہیں۔ کسی کے پاس رحمانی، کسی کے پاس شیطانی، کسی کے پاس جسمانی، کسی کے پاس روحانی، کسی کے پاس مادی، کسی کے پاس ایمانی، کسی کے پاس فانی۔ کسی کے پاس ابدالآباد تک باقی کسی کے پاس ظاہری دنیاوی زندگی میں کسی کے پاس بعد وفات بھی۔ یہ تو اپنی اپنی پہنچ کی بات ہے۔ کہ کوئی دنیا کی طرف دوڑے۔ اور کسی کی دوڑ بحکم فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ اللہ رب العزت کی طرف اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنِیْ اِلَی الْفِرَارِ اِلَیْکَ ؕ جس طرح دنیاوی محکموں کا آپس میں بذریعہ ٹیلیفون وائرلیس وغیرہ رابطہ اور تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح دفترِ معرفت میں اولیاء کاملین کا ٹیلیفون بھی لگا رہتا ہے۔ یہ مجذوب فقراء جو کسی موقع پر عجیب عجیب گفتگو اور حرکتیں کرتے ہیں۔ اور بیوقوف لوگ ان کو دیوانہ سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ کسی روحانی محکمے سے رابطے میں مشغول ہوتے ہیں بلاتشبیہ یوں سمجھ لو۔ ٹیلیفون پر گفتگو کرنے والا تو دونوں آوازیں سنتا ہے۔ مگر قریبی لوگ صرف اسی ایک کی۔ ہاں اور بات سنتے ہیں۔ ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اسی طرح ولی کامل مجذوب یا سالک کے رازوں سے بھی کوئی واقف نہیں ہوسکتا۔ اور جس طرح حکومت کے ٹیلیفون پر بیٹھے ہوئے ملازم شخص کو ستانا یا اس کے قریب جانا قانونی جرم کا باعث ہے اسی طرح اولیاء اللہ کو ستانا شرعی جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں۔ مجذوب فقیر کے پاس نہ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بددعا دے

دے کیونکہ وہ اپنے عشق وارفتگی میں نہ معلوم کس سے رابطہ ہے۔ وائرلیس پر بات کرنے والے کو کوئی پاگل دیوانہ نہیں کہتا۔ کہ ربناوی مشین کے ذریعے کسی سے تعلق مربوط ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کی عجیب وغریب باتوں کو سن کر بھی کچھ فیصلہ نہ کرو۔ کیونکہ یہ باتیں متشابہات قرآنیہ کے حکم میں ہیں۔ چنانچہ فتاوی شامی جلد سوم مطلب حال شیخ اکبر صفحہ نمبر ۴۰۶ پر ہے:۔ وَقَالَ اَنَّهٗ شَبِيْهٌ بِالْمُتَشَابِهِ فِي الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ ط ۵ ترجمہ: امام غزالی نے فرمایا کہ ان مجذوب اولیاء اللہ کی باتیں قرآن وحدیث کے متشابہات کی طرح ہیں۔ یہ اپنی قلبی مشین کا تار عشق ومعرفت کے دارالحکومت سے جوڑے ہوتے ہیں۔

حمقاء کے نزدیک تو یہ کام " مَافَوْقَ الْاَسْبَابْ ط " ہو سکتے ہیں۔ مگر عقلاء قلبی اس کو روحانی قوت واسباب سے تعبیر کرتے ہیں۔ انبیاء کرام کی امداد تو بڑی عظمت والی چیز ہے۔ اولیاء اللہ کی امداد کا بھی وہ ہی منکر ہو سکتا ہے جو عقل وخرد سے عاری ہو ہمارا ایمان ہے۔ اولیاء اللہ ہر وقت ہر آن مدد کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ط ۵ ترجمہ: مگر تم بے عقلوں کو شعور نہیں۔ اور مدد کرنے والے سے مدد مانگنی جائز ہے مدد کرنے کی طاقت دی ہی اس لیے جاتی ہے تاکہ ان سے مدد مانگی جائے۔ ورنہ کرامات کا عطیہ ربانی اور قرآنی تاریخی مشاہدات سب کو باطل کہنا پڑے گا حالانکہ یہ کفر ہے۔

حکومت دیپوی ڈپو والے کو راشن ذخیرہ کرنے اور سڑانے لگانے کے لیے نہیں دیتی بلکہ اس لیے کہ حاجتمندوں کو دیا جائے اور حاجتمند اکر اس سے مانگیں۔ حاجتمندوں کی جتنی بھیڑ مانگنے کے لیے ڈپو پر جمع ہو گی اتنا ہی حکومت کو خوشی ہو گی ڈپو سے روکنے والا حکومت کا دشمن ہے۔ بس بلا تشبیہ سمجھ لو کہ اولیاء اللہ کے آستانے قدرت الٰہی کے ڈپو ہیں۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ط

کتاب التاریخ

امام اعظم اور حضرت قتادہ رضی تابعی کا مکالمہ

سوال نمبر ۴۱ :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ امام اعظم اور حضرت قتادہ کا آیت سورۃ نمل میں لفظِ نملۃٌ کی تذکیر یا تانیث کے بارے میں کچھ مکالمہ ہوا جس میں حضرت قتادہ لاجواب ہوگئے تھے اور امام اعظم نے فرمایا تھا کہ یہ نملۃ مونث نہ ہوتی تو قَالَ نَمْلٌ ہوتا۔ یہ واقعہ تفسیر خزائن العرفان میں صدر الافاضل نے بھی ذکر کیا ہے اور مولانا لاہوری صاحب اور گوجرانوالے کا فتوٰی اس بات کی تائید میں آچکا ہے کہ یہ مکالمہ بالکل درست ہے اور حضرت قتادہ کا لاجواب ہونا اور امام اعظم کا باوجود صغر سنی کے درست جواب دینا بالکل سچا واقعہ ہے۔ لیکن ہمارا مولوی خطیب اس بات کو غلط کہتا ہے لہٰذا صحیح اور حق با دلائل فیصلے کے لیئے آپ کی خدمت میں استفتاء اور لاہور و گوجرانوالے کے فتوے حاضر ہیں۔ براہِ کرم جلد جواب دیا جائے۔

بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا :-

السّائِل :- بشارت احمد نورانی محلہ جادہ جہلم ناظم جامع مسجد نور ۱۶-۹-۷۷

اَلْجَوَاب بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابُ

سوالِ مذکورہ میں بطور تحقیق میں نے بحیثیت مفتیٔ اسلام ہونے کے ہر دو فتاوٰی مذکورہ اور تفسیر خزائن العرفان کا مطالعہ کیا بَعْدَہٗ محققانہ تحقیق سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی کہ مذکورہ فی السّوال مکالمہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر۔ عقلاً۔ نقلاً۔ نحواً۔ صرفاً۔ علماً۔ ادباً۔ تاریخاً۔ تحقیقاً۔ ہر طرح غلط ہے اور محدّثِ اسلام حضرت قتادہ وسراج الامہ کاشف الغمۃ امام الامہ امام اعظم کے درمیان اس قسم کا کبھی کوئی بصورت سوال جواب مکالمہ بالواسطہ یا بلا واسطہ نہ ہوا۔ کسی کم عقل نے اپنے پاس سے یہ مکالمہ گھڑ لیا ہے اور بعض مفسروں نے بلا سوچے سمجھے اس کی تشہیر کر دی۔ حالانکہ ایسا کرنا عقلاء کو زیب نہیں۔ گوجرانوالہ کا فتوٰی محض جذباتی ہے۔

جب کہ لاہوری فتوائے مفتی کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ ہر دو مفتی صاحبان نے غور و فکر و تحقیق کی زحمت گوارہ نہ کی تفسیر خزائن نے اس مکالمے کو لطیفے کے درجے میں رکھا ہے اسی لیئے اس کی ابتدا لطیفہ کے لفظ سے کی۔ ہماری اصطلاح میں لطیفہ ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جس میں مذاق۔ دلچسپی۔ دل لگی کا پہلو نکلتا ہو اگرچہ حقیقت کے خلاف ہو پس حضرت صدر الا فاضل صاحب تفسیر خزائن العرفان علیہ الرحمۃ کا اس لطیفے کو نقل کرنے سے آپ کی تائید ضروری نہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے بعض مفسرین کے نقل کردہ اس واقعے کو لطیفہ بنا کر اس کی حقیقت کی تردید کر دی۔ اور صدر الا فاضل کا مقصد یہ ہو کہ یہ مکالمہ حقیقت نہیں بلکہ نرا لطیفہ ہے اس توجیہہ یا تاویل سے تفسیر خزائن پر مندرجہ ذیل ممنوعات سے کوئی حجت نہیں پڑتی۔ بہر حال یہ مکالمہ سرے سے بے بنیاد اور غلط ہے۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ:۔ اس قسم کے واقعات و مکالمات سیرو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس اگر یہ مکالمہ اور بات چیت ذرا بھی درست واقعہ ہوتی تو لازماً امام اعظم کی کسی تاریخ یا سوانح میں مذکور ہوتی۔ کیونکہ امر فطری کے مطابق ہر فن کی بات انہی فن کی کتب میں پائی جائیں تو قابل قبول ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس قابل تردید ہو دے گی مثلاً علم طب۔ علم نحو۔ سائنس وغیرہ کی کوئی بات ان فنون کی کتب میں تو میسر نہ ہوں بہ دوسری کتاب میں اس کا تذکرہ موجود ہو تو ذی عقل حضرات کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگا۔ اگر دنیا کے لوگ اسی قاعدۂ کلیہ پر کاربند ہو جائیں تو دنیا سے عملی تفرقے بازی اور فکری و نظری فساد ختم ہو جائے حضرت قتادہ کا یہ مکالمہ بعض تفسیر میں ملتا ہے۔ مگر تاریخ یا سوانح امام کی کسی کتاب میں نہیں ملتا اس لیئے جہلاء تو اس مکالمے کو درست کہہ سکتے ہیں۔ مگر محققین علما پر اس کی تردید اخلاقاً واجب ہے۔ ورنہ فساد عدیدہ کا باب کھل جائے گا۔ اور اس طرح کے بناوٹی واقعات سے کسی بھی بزرگ کی توہین کی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ:۔ امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے لے کر شبلی نعمانی تک کسی مورخ نے بھی اس واقعے کا ذکر نہ کیا۔ حالانکہ بے شمار سوانحات امام اس دوران مرتب و شائع ہوئیں۔ بلکہ اکثر متقدمین و متاخرین نے لکھا کہ امام اعظم فن حدیث میں حضرت قتادہ کے شاگرد رہیں (دیکھو طبقات الحفاظ تہذیب الکمال اور شبلی نعمانی کی امام اعظم) ایسے واقعات گھڑ کر امام اعظم کے استاد محترم کی توہین کرنا مقصود ہو سکتی ہے۔ جو سراسر اکابر کی گستاخی کے مترادف ہے۔ **تیسری وجہ:۔** تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت قتادہ صرف ایک مرتبہ کوفہ تشریف لائے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بلانے مسائل پوچھنے کے لیئے۔ اعلان کرایا گیا تھا۔ اس وقت حضرت امام اعظم تقریباً سولہ سال کے نوجوان تھے اور فقہ اسلامی کے اونچے طالب علم اور حضرت امام حماد کے بڑے شاگردوں میں تھے اس وقت امام اعظم

نے چند سوال کیئے تھے مگر ان سوالات میں مذکورہ سوال نہ تھا۔ ثابت ہوا کہ یہ واقعہ غلط اور بناوٹی ہے۔ اور پھر حضرت امام اعظم کی عمر کے بارے میں بعض مفسرین بھی اور لاہوری فتوے میں بھی صغر سنی اور غُلامٌ حَدَثٌ لکھا ہے حالانکہ یہ عمر قریب بلوغ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ لغات کشوری ص۲۹۲ پر صغر سنی کا ترجمہ کرتے ہیں لڑکپن اور مجمع البحار جلد اول ص۴۲۴ پر غُلَامٌ حَدَثٌ کا ترجمہ کرتے ہیں اول عمر۔ یہ قریبًا بارہ سال کی ہوتی ہے۔ اور اس عمر میں امام اعظم و حضرت قتادہ کی ملاقات کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا پس ثابت ہوا کہ یہ واقعہ محض بناوٹی ہے لہٰذا ناقابلِ قبول :- **چوتھی وجہ** :- اس واقعے میں صرف حضرت قتادہ ہی کی گستاخی نہیں امام اعظم کی بھی گستاخی ہے۔ اس لیئے کہ نحوی قاعدے کے اعتبار سے لفظِ نملۃٌ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ لفظ مذکر ہے اور آخر کی ت وحدت کی ہے۔ اور قالت مؤنث کا صیغہ تاء وحدت کے لیئے لگایا گیا نہ کہ تاءِ تانیث کے لیئے۔ کیونکہ مؤنث کا صیغہ مؤنث حقیقیہ کے علاوہ بھی بہت جگہ استعمال ہو جاتا ہے۔ جس کی مثالیں قرآنِ کریم میں بہت جگہ ہیں۔ مثلاً ع۱ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ (ترجمہ) :- فرمایا اُن کو اُن کے رسولوں نے۔ دیکھو لفظِ رُسُلٌ جمع ہے رسول کی اور رسول مذکر ہوتا ہے مگر مؤنث مگر قالت مؤنث کا صیغہ آیا ع۲ وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ۔ ترجمہ :- اور ایک قافلہ آیا (کنز الایمان)۔ سَیَّارَۃٌ میں ت وحدت کی ہے جس کا ترجمہ ہوا ایک قافلہ۔ قافلہ مذکر ہے اسی لیئے اعلیٰحضرت و دیگر مترجمین نے اس کا ترجمہ آیا کیا ہے نہ کہ آئی۔ لیکن سَیَّارَۃٌ کے مذکر ہونے کے باوجود پھر صیغہ مؤنث جائَتْ فرمایا گیا۔ ثابت ہوا کہ وحدت کی ت کے لیئے بھی صیغہ مؤنث بولا جاتا ہے۔ اس قاعدے کے تحت امام اعظم کا وہ جواب غلط ہو جاتا ہے جو نملۃٌ کی تانیث کی دلیل میں دیا۔ بدیں وجہ بہت سے مفسرین نے اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ کہ اس طرح خود امام اعظم کی گستاخی و توہین ہے کہ وہ ایسا جواب دیں جو نحو کے خلاف ہو ع۲ دوسرا احتمال لفظِ نملۃٌ میں یہ ہے کہ یہ ت مؤنث کی ہو۔ اگر یہ احتمال درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال اتنا معمولی رہ جاتا ہے کہ اس کو ہر عربی دان بچہ یا چھوٹی کتب کا طالب علم بھی فوراً حل کر دیتا ہے۔ بلکہ یہ سوال و جواب چھوٹے طلباء کے ہی لائق ہیں۔ اکابر کے سامنے ایسے معمولی سوال کرنے ہی بیوقوفی ہے۔ بلکہ ایسے سوال اہلِ زبان کے سامنے کرنے مزید حماقت ہے اس کی مثال اپنی زبان میں اس طرح ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کسی سے سوال کرے کہ بتاؤ۔ "اقبال آئی تھی" میں اقبال مذکر ہے یا مؤنث۔ ظاہر بات ہے کہ اردو دان بچہ اس کا فی البدیہہ صحیح جواب دے سکتا ہے۔ تو یہ سوال کسی بڑے عالم سے کرنا محض حماقت ہی ہو گی۔ اب کوئی کہے کہ "اقبال آئی تھی" والا سوال کسی فلاں عالم سے کیا گیا مگر وہ جواب نہ دے سکا اس عالم کی سخت توہین ہے

لاہوری فتوے کا یہ فرمانا کہ حضرت قتادہ کی جواب سے خاموشی اس بنا پر ہے کہ نملۃ کا لفظ عربی میں مذکر مونث ہر دو کے لیئے مستعمل ہے یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اس لیئے کہ اس اشتراک کی صورت میں فیصلہ قالت کی تانیث نے کرنا ہے نہ کہ نملۃ کی تا نے۔ اور قالت تو فقط مؤنث ہی ہے۔ جس کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ پس اتنے بڑے عربی نسل زبان دان عالم حضرت قتادہ کا خاموشی اختیار کرنا تعجب ناک ہے۔ جیسے کہ لفظ اقبال ہماری اردو میں مذکر۔ مونث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ تو یہاں آئی تھی۔ نے فیصلہ کرنا ہے جس کو اردو زبان کا بچہ بچہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح قالت کی تانیث کو عربی دان بچہ بچہ سمجھتا ہے۔ پس یہ سوال نہ شانِ امام کے لائق نہ حضرت قتادہ کے۔ بلکہ اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اور ایسے معمولی سوالات کا جواب دینا خود میں بھی وقار علماء کے خلاف سمجھتا ہوں۔ مگر چونکہ ایسے بناوٹی اور بیہودہ واقعات اور پھر ان میں کچھ بحثیں کرنے سے دو بزرگ ترین ہستیوں کی گستاخی لازم آتی تھی اس لیئے واجب عملی سمجھتے ہوئے اس کے جواب پر میں نے قلم اٹھایا۔ کیونکہ مسلکِ اہل سنت نہ تو شیعہ لوگوں کی طرح حماقت کی تعریف کرنا ہے اور بیوقوفی سے شان بیان کرنا۔ نہ ہی دیوبندیوں کی طرح ایک بزرگ کی شان گھٹا کر دوسرے کی عزت بڑھانا ہے۔ اہلِ سنت تو اسلام کے سب بزرگوں کی عزت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی غلط باتیں بنانا چھوٹی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اس بناوٹ سے صرف حضرت قتادہ ہی کی توہین نہ ہوتی تھی بلکہ ایسے کچے سوال و جواب سے خود حضرت امام اعظم کی علمی وجاہت پر حرف آتا تھا۔ اس لیئے اس کو غلط ثابت کرنا ہم جیسے نمک خواروں پر اخلاقی فرض ہے :۔

پانچویں وجہ! بجز چند مفسروں کے سب مفسرین نے اس مکالمے کی تردید کی ہے۔ اور اکثر نے اس مکالمے کا ذکر تک نہ کیا جنھوں نے کیا انہوں نے ساتھ ہی کہدیا کہ یہ واقعہ تاریخاً اور عقلاً غلط ہے۔ چنانچہ تفسیر جمل جلد سوم صفحہ ۳۶۸ للشیخ سلیمان جمل پر ہے :۔ إِلَّا أَنَّ الشَّيْخَ قَدْ رَدَّ هٰذَا۔ فَقَالَ وَلِحَاقُ التَّاءِ فِي قَالَتْ لَا يَدُلُّ أَنَّ النَّمْلَةَ مُؤَنَّثٌ بَلْ يَصِحُّ أَنْ يُقَالَ فِي الْمُذَكَّرِ قَالَتْ نَمْلَةٌ۔ (الخ) :۔ (ترجمہ) :۔ مگر شیخ نے اس مکالمے کی تردید کر دی پس فرمایا کہ ت کا قالت میں لگنا اس بات کو نہیں بتاتا کہ نملۃ مونث ہے بلکہ مذکر میں قالت نملۃ کہنا بھی صحیح ہے۔ تفسیر روح المعانی نے فرمایا۔ صفحہ نمبر ۱۷۸ پ ۱۹ :۔

إِنَّ التَّاءَ فِي نَمْلَةٍ لِلْوَحْدَةِ (الخ) وَالْجَزْمُ الْقَوْلُ بِعَدَمِ صِحَّةِ هٰذِهِ الْحِكَايَةِ (الخ) وَقَتَادَةُ بْنُ دِعَامَةَ السَّدُوسِيُّ بِإِجْمَاعِ الْعَارِفِيْنَ

بِالرِّجَالِ کَانَ بَصِیْرًا بِالْعَرَبِیَّۃِ فَیَبْعُدُ کُلَّ الْبُعْدِ وُقُوْعُ مَا ذُکِرَ مِنْھَا۔
(ترجمہ)۔ نملۃ میں ت وحدت کی ہے (نہ کہ تانیث کی) اور حکایت مذکورہ کے غیر صحیح ہونے پر یہ قول یقینی ہے اور قتادہ بن دعامہ سدوسی تمام عارفین علماء کے اجماع کے مطابق عربی زبان اور قواعد سے بہت زیادہ واقف تھے لہٰذا ایسے مکالموں اور سوال جواب کا ان دونوں بزرگوں سے واقع ہونا عقل وفہم سے بہت دور ہے۔ (یعنی کسی احمق نے یہ واقعہ گھڑ لیا ہے)۔ تفسیر صاوی جلد دوم صفحہ ۱۵۷ پر ہے:۔ قَالَ بَعْضُھُمْ وَفِیْہِ نَظْرٌ لِاَنَّ لِحَاقَ التَّاءِ فِیْ قَالَتْ لَایَدُلُّ عَلٰی اَنَّھَا مُؤَنَّثَۃٌ لِاَنَّ تَاءً لِلْوَحْدَۃِ لَا لِلتَّانِیْثِ وَمَا اسْتَدَلَّ بِہٖ اَبُوْحَنِیْفَۃَ یُفِیْدُ الظَّنَّ لَا التَّحْقِیْقَ۔ (ترجمہ):۔ بعض محققین نے فرمایا کہ اس مکالمے پر اعتراض ہے۔ اس لیئے کہ امام اعظم کی دلیل تحقیقی نہیں بلکہ وہمی ہے۔ کیونکہ قالت میں ت ہونا اس وجہ سے ہے کہ نملۃ کی ت وحدت کی ہے نہ کہ تانیث کی۔ علامہ صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اگرچہ اس واقعے کی تردید قال بعضھم جیسے صیغہ تمریض سے کی مگر اس کے بعد اعتراض کا جواب نہ دینے سے ان کی اپنی تائید بھی اس تردید میں شامل ہو گئی۔ گویا کہ علامہ صاوی نے بھی اس مکالمے کی تردید کر دی۔ دیکھو معاذ اللہ اگر اس مکالمے کو درست مانا جائے تو امام اعظم جیسی ذی علم ہستی کو غلط کہنا پڑے گا اور ان کی باتوں کو کمزور اور ان کی دلیلوں کو ظنی وہمی اور حقیقت سے دور کہنا پڑے گا پس بہتر یہ ہے کہ اس قسم کی غلط باتوں کا یکسر انکار کر کے اپنے اکابر کی خداداد عزت بچائی جائے۔ اور اغیار کے قلوب میں جہاں تک ممکن ہو بزرگانِ اسلام کا وقار قائم کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ اس قسم کا مکالمہ امام صاحب کی نسبت قطعاً غلط اور بناوٹی ہے ہاں البتہ ایک موقعہ پر شاگردی کرنے سے پہلے امام اعظم نے حضرتِ قتادہ سے بطور مستفتیانہ چند بڑے بڑے فقہی۔ تفسیری سوال کیئے تھے حضرت قتادہ کا جواب نہ دینے کو تحقیقی طور پر تو وہ خود ہی جانتے ہیں مگر تاریخی طرز تحریر سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت قتادہ نے بطور احتیاط جلد بازی سے اجتناب کرتے ہوئے امام اعظم کے ان سوالات کا جواب نہ دیا کیونکہ جلد بازی میں ایسی طرح غلطیاں اور بے احتیاطیاں ہو جاتی ہیں جس طرح گوجرانوالے اور لاہور کے فتوے میں ہوئیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ایسے جلد باز مفتیوں کو فتوے نویسی سے روکنا چاہیئے ورنہ قوم کی گمراہی کا اندیشہ ہے۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ﷺ

کتبہ

سن عیسوی اور سن ھجری کا بیان

سوال ۴۲: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق مروجہ سن عیسوی کا آغاز (نعوذ باللہ، نقل کفر کفر نہ باشد) بقول نصاریٰ، حضرت عیسیٰ کی وفات سے ہوا۔ ایسی صورت میں ہم مسلمانوں کو اس سن پر اعتماد کرنا چاہیئے یا نہ۔ اور اپنے افعال و اعمال کا اس پر دار و مدار رکھنا چاہیئے یا کہ نہیں۔ نیز یہ سن اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ اور اسلامی تاریخوں سے بیگانگی و ناواقفیت کہاں تک جائز ہے۔ اور صرف ہجری سن مبارک کی جنتری یا کیلنڈر چھپوانا جائز ہیں یا نہیں۔

سائل:۔ محمد ادریس کشمیری بازار لاہور۔ مورخہ: ۱۷-۵-۷۳

الجواب

الحمد للہ الذی جعل اللیل والنہار واسری الشمس والقمر دائبین لحسبان۔ والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ الذی خلق لہ الارض والسموات والجنان۔ اما بعد۔

جاننا چاہیئے کہ تمام دن رات، سال، مہینے اللہ کے ہی ہیں۔ وہی جس طرح چاہتا ہے پھیرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ تلک الایام نداولہا بین الناس ۝ (ترجمہ) ہم ہی دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے ہیں۔ قانون فطرت کے مطابق زمین و آسمان میں دو قسم کے چکر ہیں۔ ان ہی دو چکروں کی بنا پر نظام کائنات کو اس صناع قدرت نے قائم فرمایا۔ ایک چکر رفتار شمسی سے متعلق ہے اور ایک چکر رفتار قمری سے۔ چاند کی رفتار سے قمری سال اور مہینے بنتے ہیں۔ سورج کی رفتار سے شمسی سال اور مہینے۔ رات دن سال مہینے قمری ہوں یا شمسی سب ہمارے رب العالمین کے ہیں۔ جب ہم مسلمان اپنے رب کے بندے تو اللہ کریم ہمارا۔ اور ہمارے رب کی چیز ہماری چیز۔ پس شمسی مہینے بھی ہمارے اور قمری بھی ہمارے۔ جس سن کو بھی مسلمان استعمال کریں بالکل جائز ہے۔ چاند و سورج کی گردش کا مقصد ہی کائنات کا حساب درست رکھنا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

الشمس والقمر بحسبان ۝ والنجم والشجر یسجدان ۝ ترجمہ: سورج اور چاند حساب کے لیے بنائے۔ اور تمام تارے اور درخت اس کو ہی سجدہ کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔ ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب ۝ (ترجمہ) وہی اللہ وہ ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا۔ اور منزلیں مقرر فرمائیں۔ تاکہ سالوں کی گنتی اور حساب کا علم لوگوں کو آجائے۔ اور حقیقت بھی ہے۔ اگر یہ گردش نہ ہوتی تو کائنات میں کسی انسان کو سال و ماہ کا حساب نہ آتا۔ ثابت ہوا۔ کہ جس طرح چاند کی تاریخیں قرآن و حدیث سے بنی ہیں۔ اسی

طرح سورج کی تاریخیں بھی رب تعالیٰ کی ہی بنائی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن کریم نے شمسی تاریخوں اور حساب کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ سورۃ کہف پارہ ۱۵ میں ارشاد ہے:۔ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ (ترجمہ) اور ٹھہرے وہ اپنے غار میں تین سو سال اور نو سال اور زیادہ رہے۔ حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ یہاں تین سو سال یعنی ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ سے مراد قمری مدت ہے اور وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ سے مراد شمسی سال ہیں۔ کیونکہ سورج کا چکر لمبا ہونے کی بنا پر شمسی سال قمری سال سے دراز ہوتا ہے۔ اصحاب کہف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت سے ہیں۔ اصحاب کہف کا یہ واقعہ جس کا ذکر قرآن کریم میں بیان ہوا۔ آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے دو سو سال پہلے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ سن شمسی بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور قمری سن بھی بالکل معتبر ہے۔ اور اس کا استعمال بالکل جائز ہے۔

پیش کردہ پہلی آیت کریمہ میں قَدَّرَهٗ کی ہٗ ضمیر مفسرین عظام کے نزدیک شمس و قمر دونوں کی طرف مرجوع ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر تفسیر ابو السعودی جلد پنجم صفحہ نمبر ۱۲۸ سورت یونس میں فرمایا وَقَدْ جُعِلَ الضَّمِيْرُ لِكُلٍّ مِنْهُمَا وَهِيَ ثَمَانِيَةٌ وَعِشْرُوْنَ ۝ (ترجمہ) اور بیشک قَدَّرَهٗ کی ضمیر کا مرجع چاند و سورج دونوں ہیں۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ سن عیسوی کو استعمال کرنا جائز ہے۔ قرآن کریم میں وَازْدَادُوْا تِسْعًا کا لفظ سن عیسوی کو ہی بیان فرما رہا ہے۔ اب اس میں اختلاف ہے کہ سن عیسوی کب سے شروع ہوا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی سے شروع ہوا۔ جس کو عیسائی اور مرزائی حضرت عیسیٰ کی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحیات ظاہری جسدی آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ مسلمانوں کے پاس عقلی و نقلی بے شمار دلائل ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے۔ آیت کریمہ میں ارشاد ہے:۔ يٰعِيْسٰى مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ۝ (ترجمہ) اے حضرت عیسیٰ میں تم کو پوری عمر عطا کروں گا۔ اور اپنی طرف تم کو اٹھانے والا ہوں۔ یہاں رَافِعُكَ میں لفظ کَ ہے جسے زندہ انسان کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی روح اور جسم دونوں۔ صرف روح کو کسی ذی عقل انسان نے آج تک لفظ کَ یا آپ جناب سے مراد نہ لیا۔ حیات مسیح کی دوسری دلیل یہ آیت ہے۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۝ (پارہ ۳ رکوع ۱۳) (ترجمہ) کلام کریں گے وہ بچپن، شیر خوارگی میں اور بڑھاپے میں۔ یہ خطاب حضرت مریم سے رب تعالیٰ نے فرمایا۔ اور حضرت مسیح کی شان بتائی۔ بڑھاپا پچاس سال کے بعد ہوتا ہے۔ حالانکہ رفع آسمانی بعمر تیس سال ہوئی۔ نصاریٰ کے علاوہ بعض مسلمان مورخین بھی اس چیز کے قائل ہیں۔ کہ یہ سن

عیسوی حضرت عیسیٰ کے رفع آسمانی سے شروع ہوئی۔ چنانچہ علم ریاضی کی مشہور کتاب تدریس ریاضی کے مصنف مسٹر معز الدین اپنی اس کتاب کے صفحہ نمبر ۲ پر ایسا ہی لکھتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے۔ کہ موجودہ عیسوی سن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پاک سے شروع ہوا۔ اکثر عیسائی مورخین اور مسلمان محققین اسی چیز کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ عیسائی لوگ اپنے بڑے دن پر ولادتِ مسیح کی خوشی مناتے ہیں۔ سائل مذکور نے جو ابتداء سنِ عیسوی کا نظریہ پیش کیا۔ کہ یہ سن بقول نصاریٰ وفاتِ مسیح سے شروع ہوا۔ بجز چند لوگوں کے کسی کے نزدیک درست نہیں۔ غالباً یہ نظریہ سائل نے تدریسِ ریاضی سے اخذ کیا ہے۔ مگر یہ محققین کے نزدیک بطور حساب بھی ٹھیک نہیں۔ صحیح تر یہ ہے کہ عیسیٰ کی پیدائش سے یہ سن شروع ہوا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا جس کو عربی میں قاموس العلوم یا مجمع العلوم کہتے ہیں۔ اس کے صفحہ نمبر ۳ پر بھی یہی لکھا ہے۔ کہ موجودہ مروجہ سن عیسوی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے شروع ہوا۔ اکثر عیسائی پادری بھی یہی کہتے سنے گئے۔ خیال رہے کہ شمسی تاریخوں کا رواج حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پندرہ سو سال پہلے مروج تھا۔ اور موجودہ شمسی مہینوں کے نام جنوری، فروری، مارچ، اپریل وغیرہ ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے مقرر ہو چکے تھے۔ اور لیپ سال کی تاریخیں ولادت عیسیٰ علیہ السلام سے چھیالیس سال پہلے وجود میں آئیں۔ موجودہ شمسی مہینوں کے نام پرانے بادشاہوں کے نام پر ہیں۔ دورِ جاہلیت میں ایک بہت بڑا خاندان سیزر نامی کے بارہ فاتحین کے نام پر بارہ شمسی مہینوں کے نام رکھے گئے۔ جولیس سیزر کے نام پر جولائی رکھا گیا۔ اگسٹس سیزر کے نام پر اگست کا مہینہ مقرر ہوا وغیرہ وغیرہ۔ جن تاریخوں میں جس کو فتح نصیب ہوئی اسی مہینے کا نام تبدیل کر کے اسی فاتح کے نام پر رکھا گیا۔ اس خاندان کا جدِّ اعلیٰ سیزر نامی ایک بادشاہ تھا۔ لیپس کا سال بنانے والا برٹس سیزر ہے۔ یہ مشہور نام تو ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے بنے۔ لیکن اس سے پہلے بھی سوائے عرب کے باقی دنیا میں شمسی تاریخوں سے حساب کتاب کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں مہینوں کے نام جنوری، فروری نہ تھے۔ بلکہ مختلف قوموں نے مختلف نام رکھے تھے۔ چنانچہ بعض نام شمسی مہینوں کے اب بھی مروّج ہیں۔ جیسے ساون، بھادوں، ماہ، پوس وغیرہ یہ بھی سورج کی تاریخوں سے چلتے ہیں۔ اور ان کی عمر آج سے چار ہزار سال پہلے کی ہے۔ ثابت ہوا کہ شمسی مہینے عیسائیت سے خاص نہیں۔ نہ ہی جنوری فروری انگریزوں کی ایجاد ہے۔ ہاں البتہ عرب علاقوں میں صرف قمری تاریخوں سے حساب کیا جاتا تھا۔ اور عربی نجومیوں کو صرف قمری حساب سے واقفیت تھی۔ شمسی تاریخوں سے ان کو کوئی دلچسپی اور علمی واقفیت نہ تھی۔ لیکن چونکہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تا قیامت تمام کائنات کی ہر قوم کی طرف نبی بن کر تشریف لائے۔ اس لیے آپ کو رب تعالیٰ نے ہر قسم کے شمسی، قمری

مہینوں کے حسابات سکھا کر بھیجا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سورۃ کہف کی وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۔ والی آیت نازل ہوئی۔ تو عرب یہودی بطور رسائل نبی کریم سے پوچھنے لگے۔ تین سو سال تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ نو سال کی زیادتی کیونکر ہوئی۔ آقائے کل دانائے سبل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شمسی حساب کے فارمولے سمجھائے اور پوری طرح رفتار شمس کی چالیں بیان فرما کر بڑے بڑے یہود منجمین و حساب دان عرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور بڑے بڑے فلسفیوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ یہ عرب کا اُمی لقب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ سب کائنات سے زیادہ حساب دان ہے۔ تب حقیقت میں لوگوں کو کہنا پڑا۔ شعر

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا

وہ راز اُس طیبہ والے نے سمجھا دیا چند اشاروں میں

دنیا کے وہ بدنصیب جو اپنی ضد اور تعصب کے بل بوتے پر کسی طور پر نبی کریم کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننے اور قرآن کریم کو کلام اللہ تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکتے تھے۔ شمسی حساب دانی کی ان ہی گتھیوں کو سلجھا کر حقانیتِ قرآن اور نبی کریم کی علمی شان ماننے پر مجبور ہو گئے۔ آج کے دور کے منکرین کو ثابت ہو چکا۔ کہ ہر قمری سو سال پر شمسی تین سال زائد ہوتے ہیں۔ اس حساب سے تین سو سال پر نو سال کی زیادتی بالکل درست ہے۔ آج کے ریاضی دان و حساب دان پر یہ تحقیق شاید کچھ اثر انداز نہ ہو۔ مگر آج سے چودہ سو سال پیچھے لوٹ کر دیکھا جائے۔ تو سرزمین ریگستان میں علم و حساب کے ایسے غنچے کھلنے ایک معجزے سے کم نہیں۔ معلوم ہوا کہ حساب قمری ہو یا شمسی سب میرے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے شجر سدا بہار سے پھوٹے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام علوم انہیں کلیوں کی چٹک انہیں پھولوں کی مہک اور اسی آقا کی بکھیر ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں ارشاد ہوا:۔ اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ۔ (ترجمہ) علم و حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ گم شدہ اس لیے کہ نبی کریم کی بکھیر ہے اور بکھیرنے پر کچھ تو مل جاتا ہے۔ کچھ گم شدہ رہتا ہے۔ جو بعد میں آنے والے راہ گزروں کو ملتا رہتا ہے۔ دنیا جہان کا قاعدہ ہے کہ ہر ذی عقل اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ پھر جہاں سے پاتا ہے، حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم رؤف و رحیم نے فرمایا:۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ۔ (جامع صغیر للسیوطی رح جلد دوم) ترجمہ اے میرے امتیو علم ڈھونڈتے رہو اگرچہ چین میں ہو۔ اس لیے کہ علم میری بکھیر ہے۔ اور تمہارے لیے بکھیر ہے۔ اب یہ قسمت کی بات ہے کہ اس کو اپنا اٹھائے یا پرایا۔ لہٰذا علم شمسی جنتری کا ہو یا قمری کا سب کچھ سیکھنا۔ جنتری، کیلنڈر بنانا بالکل جائز ہے

امام اعظم کے نزدیک سنِ شمسی بالکل معتبر ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ نمبر ۲۲۳ پر ہے۔
رَوَی الْحَسَنُ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَّہٗ تُعْتَبَرُ سَنَۃٌ شَمْسِیَّۃٌ وَهِیَ تَزِیْدُ عَلَی الْقَمَرِیَّۃِ بِاَیَّامٍ (ترجمہ) امام حسن نے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ بے شک شمسی سال بھی شریعتِ اسلامیہ میں قابلِ قبول ہے۔ اور وہ قمری سن سے چند دن زیادہ ہوتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود صحابہ کرام، خلفاء راشدین اور سابقہ سلاطین اسلامیہ اور فی زمانہ عرب ممالک نے سن ہجری ہی کو اپنایا۔ اسی پر نظام حکومت کو ترویج دیتے چلے آرہے ہیں اور کیوں؟ جنوری، فروری سے وہ بھی آشنا تھے۔ شمسی رفتاروں، تاریخوں کو وہ بھی جانتے تھے۔ دریائے علومِ ادوار کے وہ بھی شناور تھے۔ پاکستانی وہندی مسلمان کوئی زیادہ ترقی یافتہ تو نہیں۔ از منۂ سابقہ سے قطع نظر اب بھی عرب لوگ تہذیب اخلاق لین دین اور ایمان داری، تجارت، کاروبار، فراوانی دولت میں سب دنیا سے زیادہ ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سن ہجری کو ہی استعمال کیا۔ انہوں نے پاکستانیوں کی اوندھی عقل کی طرح کیوں نہ سمجھ لیا کہ سن عیسوی میں ہی ترقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم مسلم کو سبق سکھایا۔ یعنی اے مسلمانوں! تم ساری دنیا کے علوم حاصل کرو مگر وابستگی اُن ہی چیزوں سے رکھو۔ جن سے تمہارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو نسبت ہو۔ کیونکہ پناہ اپنے ہی آشیانے میں ملتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شمسی مہینے اور سال بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ مگر رسول اللہ کا پیار صحابہ کرام کی نسبت اور دین اسلام کی تمام عبادات وریاضات اسی سن ہجری سے ہی وابستہ ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے یہی بہتر ہے کہ سن ہجری کے مہینوں۔ محرام[1]، صفر[2]، ربیع الاول[3]، ربیع الآخر[4]، جمادی الاول[5]، جمادی الآخر[6]، رجب[7]، شعبان[8]، رمضان[9]، شوال[10] ذیقعد[11] اور ذی الحج[12] سے تعلقِ دنیا وآخرت قائم کرے۔ یہ قمری اور سن ہجری کے مہینوں کے نام ہیں۔ یہ اسما مشہور اگرچہ عرب میں پہلے ہی سے رائج تھے۔ اور نبی کریم کی تشریف آوری سے ایک ہزار سال پہلے ریگستان کے مختلف موسموں کی بنا پر یہ نام رکھے گئے۔ مگر موجودہ سن ہجری آقائے دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے فوراً بعد مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں رائج ہوئی۔ اور دور فاروقی سے اس پر قانونی طور پر عمل کیا گیا۔ فاروق اعظم ہی کے مشورے سے نبی کریم کی تاریخ ہجرت سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اور اس کے مہینے وہی مقرر کیے گئے، جو پہلے سے عرب دنیا میں رائج ومشہور تھے۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ یہ مہینے حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لے کر تشریف لائے۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر لگی تو محرم کی دس تاریخ تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ نوح علیہ السلام کے وقت محرم کا مہینہ رائج تھا۔ ہماری اس تمام گفتگو اور دلائل سے ثابت ہوا کہ کوئی دن کوئی مہینہ کسی نام سے یا کسی موسم اور سیارے سے منسلک سب ہی اسلام میں معتبر ہیں۔ وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔

لیلیٰ مجنوں کے تاریخی حالات

سوال نمبر ۲۳ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مجنوں کون تھا۔ لیلیٰ مجنوں کے قصے میں جو مجنون قیس بن عامر مشہور ہے۔ کیا اس کو رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز ہے۔ اور کیا اس کی ملاقات امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی۔ براہِ کرم وضاحت فرمائیں :۔

دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ بواسیر کے چھلے جو تانبے یا لوہے کے بنے ہوتے ہیں۔ اور بیماری کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ مسلمان مرد و عورت کو جائز ہے یا نہیں ؟ ایسے ہی جرمن کے بنے ہوئے ہیلتھی رنگ جو بہت سی جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ تانبے یا پیتل کے بنے ہوئے مسلمان مرد اور عورت کو پہننے جائز ہیں یا نہیں ؟ بَیِّنُوْا وَ تُوْجَرُوْا ھ

السائل :۔ حضرت قبلہ علامہ ابوالعلا محمد عبداللہ صاحب قادری اشرفی ناظم دارالعلوم جامعہ حنفیہ قصور ضلع لاہور۔ مورخہ : ۲۰-۱۲-۱۹۶۸

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَهَّابْ

الجواب

قبلہ علامہ صاحب وعلیکم السلام ثم السلام علیکم۔ استفتاء گرامی تشریف لایا حضرت حکیم الامت حج کے ارادے سے ویزا لگوانے کے لیے علامہ شاہ احمد نورانی صاحب مدظلہ کی دعوت پر کراچی تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت قبلہ کے اونچے اسباق بھی اور صبح کا درس قرآن و حدیث طیبین بھی میرے سپرد ہو گئے۔ دارالافتاء کا کام بھی میری ذمہ داریوں میں شامل۔ بحمد اللہ تعالیٰ ان سے روزمرہ فراغت پاکر کتب خانے کا کام بھی سرانجام دیتا ہوں۔ عجب فرحت انگیز ذکر اللہ و ذکر رسول میں ایام حیات کو مراد دل آویزی نصیب ہے۔ کیا شان ہے مجالس درس و محافل تدریس کی اس لذتِ جنون کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو بادۂ عشق میسر ہو۔ تفکراتِ دنیا کی عقل بابنوں سے اکتا کر جب کوئی ذی عقل و خرد ہم جیسے مجنون کی محافلِ یگانہ کی جھلک ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔ تو کنجِ اطمینانی و سکون قلبی کے ان گوشوں سے سرشار ہو کر سربسجود و دست بدعا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ملتجی بارگاہ ہوتا ہے کہ۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

حسبِ سابق اسی جنون میں صبح سے لذتِ علم و تفقہ حاصل کر رہا تھا کہ آپ کا استفتاءِ مجنون بدستِ غیر میسر ہوا۔ پس اسی حالت جنون میں حالاتِ مجنون کی طرف متوجہ ہوا۔ جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور

اور کانوں نے سنا۔ وہی ذہن میں سمایا۔ اور ذہن نے جو عطا کیا۔ وہی آپ کی خدمت میں قلمِ موشگاف نے پیش کیا۔ لہٰذا جوابِ سوال اس طرح ہے۔ کہ مجنون کے بارے میں ہمارے مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض تاریخی دنیا میں قدم رکھنے والوں نے تو سرے سے مجنون کے وجود کا انکار ہی کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔ اس کے سب قصے عشق کے مثل الف لیلیٰ بناوٹی اور شاعرانہ خیالات و تصورات کی آماجگاہ ہے ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ چنانچہ کتاب الاغانی جلد دوم صفحہ نمبر ۳ پر ہے۔ اَخْبَرَنِیْ ھَاشِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا الرِّیَاشِیُّ قَالَ سَمِعْتُ الْاَصْمَعِیَّ یَقُوْلُ رَجُلَانِ مَا عُرِفَا فِی الدُّنْیَا قَطُّ اِلَّا بِالْاِسْمِ اَحَدُھُمَا مَجْنُوْنٌ وَثَانِیْھُمَا ابْنُ الْقِرِّیَّۃِ اِنَّمَا وَضَعَھُمَا الرُّوَاۃُ۔ ترجمہ مجھ کو ہاشم بن محمد نے خبر دی۔ اس نے کہا ہم کو ریاشی نے بات بتائی۔ اس نے کہا۔ میں نے اصمعی سے سنا۔ وہ کہتا تھا۔ کہ دو مرد دنیا میں فقط نام کے مشہور رہیں۔ ان میں ایک مجنوں دوسرا ابن قریہ۔ یہ دونوں نام صرف ناول نویسوں کے خود ساختہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان کا وجود دنیا میں کبھی نہ تھا۔ اسی طرح آج کل ہیر رانجھا، سسی پنوں، سیف الملوک وغیرہ کے بھی حقیقت کے منکر ہیں۔ مگر میں بلا تحقیق کسی چیز کے انکار کے خلاف ہوں۔ یہ کام کسل مندوں کا ہے۔

محقق حضرات مجنون کے وجود اور حقیقت کے قائل ہیں۔ ہاں زمانۂ وجود میں اختلاف ہے۔ چنانچہ سنایا مجھ کو مولانا میارک محی الدین صاحب خطیب جامع مسجد بیگم پورہ گجرات نے۔ ان کو سنایا جناب صاحبزادہ پیر غلام محی الدین ابن حضرت اعلیٰ پیر سید مہر علی شاہ صاحب نے۔ ان کو فرمایا حضرت اعلیٰ پیر مہر علی شاہ صاحب قبلہ مدّ فیوضہم نے۔ کہ مجنون عاشقِ لیلیٰ حضرت امام حسنؓ بن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رضاعی بھائی تھا۔ اور امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہی اس کا نام مجنون رکھا تھا۔ اس روایت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مجنون کی ولادت قرنِ ثانیہ میں ہو۔ اور زیارت امام حسن سے تابعی یا تبع تابعی کا درجہ حاصل ہو۔ مگر مجھ کو اس روایت کی تواریخ سے تحقیق نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے یہ درست ہو۔ اس لیے کہ محقق اسلام قطب وقت پیر مہر علی شاہ صاحب کی طرف منسوب ہے ایک تحقیق یہ ہے کہ مجنوں جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہم زمانہ تھا۔ اور وہ زمانہ دورِ خلافت عبّاسیہ کا ہے۔ ابو الکلام آزاد نے اپنی کتاب (منصور اور مجنون) کے صفحہ نمبر ۲۵ پر مجنوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ لکھا ہے۔ اگر اس قول کو صحیح تسلیم کیا جائے تو مجنون کا زمانہ تبع تابعین کے بھی بعد آتا ہے۔ کیونکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ تیسری صدی ہجری میں ہے۔ آپ کی وفات شریف ۲۹۸ھ میں ہے۔ اور تبع تابعین کا زمانہ بعد میں آتا ہے کیونکہ

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ تیسری صدی ہجری میں ہے۔ آپ کی وفات شریف ۲۹۸ھ میں ہے اور تبع تابعین کا زمانہ ۲۲۰ھ تک ہے۔ اور تابعین کا زمانہ ۱۶۲ھ تک ہے۔ ان کڑیوں کو جوڑنے سے مجنون کا زمانہ تبع تابعین کے بعد ثابت ہوتا ہے۔ بعض مورخین نے لکھا کہ یہ مروان بن حکم کے زمانے میں پیدا ہوا۔ فارسی ادب کی کتاب (شعر و ادب) کے آخری صفحات پر مجنون کا وفات نامہ لکھا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۲۹۲ھ میں ہوئی۔ جس سے اس کا زمانہ اور پیچھے آجاتا ہے۔ اس کے زمانۂ حیات کی طرح اس کے سلسلۂ نسب میں بھی دو قول ہیں۔ بعض مؤرخین نے لکھا کہ یہ مجنون قیس بن خطیر ہے۔ مگر صحیح تر یہ ہے کہ مجنوں کا اصل نام قیس ہے۔ اور اس کے والد کا نام ملوح بن مزاحم یمنی تھا۔ بہت خوبصورت دراز قد کا تھا۔

اس کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔ قیس بن ملوح بن مزاحم بن عرس بن ربیعہ بن جعدہ بن عامر بن صعصعہ یمن کے مشہور قبیلے بنی عامر میں پیدا ہوا۔ اس کی جائے ولادت یمن کا ایک قریہ ریحان ہے چنانچہ ایسا ہی کتاب الاغانی جلد نمبر دوم صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے۔ عرب کے شاعروں کی طرح یہ بھی ایک عاشق مزاج شاعر تھا۔ بیماریِ عشق میں زمانۂ امردی سے مبتلا تھا۔ مگر چھوٹے عاشقوں کی طرح ہر در کا بھکاری نہ تھا بلکہ عاشق صادق تھا۔ اس لیے ایک ہی در سے وابستہ تھا۔ جہاں بھی ہوتا صدا اپنے ہی محبوب کی تھی عشق حقیقی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ عاشق صادق جس در پر بھی جائے۔ طلب اپنے ہی معشوق کی ہو۔ بلکہ عاشق کا دروازوں پر پھرنا ہی تلاشِ محبوب کے لیے ہو۔ آنکھیں اگرچہ کائنات کو دیکھیں۔ مگر قلبی تصورات اُسی سے متعلق ہوں۔ مصرع تیرا ہی تصور رہے محفل ہو کہ تنہائی

قیس بن ملوح کا مطمع عشق فقط لیلیٰ بنت مہدی تھی۔ یہ ہی مجنون کی معشوقہ تھی۔ لیلیٰ بنت مہدی بھی قبیلہ بنی عامر سے تھی۔ مگر وطن ولادت نجد تھا۔ مجنون کے مرنے کے بعد اس کا نکاح بنی ثقیف قبیلے کے ایک اور مرد سے ہوا جس کے نطفے سے لیلیٰ کا لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام مالک رکھا گیا۔ اس بنا پر لیلیٰ کی کنیت اُمِ مالک ہوئی۔ بعض شعراء میں یہ مشہور ہے کہ لیلیٰ مجنوں بچپن میں ایک مکتب میں پڑھتے تھے۔ وہیں سے یہ قیس لیلیٰ کا عاشق ہوا۔ پھر عشق بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہوا جو دنیا نے دیکھا۔ مگر یہ بات میری تحقیق سے باہر ہے۔

صحیح یہ ہے کہ عشقِ مجنوں کی ابتداء بلوغت سے ہوئی اور جب یہ لیلیٰ کا عاشق ہوا تو اس نے نماز روزہ وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ اور مجنونانہ کیفیات سے دربدر پھرنے لگا۔ چھوٹے بڑے پاگل دیوانہ سمجھ کر اس کو ستاتے۔ یہ خاموش رہتا۔ بجز لیلیٰ کے ذکر کے کسی کے ذکر سے اس کی زبان نہ کھلتی چنانچہ

کتاب الاغانی جلد دوم صفحہ نمبر ۱۶ پر ہے۔ فَاِذَا ذُکِرَتْ لَہٗ لَیْلٰی اَنْشَاءَ یُحَدِّثُ عَنْھَا عَاقِلًا وَّلَا یُخْطِیُٔ حَرْفًا۔ وَتَرَکَ الصَّلٰوۃَ، فَاِذَا قِیْلَ لَہٗ مَالَکَ لَا تُصَلِّیْ۔ فَلَمْ یَرُدَّ حَرْفًا وَکُنَّا نَحْبِسُہٗ وَنُقَیِّدُہٗ فَیَعُضُّ لِسَانَہٗ وَشَفَتَہٗ۔ حَتّٰی خَشِیْنَا عَلَیْہِ۔ فَخَلَّیْنَا سَبِیْلَہٗ ۔ (ترجمہ)

پس جب ذکر کیا جاتا اس کے سامنے لیلیٰ کا تو وہ بالکل سمجھداری کی باتیں لیلیٰ کے متعلق کرنے لگتا ایک حرف کی بھی غلطی نہ کرتا۔ اور نماز وغیرہ تو چھوڑ ہی چکا تھا۔ تو جب اس سے کہا جاتا کہ تیرا کیا حال ہے تو نماز نہیں پڑھتا تو بالکل خاموش ہو رہتا۔ کبھی کبھی ہم لڑکے اس کا راستہ روک لیتے اور اس کو گھر میں قید کر دیتے تھے۔ تو وہ اپنی زبان کاٹتا ہونٹ کاٹتا۔ یہاں تک کہ ہم اسی کے درد تکلیف اور خون نکلنے کے خیال سے ڈر جاتے۔ تو اس کا راستہ چھوڑ دیتے۔ قیس ایک مسلمان شاعر تھا۔ عشق لیلیٰ سے پہلے یا ظہور سے پہلے اپنے باپ ملوّح بن مزاحم کے ساتھ جا کر حج کیا۔ عشق لیلیٰ کی بناء پر لوگوں نے اس کا نام مجنون رکھ دیا۔ بعد میں اس نے خود اپنا تخلص مجنون رکھ لیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے۔ کہ یہ بچپن سے ہی عاشق ہو گیا تھا۔ اظہار عشق بعد بلوغت ہوا۔ خود اپنے ایک شعر میں کہتا ہے۔ شعر

اِنِّیْ لَمَجْنُوْنٌ بِلَیْلٰی مُؤَکَّلٌ
وَلَسْتُ عَزُوْفًا عَنْ ھَوَاھَا وَلَا جَلْدًا

بیشک میں ہی مجنون ہوں۔ لیلیٰ کے سپرد کیا ہوا۔ اور اپنی لیلیٰ کے عشق میں نہ میں جلد بازی کرنے والا ہوں نہ گھبرانے والا۔ اسکے تمام اشعار ذکر لیلیٰ ہی سے پر ہیں۔ عربی علاقوں میں دیوان قیس عام پڑھا جاتا ہے۔ یہ شعر کتاب الاغانی نے وہیں سے نقل کیا۔ جب کثرتِ جنون ہوا تو بستی کو چھوڑ کر وادیِ قری میں جبلِ نعمان کے پاس گوشۂ خلوت اختیار کیا۔ جغرافیائی اعتبار سے جبلِ نعمان نجد اور یمن کے درمیان دو پہاڑ ہیں۔ حضرت حکیم الامت نے یہ مقام دیکھا ہے۔ یہاں یاد صبا کا رخ نجد کی طرف ہے۔ قیس کے والد ملوّح نے دو مرتبہ لیلیٰ کے باپ کو پیغام نکاح بھیجا۔ مگر مہدی نے اس غصے کی بناء پر کہ قیس نے میری بیٹی کو گلی گلی بدنام کر دیا۔ نکاح سے انکار کر دیا۔ مجنون نے زندگی کے آخری دن یہیں گزارے اور اسی ریگستانی علاقے میں فوت ہوا۔ قبیلے والوں کو پتہ لگا تو سب کو کفِ افسوس کے سوا کیا ہوتا البتہ لیلیٰ کا والد روتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ میں ہی اس کی اس حالت کا ذمے دار مجرم ہوں۔ مجنون بہت خوبصورت عربی النسل تھا۔ اور لیلیٰ سیاہی مائل گندمی رنگ کی تھی۔ غالباً اسی مناسبت سے اس کا نام لیلیٰ یعنی رات رکھا گیا۔ بہرحال اس کا وجود برحق ہے۔ مثنوی شریف میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۳۴۷ میں ہے۔ کہ قیس عاشقِ لیلیٰ کا نام ہے۔ مگر چونکہ وہ مجنون فی الدنیا ہے

نہ کہ مجذوب فی الآخرت۔ اس لیے اولیاء اللہ میں۔ مگر اس کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا رحمۃ اللہ علیہ کے لقب متبرکہ سے اس کو نہیں نوازا جا سکتا۔ کیونکہ جس طرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب صحابہ کرام زنابعین و تبع تابعین سے خاص رہنا بہتر ہے۔ کہ امتیازی شان ظاہر ہو۔ اسی طرح رحمۃ اللہ علیہ اولیاء علماء سے خاص ہے۔ چنانچہ نووی شرح مسلم جلد اول مقدمہ صفحہ نمبر ۱۸ پر ہے۔ وَکَذٰلِكَ یَتَرَضّٰی وَیَتَرَحَّمُ عَلٰی سَائِرِ الْعُلَمَاءِ وَالْاَخْیَارِ (ترجمہ) اور اسی طرح رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ علیہ تمام علماء اور بزرگانِ دین پر بولا جائے۔ ورِ مختار جلد پنجم صفحہ نمبر ۶۵۹ پر ہے۔ وَیُسْتَحَبُّ التَّرَضِّیْ لِلصَّحَابَۃِ وَالتَّرَحُّمُ لِلتَّابِعِیْنَ وَمَنْ بَعْدَھُمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَالْعِبَادِ وَسَائِرِ الْاَخْیَارِ وَکَذَا یَجُوْزُ عَکْسُہٗ ۔

ترجمہ:۔ مستحب یہ ہے کہ رَضِیَ اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب صرف صحابہ کرام کو دیا جائے اور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا لقب تابعین کرام اور بعد والے علماء اسلام متقی بندوں اور تمام دینی بزرگوں کیلئے استعمال کیا جائے۔ اِن عباراتِ بالا داعلیٰ و ادلیٰ سے ثابت ہوا کہ یہ باوقار القاب صرف علماءِ امت، اور اولیاءِ ملّت کے لیے کہے جا سکتے ہیں۔ دینی لحاظ سے غیر مشہور اشخاص کے لیے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے الفاظ استعمال کرنا جائز نہیں۔ ایسے ہی فاسق شرعی مسلمان کے لیے بھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لفظ نہیں استعمال کیے جا سکتے۔ اگرچہ معاشرہ کے لحاظ سے اس کا کتنا ہی اونچا مقام ہو جائے۔ بعض داڑھی منڈانے والے لوگ اصلاحِ معاشرہ یا خدمت خلق یا پیری مریدی کی بنا پر مسلمانوں میں اچھا مقام رکھتے ہیں۔ شرعاً اخلاقی طور پر ان کا احترام ٹھیک ہے۔ مگر رحمۃ اللہ تعالیٰ کا لقب ان کے لیے استعمال کرنا گناہ ہے۔ اور استعمال کرنے والا شرعی مجرم گناہ گار ہے۔

دوسرے سوال کا بالتفصیل جواب تو پہلے گھڑی کی چین والے فتوے میں دیا گیا ہے وہاں مطالعہ کرو۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اگر طبیب حاذق یہ کہہ دے کہ اس بیماری کا علاج ہیلیتھی رنگ کے سواء کسی اور چیز سے نہیں ہو سکتا۔ یا بواسیری چھلے کے بغیر ممکن نہیں اور یا اس بیمار نے بہت علاج کرائے مگر شفا نہ ہوئی۔ تب بطور تجربہ و علاج، پنیل، تانبے کا چھلّہ اور ہیلیتھی رنگ پہننا جائز ہے ورنہ نہیں۔ ہمارے علاقے کے مشہور پیر طریقت حضرت قبلہ سید ملنگ شاہ صاحب جن کا اب وصال مبارک ہو چکا ہے۔ ان کا مزار مقدس ان کے آبائی وطن قریہ سوق کلاں متصل گجرات مرجع عوام ہے۔ ان کے ایک فرزند سید پیر صفدر شاہ صاحب نے از اوّل تا آخر مجھ سے ہی دینی علوم حاصل کیے ہیں۔ اس وقت مسند آرائے سوق کلاں ہیں۔ ان ہی سید ملنگ شاہ صاحب

نے مجھے فرمایا کہ بہشتی رنگ کے جواز کے بارے میں قبلہ ابوالبرکات سید احمد صاحب امیر حزب الاحناف لاہور دامت برکاتہم العالیہ نے بھی ارشاد فرمایا کہ حکیم حاذق کا حکم ضروری ہے۔ اور قانون شریعت کے مطابق حکیم حاذق وہ ہے۔ جو متقی مسلمان حرام، حلال کی اہمیّت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مسائلِ دینیہ سے بھی کچھ کچھ واقفیت رکھتا ہو۔ اور اپنی طب میں یا حکمت یا ڈاکٹری میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ چنانچہ فتاویٰ شامی جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۹۸ پر ہے۔ يَجُوْزُ لِلْعَلِيْلِ التَّدَاوِىْ اِذَا اَخْبَرَهُ طَبِيْبٌ مُسْلِمٌ اَنَّ فِيْهِ شِفَاءً وَّلَمْ يَجِدْ مِنَ الْمُبَاحِ مَا يَقُوْمُ مَقَامَهُ ؕ

ترجمہ:- بیمار کے لیے حرام چیز سے علاج کرنا اُس وقت جائز ہے جب مسلمان لائق حکیم یا ڈاکٹر خبر دے کہ اس چیز میں شفا ہے اور اس کے علاوہ کوئی حلال دوائی دستیاب نہ ہوتی ہو۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ط

کتبـــــــــہ

سوال نمبر ۴۴

کِتَابُ الْفَرَائِض

علم میراث

میراث بانٹنے کا شرعی اسلامی طریقہ

تصنیف لطیف

پیر طریقت حضرت حکیم الامّت مفتی احمد یار خاں صاحب قادری۔

نعیمی۔ بدایونی رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علم المیراث — حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اُولِی الصِّدْقِ وَالصَّفَاءِ اَمَّا بَعْدُ پس جاننا چاہیے کہ علوم دینیہ میں علم میراث نہایت اہم اور ضروری علم ہے۔ کیونکہ سارے دینی و دنیاوی علوم کا تعلق انسان کی زندگی سے ہے۔ لیکن علم فرائض یعنی میراث کا تعلق انسان کی موت سے ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں اسے آدھا علم فرمایا گیا۔ یعنی سارے علوم علم کا ایک حصہ ہیں اور تنہا فرائض دوسرا حصہ۔ اسی علم سے میت کے وارثوں میں عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ساری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دے، مگر اپنے وارثوں پر ظلم کر کے مرے۔ کہ بعض کو ظلماً نقصان پہنچا دے۔ تو اس کی عبادات و ریاضات بیکار ہے۔ حدیث: حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ میری والدہ نے میرے والد سے عرض کیا۔ کہ اپنا فلاں باغ میرے بچے نعمان کو ہبہ کر دو۔ اور اس پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی قائم کر لو۔ چنانچہ میرے والد مجھے بارگاہِ نبوی شریف میں لائے۔ اور عرض کرنے لگے۔ کہ میں فلاں باغ اپنے اس بیٹے نعمان کو دیتا ہوں۔ حضور گواہ رہیں۔ فرمایا کہ کیا تمہارے اور بھی فرزند ہیں۔ عرض کیا۔ ہاں۔ فرمایا۔ کیا ان سب کو اتنا اتنا ہی مال دیا ہے۔ عرض کیا۔ نہیں نعمان کو دیتا ہوں۔ فرمایا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ جب تم چاہتے ہو۔ کہ تمہاری ساری اولاد تمہاری خدمت کرے۔ تو تم بھی ساری اولاد میں انصاف سے کام لو۔ نیز حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ قیامت کے قریب علم فرائض ایسا اٹھ جاوے گا۔ کہ دو مسلمان میراث کا مسئلہ لئے پھریں گے۔ کوئی حل کرنے والا نہ ملے گا۔

قرآن کریم نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تو اجمالی طور پر بیان کئے مگر میراث کے مسائل بہت تفصیل سے ارشاد فرمائے۔ جس سے اس فن کی اہمیت کا پتہ لگا۔ موجودہ مسلمان جہاں دیگر دینی باتوں سے بے پرواہ ہو گئے۔ تقسیم میراث سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ آج کل عالم پڑھے لکھے لوگ بھی علم اوقات اور علم میراث سے بے خبر ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عام مسلمان نہ نماز کے وقتوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ نہ میراث کی صحیح تقسیم کی۔ بعض جگہ تو مسلمانوں نے میراث میں اسلامی قانون چھوڑ کر رسمی کفر کا قانون قبول کر لیا۔ جس سے ان کی لڑکیاں میراث سے محروم ہو گئیں۔ گویا معاذ اللہ یہ لوگ جیتے جی تو مسلمان ہیں۔ مگر مرتے ہی بے ایمان۔ یقیناً یہ جرم قابلِ معافی نہیں۔ حقوق اللہ تو۔ توبہ وغیرہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ مگر حقوق العباد زبانی توبہ سے معاف نہیں۔ میراث تمام وارثوں کا حق ہے۔ اگر

اس میں کمی بیشی کر کے کسی کی حق تلفی کی گئی۔ تو اس کی معافی توبہ سے بھی نہ ہوگی۔ مسلمانوں تم بیٹوں کی ناجائز محبت میں اپنی آخرت کیوں برباد کرتے ہو۔ نہ بیٹے تمہیں جنت دیں گے۔ نہ لڑکیاں تمہیں دوزخ میں دھکا دیں گی۔ دونوں تمہارے لخت جگر ہیں ان سب کو وہ حق دو جو اللہ تعالیٰ نے مقررہ فرمایا ہے۔ اس میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ یہ حالات دیکھتے ہوئے ۱۳۵۳ھ میں جب کہ میں مدرسہ مسکینیہ دھوراجی کاٹھیاواڑ میں مدرس تھا۔ علم فرائض میں یہ رسالہ لکھا۔ جس کا ترجمہ گجراتی زبان میں شائع ہوا۔ پھر اسی کا دوسرا ایڈیشن اردو زبان میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہوگیا۔ اب جب کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے سے مسلمانوں کو حکومتِ اسلامیہ یعنی دولتِ خداداد پاکستان عطا فرمائی۔ (خدا اسے دائم قائم رکھے) تو اس میں میراث کا اسلامی قانون نافذ ہوا جس سے عام مسلمانوں کو عموماً اور وکلاء و حکام کو خصوصاً میراث کے مسائل سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور میراث کے مسائل بہت آنے لگے۔ ساتھ ہی اس کتاب کی مانگ بھی بڑھ گئی۔ تب حضرت مخدوم سید شاہ محمد معصوم صاحب قادری نوری دام فیوضہم نے اس رسالہ کو تیسری بار چھاپنے کا حکم دیا۔ ان کے ارشاد کے مطابق رسالہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ رب تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے سے اسے قبول فرمائے اور میرے لئے توشۂ آخرت و صدقہ جاریہ بنائے۔ اس رسالہ میں سراجی و شریفیہ سے مسائل لئے گئے اور کہیں کہیں ردالمحتار وغیرہ فقہ کی معتبر کتابوں سے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ زبان نہایت سہل اور عبارت خوب واضح رہے۔ اور ہر مسئلہ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ مگر چونکہ فن ہے۔ اس لئے ناظرین کو چاہیئے کہ بار بار بغور اس کا مطالعہ کریں۔ اگر کوئی قانون یا مسئلہ سمجھ میں نہ آوے۔ تو کسی فرائض جاننے والے عالم سے حل کر لیں۔ جو کوئی اس رسالہ سے فائدہ اٹھائے مجھ فقیر بے نوا کے لئے دعاءِ حسنِ خاتمہ کرے۔ رب تعالیٰ اسلام کا بول بالا کرے۔ مسلمانوں کو اپنی اطاعت کی توفیق بخشے اور مجھ بندۂ مسکین گنہگار کو شدتِ نزع وحشتِ قبر، دہشتِ حشر سے امن میں رکھے۔ آمین آمین یا رب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ و نور عرشہٖ سیدنا محمد و آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ؛؛

احمد یار خاں نعیمی اشرفی بدایونی وارد حال گجرات پاکستان ۸ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ یوم دوشنبہ مبارکہ۔

مالِ میت کے مصارف

جو مسلمان مر جاتا ہے۔ تو شرعاً اس کے مال[1] میں چار حق ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اُس کے مال سے اس کے کفن[2] دفن میں خرچ کیا جاوے گا۔ اس طرح کہ نہ اس میں زیادتی کی جاوے گی۔ نہ کمی نہ زیادتی مثلاً جتنا کفن سنّت تھا[3] اُس سے زیادہ کپڑے دے دے۔ یا اتنا قیمتی کفن دے۔ جس کو مرنے والا اپنی زندگی میں کسی وقت نہ پہنتا تھا۔ اور کمی یہ کہ جتنے کپڑے کفن میں سنّت ہیں۔ اُس سے کم دیئے جاویں۔ مثلاً مرد کو دو کپڑے یا عورت کو چار کپڑے دے۔ کہ یہ سُنت سے کم ہے۔ یا ایسی کم قیمت کا کپڑا کفن میں دیا جاوے۔ جو یہ مرنے والا اپنی زندگی میں نہ پہنتا تھا۔ کفن دفن سے جو مال بچے۔ اُس سے مرنے والے پر جو کسی کا قرضہ ہو۔ وُہ ادا کیا جائے۔ قرض ادا کرنے کے بعد جو مال بچا۔ اُس کے تہائی حصّہ سے میّت کی وصیّتیں پُوری کی جائیں۔ اگر اُس نے وصیّت کی ہو۔ وصیّت کے پُورا کرنے کے بعد جو مال بچے اُس کو مرنے والے کے وارثوں پر شریعت اسلامیہ کے مطابق تقسیم کیا جاوے۔

وارثوں پر مال تقسیم کرنے کی ترتیب[5]

میّت کا جو مال اُوپر ذکر کی ہوئی چیزوں سے بچے اُس ترتیب سے وارثوں پر تقسیم کیا جاوے کہ سب سے پہلے ذی فرض لوگوں کو اُن کے حصّہ شرعی کی برابر دیا جاوے۔ ذی فرض وُہ وارث ہے جس کا

---

[1] یہ چار باتیں جو بیان کی گئی ہیں۔ میّت کے اپنے مال میں جاری ہوں گی۔ اگر کسی دوسرے کا مال میّت کے پاس امانت یا گرو رکھا ہے۔ یا کوئی مکان میّت کے پاس کرایہ پر تھا۔ تو یہ چیز مالک کو واپس کر دی جاویں گی کیونکہ یہ میّت کا مال نہیں۔ تاکہ اُس میں یہ کام کئے جاویں۔ ردّ المحتار۔ منہ

[2] کفن میں بہتر یہ ہے کہ ایسے کپڑے کا دیا جاوے۔ جیسے کپڑے پہن کر مرنے والا اپنے دوست احباب سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کہ یہ کفن درمیانی ہے شریفیہ منہ [3] کفن سنّت مرد کے لئے تین کپڑے اور عورت کے لئے پانچ کپڑے ہیں۔ ۱ کرتہ ۲ تہبند ۳ لفافہ یعنی بڑی چادر یہ مشترک ہیں۔ مرد و عورت دونوں کے لیے ۴ دوپٹہ ۵ سینہ بند۔ یہ صرف عورت کے لیے [5] وارثوں پر مال تقسیم کرنے کی ترتیب کا حاشیہ صفحہ نمبر پر ہے۔

حصّہ قرآن شریف میں مقرر کر دیا گیا ہے۔ وُہ بارہ شخص ہیں۔ ۴ مرد اور آٹھ عورتیں جن کا پُورا پُورا ذکر آگے آتا ہے۔

ذی فرض سے جو بچے وُہ نسب والے عصبہ کو دیا جاوے۔ نسب والے عصبہ میّت کے کُنبہ کے وہ لوگ ہیں جن کا حصّہ قرآن شریف میں مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ وُہ ذی فرض سے بچا ہُوا مال لیتے ہیں۔ اور اگر ذی فرض نہ ہوں تو پُورے مال کے وارث بنتے ہیں۔ اُن کا ذکر بھی آگے آوے گا؛

اگر نسب والے عصبہ نہ ہوں تو سببی کو مال دیا جاوے۔ سببی عصبہ آزاد کرنے والے مالک یا آزاد شُدہ غلام کو کہتے ہیں۔ مثلاً ایک آزاد کیا ہوا غلام مرا۔ اس کا عصبہ نسبی کوئی نہیں۔ اور اس کے پاس مال ہے۔ تو اس کا آزاد کرنے والا مولا اس مال کو لے گا!

ف پھر آزاد کرنے والے کے عصبہ اسی ترتیب سے جو اُوپر گزری۔ یعنی اوّل تو مالک کے نسبی عصبہ اُور اگر یہ نہ ہوں۔ تو اس مالک کے سببی عصبہ مگر اس صُورت میں مالک کے اُن عصبات کو ملے گا۔ جو مرد کی قسم سے ہوں۔ عصبہ عورتوں کو نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر مالک مرے۔ تو یہ آزاد شُدہ غلام اس کے ترکہ کا وارث ہوگا؛

صٓ ۵۔ پھر اگر میّت کے دونوں قسم کے عصبات نہ ہوں۔ تو ذی فرض لوگوں پر ہی بچا ہُوا مال دوبارہ تقسیم کر دیا جاوے۔ اور جتنا جتنا انہیں پہلے ملا تھا۔ اسی حساب سے اب بچا ہُوا۔ مال ان پر دوبارہ تقسیم کر دیا جاوے گا۔ اس کا پُورا بیان آگے آوے گا؛

صٓ ۶! پھر اگر میّت کے ذی فرض وارث بھی نہ ہوں۔ تو اس شخص کو میّت کا مال دیا جاوے گا۔ جو میّت کا رشتہ دار تو ہو۔ مگر ذی فرض یا عصبہ نہ ہو۔ اس کا نام ذی رحم ہے۔ اس کی جمع ذوی الارحام اس کا ذکر بھی انشاء اللہ آگے آوے گا!

---

۴ رحاشیہ از سابقہ صفحہ بقیہ: میّت کے مال کا ورثہ اس کے مرنے کے بعد وارثوں کو ملتا ہے۔ میّت کے مرنے سے پہلے کوئی اس کے مال کا وارث نہیں۔ بلکہ وہ خود مالک ہے۔ کہ اپنی زندگی اور تندرستی میں جس کو جتنا چاہے دے۔ ہاں واجب یہ ہے۔ کہ زندگی میں اگر اپنے وارثوں کو مال تقسیم کرے۔ تو اُن کے حق نہ مارے۔ اگر کسی وارث کو نقصان پہنچانے کے لئے ایسا کیا۔ تو بہت گناہگار رہوا۔ واللہ اعلم۔ ردّ المختار کتاب الوقف۔ منہ!

ف ۵! اس بیان میں جتنی چیزیں ۴ ذکر کی جاویں گی۔ اُن میں بعض آج کل ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے غلام یا آزاد کرنے والا۔ یا بیت المال۔ لیکن بحث کی تکمیل کے لئے وُہ بھی لکھ دی گئیں۔ ۱۲!

ے پھر اگر یہ بھی نہ ہوں تو میّت کا مال مولیٰ موالات لے گا۔ مولیٰ موالات وُہ شخص ہے۔ جس سے میّت نے اپنی زندگی میں وعدہ کر لیا تھا۔ کہ اگر پہلے میں مروں تو میرا مال تو لینا۔ اور اگر پہلے تو مرے تو تیرا مال میں لوں گا۔

۸ : پھر اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو وہ شخص مال کا وارث ہوگا۔ جس کے نسب کا مرنے والے نے اپنے مورث سے دعویٰ کیا تھا۔ مثلاً کہا تھا۔ کہ یہ میرا بھائی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ میّت کا بھائی وُہ ہی ہوگا۔ جو میّت کے باپ کا بیٹا ہو۔ گویا میّت اُسے اپنا بھائی کہہ کر اپنے باپ سے اس کا نسب ثابت کر چکا ہے۔ لیکن دوسری طرف سے اس شخص کا یہ رشتہ اس مرنے والے سے ثابت نہ ہو۔ یعنی نہ تو خود اس مُورث نے کہا۔ کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اور نہ کسی دوسرے شخص نے اس کی گواہی دی۔ اس کو عربی میں مُقَرٌّ لَہٗ بِالنَّسَبِ عَلَی الْغَیْرِ کہتے ہیں۔

۹ ! اگر یہ بھی موجود نہ ہو تو اُس شخص کو مال ملے گا۔ جس کو میّت نے تہائی مال سے زیادہ کی وصیّت کی ہو۔ اگر میّت کے وارث لوگ موجود ہیں۔ تو تہائی مال سے زیادہ کی وصیّت جائزہ نہیں۔ اگر میّت نے زیادہ وصیّت کر بھی دی۔ تو تہائی مال سے ہی جاری کی جاوے گی۔ اسی طرح جو شخص وارث ہونا ہو۔ اس کے لئے بھی وصیّت جائز نہیں۔ اگر کر دی۔ تو قبول نہیں ہاں اگر دوسرے وارث مان جاویں۔ تو جائز ہے۔

۱۰ پھر اگر یہ بھی نہ ہو تو بیت المال میں مال رکھا جاوے۔ کہ تمام مسلمانوں کے کام آوے۔ لیکن علامہ شامی نے فرمایا کہ چونکہ اب بیت المال ظالموں کے قبضے میں ہیں کہ وہاں کے مال صحیح مصرف شرعی طریقہ

لے اگر کوئی وارث ذی فرض اور عصبہ اور ذی رحم نہ ہو۔ تو اس شخص کو میّت کا سارا مال ملے گا۔ ہاں اگر خاوند مرا اور اس کا بیوی کے سوا کوئی اور وارث نہیں یا عورت مری اور اس کے خاوند کے سوا کوئی نہیں تو اس خاوند یا بیوی کے حصّہ کے بعد جو بچے اس شخص کو دیا جاوے گا۔ درمختار منہ۔

جس قتل سے قصاص واجب ہوتا ہے۔ وہ قتل ہے جو ایسے دھار والے ہتھیار سے جان بُوجھ کر قتل کیا جاوے جس سے جسم کٹ سکے۔ جیسے لکڑی یا پتھر یا لوہے کی پتلی دھار والی چیز اس کے سوا اگر اور کسی طرح قتل کیا جاوے۔ تو اس سے قصاص نہیں۔ اسی طرح اگر کسی جانور کو شکار کر رہا تھا۔ اور گولی انسان کے لگ گئی۔ یا سوتے میں اس نے کروٹ لی اور دُوسرا آدمی اس پر گرا۔ اور اس سے مر گیا۔ لیکن ان سب صُورتوں میں قاتل میّت کے مال سے حصّہ نہ پاوے گا۔ کیونکہ ان صورتوں میں اگرچہ قصاص تو نہیں۔ مگر کفارہ واجب ہے۔ ہاں اگر ایسا ہوا کہ وارث نے کنواں کھدوایا۔ اور میّت اس میں گر کر مر گیا۔ تو اس سے وہ محرُوم نہیں۔

ردّالمختار شریف۔

پر صرف نہیں ہوتے۔ لہٰذا ب حتی الامکان کسی میت کا مال بیت المال میں نہ جانے دو۔ ایسے لاوارث کا مال فقراً پر تقسیم کردو!

ورثہ سے محروم کرنے والی چیزیں!

چار چیزیں وارث کو ورثہ سے محروم کردیتی ہیں۔ یعنی اگر ان چیزوں میں سے ایک بھی کسی وارث میں پائی جاوے تو اس کو اپنے رشتہ دار کے مال سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ غلام ہونا۔ یعنی جب کہ وارث کسی کا غلام ہو۔ تو اپنے کسی رشتہ دار کی میراث نہ پاوے گا۔

نمبر۲ سمجھدار بالغ وارث کا بلاوجہ اس طرح میت کو قتل کرنا جس سے قصاص یا کفارہ واجب ہو۔ قصاص کے معنے ہیں۔ قتل کرنے والے کو بدلہ میں قتل کرنا۔ اگر نابالغ بچہ یا دیوانہ آدمی اپنی دیوانگی کی حالت میں کسی مورث کو قتل کردے۔ تو اس سے وہ ورثہ سے محروم نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر وارث نے اپنے قرابت دار کو حق[1] کی وجہ سے قتل کیا۔ تو بھی یہ قاتل ورثہ سے محروم نہ ہوگا!

نمبر۳ وارث اور میت کا دین جدا ہونا یعنی وارث مسلمان ہے۔ اور میت کافر تھا۔ یا میت مسلمان تھا۔ اور وارث کافر ہے۔ یا اس طرح کہ وارث .... اسلام کے سوا اور دین میں داخل ہے۔ تو یہ ورثہ سے محروم ہے۔ نمبر۴! میت[2] اور وارث کا وطن الگ الگ یا دشاہتوں[3] میں ہونا۔ لیکن یہ وطن الگ جب جانا جاوے گا

---

۱ حق کی وجہ یہ ہے۔ کہ مثلاً میت اس کو قتل کرنے آیا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے اس کو قتل کردیا۔ یا باغی ہو کر آیا۔ اس نے بادشاہ برحق کی طرف سے قتل کیا۔ ردّ المختار منہ!

۲ وطن کا الگ الگ ہونا کافروں کے لئے محروم کرنے والا ہے۔ مسلمان خواہ کسی ملک میں ہو۔ اپنے قرابت دار مسلمان کا حصہ پاوے گا۔ ردّ المختار منہ!

۳ وطن الگ الگ ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ اوّل تو دونوں الگ الگ مالک ہوں۔ جیسے ایک ہندوستان میں رہتا ہے۔ اور دوسرا ترکستان میں دوسرے دونوں ملکوں کا بادشاہ الگ الگ ہو۔ تیسرے ان دونوں ملک والوں میں آپس میں لڑائی ہو۔ کہ اس ملک کا آدمی اگر اس ملک میں آوے۔ تو یہاں کے لوگ اس کو قتل کردیں اگر یہاں کا آدمی اس ملک میں جاوے۔ تو وہ لوگ قتل کردیں۔ اِن تینوں باتوں میں سے اگر ایک بھی نہ ہوگی۔ تو اس کو الگ وطن نہ کہا جاوے گا۔ ردّ المختار و دُرّ مختار منہ!

جب دونوں مُلکوں کے بادشاہ مُستقل اور الگ الگ ہوں۔ اور اِن بادشاہوں کی فوج اور لشکر الگ ایک بادشاہت ہیں الگ الگ ریاستیں جن کے نواب راجے علیحدہ ہوں۔ مختلف وطن نہیں کہلائے جائیں گے۔

وارثوں اور اُن کے حصوں کا بیان

قرآن شریف میں وارثوں کے جو حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ وُہ کل چھ ہیں۔ آدھا ۱/۲ = چوتھائی = ۱/۴ = آٹھواں حصہ = ۱/۸ دو تہائی = ۲/۳ = ایک تہائی = ۱/۳ = چھٹا حصہ = ۱/۶۔

ان حصوں کے پانے والے وارث کل بارہ ہیں۔ جن میں چار مرد ہیں اور آٹھ عورتیں۔ چار مرد یہ ہیں!
میت کا باپ[۱]، میت کا صحیح[ف۱] دادا[۲]، ماں[۳] شریکا بھائی یعنی میت اور اس کے باپ الگ الگ ہوں۔ اور ماں ایک ہو۔ خاوند[۴]۔

آٹھ عورتیں یہ ہیں۔
میت کی بیوی[۱]، بیٹی[۲]، پوتی[۳]، سگی بہن[۴] یعنی میت اور اس کے ماں باپ ایک ہی ہو۔ باپ[۵] شریکی بہن یعنی میت اور اس بہن کا باپ ایک ہی ہو مگر والدہ علیحدہ ہو۔ اس کو عربی میں علاتی بہن کہتے ہیں۔ اور اس کی ماں الگ ہو اور باپ ایک ہی ہو۔

باپ[۱] کے تین[۳] حال ہیں۔ اگر میت نے بیٹا یا پوتا بھی چھوڑا ہے۔ تو باپ کو کل مال کا چھٹا ملے گا۔ اور اگر میت نے بیٹی یا پوتی چھوڑی ہے اور بیٹا یا پوتا نہ چھوڑا۔ تو باپ کو کُل مال کا چھٹا حصہ بھی ملے گا۔ اور باپ عصبہ بھی ہوگا یعنی اگر کچھ مال بچ رہے۔ تو وُہ بھی باپ لے گا۔ جیسے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا۔ اُس نے ایک باپ اور ایک بیٹی چھوڑی۔ تو کُل مال کے چھ[۶] حصہ کرکے اوّل ایک حصہ باپ کو دیا جاوے گا۔ اور آدھا یعنی تین لڑکی کو اب دو[۲] باقی بچے۔ وُہ بھی پھر باپ کو عصبہ ہونے کی وجہ سے دے دیئے جاویں گے تو لڑکی کو بھی تین ملیں گے۔ اور باپ کو بھی۔ مگر باپ کو ایک تو اُس کے فرضی حق کا اور دو[۲] عصبہ ہونے کی وجہ سے اس کی مثال یہ ہے۔

زید ۶

لڑکی ۳ ———————— باپ ۱ ۲

ف۱: صحیح دادا وُہ ہے۔ جس کا رشتہ میت سے باپ کی طرف سے ہو۔ یعنی اِس کے رشتہ میں ماں داخل نہ ہو جیسے باپ کا باپ یا باپ کا دادا اور فاسد دادا وُہ ہے۔ جس کے میت کے ساتھ رشتہ میں ماں ہو۔ جیسے ماں کا باپ یعنی نانا یا ماں کا دادا۔ صحیح دادا تو ذی فرض ہے۔ اور فاسد دادا یعنی نانا نہ تو ذی فرض ہے۔ اور نہ عصبہ بلکہ ذوی الارحام میں سے ہے۔ شریفیہ منہ۔

اور اگر میّت نے اولاد یعنی بیٹا یا بیٹی یا پوتی نہ چھوڑی۔ تو باپ کو صرف عصبۃً ملے گا۔ یعنی جو باقی دوسرے ذی فرض وارثوں سے بچے گا۔ وُہ باپ لے گا۔ صحیح دادا کے چار حال اس طرح کہ!

صحیح[1] دادا باپ کی طرح ہے۔ یعنی جو تین حال باپ کے تھے۔ وُہی دادا کے ہیں۔ مگر باپ کے ہوتے ہوئے دادا محرُوم رہے گا۔ کیونکہ میّت سے باپ کا رشتہ قریب ہے۔ اور قریب کے ہوتے ہوئے دُور والے کو نہیں ملتا۔

ماں شریکی اولاد کے تین حال ہیں۔ اگر ایک ہے۔ تو تمام مال کا چھٹا حصّہ ملے گا۔ اور ایک سے زیادہ دُو یا تین ہیں۔ تو اُن کو کُل مال کا تیسرا حصّہ ⅓ ملے گا۔ اور اس میں ماں شریکی بہن اور ماں شریکی بھائی برابر ہوگا۔ یعنی جیسے اور جگہ ہوتا ہے۔ کہ بھائی کو بہن سے دُو گنا ملتا ہے۔ ایسا یہاں نہ ہوگا۔ بلکہ بہن بھائی کے برابر حصّہ پائے گی۔ جیسے مرنے والے کے ایک ماں شریکی بہن اور ایک ماں شریکا بھائی ہے اور اُن کے حصّہ میں چار آئے۔ تو دُو بھائی کو ملیں گے اور دُو بہن کو۔ اور یہ لوگ میّت کی اپنی اولاد یا میّت کے بیٹے کی اولاد یا باپ دادا کے ہوتے ہوئے محروم ہو جائیں گے۔ یعنی میّت نے بیٹا یا بیٹی یا پوتا پوتی یا باپ دادا یا ان میں سے ایک چھوڑا ہے تو اخیافی یعنی ماں شریکی بہن بھائی محروم۔

خاوند کے دُو حال ہیں۔ اگر اس کی بیوی نے اپنے پیٹ کی اولاد چھوڑی ہے۔ خواہ اُسی خاوند سے ہو۔ یا دُوسرے خاوند سے تو خاوند کو کُل مال کا چوتھائی حصّہ ملے گا۔ اور اگر اولاد نہیں چھوڑی۔ تو کُل مال کا آدھا حصّہ ملے گا۔

عورتوں کے حصّوں کا بیان

بیوی[1] چاہے ایک ہو یا زیادہ اس کے دُو حال ہیں۔ اگر میّت نے اپنے نطفہ کی اولاد یا اولاد کی اولاد چھوڑی ہے۔ چاہے اُسی بیوی سے ہو۔ یا کسی دُوسری بیوی سے۔ تو بیوی کو کُل مال کا آٹھواں حصّہ ملے گا۔ اور اگر اولاد نہیں چھوڑی۔ تو کُل مال کا چوتھائی حصّہ ملے گا ؛

بیٹی[2]۔ بیٹی کے تین حال ہیں۔ اگر بیٹی ایک ہے۔ تو کُل مال کا آدھا حصّہ ملے گا۔ اگر ایک سے زیادہ

---

[1] صحیح دادا وُہ ہے۔ جس کا رشتہ میّت سے فاسد دادا کے ذریعہ نہ ہو۔ یعنی اس کے اور میّت کے بیچ میں فاسد دادا نہ آتا ہو تو ماں اور باپ کی ماں اِسی طرح ماں کی نانی پرنانی صحیح دادی ہے اور ماں کی دادی اور باپ کی ماں کی دادی فاسد دادی ہے۔ کیونکہ اس کے بیچ میں فاسد دادا آگیا۔ پہلی میں تو نانا اور دُوسری میں باپ کا نانا۔ اور یہ دونوں فاسد دادا ہیں۔ اس کو خُوب غور سے سمجھنا چاہیئے شریفیہ منہ ؛؛

ہیں۔ تو کل کا ۲/۳ دو تہائی حصہ پاوے گی۔ اگر میت نے بیٹی کے ساتھ بیٹا بھی چھوڑا ہے۔ تو یہ بیٹی[۶] اُسکے ساتھ مل کر عصبہ ہو جاوے گی۔ اور ذی فرض وارثوں سے جو مال باقی بچے گا۔ اس کو اُن پر اس طرح تقسیم کیا جاوے گا۔ کہ بیٹے کو دو حصّہ اور بیٹی کو ایک حصّہ۔

پوتی کے کئی چھ حالات ہیں۔ اگر اکیلی[۱] ہے۔ تو کل مال کا آدھا پاوے گی۔ اور اگر ایک[۲] سے زیادہ ہے۔ تو کل مال کا دو تہائی ۲/۳۔ مگر یہ جب ہے۔ کہ میت نے پوتی کے ساتھ کوئی بیٹی نہ چھوڑی ہو۔ اگر پوتی کے ساتھ ایک بیٹی بھی چھوڑی ہے۔ تو پوتی کو مال کا چھٹا حصّہ[۳] ملے گا۔ اور اگر دو بیٹیاں[۴] چھوڑی ہیں۔ تو اب پوتی محروم۔ ہاں اگر دو بیٹیوں[۵] اور پوتی کے ساتھ کوئی پوتا یا پرپوتا بھی چھوڑا ہے۔ تو یہ پوتا یا پرپوتا اس پوتی کو عصبہ کر دے گا۔ کہ جو ذی فرض کے بعد باقی بچے گا۔ وہ اس طرح تقسیم کیا جاوے گا۔ کہ پوتی کو ایک حصّہ اور پوتے کو دو[۶] حصّے۔ اور اگر میت نے اپنا بیٹا چھوڑا ہے۔ تو پوتی محروم۔

نمبر۴ :- سگی بہنوں[۱] کے پانچ حال ہیں۔

اگر ایک ہے۔ تو کل مال کا آدھا۔ اور اگر ایک[۲] سے زیادہ ہیں۔ تو کل مال کا دو تہائی حصّہ اور اگر بہن[۳] کے ساتھ سگا بھائی بھی ہے۔ تو بہن عصبہ ہے اور مال اس طرح تقسیم ہوگا کہ بھائی کو دو حصّہ اور بہن کو ایک حصّہ۔ اور اگر میت[۴] نے بہنوں کے ساتھ بیٹیاں یا پوتیاں بھی چھوڑی ہیں۔ تو اس صورت میں بہنیں عصبہ ہوں گی۔ اور اگر میت[۵] نے بہن کے ساتھ بیٹا یا پوتا یا باپ یا دادا چھوڑا ہے۔ تو بہن محروم ::

نمبر۵ باپ[۲] شریکی بہن کے کئی سات حال ہیں۔ اگر ایک[۱] ہے۔ تو کل ترکہ کا آدھا ملے گا۔ اور اگر ایک[۲] سے زیادہ ہیں۔ تو وہ دو تہائی ۲/۳ کی مستحق ہوں گی۔ مگر یہ جب ہے۔ کہ جب سگی بہن نہ ہو۔ اگر اُن کے ساتھ ایک سگی بہن بھی ہے۔ تو اس کو چھٹا حصّہ اور دو سگی بہنیں[۴] بھی ہیں۔ تو باپ شریکی بہن محروم۔ ہاں اگر کوئی باپ[۵] شریکا بھائی بھی ہو۔ تو یہ عصبہ ہو جاویں گی۔ اور اُن کے آپس میں مال اس طرح تقسیم کرنا ہوگا کہ بھائی کو دو حصّہ اور بہن کو ایک حصّہ اور باپ[۶] شریکی بہن اپنے بھائی اور میت کی بیٹی یا پوتی کے ہوتے ہوئے عصبہ ہو جاویں گی۔ اور یہ بھی بیٹے اور پوتے اور باپ اور دادا کے ہوتے ہوئے محروم رہیں گے۔

۱؎ یعنی بہن کے ماں اور باپ دونوں ایک ہی ہوں۔ اس کو عربی زبان میں حقیقی کہتے ہیں۔

۲؎ یعنی جو باپ میں شریک ہوں۔ اور ماں دونوں کی الگ الگ ہوں۔ اس کو عربی میں عَلّاتی کہتے ہیں۔

جیسے باپ کے ہوتے ہوئے۔ پوتا محروم یا جس طرح بیٹا نہ ہو تو پوتا حق دار کر دادا محروم یا بیٹے کے ہوتے ہوئے
پوتا محروم کر دادا اور پوتے کا رشتہ باپ اور بیٹے کی وجہ سے ہے۔ ہاں۔ ماں شریکے بھائی، بہن ماں
کے ہوتے ہوئے محروم نہیں ہوتے ::

دوسرا قاعدہ یہ ہے۔ کہ قریب کے رشتہ دار ہوتے ہوئے دور کا رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے۔ جو
وارث ورثہ سے خود محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دوسرے وارث کو نقصان نہیں پہونچا سکتا جیسے ایک شخص
نے کافر بیٹا چھوڑا۔ تو یہ کافر بیٹا میت کی ماں۔ یا بیوی کا حصہ کم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح قاتل اور غلام کر کسی کے
حصہ کو کم بھی نہیں کر سکتے۔ اور کسی کو ورثہ سے محروم بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن جس وارث کو دوسرے
وارث نے ورثہ سے محروم کر دیا ہو۔ وہ دوسرے وارث کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جیسے میت
کے دو بھائی اگر باپ کی وجہ سے محروم ہو جاویں۔ تو اگرچہ خود تو میت کے مال سے حصہ نہ پاویں گے
لیکن میت کی ماں کا حصہ کم کر دیں گے۔ اس کی مثال۔

۶ زید

باپ	ماں	بھائی	بھائی

اس صورت میں باپ کی وجہ سے اگرچہ دونوں بھائی محروم رہے۔ مگر ماں کا حصہ کم کر دیا گیا۔ اگر
یہ دونوں بھائی نہ ہوتے۔ تو ماں کو کل مال کا تہائی ۱/۳ حصہ ملتا۔ اب ان کے ہونے سے چھٹا حصہ ملا۔

مال سے وارثوں کے حصے نکالنے کا بیان

قرآن شریف میں جو وارثوں کے حصے مقرر کئے گئے ہیں۔ دو طرح کے ہیں۔

۱:۔ اول میں آدھا = ۱/۲ چوتھائی = ۱/۴ آٹھواں حصہ = ۱/۸ شامل ہیں۔

۲:۔ دوسرے میں ۲/۳ یعنی دو تہائی و ۱/۳ یعنی ایک تہائی و ۱/۶ یعنی چھٹا حصہ شامل ہیں۔ اگر کسی
مسئلہ میں ان حصوں میں سے کوئی ایک بھی حصہ ہووے۔ تو وہ مسئلہ اس حصہ کے مخرج[1] سے بنے گا۔ کسر کا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلہ میں جیسی کسر کا حصہ آوے گا۔ اسی کسر کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے گا۔ مخرج
کی تعریف آگے آوے گی۔ اور آدھے کے سواء باقی ہر کسر کا مخرج اس کا ہم نام عدد ہے۔ جیسے چوتھائی

مخرج وہ عدد ہے۔ جو اس حصّہ کی طرح نام رکھتا ہو۔ جیسے اگر کسی مسئلہ میں آدھا آوے تو مسئلہ دو سے بنے گا اور اگر مسئلہ میں تہائی ⅓ حصّہ آئے تو مسئلہ تین سے بنے گا اور اگر مسئلے میں چوتھائی آوے تو مسئلہ چار سے بنے گا اور اگر آٹھواں حصّہ آوے۔ تو مسئلہ آٹھ سے بنے گا۔ اور اگر چھٹا حصّہ آوے۔ تو چھ سے جیسے ایک آدمی مرا۔ اس نے ایک بیوی اور بیٹا چھوڑا۔ تو اس مسئلہ میں بیوی کا آٹھواں حصّہ ہے۔ اس لئے مسئلہ آٹھ سے ہوگا۔ اُن میں سے ایک بیوی کو اور سات بیٹے کو، اور اگر بیوی اور ایک بھائی چھوڑا ایسی بیوی کا حصّہ چوتھائی ہے۔ تو مسئلہ چار ۴ سے بنے گا۔ یعنی کُل مال کے چار حصّہ کر کے ایک بیوی کو اور تین حصّہ بھائی کو دیئے جاویں گے۔ اسی طرح اور مسئلے بھی معلوم کرو۔ اور اگر کسی مسئلہ میں اِن حصّوں میں سے دو تین حصّہ جمع ہو گئے تو یا ایک ہی قسم کے دو حصّہ ہوں گے۔ جیسے آدھا اور آٹھواں حصّہ جمع ہو گیا۔ یا آدھا و چوتھائی و آٹھواں جمع ہو گئے۔ یا کسی مسئلہ میں تہائی حصّہ و چھٹا جمع ہوئے۔ تو اُس صورت میں چھوٹی کسر کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے گا۔ کیونکہ جس عدد سے چھوٹا حصّہ نکلے گا۔ اسی عدد سے اس حصّہ کا دُگنا بھی بنے گا۔ جیسے ایک مسئلہ میں چوتھائی اور آٹھواں حصّہ جمع ہو گئے۔ تو مسئلہ آٹھ سے بنایا جاوے کیونکہ آٹھ میں

(حاشیہ بقیہ از صفحہ نمبر) کا مخرج چار۔ پانچویں حصّہ کا مخرج پانچ اسی طرح اَور دوں کو معلوم کرو۔ اور اگر کسی مسئلہ میں کئی کسروں کے حصّے آ گئے۔ تو ایسے عدد سے مسئلہ بناؤ جو ان دونوں کا مخرج بن سکے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جن دو کسروں کا مخرج مشترک معلوم کرنا ہو۔ تو پہلے ان دونوں کسروں کا الگ الگ مخرج معلوم کرلو۔ پھر ان دونوں مخرجوں میں نسبت معلوم کرو اگر ان دونوں مخرجوں میں تداخل ہے جب تو بڑا عدد ان دونوں کسروں کا مخرج ہے جیسے چوتھائی اور آٹھواں حصّہ اُن کا مخرج معلوم کرنا ہے تو پہلے چار آٹھ کو الگ الگ معلوم کیا۔

پھر دیکھا کہ چار اور آٹھ میں تداخل ہے۔ تو سمجھ لیا۔ کہ آٹھ دونوں کا مخرج ہے۔

پھر ان دونوں مخرجوں میں نسبت معلوم کرو۔ اگر ان دونوں مخرجوں میں تداخل ہے۔ جب تو بڑا عدد ان دونوں کسروں کا مخرج ہے جیسے چوتھائی اور آٹھواں حصّہ اُن کا مخرج معلوم کرنا ہے۔ تو پہلے چار اور آٹھ کو الگ الگ معلوم کیا۔ پھر دیکھا۔ کہ چار اور آٹھ میں تداخل ہے۔ تو سمجھ لیا۔ کہ آٹھ دونوں کا مخرج ہے۔ اور اگر اِن دونوں ہم مخرجوں میں توافق ہے۔ تو ایک مخرج کے وُفق کو دوسرے مخرج سے ضرب دو جو حاصل ہو۔ وُہ اُن دونوں کسروں کا مخرج ہے۔ جیسے چوتھائی اور چھٹے حصّے کا مخرج معلوم کرنا ہو تو پہلے چار اور چھ کو لیا۔ اُن میں آدھے کا توافق ہے۔ تو چھ کے آدھے یعنی تین کو چار میں ضرب دی۔ (بقیہ آگے دیکھیے)

سے آٹھواں حصّہ بھی بن سکتا ہے۔ اور اس کا دُوگنا چوتھائی بھی بن سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسئلہ میں چھٹا حصّہ اور تہائی حصہ جمع ہو گئے تو مسئلہ چھ سے بنے گا۔ اس سے چھٹا حصّہ۔ اور اس کا دُوگنا یعنی تہائی دونوں نکل سکتے ہیں اور اگر ان دُو قسموں میں سے کوئی حصّہ دُوسری قسم کے کسی حصّہ کے ساتھ جمع ہو کر آوے۔ تو اگر آدھا دُوسری قسم کے کسی حصّہ کے ساتھ یا سارے حصّوں سے جمع ہو کر آوے۔ تو مسئلہ چھ سے ہوگا۔ اور اگر چوتھائی دُوسری قسم کے کسی حصّہ یا تمام حصّوں سے مل کر آوے۔ تو مسئلہ بارہ سے بنے گا۔ اور اگر آٹھواں حصّہ دوسری قسم کے کسی حصّہ یا سارے حصوں کے ساتھ جمع ہو کر جاوے۔ تو مسئلہ چوبیس سے بنے گا۔ اس قاعدہ کو خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

عول کا بیان

عول کے معنی یہ ہیں کہ وارثوں کے حصّے جب ملائے جاویں۔ تو اُس عدد سے بڑھ جاویں۔ جس سے مسئلہ بنا تھا۔ مثلاً مسئلہ چھہ سے بنا تھا۔ اور وارثوں کے حصّے ملائے گئے۔ تو آٹھ ہو گئے۔ جیسے ایک عورت مری۔ اُس نے خاوند، ماں اور دُو بہنیں چھوڑیں۔ تو مسئلہ چھ سے ہوا۔ اُس میں سے آدھا یعنی تین خاوند کو ملے۔ اور ایک ماں کو ملا۔ اور چار دونوں بہنوں کو ملے۔ تو کُل مسئلے کے آٹھ حصّے ہوئے۔ حالانکہ مسئلہ چھ سے بنا تھا۔ اس صورت میں مال کے آٹھ حصّے کر کے اسی طرح بانٹ دیا جاوے گا۔ جاننا چاہیئے۔ کہ جن عددوں سے مسئلے بنتے ہیں۔ وُہ کُل سات عدد ہیں۔ جن میں سے چار عدد تو ایسے ہیں۔ جن کا کبھی عول نہیں ہوتا۔ دُو۔ تین۔ چار۔ آٹھ اگر کوئی مسئلہ ان میں سے کسی عدد سے بنے گا۔ تو مسئلے کے حصّے اِن عددوں سے نہ بڑھیں گے۔ اور تین عدد ایسے ہیں۔ جن کا عول ہو جاتا ہے۔ جیسے چھ، بارہ، چوبیس۔ ان تینوں میں سے چھ کا دس تک عول ہو سکتا ہے۔ یعنی جس مسئلہ کو چھہ بنایا گیا ہے۔ اُس کے حصّوں کی زیادتی سات، آٹھ، نو، دس تک ہو سکتی ہے

ے حاشیہ بقیہ از صفحہ نمبر) اس سے بارہ حاصل ہوا۔ یہ بارہ چوتھائی اور چھٹے حصّے کا مخرج ہے اور اگر ان دونوں مخرجوں میں تباین ہے۔ تو ایک مخرج کو دوسرے میں ضرب دو۔ جو حاصل ہو۔ وُہ اِن دونوں کسروں کا مخرج جیسے چوتھائی اور پانچواں حصّہ کا مخرج معلوم کرنا ہے۔ تو چار اور پانچ کو لیا۔ اور چار کو پانچ میں ضرب دی۔ جس سے بیس حاصل ہوا۔ یہ بیس چوتھائی اور پانچویں حصّہ کا مخرج ہے۔ واللہ اعلم۔ منہ۔

اور بارہ کا سترہ تک عول ہو سکتا ہے۔ یعنی جو مسئلہ بارہ سے بنا ہو۔ اس کے حصے سترہ تک بڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح کہ تمام حصے مل کر تیرہ یا پندرہ یا سترہ ہو جاویں۔ چودہ یا سولہ نہیں ہو سکتے اور چوبیس فقط ستائیس تک بڑھ سکتا ہے۔ یعنی جو مسئلہ کہ چوبیس سے بنا ہو۔ اس کا عول صرف ستائیس ہوگا۔ پچیس یا چھبیس نہیں ہو سکتا

عددوں کا حال معلوم کرنے کا بیان

اگر دو عدد برابر ہوں۔ تو اُن کو مساوی کہتے ہیں۔ جیسے چار روپیہ اور چار آدمی اُن میں آدمیوں کا عدد یعنی چار روپوں کے عدد یعنی چار کے برابر ہے۔ اور اگر دو عدد آپس میں چھوٹے بڑے ہوں۔ تو وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ چھوٹا عدد بڑے کو مٹا دوے۔ یعنی بڑا عدد چھوٹے پر برابر بٹ جاوے۔ اس کو تداخل کہتے ہیں۔ جیسے چار اور آٹھ کہ یہ دونوں چھوٹے بڑے عدد ہیں۔ لیکن بڑا عدد یعنی آٹھ چھوٹے عدد یعنی چار پر برابر بٹ جاتا ہے۔ اور اگر بڑا عدد چھوٹے عدد پر برابر نہ بٹ سکے تو یا تو کوئی تیسرا عدد اُن دونوں کو مٹا دے گا۔ یا نہیں یعنی یا تو کوئی تیسرا عدد ایسا نکلے گا۔ جس پر چھوٹا بڑا دونوں عدد برابر بٹ جاویں گے۔ اس کو توافق کہتے ہیں جیسے چھ اور نو کہ یہ دونوں عدد آپس میں چھوٹے بڑے تو ہیں۔ لیکن بڑا عدد چھوٹے عدد پر برابر

ف جس سے چیزوں کی گنتی کی جاوے۔ اس کو عدد کہتے ہیں۔ جیسے ۲۔۳۔۴۔۵ وغیرہ اور عدد کے ٹکڑوں کو کسر کہتے ہیں۔ جیسے آدھا، تہائی، چوتھائی، آٹھواں کہ یہ پورے عدد نہیں بلکہ عدد کے ٹکڑے ہیں ان کسروں میں سے جو کسر جس عدد میں جا کر ایک بن جاوے۔ اس عدد کو اس کسر کا مخرج کہتے ہیں۔ جیسے آٹھ کہ اس کا آٹھواں حصہ ہے تو آٹھ وہ عدد ہے کہ جس سے آٹھواں حصہ ایک بن گیا۔ اگر اس سے چھوٹا عدد لیتے ہیں۔ جیسے سات یا چھ تو اس کا آٹھواں حصہ ایک نہ بنتا۔ تو کہا جاوے گا کہ آٹھ کا عدد آٹھویں حصہ کا مخرج ہے اسی طرح چار کہ چوتھائی حصہ چار میں ایک بن جاتا ہے اس طرح کے چار کا چوتھائی ایک ہے۔ اگر چار سے چھوٹا عدد لیں تو اس کا چوتھائی حصہ ایک نہ بنے گا۔ بلکہ ایک سے کم رہے گا۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ چار اپنے چوتھائی حصہ یعنی ۱/۴ کا مخرج ہے۔ یوں سمجھو کہ آدھے کے سوا ہر کسی کسر کا مخرج اس کا نام عدد ہوگا تہائی کا مخرج تین۔ چوتھائی کا مخرج چار آٹھویں حصہ کا مخرج آٹھ دسویں حصہ کا مخرج دس۔ بقیہ آگے صفحہ

بٹتا نہیں۔ مگر ہاں یہ دونوں عدد تین پر برابر بٹ جاتے ہیں۔ اسی کو توافق کہتے ہیں۔ پھر وہ تیسرا عدد جس پر یہ دونوں عدد برابر بٹ جاویں۔ جس کسر کا مخرج بنتا ہو۔ اُس توافق کو اُسی کسر کی طرف نسبت دیں گے۔ جیسے چار۴ اور چھ۶ کہ ان دونوں کو دو۲ کا عدد مٹا دیتا ہے۔ اور دو۲ آدھے کا مخرج ہے۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ چار۴ اور چھ۶ میں آدھے کا توافق ہے۔ اسی طرح چھ۶ اور نو۹ کہ اس کو تین مٹا دیتا ہے۔ اور تین تہائی کا مخرج ہے تو کہا جاوے گا۔ کہ چھ۶ اور نو۹ میں تہائی کا توافق ہے۔ اور اگر یہ چھوٹے بڑے عدد ایسے ہوں کہ نہ تو اُن میں سے بڑا چھوٹے پر برابر بٹتا ہو۔ اور نہ ان دونوں کو تیسرا عدد مٹا سکتا ہے۔ تو اس کو تباین کہتے ہیں۔ جیسے سات اور نو یا گیارہ اور پندرہ۱۵ کہ یہ چھوٹے اور بڑے ہیں۔ مگر نہ تو اُن میں سے چھوٹا بڑے کو مٹاتا ہے۔ اور نہ کوئی تیسرا عدد اُن دونوں کو مٹا سکتا ہے۔ اُس کی پہچان یہ ہے کہ بڑے عدد کو چھوٹے عدد پر بانٹ دو۔ اور جب بڑا بٹ کر چھوٹا رہ جاوے تو پھر اُن میں بڑے کو چھوٹے پر بانٹ دیا جاوے۔ اسی طرح بار بار کرو۔ اگر آخر میں ایک بچا۔ تو سمجھو کہ ان دونوں میں تباین ہے۔ اور اگر ایک سے زیادہ بچا تو سمجھو کہ ان دونوں میں توافق ہے اب جو عدد بچ رہا۔ وہ جس کسی کسر کا مخرج ہو۔ اُسی کسر کی طرف اُس توافق کی نسبت دے دو۔ جیسے چوبیس۲۴ کو نو۹ پر بانٹ دیا تو چوبیس میں سے نو دوبارہ نکل گئے۔ دوبار نو۹ کے نکلنے سے چوبیس۲۴ میں سے چھ۶ بچے۔ اب چھ۶ چھوٹا عدد ہے۔ اور نو۹ بڑا عدد تو اب نو۹ کو چھ پر بانٹ دیا تو نو۹ میں چھ۶ ایک دفعہ نکلنے سے تین باقی بچے۔ تو کہا جاوے گا۔ کہ نو۹ اور چوبیس۲۴ میں تہائی کا توافق ہے اس کو خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ آگے اس کا بہت کام پڑے گا

تصحیح یعنی حصے برابر کرنے کا طریقہ اور اس کا بیان

حصّوں کو برابر برابر کر کے بانٹنے میں سات قاعدوں کے جاننے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُن میں سے تین قاعدوں میں تو صرف ایک ہی گروہ کے وارثوں کے عدد اور اُن کے حصّوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً دیکھو کہ بیٹے

بقیہ حاشیہ ۱ اسی طرح اوروں کو اپنی عقل سے معلوم کر لو۔ ۱۲ منہ، غفرلہ، ولوالدیہ و لاستاذہ ؏

ف ۱ جب کہ وارثوں کے کسی گروہ کا حصّہ اس گروہ پر برابر پورا نہ بٹ سکے۔ تو ضرب وغیرہ دے کر ایسی صورت کی جاتی ہے۔ جس سے وہ حصّے برابر بٹ جاویں۔ اس کو عرف میں تصحیح کہتے ہیں۔ اس کے سات قاعدے ہیں۔ اگر ایک ہی گروہ کے وارثوں پر کسر پڑے۔ یعنی وارثوں کے ایک ہی گروہ کا حصّہ اُن پر

کتنے ہیں۔ اور اُن کو مال میں سے کتنے حصے ملے ہیں۔ اور ان میں کیا نسبت ہے۔ اور چار قاعدوں میں ایک قسم کے وارثوں کے عدد کو دُوسری قسم کے وارثوں کے عدد کے طریقوں کے ساتھ دیکھنا پڑتا ہے۔ یعنی اس طرح کہ بیٹے تین ہیں اور بیٹیاں پانچ ہیں۔ تو دیکھا جاوے۔ کہ تین کو پانچ سے کیسی نسبت ہے۔

پہلے تین قاعدے کہ جن میں وارثوں اور اُن کے حصوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اُن میں سے پہلا قاعدہ تو یہ ہے۔ کہ وارث کے حصے برابر برابر وارثوں پر بٹ جاویں۔ جب تو ضرب وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ:۔

زید ـــــــ م

بیٹی	بیٹی	باپ	ماں
۲	۲	۱	۱

اس صورت میں مال کے چھ ۶ حصے کرکے ایک تو ماں اور باپ کو دیا جاوے گا۔ اور کل مال کا دو تہائی یعنی چار دونوں بیٹیوں کو دیئے جاویں۔ اس طرح کہ دو ایک بیٹی کو اور باقی دو دوسری بیٹی کو:۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ وارثوں کے صرف ایک گروہ پر اُن کے حصے برابر نہ بٹ سکتے ہوں۔ تو اب اُن وارثوں کے اور اُن کے حصوں کے عدد کو دیکھا جاوے۔ اگر اُن میں توافق ہے۔ تو وارثوں کے عدد کے وفق کو ہے کہ اس عدد میں ضرب دے دی جاوے۔ جس سے مسئلہ ہوا ہے۔ اور اگر اس مسئلہ میں عول ہے۔ تو عول سے ضرب دے دی جاوے۔ یعنی اگر وارثوں کے عدد اور اُن کے حصوں کے عدد میں توافق آدھے کا ہے۔ تو وارثوں کے عدد کا آدھا ہے کہ مسئلہ کے عدد سے ضرب دے دی جاوے۔ پھر جو عدد ضرب دینے سے بنے۔ اُس سے مسئلہ کر دیا جاوے۔ جیسے!

زید ۲/۶

ـــــــ م

۱۰ عدد	بیٹی ۴/۸/۴۰	باپ ۱/۵	ماں ۱/۵

اس صورت میں مال کے کل چھ ۶ حصے کئے جاویں گے۔ اس میں سے ایک حصہ ماں کو اور ایک حصہ باپ کو۔ چار ۴ حصے بیٹیوں کو لیکن بیٹیاں دس ہیں۔ اور اُن کے حصے چار ۴ تھے۔ چار ۴ حصے دس لڑکیوں

بقیہ حاشیہ) پُورا پُورا نہ بٹ سکے۔ اور باقی دوسروں کے حصے برابر اور پورے بٹتے ہوں۔ تو اس کے لئے پہلے تین قاعدے ہیں اور اگر ایک سے زیادہ گروہوں پر کسر ہو تو اس کے چار قاعدے ہیں ۱۲۰ منہ؛؛

پر برابر نہیں بٹتے۔ تو اب چار۴ اور دس۱۰ ہیں۔ نسبت دیکھی۔ معلوم ہوا۔ کہ دو۲ پر چار اور دس پورے پورے بٹ جاتے ہیں۔ اس لئے اُن میں آدھے کا توافق ہے۔ پس دس کے آدھے یعنی پانچ کو چھ۶ میں ضرب دی۔ تو تیس۳۰ ہوئے۔ اُن میں سے پورے پانچ پانچ ماں باپ کو دیئے گئے۔ اور بیس۲۰ دس لڑکیوں کو دیئے گئے۔ اب اُن میں سے ہر لڑکی کو پورے دو۲ دو۲ آ گئے۔ اصل مسئلہ چھ۶ سے ہو کر تیس۳۰ سے تصحیح کیا گیا۔

تیسرا۳ قاعدہ یہ ہے۔ کہ جن وارثوں کے گروہ پر حصّہ برابر نہیں بٹتا۔ اور اُن وارثوں کے عددوں اور حصّہ کے عددوں میں توافق نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں اُن وارثوں کے پورے عددوں کو اس عدد میں ضرب دیں گے۔ جس سے مسئلہ ہوا۔ اور اگر مسئلہ تباین ہے تو عول سے ضرب دیں گے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ!

زید		۶/۳۰	
باپ	ماں	لڑکیاں	
۱/۵	۱/۵	۴/۲۰	۵ عدد

اس صورت مسئلہ چھ۶ سے کر کے ایک ماں باپ کو دیا گیا۔ اور چار۔ پانچ لڑکیوں کو دیئے گئے مگر چار حصّے پانچ لڑکیوں پر پورے نہیں بٹ سکتے۔ اور چار پانچ میں تباین ہے۔ تو پورے پانچ کو چھ۶ میں ضرب دی۔ جس سے تیس۳۰ حاصل ہوئے اس لئے مسئلہ اس طرح کر دیا گیا۔ کہ پانچ پانچ ماں باپ کو اور بیس۲۰ ۵ لڑکیوں کو اب یہ بیس۲۰ ۵ لڑکیوں پر پورے بٹ گئے۔ کہ ہر لڑکی کو چار چار مل گئے۔ دُوسرے چار۴ قاعدے جن میں ایک گروہ کے وارثوں کے عدد کو دُوسرے گروہ کے عدد کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اُن میں سے پہلا قاعدہ یہ ہے:۔

کہ وارثوں کے دو۲ یا زیادہ گروہ ہوں پر اُن کا ملا ہوا حصّہ برابر پورا نہیں بٹ سکتا۔ تو اگر اُن کے عددوں میں آپس میں برابری ہے۔ مثلاً لڑکوں اور بیٹیوں پر اُن کا حصّہ پورا نہیں بٹتا۔

لہ ان چار۴ قاعدوں میں بھی پہلے ہر گروہ کے وارثوں اور اُن کے حصّوں کے عددوں میں نسبت دیکھی جاوے گی۔ اگر حصّے کے عدد اور گروہ کے وارثوں کے عددوں میں بھی توافق ہوگا۔ تو وارثوں کے عددوں کے وفق کو رکھا جاوے۔ اور اگر تباین ہے۔ تو وارثوں کا عدد پورا رکھا جاوے۔ پھر اُن رکھے ہوئے عددوں میں نسبت دیکھی جاوے گی۔ جیسا کہ مثال سے ظاہر ہے۔ ۱۲ منہ:۔

اور لڑکے بھی چار ہیں۔ اور بیٹیاں بھی چار۔ تو اس میں قاعدہ یہ ہے۔

کہ وارثوں میں سے ایک کے عدد کو مسئلہ کے مخرج سے ضرب دی جاوے۔ جس سے مسئلہ بنا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص مرا۔ اس نے چھ لڑکیاں، تین دادیاں اور تین چچا چھوڑے مسئلہ چھ سے ہو کر چوتھا حصہ یعنی ایک تین دادیوں کو اور چار چھ لڑکیوں کو اور ایک باقی تینوں چچاؤں کو ملے گا۔ مثال:

زید ۱۸/۶

لڑکیاں ۶	دادی ۳	چچا ۳
۴/۱۲	۱/۳	۱/۳

یہاں وارثوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک لڑکیوں کا، دوسرا دادیوں کا، تیسرا چچاؤں کا۔ ان تینوں گروہوں کو حصہ اتنا ملا۔ کہ اُن پر برابر نہیں بٹتا۔ چھ لڑکیوں کو چار ملے۔ تین دادیوں کو ایک، اسی طرح تینوں چچاؤں کو بھی ایک ملا۔

اب چھ لڑکیوں کو جو چار ملے ہیں۔ اُن چھ اور چار میں آدھے کا توافق ہے۔ تو ہم نے لڑکیوں کے عدد کا آدھا یعنی تین لیا۔ چچا اور دادیوں کے عددوں اور اُن کے حصوں میں تباین ہے۔ تو اُن کے پورے عدد یعنی تین تین لئے۔ اب گویا تین لڑکیاں، تین دادیاں اور تین چچا ہیں۔ اُن سب میں آپس میں برابری ہے۔ تو ایک تین کو اصل مسئلہ یعنی چھ میں ضرب دی۔ جس سے ۱۸ حاصل ہوئے۔ اُن میں سے ۱۲ تو چھ لڑکیوں کو اور ۳ تین دادیوں کو۔ ۳ تینوں چچاؤں کو دے دیئے گئے۔ جو اُن پر برابر بٹ گئے لہٰذا مسئلہ چھ سے ہوا اور ۱۸ سے صحیح کیا گیا۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ وارثوں کے چند گروہوں پر حصہ برابر نہیں بٹتا اور اُن گروہوں کے عددوں میں آپس میں تداخل ہے۔ یعنی اس کا چھوٹا عدد بڑے کو مٹا دیتا ہے۔ تو اس میں یہ حکم ہے۔ کہ بڑے عدد کو اس مخرج سے ضرب دے دی جاوے۔ جس سے مسئلہ بنا ہے۔ جیسے:۔

زید ۱۴۴/۱۲

بیوی ۴	دادیاں ۳	چچا ۱۲
۳/۳۶	۲/۲۴	۷/۸۴

اس صورت میں چار۴ بیویوں کو تین۳ ملے۔ اور ۴ و ۳ میں تباین ہے۔ لہٰذا بیویوں کا پورا عدد یعنی چار لیا گیا۔ اسی طرح ۳ دادیوں کو دو۲ اور ۱۲ چچاؤں کو سات ملے۔ اور تین اور دو۲ میں اور ۱۲ و ۷ میں تباین ہے۔ لہٰذا اُن کا پورا عدد لیا گیا۔ یعنی تین تو دادیوں کا، اور ۱۲ چچاؤں کا عدد۔ اب ہمارے پاس تین عدد ہیں۔ ۴ و ۳ و بارہ۱۲ اور بارہ کے عدد میں ۳ و ۴ دونوں داخل ہیں۔ یعنی ۳ و ۴ دونوں پر بارہ۱۲ تقسیم ہو جاتا ہے۔ تو بڑے عدد یعنی ۱۲ کو اصل مسئلہ یعنی ۱۲ میں ضرب دی۔ جس سے ۱۴۴ حاصل ہوئے۔ اُن میں سے ۳۶ تو چار بیویوں کو دیئے گئے۔ ۲۴ تین دادیوں کو۔ اور ۸۴ بارہ۱۲ چچاؤں کو اب یہ سب حصے سب وارثوں پر پورے پورے بٹ گئے۔

تیسرا۳ قاعدہ یہ ہے۔ کہ وارثوں کے جن گروہوں پر اُن کے حصے برابر نہیں بٹتے۔ اُن کے بعض کے عدد دوسروں کے عدد سے توافق رکھتے ہیں۔ اس صورت میں قاعدہ ہے۔

کہ بعض کے عدد کے وفق کو دوسرے ورثہ کے عدد سے نسبت دی جاوے۔ اگر یہ حاصل ضرب دوسرے ورثہ کے عدد سے توافق رکھتا ہے۔ تو اس مجموعہ کے وفق کو دوسرے ورثہ کے پورے عدد میں ضرب دی جاوے۔ اور اگر اُن دونوں میں تباین ہے۔ تو پورے کو دوسرے ورثہ کے پورے عدد میں ضرب دی جاوے۔ اسی طرح جتنے ورثہ کے حصے برابر نہ ہوں۔ اُن میں یہی معاملہ کیا جاوے جب تمام کام ختم ہو جاوے۔ تو مجموعہ کو مسئلہ کے مخرج میں ضرب دی جاوے۔ اس کی مثال یہ ہے۔

زید

مسـ ۲۴ / ۴۳۲۰

بیوی ۴	لڑکیاں ۱۸	دادیاں ۱۵	چچا ۶
۳ / ۵۴۰	۱۶ / ۲۸۸۰	۴ / ۷۲۰	۱ / ۱۸۰

اس صورت میں میت کے مال کے پہلے چوبیس۲۴ حصے کئے گئے۔ اُن میں سے آٹھواں حصہ یعنی ۳ چاروں بیویوں کو دیا گیا۔ بیویاں چار ہیں۔ اور اُن کے حصے تین۔ چار اور تین میں تباین ہے۔ تو ہم نے اس چار کو محفوظ رکھا۔ اور سولہ لڑکیوں کو ملے۔ اور لڑکیاں ۱۸ ہیں۔ اُن کے حصے ۱۶ اور ۱۶ و ۱۸ میں تداخل نہیں تو دیکھا کہ ۱۶ اور ۱۸ میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا کہ

اُن دونوں عددوں کو دو مٹا سکتا ہے۔ تو ۱۶ و ۱۸ ہیں۔ آدھے کا توافق ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کا آدھا عدد یعنی نو لیتے۔ دادیاں پندرہ ہیں۔ اُن کے حصّے چار اور ۱۵ و ۴ میں تباین ہے۔ اسی طرح چچا چھ ۶ ہیں۔ اُن کا حصّہ ایک اور چھ و ایک میں تباین ہے۔ تو دادیوں اور چچاؤں کے عدد پورے باقی رکھے گئے اب ہمارے پاس اتنے عدد حاصل ہو گئے۔ ۴ و ۶، ۱۵ اور ۹، اب اُن عددوں کو آپس میں دیکھا کہ اُن میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا کہ ۴ و ۶ میں آدھے کا توافق ہے۔ تو چار کے آدھے یعنی دو ۲ کو چھ ۶ میں ضرب دیا ۱۲ حاصل ہوئے اب ۱۲ اور ۹ میں تہائی کا توافق ہے۔ کیونکہ ان دونوں کو ۳ مٹا دیتا ہے۔ پس ۱۲ کے تہائی یعنی ۴ کو ۹ میں ضرب دیا۔ جس سے ۳۶ حاصل ہوئے اور ۳۶ و ۱۵ میں دیکھا گیا تو وہ ہی تہائی کا توافق تھا۔ کہ ۳ پر ۳۶ و ۱۵ دونوں برابر بٹ جاتے ہیں۔ تو ۱۵ کا تہائی ۵ لے کر ۳۶ میں ضرب دیا گیا۔ تو ۱۸۰ حاصل ہوئے۔ اب ۱۸۰ کو ۲۴ میں ضرب دیا گیا۔ تو ۴۳۲۰ حاصل ہوئے۔ جس سے مسئلہ صحیح کیا گیا۔ اس کو ان وارثوں پر اس طرح بانٹا گیا[1]۔ کہ چاروں بیویوں کو ۵۴۰ دیئے گئے اور ۱۸ لڑکیوں کو ۲۸۸۰ دیئے گئے اور ۱۵ دادیوں کو ۷۲۰ دیئے گئے۔ اور ۱۸۰ چھ ۶ چچاؤں کو دیئے گئے۔ مسئلہ صحیح ہو گیا!

چوتھا قاعدہ یہ ہے۔ کہ جب وارثوں کی ایک سے زیادہ جماعتوں پر اُن کے حصّے پورے نہ بٹتے ہوں۔ اور وہ وارثوں کے عدد آپس میں تباین کی نسبت رکھتے ہوں تو ایک گروہ کے عدد کو دوسرے گروہ کے پورے عدد میں ضرب دیں گے۔ اور اس سے جو عدد حاصل ہوگا۔ وہ بھی اگر تیسرے گروہ کے وارثوں کے عدد سے تباین رکھتا ہو۔ تو اس کو بھی تیسرے گروہ کے پورے عدد میں ضرب دیں گے۔ پھر جو عدد ان سب ضربوں سے حاصل ہوگا۔ اس کو مسئلہ کے عدد میں ضرب دیں گے اس کی مثال یہ ہے۔

زید

۵۰۴۰ / ۲۴	بیوی ۲	دادیاں ۶	لڑکیاں ۱۰	چچا ۷
	۳ / ۶۳۰	۴ / ۸۴۰	۱۶ / ۳۳۶۰	۱ / ۲۱۰

اس صورت میں میت کے مال کے چوبیس ۲۴ حصّے کئے گئے۔ دو بیویوں کو تین اور چھ دادیوں

[1] تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چار فریقوں سے زیادہ پر کسر نہیں پڑتی۔ ۱۲ منہ

کو ۴۸ اور دس لڑکیوں کو ۱۱۹ اور سات چچاؤں کو ایک دیا گیا۔ اُن گروہوں میں سے کسی کا حصّہ اُس پر پُورا نہیں تقسیم ہوتا۔ بیویوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں تباین ہے۔ اور دادیوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں آدھے کا توافق ہے۔ تو اس کا آدھا یعنی تین لیا گیا۔ اسی طرح لڑکیوں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں آدھے کا توافق ہے۔ تو لڑکیوں کے عدد کا آدھا لیا گیا۔ یعنی ۵۔ اور چچاؤں کے عدد اور اُن کے حصّوں میں تباین ہے۔ اس کو پُورا رکھا گیا۔ اب ہمارے پاس اتنے عدد ہوئے ۲ و ۳ و ۵ و ۷ اُن سب میں آپس میں تباین ہے۔ تو دو کو تین میں ضرب دی چھ حاصل ہوئے۔ اور چھ اور پانچ میں تباین ہے۔ تو چھ اور پانچ میں ضرب سے ۳۰ حاصل ہوئے اسی طرح ۳۰ و ۷ میں تباین ہے۔ تو ۳۰ کو ۷ میں ضرب دینے سے کل ۲۱۰ حاصل ہوئے۔ اس ۲۱۰ کو اصل مسئلہ کے مخرج یعنی ۲۴ میں ضرب دی۔ تو کل ۵۰۴۰ حاصل ہوئے۔ اس سے مسئلہ صحیح کیا گیا۔ اور پھر وارثوں پر اس طرح بانٹ دیا۔ کہ دونوں بیویوں کو ۶۳ چھ دادیوں کو ۸۴۰ دس لڑکیوں کو ۳۳۶ اور سات چچاؤں کو ۲۱۰!

صحیح کیئے ہوئے مسئلہ سے ہر گروہ اور اس کے ہر وارث کو علیحدہ علیحدہ حصہ دینے کا طریقہ اور اس کا بیان

مسئلہ کو بیان کئے ہوئے طریقوں سے صحیح کرنے کے بعد جب کہ وارثوں کے ہر گروہ کو اس سے

حاشیہ باقی۔ صحیح کئے ہوئے مسئلہ سے وارثوں کو بانٹنے کا قاعدہ۔ یہ ہے کہ جس عدد کو اصل مسئلہ میں ضرب دی گئی تھی۔ اس عدد میں اس وارث کے اس حصّہ کو ضرب دے دی جاوے۔ جو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ جیسے یہاں ۱۸۰ کو ۲۴ میں ضرب دیا گیا ہے۔ تو اب صحیح کئے ہوئے مسئلہ یعنی ۴۳۲۰ سے ہر وارث کو اس طرح دیں گے کہ جس کو ۲۴ میں سے جس قدر حصّے ملے ہوں گے۔ اُن حصّوں کو ۱۸۰ میں ضرب دیں گے۔ جو حاصل ہوگا وُہ اُس وارث کو دیا جائے گا۔ یہاں ۲۴ میں سے چار بیویوں کو تین ملے تھے۔ اُن تین کو ۱۸۰ میں ضرب دی۔ ۵۴۰ حاصل ہُوئے۔ وُہ بیویوں کا حصّہ ہوا۔ اور لڑکیوں کو ۲۴ میں سے ۱۶ ملے تھے۔ اُن ۱۶ کو ۱۸۰ میں ضرب دیا۔ تو کُل ۲۸۸۰ ہوئے۔ یہ لڑکیوں کو دیئے گئے۔ اسی طرح عقل سے معلوم کرلو۔ انشاءاللہ اس کا بیان آگے بھی آوے گا ۱۲ منہ۔

حصّہ دینا چاہیں۔ تو جس عدد کو اصل مسئلہ کے مخرج میں ضرب دی گئی تھی۔ اُس عدد میں ہر گروہ کے اُس حصّہ کو ضرب دی جاوے۔ جو اُس کو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ پھر جو حاصل ہو۔ وُہ ہی اس گروہ کا حصّہ ہے۔ جیسے مسئلہ نمبر ۳۴ سے ہُوا۔ اور ۲۱ کو ۳۴ میں ضرب دے کر مسئلہ کو تصحیح کیا گیا۔ تو جس گروہ کو ۳۴ میں سے ۱۶ ملے تھے۔ اُس کے حصّے ۱۶ کو ۲۱ میں ضرب دی جاوے۔ اُس سے جو ۳۳۶ حاصل ہُوئے وُہ اُس گروہ کا حصّہ ہے۔ اب اگر اس حصّہ کو اس گروہ کے وارثوں پر الگ الگ بانٹنا چاہو۔ تو اس ۳۳۶ کو گروہ کے وارثوں پر بانٹ دیں۔ جو حاصل ہُوا۔ وُہ اُس کا حصّہ ہے۔ اسی طرح اوروں کو معلوم کرنا چاہیئے ؛

میت کا مال اس کے وارثوں اور قرض خواہوں پر بانٹنے کا بیان

جس عدد سے مسئلہ کو تصحیح کیا گیا ہے۔ اُس میں اور میّت کے چھوڑے[۱] ہُوئے مال میں اگر برابری ہے۔ تو ضرب وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ جیسے مسئلہ ۲۴ سے بنایا گیا۔ اور مرحوم نے ۲۴ روپیہ چھوڑے تو ۲۴ روپیہ پورے بٹ گئے۔ لیکن اگر میّت کے چھوڑے ہُوئے مال اور مسئلہ کے عدد میں برابری نہیں۔ تو اگر دونوں میں تباین ہے۔ تو اصل مسئلہ سے ہر گروہ کو جتنا حصّہ پہونچا ہے۔ اُس کو چھوڑے ہُوئے مال میں ضرب دیا جاوے۔ پھر جو ضرب سے حاصل ہُوا ہو۔ اُس کو تصحیح کئے ہوئے اصل مسئلہ کے عدد[۲]

ف۱ :: چھوڑے ہُوئے سے وُہ مال مُراد ہے۔ جو روپیہ یا اشرفی کی قسم سے ہو۔ یا مال منقول یا غیر منقول کہ جس کی قیمت روپیہ یا اشرفی سے لگائی جاتی ہو ۱۲ منہ ؛

ف۲ :: اور اگر عول ہو۔ تو اس کے عدد پر بانٹا جاوے۔ اسی طرح اور جگہ بھی اگر عدد عول ہو۔ تو اس پر تقسیم کیا جاوے گا ۱۲ منہ ؛

پر بانٹ دیا جاوے۔ جو حاصل ہو۔ وُہ اِس گروہ کا حِصّہ ہے۔ جیسے کہ:۔

مسئلہ ۶ — زیدؔ

ماں ۱ — باپ ۱ — بیٹی ۲ = ۴

اِس صُورت میں مسئلہ چھہ سے بنا۔ ایک ایک ماں باپ کو دیا گیا۔ اور دوؔ لڑکیوں کو چار مگر میّت نے سات روپیہ چھوڑے ہیں۔ تو ماں باپ اور لڑکیوں کو جتنے حصّے چھہ ۶ میں سے ملے ہوں۔ اُن کو سات میں الگ الگ ضرب دے کر چھ ۶ پر بانٹ دیا جاوے۔ جیسے لڑکیوں کو چار ملے ہیں۔ تو چار کو سات میں ضرب دی جاوے۔ ۲۸ حاصل ہُوئے۔ ان ۲۸ کو ۶ پر بانٹ دیا جاوے۔ تو چار ۴ پُورے اور ۲ تہائی ⅔ حصّے ہوئے۔ یعنی چار ۴ روپیہ پُورے اور باقی ۴ روپے کے ۶ حصّے کرو۔ اُن میں سے ایک یعنی دس آنہ آٹھ پائی لڑکیوں کا حصّہ ہُوا۔ اسی طرح اوروں کے حصّے معلوم کر لو۔ اور اگر مسئلہ کے عدد اور چھوڑے ہوئے مال میں توافق ہو۔ تو ہر گروہ کے حصّہ کے وفق کو چھوڑے ہُوئے مال کے وفق میں ضرب دو۔ جو عدد ضرب سے حاصل ہو۔ اِس کو مسئلہ کے مخرج کے وفق پر تقسیم کرو۔ جیسے:۔

مسئلہ ۶ — زیدؔ ۸

ماں ۱ — باپ ۱ — لڑکی ۲ = ۴

اِس صُورت میں مسئلہ چھ ۶ سے بنا۔ اور مرنے والے نے آٹھ روپے چھوڑے ۸ و ۶ میں آدھے کا توافق ہے۔ یعنی دوؔ ۲ چھ ۶ و آٹھ ۸ دونوں کو مٹا سکتا ہے۔ تو وارثوں میں سے ہر ایک گروہ کے حصّے کو ۸ کے آدھے چار ۴ میں ضرب دی۔ جو حاصل ہُوا۔ اِس کو چھ ۶ کے آدھے یعنی تین پر بانٹ دیا۔ جو نکلا وُہ ہر گروہ کا حِصّہ ہے۔ یہاں لڑکیوں کے حِصّے یعنی چار ۴ کو آٹھ ۸ کے آدھے یعنی چار میں ضرب دی۔ ۱۶ حاصل ہوئے۔ اِس ۱۶ کو ۶ کے آدھے یعنی ۳ پر بانٹ دیا۔ تو ۵ ⅓ ملے۔ یعنی ۵ پُورے اور باقی ایک کا تہائی ⅓ لڑکیوں کو ملا۔ اب جو حصّہ اِس طریقہ سے ہر گروہ کو ملا۔ اگر اِس حصّہ میں سے

ہر شخص کا الگ الگ حصّہ معلوم کرنا چاہیں۔ تو اِس کا قاعدہ یہ ہے:

کہ جو حصّہ وارث کو اصل مسئلہ سے ملا ہے۔ اس کو یا تو پُورے چھوڑے ہُوئے مال میں ضرب دیں۔ اگر مال اور اصل مسئلہ کے مخرج میں تباین ہو۔ یا چھوڑے ہوئے مال کے وفق میں ضرب دیں اگر چھوڑے ہوئے مال اور مسئلہ کے مخرج میں توافق ہے۔ پھر جو حاصل ہُوا۔ اِس کو پُورے مسئلہ کے عدد پر دُوسری صُورت میں یعنی جب کہ مال و اصل مسئلہ کے عددوں میں توافق ہو تقسیم کریں۔ جو حاصل ہو وُہ اِس وارث کا حِصّہ ہے۔ جیسے کُل لڑکیوں کو ۵ پانچ ملا ہے۔ اب ہر ایک لڑکی کا الگ الگ حِصّہ معلُوم کرنا ہے۔ تو اصل مسئلہ یعنی چھ ۶ میں سے جو دو ۲ دو ہر ایک لڑکی کو ملے تھے۔ اِس دو ۲ سے متروکہ مال کے وفق چار کو ضرب دیا۔ ۸ حاصل ہُوئے۔ اِس کو اصل مسئلہ ۶ کے وفق یعنی ۳ پر تقسیم کیا۔ تو ۲ $\frac{2}{3}$ نکلا۔ وہ ہر ایک لڑکی کا الگ حصّہ ہے۔ اسی طرح سب کو معلُوم کر لو۔ یہ تو وارثوں کے حِصّہ کا بیان ہُوا۔ اب اگر میّت پر چند لوگوں کا قرض تھا۔ تو ہر شخص کے قرض کو وارث کے حصّہ کی طرح مان کر وُہی کام کرو۔ جو میّت کے وارثوں کے حصّے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ جیسے ایک آدمی مرا۔ اُس پر زید کے دو ۲ روپیہ محمد کے ۴ روپیہ اور احمد کے تین روپیہ قرض تھے۔ تو کُل قرضہ ۹ روپیہ ہُوا۔ اور اُس کے کفن دفن کے بعد کُل ۸ روپیہ بچے۔ تو اُن قرض خواہوں کے قرضوں کو حصّہ کی طرح بنا دو۔ اس طرح:۔

عبدالرحمٰن ۸

مد ۹

زید ۲ محمد ۴ احمد ۳

اِس صُورت میں ہر شخص کے قرض کو اِس کے نیچے رکھا۔ اور اُن تمام قرضوں کو ملا کر مجموعہ بنا۔ اُس کو اصل مسئلہ بنا دیا۔ اب اِس عدد سے اور چھوڑے ہُوئے مال سے نسبت دے کر اُسی قاعدہ سے بانٹو۔ جو اُوپر گزرا ؛

کسی وارث کے حصّہ سے نکل جانے کا بیان

وارثوں میں سے اگر کوئی وارث اپنا حصّہ میّت کے مال سے نہ لے۔ بلکہ معاف کر دے۔ تو مسئلہ کے عدد سے اُس کا حصّہ نکال کر جو باقی بچے۔ اُسی کو دُوسرے وارثوں پر بانٹ دو۔ پھر جو حاصل ہو۔ وُہ ہر وارث کا حصّہ ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے:۔

میت ۶ فاطمہ

خاوند	ماں	چچا
۳	۲	

اِس صُورت میں چھ ۶ سے مسئلہ بنایا گیا۔ جس میں سے تین خاوند کا حق ہے۔ اور ۲ ماں کا اور ایک چچا کا۔ خاوند نے اپنا حصّہ معاف کر دیا۔ تو اِس تین کو چھ ۶ سے نکال دیا۔ تین باقی بچے اِسی تین سے مسئلہ بنایا۔ اب دیکھا کہ چھ ۶ میں سے ماں کو دُو ملے تھے۔ اور چچا کو ایک تو اُن تین میں سے دُو ۲ ماں کو دیئے گئے۔ اور ایک چچا کو مطلب یہ ہُوا۔ کہ اگر خاوند اپنا حصّہ لیتا۔ تو مال کے چھ ۶ حصّے ہوتے اور اِس میں سے ماں کو دُو۔ اور چچا کو ایک ملتا۔ اب جب خاوند نے اپنا حصّہ مُعاف کر دیا۔ تو میّت کے کُل مال کے تین حصّے کر دیئے۔ اور تین میں سے ماں کو دُو۔ اور چچا کو ایک دے دیا۔ یا اِس طرح سمجھو:۔

میت $\frac{۳۲}{۸}$ زید

بیوی	بیٹے ۴
$\frac{۱}{۴}$	$\frac{۷}{۲۸}$

اِس صُورت میں ۸ سے مسئلہ بنا۔ اور ۳۲ سے تصحیح کیا گیا۔ کیونکہ ۸ میں سے ایک بیوی کو دیا گیا۔ تو باقی ۷ چار لڑکوں کے حِصّے میں آئے۔ اور ۴ و ۷ میں تباین ہے۔ تو ۴ کو مسئلہ کے مخرج ۸ میں ضرب دی۔ ۳۲ حاصل ہوئے۔ اِس ۳۲ میں سے ۴ بیوی کو دے دیئے۔ اور سات سات ۴ بیٹوں کو۔ اب اُن

میں سے اگر کوئی بیٹیا اپنا حصہ معاف کردے۔ تو ۳۲ میں ۷ نکال دو باقی ۲۵ رہے۔ اُس ۲۵ میں سے ۴ بیوی کو سات سات ۳ بیٹیوں کو دے دو ؞

میت کا مال وارثوں پر دوبارہ بانٹنے کا بیان

جب کہ میت کے ذی فرض وارثوں سے مال بچ رہے۔ اور اُس بچے مال کا لینے والا کوئی وارثوں میں سے نہ ہو۔ تو اس بچے ہوئے مال کو اُن ہی ذی فرض وارثوں پر دوبارہ بانٹ دیں گے۔ سبھی کو پہلے دے چکے تھے۔ اور جتنا جتنا پہلے۔ اُن ذی فرض وارثوں کو دیا گیا تھا۔ اتنا ہی دوبارہ دیا جاوے گا۔ جیسے پہلے لڑکیوں کو اگر دو تہائی دیا گیا تھا۔ تو اب بھی اتنا ہی دو۔ سوائے خاوند اور بیوی کے۔ کہ اُن کو بچا ہوا مال دوسری مرتبہ نہیں ملتا[ل]۔ اب اُس مال کو دوبارہ بانٹنے کے چار قاعدے ہیں۔ پہلا قاعدہ تو یہ ہے۔ کہ میت کے ایک ہی طرح کے وارث ہوں۔ اور اُس کے ساتھ

ل: مگر آج کل بیت المال نہیں ہے۔ اور اگر کسی جگہ ہے بھی تو وہاں کا بادشاہ یا دوسرے لوگ اُس کا ٹھیک انتظام نہیں کرتے۔ اور اُس کے مال کو مناسب جگہ خرچ نہیں کرتے۔ اس لئے اگر بیوی یا خاوند کے سوائے کوئی اور شخص اُس بچے ہوئے مال کا حق دار نہ ہو۔ یعنی نہ تو کوئی عصبہ ہو۔ نہ کوئی ذی فرض نہ ذی رحم نہ مولا موالات وغیرہ غرض کہ کوئی بھی اس کا حق نہ رکھتا ہو۔ تو یہ بچا ہوا مال پھر دوبارہ خاوند یا بیوی ہی کو دے دیں گے اور بیت المال میں نہ جانے دیں گے۔ بلکہ اگر میت کے خاوند یا بیوی بھی نہ ہوں۔ تو دودھ شریکے بھائی بہن کو دے دیں گے۔ ہر طرح کوشش کریں گے۔ کہ بیت المال میں میت کا مال نہ جاوے ۱۲ ردالمحتار منہ ؞

ط: بیت المال سے مراد یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کا مال ایک جگہ اس لئے رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے کاموں میں اُسے خرچ کیا جاوے۔ رہی بات یہ کہ بیت المال کتنی قسم کا ہے۔ اور اس کا مال کہاں کہاں خرچ کیا جاوے۔ اس کی بحث بڑی ہے۔ یہاں اس کے بیان کا موقعہ نہیں اور یہ بات ظاہر ہے (باقی حاشیہ صفحہ آگے۔

خاوند یا بیوی نہ ہو۔ اس صورت میں وارثوں کے عدد سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ جیسے کوئی شخص مرا۔ اُسنے فقط ۲ دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اس صورت میں بیوی موجود نہیں۔ اور وارث ایک ہی طرح کے ہیں۔ یعنی فقط لڑکیاں ہیں۔ تو اب مال کو ۲ دو حصّہ کرکے ایک حصّہ ایک لڑکی کو اور دُوسرا حصّہ دُوسری لڑکی کو دے دیا جاوے ؛

دُوسرا ۲ قاعدہ یہ ہے۔ کہ میّت نے کئی طرح کے وارث چھوڑے۔ اور بیوی یا خاوند نہ چھوڑے تو اس صورت میں جتنے حصّے اُن سب وارثوں کے ہوتے ہوں۔ اُن حصّوں کے مجموعہ کے عدد سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ جیسے ایک آدمی مرا۔ اس نے ایک ماں اور ۲ دو لڑکیاں چھوڑیں۔ اس صورت میں وارث ۲ دو طرح کے ہیں ؛

(۱) ایک ماں اور (۲) دُوسری لڑکیاں ؛ ماں کا حق چھٹا حصّہ ہے۔ اور لڑکیوں کا حق ۲ دو تہائی۔ تو مسئلہ ۶ چھ سے بنایا۔ اس میں سے ایک ماں کو اور چار ۲ دو لڑکیوں کو دے دیئے ایک باقی بچا۔ اس کا لینے والا کوئی نہیں۔ تو ان وارثوں کے حصّوں کو ملا کر دیکھا۔ وہ کُل پانچ تھے۔ لہذا پانچ سے مسئلہ بنا دیا گیا۔ اس پانچ میں سے ایک ماں کو اور ۴ چار دونوں لڑکیوں کو دے دیئے گئے۔

تیسرا قاعدہ یہ ہے۔ کہ وارث تو ایک ہی قسم کے ہوں۔ مگر اُن کے ساتھ بیوی یا خاوند بھی ہو۔ جن پر مال دوبارہ نہیں بٹتا۔ اس کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ بیوی یا خاوند کے حصّہ کا جو مخرج ہو۔ اُس سے مسئلہ بنا دیا جاوے۔ اور اُس سے بیوی یا خاوند کا حق دے دیا جاوے۔ پھر جو باقی بچے۔ اگر دُوسرے وارث پر برابر بٹ جاتا ہے۔ تو اچھا جیسے :۔

مسئلہ ۴ فاطمہ

خاوند ۱ — لڑکیاں ۳ ۳

بقیہ حاشیہ : کہ اس زمانہ میں ظلم بڑھا ہُوا ہے۔ لوگوں میں امانت نہیں رہی بیت المال کے مال کے منتظمین اپنے گھر خرچ کریں گے۔ اس لئے یہ انتظام کیا گیا۔ کہ مسلمانوں کے مال کو وہاں نہ پہنچایا جاوے ۱۲ منہ ؛

اِس صُورت میں خاوند کا حق چوتھائی حصّہ تھا۔ تو چوتھائی کے مخرج چار سے مسئلہ بنایا گیا۔ باقی جو تین بچے۔ وُہ تین لڑکیوں پر پُورے پُورے بٹ گئے :۔

مسئلہ پُورا ہوگیا۔ اور اگر باقی بچا ہُوا مال دُوسرے وارث پر برابر نہیں بٹتا تو دیکھو۔ کہ وارثوں کے عدد اور باقی بچے ہُوئے عددمیں کیا نسبت ہے۔ اگر تباین ہو۔ جب تو پُورے وارثوں کے عدد کو پُورے مخرج میں ضرب دے دی جاوے۔ اور اگر توافق ہو۔ تو وارثوں کے عدد کے وفق کو مخرج میں ضرب دے دی جاوے۔ تباین کی مثال یہ ہے :۔

مسئلہ ۴ / ۲۰ فاطمہ

لڑکیاں ۵	خاوند
۳ / ۱۵	۱ / ۵

اِس صُورت میں چار سے مسئلہ ہُوا۔ ایک خاوند کو ملا۔ باقی تین ۵ لڑکیوں کے لئے بچے اور تین و پانچ میں تباین ہے۔ لہٰذا پُورے پانچ کو چار میں ضرب دی۔ تو بیس ۲۰ حاصل ہُوئے۔ اب ۲۰ میں سے ۵ خاوند کو اور باقی پندرہ پانچ لڑکیوں کو دیا :۔

چوتھا قاعدہ یہ ہے۔ کہ میّت کے کئی طرح کے وارث ہوں۔ اور اُن کے ساتھ بیوی یا خاوند بھی ہو۔ اِس صورت میں یہ کیا جاوے گا۔ کہ پہلے تو بیوی یا خاوند کے حق کے مخرج سے مسئلہ بناکر اُس بیوی یا خاوند کا حق اُس مال سے دے دیا جاوے گا۔ اب جو باقی بچیں۔ وُہ اگر دُوسرے وارثوں پر پُورے پُورے بٹ جاتے ہوں۔ جب تو خیر جیسے۔ کہ

مسئلہ ۴

ماں شریکی بہن ۲	دادیاں ۴	بیوی
۲	۱	۱

اِس صُورت میں دادیوں کا حق چھٹا یعنی چھ ۶ میں سے ایک ہے۔ اور ماں شریکی بہنوں کا حق تہائی یعنی

چھ۶ میں سے دو۲ بہنیں تو دادی اور بہنوں کے کل حصے تین ہوئے ۔ اور جب کہ چار۴ سے مسئلہ بنا کر اس میں سے ایک تو بیوی کو دے دیا گیا۔ تو تین ہی باقی بچے۔ جو دادی اور بہنوں کے حصوں کے برابر ہیں۔ اور اگر باقی بچے ہوئے عدد دوسرے وارثوں کے حصے کے برابر نہ ہوتے ہوں۔ تو اس کا قاعدہ یہ ہے:۔

کہ بیوی یا خاوند کے حق کے مخرج سے مسئلہ کیا جاوے۔ اور دوسرے وارثوں کے حصوں کو ملا کر مخرج میں ضرب دی جاوے۔ جو عدد ضرب سے حاصل ہو۔ اس سے مسئلہ بنایا جاوے۔ اب جو بیوی یا خاوند کو حصہ ملا تھا۔ اس کو باقی وارثوں کے حصوں کے مجموعہ میں ضرب دی جاوے۔

۔ اور دوسرے وارثوں کے حصوں کے مجموعہ

کو اس عدد میں ضرب دی جاوے۔ جو بیوی یا خاوند کو اس کا حصہ دینے کے بعد مخرج سے بچا۔

جیسے:۔

۸/۴۰

مسـ ۵ زید

بیوی ۴	لڑکیاں ۹	دادیاں ۶
۱/۵	۴/۲۸	۱/۷

اس صورت میں بیوی کا حق آٹھواں حصہ ہے۔ یعنی آٹھ میں سے ایک اور لڑکیوں کا حصہ دو تہائی یعنی چھ میں سے چار اور دادیوں کا حق چھٹا حصہ یعنی چھ میں سے ایک ہے۔ لڑکیوں اور دادیوں کا حصہ ملایا گیا تو کل پانچ ہوئے۔ ان پانچوں کو خیال میں رکھے۔ آٹھ سے مسئلہ بنا۔ اس میں سے ایک تو بیوی کو دیا جاوے، باقی بچے۔ اب پانچ کو

(جو لڑکیوں اور دادیوں کے حصوں کا مجموعہ ہے) ۸ میں ضرب دی۔ تو ۴۰ حاصل ہوئے۔ اس سے مسئلہ بنایا گیا۔ بیوی کو جو ایک ملا تھا۔ اس کو ۵ میں ضرب دے کر بیوی کو دے دیا گیا۔ دادیوں کو جو چھ۶ میں سے ایک ملا تھا۔ اس ایک کو ۷ میں ضرب دی۔ تو ۷ حاصل ہوئے۔ وہ ۷ دادیوں کو دے دیئے۔ اور لڑکیوں کو چھ۶ میں سے چار۴ ملے تھے۔ ان چار۴ کو ۷ سے ضرب دی۔ تو ۲۸ حاصل ہوئے۔ وہ لڑکیوں کو دے دیئے گئے:۔

مناسخہ کا بیان

مناسخہ کے معنی یہ ہیں۔ کہ مال کے بعض حصے تقسیم سے پہلے میراث بن جاویں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ایک میت کا مال اس کے وارثوں میں ابھی تقسیم نہ ہوا تھا۔ کہ بعض وارث مر گئے۔ لہٰذا اب اس میت کا مال اس مردہ وارثوں کے وارثوں کو ملے گا۔ یہ مناسخہ ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو۔ کہ:۔

"شکل نمبر ۱"

فاطمہ

خاوند بیٹی ماں

"شکل نمبر ۲"

خاوند

بیوی ماں باپ

شکل نمبر ۳:۔

بیٹی

بیٹے ۲ بیٹی ۱ دادی

"شکل نمبر ۴"

دادی

خاوند بھائی

اس فاطمہ کا مال اس کے وارثوں پر تقسیم نہ ہونے پایا تھا۔ کہ اس کے خاوند کا انتقال ہوگیا۔ اس خاوند نے شکل نمبر ۲ کے وارث چھوڑے۔ جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے۔ پھر فاطمہ کی بیٹی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس نے شکل نمبر ۳ والے وارث چھوڑے۔ پھر اس کی دادی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے شکل ۴

کے وارث چھوڑے۔ مناسخہ کا قاعدہ یہ ہے:۔

کہ اوّل پہلے مسئلہ کو جس کی میّت فاطمہ ہے۔ صحیح کر لو۔ اور اس سے اُس کے جتنے وارث[ف] تھے۔ اُن کا حصّہ دیدو۔ پھر دُوسرے مسئلہ کو جس میں میّت خاوند ہے۔ صحیح کرو۔ اور اُس صحیح کئے ہُوئے عدد سے خاوند کے جتنے وارث تھے۔ اُن کو دے دو۔ اب دیکھو۔ کہ جو حصّہ خاوند کو پہلی میّت یعنی فاطمہ کے مال سے ملا ہے۔ اُس کے عدد اور اُس خاوند کے مسئلہ کے عدد میں کیا نسبت ہے۔ اگر خاوند کا حصّہ جو اُسے فاطمہ کے مال سے ملا ہے۔ اُس کے وارثوں پر برابر بٹ جاوے۔ تو بہت اچھا۔ اور اگر برابر نہ بٹے۔ تو دیکھو۔ اگر اس کی تصحیح اور اس کے پہلے ورثہ کے عدد میں توافق ہے۔ تو دُوسرے مسئلہ کے وفق کو پہلے مسئلہ کے صحیح کئے ہُوئے عدد میں ضرب دے دو۔ اور اگر دُوسرے مسئلہ کی تصحیح اور اس کی میت کا جو مال ہے اُس میں تباین ہے۔ تو دُوسرے مسئلہ کے پُورے صحیح کئے ہُوئے عدد کو پہلے مسئلہ کے پُورے صحیح کئے ہُوئے عدد میں ضرب دے دو۔ اب جو عدد اس ضرب سے حاصل ہُوا۔ یہ پہلے اور دُوسرے دونوں مسئلوں کا مخرج ہُوا۔ اب پہلے مسئلہ کے وارثوں کو جو حصّہ پہلے مل چکا تھا۔ اُس حصّہ کو اس عدد میں ضرب دو۔ جس کو پہلے مسئلہ کی تصحیح میں ضرب دیا گیا ہے۔ اور دُوسرے مسئلہ کے وارثوں کو جو دُوسرے مسئلہ سے حصّہ ملا ہے۔ اُس عدد میں ضرب دو۔ جو میّت کے پاس ہے۔ اگر اس میّت کے پاس کے عدد اور اس مسئلہ کے صحیح کئے ہُوئے عدد میں تباین ہے۔ اور اگر توافق ہے۔ تو اس میت کے وارثوں کے حصّوں کو جو پہلی صحیح شدہ تقسیم سے حاصل ہو چکے ہیں۔ اُس میّت کے پاس کے عدد کے وفق میں ضرب دے دو۔ اب تیسرا اور چوتھا مسئلہ جو باقی رہا۔ اُس کے اندر بھی یہی کام کرو۔ جو دُوسرے مسئلہ میں

ف: پہلے مسئلہ کو صحیح کرتے وقت وُہ تمام لوگ وارث شمار کرلئے جائیں گے۔ جو فاطمہ کے مرنے وقت موجود تھے۔ اگرچہ اب تو اُن میں سے بعض وارث مر چکے ہیں۔ ۱۲ منہ؛

کیا۔ یعنی دُوسرے مسئلہ کی تصحیح کو پہلے مسئلہ کی تصحیح میں ضرب دینے سے جو حاصل ہوا۔ اس پورے مجموعہ میں تیسرے مسئلہ کے صحیح کئے ہوئے عدد کو ضرب دے دی جاوے۔ اسی طرح آئندہ کام کیا جاوے۔ اُس کی مثال یہ ہے :۔ مثلا :۔

۱۲۸ / ۳۲ / ۱۶ / ۴ — مثلا :۔ — فاطمہ

خاوند	بیٹی	ماں
۱/۴	۹	۳/۶

مسئلہ نمبر ا :۔ میں ردّ ہو گا۔ یعنی وارثوں پر دوبارہ مال بانٹنا پڑیگا۔ کیونکہ مسئلہ ۱۲ سے ہو کر خاوند کو تین اور بیٹی کو چھ اور ماں کو ۲ ملتے ہیں۔ کل ۱۱ ہوگئے۔ ایک بچا۔ اب اس کو ردّ کرنا پڑا۔ اس طرح کہ اول مسئلہ چار سے بنا کر خاوند کو ایک دے دیا۔ اور بیٹی اور ماں کے حصّے تھے۔ چار اور یہاں کل ۳ باقی بچے۔ تو چار کو چار میں ضرب دی ۱۶ حاصل ہوئے۔ اس سولہ میں سے چار خاوند کو۔ اور ۹ بیٹی کو اور تین ماں کو دیئے۔ نمبر ا کے مسئلہ کا کام ختم ہوا :۔

۴ — مُساوات — خاوند ۴

نمبر ۲ :۔

بیوی	ماں	باپ
۱/۴ / ۸	۱/۴ / ۸	۲/۴ / ۱۶

اب نمبر ۲ کا مسئلہ دیکھا۔ تو چار سے صحیح ہوتا ہے۔ اور خاوند کو پہلے مسئلہ سے چار ہی ملے ہیں۔ تو چار پر برابر بٹ گئے۔ اس میں ایک بیوی کو اور ایک ماں کو اور دو باپ کو دے دیا گیا۔ اس کا بھی کام پورا ہوا۔ اب دیکھا مسئلہ نمبر ۳ :۔

مسئلہ نمبر ۳۔ صفحہ نمبر ۔ پر دیکھئے :۔

مسئلہ نمبر ۳ :-

وفق ۳ بیٹی ۹	توافق بالثلث	وفق ۲ ۶ مسئلہ
بنت	بیٹے ۲	دادی
۱/۳	۴/۱۲	۱/۳
۱۲	۴۸	

اس میں مسئلہ چھ سے بنتا ہے۔ اور بیٹی کے پاس پہلے مسئلہ سے ملے ہوئے ۹ ہیں۔ اور ۹ و ۶ میں تہائی کا توافق ہے۔ کیونکہ ۹ و ۶ دونوں کو ۳ فنا کر دیتا ہے۔ تو چھ۶ کا تہائی ڈو۲ لے کر اس کو پہلے مسئلہ کے عدد یعنی ۱۶ میں ضرب دیا۔ ۳۲ حاصل ہوئے۔ اس ۳۲ میں سے پہلے مسئلہ میں مال کے حصّے کو ڈو۲ سے ضرب دیا۔ تو چھ حاصل ہوئے۔ اسی ۲ کے مسئلہ میں بیوی اور ماں باپ کے حصّوں کو دو میں ضرب دو۔ تو بیوی کو ۱۲، اور ماں کو ۲، اور باپ کو چار ملے ؛؛

اب نمبر ۳ کے مسئلہ کے وارثوں کے حصّوں کو اس عدد کے تہائی میں ضرب دیا۔ جو میّت کے پاس ہے۔ اور وُہ ۹ ہیں۔ اس کی تہائی ۳ ہوئے۔ اس ۳ کے وارثوں کے حصّوں کو جب ۳ میں ضرب دیا۔ تو دادی کو تین اور دو لڑکوں کو ۱۲ اور لڑکی کو ۳ ملے۔ اب سب حصّوں کو جمع کیا گیا۔ تو وُہی ۳۲ ہو گئے۔ نمبر ۳ کے مسئلہ کا کام ختم ہوا ؛؛

(مندرجہ بالا مسئلہ ۳ کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے :-)

دادی ۹	تباین	۴/۲ مسئلہ نمبر ۴
		خاوند
	بھائی ڈو۲ عدد	۱/۲
	۲/۱۸	۱۸

اب نمبر ۴ کے مسئلہ میں دادی میّت ہے۔ اس کو پہلے ۹ مل چکے ہیں۔ نمبر ۱ کے مسئلہ میں چھ۶ اور نمبر ۳ کے مسئلہ میں نمبر ۳ اور نمبر ۴ کا مسئلہ بنا ہے۔ ۴ سے اور چار اور نو۹ میں تباین ہے۔ تو پُورے چار کو

۳۲ میں ضرب دی۔ ۱۲۸ حاصل ہوئے رہا۔ اب اوپر کے تین مسئلوں کے وارثوں کے حصّوں کو تو چار میں ضرب دیں گے۔ اور نمبر ۴ کے وارثوں کے حصّوں کو نو میں اس سے اس طرح حساب بنے گا۔ کہ نمبر ۱ کے وارث تو سب مر چکے۔ اور اُن ہی کے مال کے حصّے بٹ رہے ہیں۔ نمبر ۲ میں بیوی اور ماں باپ کے حصّوں کو ۴ میں ضرب دیں۔ تو بیوی کو ۴ اور ماں کو ۸ اور باپ کو ۱۶ ملے۔ نمبر ۳ کے مسئلہ میں دادی مر چکی۔ اُسی کا مال بٹ رہا ہے تو دو بیٹوں اور بیٹی کے حصّوں کو ۴ میں ضرب دی تو لڑکوں کو ۴۸ اور لڑکی کو ۱۲ ملے نمبر ۴ کے وارثوں کے حصّوں کو ۹ میں ضرب دی۔ تو خاوند کو ۱۸ اور دو بھائیوں کو ۱۸ ملے۔ اب کُل حصّوں کو جب جمع کیا۔ تو وہی ۱۲۸ حاصل ہوئے مسئلہ ختم ہوا۔ اُس کے بعد تمام زندہ لوگوں کے نام اُن کے حصّوں کے ساتھ ایک جگہ "الاحیاء" لکھ کر اُس کے نیچے لکھ دو۔ اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں۔ اُن کے نام کے نیچے "ں" اس طرح کا ہلالی خط لگا دو۔ تاکہ نشان رہے۔

المناسخہ

الاحـــــــــــــــیاء

خاوند	دو بھائی	دو بیٹے	بیٹی	باپ	ماں	بیوی
۱۸	۱۸	۴۸	۱۲	۱۶	۸	۸

۸
۸
۱۶
۴۸
۱۲
۱۸
۱۸
۱۲۸

ذی رحم وارثوں کا بیان

"ذی رحم" میّت کا وہ رشتہ دار وارث ہے۔ جو ذی فرض اور عصبہ نہ ہو۔ یہ ذی رحم وارث بھی عصبہ

۱؎ مناسخہ کا مسئلہ لکھنے کی ترکیب یہ ہے کہ لفظ میّت کو لمبا کر کے لکھے۔ اور اُس کے اُلٹی جانب میں میّت کا نام لکھا۔ اور سیدھے کنارے پر وہ عدد لکھا۔ جس سے یہ مسئلہ بنے گا۔ پھر میّت کے نام کے اُلٹی طرف ایک لکھ کر اُس مال کے عدد لکھے جو میّت کے پاس پہلے مسئلہ میں ملے ہوئے موجود ہیں اور میّت کے نام اور مسئلہ کے عدد کے بیچ میں میّت کے مال کے عدد اور مسئلہ کے عدد کے درمیان والی نسبت لکھیں۔ تاکہ اس میں آسانی رہے۔ اُس کی مثال وہ ہے جو مسئلہ نمبر ۳ میں گئی۔ وہ یہ ہے۔ م‍ـــــــ اگر سہم اور عدد کے درمیان کے مسئلہ میں

توافق بالثلث بیٹی سہم ۹ ثلث ۳

کی طرح چار قسم کے ہیں۔ پہلی قسم جو میّت کی اُولاد میں ہوں۔ جیسے نواسی نواسے اور پوتی کی اولاد۔ دوسری قسم وہ کہ میّت جن کی اولاد میں ہو جیسے فاسد دادی اور فاسد دادا جیسے ماں کا باپ، نانا اور ماں کی دادی۔ کہ یہ میّت کا فاسد دادا اور فاسد دادی ہیں۔

تیسری قسم وُہ جو میّت کے ماں باپ کی اولاد میں ہوں۔ جیسے میّت کے بھانجے، بھانجی یعنی میّت کی بہن کی اولاد چوتھی قسم وُہ جو میّت کے دادا، نانا کی اولاد ہوں۔ جیسے ماموں، خالہ پھوپھی اور باپ کا ماں شریکا بھائی۔ یہ لوگ اور اُن کے علاوہ جو شخص اُن کے ذریعہ سے میّت کا رشتہ دار ہو۔ وُہ سب ذی رحم ہیں۔ اُن میں بھی جو میّت سے قریب کا رشتہ رکھتا ہوگا۔ وہ دُور والے رشتہ دار کو محروم کردے گا۔ اُن میں سے پہلے میّت کی اُولاد وارث ہے۔ اگر میّت کی اولاد نہ ہو۔ تو وُہ وارث ہے۔ جس کی اولاد میں۔ میّت ہو۔ اور اگر وُہ بھی نہ ہوں تو وہ وارث ہے جو میّت کے ماں باپ کی اولاد میں سے ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو وُہ وارث ہے۔ جو کہ میّت کے دادا کی اُولاد میں ہوں

پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کا بیان

اس میں جس کا رشتہ میّت سے قریب ہوگا وُہ دُور کے رشتہ والے کو محروم کردے گا جیسے نواسی کے ہوتے ہوئے پوتی کی بیٹی کو کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ پوتی کی بیٹی، نواسی کے اعتبار سے میّت سے دُور ہے۔ اگر قریب ہونے میں سب برابر ہوں۔ تو اُن میں سے جو وارث[۱] کی اولاد میں ہو۔ وُہ پہلے مستحق ہوگا۔ یعنی جو خود اپنے آپ تو ذی رحم ہے۔ مگر یہ جس کی اُولاد میں ہے۔ وُہ میّت کا وارث تھا۔ تو یہ ذی رحم

باقی حاشیہ! تو افنی ہوا۔ تو سو کے عدد کے بعد لکھ دو۔ جیسا کہ ہم نے مثال میں دکھایا۔ واللہ اعلم منہ، غفرلہ؛

۵؎ ذی رحم وارث عصبہ کے ہوتے ہوئے محرُوم ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح خاوند اور بیوی کے سِوا دُوسرے ذی فرض وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی محرُوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ خاوند بیوی پر بچا ہوا مال دوبارہ نہیں بٹتا۔ اور دوسرے ذی فرض وارثوں پر بچا ہوا مال دوبارہ بٹ جاتا ہے، تو جب اُن ذی فرض وارثوں پر دوبارہ مال بٹ گیا۔ تو اب ذی رحم کے لئے بچا ہوا ہی کیا کہ اُسے ملے۔ یہ مسئلہ شریفیہ سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ منہ؛

۱؎ وارث کا لفظ ذی فرض و عصبہ دونوں کو شامل ہے۔ مگر یہاں مراد ذی فرض ہے۔ اس لئے کہ اس صنف میں عصبہ کی اولاد اور ذی فرض کی اولاد ایک ساتھ نہیں پائی جاسکتی ۱۲ منہ؛

اِس ذی رحم پر مقدم ہو گا۔ جو خود بھی ذی رحم ہے۔ اور جس کی اولاد میں ہے۔ وُہ بھی ذی رحم ہے۔ جیسے ایک شخص نے اپنے پیچھے پوتی کی بیٹی اور نواسی کی لڑکی چھوڑی تو اگرچہ یہ دونوں ذی رحم ہیں۔ مگر پوتی کی لڑکی حصّہ پاوے گی اور نواسی کی لڑکی محروم رہے گی۔ کیونکہ یہ خود بھی ذی رحم ہے۔ اور اِس کی ماں یعنی میّت کی نواسی بھی ذی رحم ہے۔ بخلاف پوتی کی بیٹی کے کہ وُہ اگرچہ خود تو ذی رحم ہے۔ مگر اُس کی ماں یعنی میّت کی پوتی ذی رحم نہیں۔ بلکہ کبھی ذی فرض ہوتی ہے۔ کبھی عصبہ اگرچند وارث ذی رحم جمع ہو گئے اور سب کا رشتہ میّت سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ یعنی سب قریب رشتہ کے ہیں۔ یا سب دُور رشتہ کے اور یا اُن میں سے کوئی وارث کی اولاد نہیں۔ یا سب وارث کی اولاد ہیں۔ غرض کہ اُن میں سے کوئی کسی دوسرے سے بڑھ کر نہیں۔ تو جو لڑکوں کی اولاد میں ہو گا۔ وُہ دُوگنا پاوے گا۔ اور جو لڑکیوں کی اولاد میں سے ہے۔ وُہ ایک حصّہ پاوے گا۔ خود یہ ذی رحم خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ جیسے کہ ایک شخص نے نواسے کی بیٹی اور نواسی کا بیٹا چھوڑا۔ تو مال کے تین حصّہ ہو کر نواسے کی بیٹی کو دو اور نواسی کے لڑکے کو ایک ملے گا۔ نواسے کی لڑکی اگرچہ خود عورت ہے۔ مگر دُوگنا پاوے گی۔ کیونکہ وُہ مرد یعنی نواسے کی بیٹی ہے۔ اور نواسی کا لڑکا اگرچہ خود مرد ہے مگر ایک حصّہ پاوے گا۔ کیونکہ وُہ نواسی کا لڑکا ہے اور نواسی عورت ہے۔ اور اگر یہ سب ذی رحم اِس بات میں بھی برابر ہیں۔ یعنی یا تو سب مرد کی اولاد ہوں۔ یا سب عورت کی اولاد تو اب اُن میں اِس طرح حصّہ بٹے گا۔ کہ لڑکے کو دُو حصّہ اور لڑکی کو ایک حصّہ جیسے کسی نے نواسہ اور نواسی چھوڑی تو کُل مال کے تین حصّہ ہو کر نواسے کو دُو حصّے اور نواسی کو ایک حصّہ ملے گا۔

دوسری قسم کے ذی رحم وارث کا بیان

دُوسری قسم کے ذی رحم جن کی اولاد میں میّت ہے۔ جیسے نانا وغیرہ اُن میں بھی۔ جس کا رشتہ میّت سے قریب ہو گا۔ وُہ وارث ہو گا اور دُور کے رشتے والے کو محروم کر دے گا۔ جیسے ماں کا باپ اور ماں کا نانا اُن میں ماں کا باپ حصّہ پاوے گا۔ اور ماں کا نانا محروم۔ اگر اِس قریب ہونے اور دُور ہونے میں سب برابر ہوں تو جس ذی رحم کا رشتہ وارث کے ذریعہ سے ہو گا۔ وُہ وارث ہو گا۔ اور جس کا رشتہ میّت سے ذی رحم کے ذریعہ سے ہو گا۔ اُس کو محروم کر دے گا۔ جیسے ایک شخص نے اپنی ماں کا دادا اور اپنی ماں کا نانا چھوڑا۔ تو ماں کے نانا کو حصّہ ملے گا۔ اور ماں کا دادا

محروم رہے گا۔ کیونکہ ماں کے دادا کا رشتہ میّت سے ماں کے باپ کے ذریعہ سے ہے اور وہ یعنی ماں کا باپ ذی رحم ہے تو ماں کا دادا خود بھی ذی رحم اور اُس کا رشتہ پیدا کرنے والا بھی ذی رحم اور ماں کا نانا کہ اِس کا رشتہ میّت سے ماں کی ماں کے ذریعے سے ہے۔ اور ماں کی ماں صحیح دادی ہے اور وُہ وارث ہوتی ہے۔ اُن کے تمام حکم پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کی طرح ہیں۔

تیسری قسم کے ذی رحم وارث کا بیان

اُن کے حکم بھی وُہی ہیں جو پہلی قسم کے ذی رحم لوگوں کے تھے۔ یعنی جس کا رشتہ میّت سے قریب ہوگا۔ وُہ دُور والے ذی رحم کو محروم کردے گا اسی طرح اِس قسم میں بھی جو ذی رحم کو وارث کے ذریعہ سے میّت کا رشتہ دار ہوگا۔ وُہ اس ذی رحم کو محروم کردے گا۔ جو ذی رحم کے ذریعے سے میّت سے رشتہ رکھتا ہو۔ جیسے بھائی کے بیٹے کی بیٹی اور بہن کی بیٹی کا بیٹا کہ اِس صُورت میں بھائی کے بیٹے کی بیٹی بہن کی لڑکی کے لڑکے کو محرُوم کردے گی۔ کیونکہ اس کا رشتہ بھانجی کے ذریعہ سے ہے۔ اور وہ عصبہ ہے۔ یہ تمام باتیں خیال رہیں۔ اور باقی تمام مسائل اس جگہ بھی پہلی قسم کے ذی رحم لوگوں کی طرح ہیں!

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کا بیان

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کا یہ حکم ہے۔ کہ اگر ان میں کا کوئی ایک ہی ذی رحم ہے۔ دوسرا نہیں تو یہ ہی پُورا مال لے گا۔ کیونکہ کوئی اِس کا مقابل موجود نہیں اور اگر اِس قسم کے کئی ذی رحم ہیں تو دیکھا جاوے گا کہ ان سب ذی رحم وارثوں کا رشتہ میّت سے ایک ہی طرف سے ہے یا الگ الگ طرف سے ایک طرف سے رشتہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ سب کا رشتہ میّت کے باپ کی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی پھوپھیاں اور اخیافی چچا۔ یا سب کا رشتہ ماں کی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی خالہ ماموں اگر کوئی ذی رحم ایک ہی طرف کے رشتہ والے یعنی فقط ماں یا فقط باپ کی طرف کے پائے گئے۔

ف باپ کے ماں شریکی بھائی ذی رحم ہیں۔ اور باپ کے سگے بھائی اور باپ شریکی بھائی عصبہ ہیں۔ باپ کی بہن تو ذی رحم ہی ہے۔ چاہے کیسی ہی ہو ۱۲ منہ ::

تو اُن میں سے جس کا رشتہ میّت سے مضبوط ہوگا۔ وُہ میراث پاوے گا اور کمزور رشتہ والا محروم ہوگا۔ مضبوط رشتہ سے مطلب یہ ہے کہ اس کا رشتہ میّت سے دُو طرف سے ہو۔ اور کمزور سے مُراد یہ ہے۔ کہ اس کا رشتہ ایک ہی طرف سے ہو۔ جیسے میّت کی دُو پھوپیاں ہیں۔ ایک تو باپ کی سگی بہن اور دوسری باپ کی ماں شریکی بہن یا باپ شریکی۔ تو باپ کی سگی بہن حصّہ پاوے گی اور باپ کی ماں شریکی بہن محروم ہوگی اس لئے کہ سگی کا رشتہ میّت کے باپ سے دو طرف سے ہے اور اس کا ایک طرف سے۔ اسی طرح اگر دُو پھوپیاں ہیں۔ ایک تو باپ کی شریکی بہن ہے اور دوسری ماں شریکی بہن تو یہ محروم رہے گی کیونکہ باپ کا رشتہ ماں کے رشتہ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اُن میں جب ایک ہی درجہ کے رشتہ دار ہوں تو مرد کو دُو حصّہ اور عورت کو ایک حصّہ ملے گا۔ جیسے میّت نے پھوپھی اور اخیافی چچا چھوڑا تو پھوپھی کو ایک حصّہ اور اخیافی چچا کو دُو حصّہ ملیں گے اور اگر ان ذی رحم وارثوں کا رشتہ الگ الگ طرف سے ہے تو اس صورت میں ایک طرف کا مضبوط رشتہ والا ذی رحم دوسرے کمزور رشتہ والے ذی رحم کو محروم نہ کر سکے گا۔ جیسے ایک شخص کی ماں کی سگی بہن اور باپ کی ماں شریکی بہن ہے۔ تو دونوں میّت کے مال سے حصّہ پائیں گی اگرچہ ماں کی بہن کا مضبوط رشتہ ہے۔ اور باپ کی بہن کا کمزور۔ مگر چونکہ اُن کا رشتہ الگ الگ طرف سے ہے اس لئے ایک دوسرے کو محروم نہ کریں گی اور اس صورت میں ماں کی بہن عورت کو ایک حصّہ اور باپ کی بہن کو دُو حصّہ ملیں گے کہ ماں کی بہن عورت کے ذریعہ سے میّت کی رشتہ دار ہے اور باپ کی بہن مرد کے ذریعہ سے رشتہ رکھتی ہے۔ لہٰذا باپ کی طرف سے رشتہ والی دُو حصّہ پاوے گی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اب اگر ہر طرف کے کئی کئی وارث ہوں۔ جیسے کہ تین خالہ ہیں۔ اور چار پھوپیاں تو پہلے ہر گروہ کو الگ الگ حصّہ دے کہ جو ہر فریق کو ملے گا۔ وہ اُس کے شخصوں پر بانٹ دیا جاوے گا۔ تو تین خالاؤں کو اُن کا حصّہ دلا کر اُس حصّہ کے تین حصّہ کر کے ہر ایک کو ایک حصّہ دے دیا جاوے گا۔ اِسی طرح پھوپیوں کا معاملہ ہے۔

ان کی اولاد کا بیان

چوتھی قسم کے ذی رحم وارثوں کی اولاد کا وُہی حکم ہے۔ جو پہلی قسم کے ذی رحم وارثوں کا تھا یعنی قریب کا رشتہ دار ہوتے ہوئے دُور کا رشتہ والا محروم ہوگا۔ تو پھوپھی کا بیٹا

ہوتے ہوئے پھوپھی کے پوتے کو کچھ نہ ملے گا۔ اگر قریب اور دُور ہونے میں سب اولاد برابر ہیں تو اگر میّت سے ایک رشتہ ہے۔ تو مضبوط رشتہ والا حصّہ پا دے گا۔ اور کمزور رشتہ[۱] والا مضبوط کے ہوتے ہوئے محروم رہے گا۔ اگر اس میں بھی برابر ہوں۔ تو عصبہ کی اولاد ذی رحم کی اولاد کو محرُوم کر دے گی۔ جیسے میّت نے ایک چچا کی بیٹی اور ایک پھوپی کا بیٹا چھوڑا۔ تو چچا کی بیٹی پھوپی کے بیٹے کو محرُوم کر دے گی۔ کیونکہ لڑکی کا رشتہ عصبہ یعنی چچا کے ذریعہ سے ہے۔ اور لڑکے کا رشتہ ذی رحم یعنی پھوپھی کے ذریعے سے ہے۔ اگر چند طرف کے ذی رحم وارثوں کی اولاد ہو۔ جیسے ایک تو خالہ کی اولاد اور دُوسری پھوپھی کی اولاد، تو اب مضبوط رشتہ والا کمزور رشتہ والے کو محرُوم نہ کر سکے گا۔ جیسے باپ کی سگی بہن کی اور ماں کی باپ شریکی بہن کی اولاد ہے۔ تو اگرچہ پہلی کا رشتہ میّت سے مضبوط ہے اور دُوسری کا کمزور مگر چونکہ ایک ہی طرف کے یہ دونوں وارث نہیں ہیں۔ اس لئے یہ مضبوط رشتہ والی کمزور رشتہ والی کو محرُوم نہ کر سکے گی۔

حمل کا بیان

عورت کے پیٹ میں بچہّ کم سے کم چھ۶ مہینے تک رہ سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دو۲ سال تک تو اگر کسی عورت کے اُس کے خاوند کے مرنے سے دو۲ برس بعد بچہّ پیدا ہو۔ تو یہ اس میّت خاوند کی میراث نہ پاوے گا۔ کیونکہ یہ بچہّ میّت کا نہیں کسی اور کا ہے۔ اور اگر میّت کے مرنے کے بعد دو۲ برس یا دو۲ برس سے کم مدّت میں پیدا ہوا اور بیوی نے اس سے پہلے[۲] حمل کا انکار نہ کیا تھا تو اس بچہ کو اس میّت کے مال سے حصّہ ملے گا اور اگر میّت کے سوا دوسرے وارث کا ہے جیسے میّت کی ماں حاملہ ہے تو اس صورت میں یہ حمل اگر کم سے کم یعنی میّت کے مرنے کے بعد چھ۶ ماہ یا کم میں پیدا ہو

---

[۱] اس کی مثال جیسے میّت کے باپ کی سگی بہن کی اُولاد ہوتے ہوئے میّت کے باپ کی علاتی بہن کی اولاد محرُوم رہے گی ۱۲ منہ ::

[۲] حمل سے انکار کرنے کی صورت یہ ہے کہ عورت چار۴ ماہ دس دن کے بعد کہہ چکی ہو۔ کہ میری عدّت پُوری ہو چکی کیونکہ اگر یہ حمل میّت کا تھا۔ تو حمل کے باہر آنے سے پہلے اُس کی عدّت کیسے پُوری ہو گئی۔ اس لئے کہ جس کا خاوند مرجادے۔ اور عورت حاملہ ہو۔ تو اس کی عدّت بچہ کے پیدا ہونے سے پُوری ہوتی ہے اور جب

تو اس میّت کے مال کا وارث ہوگا اور اگر اس سے زیادہ مدّت میں پیدا ہوا۔ تو نہیں اور اگر یہ بچہ ف۱ زندہ پیدا ہو کر مر جاوے تو دوسرے لوگ اس بچہ کے وارث ہوں گے۔ یہ جو کہا کہ بچہ زندہ پیدا ہو تو بچہ کو میّت کا مال ملے گا۔ اس سے مطلب یہ ہے۔ کہ پُورا بچہ زندہ پیٹ سے باہر آجاوے اور اگر باہر آنے کی حالت میں مر گیا تو اگر بچہ سیدھا آیا ہو۔ یعنی سر کی طرف سے پیدا ہوا ہو۔ اور سینہ تک زندہ نکلا۔ تو اس کو زندہ مانا جاوے گا۔ یعنی اُس کو میّت کے مال کا وارث کر کے مال اس بچے کے وارثوں کو دیدیا جاوے گا۔ اور اگر سینہ سے کم تک زندہ نکلا۔ تو اس کو مُردہ مان کر میّت کے مال سے کچھ نہ ملے گا۔ اور اگر اُلٹا پیدا ہوا ہے۔ یعنی پاؤں کی طرف سے ہوا تو اُس میں ناف کا اعتبار ہے۔ یعنی اگر ناف تک زندہ پیدا ہوا۔ اور بعد میں مرا تو اس کو زندہ مان کر میراث کا حقدار مانا جاوے گا۔ اب جب یہ معلوم ہو چکا تو اس کے مسائل یہ ہیں۔ کہ جس طرح زندہ وارث اپنے رشتہ دار میّت کے مال کا حصّہ پاتے ہیں۔ اُسی طرح جو وارث میّت کے مرتے وقت اپنی ماں ف۲ کے پیٹ میں ہو۔ وُہ بھی وارث ہوگا۔ مگر اسی شرط سے کہ زندہ پیدا ہو۔ جیسے ایک شخص کا انتقال ہوا۔ اُس کے کچھ لڑکے موجود ہیں۔ اور اُس کی بیوی حاملہ ہے تو جیسے یہ موجود لڑکے اُس کے وارث ہیں۔ اُسی طرح یہ حمل کا بچہ بھی اُس کا وارث ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا انتقال ہوا اور اس کے کچھ بھائی زندہ موجود ہیں

باقی حاشیہ! اُس نے کہا کہ میری عدّت پوری ہو گئی اور بعد میں آٹھ دس ماہ بعد بچہ پیدا ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ اس بچہ کا حمل بعد میّت ٹھہرا تھا۔

ف۱: اگر حمل سے مُردہ بچہ پیدا ہوا تو اس کو میّت کے مال سے حصّہ نہ ملے گا۔ یہ حکم اُس صورت میں ہے جب بچہ اپنے آپ مرا ہوا پیدا ہو۔ لیکن اگر حمل گرا دیا گیا تو وارث ہوگا اور دوسرے ورثاء اُس کے وارث ہوں گے ردّ المحتار منہ ۱۲۔

ف۲ اگر میّت کا مال بانٹتے وقت خبر نہ ہوئی کہ میّت کی بیوی میّت سے حاملہ ہے۔ اور بعد میں بچہ میّت سے پیدا ہوا۔ تو اسی تقسیم کئے ہوئے مال کو دوبارہ بانٹا جاوے گا۔ اسی طرح اگر میّت کی بیوی نے کہا کہ مجھے حمل ہے اور دوسرے وارثوں نے کہا۔ کہ تجھ کو حمل نہیں ہے تو کسی جاننے والی ہوشیار دیندار دائی کو دکھایا جاوے گا۔ اگر وُہ حمل بتاوے۔ تو حمل مان لیا جاوے گا ورنہ نہیں۔ ردّ المختار منہ ۱۲۔

ف۳ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اگر عنقریب بچہ پیدا ہونے کی اُمید ہے مثلاً ایک ماہ سے کم میں بچہ پیدا ہو جاوے گا تو ابھی مال کو تقسیم نہ کیا جاوے۔ بلکہ بچہ پیدا ہونے کا انتظار کریں۔ کیونکہ خبر نہیں کہ ماں کے پیٹ

اور اُس کے مرتے وقت اس کی ماں حاملہ ہے۔ تو اگر اُس کے زندہ بھائی حصّہ پائیں گے۔ تو ضرور یہ حمل کا بچّہ بھی حصّہ کا حق دار ٹھہرے گا۔ اب جب کہ مال تقسیم کیا جاوے۔ تو ایک وارث کا حصّہ اُس مال سے حمل کے لیئے رکھ لیا جاوے گا۔ کیونکہ اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ماں کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچّے ہوں۔ مگر جب عام طور سے عورتوں کے ایک حمل میں ایک ہی بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک سے زیادہ بچّہ ہونا بہت کم ہے۔ اس لیئے ایک ہی بچّہ کا حصّہ بچا کر رکھا جاوے گا۔ اور باقی وارثوں سے ضامن لیا جاوے گا۔ کہ اگر ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوں۔ تو تم کو اپنے حصّوں میں سے اُس کے حصّہ کی برابر واپس کرنا پڑے گا۔ اب یہ حساب لگایا جاوے کہ اگر حمل لڑکی ہوگی۔ تو زیادہ حصّہ پاوے گی یا لڑکا ہوگا تو زیادہ حصّہ پاوے گا۔ جس صُورت میں حمل لڑکی کو زیادہ حصّہ ملے۔ اُسی کا اعتبار کر کے اُس حمل کے لیئے حصّہ رکھا جاوے۔ جیسے کہ اگر یہ حمل لڑکی ہو۔ جب تو کل مال کا آدھا پاوے گی اور اگر لڑکا ہو تو عصبہ ہو کر ذی فرض وارثوں سے بچا ہُوا مال رکھا جاوے اور بچا ہوا آدھے سے کم ہے تو اس حمل کو لڑکی مان کر اُس کے لیئے آدھا مال رکھا جاوے۔ اس مسئلہ کے بنانے کے قاعدے یہ ہیں۔ کہ حمل کو لڑکا اور لڑکی فرض کر کے دونوں صُورتوں سے مسئلہ بناؤ۔ پھر جن عددوں سے یہ دونوں مسئلے بنے ہیں۔ ان دونوں عددوں کی آپس میں نسبت دیکھو۔ اگر ان دونوں عددوں میں توافق ہے تو ایک مسئلہ کے عدد کے وفق کو دُوسرے مسئلہ کے پُورے عدد میں ضرب دو۔ اور اگر ان دونوں مسئلوں کے عدد میں تباین ہے۔ تو ایک مسئلہ کے پورے عدد کو دوسرے مسئلہ کے پورے عدد میں ضرب دو جو کچھ اس ضرب سے حاصل ہو اُس سے مسئلہ کو صحیح کر دیا جاوے۔

پھر وارثوں کے حصّوں پر نگاہ کرو۔ کہ حمل کے لڑکی ماننے کی صُورت میں اُن کو جو حصّے ملے ہیں۔ اُن حصّوں کو لڑکے ہونے کی صُورت والے مسئلہ کے مخرج میں ضرب دو۔ اور جو حصّے حمل کو

میں کتنے بچے ہیں۔ اور لڑکا ہے یا لڑکی۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ انتظار نہ کریں گے چاہے بچّہ جلد پیدا ہونے والا ہو یا دیر میں کیونکہ اگر آنے والے بچّے کا انتظار کیا تو ممکن ہے کہ جو وارث اب موجود ہیں۔ اُن میں سے جب تک کوئی مر جاوے تو آنے والے کے انتظار سے موجود وارثوں کو کیوں محروم کر دیا جاوے۔ ہاں اگر حمل الیسا ہے کہ اُس کے پیدا ہونے پر موجودہ وارثوں میں سے بعض محروم ہو جائیں گے تو اُن وارثوں کو نہ دیا جاوے گا جو محرُوم ہونے والے ہوں۔ واللہ اعلم۔ ردّ المحتار ۱۲ منہ::

لڑکا ماننے کی صورت میں ملے ہیں۔ اُن کو لڑکی کے مسئلہ کے مخرج میں ضرب دو۔ اگر اُن دونوں مسئلوں کے عددوں میں تباین ہو تب ورنہ اگر توافق ہو۔ تو وارثوں کے حصّوں کو اُن مسئلوں کے مخرجوں کے وفق میں ضرب دیا جاوے اور دیکھا جاوے کہ کس ضرب سے حصّہ کم ملا۔ جس ضرب سے حصّہ کم ملے وہ اُس وارث کو دے دیا جاوے اور زیادتی حمل کے لیئے رکھ لی جاوے۔ اگر حمل سے ایسا بچہ پیدا ہوا جو اُس بڑے حصّہ کو پانے کا حق دار ہے۔ جب تو اِس بچّہ کو بڑا ہی حصّہ دے دیا جاوے اور جتنا پہلے ان دوسرے وارثوں کے حصّوں میں سے کم کر لیا گیا تھا۔ وہ اُن وارثوں کو واپس کر دیا جاوے۔ اُس کی مثال یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص کا اِنتقال ہوا اُس نے ایک بیٹی اور ماں باپ اور ایک حاملہ بیوی چھوڑی اس طرح!

لڑکی والی صورت

مسـ ۲۴/۲۷ ۱۱۶ احمد

لڑکی	ماں	باپ	بیوی	حمل لڑکی
۱۶	۴	۴	۳	

لڑکے والی صورت

مسـ ۲۴ احمد

لڑکی	ماں	باپ	بیوی	حمل لڑکا
۱۳	۴	۴	۳	

اس صورت میں اگر حمل کو لڑکی مانتے ہیں۔ تو مسئلہ چوبیس (۲۴) سے ہو کر ۲۷ سے عول کیا جاوے گا۔ اس میں سے حمل و لڑکی کو ۱۶ باپ کو اور ماں کو چار، چار بیوی کو تین ملیں گے۔ اور اگر حمل کو لڑکا مانئے میں تو مسئلہ ۲۴ سے ہی صحیح ہوگا۔ اس چوبیس (۲۴) میں سے ماں کو چار، باپ کو چار اور بیوی کو تین حمل و لڑکے کو ۱۳ ملیں گے۔ ان مسئلوں کے مخرج ۲۴ و ۲۷ ہیں۔ جن سے دونوں مسئلے بنے ہیں۔ دیکھا

ل یہ جو معاملہ کیا گیا ہے یہ جب ہے کہ حمل اس وارث کا حصّہ لڑکا یا لڑکی ہونے کی صورت میں کم کر دے۔ اور اگر وارث ایسا ہے۔ کہ اُس کا حصّہ کم ہو ہی نہیں سکتا۔ حمل چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ جیسے دادی کو چھٹا حصّہ ملے گا چاہے حمل سے لڑکا ہو یا لڑکی۔ تو اُس کا حصّہ پُورا دیا جاوے گا۔ اور جو وارث ایسا ہو۔ کہ حمل میں لڑکا ہے۔ جب تو وُہ محروم ہو جاتا ہے اور اگر حمل میں لڑکی ہو۔ تو حصّہ پاتا ہے۔ جیسے بھائی تو اُس صورت میں ایسے وارث کو کچھ بھی نہ دیا جائے گا۔ بلکہ حمل کے پیدا ہونے کا انتظار ہو گا۔ حمل کے پیدا ہونے کے بعد اگر یہ وارث حصّہ کا حق دار ہو۔ تو حصّہ دے دیا جاوے۔ ورنہ نہیں اس سے معلوم ہوا کہ وارث تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا حصّہ سارا دے دیا جاوے۔ حمل کی پیدائش سے پہلے ہی دُوسرا وُہ جن کو حمل کے پیدا ہونے سے

جا دے۔ کہ ۲۴ و ۲۷ میں کیا نسبت ہے۔ معلوم ہوا۔ کہ ان دونوں میں تہائی کا توافق ہے کیونکہ تین دونوں کو مٹا دیتا ہے۔ تو ۲۴ کا تہائی لیا۔ (۸) اس ۸ کو ۲۷ میں ضرب دی۔ ۲۱۶ حاصل ہوئے۔ اب لڑکی اور ماں و باپ اور بیوی کے حصّوں کو ۲۴ و ۲۷ کے تہائی میں ضرب دی جاوے

لڑکی	ماں	باپ	بیوی
۶۴ و ۱۲۸	۳۲	۳۲	۲۴

اور اگر اُن وارثوں کے حصّوں کو ۲۷ کی تہائی یعنی ۹ میں ضرب دی۔ تو اُن کو یہ حصّے ملتے ہیں۔

ماں	لڑکی	باپ	بیوی
۳۶	۳۹	۳۶	۲۷

معلوم ہُوا کہ اگر حمل کو لڑکا مانیں تو لڑکی کو ۲۵ کم ملتے ہیں اور بیوی کو تین زیادہ ملتے ہیں اور ماں و باپ کو چار چار زیادہ ملتے ہیں اور اگر حمل کو لڑکی مانیں تو لڑکی کو ۲۵ زیادہ اور بیوی کو تین کم اور ماں باپ کو چار چار کم ملتے ہیں۔ لہٰذا حمل کو ماں باپ اور بیوی کے لئے لڑکا مانا جاویگا۔ اور بیوی کو ۲۴ دیئے جاویں گے۔ تین بچا لئے جاویں گے اور ماں باپ کو ۳۲، ۳۲ دیئے جاویں گے اور اُن کے حصّوں میں سے چار چار بچا لئے جاویں۔ اور لڑکی کو وُہ حصّہ ملے گا۔ جو حمل کے لڑکا ماننے پر اس کو ملا ہے کیونکہ یہ ہی کم ہے۔ یعنی ۱۳ کو ۹ میں جب ضرب دی۔ تو ۱۱۷ حاصل ہوئے اُس ایک ثلث سترہ کا تہائی یعنی ۳۹ لڑکی کو دیا گیا۔ کیونکہ جب حمل کو لڑکا مانا گیا تو اب ۱۱۷ کے تین حصّے کئے جاویں گے۔ اُس میں سے دو حصّہ لڑکے کے لئے ہیں۔ اور ایک حصّہ لڑکی کے لئے خلاصہ یہ ہوا کہ لڑکی کو وُہ حصّہ دیا جاوے گا جو حمل کو لڑکا مان کر ملتا ہے۔ اور باقی ماں باپ اور بیوی کو وہ حصّہ ملیگا جو حمل کو لڑکی مان کر ملتا ہے۔ کیونکہ لڑکی کے لیئے وُہ کم ہے ماں باپ اور بیوی کے لیے یہ کم ہیں۔ اور حمل کے لئے ۲۱۶ میں سے ۸۹ باقی رکھے جاویں گے۔ اُن موجودہ وارثوں کے حصّے سے حسب ذیل کمی کی گئی ۲۵/۵ لڑکی کے حصّے سے ۳/۲ بیوی کے حصّے سے ۴/۳ ماں کے حصّے سے ۴/۳ باپ کے حصّے سے :۔

تو کل اُٹھا کر رکھے ہوئے حصّہ ۳۶ ہیں۔ اب اگر حمل سے لڑکی پیدا ہوئی۔ تو فقط بیٹی کو ۲۵

باقی حاشیہ ! پہلے بالکل نہیں دیا جاتا۔ اور تیسرا وُہ جن کو کم حصّہ دیا جاتا ہے۔ یہاں اسی تیسرے قسم کے وارث کا ذکر ہے۔ ردّ المحتار منہ ۱۲ !

واپس کر دیئے جاویں گے۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا حصہ کم ہوا تھا۔ اور ماں باپ وغیرہ کو کچھ واپس نہ ہوگا۔ اور اگر حمل سے لڑکا پیدا ہوا۔ تو ماں کو ۴۔ باپ کو چار بیوی کو ۳ واپس کئے جاویں گے اور لڑکی کو کچھ واپس نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں لڑکی کے حصہ سے کچھ کم نہ ہوا تھا۔ اور اگر یہ حمل کا بچہ مرا ہوا پیدا ہو۔ تب تو لڑکی کو ۶۹ اور دیئے جاویں گے کہ یہ ۶۹ انتالیس ۳۹ سے مل کر ۱۰۸ ہو جاویں۔ جو ۲۱۶ کا آدھا ہے۔ اور بیوی کو تین اور دیئے جاویں گے۔ تاکہ یہ تین اُن ۲۴ سے مل کر ۲۷ ہو جاویں۔ کیونکہ ۲۷، ۲۱۶ کا آٹھواں حصہ ہے۔ اور ماں کو چار تاکہ یہ چار مل کر ۲۱۶ کا چھٹا حصہ یعنی ۳۶ ہو جاویں۔ اور باپ کو چار اُس کا چھٹا حصہ پورا کرنے کے لئے اور باقی ۹ عصبہ ہونے کی وجہ سے دیئے جاویں۔ اب اس طرح مسئلہ ہوا کہ مسئلہ کے عدد ۲۱۶ میں سے بیٹی کو، بیوی کو، ماں کو، باپ کو ان کو جمع کیا۔ تو ۲۱۶ ہو گئے:

۱۰۸
۲۷
۳۶
۴۵
۲۱۶

۱۰۸	۲۷	۳۶	۴۵

مفقود یعنی گمے ہوئے وارث کا بیان

گمے ہوئے شخص سے وہ مراد ہے۔ جو اپنے وطن سے ایسا غائب ہو گیا ہو۔ کہ اُس کی خبر نہ رہی کہ مر گیا یا زندہ ہے اور اگر زندہ ہے۔ تو کہاں ہے ایسے آدمی کا یہ حکم ہے۔ کہ اُس کے مال کے معاملہ میں تو اس کو زندہ مانا جاوے گا۔ یعنی اُس کے مال کا کوئی وارث نہ ہوگا۔ اور اس کے دوسرے رشتہ داروں کے مال میں اُس کو مُردہ مانا جاوے گا۔ یعنی کسی کے مال کا وُہ وارث نہیں ہو تو دوسرے کے مال کا وارث نہ ہوگا۔ مگر دوسرے وارثین جو اس کی وجہ سے محروم ہوتے ہوں۔ اُن کو اُس وقت نہ دیا جاوے گا۔ اسی طرح جس کا حصہ اس کی وجہ سے کم ہونا ہوگا اُس کو کم کر دیا جاوے گا۔ اور اُس کا مال رکھا رہے گا۔ کسی کو ورثہ میں نہ دیا جاوے گا۔ جب تک کہ اس کی موت کی خبر نہ مل جاوے۔ اگر کسی طریقہ سے معلوم ہو جاوے کہ وُہ فلاں تاریخ میں مر گیا۔ تو اس تاریخ میں جو اُس کے وارثین زندہ ہوں گے۔ اُن میں اُس کا مال بانٹ دیا جاوے گا۔ اگر اس کی موت کی خبر نہ ملے۔ تو جب اُس کی زندگی کی مدت ختم ہو جاوے۔ تب اس کی موت کا حکم دیا جاوے گا۔ یہ مدت ۹۰ سال ہے۔ یعنی جب اُس کی عمر ۹۰ سال ہو جاوے۔ جیسے ایک آدمی ۴۰ سال کی عمر میں غائب ہوا۔ تو پچاس سال اور انتظار کر کے موت کا حکم

دیا جاوے گا۔ کیونکہ ۴۰ سال کی عمر میں غائب ہوا اور ۵۰ سال غائب ہوئے ہو گئے اب اُس کی عمر ۹۰ سال کی ہو گئی ہے۔ جس وقت کہ اس کی موت کا حکم دیا گیا۔ اُس وقت جتنے وارث زندہ ہوں گے۔ اُن ہی میں مفقود کے مال کی میراث تقسیم کردی جاوے۔ اسی طرح اس کی موت سے پہلے جن لوگوں کا مال تقسیم ہوا۔ اور اس کی وجہ سے اُس کے وارثوں کو آج دیا جاوے گا۔ یعنی جس وارث کا حصہ اس گے ہوئے کی وجہ سے نہ دیا گیا تھا۔ اُس کو آج دیا جاوے گا یا اُس کے حصے کی کمی پوری کردی جاوے گی۔ جیسے ایک آدمی کا انتقال ہوا۔ اُس نے ماں، بیوی، بھائی اور ایک گما ہوا بیٹا چھوڑا تو ماں اور بیوی نے اس کی وجہ سے کم پایا اور بھائی اس کی وجہ سے بالکل حصہ نہ پا سکا۔ اب جب کہ اس کے مرنے کا حکم دیا گیا۔ تو ماں اور بیوی کا حصہ پورا کر دیا گیا اور بھائی کو اُس کا حصہ مل گیا۔ اس مسئلہ کے بنانے کا بھی وُہی قاعدہ ہے جو حمل کے بیان میں گزر چکا ہے۔ کہ اُس کے رشتہ داروں میں سے اگر کوئی شخص مرے۔ اور اُس کے وارثوں میں اس طرح کا مال تقسیم کیا جاوے تو دو طرح اُس کے مال کا مسئلہ بنایا جاوے۔ ایک تو اس گے ہوئے کو زندہ مان کر دوسرے اس کو مُردہ مان کر اور اُن دونوں مسئلوں کے عددوں میں ایک دوسرے کو ضرب دے دو۔ اگر تباین ہو۔ اور اگر توافق ہو تو ایک کے وفق کو دوسرے میں ضرب دی جاوے۔ پھر اُسی طرح اُن کے وارثوں کو جس مسئلہ سے جتنے حصے ملے ہوں۔ اُن کو دوسرے مسئلہ کے پورے مخرج یا وفق سے ضرب دے دی جاوے۔ اور جس میں حصہ کم ملے۔ وُہ ہی حصہ دے دیا جاوے۔ اور باقی زیادتی رکھ لی جاوے اور جو شخص اس گے ہوئے شخص کو زندہ ماننے سے محروم ہوتا ہو۔ اس کو اُس وقت مال نہ دیا جاوے غرض کہ جو کچھ حمل کے بیان میں تفصیل سے گزرا۔ وُہی یہاں کیا جاوے۔ پھر جب یہ گما ہوا آدمی مُردہ ثابت ہو۔ تب اُن وارثوں کے رکھے ہوئے حصے واپس کر دیئے جاویں۔

مرتد کا حکم

جو شخص مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو جاوے۔ اس کو مُرتد کہتے ہیں۔ اگر مُرتد اپنے کفر پر ہی مر جائے۔ یا قتل کر دیا جاوے۔ تو مال جو اُس نے اپنے مسلمان ہونے کے زمانہ میں کمایا تھا۔ اُس میں سے اُس کا وُہ قرض جو مسلمان ہونے کے زمانہ کا ہوا ادا کیا جاوے گا۔ اُس سے جو مال بچے

وہ اُن وارثوں میں بانٹ دیا جاوے۔ جو اس کے مرتے وقت باقی ہوتے وقت موجود ہیں اور جو مال مرتد ہونے کے بعد کایا ہے۔ اُس سے مرتد ہونے کے بعد جو اُس پر قرضہ ہوگیا ہو وہ ادا کیا جاوے اور جو باقی بچے وہ بیت المال میں رکھ دیا جاوے۔ کہ مسلمانوں کی ضرورتوں میں کام آوے۔ اور اگر عورت مرتد ہو گئی تو اس کے تمام مال سے اُس کے وارث ورثہ پائیں گے۔ چاہے وہ اسلام کے زمانہ میں مال کمایا ہو یا کافر ہونے کے بعد جو شخص مرتد ہوگیا وہ اپنے کسی رشتہ دار کے مال سے ورثہ نہیں پاسکتا چاہے وہ رشتہ دار مسلمان ہو یا وہ بھی مرتد ہوگیا ہو۔ اسی طرح مرتدہ عورت کسی کے مال سے ورثہ نہ پائے گی۔ ہاں اگر "معاذ اللہ" کسی شہر کے تمام لوگ مرتد ہوگئے۔ تو اُن میں سے ایک دوسرے کا مال ورثہ میں پائیں گے۔

قیدی وارث کا بیان

جس مسلمان شخص کو کافر قید کرکے اپنے ملک میں لے گئے۔ وہ جب تک اسلام پر قائم رہے اُس وقت تک اور مسلمانوں کی طرح ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے مال سے ورثہ پاوے گا۔ اور اگر اس قیدی مسلمان نے نعوذ باللہ۔ اپنا مذہب بدل دیا۔ تو اس کے حکم اب مرتد کی طرح ہو جائیں گے اور اگر اس کے رشتہ داروں کو خبر نہ رہی۔ کہ وہ مسلمان ہے یا کافر ہوگیا تو اس کا حکم گمے ہوئے شخص کی طرح ہے کہ اُس کے دوسرے رشتہ داروں کو اپنے مورثوں (مرنے والوں) کے مال سے کم حصہ دیا جاوے گا۔ اور باقی بچا کر رکھا جاوے گا۔ جب پوری خبر مل جاوے۔ کہ وہ مسلمان ہے تب تو خیر۔ اور اگر خبر ملے۔ کہ وہ کافر ہو چکا تو وارثوں کا وہ مال جو بچا کر رکھا گیا۔ واپس کر دیا جائیگا۔

ے کافر یا تو اس طرح ہو جائے کہ مذہب اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب سے جا ملے جیسے عیسائی یا یہودی یا ہندو ہو جائے۔ اور یا اس طرح کہ وہ تو اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتا رہے۔ اور دعویٰ اسلام کا ہی کرتا رہے۔ مگر شریعت اس کو کافر کہتی ہو جیسے اس زمانے کے صرف وہ وہابی جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کی شان مبارک میں بری باتیں لکھیں یا بکیں یا اس بکنے کو اچھا سمجھا۔ اسی طرح قادیانی نیچری وغیرہ اور دوسرے وہ لوگ جو شرعاً کافر ہو چکے۔ مگر وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ۱۲ منہ۔ خیال رہے کہ بد مذہب فرقے شرعی کافر ہیں مگر میراث میں قانونی کافروں کا ذکر ہے

جو لوگ جل کر یا ڈوب کر یا دب کر مر جائیں انکا بیان

اگر ایک کنبے کے چند لوگ اچانک مر جائیں چاہیں ڈوب کر یا جل کر یا دب یا کسی اور طرح اور پتہ نہ چلے کہ اُن میں پہلے کون مرا ہے اور بعد میں کون تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ سب ایک دم ہی مرے ہیں۔ لہٰذا ان مرنے والوں میں سے کسی کو کسی کا وارث نہ بنایا جائے گا۔ بلکہ اُنکے وہ وارث جو اب موجود ہیں۔ اُن کو ہی سب مال شرعی طریقہ سے بانٹ کر دے دیا جائے گا۔ جیسے باپ۔ بیٹا بھائی بہن۔ کسی مکان سے دب کر مر گئے تو نہ باپ کے مال سے اس اولاد کو کچھ ملے اور نہ ہی ان بیٹوں کے مال سے باپ مرحوم کو کچھ ملے۔ نہ بیٹی نہ بھائی بہن کے مال سے کچھ ملے۔ بلکہ جو لوگ اِن ہلاک شدگان کے وارثین میں اب موجود زندہ ہیں ان میں اِن میتوں کا مال بانٹ دیا جائے گا۔

وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ

ناچیز/ **احمد یار خان قادری بدایونی**

صدر مدرس

مدرسہ مسکینیہ دھوراجی۔ کاٹھیاواڑ گجرات۔ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ

علم فرائض کے کچھ اصطلاحی الفاظ جن کو یاد کرنا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے تاکہ علم سیکھنا آسان ہو جائے

(۱) مورث: جو فوت ہو اور اُس کا مال تقسیم کیا جائے۔

(۲) وارث: جس کو تقسیم شدہ مال دیا جائے۔

(۳) میراث: وہ مال جو مرنے والا چھوڑ جائے اور اس کو تقسیم کیا جائے۔

(۴) مصرف: میت کا مال کہاں خرچ کیا جائے۔

(۵) ذی فرض: وہ وارث جس کا حصہ قرآن مجید نے مقرر فرما دیا ہے۔

(۶) عصبہ: وہ وارث جن کا حصہ قرآن مجید نے بیان نہ کیا ہے۔ اور ذی فرض کی تقسیم کرکے جو مال بچے وہ اُس کو دیا جائے۔

(۷) ذی رحم: وہ وارث جو عصبہ نہ ہوں تو میراث پائیں۔

(۸) حجب: کوئی وارث دوسرے وارث کو محروم کر دے یا اُس کا حصہ میراث کا کم کر دے۔

(۹) عول: چھوٹے عدد سے تقسیم پوری نہ ہو تو وارثوں کے حصوں کے مطابق بڑے عدد سے تقسیم کی جائے۔ اس کو عول کہتے ہیں۔

(۱۰) مساوی: میراث کے عدد اور وارثوں کے عدد برابر ہوں۔

(۱۱) تداخل: بڑا چھوٹا عدد ہو۔ اور بڑا عدد چھوٹے پر ______ برابر تقسیم ہو جائے

(۱۲) توافق: بڑا چھوٹا عدد ہو۔ اور چھوٹا بڑا عدد ۔ آپس میں برابر نہ تقسیم ہوں مگر تیسرا عدد دونوں کو برابر بانٹ دے۔

(۱۳) تباین: بڑا چھوٹا عدد نہ خود برابر بٹ سکے نہ تیسرا عدد ان کو برابر تقسیم ...... کرے۔

(۱۴) مناسخہ: ایک شخص کے مال ابھی تقسیم نہ ہوا تھا کہ اُس کے کچھ وارث مر گئے اور ان کا حصہ تقسیم سے پہلے میراث بن گیا۔

کتاب الآداب

فن تصنیف کی گہرائیاں اور ذمہ داریاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال ۴۵

نحمدہ ونصلی علی رسولہ النبی الکریم ورؤف الرحیم۔ **اما بعد** اس بات سے کون ذی عقل وفہم ناواقف ہے۔ کہ دنیائے علم وہنر میں فن تصنیف انتہائی مشکل اور اہم ذمے داری کا کام ہے اسی فن سے شخصی قسمتیں وابستہ ہیں۔ مصنفین کے قلم سے ہی اقوام عالم کے زوال وعروج ہوتے رہے۔ یہی وہ فن ہے، جس کے جادو سے تفکرات ومزاج بدلے جاسکتے ہیں۔ اس ہنر میں یہ ملکہ ہے۔ کہ کو آخریں، ازل کو ابد میں منتقل کیا جاسکے۔ غرضکہ جس نے کائنات کے دھارے کو پھیرا۔ وہ یہی طاقت ہے۔ آج ہم کو دولت ایمانی وعرفانی کا میسر ہونا اسی محنت اکابر کا ثمرہ ہے۔ جزاھم اللہ فی الجنۃ خیر الجزاء۔ تصورات رومی وغزالی اسی چاند کی بکھیر ہے۔ اور اسی سورج کی دھوپ ہے مگر اتنا ضرور خیال رہے۔ کہ تصنیف مثل کچلول ہے۔ اس میں جو بھرا جائے گا وہ ہی تقسیم ہوگا۔ دودھ اور شہد بھرنے سے دودھ اور شہد ہی ملے گا۔ اور اگر زہر قاتل ہوگا تو ہلاکت وتباہی سے ہی واسطہ پڑے گا۔ اس دنیاء دون میں جیسے جیسے مصنف پیدا ہوتے رہے ویسے ہی قوم کے مزاج میں تبدیلی آتی رہی۔ اور حق وباطل تصنیف ہی کے گہوارے پلتے بڑھتے رہے۔ بہرحال اس تسلیم کے سواء چارہ نہیں کہ تصنیف بہت ذمہ داری کا فریضہ ہے۔ اور ایک نازک ترین راہ گزر ہے۔ سابقہ عقلاء وحکماء بڑی احتیاط سے اس پگڈنڈی پر قدم رکھتے تھے۔ جتنا یہ نازک فن تھا۔ اتنا ہی فی زمانہ لوگوں نے اس کو معمولی کام سمجھ لیا۔ ہر نا سمجھ اہل قلم بن بیٹھا۔ اور لگا قوم کی قسمتوں کے فیصلے لکھنے۔ آج قوم کے تفرقوں اور نسل انسانی کی اخلاقی تباہی کی ذمہ داری انہی مصنفین کے سر ہے۔ فن تصنیف میں سب سے باریک پہلو یہ ہے۔ کہ مصنف کے ناوک قلم سے کوئی ایسا نشتر نہ لگے جو صاحب تصنیف کے خود اپنے ہی مسلک کو مجروح کرتا چلا جائے۔ ورنہ مصنف اور اس کے ہم مشرب افراد

کی تباہی لازمی ہے۔ اس گھمار سے بچنے کے لیے لازم و اشد ضروری ہے۔ کہ تصنیف پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے مسلک کے صغریٰ، کبریٰ و اصغر و اکبر سے کماحقہ، واقف اور مذہب کے اصول و فروع سے خبردار ہو۔ کامیاب مصنف کے لیے دوسری یہ چیز ضروری ہے کہ اپنے اکابر سے تصادم کا راستہ اختیار نہ کرے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی صورت اختیار کرے۔ اگر کسی بزرگ سے تطبیق ممکن نظر نہ آئے تو بھی خلاف سے ہٹ کر راہ اختلاف پر گامزن ہو۔ بشرطیکہ کسی اور بزرگ کا تائیدی سہارا لے کر اور اس اختلاف میں بھی للٰہیت و خلوص ہونا اہم ہے۔ مصنف کو اپنے مسلک کے حدود میں رہتے ہوئے فراخ دل ہونا لازم ہے۔ مصنف کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے۔ کہ تعصب و عناد کی پٹی کھول کر اس میدان میں قدم رکھے۔ مگر تصلّب لازم۔ ورنہ آغوش اغیار میں جانا مصنف کی اخلاقی بربادی اور فن کی ذلت ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ مقفہ مسجع عبارات اور لفاظی فن کاری اور عجیب و غریب الفاظ کی بھرمار کا نام کامیاب تصنیف ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ کامیاب تصنیف وہ ہے۔ جس سے مقصدِ تصنیف اجاگر ہو۔ جن کے لیے لکھی گئی ہے۔ ان کی فہم سے بالاتر نہ ہو۔ بلکہ قارئین کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ جیسے کہ علماء کے لیے اعلیٰ حضرت کی تصنیف اور عوام و خواص کے لیے حضرت حکیم الامت کی تحاریر۔ بعض ناسمجھ مصنفین اپنے تصنیفی جوش میں ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں کہ شریعت پاک کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ خالق، اللہ کریم کے لیے خاص۔ کسی انسان وغیرہ کو خالق کہنا حرام ہے۔ اسی طرح لفظ معجزہ انبیاء کرام کے افعال عجیبہ کے لیے خاص ہے۔ مگر بہت سے غیر ذمے دار، اسلامی تعلیم سے اجہل صحافی اور پاکستانی مصنف، قائداعظم کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ کہ پاکستان کا خالق (معاذ اللہ) کتنا بے ہودہ اور گناہ والا جملہ ہے۔ بعض کتابوں میں اس طرح لکھا دیکھا کہ معجزات ہومیوپیتھی وغیرہ وغیرہ یہ سب گناہ اور مسلمان کی شان تصنیف کے خلاف۔ ایسے ہی مسلک اہل سنت میں لفظ علیہ السلام، انبیاء ملائکہ کے علاوہ کسی کے لیے لکھنا ناجائز۔ مگر غیر ذمے دار متفرق صفت سنی اہل قلم علیہ السلام، صدیق علیہ السلام لکھ دیتے ہیں۔ جس سے مسلک کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

آداب المفتی: قانون شریعت میں کون شخص فتویٰ دے سکتا ہے کون نہیں:

یہ تو منزل تصنیف کے گوشوں کی تطہیر تھی۔ لیکن اصول افتاء اس سے بھی مشکل تر ہیں۔ اور ایک مفتی اسلام بننے کے لیے کہیں زیادہ کٹھن منزلیں ہیں۔ قانون شریعت کے مطابق لفظ مفتی ایک ذمہ دار عہدے کا نام ہے۔ جس طرح آجکل انگریزی قانون میں جج، جسٹس اور چیف جسٹس عدالتی ارکان کے نام رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح عدالت اسلامیہ کے اہم نام مفتی، قاضی اور قاضی القضاۃ ہیں۔ دنیاوی قانون میں بغیر ڈگری

اور بغیر منظوری حکومت کوئی شخص بھی حکومت وقت کے قانونی نام استعمال نہیں کر سکتا۔ ورنہ قانونی مجرم ہو کر مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اسی طرح حکم اسلامی کی رو سے اسلامی سلطنت کے قانونی نام شرعاً کسی طرح استعمال کرنے جائز نہیں۔ ایک عام آدمی کو قانون اجازت نہیں دیتا کہ اپنا لقب یا تخلص کرنل یا جرنل یا ڈپٹی کمشنر یا مجسٹریٹ رکھے۔ ورنہ وہ توہین حکومت کا مرتکب گردانا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی حکومت کے ڈر سے ایسا کرتا ہے۔ تو شریعت پاک بھی کسی جاہل یا کم علم کو ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ کہ اپنا نام یا لقب یا تخلص، مفتی، محدث، مفسر رکھے۔ یہ الفاظ کوئی ذات پات نہیں۔ نہ ہی یہ بطور قافیہ ردیف ہے۔ کہ ہر نااہل آدمی اپنے نام سے پیوست کرتا پھرے۔ یہ الفاظ نااہل کے لیے استعمال کرنے سے عدالت اسلام کی توہین ہے۔ اور ایسا شخص میدان محشر میں ضرور سزایاب ہوگا۔ یہاں تک کہ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایک شخص پورا عالم متبحر ہو مگر فتوے نہ دیتا ہو وہ بھی اپنے آپ کو مفتی نہیں لکھ سکتا۔ نہ ہی اس کو مفتی کہا جائے۔ کیونکہ کہلانے اور کہنے والا دونوں کذب بیانی کے مرتکب۔ لفظ مفتی، عدالت اسلامیہ کا عظیم ترین نام ہے۔

اس کے لیے وہی لائق ہے اور اہل ہے جس میں فقہاء کرام کی فرمودہ اٹھائیس صلاحیتیں ہوں۔ مندرجہ ذیل فرمودات حضرت حکیم الامت قبلۂ عالم مفتی اعظم اسلام مفتی احمد یار خاں صاحب علم الافتاء کے دوران اسباق افتاء کے ضمن میں تلامذۂ دارالافتاء کو سبقاً سبقاً تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ اور اس درس میں آپ کچھ زیادہ ہی اہتمام فرماتے۔ متقدمین و متاخرین فقہاء نے بھی اس علم فتوی پر بہت کتب تصنیف کیں۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے حقوق اللہ اور حقوق العباد ہر دو وابستہ ہیں۔ اس فن میں ذرا سی چوک بعض وقت خود مفتی کے دین و ایمان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ مفتی بننے میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اگرچہ غریب ہو۔ امیر ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ دولت مندی اسلام کی خدمت گزاری کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہی وجہ ہے۔ متبحر علماء اکثر سفید پوش اور حالت مفلسی میں ہی رہے۔ جیسا کہ تاریخ اسلام اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا سے واضح ہے۔ ادب اخلاق اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا جو پہلو اعلیٰ خاندانی میں ہے وہ نیچ قوم میں نہیں۔ اور ایک مفتی اسلام کے لیے اخلاق و تہذیب اور سلیقۂ گفتگو نہایت ضروری ہے۔

دوسری شرط مفتی بننے کے لیے ضروری ہے کہ بیشۂ علم و معرفت میں مثل ہرن ہو۔ کہ ہر چیز سے چوکنا رہے۔ اور وادی عشق و مستی میں مثل شیر ہو۔ کہ دل کا مستغنی اور راضی بہ رضا رہے۔

(از فتاوی عالمگیری) **تیسری شرط** جتنے علاقوں میں اس کا فتوی جاری ہوتا ہو ان علاقوں کے

لغت اور رواج و رسومات سے واقف ہو۔ علامہ شامی عقود رسم المفتی کے صفحہ نمبر ۱۴۱ پر فرماتے ہیں، جو اپنے زمانے کے رواج سے ناواقف ہو وہ علماء فتویٰ کے نزدیک جاہل ہے: **چوتھی شرط**، قرآن وحدیث اور قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے اٹھارہ علوم کا ماہر ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری و فتح القدیر)

پانچویں شرط اُمراء اغنیاء دولت والوں دور رہے۔ کثرت محافل سے پرہیز کرے۔ بلکہ گوشہ نشینی اختیار کرے۔ اور بقول اعلیٰ حضرت۔ ع۔ منم و کنج خیال و دوات و قلمے خلوت میں ہو۔ علماء کرام کی گوشہ نشینی یہ ہے۔ کہ ہر وقت تحقیق و علمی جستجو میں لگا رہے۔ اگرچہ بازاروں میں پھرتا ہو۔ یا بظاہر دریاؤں، پہاڑوں کی سیر میں مشغول ہو۔ اور بقول حضرت سعدی علیہ الرحمتہ۔ مصرعہ

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

کا مظہر اتم ہو۔

چھٹی شرط اس میں عقل و خرد پوری بلکہ اتنی زیادہ ہو کہ ملکۂ اجتہاد فروعی پیدا ہو سکے۔ (عالمگیری جلد سوم صفحہ نمبر ۳۰۸) **ساتویں شرط** اپنے ہر اجتہاد پر اپنے امام کی باحوالہ تائید حاصل کرتا جائے

آٹھویں شرط مفتی کے لیے لازم ہے کہ نگاہِ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز ہو۔ نرم اور میٹھی زبان حلیم اور باوقار طبیعت ہو۔ **نویں شرط**: مسلمان، متقی، پرہیزگار ہو۔ فاسق یا گھناؤنی طبیعت اور بدخصائل یا رذیل عادات والا نہ ہو۔ **دسویں شرط** عدل و انصاف والا ہو۔ ظالم نہ شرد امراء کی دلجوئی یا ان سے مرعوب، خوف زدہ ہونے والا بزدل نہ ہو، حق بات میں جابر بادشاہ سے بھی نہ ڈرے۔ **گیارھویں شرط** مفتی کے ضروری ہے تحمل مزاجی سے مستفتی کی بات سنے۔ اور اس کو سوال وجواب اور بحث کرنے کی پوری آزادی دے۔ اور استفتاء کی تحریر بغور پڑھے۔ اچھی طرح سمجھے۔ ایک ایک نقطے پر غور کرے۔ صرف سنانے اور لکھنے کا ہی عادی نہ ہو۔ بلکہ حق سننے اور حق کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالے۔ غلطی کے اعتراف میں شرمندگی محسوس نہ کرے۔ کیونکہ غلطی پر اجماد تکبر اور غرور کی نشانی ہے۔ ایسا شخص مفتیٔ اسلام ہونے کے لائق نہیں۔ بلکہ بقول حدیث پاک گمراہ اور گمراہ گر ہے۔ **بارھویں شرط** جس کا استفتاء پہلے ہو اس کو پہلے جواب دے۔ کسی امیر کی رعایت سے یہ ترتیب نہ توڑے۔ اگر امراء دباؤ ڈالیں۔ بشرطیکہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو۔ ہاں علماء کرام، صوفیاء عظام یا اپنے قریبی احباب کے لیے یا آسان اور مشکل فتاویٰ کے اعتبار سے ترتیب توڑنا جائز ہے۔ جب کہ سابق مستفتی کو نقصان نہ ہو۔ **تیرھویں شرط** حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کوئی زنا کر نگر کے فتویٰ نہ لکھا جائے۔ بلکہ اگر کسی دوسرے فرد کا بھی استفتاء سے تعلق ہے۔ تو اس کو حاضر کر کے دو طرفہ مع شہادت حلفیہ بیان لے کر اور پوری تشفی کر کے تب فتویٰ لکھے۔ اگرچہ کچھ دن لگ جائیں

فتوی پر اعتماد طریقے سے لکھا جائے۔ اوّل سے ہی رجوع کا ارادہ نہ ہو۔ ورنہ مفتی میں کبھی بھی خود اعتمادی پیدا نہ ہوگی۔ دلائل مضبوط پیش کرے محوّلہ کتب کا باب اور صفحہ بھی نوٹ کر دیا جائے۔ نادر و نایاب کتب کے ایسے حوالوں سے پرہیز کیا جائے۔ جن کی تائید دوسری کتب مشہورہ سے میسّر نہ ہو (از عالمگیری) **چودھویں شرط** مفتی کے لیے ضروری ہے کہ تمام دینی تعلیم کسی بڑے متبحر عالم دین سے پڑھی ہو۔ اور سند یافتہ ہو۔ جو شخص خود بخود عربی کتب کا مطالعہ کرے۔ کتنا ہی بڑا عالم بن جائے۔ مگر فتوے دینے کا اہل نہ ہوگا (عقود رسم المفتی لعلامہ شامی صفحہ نمبر ۸) **پندرھویں شرط** حضرت حکیم الامت نے فرمایا بچوں اور عورتوں سے استفتاء کا کاغذ نہ پکڑے۔ بلکہ درمیان میں مردوں کا واسطہ رکھے۔ نہ ہی بچوں یا عورتوں کی مجلسوں میں بیٹھ کر فتوی لکھے۔ **سولہویں شرط** جب حوالے کے لیے کتب کا مطالعہ کرے تو بہتر ہے کہ باوضو ہو اور عزت و احترام سے کتب کا مطالعہ کرے۔ ادب سے رکھے۔ نیچے زمین پر یا چٹائی پر نہ رکھے۔ ورنہ ادب ختم ہونے سے ملکۂ تفقہ فی الدین ختم ہو جائے گا۔ کتب فقہ پر اپنی تسبیح یا قلم دوات بھی نہ رکھے کہ سوءِ ادبی ہے **ستارھویں شرط** فتووں یا سوالوں سے ردّی کاغذ پھاڑ کر زمین پر نہ پھینکیں کہ یہ بدخصلتی کا نمونہ ہے۔ نفسیاتی طور پر طبیعت کی نفاست پسندی جو ایک مفتیٔ وقت کے لیے بہت ضروری ہے ختم ہو جاتی ہے۔ لکھے ہوئے یا سادے کاغذ سے استنجا کرنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ یہ یہود و نصاری کی اسلام دشمنی میں ایجاد کردہ رسم ہے۔ کاغذ سے کسی قسم کا استنجا کرنے کی حرمت کا حکم سب مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ کاغذ ذریعہ ہے اشاعت قرآن و حدیث و تبلیغ دین کا۔ **اٹھارویں شرط** مفتی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ فوراً بعد بلوغت باعتبار اہلیت منصب افتاء پر فائز ہونا جائز ہے (عالمگیری) چنانچہ اعلیٰ حضرت کے اساتذہ نے اعلیٰ حضرت قبلۂ عالم کو بلوغت کے ایک سال بعد یعنی تیرہ سال ہی تحریر فتوے کے لائق بنا دیا تھا۔ اور آپ نے تیرہ سال کی مختصر عمر میں بکمال ذہنیت اپنے رب کریم کے فضل و کرم سے پہلا جامع مانع فتوی لکھا خود مجھ کو حضرت حکیم الامت کی محنت شاقہ و نگاہ داشت نے اٹھارہ سالہ عمر ۱۹۵۹ء میں پہلا فتوی لکھنے کا شرف بخشا۔ جبکہ میری پیدائش بقول بڑی پھوپھی صاحبہ بدایونی مدّ فیوضہا۔ ماہ اپریل بروز جمعہ بوقت اشراق وطن اوجھیانی ۱۹۴۲ء میں یعنی پاکستان بننے سے چھ سال پیشتر۔ اس حساب سے اس وقت میری عمر چھتیس ۳۶ سال بنتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ **انیسویں شرط** کتاب میں لکھے ہوئے مسئلے کو پہلے بار بار پڑھ کر اچھی طرح سمجھے پھر بیان کرے۔ **بیسویں شرط** مفتی کیلیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ زبانی یا تحریری فتوی دینے وقت نہ زیادہ بھوکا ہو نہ پیاسا، نہ زیادہ پیٹ

بھرا ہوا ہو۔ اس لیے کہ بھوک، پیاس میں جلدی غصہ آجاتا ہے۔ جو ایک مفتی کی شان کے خلاف ہے کہ بلا وجہ غصہ اور بے موقع طیش جہلا کا کام ہے۔ اور پیٹ بھرا ہو تو سستی پیدا ہوتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سبب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ قوت فتویٰ نویسی اور معاملہ فہمی کے لیے بہت فروری ہے۔ **اکیسویں شرط** زبانی یا تحریری فتوے میں اشارے کنائے والے الفاظ و جملوں سے اجتناب لازم ہے۔ صاف صاف عام فہم پوری عبارت اور شستہ گفتگو اور تحریر ہو۔ اس لیے کہ مستفتی اکثر گنوار ہوتے ہیں۔ ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو ہونی چاہیئے۔ (از نبراس علی شرح عقائد صفحہ نمبر ۱۱۹)

بائیسویں شرط فتویٰ لکھنے سے پہلے اپنے رب کریم کے حضور گناہوں کی معافی اور بخشش و کرم کی طلب ہو۔ اور خطا و نسیان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ بلکہ اپنے ہاتھ اور قلم کو سمت قبلہ بطریقہ دعا دراز کر کے یہ عرض کرے۔ کہ یا اللہ مجھ کو ان کے فتنے سے بچا۔ اور ان کے فیوضات سے نواز پھر لفظ الجواب کی ب خاصی دراز کرے۔ اس کے اوپر استعانت باللہ کے دعائیہ الفاظ لکھے۔ پھر نیچے فتوے کی عبارت شروع کرے اور سطور کو ب سے زیادہ درازی نہ دے۔ تاکہ خط بصورتی رہے۔ جواب مکمل ہونے پر وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ پھر کتبہ کا لفظ دراز کر کے لکھے۔ نیچے اپنا نام مع مکمل پتہ درج کرے اس کے نیچے تاریخ اور مہر لگائے۔ اسی طرح حضرت حکیم الامت ہم کو مشق کرواتے تھے۔ اسی طرح کچھ تغیر سے عالمگیری صفحہ نمبر ۳۰۹ پر ہے۔ لهٰذا ان قیود و شرائط علم مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مسلک کے اصول و فروع پر پورا عبور رکھو اور مہارت رکھتا ہو۔ دیگر مذاہب کے ضروریات سد بدہ ہو۔ ضوابط و قوانین کے تمام قواعد کی بھی پہچان رکھتا ہو۔ حدیث و قرآن کے ناسخ و منسوخ سے خبردار ہو۔ تعدلی اور وجوہ بھی جانتا ہو ویسے تو ہر فتوے کے لیے علم کثیر و تجارب شدید کی ضرورت ہے۔ مگر خصوصاً فتوئے کفر کے لیے بہت ہی زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ کفر کا فتویٰ لگانا ہر مفتی کا کام نہیں۔ بلکہ اس کے لیے مفتی اعظم ہی کا علم و مقام مناسب ہے۔

فتوے پر اجرت لینے کے متعلق فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب فتویٰ نماز، روزے یا یتیموں کی میراث سے متعلق ہو تو اجرت نہ لے۔ لیکن جب مدعی اور مدعیٰ علیہ کی شکل میں ہو۔ تو اپنی محنت کے حساب سے اجرت لے۔ یہ اس شخص سے لے سکتا ہے۔ جس کے حق میں فتویٰ ہو۔ بشرطیکہ مفتی کو اس کام پر نہ کسی ادارے سے تنخواہ ملتی ہو۔ نہ حکومت کی جانب سے۔ لیکن اگر حکومت یا ادارے کی طرف سے فقط فتویٰ نویسی کی تنخواہ مل رہی ہو۔ تو فتویٰ لکھنے کی اجرت مستفتی سے لینا حرام ہوگا۔ کہ یہ رشوت ہے۔

چھبیسویں شرط: مفتی کو چاہیے کہ فتوائے لکھنے پر حریص نہ ہو۔ بلکہ اسی طرح فتویٰ لکھنے پر جلد بازی نہ کرے، جہاں تک ہو سکے اجتناب کرے۔ پہلے مستفتی کو زبانی جواب سمجھادے۔ اور کہے کہ لکھوانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب مدعی یا مدعیٰ علیہ لکھنے ہی کا مطالبہ کرے۔ تو پھر بالکل کمزوری نہ دکھائے۔ پوری قوت کے ساتھ مضبوط فتویٰ لکھے۔ **ستائیسویں شرط:** غیر مفتابہ کتب پر فتویٰ جاری نہ کرے۔ ہمیشہ معتبر کتب اور محقق کتب سے فتویٰ جاری کرے۔ ہاں غیر مفتابہ کتب کے حوالے تائید میں پیش کر سکتا ہے۔ بصورت تقابل مفتابہ کو ترجیح دے۔ جیسے کہ آج کل فتاویٰ شامی، بحر الرائق، فتح القدیر، ہدایہ وغیرہ تقابل میں شامی قابل ترجیح ہے۔ **اٹھائیسویں شرط:** مفتی دار الاسلام کے لیے ضروری ہے۔ کہ فتویٰ لکھتے وقت صرف مدعی مدعیٰ علیہ اور گواہوں کے بیان پر نظر ہو۔ نہ تو ذاتی معلومات پر فتویٰ دے اور نہ ہی مسلک یا مشرب یا دینی تعصب یا لنگاوٹ باقی رکھے۔ حق فتویٰ دے اگرچہ اپنوں کے خلاف ہو۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ؕ

کتبہ

یہ تھے وہ آداب جو ہر مفتی کے لیے سیکھنے لازم و ضروری ہیں۔ تاکہ دنیا و آخرت کی عزت حاصل ہو۔

○

سوال:۔ تمام آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کا کلام اور صفاتِ باری تعالیٰ ہیں نہ کہ مخلوق

کیا فرماتے ہیں علماءِ اسلام اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر کے ایک جلسے میں ایک مولوی صاحب جو بہت مشہور مقرر ہیں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ توریت اور زبور اور انجیل جو حضرت موسیٰ اور داؤد اور عیسیٰ علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ وہ کلامِ الٰہی نہیں ہیں۔ ان کو وحی الٰہی تو کہا جا سکتا ہے مگر کلام الٰہی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان صاحب کتاب انبیاء کرام نے اصل منزل کتاب قوم کے سامنے پیش نہیں کی بلکہ اپنی قوم کی زبانوں میں ترجمہ کر کے پیش کیا اور ترجمہ کو کلام الٰہی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب کتابیں عربی میں نازل ہوئی تھیں۔ اپنی تقریر کے ان الفاظ پر انہوں نے جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب اَلْاِتْقَان کا حوالہ پیش کیا۔ تقریر اور جلسے کے بعد علما نے ان سے توبہ کرنے

کو کہا۔ تو وہ توبہ کی طرف مائل نہیں ہوئے بلکہ ابھی تک اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں لہٰذا آپ کی خدمتِ عالیہ میں گزارش ہے۔ کہ آپ مکمل و مدلل فتویٰ عطا فرمائیں۔ اور فرمائیں کہ کیا ان خطیب صاحب کو توبہ کرنی چاہیئے یا نہیں۔ اور کیا یہ بات غلط ہے یا صحیح خدمتِ عالیہ میں گواہ بھی حاضر ہیں اور ان خطیب صاحب کی کیسٹ بھی حاضر ہے۔ ہمارے علاقے میں اس تقریر پر بہت باتیں ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ ان کی شہرت یافتہ شخصیت کی بنا پر کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے مگر اکثریت کہتی ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ بیّنوا توجروا۔

سائل محمد اعظم میرپوری (آزاد کشمیر) حال ساکن برطانیہ 3/1/84

بعون العلام الوہاب

الجواب

صورتِ مسئولہ میں گواہوں کے بیان اور سائل کے تحریری استفتاء پر غور و خوض کرنے کے علاوہ مولانا کی تقریر کا ٹیپ شدہ شریط (کیسٹ) کئی دفعہ بغور سنا۔ بعد تامّلِ بسیار یہ فتویٰ جاری کیا جا رہا ہے۔ قانونِ شریعت کے مطابق مولوی صاحب کی یہ بات سخت غلط اور گمراہ کن ہے ان کو فوراً اپنے اس غلط عقیدے سے توبہ کرنی چاہیئے۔ دراصل یہ بات پرانے زمانے کے ایک بڑے مشہور فرقۂ باطلہ معتزلہ کے عقائدِ ضالّہ سے ہے۔ یہ ان لوگوں کا ہی عقیدہ تھا اور یہ عقیدہ اس لئے بنایا تھا کہ قرآن مجید توریت زبور انجیل کو کلام الٰہی نہ مانا جائے بلکہ مخلوقِ الٰہی مانا جائے۔ اسی باطل نظریے کو اس زمانے کے خبیث طینت بادشاہوں کا ظالمانہ جابرانہ سہارا مل گیا۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مناظروں میں جب بڑے بڑے معتزلیوں نے شکست کھائی تو باطل اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا۔ اور امام حنبل جیسی پاکیزہ شخصیت کو کوڑوں سے زخمی کیا گیا۔ اسی باطل نظریئے کے مقابل اہل سنّت کے عظیم امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سینہ سپر ہوئے! امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس فتنے نے ابھی سر نہیں ابھارا تھا مگر کچھ دبے لفظوں میں ظاہر ہو رہا تھا جس کو امام اعظم اور آپ کے تلامذہ نے سختی سے کچلا اور اپنے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ قرآن مجید اور توریت و زبور و انجیل سب ہی کلام الٰہی اور اللہ کا کلام ہے۔ اور کلام متکلّم کی صفت ہوتی ہے نہ کہ مخلوق۔ صفاتِ باری تعالیٰ عینِ ذات ہیں نہ کہ غیرِ ذات۔ یہ ضابطہ کلّیہ متفقہ ہے کہ صفتِ موصوف کبھی بھی اپنے موصوف کی مخلوق نہیں ہو سکتی۔ اب معتزلہ فرقہ دنیا سے مفقود ہو چکا ہے۔ کیونکہ باطل فنا ہونے کے ہی لائق ہے۔ مگر اہل سنّت کے تاجدار امام حنبل کا چراغ تا ابد روشن ہے۔ معتزلہ کا تھوڑا سا روپ اب وہابیت کے نقشے میں ہے اور باقی سب فرقے اسی جھاڑی کے کانٹے ہیں۔ یہاں تک کہ منکرینِ حدیث اور مرزائیت بھی اولاً اسی فرقے سے تھے۔ آپس میں سب ایک دوسرے کے مدح خواں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنی کتاب دو اسلام کے دوسرے ایڈیشن میں وہابی علماء کی نام بنام تعریف کرتا ہے اور اہل سنّت علماء کی توہین و گستاخی کرتا ہے اسی طرح ڈاکٹر اقبال جو خفیہ انکار حدیث مسلک سے محبت رکھتے ہیں خانقاہی علماء صوفیا کی برائی کرتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے یہ مذہب اور عقیدہ معتزلہ کا ہے مسلکِ اہل سنّت کے بالکل خلاف ہے یہ جن مولانا صاحب نے اپنی تقریر میں ایسی لغو بات کر دی وہ ان کی تقریری جذبات کا نتیجہ ہے ان کو توبہ پر مجبور کیا جائے اگر توبہ نہ کریں تو ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی

جائے نہ ان کو آئندہ تقریر کے لئے بلائے۔ شاعرانہ لغزشیں شعراء اور نعت خوانوں سے تو شروع سے مشہور رہیں مگر اب ہمارے مقررین حضرات بھی کافی کم علمی کا شکار رہیں۔ امام جلال الدین سیوطی نے اگرچہ یہ بات لکھی ہے مگر وہ ان کا اپنا مسلک نہیں بلکہ کسی کا قول نقل کیا ہے۔ اور یہ قول روایۃً درایۃً عقلاً نقلاً۔ اور حدیث و قرآن پاک کی آیات کے خلاف اور ہر طرح لغو اور باطل ہے مسلک اہل سنت کے خلاف ہے۔ جلال الدینؒ تو قرآن مجید کے متعلق بھی اسی طرح نقل کر رہے ہیں۔ چنانچہ الاتقان صفحہ ۴۳ پر ہے اِنَّ جِبْرَائِیْلَ اِنَّمَا نَزَلَ بِالْمَعَانِیْ خَاصَّۃً وَاَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلِمَ تِلْکَ الْمَعَانِیْ وَعَبَّرَ عَنْھَا بِلُغَۃِ الْعَرَبِ (الخ) ترجمہ بے شک جبریل علیہ السلام قرآن مجید کو خاص معانی میں لے کر آئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان معانی کو جانتے تھے اور اپنے ان معانی کو عربی لغت میں ڈھالا (عبارت بنایا)۔ معاذ اللہ معاذ اللہ کتنا کفریہ مسلک ہے اس سے تو قرآن مجید کی آیتوں کا ہی صاف انکار ہو رہا ہے۔ ایسی بیہودہ باتیں تو معتزلہ کی ہی ہو سکتی ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ باتیں معتزلہ نے کیوں کیں؟ صرف اس لئے کہ مسلک حق اہلسنت کے خلاف اور اپنے باطل نظریے کو بچایا جائے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ کتب سماوی کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کیا جائے۔ اور مخلوق ثابت کیا جائے صفت باری تعالیٰ عزاسمہٗ نہ مانا جائے۔ حالانکہ مسلک اہل سنت یہ ہے کہ تمام کتب الٰہیہ کلام الٰہی اور صفت الٰہیہ ہیں نہ کہ خلق الٰہیہ۔ اور ہر کتاب اپنی اپنی قومی و علاقائی زبان میں نازل ہوئی۔ عربی زبان میں صرف قرآن مجید نازل ہوا مسلک اہل سنت پر کثیر دلائل ہیں۔

پہلی دلیل: قرآن مجید سورہ بقرہ پارہ ۱ع آیت ۷۵، پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ ترجمہ: اور بے شک ان یہودیوں عیسائیوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں۔ پھر تحریف کر دیتے ہیں اس کو اس کے بعد کہ عقل رکھتے ہیں اس کی حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اس آیت میں صاف صاف توریت و انجیل کو کلام الٰہی فرمایا گیا۔ تمام مفسرین اس کی یہی تفسیر فرماتے ہیں۔ کہ اس جگہ توریت کا ذکر ہے۔ رب تعالیٰ تو آج تک توریت و انجیل کلام سماوی کو کلام الٰہی فرما رہا ہے اور یہ مولوی صاحب اس کے کلام الٰہی ہونے کے منکر ہیں۔ بھلا کیونکر ان کو درست کہا جا سکتا ہے۔ بجز گمراہی اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ قرآن مجید سورۃ توبہ پارہ ۱۰ میں ارشاد باری ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰہِ (الخ) ترجمہ: اور اگر کوئی مشرک یا رسول اللہ آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دیدو تاکہ اللہ کا کلام سنے۔ اس آیت میں قرآن مجید کو اللہ کا کلام کہا گیا۔ اس میں بھی معتزلہ کا رد ہے۔ **دوسری دلیل:** صرف قرآن پاک عربی زبان میں آیا۔ پہلی تین کتابیں اور جملہ صحائف اپنی زبانوں میں نازل ہوئے۔ کسی نبی اکرم نے ذرہ بھر تبدیلی نہیں کی اسی طرح قوم کے سامنے پیش فرما دی۔ مولوی مذکور کی کتنی بڑی نادانی ہے کہ قرآن مجید کی صریح آیات پر غور نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے سورت ابراہیم پارہ ۱۳ آیت ۳۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ اور نہیں بھیجا ہم نے اپنے کسی پیغام والے کو مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ یہ پیغام بیان فرمادے ان کے لئے۔ اس آیت کریمہ کی اقتضاء النص سے

ثابت ہو رہا ہے کہ یہاں پیغام الٰہی کی زبان مراد ہے۔ اس لئے کہ حرفِ اَلّا نفی سابق کو توڑ کر لسان کا حصر پیدا کر رہا ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایک ہی زبان میں ہو۔ حالانکہ رسولانِ عظام بہت سی زبانیں جانتے ہیں جیسا کہ تفاسیر سے ثابت ہے حضرت آدم علیہ السلام نے ہزار زبانیں جانتے تھے حضرت یوسف علیہ السلام کو چالیس زبانیں آتی تھیں اسی طرح دیگر انبیاء کرام بھی علوم کائنات کے بحرِ ذخار ہوتے ہیں ان کی اپنی معلوماتی زبان ایک نہیں ہوتی بلکہ قومی زبان کے علاوہ بہت سی ایسی زبانیں ہوتی ہیں جن کو کائنات کے لوگ نہیں جانتے۔ یہاں ایک زبان سے مراد پیغام اور کلام الٰہی کی زبان ہے جس کیلئے نبی علیہ السلام مبعوث ہوئے اور وہ ایک قومی زبان کتاب اور صحیفے کی زبان ہے اسی لئے آگے ارشاد ہے لِیُبَیِّنَ تاکہ وہ نبی علیہ السلام پیغام الٰہی قوم کے سامنے بیان کرے۔ پس ثابت ہوا کہ انبیاء کرام کی کتابی اور قومی زبان تبلیغ کے لئے ایک ہے اور معلوماتی زبانیں کثیر ہیں۔ یہاں کتاب کی زبان مراد ہے کیونکہ مقصودِ رسالت یہی ہے لِیُبَیِّنَ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ہر رسول بعینہ اپنی کتاب کا کلام پڑھ کر سناتے ہیں نہ کہ ترجمہ کتاب۔ اس لئے اتقان کی یہ عبارت قرآن کریم کی رُو سے لغو ہے۔ دوسری جگہ ارشادِ قرآنی ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ ترجمہ: بے شک ہم نے نازل کیا قرآن کو عَرَبِیًّا عربی بنا کر یا عربی زبان میں۔ اس آیت کے اشارت النص سے ثابت ہوا کہ صرف قرآن مجید ہی عربی زبان میں نازل ہوا۔ مشکوٰۃ شریف باب مناقب قریش ص۵۵۳ فصل ثالث کی آخری حدیث میں ہے: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلٰثٍ۔ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَكَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ: ترجمہ: روایت ہے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا انہوں نے کہ فرمایا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ محبت کرو تم عربیوں سے کیونکہ میں قومی لحاظ سے عربی ہوں اور اللہ کا قرآن الفاظ و لغت کے لحاظ سے عربی ہے اور جنتیوں کی زبان عربی ہو گی۔ اس حدیث پاک سے تو ظاہر ظہور ثابت ہو گیا کہ صرف قرآن مجید ہی عربی زبان میں آیا۔ اگر کوئی اور کلام الٰہی بھی عربی میں ہوتا تو یہ خصوصیت قرآن مذکور نہ ہوتی۔ ان تمام دلائل سے یہی ثابت ہوا کہ توریت و زبور و انجیل عربی میں نہیں اتریں بلکہ اپنے علاقے کی زبان میں نازل ہوئیں۔ چنانچہ تفسیر روح البیان پارہ ۱۳ جلد چہارم سورت ابراہیم ص۳۹۶ پر ہے۔ اُنْزِلَ التَّوْرٰىةُ فِى الْعِبْرَانِيِّ وَالْاِنْجِيْلُ فِى السُّرْيَانِيِّ۔ ترجمہ: توریت عبرانی زبان اور انجیل سُریانی میں نازل ہوئی۔ اور ہمارے عظیم مفسر پیر محمد کرم شاہ صاحب نے ضیاء القرآن پ۱۳ سورۃ ابراہیم میں لکھا کہ ہر نبی علیہ السلام کی وحی ان کی قومی زبان میں آئی۔ اسی طرح تفسیر ابن کثیر جلد دوم ص۵۲۲ پر ہے کہ ہر نبی اپنی قومی زبان میں مبعوث ہوئے اور بعثت کا معنیٰ ہے کلام الٰہی لانا۔ جب قرآن مجید حدیث پاک فقہا علماء مفسرین کرام سب ہی سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ توریت و زبور انجیل اپنی علاقائی زبانوں میں آئی اور سب ہی کلام الٰہی ہے تو جلال الدین سیوطی کا یہ ایک قول یا موجودہ خطیب کی لغویات ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے۔ موجودہ دور کے مقررین کرام کو صرف جذباتی نعرے لگوانے کا شوق ہے۔ تدبر و تفکر اور مسائل شرعیہ و آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ میں غور و خوض و تحقیق و تفتیش سے

دُور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے بدیں وجہ اکثر نعت خواں قسم کے خطباء فتویٰ شرعی کی زد میں آجاتے ہیں جس سے امت مسلمہ کی سبکی ہوتی ہے۔ اگر ذرا غور فرما لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ محققین و اہلِ تدبّر کے ارشادات کیا ہیں۔ چنانچہ توریت کے بارے میں ارشادات اس طرح ہیں (۱) مشکوٰۃ شریف باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء تیسری فصل آخری حدیث پاک صـ۵۱۰ پر حدیث پاک نے فرمایا کہ توریت مقدّس تختیوں پر لکھی ہوئی نازل ہوئی اور حضرت موسیٰ ان ہی تختیوں کو اٹھا کر بنی اسرائیل میں تشریف لائے اور جب قوم کو بچھڑے کی پرستش کرتے دیکھا تو بحالتِ غصّہ و غضبِ شدید تختیوں کو زمین پر رکھ دیا جس کی وجہ سے کچھ تختیاں اُٹھالی گئیں اور غائب ہو گئیں حدیث پاک میں تو اس طرح ہی ہے۔ مگر ہمارے مقرّر صاحب بحوالہ اتّقان ایسی لایعنی بات کر رہے ہیں جس کا اس حدیث پاک سے کوئی تعلّق نہیں۔ بھلا غور کرو کہ اگر موسیٰ علیہ السلام نے ترجمہ کر کے پیش کیا تو تختیوں میں رب تعالیٰ نے کیوں لکھا! ورنہ تختیوں کو قوم کے پاس کیوں لائے۔ (۲) اسی باب کی دوسری فصل میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام زبور شریف کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور تلاوت تو رب کے کلام کی ہوتی ہے اگر زبور کا بھی ترجمہ ہی تھا تو تلاوت کس کی (۳) تفسیر روح البیان جلد پنجم صـ۱۳۱ پر ہے آتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ۔ اَیِ التَّوْرَاتَ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً ترجمہ: اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی یعنی تورات شریف ایک دم عطا فرمائی (۴) تورات کی تختیں زبرجد یا لکڑی کی تھیں (تفسیر روح المعانی جلد پنجم پ۹ صـ۵۱) تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن جلد دوم میں ہے توریت پہلی ذیقعد کو نازل ہوئی اسی طرح تفسیر نعیمی پارہ نہم اور ضیاء القرآن میں ہے (۵) تفسیر روح المعانی نے فرمایا پارہ ۳ صـ۱۷۲ پر کہ توریت اور انجیل کا درمیانی زمانے کا فاصلہ ایک ہزار نو سو پچیس سال کا ہے اور بزرگانِ دین فرماتے ہیں حضرت آدم سے لے کر نبی کریم رؤف ورحیم تک کا کل زمانہ ۲ ارب ساٹھ کروڑ تنانوے لاکھ سال ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا یہ زمین کی ابتداء اور پیدائش کا زمانہ ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ کسی بزرگ کا شعر اس طرح ہے ؎

۲ ارب دو سی کروڑ و نود نو لک سالھا!
ابتداءِ دَورِ عالَم تا زمانہء مُصطفٰے!

تفسیر روح المعانی پ۹ صـ۵۱ اور تفسیر خازن جلد دوم صـ۲۸۷ پر ہے کہ توریت کی تختیوں کی تعداد دس تھی اور سائز پہلے زمانہ کا اٹھارہ انچ (ڈیڑھ فٹ) کے حساب سے بارہ گز کی ایک تختی تھی۔ اور تفسیر روح المعانی جلد پنجم پ۱۵ صـ۱۴۱ پر ہے توریت کوہِ طور پر عطا ہوئی تفسیر معانی پ۹ صـ۵۱ پر ہے کہ توریت رب تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے تحریر فرمائی۔ الاتّقان صـ۱۴ پر ہے کہ سابقہ کتابیں اور صحیفے ایک دم نازل ہوئے اپنے اپنے وقت میں تفسیر نعیمی جلد سوم صـ۸۴ اور تفسیر روح البیان جلد دوم پ۴ صـ۳۹۶ ۔ روح المعانی جلد سوم پ۶ صـ۱۵ پر ہے کہ زبور کی سورتیں ایک سو پچاس تھیں۔ لفظ زبور بمعنی مذبور ہے اس کا معنی لکھی کتاب یعنی مکتوب تفسیر نعیمی نور العرفان اور تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ زبور کاغذ پہ لکھی ہوئی تھوڑی تھوڑی نازل ہوئی۔ ابن کثیر جلد دوم صـ۲۱۶ پر ہے کہ زبور رمضان پاک کی بارہ تاریخ دن میں نازل ہوئی۔ خازن جلد چہارم صـ۱۶۴ پر ہے کہ زبور مقدس میں شرعی احکام نہ تھے صرف حمد و

ثنا اور دعائیں اور نعتِ پاک تھی تفسیر روح المعانی پ ۱۶ جلد ہشتم صہ ۸۲ پر ہے عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ دَرَسَ الْاِنْجِیْلَ وَاَحْکَمَہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ تفسیر خازن جلد چہارم صہ ۲۲۵ وَعَنِ الْحَسَنِ اَنَّہٗ قَالَ اُلْہِمَ التَّوْرٰاۃَ وَھُوَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ ۔ وَاُوْتِیَ الْاِنْجِیْلَ وَھُوَ صَغِیْرٌ طِفْلٌ ۔ تفسیر ابن کثیر جلد اول صہ ۳۶۴ پر ہے وَقَدْ کَانَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ یَحْفَظُ ھٰذَا وَھٰذَا یَعْنِی التَّوْرٰاۃَ وَالْاِنْجِیْلَ سب کا ترجمہ: روایت ہے حضرت انس سے کہ بے شک عیسٰی علیہ السلام نے والدہ کے پیٹ میں ہی انجیل پڑھی تھی اور رب تعالٰی نے ان کو وہیں سب احکام سکھا دیئے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بےشک انہوں نے فرمایا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو والدہ کے پیٹ میں ہی تورات کا الہام کر دیا گیا تھا اور انجیل بھی دیدی گئی تھی حالانکہ ابھی آپ صغیر یعنی شیرخوار بچے تھے۔ بے شک عیسٰی علیہ السلام پیدائشی وقت میں توریت اور انجیل کے حافظ تھے اس پوری گفتگو سے ثابت ہوا کہ توریت تختیوں پر لکھی ہوئی نازل ہوئی اور زبور شریف کاغذ پر اور انجیل شریف حفظ ہو کر آئی۔ یہ کہیں ثابت نہیں کہ کسی نبی علیہم السلام نے کسی کتاب کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کیا۔ تفسیر بیضاوی پ ۲ میں ہے کہ انجیل و توریت دونوں عبرانی زبان میں نازل ہوئیں۔ سب اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے اور حدیث و قرآن مجید میں بھی ظاہر ہے۔ فقط فرقۂ معتزلہ اس حقیقت اور حق مسلک کا صرف اس لئے منکر ہوا تاکہ اس کا باطل اور بنادٹی عقیدہ خلقِ قرآن والا بچ جائے۔ مذکور مولوی صاحب نے بھی بلا سوچے سمجھے معتزلہ کا مذہب بیان کر دیا۔ اللہ تعالٰی ان کو ہدایت دے تاکہ ایسی نادانی کی تقریروں سے باز آ جائیں۔ معتزلہ کے پاس اپنے باطل نظریہ پر قرآن مجید سے صرف چھ دلیلیں ملتی ہیں جس کے سہارے پر وہ اتنی لغویات کہتے ہیں یہ رب تعالٰی کا ہی کرم ہے جس نے اول ہی سے اسلام کی حفاظت کے لئے جماعتِ اہلسنّت کو پیدا فرمایا اور پھر اس کو مٹنے نہ دیا۔ ورنہ باطل کے ہزاروں فرقے پیدا ہوئے اور مٹ گئے۔ اور پھر حیرانی اس بات کی ہے کہ جو فرقہ بھی اٹھتا ہے اپنے باطل نظریات کے لئے قرآن پاک ہی سے استدلال کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی سچی سمجھ اور تدبر و تفکر غور و خوض انتہائی تحقیق و تفتیش بحمد اللہ تعالٰی علماء اہل سنت ہی کے مقدر و نصیب میں ہے۔ جب بھی کسی نے قرآن مجید کو بغیر تدبر پڑھا تو ایک باطل فرقے نے جنم لیا۔ چنانچہ یہی وطیرہ فرقۂ ضالہ معتزلہ کا رہا کہ استدلال ان کا بھی آیاتِ قرآنیہ سے ہوتا ہے۔ مگر سوچ اور تدبر نہیں۔ چنانچہ فرقۂ معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِہِمَا النُّبُوَّۃَ وَالْکِتٰبَ۔ سورت حدید ۵۷ آیت ۲۶۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ سورت اسراء ۱۷ آیت ۲۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ سورہ سجدہ ۳۲ آیت ۲۳۔ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲ اور معتزلہ کہتا تھا کہ رب فرماتا ہے اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ سورہ زخرف ۴۳ آیت ۳۔

ان تمام آیتوں سے استدلال علی خلقِ قرآن اس بنا پر ہے کہ لفظ جَعَلْنَا کا ترجمہ معتزلہ نے خَلَقْنَا کیا اور مطلب یہ لیا کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی یعنی ہم نے پیدا کیا اس قرآن کو ہدایت یا جَعَلْنٰہُ نُوْرًا ہم نے پیدا کیا اس قرآن کو نور۔ حالانکہ ان مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ میں جَعَلْنَا کا معنی خَلَقْنَا (ہم نے پیدا کیا) کرنا انتہائی جہالت اور کم علمی

اور خودی کا مسئلہ بنا لیتے ہیں حالانکہ اسی غلط رویّے سے باطل فرقے جنم لیتے رہے ہے جس نے قوم میں ناسورِ تفرق پیدا کر کے اتحادِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا۔ لیکن بہر حال و بہر طور مُصلحین اپنی ذمّے داری نباہتے ہی رہے۔ ان ہی پاکباز ہستیوں کی مساعی جمیلہ سے آج چمنِ اسلام میں حقائق کی کلیاں چٹک رہی ہیں۔ اور باطلین کے منصوبے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ بعض معتزلہ الزامی اعتراض کے طریقے پر کہا کرتے تھے کہ اگر انجیل و توریت اور قرآن مجید وغیرہ کُتب آسمانی اللہ کا کلام ہوتا اور کلام صفتِ الٰہی ہوتی اور صفتِ الٰہیہ غیر مخلوق ہوتی تو اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ سورۃ نساء آیت ۱۷۱ پ ۶ ترجمہ حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں۔ کلمہ اور کلام ایک چیز ہے۔ جب کلام غیر مخلوق تو کلمہ بھی غیر مخلوق لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام غیر مخلوق ہوئے۔ اور اور عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت اور الوہیت مسیح کا درست ماننا پڑے گا۔ اور اہل سنّت فقہا کا عقیدہ عیسائیت سے مشابہ ہو جائے گا۔ جواب یہ اعتراض معتزلہ کے نزدیک تو بہت مضبوط ہوگا اور وہ تو اپنے اس اعتراض پر بہت خوش ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض انتہائی جہالت کی بنا پر ہے اس لئے کہ اس اعتراض کا دار و مدار اس ہی بنا پر ہے کہ کلمہ اور کلام کو ایک درجے میں رکھا جائے حالانکہ حقیقتاً کلمہ اور کلام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ کہنا بہت مناسب ہے کہ ان دونوں میں نسبتِ تباین ہے تین وجہ سے۔ پہلی وجہ یہ کہ کلمہ مشترک المعانی ہے اور کلام متحد المعانی چنانچہ کتب لغت میں کلمے کے آٹھ معنیٰ ہیں ۱۔ زخم ۲۔ بات ۳۔ لفظ ۴۔ جملہ ۵۔ قانون ۶۔ فیصلہ ۷۔ کاریگری ۸۔ حکم۔ اور اس کی جمع ہے كَلِمَاتٌ یا كَلِمٌ۔ مگر کلام کا معنیٰ صرف ایک ہی ہے یعنی فرمودہ قول (بولا ہوا) لہٰذا کوئی کلمہ کلام نہیں ہو سکتا اور کوئی کلام کلمہ نہیں۔ اگرچہ ایک معنیٰ میں کلمہ جزء ہے کلام کی۔ لفظ كَلِمَةٌ اپنے ہر ترجمہ کے لحاظ سے علیحدہ خاصیت رکھتا ہے اس کا اصلی لغوی ترجمہ ہے زخم۔ اس معنیٰ سے اس کی جمع ہے كُلُوْمٌ جب ترجمہ ہو بات تو جمع ہے کلمات جب ترجمہ ہو قانون تو جمع ہے كَلِمٌ جب ترجمہ ہو کاریگری صنعت تو جمع ہے كِلَامٌ جب مراد ہو حکم تو جمع ہے كَلِمٌ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے مفرد اور جمع کے ساتھ بہت جگہ استعمال ہوا ہے مگر جب بھی کلمہ کا ترجمہ بات یا جملہ ہو تو اس کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لفظ کلمہ بمعنیٰ بات۔ ناقص کلام یعنی جزء کے درجے میں ہے اور اللہ کی بات کو ناقص کے درجے میں رکھنا گستاخی ہے۔ لہٰذا كَلِمَةُ اللّٰهِ یا کلمات اللہ کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یا قانون یا حکم یا صنعت کیا جائے گا۔ اس ضابطۂ کلیہ متفقہ کے تحت حضرت مسیح کو بھی كَلِمَتُهٗ کہنے کا مطلب ہوگا اللہ کا نشانِ قدرت یا کلمۂ کُن سے پیدا ہونا۔ یعنی حضرت مسیح نطفہ سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ حکم الٰہی سے پیدا ہوئے اور خود حکم یعنی نشانِ قدرت ہو گئے۔ یہی تمام مفسرین اور علماء و ائمہ عظام فرماتے ہیں۔ جس سے واضح ہو گیا کہ کوئی کلمہ کلام کے درجے میں نہیں اور کوئی کلام کلمے کے درجے میں نہیں۔ معتزلہ کا دونوں کو ایک درجے میں سمجھنا ان کی حماقت و کم فکری ہے لہٰذا كَلِمَتُهٗ کے لقب مسیح نہ ابنیت پر عقیدہ بنایا جا سکتا ہے نہ غیر مخلوق ہونے پر نہ الوہیت پر۔ اور فرقہ ضالّہ معتزلہ کا یہ استدلال نہایت ہی غلط ہے

ہے اس لئے کہ یہاں عقلاً۔ نقلاً اور اصلاً۔ لغتاً۔ نحواً جَعَلْنَا کا معنی خَلَقْنَا کرنا غلط ہے۔ لفظ جَعَلْنَا کا مادّہ اشتقاق ہے جَعَلَ اور یہ سات معنی میں مشترک ہے (۱) جَعَلَ کے معنی صنعت کاریگری (۲) جَعَلَ کے معنی پھیرنا بدلنا جیسے جَعَلَ الْحَسَنَ قَبِیْحًا یعنی اچھے کو برا کر دیا۔ (۳) گمان کرنا جیسے جَعَلَ الْحَقَّ بَاطِلًا یعنی حق کو باطل گمان کیا (۴) قائم کرنا مقرر کرنا جیسے جَعَلَہٗ حَاکِمًا اس کو حاکم مقرر کر دیا۔ (۵) لینا شروع کرنا جیسے جَعَلَ یَکْتُبُ یعنی لکھنے لگ گیا شروع ہو گیا۔ (۶) عطا کرنا۔ دینا بنانا۔ جیسے اِجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ یعنی عطا فرما مجھ کو سچی زبان۔ بنا میری زبان سچی۔ (۷) پیدا کرنا جیسے جَعَلَ اللّٰہُ الظُّلُمَاتِ اللہ تعالیٰ نے ظلمتوں کو پیدا کیا (المنجد عربی ص۹۰) ان معانی میں اصل اور لغوی ترجمہ ہے بنانا۔ باقی تراجم اصطلاحی ہیں اور نحو کا یہ قاعدہ مشہور اور متفق علیہ ہے کہ جب کوئی مصدر یا مادہ اشتقاق اپنے اصل معنیٰ سے ہٹ کر دوسرے مصدر کے معنیٰ میں مستعمل ہو تو وہ مادہ اپنی ذاتی اصلیت میں خواہ کچھ بھی ہو لازم یا متعدّی بیک مفعول یا بدو مفعول۔ لیکن دوسرے مصدر کے معنی میں آ کر اسی دوسرے کے مشابہ اور درجے میں ہو گا۔ اگر وہ لازم تو یہ لازم وہ متعدّی تو یہ متعدّی۔ اگر وہ مقیّد تو یہ مقیّد وہ مطلق تو یہ مطلق۔ بقاعدۂ نحو لفظ خَلَقَ متعدّی بیک مفعول ہے اور مطلق ہے۔ اس لئے جب جَعَلَ بمعنی خَلَقَ ہو گا تو مطلق اور متعدّی بیک مفعول ہو گا۔ اگر ان میں سے ایک بات بھی نہ ہو گی تو اس معنی میں نہ ہو گا۔ اس لئے اس قاعدۂ نحویہ کے تحت جب ان آیات میں غور و تدبّر کیا گیا۔ تو پتہ لگا کہ پہلی آیت میں فِیْ ذُرِّیَّتِہِمَا کی قید ہے اس لئے وہاں بھی جَعَلْنَا خَلَقْنَا کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتا بلکہ وہاں بمعنی عطا ہے اور ترجمہ اس طرح ہے ہم نے عطا کی ان کی اولاد میں نبوّت اور کتاب۔ باقی تین آیات میں جَعَلْنَا متعدّی بدو مفعول ہے (۱) جَعَلْنَاہُ ھُدًی (۲) وَجَعَلْنَاہُ ھُدًی (۳) وَلٰکِنْ جَعَلْنَاہُ نُوْرًا۔ مفعولِ اوّل ہٗ ضمیر ہے مفعولِ دوم ھُدًی اور نُوْرًا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی بمعنیٰ خَلَقْنَا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خَلَقْنَا ہمیشہ متعدّی بیک مفعول ہوتا ہے۔ اسی طرح پانچویں آیت جَعَلْنَاہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا بھی متعدّی بدو مفعول ہے۔ مفعولِ اوّل قُرْاٰنًا مفعول دوم عَرَبِیًّا پس ثابت ہوا کہ ان میں سے کسی جگہ بھی خَلَقَ کے معنیٰ نہیں ہو سکتے بلکہ ان چار آیات میں جَعَلْنَا کا معنیٰ ہے قائم کر دیا بنا دیا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ استاد نے شاگرد کو عالم بنا دیا جب یہاں بنانے کا مطلب پیدا کرنا نہیں ہو سکتا تو ان آیات میں بھی جَعَلْنَا کا معنیٰ پیدا کیا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خلقِ قرآن و توریت وغیرہ کا عقیدہ باطل ہو گیا۔ یہی وہ ضابطۂ اخلاق اور تدبّر و تفکّر کے دلائل ہیں جن کے سامنے معتزلہ اپنے دور میں ہمیشہ خائب و خاسر ہوتے رہے۔ اور عجز و مغلوبیت سے شکست کھاتے رہے مگر بجائے قبولیت حق کے حسد و عناد کی آگ میں ہی انتقام پر آمادہ رہے۔ بجز اس کے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے توفیقِ حق عطا فرمائی۔ یہی حال ہر دور میں ہوتا چلا آیا ہے۔ آج بھی کم علم خطبا بے تحقیق مقرّرین۔ داعیانِ ہمہ دانی قسم کے شیوخ مصلحین کی گرفت اور محاسبے کو آنا

اللہ تعالیٰ کی صفت کلام اللہ ہے نہ کہ کلمۃ اللہ۔ بدیں درجہ انجیل زبور توریت قرآن مجید کو رب تعالیٰ نے کلام اللہ تو فرمایا مگر کلمۃ اللہ نہ فرمایا۔ قرآن مجید میں انتیس ۲۹ جگہ لفظ کلمۃ استعمال ہوا ہے اور چودہ جگہ کلمات استعمال ہوا ہے مگر کہیں بھی اس کا معنی اللہ کی بات یا اللہ کا قول یا فرمان مراد نہیں۔ اسی لئے اس کا تعلق سننے سنانے سے نہیں کیا گیا جبکہ قول اور بات کا تعلق سننے سنانے سے ہے۔ بخلاف کلام اللہ کے کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں چار جگہ ہوا اور ہر جگہ سننے سنانے سے متعلق ہے جس سے ظاہر ہو گیا کہ کلام و کلمہ میں بہت فرق ہے اور معتزلہ کا دونوں کو ایک درجہ دینا غلط ہے۔ حضرت مسیح کلمۃ اللہ تو ہیں مگر کلام اللہ نہیں اور کتب الٰہیہ صحف آسمانی کلام اللہ ہیں کلمۃ اللہ نہیں ہیں۔ جب اس جواب سے معتزلہ گھبراتے تو بعض معتزلہ کہدیتے کہ کلام اللہ تو ہیں لیکن صفت الٰہیہ نہیں۔ مگر یہ بات بھی بہت کمزور ہے کیونکہ جس طرح رحم کرم صفت ہے اور رزاقیت خالقیت صفات ربانیہ میں شامل ہے اسی طرح کلام فرمانا بھی صفت ہے۔ مگر کلام الٰہی متفقہ طور پر کلام مفید اور کلام نفسی ہے اور جس طرح رازقیت کا مظہر مرزوق ہے اسی طرح کلام نفسی کا مظہر کلام لفظی ہے رازقیت قدیم صفت ہے اور مرزوق حادثات بایں طور کلام نفسی قدیم مگر کلام لفظی حادثات۔ بعض معتزلہ یہ بھی کہتے رہے کہ قرآن مجید وغیرہ کتب الٰہیہ کلام اللہ تو ہیں اور صفت الٰہی بھی ہیں مگر صفت الٰہی قدیم نہیں ہوتی اس طرح بہت سی چیزیں قدیم ماننا پڑیں گی۔ حالانکہ قدیم ہونا صرف ذات باری تعالیٰ کی شان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کتنا احمقانہ نظریہ ہے اس بات سے کون منکر ہو سکتا ہے کہ صفت سے موصوف کی تکمیل ہے اگر صفات الٰہیہ کو قدیم نہ مانا جائے تو کہنا لازم آئے گا بعد میں صفت پیدا ہوئیں اور بعد میں رب کی تکمیل ہوئی حالانکہ یہ عقیدہ عین کفر ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام کتب آسمانی اللہ کا کلام ہے اور کلام صفت الٰہی ہے اور صفات الٰہیہ بھی قدیم ہیں اسلئے غیر مخلوق غیر حادث ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ باطل اور لغو ہے۔ مولوی مذکور کو اس باطل عقیدے سے جلد از جلد توبہ کرنی چاہیئے اور آئندہ سوچ سمجھ کر تقریر کرنی چاہیئے۔ اس قسم کے ناکارہ اعتراضات کا سہارا لے کر یہ معتزلہ وغیرہ باطل فرقے ہمیشہ علماء حق کی گستاخیاں کرتے رہے۔ اور آج بھی نادان لوگ اہل حق مصلحین و مفکرین کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے ہیں۔ مگر رب تعالیٰ حق کا حامی و ناصر ہے۔ چراغ ہمیشہ اہل حق علماء کا ہی روشن ہے۔ واللہ و رسولہٗ اعلم

سوال ۴۳

اسلام میں تا قیامت ہر صدی کے ابتدا میں ایک مجدد آتا رہے گا۔ چودہ سابقہ صدیوں کے مجددین کرام کے اسماء گرامی۔ ہزار سالہ مجدد کوئی نہیں ہو سکتا۔ (بعض حضرات کے غلط اقوال کا مدلل جواب)

سوال :۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں۔ کہ حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ ہر صدی پر میری امت کی درستی کے لیے ایک مجدد آئے گا۔ لہٰذا عرض ہے۔ کہ آج تک کی صدیوں کے کون کون سے مجدد کس کس زمانے میں تشریف لائے؟ اُن کے زمانے میں کن کن فتنوں کا ظہور تھا۔ کہ جن کو آکران بزرگوں نے بند کیا؟ اِن مجدد کرام کے نام کیا ہیں۔ بعض نقشبندی لوگ کہتے ہیں کہ اب قیامت تک صرف مجدّد صاحب ہی مجدّد ہیں اور کوئی شخص مجدّد نہیں ہوسکتا۔ بَیِّنُوْا وَتُوْجَرُوْا۔ السائل :۔ مولوی شمس الدین الہ آبادی کراچی مورخہ ۱۳ ۱/ ۱۹۶۱

بِعَوْنِ الْعَلَّامِ الْوَھَّابِ ۵

الجواب

قانونِ شریعت کے مطابق یہ بات حتماً مسلّم ہے۔ کہ اللہ جل شانہ، اپنے پیارے حبیب رؤف و رحیم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل ان کی امت کو ضلالت سے بچانے کے لیے ہر سَو سال بعد آنے والی صدی کے بالکل ابتداء میں اپنے کسی کامل اکمل بندے کو مجددیت کا تاج پہنا کر اُمتِ نبی کریم کے لیے مبعوث فرماتا ہے چنانچہ ابو داؤد جلد دوم صفحہ نمبر ۵۸۹ کتاب الملاحم کے شروع میں پہلی حدیث ہے: حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ الْمَھْرِیُّ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَھْبٍ اَخْبَرَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ اَبِیْ اَیُّوْبَ عَنْ شَرَاحِیْلَ بْنِ یَزِیْدَ الْمَعَافِرِیِّ عَنْ اَبِیْ عَلْقَمَۃَ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ فِیْمَا اَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ترجمہ) سلیمان بن داؤد مہری نے ابو داؤد سے روایت کی ان سے ابن وھب نے ان کو خبر دی سعید بن ایوب نے انہوں نے شراحیل بن یزید معافری سے روایت لی۔ انہوں نے علقمہ سے انہوں نے ابوہریرہ سے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ میری اُمت کے لیے ہر صدی کے شروع میں مبعوث فرماتا رہے گا۔ ایسے شخص کو جو دین پاک کو صاف ستھرا کرتا رہے۔ (الخ) اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے بھی روایت کیا۔ جامع الصغیر نے جلد اول صفحہ نمبر ۶۳ پر اس کو صحیح کہا۔ اس حدیث پاک سے تین باتیں ثابت ہوئیں۔

(۱) پہلی یہ کہ ہر مجدد صرف ایک صدی کے لیے ہوگا نہ کم نہ زیادہ۔ بعض نقشبندی لوگ جو یہ کہتے کہ مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہزار سال کے مجدد ہیں اور ان کے بعد کوئی مجدد نہیں ہوسکتا بس ایک یہ ہی قیامت تک مجدد ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ بلکہ آپ بھی دیگر مجددین کی طرح فقط ایک صدی کے مجدد ہیں۔ الف ثانی کا مطلب دوسرے ہزار کی ابتداء جو گیارھویں صدی ہے۔ نہ کہ پورے ہزار سال۔ کیونکہ پورے ہزار سال تو ابھی نہیں سکتے۔ قیامت قریب ہے اور موجودہ نقشبندیوں کا یہ قولِ خود ساختہ اس حدیثِ منورہ کے

بھی خلاف ہے۔ مگر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مکتوبات حصہ دوم مکتوب چہارم ص۱۹ میں مجدد کی دو قسمیں فرمائی ہیں ۱ مجدد مائۃ ۲ مجدد الف۔ یعنی ہر صدی کا مجدد اور ایک ہزار سال کا مجدد اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجدد صاحب کے نزدیک بھی ہر صدی کا علیحدہ ایک مجدد ہونا ثابت ہے۔ اور نقشبندی حضرات کی یہ بات غلط ہو جاتی ہے کہ مجدد صاحب کے بعد کوئی مجدد نہ ہوگا۔ ہاں مجدد علیہ الرحمۃ کا یہ فرمان کہ مجدد الف بھی کوئی ہوتا ہے۔ یہ بات انتہائی قابل غور اور دلائل سے دور اور دو وجہ سے خلافِ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ کہ احادیثِ مطہرات میں ہزار سالہ مجدد یعنی مجدد الف کا کہیں ذکر نہیں۔ نہ ہی کسی اور امام یا فقیہ یا غوث و قطب نے اس کا ذکر فرمایا صرف مجدد صاحب کا اس طرح دو قسمیں فرمانا اہل تحقیق کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر بقولِ مجدد صاحب کوئی شخص مجدد ایں الف ہے یعنی الف ثانی تو مجددِ الف اوّل بھی ہونا لازم ہے۔ حالانکہ اس کا وجود تک نہیں۔ نیز یہ بات اظہر ہے کہ کسی بھی مجدد نے خود کو مجدد نہ فرمایا۔ بلکہ رب تعالیٰ کی طرف اقوام کی زبان و قلب پر جاری ہوگیا۔ خود مجدد علیہ الرحمۃ نے بھی۔ الفِ ثانی کا تذکرہ کیا لیکن یہ نہ کہا کہ میں الف ثانی مجدد ہوں۔ اب اس دور کے نقشبندی بزرگ صرف اسی مکتوب شریف کے سہارے پر الفِ ثانی کا لقب۔ مجدد صاحب کو دینے لگے۔ اس لیے یہ لقب عقیدت میں تو صحیح ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی ہزار اول کا مجدد ہے۔ نہ ہزار ثانی کا اسی بنا پر نہ کسی کو مجدد الفِ اول کہا گیا اور نہ ہی مجدد الف ثانی کہنا چاہیے۔ صرف جوشِ محبت میں احادیث کی خلاف ورزی اور مطلب برآری کے لیے اصول کی توڑ پھوڑ اچھا کام نہیں۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جس عالم کو مجدد بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنی بعثت کی صدی سے پہلی صدی میں پیدا ہو کر عالمِ واکمل مشہور ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ لفظ یَبْعَثُ، بَعَثَ سے بنا ہے اور بَعْثٌ کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کسی کام کے لیے اٹھ کھڑا ہونا۔ اور اس کام میں محوُل و مشغول ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لغاتِ کشوری صفحہ نمبر ۵۰ پر اور منجد عربی صفحہ نمبر ص۳۹ پر ہے۔ بَعَثَہٗ عَلَی الشَّیْءِ اَیْ حَمَلَہٗ عَلٰی فِعْلِہٖ وَ اَقَامَہٗ (الخ) ترجمہ: اس شخص کو مبعوث کیا۔ کسی چیز پر یعنی اس کے کرنے پر مشغول کیا۔ اور قائم کیا۔ بَعْثٌ کا شرعی ترجمہ یہ ہے کہ پیغام خداوندی کی تبلیغ شروع کر دینا۔ اور جو خدمتِ دین اس کے سپرد ہوئی۔ اس میں مشغول ہو جائے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعثتِ انبیاء عظام ولادتِ انبیاء کرام سے تقریباً چالیس سال بعد ہوتا ہے۔ اس روایتِ صحیح میں بھی لفظ بعثت مستعمل ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اپنی تبلیغی صدی سے پہلی صدی میں اس مجدد کی ولادت و تکمیل علوم معنوی و ظاہری ہو چکی ہو۔ اور دوسری صدی شروع ہوتے ہیں۔ اس کو مبعوث کر دیا جائے۔ کیونکہ روایت کے دوسرے لفظ ہیں: عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ ہر صدی کے راس پر۔ اور لفظ راس کے معنیٰ ہیں سر یعنی بالکل ابتدا اور ابتداءِ تبلیغ یعنی بعثت

تب ہی ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے صدی کا اکثر زمانہ بھی پایا ہو اور علوم حقیقیہ سے بھی کماحقہٗ واقف ہو چکا ہو تیسری یہ ثابت ہوئی۔ کہ ہر عالِم مجدّد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس عالِم، یا ولی اللہ یا مختار حاکِم بادشاہ وغیرہ کو مجدد کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس نے دو صدی کے انتہائی و ابتدائی زمانے کے پانے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے دینی فتنے کا خاتمہ یا زور توڑا ہو۔ کہ جس کے وجود سے اُمتِ مسلمہ کے شدید گمراہ ہونے کا خطرہ تھا۔ کیونکہ آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد پاک میں ہے۔ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا[۲] کہ وہ شخص اُمتِ مسلمہ کے لیے اس کے دین کو ستھرا کرے گا۔ چوتھی بات یہ ثابت ہوئی کہ وہ مجدّد فردِ واحد ہو گا۔ نہ کہ جماعتِ کثیرہ اگرچہ دیگر علماء اس کے معاون بن جائیں۔ مگر اصل مجدّد فقط ایک شخص ہی ہو گا۔ اس لیے کہ حدیثِ مذکورہ بالا میں مَنْ اسم موصول ہے۔ جو صرف وحدت کو چاہتا ہے۔ پانچویں بات یہ ثابت ہوئی۔ کہ مجدّد کا وہ زمانہ، صحابہ کرام کے زمانے کے بعد شروع ہوا ہے۔ کوئی صحابی مجدّد نہیں۔ اس لیے کہ روایتِ طیبہ میں ہے۔ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ[ط] (ترجمہ): یعنی وہ مجدّد ہر صدی کے بالکل شروع میں مبعوث ہو گا۔ جب کہ امت کی گمراہی کا سخت اندیشہ ہو تو تجدیدی کارنامے کر کے باطل فتنے کو فرد کرے۔ اکابرین صحابہ میں سے کسی نے بھی صدی کا ابتداء نہ پایا۔ اس لیے کہ پہلی صدی کی ابتداء میں خود آقائے کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے تھے۔ اور کسی کے گمراہ ہونے کا بھی اندیشہ نہ تھا۔ دوسری صدی کی ابتداء میں دورِ صحابہ تقریباً انتہائی مراحل میں پہنچ چکا تھا۔ خاص کر وہ چند صحابہ کرام جن کے افعالِ طیبہ اور حسین کردار کو تجدیدی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ سب اکابر وصالِ ربانی فرما چکے تھے۔ جیسے صدیق اکبر فتنۂ منع زکوٰۃ و فتنۂ مسیلمہ کذاب کو مٹانے والے اور فتوحاتِ اسلامیہ کے بانی فاروق اعظم وغیرہ اور قرآنِ کریم کے مخلوط کرنے کے فتنے کو ختم کرنے والے عثمانِ غنی اور جیسے کہ علی المرتضیٰ جنہوں نے اپنے عدالتی اور فقہی فیصلوں سے دین کو عجیب طرح سے روشن کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجدّد نہیں۔ اس لیے کہ مجدّد کا درجہ صحابہ کرام سے کم درجے پر ہے۔ صحابی کو مجدّد کا درجہ دینا ایسا ہی معیوب ہے۔ جیسا کہ وزیرِ اعظم کو تھانے دار کا درجہ دیا جائے۔ اسی طرح یہ کہنا ایک لحاظ سے گناہ ہے کیونکہ صحابہ کی گستاخی ہے کہ مجدّد کا درجہ مجتہد اربعہ کے بھی بعد ہے خلاصہ یہ کہ اس حدیث پاک نے جہاں مجدّد آنے کی خبر دی۔ وہاں مجدّد کی تعریف نوعیت اور شخصیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ تاکہ ہر ایرہ غیرہ کو مجدّد نہ کہہ دیا جائے۔ اس حدیث کی روشنی میں سابقہ چودہ صدیوں کے مجدّدین کرام اور ان کے دینی کارناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ (۱) پہلی صدی کے مجدّد (یعنی مجدّد کی پہلی صدی نہ کہ اسلام کی) حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے خارجیوں کے فتنے کو توڑ کر تجدیدِ اسلام فرمائی۔ آپ کی ولادت باسعادت ۹۱ھ میں اور وفات شریف ۱۱۲ھ میں ہوئی۔ اس طرح آپ نے اپنی صدی کے بارہ سال پائے۔ (۲): دوسری صدی کے مجدد امام احمد بن حنبل ہیں۔ آپ کی عمر شریف ستر سال ہوئی اور

سنہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ آپ نے معتزلہ فرقے کو ہلاک فرمایا۔ اور خلق قرآن کریم کے فتنے کی بڑھتی ہوئی آگ کو بجھا کر تجدید اسلام فرمائی۔ اس زمانے میں امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوئے۔ مگر خدمت تجدید امام احمد کے مقدر میں ہوئی۔ اسی میں آپ کی شہادت ہوئی۔ ۳ تیسری صدی کے مجدد امام احمد نسائی جنہوں نے فرقہ جہمیہ کے باطل عقائد کو فنا کر کے مجددیت کا خطاب پایا۔ آپ کی ولادت سنہ ۲۱۵ھ میں اور وفات سنہ ۳۰۳ھ میں ہوئی۔ فرقہ جہمیہ کے چند باطل عقیدے یہ تھے:۔ (۱) کہ عذاب قبر کوئی نہیں (۲) اور معاذ اللہ خالق دو ہیں ۱: خالق خیر، ۲: خالق شر ان کفریہ عقیدے کے باوجود پھر بھی یہ خود کو مسلمان کہتے تھے۔ چوتھی صدی کے مجدد امام بیہقی یا امام ابوبکر خلافی ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ہم زمانہ ہیں۔ انہوں نے تیسری صدی کے بیس۲۰ سال اور چوبیس۲۴ سال پائے اور چوتھی صدی کے بیالیس۴۲ اور پچپن۵۵ سال پائے۔ انہوں نے فرقہ رافضیہ کا زور توڑا۔ اور مسلمانوں کو ان کے کفریہ عقیدوں سے بچایا۔ اور طہران دلبنان میں تجدید اسلامی کا جھنڈا گاڑھا۔ پانچویں صدی کے مجدد امام محمد بن محمد غزالی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ قدریہ کے باطل عقیدوں سے مسلمانوں کو بچایا۔ ان کی ولادت سنہ ۴۵۰ھ میں اور وفات سنہ ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ چھٹی صدی کے مجدد امام فخر الدین رازی ہیں۔ جنہوں نے فرقہ جہمیہ اور فلاسفہ کے باطل عقیدوں کو اسلامی فلسفے کے ذریعے سے ہی ختم کیا اور عالم کے قدیم ہونے کے کفریہ عقیدے کا رد بلیغ فرمایا۔ انہوں نے پانچویں صدی اور چھٹی صدی کا زمانہ پایا۔ ساتویں صدی کے مجدد امام تقی الدین ابن دقیق عبدی ہیں۔ یہ سنہ ۶۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اور سنہ ۷۰۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوستان کے بعض علاقوں میں اسلام پھیلایا اور آریہ مذہب کا زور توڑ کر ان کی غلط توحید سے جو مسلمانوں میں فتنہ پڑتا تھا۔ اس کا خاتمہ کیا۔ آپ شام سے ہجرت کر کے ہند میں خدمت اسلام کے لیے تشریف لائے۔ آٹھویں صدی کے مجدد حافظ ابن حجر عسقلانی انہوں نے بہشت بریں بنانے والے بہائی مذہب کا زور توڑ دیا۔ ان کی عمر شریف ترسیٹھ سال ہوئی اور سنہ ۸۱۵ھ میں وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی صدی کے صرف پندرہ سال پائے۔ نویں صدی کے مجدد امام جلال الدین سیوطی ہیں۔ انہوں نے بھی فلاسفہ کی پھیلتی ہوئی بے دینی اور فلسفے کے گمراہ کن چکروں سے مسلمانوں کو بچایا۔ یہاں تک کی فہرست کتاب عون المعبود شرح ابوداؤد ص ۱۸۱ پر موجود ہے۔ دسویں صدی کے مجدد ملا علی قاری جنہوں نے اکبر بادشاہ کے دین الٰہی کا تختہ الٹایا۔ گیارھویں صدی کے مجدد امام شیخ احمد سرہندی۔ جنہوں نے جہانگیر کے کفریہ قوانین سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کو بچایا۔ بارھویں صدی کے مجدد امام محی الدین اورنگ زیب شہنشاہ ہند ان کی ساری زندگی ملحدین سے مقابلہ کرتے گزری۔ تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز جن کی وفات شریف سنہ ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔ چودھویں صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کے کارہائے نمایاں ان کی سوانحات میں موجود ہیں۔ آپ کی ولادت شریف سنہ ۱۲۷۲ھ میں ہے۔ اور وفات شریف سنہ ۱۳۴۰ھ میں ہوئی۔ واللہ ورسولہٗ اعلم ۵

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا وَّ شُکْرًا جَزِیْلًا کہ آج مورخہ بتاریخ شمسی ۲۶ ۳/۸۴ بروز پیر مبارک دوسری بار فتاویٰ العطایا جلد دوم جس کی مکمل کتابت تقریباً دو سال بیشتر ہو چکی تھی اس پر نظر ثانی اور مزید چند مضامین شامل کر کے طباعت کے لئے پریس میں دیدیا۔ مولیٰ تعالیٰ قبول فرمائے اور عوام مسلمانوں کو اس سے دینی ایمانی فائدہ اور ہدایت نصیب ہو۔ میری اس محنت سے زیادہ فائدہ طلباء کو حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ان کی دعاؤں سے میرے گناہ ولغزشیں معاف ہوں۔ اے میرے عزیز طالب علم! دین کی تعلیم حاصل کر کے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والو! یہ دنیا چند روزہ ہے اللہ اور رسول صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی محبّت حاصل کرنے کا یہی زمانہ ہے۔ سب ساتھ ٹوٹنے والے ہیں۔ سچا ساتھ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی مسند کو سنبھالا مگر حق ادا نہ ہوا۔ تم ہماری کمیوں کو پورا کردو وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَاِلَیْہِ الْبَلَاغ میرا کلام نصیحت کرنا تھا۔ سو میں نے کر دیا۔ عمل کے لئے دست بدعا ہوں۔

رُباعی ترمیمی

درآں مدّت کہ ما را وقتِ خوش بود — زہجرت سیزدہ صد نود و شش بود (۱۳۹۶ھ)

مرادِ ما نصیحت بُود و کردیم — حوالت با خدا کردیم و رفتیم

یہ فتاویٰ مطابق ماہِ شعبان بروز جمعۃ المبارک بعد جمعہ۔ سوا ایک بجے رات آج مورخہ شمسی ۲۰ ۸/۷۶ مکمل تصنیف ہوا اور اب ۲۶ ۳/۸۴ بزرگوں کی خبر مصدّقہ کے مطابق ۱۹۲۵ء میں ولادت کے حساب سے اپنی عمر کی سالانہ اُنتالیسویں (۳۹) ایمانی بہار دیکھ رہا ہوں۔ اور اپنے بزرگوں، پیارے دوستوں کی دُعاؤں کے طفیل جن میں استاذ محترم برادر بزرگ (۱) حضرت قبلہ مفتی مختار احمد صاحب ہم زلف حضرت والا مرتبت (۲) مولانا احمد حسن نوری صاحب لاہور۔ حضرت فاضل ذی شان (۳) قاری علی اکبر صاحب کوٹلہ ضلع گجرات حضرت علّامہ (۴) قاری ہدایت اللہ صاحب سرفہرست ہیں میں اس وقت تفسیر نعیمی کا تیرھواں چودھواں پندرھواں سیپارہ بیک وقت لکھ رہا ہوں اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق اور قبولیت کا شرف عطا فرمائے جبکہ گیارھواں پارہ چھپ چکا ہے اور بارھواں پارہ چھپ رہا ہے۔ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ وَزِیْنَتِ فَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا وَمَلْجَانَا وَمَاوَانَا وَکَرِیْمِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَبَنَاتِہٖ وَآبَائِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

اقتدار احمد خاں نعیمی بدایونی حال بریڈفورڈ انگلینڈ